

امام اعظم
رحمۃ اللہ علیہ

اور
علم الحدیث

حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی

امام اعظم اور علم الحدیث

مؤلفہ
حضرت مولانا محمد علی صاحب مدنی کا جملوی
صدر دارالعلوم الشہابیہ
سیالکوٹ

انجمن دارالعلوم الشہابیہ ○ نئی دہلی ○ ریکورڈنگ سوسائٹی

(جملہ حقوق محفوظ)

ملکیت	— — — —	انجمن دارالعلوم الشہابیہ شہر سیالکوٹ
تالیف	— — — —	مولانا محمد علی الصدیق، الکاظمی علمی
ترتیب قمارس	— — — —	عبدالوکیل علمی ایم۔ اے
عناوین	— — — —	۲۸۸
آیات	— — — —	۵۲
احادیث	— — — —	۹۳
طابع	— — — —	حفیظ اللہ فاروقی
تذمین و آرائش	— — — —	سید نفیس الحیدری، لاہور
کتابت	— — — —	محمود صوفی، گوجرانوالہ
مطبع	— — — —	تہابہ بشیر پریس، لاہور
کل صفحات	— — — —	۸۱۲
تاریخ اشاعت	— — — —	اپریل ۱۹۸۱ء

قیمت روپے ۵۵۵

انتساب

عالی جناب عباس حسین ملک رئیس اعظم شہر سیالکوٹ کے نام
جن کی دینی حمیت اور محبت اسلام میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ
دربادلی اور ہمدردانہ عنایت کی انجمن دارالعلوم الشہابیہ
رہن منت ہے اور جو اپنے دل میں آئندہ بھی انجمن کے
فلاحی، تعلیمی اور تبلیغی کاموں کو پروان چڑھانے کا
خاص جذبہ رکھتے ہیں۔

انجمن دارالعلوم الشہابیہ شہر سیالکوٹ

پیش لفظ

باسمہ سبحانہ :-

۱۹۵۳ء میں جب مرزا یوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک میں نظر بندی کے ایام سیالکوٹ جیل میں گزار رہا تھا، میراجی چاہا کہ علم حدیث میں امام اعظم کی جلالت قدر اور اس فن میں ان کی عظمت کو شاہراہ عام پر لاؤں اور یہ تمنا اس لیے ہوئی کہ جیل ہی کی زندگی میں ایک روز صبح کی نماز کے بعد اذکار مسنونہ میں مشغول تھا کہ اچانک میری جیل کی زندگی کے دو رفیق میرے کمرے میں آئے۔ ان میں سے ایک کو میرے سے عقیدت اور دوسرے کو عقیدت تو نہیں مگر تلمذ کی نسبت حاصل تھی۔ بغیر کسی تمہید کے دونوں نے مجھ سے دریافت کیا:

آپ دارالعلوم الشہابیہ میں کس قدر عرصہ سے رہتے ہیں؟
میں نے جواباً بتایا کہ

۱۵ فروری ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم الشہابیہ سے وابستگی ہوئی ہے اور اب ۱۹۵۳ء ہے حساب کر لو غالباً اٹھارواں سال ہے۔

اٹھارہ کا لفظ سنتے ہی دونوں کچھ چونک سے گئے اور باہم آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرنے لگے
میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟
اُن میں سے ایک نے کہا کہ

میں نے آج رات خواب دیکھا ہے کہ میں دارالعلوم گیا ہوں۔ دارالعلوم کا کتب خانہ بڑا شاندار ہے
شیشہ لگی ہوئی خوبصورت الماریاں ہیں، کتب خانے میں ایک نورانی صورت بزرگ ہستی سپید لباس
میں جلوہ افروز ہے۔ میں نے اُن سے مصافحہ کیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ ہیں۔
میں نے موڈ بانہ انداز میں دریافت کیا کہ آپ دارالعلوم الشہابیہ میں کتنے عرصہ سے قیام پذیر ہیں۔
جواب میں ارشاد فرمایا کہ مجھے غالباً اٹھارواں سال ہے۔

میں یہ خواب سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ دو روز تک اسی پریشانی میں وقت گزرا۔ تیسرے دن میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا اس خواب کے بعد میرے قلب میں امام اعظم کی محدثانہ نشان اور علم حدیث میں ان کی عظمت کے موضوع پر کام کرنے کا داعیہ رونما ہوا اور اس داعیہ کا اپنے دوستوں میں اظہار بھی کر دیا۔ جب میں نے اپنے احباب کو یہ بات بتائی تو میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں ایک ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو تیرہ برس تک التوا میں پڑا ہے گا لیکن حالات و واقعات کچھ اسی طرح بن گئے۔

ارمغانِ ایمان

جیل سے باہر آتے ہی دوستوں کے اصرار سے ارمغانِ ایمان پر نظر ثانی کی۔ مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو دارالعلوم کی انتظامی اور اہتمامی مصروفیات سدراہ ہو گئیں۔ نئے انداز میں نئے طرز کے اسکول کا آغاز کیا، پرائمری پھر مڈل۔

اسلام کا نظامِ اذکار

اسکول کی انتظامی مصروفیات ہی میں اسلام کا نظامِ اذکار نامی کتاب کی طباعت کا مرحلہ بھی پیش آگیا۔ اس کے لیے جب مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے مکرہت یا مذہبی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری کتاب پر نظر ثانی کی جائے اصل کتاب صرف ۷۷ صفحات پر مشتمل تھی نظر ثانی میں کتاب کی ضخامت ساڑھے تین سو صفحات سے زائد ہو گئی۔

نقوشِ زنداں

جیل کی زندگی میں کچھ وقت خود ہی تفریح طبع کے لیے مقرر کر رکھا تھا اور تفریح یہ ہوتی تھی کہ روزانہ قلم کی زبان سے کسی عزیز، کسی دوست اور کسی بزرگ کو مخاطب کر کے جو کچھ جی میں آتا لکھ دیتا مختلف بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے ہوتے یہ خطوط میرے بکس میں محفوظ تھے۔ میرا معمول تھا کہ جو کچھ بھی لکھتا تاریخ تریب کے ساتھ بکس میں رکھ دیتا۔ جیل سے آنے کے بعد کافی عرصہ یہ خطوط لکھے رہے۔ ایک روز میں نے یہ خطوط نکال کر مولوی محمد شریف قاسمی کو نقل کرنے کے لیے دیے۔ مولوی صاحب نے ان کو اس طرح نقل کیا کہ ان کا حسن و جمال دوبالا ہو گیا۔ احباب نے

پڑھے تو ان کی طباعت کے لیے متقاضی ہو گئے۔ بالآخر مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے اس کی طباعت کا بھی انتظام کیا۔

ان کاموں سے فراغت ہوئی تو انجمن دارالعلوم الشہابیہ نے اپنی نگرانی میں مختلف ادارے کھول دیے۔ پرائمری اسکول، مڈل اسکول، شعبہ حفظ قرآن، شعبہ علوم اسلامی، شعبہ تبلیغ، شعبہ نشر و اشاعت اور دارالافتاء۔ انتظامی و اہتمامی مشغولیتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ فرصت میرے لیے معدومات میں سے ہو گئی اور اس پر یہ سرگرائی کہ اخراجات کے لیے آمد کے وسائل ساتھ نہ دیتے تھے۔ یہ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں پورا اتروں انتظامی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمیٹیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ امام اعظم پر کچھ لکھنا پر سکون زندگی کے بغیر ممکن نہ تھا اور زندگی کا سکون میرے لیے عنقا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کچھ سرمایہ جمع کیا جو نہی ترتیب کے لیے تیار ہوتا تو انجمن دارالعلوم الشہابیہ کے مختلف اداروں کی پھیلی ہوئی پریشانیوں سے طبیعت میں انقباض آجاتا اور دوچار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑتا۔

ستمبر ۶۵ء کی چھ تاریخ تھی کہ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان پر ناپاک ارادوں سے حملہ کر دیا۔

دارالعلوم کے تمام ادارے بند ہو گئے اور سہ عدد شرے برائیکزفہ کہ خیر ماوراں باشد کے مطابق میں جس سکون کی تلاش میں تھا الحمد للہ مل گیا۔ تنہائی اور بالکل تنہائی۔ میں اور میری رفاقت کا کام دارالعلوم کے کتب خانے کی کتابیں کر رہی تھیں۔ الحمد للہ، اون کی شبانہ روز محنت کے بعد امام اعظم اور علم الحدیث کی ہستی وجود میں آگئی ضروری ہے کہ امام اعظم اور علم الحدیث کے متعلق چند امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

۱۔ کتاب کی ترتیب سے مقصود یہ تھا کہ امام اعظم کی محدثانہ شان کو خود محدثین کی زبانی شاہرہ عام پر لایا جائے لیکن محدثانہ شان کو بتانے کے لیے مؤلف نے محسوس کیا کہ علم حدیث کے تاریخی تعارف کے بغیر بحث اصولی حیثیت سے ناممکن ہے گا۔ اس لیے اولاً علم حدیث کا تاریخی چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ مقصد کے پیش نظر جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اول کوشش کی گئی ہے کہ حدیث میں امام اعظم کی علمی زندگی کا کوئی گوشہ بغیر اشارہ و تشریح کے نہ رہ جائے اور جن جن مقامات کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت محسوس ہوئی ان پر مستقل مباحث لکھے گئے۔ یہ مباحث بعض مقامات پر قدسے طویل ہو گئے مثلاً حدیث میں امام اعظم

کے اساتذہ پر پورے سو صفحات کا بحث ہے۔

مجہول اور ضعیف راویوں سے روایت پر بیس صفحوں میں تبصرہ ہے۔

تاریخ تدوین حدیث کا چونکہ امام اعظم سے خاص تعلق ہے اس لیے یہ بحث ۲۹۳ سے شروع ہو کر ۳۲۶ تک آگئی ہے۔

تصانیف کی تاریخ کے تذکرے میں کتاب الآثار پر مختلف حیثیتوں سے صفحہ ۳۲۷ سے ۳۷۶ تک بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ حدیث کی دوسری کتابوں مثلاً مؤطا، جامع معمر، جامع سفیان کے ساتھ اس دور کی تصانیف کا پورا تاریخی خاکہ صفحہ ۴۱۲ تک پیش کیا گیا ہے۔

علم حدیث میں مسانید کی حیثیت اور تاریخ لکھ کر مسند امام احمد اور مصنف عبدالرزاق کی تاریخی اور علمی حیثیت کی نشاندہی کی ہے۔ تیسری صدی میں صحاح کی تالیف پر ایک تفصیلی نوٹ ہے۔ الغرض تمام موضوعات پر تفصیل و تشریح کا یہی انداز رہا ہے۔ بلاشبہ یہ تفصیلات قاری کے لیے بار خاطر ہوں گی مگر مؤلف اپنی افتادِ طبع سے کچھ مجبور ہے۔ زبانِ قلم پر بات آنے کے بعد روکنا مؤلف کے بس کی بات نہیں ہے۔

۳۔ کتاب میں جو علمی مواد فراہم کیا گیا ہے اس میں مؤلف نے حوالہ کا التزام کیا ہے اور کتاب کے آخر میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست بھی شامل ہے۔ کام کی علمی نوعیت کے پیش نظر کتابوں کی نمایاں مؤلف کے لیے پریشان کن رہی ہے۔ اس پریشانی میں جس گرامی قدر شخصیت کی علمی محنتوں سے میں نے استفادہ کیا ہے اور جن کے لیے میرے رویں رویں سے دُعائیں نکل رہی ہیں وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی جامعہ اسلامیہ بہاولپور ہیں۔ موصوف کی تصانیف مائتس بہ الحاجۃ، امام ابن ماجہ اور علم حدیث، تعلیقات و دراسات، تعلیقات ذب و بابات میری قدم قدم پر رہنما رہی ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ کتاب میں مطبعی اغلاط کافی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب لکھنے کے بعد طباعت کے وقت دارالعلوم کے تعلیمی ادارے کھل چکے تھے، نہ میں تصحیح کر سکا ہوں اور نہ پروف پڑھ سکا ہوں اور نہ اس پر صحیح معنی میں نظر ثانی کر سکا ہوں حتیٰ کہ کتاب کی فہرستیں مرتب کرنے کا بھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔

فہرستوں کی ترتیب کے لیے میں عزیز امین اللہ و بڑا ایم۔ اے لیکچرر پنجاب یونیورسٹی کے لیے خلوصِ قلب سے دعا گو ہوں انہوں نے بڑی تندہی اور عرق ریزی سے کتاب کی فہرستیں مرتب کیں۔

آخر میں میں اپنے ان احباب کا بھی صمیم قلب سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری صرف ایک آواز پر مصارف طباعت کے لیے مطلوبہ رقم پیش کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ جزاءہم اللہ۔

معذرت

تمام غامیوں کے باوجود وقت کی تنگی اور عدیم الفرستی قدم قدم پر میرے خیالات کو میری خواہش کے مطابق عملی جامہ پہنانے میں مانع رہی ہے۔

چونکہ ۱۹۶۶ء میں اس کتاب کو پیش کرنے کا اعلان ہو چکا تھا اس لیے کام کی رفتار تیز رکھنی پڑی، مسودے کو میرے ایک عزیز مولوی محمد شریف قاسمی صاف کرتے تھے میں اس پر سرسری نگاہ ڈالتا تھا اور کاتب کے حوالہ کرنے کو کہہ دیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں گزشتہ کا استحضار رہنا مشکل تھا اس لیے عنوانات میں جس قدر ترقیب کا حسن قائم رہنا چاہیے تھا، قائم نہیں رہ سکا۔ ارباب علم سے استدعا ہے کہ وہ اپنی منصفانہ علمی تنقید سے مطلع فرمائیں تاکہ طبع ثانی میں اس کا خیال رکھا جائے۔ اللہم تقبل منا انک انت السميع العليم۔



امام اعظم اور علم الحدیث کے متعلق کلمی قدر آراء

حضرت مولانا علامہ ابوالوفا افغانی رحمۃ اللہ صدر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ، حیدرآباد (دکن) ماشاء اللہ تعالیٰ آپ نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا کہ قوم کو مستفنی کر دیا۔ کتاب کی تحقیقات اور اس کی خوبیاں تو فوراً اس پر بھی واضح ہو جائیں گی جس نے اس کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے جانیکیہ ایمان و نعمت سے دیکھا ہو، جزاک اللہ تعالیٰ خیراً بڑی تحقیق کی اور تفصیل سے بیان کیا۔ کاش یہ کتاب عربی میں ہوتی تو اس کی منفعت عام ہوتی۔ اب اس کا فائدہ صرف ان کے لیے ہے جو اردو سے واقف ہیں۔ میں کتاب پر تفصیلاً تو اس وقت کچھ لکھ سکوں گا کہ اس کا پورا مطالعہ کر سکوں۔ اشغال و امراض غور سے پوری کتاب کے مطالعہ کی اجازت کہاں دیتے ہیں۔ تاہم میں ضرور اس کے مطالعہ سے فارغ ہونے کی کوشش کروں گا بشرط زندگی، و الموت ادنیٰ من شرک نعلہ، تبدیل اب وہو کہے لیے افغانستان جانے کا قصد ہے دو ماہ بعد اگر میسر ہو تو شاید دیکھ سکوں۔ اب تو کتاب الحجہ جز ثانی کی طباعت میں مشغول ہوں، اکثر حصہ کی طباعت ہو چکی ہے بحمد اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید اس قسم کی خدمتوں کی توفیق دے اور حیات طیبہ نصیب فرمائے و فقکم اللہ کل خیر، آپ کے تعارف کا متاقی ہوں والسلام دو متم بالخير والعافیہ۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرسہ خیر المدارس، ملتان

حدیث اور امام اعظم، پونچھ، ماشاء اللہ، ایسی کاراؤ تو آید و مردان چنین کنند۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر دارالعلوم، کراچی

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی جلالات، شان اور علمی کمالات، درع و تقویٰ، عبادت و زہادت ایسی چیز نہیں جس سے کوئی لکھا پڑھا مسلمان ناواقف ہو، اپنوں اور غیروں میں موافق اور مخالف سبھی میں یہ چیز ناقابل اختلاف سمجھی گئی ہے لیکن ہر امام اور ہر عالم مقتدا۔ علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کو بحیثیت فن کے اپنے سعی و عمل کے لیے مخصوص کر لیتا ہے یا منجانب اللہ ایسے اسباب ہو جاتے ہیں کہ یہ فن ان کی خصوصیت بن جاتی ہے۔ وہ دنیا میں عام طور پر اسی فن کے ماہر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب کہیں نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے علوم و فنون کا ماہر نہیں ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام علوم اسلامیہ، نقلیہ، تفسیر، حدیث وغیرہ میں بلکہ عقلیہ کلام وغیرہ میں بھی اعلیٰ کمال عطا فرمایا تھا۔ مگر ان تمام علوم و فنون میں سے جس چیز کو اپنے لیے خاص فن کی حیثیت سے انہوں نے اختیار فرمایا وہ فقہ فی الدین ہے، اس لیے دنیا میں ان کی عام شہرت فقہ کی حیثیت سے ہوئی۔ اہل بصیرت سے تو یہ بات مخفی نہیں کہ فقہ میں کوئی شخص مہارت و امامت کا درجہ اس وقت تک حاصل کر ہی نہیں سکتا جب تک قرآن و سنت میں مہارت تامہ حاصل نہ کرے۔ مگر بعض سطحی نظر والوں نے امام اعظم کی جلالات شان فی علم الحدیث پر کچھ شبہات کیے کچھ دوسرے لوگوں نے اسے عوام میں پھیلا دیا اور بہت سے عوام غلط فہمی کا نشانہ بن گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر میری دیرینہ تمنا تھی کہ حضرت امام اعظم کی مہارت علم حدیث اور ان کے اساتذہ و تلامذہ فی الحدیث پر کوئی کتاب لکھی جائے۔ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے خود احقر نے محدثین حنفیہ کے نام سے ایک مقالہ ماہنامہ انقاسم دارالعلوم دیوبند میں شروع کیا تھا مگر اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔

حال میں حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی کی تصنیف جدیدہ امام اعظم اور علم الحدیث، نظر لاندہ ہوئی تو دیرینہ تمنا پوری ہونے کا وقت آگیا۔ کتاب کو جوں جوں دیکھتا گیا مسرت بڑھتی گئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ پوری شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر بہترین اور مستند مواد جمع فرمادیا، اور اس کی افادیت اس سے اور بڑھ گئی کہ ہر جگہ اصل ماخذ کا حوالہ پوری وضاحت کے ساتھ دیا ہے۔ اور جب کتاب کے مقدمہ میں یہ پڑھا کہ اس کی تالیف کا زمانہ صرف وہ سترہ دن ہیں جن میں پاکستان ہندوستان کے حملہ پر دفاعی جہاد میں مصروف تھا اور

مولانا مدظلہ کا محل فیام میاں کوٹ خصوصیت سے اس جنگ کا سخت ترین محاذ تھا انہی دنوں میں اس کتاب کی تالیف ہوئی تو معلوم ہوا کہ بلاشبہ یہ ایک کرامت ہے۔ اب کتاب چھپی ہوئی سامنے ہے سترہ دن میں کوئی متوسط آدمی اس کو اطمینان سے پڑھ کر بھی پورا نہیں کر سکتا۔ لکھنا اور وہ بھی سینکڑوں کتابوں کے حوالوں اور ان کی تشریحات کے ساتھ لکھنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

بہر حال کتاب کو مختلف مقامات سے پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ الحمد للہ اس موضوع پر کافی، شافی اور بڑا قابل قدر ذخیرہ مولانا نے پیش فرمادیا ہے فجزاہم اللہ خیر الجزاء

حضرت مولانا نعمت اللہ شاہ صاحب، حیدر آباد (دکن)

کتاب اہم اعظم اور علم الحدیث، کے ابواب و فصول ایک مستقل کتاب کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر چاروں ائمہ کے فقہ کی تدوین کی جائے اور مختلف معروضات پر مضمیموں اور تذیل اور ترتیب، تہذیب نگارش جو علم الحدیث نبوی خاطر جمع کیے گئے ہیں، کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے، میں اس کتاب کو ہر مسلم یونیورسٹی اور ہر دارالعلوم کے لیے لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ میں نے مواعظیت اور اپنے خطبات کے لیے اس کتاب کو نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ سینکڑوں اسماء الرجال، انسائیکلو پیڈیا بڑانیکا کیوں نہ لکھی جائیں اس کتاب کی اہمیت پیدا نہیں کر سکتیں۔

حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب صدر شعبہ تفسیر اسلامی یونیورسٹی، بہاولپور

یہ کتاب حضرت مولانا محمد علی صاحب کاندھلوی کا تصنیفی شاہکار ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت جامع الکمال تھی۔ آپ بیک وقت فقیہ اعظم اور مجتہد بھی تھے، عارف، زاہد، عابد اور متقی بھی تھے، جامع الکمال تھے۔ آپ بیک وقت فقیہ اعظم اور مجتہد بھی تھے، عارف، زاہد، عابد اور متقی بھی تھے، مفسر، متکلم اور سیاسی مبصر بھی تھے، اس کے ساتھ قضا و افتاء کا سرچشمہ بھی تھے اور یہ کہ عظیم محدث اور ناقد حدیث بھی تھے، آخری وصف کے علاوہ باقی اوصاف امام کی تاریخی حیثیت اس قدر واضح تھی کہ ان پر کسی مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ ان میں کسی موافق مخالف کو تردد نہ تھا، البتہ آپ کا آخری کمال کہ آپ ایک عظیم محدث اور ناقد حدیث تھے بعض حضرات کی نظروں سے پوشیدہ تھا اگرچہ آپ کا یہ کمال بھی واقعات اور تاریخی شواہد کی بنیاد پر بالکل منقطع تھا لیکن اس کے

دلائل، کتب رجال، تاریخ و طبقات کے وسیع ذخیروں میں منتشر ہونے کی وجہ سے ناظرین کی نگاہوں اور جمل
مٹھے۔ حضرت مولانا موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے کہ آپ نے ان ذخائر منتشرہ کو غطان بعیدہ سے
فراہم کر کے نہایت عمدہ ترتیب، شگفتہ تعبیر اور مؤندوں اسلوب استدلال کی شکل میں پیش کیا اور ساتھ
ہی جدید معیاری فہرست بھی منسلک کر دی۔ یہ کتاب صرف ایک تاریخی کتاب نہیں بلکہ دلائل حجیت
حدیث مقامیت و اجتہاد، شرائط و خصوصیات، کتب حدیث و احوال محدثین، علم اصول الحدیث،
علم الرجال کے قیمتی مباحث کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جس کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ علماء اور
مدرسین کے لیے بھی ضروری ہے اللہ تعالیٰ آپ کی اس خدمت کو قبول فرمادے۔

حضرت مولانا محمد رفیع فرزاں صاحب، شیخ الحدیث نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

آپ کا ار سال کردہ گرامی قدر علمی ستفہ موصول ہوا، کچھ حصہ پڑھا اور سیر نہ ہوا، یہی خیال اور ارادہ تھا کہ
ساری کتاب کو دفعۃً پڑھ کر اپنے تاثر کا اظہار بھی وصولی کے عرضیہ میں بھیج دوں گا مگر افسوس کہ اچانک
تین چار بیماریاں حملہ آور ہوئیں جن میں ایک عارضۃ قلب بھی ہے، چند دن صاحب فراش رہا اور
نماز کے لیے بھی گھر سے باہر نہ جاسکا، اب خدا خدا کر کے کل سے مسجد اور مدرسہ میں حاضری
دیتا ہوں لیکن نظر جھکا کر مطالعہ مشکل ہے۔ جتنا حصہ کتاب کا پڑھا ہے بلامبالغہ دل کی تہ سے دعائیں
نکلتی رہی ہیں کہ ایسی مدد، ٹھوس اور لا جواب کتاب اپنے باب میں آگئی ہے جس کے بعد انشاء اللہ
اس سلسلہ میں عنوان تو بدل سکتا ہے لیکن تحقیق حد آخر کو پہنچ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسحاب کو
تمام اہل اسلام کی طرف سے عموماً اور حضرات اخلاف کی طرف سے خصوصاً جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔
راقم کی صحت کے لیے خصوصی اوقات میں دعا فرمائیں۔

حضرت مولانا محمد رفیع صاحب، شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ، گوجرانوالہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کا مذہبوی کی تصنیف امام اعظم اور علم الحدیث، کے چیدہ
چیدہ مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا، میرے خیال میں حضرت مولف کی یہ علمی کاوش دادِ ستھین حاصل
کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مولانا نے یہ کتاب تصنیف کر کے ملت اسلامیہ کی ایک عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔
 امام اعظم کے علم حدیث سے استفادے اور تعلق کے بارے میں بعض لوگ جن غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اگر انہوں نے تعصب سے بالا نہ ہو کر اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش کی تو امید ہے کہ یہ تصنیف لطیف ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو جائے گی۔
 مصنف محترم نے کتاب کے پیش لفظ میں جن تین امور کا ذکر کیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف محترم کے قلم نے ان کا پورا پورا لحاظ لیا ہے اور اسلامی دہائیوں اور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔
 دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو تمام مسلمانوں کے لیے نافع بنائے اور مصنف محترم کو دنیا و آخرت میں بہتر صلہ عطا فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حضرت مولانا محمد بشیر صاحب صدیقی رحمۃ اللہ علیہ،

ہمارے محترم مولانا الحاج محمد علی صدیقی کاندھلوی نے اپنی مایہ ناز تصنیف "امام اعظم اور علم الحدیث" کو بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا ہے جس کا قلم ہم ۴۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مدوح نے اس میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صرف علم فقہ میں ہی امام الائمہ نہیں بلکہ علم حدیث میں بھی ایک برترین اور قابلِ فخر مقام رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی کم علمی یا حاسدانہ نگاہ اسے معلوم نہ کر سکے تو چشمہ آفتاب را چہ گناہ۔

موضوع کتاب کا دائرہ تحقیق اگرچہ صرف امام اعظم کی محدثانہ شان کا اظہار ہے مگر ضماً بڑے بڑے مفید بحث زیر قلم آگئے ہیں، چنانچہ کہیں تو مقام حدیث کی اہمیت بتائی ہے اور کہیں قرآن و سنت کا باہمی تعلق نہایت لطیف پیرایہ میں واضح کیا ہے۔ کہیں اس بات کی تشریح و توضیح ہے کہ ابتدائیں کتابت حدیث کی مخالفت کیوں تھی پھر اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ حدیث کی تدوین وصال نبوی کے ایک سو سال بعد ہوئی اور اس کے ثبوت میں دور نبوت میں حدیث کے کتابی ذخیرے کی نشاندہی کر کے ثابت کر دکھایا ہے کہ تحریر حدیث کی ابتداء دور نبوت میں ہی شروع ہو چکی تھی اور خلافت راشدہ کے دور میں اشاعت حدیث کی سب سے زیادہ کوشش فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کی۔
 امام اعظم کے نام اور کنیت پر بحث کرتے ہوئے بعض لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ

آپ کے جد امجد غلام تھے۔ اور اس کی تائید میں خود امام موصوف کی تشریح پیش کی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کے متعلق کہ (اگر ایمان یا علم) ثریا میں بھی ہو گا تو ابھی فارس میں سے کچھ لوگ اسے حاصل کر لیں گے) سیر حاصل بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ امام اعظم اس بشارت میں بدرجہ اولیٰ داخل ہیں بلکہ اس کا اولین مصداق آپ ہی ہیں۔

امام موصوف کی تابعیت کے ثبوت میں آپ کی روایت عن الصحابہ کو بھی بدلائل ثابت کیا ہے پھر آپ کی تعلیم و تربیت کے مبحث میں علم حدیث میں آپ کے شیوخ کی علمی عظمت و برتری ثابت کر کے کوفہ کی علمی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں ان دنوں حدیث و فقہ کی تعلیم کا کس قدر پھر چلتا تھا اور امام موصوف نے کتنے جلیل القدر شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا۔

امام اعظم کا حفاظ حدیث میں برترین مقام واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ ناقدین نے راویوں کی عدالت و ثقاہت کے بارے میں امام موصوف کی رائے کو خاص طور پر پیش کیا ہے۔ گویا آپ علم جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے فن میں بھی یکساں روزگار تھے۔ آپ کے تلامذہ حدیث کا ذکر کرتے ہوئے ثابت کر دیا ہے کہ جلیل القدر ائمہ حدیث و فقہ کو آپ سے تلمذ کی نسبت ہے اور اصحاب صحاح ستہ بھی بالواسطہ آپ کی شاگردی کے دائرہ سے خارج نہیں۔

”حدیث میں امام اعظم کے اصول، اور حدیث و قیاس کے باہمی تعارض کے مبحث اہل نظر کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ الغرض زیر تبصرہ کتاب گونا گوں مبحث کو ضمن میں لیے ہوئے ہے جو صرف طلبہ حدیث کے لیے ہی نہیں بلکہ طبقہ علماء کے لیے بھی بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔ اگر مولانا بعض علمی مباحث کو حذف کر کے صرف اس مواد کو شائع کر دیں جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی محدثانہ شان کے اظہار پر مشتمل ہے تو عام پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔“

مولانا کا طرز بیان تنگنہ اور دل آویز ہے اور سب بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے ہر مکتب فکر کے علماء فضلاء کے نام بڑے ادب و احترام سے لیے ہیں اور یہ ایسی خوبی ہے جس سے ہمارے اکثر علماء حتیٰ دست نظر آتے ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں کتاب کے مواد اور عناوین کی ترتیب اور ان کے باہمی تعلق میں زیادہ دقت نظر کی ضرورت ہے تاکہ ہر مبحث ایک خاص دائرہ میں محدود ہو اور یہ بکھرے ہوئے درگراں مایہ ایک مسلسل مسلک مراد پر نظر آئیں۔

علمی نسب نامہ

امام اعظمؑ نے سربراہ حکومت عباسیہ ابو جعفر منصورؑ و واسطی کے سامنے برسرِ دربار بتایا ہے :

”ربیع بن یونس کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ امیر المومنین ابو جعفر منصورؑ کے پاس آئے اس وقت دربار میں امیر کی خدمت میں عیسیٰ بن موسیٰ بھی موجود تھے عیسیٰ نے امیر المومنین کو مخاطب کر کے کہا اے امیر المومنین اِهَذَا عَالَمُ الدُّنْيَا الْيَوْمَ، یہ آج تمام دنیا کے عالم ہیں، ابو جعفر منصورؑ نے امام اعظمؑ سے دریافت کیا کہ اے نعمان! تم نے کن لوگوں کا علم حاصل کیا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین! میں نے فاروق اعظمؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا علم حاصل کیا ہے۔ ابو جعفر نے کہا کہ آپ تو علم کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہیں۔“

(تاریخ بغداد، جامع المسانید)

علمی شہرت

”امام لیث فرماتے ہیں کہ میں امام اعظمؒ کی شہرت سُنتا تھا۔
 ملنے کا بے حد مشتاق تھا حُسنِ اتفاق سے مکہ میں
 اس طرح ملاقات ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک
 شخص پر ٹوٹے پڑے جا رہے ہیں۔ مجمع میں میں نے
 ایک شخص کی زبان سے کلمہ سنا کہ اے ابو حنیفہ! میں نے
 جی میں کہا کہ تمنا تو بر آئی، یہی امام ابو حنیفہ ہیں۔“

(مناقب ابی حنیفہ للذہبی ص ۲۲)

علمی طلب

حافظ ذہبی الامام الحافظ مسعر بن کدام سے جو زمانہ
طالب علمی میں کوفہ کے اندر امام صاحب کے
رفیق ہیں، نقل کرتے ہیں :

”میں امام اعظم کا رفیق مدرسہ تھا، وہ علم حدیث
کے طالب علم بنے تو حدیث میں ہم سے آگے نکل گئے یہی
حال زہد و تقویٰ میں ہوا۔ اور فقہ کا معاملہ تو
تمہارے سامنے ہے۔“

علمی کمال

حافظ ابن عبد البر نے مشہور محدث زہرید بن ہارون کا امام اعظمؒ کے بارے میں یہ تاثر نقل کیا ہے :

”میں نے ہزار محدثین کے سامنے زانوئے

ادب تہ کیا ہے اور ان میں اکثر سے احادیث

لکھی ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ فقیہ

سب سے زیادہ پارسا اور سب سے زیادہ عالم

صرف پانچ ہیں ان میں اولین مقام ابو حنیفہؒ کا

ہے۔“

جامع بیان العلم وفضلہ - الانتقاء ص ۱۶۳

علمی جامعیت

امام ابو جعفر طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالہ سے امام ابو عاصم کی زبانی نقل کیا ہے کہ :

”ہم مکہ میں امام اعظم کے پاس رہتے تھے ، آپ کے

پاس اربابِ فقہ اور اصحابِ حدیث کا ہجوم ہو گیا ۔

آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو

صاحبِ خانہ کو کہہ کر ہم سے ان لوگوں کو مٹواتے ۔“

(مقدمہ اعلام السنن ص ۴۲)

فہرست مضامین تفصیلی

صفحہ	عنوان	شمارہ
۲۶	آیت دعوت اور اس کی تفسیر	۱
"	حافظ ابن کثیر اور ان کا مختصر تفسیر	۲
"	دعوت نبی اور امت و دنوں کا کام ہے	۳
۲۸	اتباعِ محبت کی نشانی ہے	۴
"	اتباع کے موضوع پر قرآن کا دعویٰ	۵
۲۹	اتباع کی سرشاریوں کا نتیجہ	۶
"	آیت دعوت کا اجمال اور اس کی تشریح	۷
"	آیت کے چہرہ اجمال سے نقاب کشائی	۸
"	حضرت ابو موسیٰ اشعری اور ان کا مختصر چہرہ	۹
۵۰	امت دعوت اور امتِ اجابت	۱۰
"	امام بخاری کا حدیث ابی موسیٰ سے استدلال	۱۱
"	حدیث ابی موسیٰ کی رہنمائی	۱۲
"	زمین کی بارش سے استفادہ میں تین قسمیں	۱۳
"	انسانی قلوب کی علم و ہدایت سے استفادہ میں تین قسمیں	۱۴
"	پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین یعنی محدثین	۱۵
۵۱	حدیث ابی موسیٰ میں محدثین اور اربابِ روایت	۱۶
"	علامہ سندھی کا تشریحی نوٹ	۱۷
"	محدثین کے بارے میں حضورِ نور کا ایک اور ارشاد	۱۸
"	پانی سے پیداوار کرنے والی زمین یعنی مجتہدین	۱۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۵۲	حدیث ابی موسیٰ، مجتہدین اور فقہاء	۲۰
"	علامہ سندھی کی رہنمائی	۲۱
"	فقہاء و مجتہدین کے متعلق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد	۲۲
۵۳	محدثین اور مجتہدین اسلام کا علمی سرمایہ ہیں	۲۳
"	حدیث من یدر اللہ بہا خیراً کی تخریج	۲۴
"	حافظ ابن القیم کا تفصیلی بیان	۲۵
"	حکیم الامت شاہ ولی اللہ کا بیان	۲۶
"	اصحاب روایت اور اصحابِ درایت دونوں ارشاد کا منطوق ہیں	۲۷
۵۴	امۃ اجتہاد کی طاعت ضروری ہے	۲۸
"	امتِ محمدیہ میں علماء کی دو قسمیں	۲۹
"	فقہائے اسلام کا حافظ ابن القیم کی زبانی تعارف	۳۰
"	آیتِ اطاعت میں اولی الامر سے فقہاء مراد ہیں	۳۱
۵۵	صاف اور سنگلاخ زمین یعنی مقلدین	۳۲
"	مقلدین کی طرف ارشاد میں اشارہ	۳۳
"	علامہ قسطلانی کی تشریح	۳۴
"	تقلید کی حقیقت	۳۵
"	ابن ماجہ کے حوالے سے صحابہ کے پانچ طبقے	۳۶
۵۶	صحابہ کے اختلاف مدارج پر شاہ ولی اللہ کا بیان	۳۷
"	علمِ تحقیقی اور تقلیدی دونوں علم ہیں	۳۸
"	منصبِ امامت میں مولانا شہید کا بیان	۳۹
۵۸	علامہ شاطبی کی بیان کردہ علماء کی قسمیں	۴۰
"	اہل سنت کے تقلیدی موقف پر امام ذہبی کا بیان	۴۱
"	شاہ ولی اللہ کی اختیار کردہ تقلید کی تعریف	۴۲
۵۹	امام اعظم کی فقہانیت میں شہرت کی وجہ	۴۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۵۹	مجتہد ہونے کی ضروری شرطیں	۴۴
"	مجتہد کون ہوتا ہے؟ اس کا جواب علامہ شاطبی کی زبانی	۴۵
۶۰	محدثین علم حدیث و روایت میں فنکار ہیں	۴۶
"	ائمہ اربعہ کا حدیث میں مقام اور شاطبی کا بیان	۴۷
"	حدیث کیا ہے؟	۴۸
"	قرآن میں نبوت کا مقام اور منصب اور اس کی تشریح	۴۹
۶۱	قرآن و قاتع کے تحت نازل ہوا ہے	۵۰
"	بتدریج نزول قرآن کی توجیہ اور اس سے استدلال	۵۱
"	قرآن اور وقائع میں باہم تعلق	۵۲
۶۲	قرآن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قرآن کو نور کہنے کی وجہ	۵۳
"	قرآن اور سنت میں چراغ اور روشنی کی نسبت ہے	۵۴
"	حدیث تاریخ سنت کا نام ہے	۵۵
"	السنة کے ایک سے زیادہ اصطلاحی معنی	۵۶
"	فقہاء کی اصطلاحی زبان میں السنة	۵۷
۶۳	قرآن کے لیے قراء سبعہ اور السنة کے لیے محدثین کی روایات	۵۸
"	سنت کا سنت ہونا روایات محدثین کا محتاج نہیں ہے	۵۹
۶۴	اس موضوع پر حافظ ابن تیمیہ کا لطیف بیان	۶۰
"	قرآن کی حفاظت کے دو طریقے سینہ اور صحیفہ	۶۱
"	سنت کی حفاظت بھی دو طرح ہوئی سینہ اور عمل کا پیمانہ	۶۲
۶۵	حفاظت سنت اور حفاظت قرآن میں فرق کی وجہ	۶۳
"	تاریخ سنت کے لیے حدیث کا لفظ	۶۴
"	لفظ حدیث کا قرآن میں استعمال	۶۵
۶۶	قرآن میں دین کی نعمت کے اظہار کا نام تحدیث ہے	۶۶
"	تاریخ سنت کے لیے نام تجویز کرنے میں اُمت کی دیانت	۶۷

صفحہ	عنوان	نمبر
۶۶	حدیث کا صحیح مقام	۶۸
"	دین میں قرآن و سنت کی حجیت	۶۹
"	منکرین حدیث کا اسلام میں مقام	۷۰
۶۷	قرآن اور سنت میں فرق	۷۱
"	قرآن و سنت دونوں وحی ہیں	۷۲
"	قرآنی وحی کی شانِ اعجاز اور اس کا مقام بعد ہی	۷۳
"	قرآن کی تلاوت اور سنت کے اتباع پر زور	۷۴
"	قرآن و سنت میں نامہ اور پیام کا فرق ہے	۷۵
"	نامہ و پیام کے فرق پر امام ابو محمد الجوینی کی تصریح	۷۶
۶۸	حافظ جلال الدین السیوطی کی تائید	۷۷
"	قرآن معجزہ ہے سنت معجزہ نہیں ہے	۷۸
۶۹	سنت کا آغاز روایت بالمعنی سے ہوا ہے	۷۹
"	نامہ اور پیام کا تفصیلی فرق	۸۰
"	سنت بھی اللہ کی وحی ہے	۸۱
"	قرآن نظم و معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے	۸۲
۷۰	قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں ہے	۸۳
"	نزول قرآن کے بعد قرآن کا بیان بھی اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے	۸۴
"	قرآن کی بتائی ہوئی وحی کی تین صورتیں	۸۵
"	نزول قرآن کے لیے وحی کے اقسام سہ گانہ میں سے ایک کی تعیین	۸۶
۷۱	علامہ آلوسی اور علامہ طیبی کے بیانات	۸۷
"	نفث فی الروع، رویا اور الہام کو قرآن نے وحی کہا ہے	۸۸
"	امام شافعی کی الرسالہ میں تشریح	۸۹
۷۲	قرآن میں حکمت سے مراد سنت ہے	۹۰
"	حکمت سے سنت مراد ہونے پر قرآنی آیات سے استدلال	۹۱

صفحہ	عنوان	شمارہ
۷۲	حکمت سے کیا مراد ہے اس کا امام شافعی کی جانب سے تفصیلی جواب	۹۲
۷۳	حکمت کی کہبتیں بھی قرآن کی آیات کی طرح تلاوت ہوتی تھیں	۹۳
۷۴	سنت کے وحی الہی ہونے پر حافظ ابن القیم کا جامع تبصرہ	۹۴
۷۵	کتاب کے ساتھ نبوت آنے کی ضرورت پر امام احمد کا بیان	۹۵
۷۵	کتاب و سنت کے باہمی رشتہ پر امام ابو حنیفہ کے بیانات	۹۶
۷۶	قرآن میں حضور انور کی اتباع کا غیر مشروط اور بے قید حکم ہے	۹۷
"	پیغمبر قرآن کے شارح ہیں	۹۸
۷۷	سنت میں روایت بالمعنی جاتزہ ہونے کی عقلی توجیہ	۹۹
"	حافظ جلال الدین السبوطی کا مختصر اور اجمالی تعارف	۱۰۰
۷۸	السنة میں تواتر لفظی نہ ہونے پر الجزائری کا بیان	۱۰۱
"	تواتر سے بحث کرنا محدثین کے دائرہ کار سے باہر ہے	۱۰۲
"	حافظ ابن تیمیہ کی بتائی ہوئی دو اصولی باتیں	۱۰۳
۷۹	کلام کے اشرف اور افضل ہونے کا معیار اور امام خطابی	۱۰۴
"	اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق	۱۰۵
"	ما اوحی میں الکتاب کی قید تلاوت کے ساتھ مخصوص ہے	۱۰۶
۸۰	صحیح مسلم کی حدیث ابی سعید کا منشاء	۱۰۷
"	حدیث ابی سعید خدری معلول ہے	۱۰۸
۸۱	حافظ ابن حجر کا اجمالی تذکرہ	۱۰۹
"	لا تکتبوا عنی غیر القرآن میں غیر کا موصوف محذوف ہے	۱۱۰
۸۲	کتابت کی ممانعت پر ڈاکٹر صبیحی صالح کی رائے	۱۱۱
"	ممانعت کے عملی مصداق پر امام خطابی کا بیان	۱۱۲
"	المحدث الفاضل میں رامہرنزی کی رائے	۱۱۳
۸۳	حضرت ابو ہریرہ کی مسند احمد کی حدیث سے استدلال	۱۱۴
"	ڈاکٹر حمید اللہ کی حدیث ابی سعید کے مصداق کے متعلق رائے	۱۱۵

صفحہ	عنوان	شمارہ
۸۳	حدیث ابی سعید کتابت کی حدیثوں کے معارض منہیں ہے	۱۱۶
"	حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اجازت اور اس پر احادیث سے استدلال	۱۱۷
۸۶	حدیث ابی سعید کے تین جوابات	۱۱۸
"	حدیث ابی سعید کا نسخ اور علامہ احمد محمد شاہ کا اصرار	۱۱۹
۸۷	ناقابل انکار حقیقت	۱۲۰
"	دور نبوت میں حدیث کا کتابی ذخیرہ	۱۲۱
۸۸	احکام و سنن کی کتابیں	۱۲۲
"	عمرو بن حزم صحابی کی تالیف	۱۲۳
"	عمرو بن حزم کی تالیف کی تاریخی حیثیت	۱۲۴
۸۹	قاضی ابوبکر کے پاس عمرو بن حزم کی دستاویز	۱۲۵
۹۰	دستاویز عمرو بن حزم امہ اسلام میں متداول ہے	۱۲۶
۹۰	کتاب الصدقہ نبوت کا تحریری سرمایہ ہے	۱۲۷
۹۲	خلفاء راشدین کا کتاب الصدقہ پر عمل	۱۲۸
"	سالم بن عبد اللہ سے کتاب الصدقہ کی روایت	۱۲۹
"	کتاب الصدقہ کی تاریخی اور روایتی حیثیت	۱۳۰
۹۳	صحابہ کرام اور کتابت حدیث	۱۳۱
"	صحیفہ صادقہ کی روایتی حیثیت	۱۳۲
"	صحیفہ صادقہ کا توارث	۱۳۳
۹۵	صحیفہ علی مرتضیٰ اور اس کی روایتی حیثیت	۱۳۴
۹۶	صحیفہ صدیقی اور اس کا تاریخی مقام	۱۳۵
۹۷	صحیفہ جابر اور اس کی تاریخی حیثیت	۱۳۶
۹۸	صحیفہ کمرہ بن جندب	۱۳۷
"	صحیفہ کمرہ کی روایت	۱۳۸
"	امام حسن بصری کا اجمالی تذکرہ	۱۳۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۹۹	صحیفہ صحیحہ اور اس کا پورا نام	۱۴۰
"	الصحیفۃ الصحیحہ اور الصحیفۃ الصادقہ	۱۴۱
"	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۴۲
"	اہل عرب میں علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کے ذرائع	۱۴۳
۱۰۰	حدیث بیان کرنے والے صحابہ کرام	۱۴۴
"	حدیث روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد	۱۴۵
۱۰۱	اس قدر قلیل تعداد صحابہ کی روایت کی وجہ	۱۴۶
"	شاہ ولی اللہ کا تاریخی انکشاف	۱۴۷
"	تعداد حدیث کے لحاظ سے صحابہ کی قسمیں	۱۴۸
۱۰۳	صحابہ کرام کے امام حاکم کے بتائے ہوئے بارہ طبقے	۱۴۹
"	صحابہ کرام میں حفاظ و فقہاء	۱۵۰
۱۰۴	فقہاء صحابہ کی حفاظ صحابہ پر تنقید	۱۵۱
۱۰۵	صحابہ میں حضرت ابو ہریرہ کا مقام	۱۵۲
"	حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ کا موازنہ	۱۵۳
۱۰۶	ترجیح روایت کے لیے فقہ راوی کی شرط	۱۵۴
"	حفظ و ضبط اور فقہ و اجتہاد میں موازنہ	۱۵۵
"	حضرت عائشہ کے صحابہ پر تعقیبات	۱۵۶
۱۰۷	حضرت عمر کی جانب منسوب بیانات کا صحیح منشا	۱۵۷
"	امام دارمی اور حکیم الامت کی رائے	۱۵۸
"	موقف عمر کی عمل عمر سے تعین	۱۵۹
۱۰۸	حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں ایک ہزار چھتیس محدث	۱۶۰
"	امراء بلا و فقہاء اور محدثین ہوتے تھے	۱۶۱
۱۰۹	صدر اول میں سنت سے فقہ مراد ہوتا تھا	۱۶۲
"	خلافت راشدہ اور تدوین حدیث	۱۶۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۰۹	حافظ ابوبکر بن عقیل کا توضیحی بیان	۱۶۴
"	دورِ خلافت میں حدیث کے مدون نہ ہونے کے وجوہ	۱۶۵
۱۱۰	نبوت کا امتیازی مقام خلافت ہے	۱۶۶
"	آیت نسخ کی شاہ ولی اللہ کی بیان فرمودہ تفسیر	۱۶۷
۱۱۱	اسلام میں خلافت راشدہ کے اعمال کی حجیت	۱۶۸
"	اسلام میں سنت نبوت اور سنت خلافت دونوں واجب الاتباع ہیں	۱۶۹
۱۱۲	السنة کی تعریف اور اس کی حقیقت	۱۷۰
"	ما انا علیہ واصحابی کی تشریح	۱۷۱
"	فرقہ ناجیہ کی تعریف	۱۷۲
۱۱۳	اسلام نظام نبوت و خلافت کے مجموعہ کا نام ہے	۱۷۳
"	قرآن میں صراط مستقیم کا تصور	۱۷۴
"	انعام یافتہ طبقہ کی قرآن سے تعبیر	۱۷۵
"	صحابہ کے اوصاف خصوصی	۱۷۶
۱۱۴	نبوت اور امت دونوں کا کام دعوت	۱۷۷
"	امر بالمعروف امت کی خیریت کا مہنی ہے	۱۷۸
"	شہادت علی الناس امت کا فریضہ ہے	۱۷۹
۱۱۵	نبوت اور امت کا فرائض میں اشتراک	۱۸۰
"	خلافت راشدہ کے دور میں خدمت حدیث	۱۸۱
"	خدمت حدیث کی خاطر فاروق اعظم کے اقدامات	۱۸۲
۱۱۶	ایک شبہ کا ازالہ	۱۸۳
"	محدثین کا بتایا ہوا ضابطہ اور اصول	۱۸۴
"	فاروق اعظم کی احادیث	۱۸۵
۱۱۷	سنن بدیہی اور سنن زوائد میں امتیاز	۱۸۶
"	فاروق اعظم کی محققانہ دقیق نظر	۱۸۷

نمبر	عنوان	صفحہ
۱۸۸	تحدیث و روایت میں فاروق اعظم کا کارنامہ	۱۱۸
۱۸۹	امام اعظم کا نام، کنیت اور لقب	۱۱۹
۱۹۰	نعمان کی لغوی تحقیق اور نام میں معنویت	۱۲۰
۱۹۱	حنیف کے لغوی معنی اور اس کے مجازات	۱۲۰
۱۹۲	ابو حنیفہ امام اعظم کی کنیت تفاؤل کی بنا پر ہے	۱۲۱
۱۹۳	حنیفہ نامی امام اعظم کی کوئی لڑکی نہیں	۱۲۲
۱۹۴	ابو حنیفہ دراصل ابوالملة الحنیفہ ہے	۱۲۲
۱۹۵	امام اعظم کا نسب نامہ	۱۲۱
۱۹۶	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۲۲
۱۹۷	نسبت و لا کی وجہ سے امام اعظم تیمی ہیں	۱۲۲
۱۹۸	ولا کے معنی اور علامہ نووی کی تصریح	۱۲۲
۱۹۹	ولا بمعنی دوستی کے لیے امام اعظم کی تصریح	۱۲۲
۲۰۰	معنی و لا کے لیے عبد اللہ بن یزید کا انکشاف	۱۲۲
۲۰۱	عبد اللہ بن یزید کا چہرہ امام ذہبی کی زبانی	۱۲۳
۲۰۲	اسماعیل بن حماد کا تشریحی بیان	۱۲۳
۲۰۳	ابو حازم عبد الحمید کا بیان اور اس کی تضعیف	۱۲۳
۲۰۴	امام اعظم کے والد کے لیے حضرت علی کی دعا	۱۲۴
۲۰۵	اسماعیل کا دعا کے بارے میں تاثر	۱۲۴
۲۰۶	امام اعظم کے بارے میں نبوی پیش گوئی	۱۲۴
۲۰۷	فارس کے بارے میں صحیحین کی روایت	۱۲۴
۲۰۸	صحیحین کا مصداق محدثین کے نزدیک امام اعظم ہیں	۱۲۵
۲۰۹	حافظ سیوطی کا دعویٰ	۱۲۵
۲۱۰	علامہ حنفی اور علامہ غزیری کی تشریح	۱۲۶
۲۱۱	شاہ ولی اللہ کا مکتوبات میں محاکمہ	۱۲۶

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۲۷	نواب صدیق حسن خاں کا اعتراف	۲۱۲
۱۲۸	نواب صاحب کے بیان پر تبصرہ	۲۱۳
۱۲۸	محمد ثنین میں ابن ماجہ اور بخاری کے سوا کوئی عجیب نہیں ہے	۲۱۴
۱۲۹	امام اعظم اور اعجاز نبوی	۲۱۵
۱۲۹	تمام مکاتیب فکر کی طرف سے امام اعظم کو خراج عقیدت	۲۱۶
۱۳۰	امام اعظم کی محبت سنی ہونے کی نشانی ہے	۲۱۷
۱۳۰	عبد العزیز بن میمون امام اعظم کے معاصر ہیں	۲۱۸
۱۳۱	وکیع بن الجراح فتاویٰ میں امام اعظم کے اقوال کو اپناتے تھے	۲۱۹
۱۳۱	امام یحییٰ بن سعید امام اعظم کے فتویٰ میں مقلد تھے	۲۲۰
۱۳۱	امام اعظم کی تقلید ۱۹۵ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی	۲۲۱
۱۳۱	یحییٰ بن سعید امام ابو یوسف کے شاگرد ہیں	۲۲۲
۱۳۱	ربیع النور اور سر پائے امامت	۲۲۳
۱۳۱	امام اعظم کی تاریخ ولادت میں اختلاف	۲۲۴
۱۳۲	امام اعظم تابعی ہیں	۲۲۵
۱۳۲	اسلام میں صحابہ کا مقام	۲۲۶
۱۳۳	صحابہ کی عدالت قرآن سے ثابت ہے	۲۲۷
۱۳۳	عدالت صحابہ پر ملا علی قاری اور ابن عبد السلام کی تصریح	۲۲۸
۱۳۴	تابعین کی بزرگی اور اسلام میں ان کا مقام	۲۲۹
۱۳۵	حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت سے استدلال	۲۳۰
۱۳۵	حدیث عائشہ کی روایت سے استدلال	۲۳۱
۱۳۵	خیر القرون کی محدثین کی پیش کردہ تفسیر	۲۳۲
۱۳۶	صدر اقول اور سلف صالح کی تشریح	۲۳۳
۱۳۶	کمال علم اور کمال ایمان میں صحابہ کا مقام	۲۳۴
۱۳۶	دور نبوت میں امام اعظم کی ولادت	۲۳۵

صفحہ	عنوان	نمبر
۱۳۷	محدثین کی زبان میں تابعی	۲۳۶
"	صحابی کی تعریف امام بخاری کی زبانی	۲۳۷
۱۳۸	ارشادات نبوت سے امام بخاری کی تائید	۲۳۸
۱۳۹	امام اعظم کو صحابہ کی دید کا شرف بے غبار ہے	۲۳۹
"	امام اعظم کی تابعیت اور محدثین کرام	۲۴۰
۱۴۰	امام اعظم کی تابعیت اور حافظ ابن حجر عسقلانی	۲۴۱
۱۴۱	امام اعظم کی تابعیت پر حافظ ولی الدین عراقی کا فیصلہ	۲۴۲
"	امام اعظم کی تابعیت پر حافظ زین الدین عراقی کا تبصرہ	۲۴۳
۱۴۲	حافظ عراقی کی بیان کردہ تابعین کی فہرست	۲۴۴
"	علامہ قسطلانی کی رائے	۲۴۵
۱۴۳	حافظ ابن عبد البر کا تابعیت امام کے بارے میں انکشاف	۲۴۶
"	عبد اللہ بن الحارث سے امام اعظم کو شرف دید	۲۴۷
"	حافظ ابو بکر الجعابی اور عبد اللہ بن الحارث کی تاریخ وفات	۲۴۸
"	حافظ ابو بکر الجعابی اور ان کی تاریخ رجال سے واقفیت	۲۴۹
"	دید کی شہادت ایک مثبت دعویٰ ہے	۲۵۰
۱۴۴	اثبات ونفی میں تعارض پر محدثین کا فیصلہ	۲۵۱
"	جزء رفع یدین میں امام بخاری کا زریں فیصلہ	۲۵۲
"	امام اعظم کا حضرت انس کو دیکھنا متفق علیہ ہے	۲۵۳
۱۴۵	صحابہ و تابعین کے لیے قرآن میں چار وعدے	۲۵۴
"	امام اعظم کا زمانہ طلب علم	۲۵۵
"	ولید بن عبد الملک سکتی بن کارآمد سپہ سالار	۲۵۶
۱۴۶	زمانہ ولید میں اسلامی حکومت کا جغرافیہ	۲۵۷
"	امام اعظم کے چھپنے اور لڑکپن کا دور	۲۵۸
"	کوفہ کی مرکزی حیثیت	۲۵۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۴۶	کوفہ کا جغرافیائی مقام	۲۶۰
"	زمانہ فاروق اعظم میں کوفہ کی آبادی اور اس کی وجوہ	۲۶۱
"	کوفہ کی آباد کاری کے لیے کمیٹی کی تشکیل	۲۶۲
"	کوفہ میں آباد کاروں کی اولین تعداد ۴۰ ہزار ہے	۲۶۳
۱۴۷	کوفہ کی جدید تشکیل اور ابو الہیاج الاسدی کا سرے	۲۶۴
"	کوفہ کا نقشہ اور اس کی تمدنی و تہذیبی مرکزیت	۲۶۵
"	کوفہ میں زمانہ فاروق میں مسلمانوں کا متول	۲۶۶
"	۴۰ ہزار آباد کاروں میں صحابہ کی تعداد	۲۶۷
۱۴۸	صحابہ کی تعداد میں محدثین و مورخین کا اختلاف	۲۶۸
"	احمد ابن کی زبانی کوفہ کا علمی نسب نامہ	۲۶۹
۱۵۰	علماء کوفہ کے شوق طلب علم پر ابن تیمیہ کا انکشاف	۲۷۰
"	فن قرآن و تجوید کے امام اور کوفہ	۲۷۱
"	علم التفسیر اور کوفہ	۲۷۲
"	عربیت اور نحو و صرف کی تدوین اور کوفہ	۲۷۳
"	علماء لغت کے یہاں کوفہ کی لسانی اہمیت	۲۷۴
۱۵۱	امام اعظم کی علمی طلب کاریوں کا زمانہ	۲۷۵
"	علمی طلب کاریوں کے لیے نقطہ آغاز	۲۷۶
"	آغاز طلب میں امام اعظم کی علم الکلام سے دلچسپی	۲۷۷
"	علم الکلام میں امام اعظم کی مہارت	۲۷۸
۱۵۲	نظریۃ العلم کے لیے امام شعبی کا مشورہ	۲۷۹
"	الشرائع کی طرف متوجہ کرنے میں امام شعبی کا کردار	۲۸۰
"	آغاز طلب علم کے بارے میں غلط فہمی کا ازالہ	۲۸۱
"	امام اعظم اور فنون عصریہ	۲۸۲
"	علم الشرائع سے پہلے امام اعظم نے فنون حاصل کیے	۲۸۳

صفحہ	عنوان	۵
۱۵۳	علم الکلام میں امامت پر یحییٰ ابن شیبان کا بیان	۲۸
۱۵۴	زمانہ امام اعظم میں مروجہ علوم اور ان کی تقسیم	۲۸
"	امام اعظم کے طلب علم کی تاریخی ترتیب	۲۸
"	امام اعظم نے لڑکپن میں علوم عصریہ میں تکمیل فرمائی تھی	۲۸
۱۵۵	امام اعظم اور علوم عقلیہ	۲۸
"	علوم عقلیہ میں مہارت پر عبداللہ بن ابی حفص کا بیان	۲۸
"	امام اعظم کی کلامی اور عقلی علوم میں شہرت	۲۹
"	مختلف مدارس اور مکاتیب سے امام اعظم کے مناظرے	۲۹
"	امام اعظم کے زمانہ میں علمی مسائل	۲۹
۱۵۶	حافظ ابن رجب حنبلی کا اختلاف پر تا سف -	۲۹
"	مسئلہ ایمان میں اختلاف اور جہم بن صفوان کا موقف	۲۹
"	مسئلہ ایمان اور امام اعظم	۲۹
۱۵۷	ایمان میں تصدیق، اقرار اور اعمال کا باہمی ربط	۲۹
"	ارشاد نبوت سے ربط کی تائید	۲۹
۱۵۸	زبان کا اقرار ایمان میں کیوں شرط ہے	۲۹
۱۵۹	ایمان میں امام اعظم کے نزدیک اقرار کی اہمیت	۲۹
۱۶۱	ایمان کے موضوع پر امام اعظم کا قانونی موقف	۳۰
"	امام اعظم کی علم کلام میں تصانیف	۳۰
"	معتزلہ کا غلط پروپیگنڈا	۳۰
۱۶۲	ابلیاضی طائش کبریٰ، بزازی اور بزدوسی کی تصریحات	۳۰
۱۶۳	امام اعظم کی کلامی کتابوں کی تاریخی حیثیت	۳۰
۱۶۴	علم کلام اور اس کا حکم	۳۰
۱۶۵	امام اعظم کے نزدیک اسلامیات میں علم کلام کی حیثیت دفاعی سرمایہ کی ہے	۳۰
۱۶۵	امام الحرمین اور امام غزالی کی تائید	۳۰

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر
۱۶۶	علم کلام کے موضوع پر اولیت کا شرف امام اعظم کو حاصل ہے	۳۰۸
۱۶۷	۹۵ھ سے ۱۰۴ھ تک کا وقت امام اعظم نے حدیث پر صرف کیا	۳۰۹
۱۶۸	امام اعظم طالب علم حدیث کی حیثیت سے	۳۱۰
۱۶۹	امام شعبی کا امام اعظم کے اکابر شیوخ میں شمار	۳۱۱
۱۷۰	امام شعبی کی حدیث میں شانِ جاہلیت	۳۱۲
۱۷۱	امام اعظم کے طلب علم کی تاریخی داستان کا اجمالی خاکہ	۳۱۳
۱۷۲	بیس سال کی عمر میں حدیث پڑھنے کی وجہ	۳۱۴
۱۷۳	علم حدیث میں امام اعظم کی سہولت	۳۱۵
۱۷۴	امام مسعر بن کدّام کی شہادت	۳۱۶
۱۷۵	علم حدیث میں امام مسعر بن کدّام کا مقام	۳۱۷
۱۷۶	امام یحییٰ کی زبانی امام اعظم کی اعلیٰیت کا اعتراف	۳۱۸
۱۷۷	امام اعظم کے حدیث میں اساتذہ	۳۱۹
۱۷۸	امام اعظم کے اساتذہ حدیث کی عظمت	۳۲۰
۱۷۹	اساتذہ کی عظمت سے تلامذہ کی عظمت کا اندازہ	۳۲۱
۱۸۰	امام اعظم کی برتری کی ادنیٰ شہادت	۳۲۲
۱۸۱	مملکت اسلامی میں حدیث کی درسگاہیں	۳۲۳
۱۸۲	علم حدیث کی صبح صادق کا طلوع	۳۲۴
۱۸۳	امام اعظم کے اساتذہ میں پہلا طبقہ	۳۲۵
۱۸۴	محدثین کے نزدیک عدم صحت موضوع ہونے کو مستلزم نہیں ہے	۳۲۶
۱۸۵	حدیث کے صحیح نہ ہونے کا مطلب	۳۲۷
۱۸۶	حدیث ضعیف کی بھی دو قسمیں ہیں	۳۲۸
۱۸۷	حدیث افراق کے بارے میں فیروز آبادی کا دعویٰ	۳۲۹
۱۸۸	صحابہ سے شرفِ روایت	۳۳۰
۱۸۹	صحابہ سے روایت کے بارے میں ثبوت مستند ہے	۳۳۱

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۸۱	امام اعظم کا انس بن مالک سے تلمذ	۳۳۲
۱۸۲	حضرت انس بن مالک کا اجمالی سوانحی چہرہ	۳۳۳
۱۸۳	حضرت انس سے امام اعظم کی روایت طلب علم	۳۳۴
۱۸۴	امام اعظم کا عبداللہ ابن الحارث سے تلمذ	۳۳۵
"	امام اعظم کی زبانی عبداللہ سے ملاقات کا واقعہ	۳۳۶
۱۸۵	عبداللہ سے امام اعظم کے سماع کی تصریح	۳۳۷
"	عبداللہ بن الحارث کی تاریخ وفات	۳۳۸
"	حافظ ابو بکر الجعابی علی حدیث اور تاریخ رجال کے امام ہیں	۳۳۹
۱۸۶	عبداللہ ابن ابی اوفیٰ سے امام اعظم کا تلمذ	۳۴۰
۱۸۷	تکمل روایت کی عمر اور محدثین کا نقطہ نظر	۳۴۱
۱۸۸	انصال روایت کی شرط اور بخاری و مسلم	۳۴۲
۱۸۹	کوفہ میں علم حدیث	۳۴۳
"	کوفہ میں صحابہ کرام	۳۴۴
۱۹۳	بخاری شریف میں کوفہ کے رہنے والے راویوں کی تعداد	۳۴۵
۱۹۴	کوفہ کے محدثین کی تذکرۃ الحفاظ سے فہرست	۳۴۶
۱۹۵	علامۃ الثابعین امام شعبی سے تلمذ	۳۴۷
۱۹۶	حدیث کی زبانی یادداشت کا دور	۳۴۸
۱۹۹	امام حماد بن سلیمان سے امام اعظم کا تلمذ	۳۴۹
۲۰۲	تاریخ کا ایک المناک حادثہ	۳۵۰
۲۰۳	امام حماد پر ارجار کی تہمت	۳۵۱
۲۰۴	حافظ سیوطی کی زبانی ارجار کی حقیقت	۳۵۲
۲۰۹	ابو اسحاق السبعی سے تلمذ	۳۵۳
۲۲۱	الامام الحافظ شیبان سے امام صاحب کا تلمذ	۳۵۴
۲۱۲	الحکم بن عقیبہ سے امام اعظم کا تلمذ	۳۵۵

صفحہ	عنوان	نمبر
۲۱۴	امام اعظم کا طلب علم کے لیے سفر	۳۵۶
۲۱۵	علم کی خاطر اسلام میں سفر کی اہمیت	۳۵۷
۲۱۶	حدیث اور فقہ کا باہمی تعلق	۳۵۸
"	فقہ و حدیث کا تعلق شاہ ولی اللہ کی زبانی	۳۵۹
۲۱۷	فقہ و حدیث کا تعلق علامہ خطابی کی زبانی	۳۶۰
۲۲۳	رحلت علمیہ کی تاریخ	۳۶۱
۲۲۴	امام اعظم کے اسفار حج کی تعداد	۳۶۲
"	لیث بن سعد کی امام اعظم سے پہلی ملاقات	۳۶۳
۲۲۵	مکہ میں امام اعظم کے ارد گرد اہل فقہ اور محدثین کا ہجوم	۳۶۴
۲۲۶	مکہ میں امام اعظم کا چار سال نو ماہ قیام	۳۶۵
۲۲۶	حجاز میں امام اعظم کے علمی مشاغل	۳۶۶
۲۲۷	محدث اور فقیہ میں جوہری فرق	۳۶۷
۲۲۸	حدیث اور روایت حدیث میں امتیاز	۳۶۸
۲۲۹	روایت و اسناد سے پہلے حدیث کا مقام	۳۶۹
۲۳۱	اسناد و روایت کے فن میں وسعت	۳۷۰
۲۳۱	جو حدیث ابو حنیفہ کو ایک یاد و واسطوں سے ملی ہے	۳۷۱
"	وہ امام بخاری و مسلم کو چھ واسطوں سے ملی	۳۷۲
۲۳۳	صحابہ اور کبار تابعین میں کوئی ضعیف نہ تھا	۳۷۳
۲۳۴	مکہ مکرمہ کی علمی حیثیت	۳۷۴
"	حرمین کے عمل پر اعتماد اور امام بخاری کا مسلک	۳۷۵
۲۳۵	امام اعظم کا عطاء ابن ابی رباح سے تلمذ	۳۷۶
۲۳۶	عطاء ابن ابی رباح سے امام اعظم کی پہلی ملاقات	۳۷۷
۲۳۸	عطاء ابن ابی رباح کی علمی وسعت پر ایک ضروری تہنیت	۳۷۸
۲۳۹	عمر بن دینار سے امام اعظم کا تلمذ	۳۷۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۲۴۰	حکومت اور عدالت	۳۸۰
۲۴۱	عمرو بن دینار مکی اور عمرو بن دینار بصری	۳۸۱
۲۴۲	حافظ ابو الزبیر محمد بن مسلم سے امام اعظم کا تلمذ	۳۸۲
۲۴۴	مدینہ مکرّمہ کی علمی حیثیت	۳۸۳
"	مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ	۳۸۴
۲۴۵	عمر بن عبد العزیز کی مدینہ میں مشاورتی کونسل	۳۸۵
"	فقہاء سبعہ پر ابن العمامہ حنبلی کا نوٹ	۳۸۶
۲۴۷	مدینے کے علم و عمل پر اعتماد	۳۸۷
۲۵۰	خواجگاہ نبوت کی زیارت اور مسجد نبوی میں عبادت	۳۸۸
۲۵۳	الحافظ ابو عبد اللہ نافع العدوی سے تلمذ	۳۸۹
۲۵۵	روایت میں راویوں کا تعبیری اختلاف	۳۹۰
۲۵۶	احادیث فقہ اور روایات حدیث	۳۹۱
۲۵۸	ابو بکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری سے تلمذ	۳۹۲
۲۵۹	محدثین کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح سند	۳۹۳
۲۶۰	ایک لطیف نکتہ	۳۹۴
"	قاسم بن محمد کی شان علمی	۳۹۵
۲۶۲	عمرہ بنت عبد الرحمن کا علمی مقام	۳۹۶
۲۶۴	باب امام اعظم نے امام مالک سے روایت لی ہے؟	۳۹۷
۲۶۷	اشہب کی روایت سے غلط فہمی اور اس کی حقیقت	۳۹۸
۲۶۹	اصح الاسانید کے موضوع پر حافظ مغلطی کی تحقیق	۳۹۹
۲۷۱	امام مالک کی نظر میں امام اعظم کا مقام	۴۰۰
۲۷۲	بصرہ اور اس کی علمی حیثیت	۴۰۱
۲۷۵	الامام ابو بکر ایوب بن ابی تمیمہ السخیتی	۴۰۲
۲۷۷	حدیث میں امام اعظم کا نمایاں مقام	۴۰۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۲۸۰	مجہول اور ضعیف راویوں سے روایت	۴۰۴
۲۸۲	علم اسناد و روایت میں مجہول کا مسئلہ	۴۰۵
۲۸۳	مجہول کی قسمیں اور اس پر علماء کی اراار	۴۰۶
۲۸۵	امام اعظم کی ضعف سے روایت ان کی تعدیل ہے	۴۰۷
۲۸۶	ضعیف روایات کا درجہ شواہد اور توابع کا ہے	۴۰۸
۲۹۰	خطا اور غلطی سے کوئی پاک نہیں ہے	۴۰۹
۱۹۱	موضح اوہام الجمع والتفریق میں امام بخاری کے اوہام	۴۱۰
۲۹۲	تذکرۃ الحفاظ میں امام اعظم کے مشائخ	۴۱۱
۲۹۵	تذکرہ الحفاظ کا علمی مقام	۴۱۲
۲۹۷	امام اعظم کا حفاظ حدیث میں مقام	۴۱۳
۲۹۹	امام اعظم ابو حنیفہ اور اسناد عالی	۴۱۴
۳۰۱	اسناد عالی کی تلاش سلف کی سنت ہے	۴۱۵
۳۰۲	اسناد عالی کے استحباب پر حدیث سے استدلال	۴۱۶
۳۰۴	امام اعظم کی احادیث	۴۱۷
۳۰۶	اسناد عالی کی دوسری قسمیں	۴۱۸
۳۰۹	امام اعظم کی ثنائیات اور کتاب الآثار سے نمونہ	۴۱۹
۳۱۰	امام اعظم کی ثلاثیات	۴۲۰
۳۱۱	امام بخاری کی ثلاثیات اور ان کے ذرائع	۴۲۱
۳۱۳	امام مکی بن ابراہیم اور امام بخاری کی ثلاثیات	۴۲۲
۳۱۴	الضحاک بن مخلد اور امام بخاری کی ثلاثیات	۴۲۳
۳۱۵	امام اعظم کی رباعیات اور ان کا درجہ	۴۲۴
۳۱۶	تاریخ تدوین حدیث اور ضبط کے تین دور	۴۲۵
۳۱۷	طرق واسانید حدیث کی تعداد محدثین کی زبانی	۴۲۶
۳۱۸	احادیث صحیحہ کی محدثین کی بیان کردہ تعداد	۴۲۷

صفحہ	عنوان	شمارہ
۳۱۸	قرآن کی ۶۲۳۶ آیتیں اور ۴۴۰۰ حدیثیں	۴۲۸
۳۲۰	احادیث یاد کرنے کا سلف میں رواج	۴۲۹
۳۲۱	تدوین حدیث اور عمر بن عبدالعزیز	۴۳۰
۳۲۲	جمع قرآن اور صحابہ کی مساعی جلیلہ	۴۳۱
۳۲۴	جامع القرآن کا حضرت عثمان کے لیے لقب	۴۳۲
۳۲۵	۹۸۷ سے ۹۸۸ تک موضوع حدیث پر علمی سرمایہ	۴۳۳
۳۲۶	عمر بن عبدالعزیز کا تدوین حدیث کے لیے سرکلہ	۴۳۴
۳۲۰	اسلام کے علمی سرمایہ پر حافظ ابن حزم کا بیان	۴۳۵
۳۳۱	فرمان خلافت میں حدیث عمر کا اضافہ	۴۳۶
"	اسلام میں خلفاء راشدین کی سنت	۴۳۷
۳۳۶	جمع قرآن بیان قرآن پر ایک اہم تفسیری نکتہ	۴۳۸
۳۳۶	آیت جمع کی تفسیر ابن عباس اور شاہ ولی اللہ کی تنقید	۴۳۹
۳۳۷	ان علینا جمع کی شاہ ولی اللہ کی بیان کردہ تشریح	۴۴۰
۳۴۱	عمر اول اور عمر ثانی کے عمل میں ہم آہنگی	۴۴۱
۳۴۲	تدوین حدیث کی اولیت کا شرف	۴۴۲
"	دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث	۴۴۳
۳۴۵	امام اعظم شراعت کے مدون اول ہیں	۴۴۴
۳۴۷	حدیث میں امام اعظم کی تصنیف	۴۴۵
"	کتاب الآثار کا طریق تالیف املائی ہے	۴۴۶
۳۴۸	املائی طریق میں تلامذہ کے لیے محدثین کی تعبیری زبان	۴۴۷
۳۴۹	کتاب الآثار کے نسخے اور اس کی روایات	۴۴۸
۳۵۰	کتاب الآثار بروایت امام محمد اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۴۹
۳۵۳	کتاب الآثار بروایت ابی یوسف اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۵۰
۳۵۵	کتاب الآثار بروایت امام زفر اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۵۱

صفحہ	عنوان	نمبر
۳۵۷	کتاب الآثار بروایت حسن بن زیاد اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۵۲
۳۵۸	ناموں کی تصحیف پر ایک ضروری توضیح	۴۵۳
۳۶۰	کتاب الآثار کی روایتی صحت	۴۵۴
۳۶۱	کتاب الآثار کی علمی حیثیت	۴۵۵
۳۶۳	کتاب الآثار کا تاریخی مقام	۴۵۶
۳۶۵	کتاب الآثار کی امتیازی حیثیت	۴۵۷
۳۶۷	کتاب الآثار کی مقبولیت	۴۵۸
۳۶۹	کتاب الآثار کا اس دور کے محدثین پر اثر	۴۵۹
۳۷۱	کتاب الآثار کی مسانید کے نام پر قلمی خدمت	۴۶۰
۳۷۳	البواب اور مسانید کا فرق	۴۶۱
۳۷۵	حافظ محمد بن مخلد جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۲
۳۷۶	حافظ ابوالعباس احمد بن محمد جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۳
۳۷۸	حافظ عبداللہ الحارثی بخاری جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۴
۳۸۰	حافظ محمد بن ابراہیم الاصفہانی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۵
۳۸۱	حافظ ابوالحسن محمد بن المنظر جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۶
۳۸۲	حافظ ابوعبداللہ حسین بن محمد جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۷
۳۸۳	حافظ ابو نعیم الاصفہانی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۸
۳۸۴	حافظ ابن ابی العوام جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۹
"	حافظ ابن عدی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۰
۳۸۵	حافظ ابوالحسن اشعری جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۱
"	حافظ ابوبکر بن عبدالباقی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۲
۳۸۷	حافظ طلحہ بن محمد جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۳
"	حافظ ابن عساکر دمشقی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۴
۳۸۸	حافظ عیسیٰ جعفری مغربی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۵

صفحہ	عنوان	شمارہ
۳۸۹	محدث خوارزمی کا ترتیب داوہ جامع المسانید	۴۷۶
۳۹۰	اظراف حافظ ابن القیسرانی	۴۷۷
۳۹۱	مسانید امام اعظم کی شرحیں	۴۷۸
۳۹۲	حدیث کا دوسرا مجموعہ موطا امام مالک	۴۷۹
۳۹۳	کتب حدیث میں موطا کا مقام	۴۸۰
۳۹۶	موطا کی وجہ ترجیح	۴۸۱
۳۹۷	موطا کے روایتی تسلسلے کی مرکزی شخصیتیں	۴۸۲
۳۹۸	جامع معمر بن راشد اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۸۳
۴۰۲	جامع سفیان الثوری اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۸۴
۴۰۲	اس دور کی اور کتابیں	۴۸۵
۴۰۵	کتاب السنن محمد بن جریر	۴۸۶
۴۰۶	کتاب الفرائض محمد بن مقسم	۴۸۷
۴۰۷	کتاب السنن لزامدہ ابن قدامہ	۴۸۸
"	کتاب السنن یحییٰ ابن زکریا	۴۸۹
۴۰۸	کتاب السنن وکیع بن الجراح	۴۹۰
۴۰۹	کتاب السنن سعید بن ابی عروبہ	۴۹۱
۴۱۰	کتاب التفسیر علیہ بن بشر	۴۹۲
"	کتاب الزہد عبد اللہ بن المبارک	۴۹۳
۴۱۲	سیرت و منغازی اور ان کی حیثیت	۴۹۴
"	فقہ و شرائع اور ان کی تاریخی حیثیت	۴۹۵
۴۱۸	فقہ و شرائع میں امام اعظم کی تصانیف	۴۹۶
۴۱۹	۱۰۲ سے سن لکھ تک حدیث	۴۹۷
۴۲۱	دوسری صدی کے مصنفین اور ان کی کتابیں	۴۹۸
۴۲۳	مصنفین اور تلامذہ امام اعظم	۴۹۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۲۲۵	تیسری صدی میں علم حدیث	۵۰۰
۲۲۶	علم حدیث میں کثرت طرق	۵۰۱
۲۲۶	محدثین و حفاظ حدیث کے مراتب	۵۰۲
۲۲۸	حدیث میں موافقات کا توسع	۵۰۳
۲۲۸	علم حدیث میں مسانید کی تالیف	۵۰۴
۲۳۰	مصنفین مسانید کا پیش ہناؤ	۵۰۵
۲۳۱	تیسری صدی کے مسانید کی فہرست اجمالی	۵۰۶
۲۳۱	مسانید کی تصنیف میں شرف اولیت	۵۰۷
۲۳۲	عبید اللہ بن موسیٰ کا تیشیع اور محدثین کے یہاں اس کا مطلب	۵۰۸
۲۳۳	مسند امام احمد بن حنبل کی عظمت	۵۰۹
۲۳۶	کیا مسند امام احمد میں موضوع حدیثیں بھی ہیں؟	۵۱۰
۲۳۷	مسند امام بقی بن مخلد کی وسعت	۵۱۱
۲۳۹	علم حدیث میں مصنفات	۵۱۲
۲۴۰	مصنف عبد الرزاق اور اس کی تاریخی حیثیت	۵۱۳
۲۴۱	امام عبد الرزاق کو امام اعظم سے شرف تلمذ	۵۱۴
۲۴۱	مصنف ابن ابی شیبہ اور اس کی روایتی حیثیت	۵۱۵
۲۴۲	مصنف ابن ابی شیبہ کی خصوصیات	۵۱۶
۲۴۲	امام مالک اور امام لیث بن سعد کی خط و کتابت	۵۱۷
۲۴۶	امام ابو حنیفہ کی کتاب السیر پر امام اوزاعی کی تنقید	۵۱۸
۲۴۸	تیسری صدی ہجری میں صحاح کی تدوین	۵۱۹
۲۵۰	ابن ماجہ، سنن دارمی یا موطا کا صحاح ستہ میں شمار	۵۲۰
۲۵۲	صحیح امام بخاری اور صحیح امام مسلم کا علم حدیث میں مقام	۵۲۱
۲۵۵	محدثین کرام کے نزدیک صحیحین کا مقام	۵۲۲
۲۵۶	صحیحین میں صحت حدیث کا معیار	۵۲۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۴۵۶	الترام صحت اور اس کا مطلب	۵۲۴
۴۵۷	بخاری و مسلم کی شرطیں اور علماء کی آراء	۵۲۵
۱۶۱	ملقی امت بالقبول اور صحیحین	۵۲۶
۴۶۵	بخاری و مسلم کا صحیحیت میں مقابلہ بعد میں آنے والوں سے ہے	۵۲۷
۴۶۶	صحیح بخاری کا پورا نام اور اس کی سب سے بڑی خوبی	۵۲۸
۴۶۸	صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں موازنہ	۵۲۹
۴۷۱	حدیث میں امام مسلم کا مقام	۵۳۰
۴۷۳	سنن نسائی اور صحاح میں اس کا مقام	۵۳۱
۴۷۶	سنن ابی داؤد کا صحاح میں مقام	۵۳۲
۴۷۹	سنن ابی داؤد کی فقہ میں اونچی ہونے کی وجہ	۵۳۳
۴۸۰	سنن ترمذی کا صحاح ستہ میں درجہ	۵۳۴
۴۸۱	ترمذی میں صحیح کے ساتھ حسن اور غریب کی اصطلاح	۵۳۵
۴۸۲	ترمذی کے بارے میں ایک اہم سوال	۵۳۶
۴۸۷	صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کا مقام	۵۳۷
۴۸۹	مؤلفین صحاح کے نقطہ نظر کا تالیف میں اختلاف	۵۳۸
۴۸۹	امام بخاری کا صحیح کی تصنیف میں نقطہ نظر	۵۳۹
۴۹۱	امام مسلم کا صحیح کی ترتیب میں مطمح نظر	۵۴۰
"	امام ابو داؤد کا سنن کی تالیف میں مقصد	۵۴۱
۴۹۲	امام ابو عیسیٰ ترمذی کا سنن کی تالیف میں پیش نہاد	۵۴۲
۴۹۳	امام نسائی کا کتاب کی تالیف میں مسلک	۵۴۳
۴۹۴	امام ابن ماجہ کا مطمح نظر	۵۴۴
۴۹۴	صحاح ستہ کی علمی خدمت	۵۴۵
۴۹۵	مستخرجات صحیحین اور استخراج کے فوائد	۵۴۶
۴۹۶	احادیث صحیحین کے طرق و اسانید کی تعداد	۵۴۷

صفحہ	عنوان	شمارہ
۴۹۸	صحیحین اور دوسری کتابوں کے اطراف	۵۴۸
۴۹۹	دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین حدیث	۵۴۹
۵۰۰	تیسری صدی کے محدثین کا چہرہ شاہ ولی اللہ کی زبانی	۵۵۰
۵۰۱	حجۃ اللہ میں بیان کردہ دوسری صدی کے محدثین کا حال	۵۵۱
۵۰۳	دوسری اور تیسری صدی میں صحت حدیث کا معیار	۵۵۲
۵۰۵	دوسری صدی کے ائمہ حدیث اور احادیث مرسلہ	۵۵۳
۵۱۰	افراد و غرائب اور تیسری صدی کے محدثین	۵۵۴
۵۱۱	ابوداؤد و ترمذی کی حدیث قلتین	۵۵۵
۵۱۳	سنن ابی داؤد کی حدیث ثانیین	۵۵۶
۵۱۵	صحیحین کی حدیث خیار مجلس	۵۵۷
۵۱۸	امام اعظم ابو حنیفہ اور حدیث کی صحت	۵۵۸
۵۱۹	راوی کے ضبط صدر کی اہمیت اور اس کی شرط	۵۵۹
۵۲۰	ضبط کا مفہوم اور اس کی محدثین کی نظر میں سنگینی	۵۶۰
۵۲۲	امام اعظم اور رد و قبول روایت	۵۶۱
۵۲۵	آئینی و قانونی لحاظ سے احادیث کی شہرت	۵۶۲
۵۲۷	امام اعظم اور اہل ہوی سے روایت	۵۶۳
۵۳۳	جہر بسملہ کے بارے میں حافظ زبلی کا خالص محدثانہ نقطہ نظر	۵۶۴
۵۳۴	جرح و تعدیل رواۃ حدیث اور امام اعظم	۵۶۵
۵۳۶	علامہ سخاوی کی جرح و تعدیل پر ایک مورخانہ دستاویزہ	۵۶۶
۵۳۷	جرح و تعدیل کے موضوع پر امام ترمذی کا امام اعظم سے استدلال	۵۶۷
۵۳۸	امام اعظم اور جابر جعفی کی تصنیف	۵۶۸
۵۴۰	زید بن عیاش اور امام مالک اور ابو حنیفہ کا اختلاف	۵۶۹
۵۴۱	اسماء الرجال اور امام اعظم	۵۷۰
۵۴۵	تخل روایت حدیث اور امام اعظم	۵۷۱

صفحہ	عنوان	شمارہ
۵۴۶	تحمل روایت کے طرق	۵۷۲
۵۴۶	سماح و عرض	۵۷۳
۵۵۱	تحمل روایت اور اجازت	۵۷۴
۵۵۲	تحمل روایت اور مناولہ	۵۷۵
۵۵۲	حدیث شاذ اور امام اعظم	۵۷۶
۵۵۹	روایت بالمعنیٰ اور امام اعظم	۵۷۷
۵۶۲	حفظ کالفاظ سے اور معرفت کامعانی سے تعلق ہے	۵۷۸
۵۶۲	روایت بالمعنیٰ کی اجازت اور اس کی ضروری شرطیں	۵۷۹
۵۶۵	روایت بالمعنیٰ کے جواز کے لیے علماء کے بیان کردہ نتائج	۵۸۰
۵۶۹	روایت بالمعنیٰ کا دائرہ کار وسیع ہونے سے علماء کی پریشانی	۵۸۱
۵۷۳	مراتب حدیث اور امام اعظم کا مسلک	۵۸۲
۵۷۴	تواتر اسناد پر اصول حدیث کے علماء کی آراء	۵۸۳
۵۷۶	تواتر عمل اور ان کی قانونی طاقت	۵۸۴
۵۷۷	حدیث ضعیف کو اگر تواتر عمل کی تائید ہو تو وہ صحیح قرار پاتی ہے	۵۸۵
۵۷۸	تواتر قدر مشترک، تواتر معنوی کی حقیقت	۵۸۶
۵۸۰	اخبار آحاد کی حجیت اور امام اعظم	۵۸۷
۵۸۲	اخبار آحاد کا معیار احتجاج	۵۸۸
۵۸۵	معیار احتجاج میں اصحاب روایت اور ارباب درایت کا مسلک	۵۸۹
۵۸۶	سند سے متعلق تحقیق محدثین کا اور متن سے متعلق تنقیح فقہاء کا کام ہے	۵۹۰
۵۸۷	صحت حدیث کے ساتھ قبولیت حدیث کی شرطیں	۵۹۱
۵۸۸	قبولیت حدیث کی پہلی شرط کہ مسلمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو	۵۹۲
۵۹۱	حدیث مسیح عمامہ اور اس کے مسلمہ اصولوں سے تصادم	۵۹۳
۵۹۱	کیا ہر حدیث بجائے خود ایک اصول ہے؟	۵۹۴
۵۹۲	حدیث کذبات ابراہیم اور اس پر الجزائری کی تنقید	۵۹۵

صفحہ	عنوان	شمارہ
۵۹۳	معانی قرآن سے متصادم حدیث	۵۹۶
۵۹۴	حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ متعدد اور متباہن ہوتی ہیں	۵۹۷
۵۹۴	حدیث المتباہیان کی محدثانہ اور فقیہانہ تعلیل	۵۹۸
۵۹۷	حدیث کی مقبولیت میں معانی قرآن سے تصادم علتِ قاطعہ ہے	۵۹۹
۵۹۸	حدیث مصراۃ اور معانی قرآن سے اس کا معارضہ	۶۰۰
۵۹۹	حدیث مصراۃ اور سنت مشہورہ سے اس کا معارضہ	۶۰۱
۶۰۲	حدیث مصراۃ اور اس پر امام اعظم کے موقف کی غلط ترجمانی	۶۰۲
۶۰۴	سنت مشہورہ سے معارضہ حدیث	۶۰۳
۶۰۵	سنت مشہورہ سے معارضہ اور حدیث عمر بن سلمہ	۶۰۴
۶۰۸	اخبارِ آحاد کا توارث سے معارضہ اور امام اعظم کا موقف	۶۰۵
۶۱۱	حدیث بسملہ کی تعلیل اور حافظ ابن تیمیہ کا جواب	۶۰۶
۶۱۳	احادیث رفع یدین کا توارث سے معارضہ	۶۰۷
۶۱۴	علامہ معین الدین سندھی کا خدشہ اور اس کا جواب	۶۰۸
۶۱۷	اعمال و اقوال صحابہ کا اسلام میں مقام	۶۰۹
۶۲۰	اخبارِ آحاد میں مفاہمت اور امام اعظم	۶۱۰
۶۲۶	رفع یدین کی مختلف حدیثوں میں مصالحت	۶۱۱
۶۲۸	ہبہ کی واپسی پر احادیث میں مفاہمت	۶۱۲
۶۲۹	ارشادِ نبوت اور صحابی کے فتویٰ میں مفاہمت	۶۱۳
۶۳۰	احمد حسین کراچی، اپر فکری اختلاف کی بنا پر جرح	۶۱۴
۶۳۱	ولوغ کلب پر ابو ہریرہ کا فتویٰ اور امام بیہقی کی معذرت	۶۱۵
۶۳۲	نعیم بن حماد پر وضع حدیث کا الزام	۶۱۶
۶۳۵	جماعت کھڑی ہو جانے پر سنتیں پڑھنا اور حدیث ابی ہریرہؓ	۶۱۷
۶۳۷	مختلف اوقات میں سنتوں کی ادائیگی پر نیکر	۶۱۸
۶۳۸	صبح کی سنتوں کی ادائیگی پر آثارِ صحابہ	۶۱۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۶۴۰	قیس بن فہد کے واقعہ کا غلط استعمال	۶۲۰
۶۴۱	وجہ ترجیح احادیث اور امام اعظم	۶۲۱
۶۴۲	کیا مختلف احادیث میں فقہیت وجہ ترجیح ہے؟	۶۲۲
۶۴۵	فقہیت صحت روایت کی نہیں بلکہ ترجیح کی شرط ہے	۶۲۳
۶۴۷	رفع یدین کے موضوع پر امام ابو حنیفہ اور امام اوزاعی کی گفتگو	۶۲۴
۶۴۷	واقعہ کی روایتی حیثیت اور علامہ سندھی کا چیلنج	۶۲۵
۶۴۹	علو اسناد سے ہٹ کر فقہیت کیوں وجہ ترجیح ہے	۶۲۶
۶۵۰	حنفیہ کے نزدیک وجہ ترجیح فقہیت ہے اکثریت نہیں ہے	۶۲۷
۶۵۱	حدیث ضعیف اور امام اعظم	۶۲۸
۶۵۲	متقدمین میں امام ترمذی سے پہلے حدیث کی تقسیم ثنائی تھی	۶۲۹
"	متقدمین اور متاخرین کی حسن میں فرق	۶۳۰
۶۵۳	رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث پر عمل حنفیہ کا مذہب ہے	۶۳۱
"	ضعیف پر عمل میں امام ابو حنیفہ اور امام احمد میں ہم آہنگی	۶۳۲
"	ضعیف سے متقدمین کی اصطلاحی ضعیف مراد ہے	۶۳۳
۶۵۶	حدیث قہقہہ سے وضو ٹوٹنے پر استدلال	۶۳۴
۶۵۷	نبیذ ثمر سے وضو کی حدیث اور اس کی تحقیق	۶۳۵
۶۵۸	مقدار ایام حیض پر حدیث ضعیف اور اس سے استدلال	۶۳۶
۶۵۹	ضعیف پر عمل کے بارے میں ارباب روایت کے مسائل	۶۳۷
۶۶۱	حدیث ضعیف پر عمل کرنے کی تین شرطیں	۶۳۸
۶۶۲	ضعیف پر عمل اور علامہ دوانی کا شبہ اور اس کا جواب	۶۳۹
۶۶۳	دوانی کے شبہ پر علامہ خفاجی کا جواب	۶۴۰
"	علامہ خفاجی کے جواب پر مولانا عبدالحی کی تنقید	۶۴۱
۶۶۵	دوانی کے شبہ کا خود دوانی کا دیا ہوا جواب	۶۴۲
۶۶۶	حدیث و قیاس میں تعارض اور امام اعظم	۶۴۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۶۶۷	قیاس کی شریعت پر علماء کی آراء	۶۴۴
۶۷۰	خبر واحد اور قیاس میں تعارض پر امام اعظم کے موقف کی توضیح	۶۴۵
۶۷۱	فخر الاسلام کی جانب سے امام اعظم کے مسلک کی غلط ترجمانی	۶۴۶
۶۷۲	صدر الاسلام کی جانب سے امام اعظم کے مسلک کی صحیح ترجمانی	۶۴۷
۶۷۳	شیخ ابوالحسن کمرخی کی جانب سے صدر الاسلام کی تائید	۶۴۸
۶۷۴	علم حدیث میں امام اعظم کے اصول اور ان کی تاریخی حیثیت	۶۴۹
۶۷۵	صحت حدیث کے اصول اور قبولیت حدیث کے ضوابط	۶۵۰
	جیسے صحت کے موضوع پر قوانین تخریجی ہیں ایسے ہی قبولیت کے موضوع پر	۶۵۱
۶۷۶	اصول تخریجی ہیں	
"	دوسرے علوم کی طرح حدیث بھی ایک علم ہے	۶۵۲
"	شاہ ولی اللہ کا بے محل سہارا اور اس پر تفصیلی بحث	۶۵۳
۶۸۰	شاہ صاحب کا منشا اور خود ان کی زبانی اس کی تعیین	۶۵۴
۶۸۳	اصول و ضوابط صحت و قبولیت حدیث	۶۵۵
۶۸۳	مجتہدین کے پیش نظر شریعت کا پورا نظام ہوتا ہے	۶۵۶
"	مجتہدین اس حیثیت میں انبیاء سے مشابہت رکھتے ہیں	۶۵۷
۶۸۷	تلامذہ حدیث اور امام اعظم	۶۵۸
۶۹۳	الحافظ یحییٰ ابن زکریا بن ابی زائدہ اور ان کی محدثانہ شان	۶۵۹
۶۹۵	الحافظ عبداللہ بن یزید ابو عبد الرحمن المقرئ اور ان کی محدثانہ شان	۶۶۰
۶۹۶	امام مقرئ سے متعلق ابن ابی حاتم کا مغالطہ	۶۶۱
۶۹۹	الحافظ الامام عبداللہ بن المبارک کی محدثانہ شان	۶۶۲
۷۰۲	یتیم فی الحدیث کا مطلب	۶۶۳
۷۰۴	الامام الحافظ ابراہیم بن طہمان	۶۶۴
۷۰۶	محدثین کی اصطلاحی زبان میں ارجام کی حقیقت	۶۶۵
۷۰۷	الامام الحافظ مکی بن ابراہیم	۶۶۶

صفحہ	عنوان	شمارہ
۷۱۰	الامام الحافظ الضحاك بن مخلد البوصام النبيل	۶۶۷
۷۱۳	الامام الحافظ نريد بن يارون	۶۶۸
۷۱۵	الامام الحافظ وكيع بن الجراح	۶۶۹
۷۱۸	الامام الحافظ علي بن مسهر	۶۷۰
۷۱۹	الامام الحافظ حفص بن غياث	۶۷۱
۷۲۲	الامام الحافظ متعيم بن بشير	۶۷۲
۷۲۴	محدثين كرام امام اعظم سے علمی رشتہ	۶۷۳



اہم تعلقات و حواشی کی فہرست

صفحہ	عنوان	نمبر
۴۷	عماد الدین ابن کثیر حافظ کا چہرہ	۱
۴۸	آیت امتحان میں دلیل محبت اور فائدہ محبت کا بیان	۲
۴۹	ابو موسیٰ اشعری عبداللہ بن قیس کا چہرہ	۳
۵۱	حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ... الخ کی تخریج اور امام شافعی کی تشریح	۴
۵۲	علامہ سندھی ابوالحسن نور الدین محمد بن عبد الہادی کا ترجمہ	۵
۶۳	قرآن سب سے پر تشریحی نوٹ	۶
۶۷	امام الحرمین دو عظیم المرتبت شخصیتوں کا لقب ہے	۷
۶۹	قرآن نظم اور معنی دونوں کا نام ہے	۸
۷۱	الرسالہ کی حیثیت اور اس کی تالیف کا پس منظر	۹
۷۷	حافظ جلال الدین السیوطی کا تعارف	۱۰
۸۱	حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری کا چہرہ	۱۱
۸۵	امام ابو داؤد اور امام دارمی کا تعارف	۱۲
۸۸	حافظ ابن عبد البر ابو عمر و قرطبی کا تعارف	۱۳
۹۲	امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی کا چہرہ	۱۴
۹۵	عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی اصول کی روشنی میں تشریح	۱۵
۹۶	امیر المؤمنین فی الحدیث محمد بن اسماعیل البخاری کا تعارف	۱۶
۹۷	امام حماد بن سلمہ کا محدثین کی زبانی تعارف	۱۷
"	مشہور ناقد ابو عبد اللہ ذہبی کا چہرہ	۱۸

صفحہ	عنوان	نمبر
۹۸	مشہور صفوی امام حسن بصری کا تعارف اور محدثین میں مقام	۱۹
۱۰۰	آیت قرآنی بل هو آیات بینات سے صراطِ مستقیم کا استنباط	۲۰
۱۱۹	امام ابو حنیفہ کو امام اعظم کے لقب سے یگانے اور بیگانے پکارتے ہیں	۲۱
//	حافظ ابن حجر مکی کا چہرہ	۲۲
۱۲۱	ابن خلکان کا نام لقب مولد و مسکن اور وجہ تسمیہ	۲۳
۱۲۲	ابوزکریا یحییٰ بن اسحاق نووی کا علمی مقام	۲۴
//	ولاء اور اس کی قسمیں ولاء اسلام ولاء حلف، ولاء لزوم	۲۵
۱۲۳	امام الحسین بن علی ابو عبد اللہ صغیری کا تعارف	۲۶
//	ابو خازم عبد الحمید بن قاضی عبدالعزیز کا حکمیہ	۲۷
۱۲۵	حدیث ابی ہریرہ لو کان العلم بالشر یا پر نوٹ	۲
۱۲۶	حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث کا علمی و عملی چہرہ	۲۹
۱۲۸	امام مسلم بن الحجاج ابو الحسین کا تعارف	۳۰
//	امام اہل السنۃ احمد بن حنبل الشیبانی کا تعارف	۳۱
۱۳۲	اولو العزم من الرسل کی تشریح اور ان کی تعداد	۳۲
۱۳۳	عدالت کی لغوی تحقیق اور اس کے مختلف اطلاقات	۳۳
۱۳۴	عبداللہ بن مسعود کا روایت حدیث میں مقام	۳۴
۱۳۶	خیر القرون قرنی میں جمہور کا مسلک	۳۵
۱۳۸	تابعی کی تعریف پر شبہ اور اس کا الزام	۳۶
۱۴۰	حدیث کے ضعیف ہونے کا محدثین کے یہاں مطلب	۳۷
۱۴۱	حافظ زین الدین عراقی کا اجمالی ترجمہ	۳۸
۱۸۳	حدیث طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم کی تخریج اور اس کے طرق	۳۹
//	حرم میں امام اعظم کی عبداللہ بن الحارث سے ملاقات	۴۰
۱۶۱	مشہور محدث عفان بن مسلم کا چہرہ	۴۱
۲۰۶	موطا امام محمد کی روایتی و تاریخی حیثیت	۴۲
۲۰۸	ترک رفع یدین پر حدیث ابن مسعود اور مختلف طریقوں سے اس کی تخریج	۴۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۲۱۱	امام الحدیث علی بن الجعد کا چہرہ	۴۴
۲۱۵	آیت نفر سے مختلف مسائل کا استنباط	۴۵
۲۱۸	حدیث اور روایت حدیث میں جوہری فرق	۴۶
۲۱۹	تلاش علم کے لیے چلنا و طرح کا ہے	۴۷
۲۲۱	خلف بن ایوب فقیہ و محدث کا تعارف اور ان کا مقام	۴۸
۲۳۵	اخلاقی مسائل میں عملِ حرمین کا علمی مقام	۴۹
۲۵۱	زیارۃ قبر النبی پر حدیث ابن عمر اور اس کی تصحیح	۵۰
۲۵۷	مسائل فقہ کے امام اعظم سے بتواتر منقول ہونے پر تبصرہ	۵۱
۲۶۳	لیث بن سعد کے امام اعظم سے شرفِ تلمذ کی تحقیق	۵۲
۲۶۹	ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن مسلم کا ترجمہ	۵۳
۲۷۰	حافظ علم الدین صالح بن سراج الدین البلقینی کا ترجمہ	۵۴
۲۷۷	نضر بن محمد ابو عبد اللہ مروزی استاد محدث اسحاق کا ترجمہ	۵۵
۲۷۸	ابو محمد عبد اللہ حارثی بخاری کی محدثانہ شان	۵۶
۲۸۹	امام اعظم کی تاریخ ولادت سے حافظ محمد بن ابراہیم کے بیان کی توضیح	۵۷
۲۹۸	خارجہ ابن زید کے تقلیل الحدیث اور کثیر الحدیث ہونے پر تبصرہ	۵۸
۲۹۹	اتحاف النبلاء کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم الوزير کا تعارف	۵۹
۳۰۰	اسناد کے امت اسلامیہ کے خصائص سے ہونے پر علمائے کی آراء	۶۰
۳۰۷	ابراہیم بن عثمان البوشیبہ کا پورا چہرہ	۶۱
۳۲۲	جمع قرآن کے لیے زید بن ثابت کے انتخاب کی وجوہ	۶۲
۳۵۳	ابو سلیمان الجوزجانی کا ترجمہ	۶۳
۴۲۳	اسد بن الفرات قاضی قیروان کا تعارف	۶۴
۴۵۳	صحیح مسلم میں التزامِ صحت کا دعویٰ اور اس کی تشریح	۶۵
۶۶۷	ابو بکر محمد بن احمد شمس اللامہ سرخسی کا مبسوط ترجمہ	۶۶
۶۶۹	ابراہیم بن سیار نظام معتزلی کا تعارف	۶۷
۶۷۱	فخر الاسلام علی بن محمد اور صدر الاسلام محمد بن محمد کا تعارف	۶۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى سب سے پہلے ایک ارشادِ ربّانی اور ایک حدیث سن لیجئے۔ اللہ سبحانہ فرماتے ہیں۔

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمِنَ اتَّبَعَنِي
وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَ مَا آتَا مِنَ الْمُسْرِعِينَ ۝۱۰۸

کہہ دو میری راہ تو یہ ہے کہ میں روشنی کی بنا پر اللہ کی طرف بلاتا ہوں
اور جن لوگوں نے میری پیروی کی وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں
اور اللہ کی پاکی ہو میں مشرکوں سے نہیں ہوں۔

ارشادِ ربّانی کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ
میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری
پیروی کی ہے وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں،
فَمَنْ اتَّبَعَ يَدْعُوا إِلَى مَا دَعَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۝

جو شخص بھی حضور کا پیرو کار ہے اس کا کام اسی بات کی دعوت دینا ہے
جس کی حضور انور نے دعوت دی ہے۔

اس آیت میں دعوت کو دونوں کام بتایا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ جیسے آپ کی پیروی
کرنے والے آپ کے ساتھ دعوت میں شریک ہیں، فرق ہے تو صرف یہ کہ دعوت دینا نبی کا کام

۱۰۸ آیت ۱۰۸ ۱۰۸ البواضراء کنیت، عماد الدین لقب، اسماعیل بن عمر بن کثیر نام ہے
نسباً قرشی، وطن دمشق ہے۔ ولادت ۷۰۱ھ میں بمقام مجدل ہونی۔ حافظ جمال الدین المزنی
۷۴۲ھ، حافظ ابن تیمیہ ۷۲۸ھ، حافظ شمس الدین ۷۴۸ھ کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا ہے
ابن العماد خضلی، حافظ ابن حجر، حافظ سیوطی، حافظ ابن تفرحی اور شیخ ابن ناصر نے ان کے مناقب لکھے
ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۷۴۰ھ میں وفات پائی۔ مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔ لکھ تفسیر ابن کثیر ۳ ج ۲

اللہ کا نبی ہونے کی وجہ سے ہے اور مومن کا صرف اُمتی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ نبی کا متبع اور پیرو کا ہونے کی وجہ سے ہے۔ ایسے ہی طاعت میں بھی دونوں شریک ہیں لیکن نبی کی طاعت نبی ہونے اور اس کے معصوم ہونے کی وجہ سے ہے اور اُمتی کی طاعت متبع رسول اور مجتہد ہونے کی وجہ سے ہے۔ شاطبی نے الموافقات میں الائمہ نے احکام میں اسے عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔

اتباعِ محبت کی نشانی ہے

بات بڑی معنی خیز ہے اور اس کی معنویت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اس پر غور کیا جائے کہ نبوت کے اس کام میں نبوت کی اتباع کرنے والے شریک ہیں۔ صرف ایمان لانے والے نہیں۔

اتباع کے موضوع پر قرآن نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ اللہ سبحانہ کی محبت کی نشانی نبوت کا اتباع ہے۔ اور جو اس نشانی کو قائم کرنے میں پورا اترتے ہیں اللہ سبحانہ ان کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہ ان کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہیں۔

ارشاد ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔

کہہ دو اگر تم اللہ سے پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو محبوب بنالے گا
اللہ پاک تم کو اور بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو۔ اللہ بڑا
بخشنہارا اور رحم کار ہے۔

۱۔ اس آیت میں محبتِ الہی کے دعوے کی جانچ کے لیے اچھا معیار بتایا ہے یعنی اتباعِ رسول۔ جو جتنا متبع رسول ہوگا اسی قدر اس کی محبتِ الہی کا دعویٰ زیادہ معتبر و مسلم ہوگا۔ اس کو اسی بنا پر آیت امتحان کہتے ہیں۔ ابوسلیمان الدارانی کہتے ہیں جب لوگوں نے محبت کے بلند بانگ دعوے کیے تو اللہ سبحانہ نے آیتِ محبت نازل کی۔ اس آیت میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ دلیلِ محبت اور فائدہِ محبت، محبتِ الہی کی علامت اگر اتباعِ رسول کو قرار دیا۔ تو محبت کا فائدہ یہ بتایا کہ اللہ تم سے محبت کرے گا۔

جو بات یہاں شرط و جزا کے پیرائے میں کہی گئی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ اتباع کی سرشاریاں
 دیکھ کر یہی بات مقام مدح میں بولی گئی ہے یُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْهُمْ اَوْر کہیں رضی اللہ
 عنہم ورضوا عنه۔

آیت دعوت کا اجمال اور اس کی حدیث سے تشریح

آیت دعوت نے یہ بات کھول دی ہے کہ نبوت کی پیروی کرنے والوں کا کام نبوت کے کام
 میں ہاتھ بٹانا ہے۔ لیکن آیت ہاتھ بٹانے کی نوعیت میں مجمل ہے۔ اس اجمال کے چہرے سے
 جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقاب اٹھائی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 نے فرمایا کہ جو ہدایت اور دین اللہ سبحانہ نے مجھے دے کر روانہ فرمایا ہے
 اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی۔ زمین کے ایک حصے نے
 جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پیا۔ گھاس اور سبزہ اچھا اگایا اور ایک
 حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو سمیٹ لیا۔ اس کے ذریعے اللہ سبحانہ
 نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا خود پانی پیا دوسروں کو پلایا لیکن زمین کا
 ایک حصہ جو چٹیل تھا اس نے نہ پانی روکا اور نہ گھاس اگایا۔ یہی
 مثال اُس شخص کی ہے جس نے اللہ سبحانہ کے دین میں نفقہ کیا
 اور اللہ سبحانہ نے اسے دین سے فائدہ دیا۔ اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو

اے نام عبد اللہ بن قیس، کنیت ابو موسیٰ ہے۔ فتح خیبر کے زمانے میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف
 لائے۔ حضور انورؐ نے ان کو حضرت معاذ کے ساتھ یمن کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفہ کے گورنر
 رہے ہیں۔ حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ بصرہ کے شہریوں کے قرأت اور فقہ میں استاد ہیں۔ امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ
 علم کا ماخذ صحابہ میں چھ بزرگ ہیں۔ عمرؓ، علیؓ، ابیؓ، ابن مسعودؓ، زیدؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ، صفوان بن سلیمؒ فرماتے
 ہیں کہ زمانہ نبوت میں یہ چار فتویٰ دیتے تھے۔ عمرؓ، علیؓ، معاذؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ۔ آواز اتنی اچھی تھی کہ
 قرآن پڑھتے تو سماں بندھ جاتا حضور انورؐ نے ایک دفعہ قرآن سنا تو فرمایا۔

لَقَدْ اُوتِیْ مِنْ مَّارِ اٰمِنْ مَّرَا مِیْرَالِ دَاوْدَ۔ ۴۴ ہادی الحجۃ کے مہینے میں انتقال ہوا۔

کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے اوہر سر اٹھا کر نہیں دیکھا
اور ہدایت ہی کو قبول نہیں کیا جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے یہ

اس حدیث کی مخاطب امتِ اجابت یعنی مسلمان ہیں نہ کہ اُمتِ دعوت یعنی عام انسان اسی
بنا پر حضرت امام بخاری نے کتاب العلم میں عالم بننے اور عالم بنانے کی فضیلت کا عنوان قائم کر کے
بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم ہونے اور علم سکھانے کی فضیلت کا مقام ایمان سے پہلے
نہیں بلکہ ایمان کے بعد ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ حق و باطل کی آویزش میں حق کے بقا کا کیا قانون
ہے۔ اور نبوت کی لائی ہوئی ہدایت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ اس نازک اور دقیق حقیقت کے لیے
ایسی صاف اور عامۃ الوجود مثال پیش کی ہے جس کے معائنہ سے کوئی انسانی نگاہ بھی محروم نہیں
فرمایا جب پانی برستا ہے اور زمین کے لیے شادابی اور کل ریزی کا سامان مہیا ہونے لگتا ہے تو تم دیکھتے
ہو کہ زمین بارش کے پانی سے فائدہ اٹھانے میں تین حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

الف :- پانی کو چوس کر پیداوار کرنے والی زمین

ب :- پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین

ج :- ناقابل کاشت اور ناقابل ذخیرہ

ٹھیک ایسے ہی علم و ہدایت کی بارش کے لیے انسانی قلوب کی زمین بھی تین حصوں میں منقسم ہے۔

الف :- وہ جو قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں

ب :- وہ جو قرآن و سنت سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں

ج :- وہ جو نہ ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ ہی استنباط و استخراج کرنے والوں میں سے ہیں۔

پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین یعنی محدثین

جو لوگ قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں یہ زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے

كَانَتْ مِنْهَا آجَادِبٌ أَمْسَكْتَ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللَّهُ

بِالنَّاسِ فَشَرِبُوا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا۔

زمین کا ایک حصہ جو بخر تھا اس نے پانی کو روکا اللہ نے اس سے لوگوں

کو فائدہ دیا لوگوں نے پانی پیا اور زمین سیراب کی۔
 سے تعبیر کیا ہے۔ یہ قرآن و سنت کی بالذات نگرانی کرنے والے اور ان کے الفاظ کو اس طرح سمیٹے
 ہوتے ہیں کہ ان میں بال برابر فرق نہیں آنے دیتے۔ یہ ہیں اصحاب حدیث اور محدثین۔ علامہ سندھی
 فرماتے ہیں۔

قسم ینتفع بعین علمہ ذالک کاہل الحفظ والروایت لہ
 یہ وہ قسم ہے جس میں بالذات علم ہی سے فائدہ ہوتا ہے جیسے محدثین
 اور اصحاب روایت۔

اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
 نَصَرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَغَاَهَا دَاذَاهَا
 فَرُبَّ حَامِلٍ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ
 رواہ الشافعی

خوش و خرم رکھے اللہ اس شخص کو جس نے میری بات سنی اسے محفوظ
 رکھا اور پوری حفاظت سے اُگے روانہ کیا۔ بہت سے سمجھ کی بات
 رکھنے والے بات کو اپنے سے زیادہ سمجھ دار تک پہنچاتے ہیں۔

پانی سے پیداوار کرنے والی زمین یعنی مجتہدین
 کچھ لوگ صرف پانی کی حفاظت ہی کا کام نہیں بلکہ اس سے مسائل کے استخراج اور استنباط

لہ سندھی علی البخاری ج ۱ ص ۲۶

لہ یہ حدیث ان لفظوں میں بحوالہ ابن مسعود بیہقی میں ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی میں الفاظ یہ
 ہیں نَصَرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَغَاَهَا دَاذَاهَا
 حدیث مسند بزاز میں بحوالہ ابوسعید خدری صحیح ابن حبان میں بحوالہ زید بن ثابت آئی ہے۔ نیز دوسرے
 صحابہ مثلاً معاذ بن جبل، نعمان بن بشیر، جیسر بن مطعم اور ابوالدرداء کے حوالے سے بھی یہی حدیث مختلف
 الفاظ میں مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ یہ حدیث بھی خود بتا رہی ہے کہ علماء دو قسم کے ہیں۔ حفاظ اور
 فقہاء ہر حافظ حدیث فقہرہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام شافعی نے اس حدیث پر یہ خاص نوٹ لکھا ہے۔
 دَلَّ عَلَى أَنَّهُ قَدْ حَمَلَ الْفَقْهَ غَيْرَ فُقَيْهِ، يَكُونُ لَهُ حَافِظًا وَلَا يَكُونُ فِيهِ فُقَيْهًا۔ (الرسالۃ ص ۵۵)

کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس کے ثمرات سے رائے عامہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ نتائج کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ یہ تمثیل میں زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے

نَقِیَّةٌ قَبِلَتْ الْمَاءَ فَأَنْبَتَ الْكَلَاءُ وَالْعُشْبُ الْكَثِیْرُ
صاف زمین جس نے پانی کو چوس لیا اور پانی کے ذریعے گھاس اور
زیادہ سے زیادہ سبزہ اگایا۔

سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لوگ قرآن و سنت کے پانی سے اپنی قوتِ اجتہاد کے ذریعے مسائل کے موتی نکالنے والے اور پانی کو نہیں بلکہ پانی کے نتائج کو شاہراہِ عام پر لانے والے ہیں یہ ہیں اربابِ اجتہاد اور فقہاءِ کرام۔

علامہ سندھی فرماتے ہیں:

قسم ینتفع بثمرات علم و نتائجہ کاهل الاجتہاد
والاستخراج لہ

یہ وہ قسم ہے جس میں علم کے ثمرات اور نتائج سے فائدہ ہوتا ہے جیسے
مجتہدین اور فقہاء۔

اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ يُدِرِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفْقِهْهُ فِي الدِّينِ بَلَّغْ

جس کے ساتھ اللہ سبحانہ، خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین میں
فقاہت عطا فرماتے ہیں۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ارشادِ نبوت کی روشنی میں ارشاداتِ نبوت کا ذخیرہ رکھنے والے ہوں

۱۔ پورا نام ابو الحسن نور الدین محمد بن عبد الہادی ہے۔ سندھ میں مقام ٹھٹھہ کے رہنے والے ہیں۔ یہیں
نشو و نما پائی، تعلیم تسمت میں حاصل کی مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔ حرم نبوی میں ان کا درس حدیث خاص شہرت
رکھتا تھا۔ ۳۳۸ھ میں وفات پائی اور البقیع میں دفن ہوئے۔ حدیث کی چھ کتابوں پر ان کے حاشیے ہیں۔
۲۔ سندھی علی البخاری ج ۱ ص ۲۶۔ ۳۔ صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۲ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے
حضرت معاویہ سے صرف مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے، ابو داؤد، مسلم، ترمذی نے ثوبان سے۔ ترمذی
نے معاویہ بن قرہ سے اور ابو داؤد نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے۔

یعنی محدثین یا ارشادات نبوت اور قرآن سے مسائل نکالنے والے ہوں یعنی فقہاء دونوں اسلام کا سرچشمہ علمی ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں۔

ایک قسم وہ حفاظ ہیں جن کا کام صرف روایات کو یاد رکھنا اور جیسی سنی ہیں ویسی ہی آگے پہنچا دینا ہے۔ ان کا کام مسائل معلوم کرنا اور استنباط کرنا نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علماء کی ہے جن کا کام محفوظ سرمایہ مسائل نکالنا اور احکام مستنبط کرنا ہے۔ پہلی قسم جیسے حافظ ابو زرہ اور ابو حاتم اور دوسری قسم جیسے امام مالک، امام شافعی وغیرہ۔ خود صحابہ میں بھی حفظ روایت اور استنباط مسائل کے لحاظ سے یہ تقسیم موجود تھی۔ غور فرمائیے۔ عبد اللہ بن عباسؓ جبرامت اور قرآن کے ترجمان ہیں۔ مگر اس کے باوجود آپ کی ان حدیثوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے جن میں ذاتی سماع اور دید کی تصریح ہو۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ کے صرف فتاویٰ ضخیم جلدوں میں جمع کیے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہ بھی ان کے دریائے فقہیت کی ایک چٹو ہے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ان کے مقابلے میں ابو ہریرہؓ میں حفظ روایت میں علی الاطلاق حافظ امت تو ہیں مگر تفقہ اور استنباط میں ابن عباسؓ کے پاسنگ بھی نہیں۔ حفظ روایت اور استنباط مسائل کے لحاظ سے یہی تقسیم امت کو صحابہ سے وراثت میں ملی ہے بلکہ

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

التخریج علی کلام الفقہاء و تتبع لفظ الحدیث لکل منہما
اصل اسبیل فی الدین ہے

فقہاء کے انداز پر حدیث سے مسئلہ نکالنا اور الفاظ حدیث کا تتبع و تلاش دونوں کی دین میں بنیادی حیثیت ہے۔

دونوں اس ارشاد نبوت کا منطوق ہیں۔ محدثین بھی اور فقہاء بھی، یا بالفاظ دیگر اصحاب روایت

بھی اور اصحابِ درایت بھی۔

اُمّہ اجتہاد کی طاعت ضروری ہے

اسی بنا پر حافظ ابن القیم جوزی نے اعلام میں دونوں کو الفاظِ نبوت کو اُگے پہنچانے والے ہوں یا الفاظِ نبوت کو سمجھانے والے ہوں یہ کہہ کر کہ

حضور انور کی جانب سے تبلیغ دو طرح کی ہے الفاظِ نبوت کی تبلیغ اور معانی کی تبلیغ۔

بتایا ہے کہ اُمتِ محمدیہ کے علماء دو قسموں میں منحصر ہیں ایک حفاظِ حدیث۔ یہ اُمت کے رہنما اور مخلوق کے پیشوا ہیں جنہوں نے اُمت کے لیے دین کو محفوظ رکھا ہے۔ اور اس کی ہر قسم کے رد و بدل سے حفاظت فرماتی ہے۔ اُگے فرماتے ہیں :

دوسری قسم ان فقہاءِ اسلام کی ہے جن کو مسائل نکالنے کی نعمت ارزاقی ہوئی اور جو حلال و حرام کے ضابطے بنانے کے لیے متوجہ ہوئے ان فقہاء کا مقام زمین میں ایسا ہے جیسے ستارے آسمان میں۔ ان کے ذریعے ہی تاریکیوں میں سرگرداں راستہ معلوم کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کھانے اور پینے سے زیادہ ہے اور ان کی طاعت والدین سے بھی زیادہ ازروئے قرآن فرض ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم نے قرآن کی یہ آیت لکھی ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اولی الامر کا جو تم میں سے ہوں۔

اور بتایا ہے کہ

اس آیت کی رو سے فقہاء اور مجتہدین کی طاعت فرض ہے اور اس

آیت میں عبد اللہ بن عباس، جابر بن عبد اللہ، حسن بصری، ابو العالیہ عطاء بن ابی رباح، ضحاک اور مجاہد کے خیال میں "اولی الامر" سے

حکام نہیں بلکہ فقہاء اسلام مراد ہیں۔

صاف اور سنگلاخ زمین یعنی مقلدین

جو لوگ قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہوں اور نہ قرآن و سنت سے مسائل نکالنے پر قدرت رکھتے ہوں۔ اس ارشاد نبوت میں زمین کی وہ قسم ہیں جسے زبان نبوت نے اس تمثیل میں اِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تَمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَاءً سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اُمت کا وہ طبقہ جو مسلمان ہونے کے باوجود علم نبوت سے بہرہ ور نہیں۔

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں حَسَوْ مَنْ دَخَلَ فِي الدِّينِ وَلَمْ يَسْمَعْ الْعِلْمَ، یعنی وہ مسلمان جو دین سیکھنے کے لیے زندگی بھر کچھ وقت بھی دین سیکھنے پر صرف نہیں کرتے اور کوئی موقع بھی دین کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کے لیے نہیں نکالتے۔ وہ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا کا مصداق ہیں۔ اُمت اسلامیہ میں ان کی اکثریت ہے اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں جو جانتے ہیں۔ ان سے پوچھ پوچھ کر گزارہ کریں۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں، ممکن ہے کہ بعض لوگ تقلید پر چونکیں اس لیے اس حقیقت کو آشکارا کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم صرف تحقیق کا نام ہے اور صدر اول میں صرف تحقیق تھی۔ تقلید کا نام و نشان نہ تھا وہ سخت غلط فہمی میں ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے سنن ابن ماجہ کی حدیث انس بن مالک

امتی علی خمس طبقات فاربعون سنة اهل بر وتقویٰ

ثم الذین یلونہم الی عشرين ومائة سنة اهل

تراحم وتواصل ثم الذین یلونہم الی ستین ومائة

اهل تدابرد تقاطع ثم المصرج الہرج النجا النجا۔

میر ہی اُمت پانچ طبقتوں پر ہے چالیس برس تک تونیک اور

پیرہنیز کار لوگ ہوں گے پھر اُن کے بعد والے ایک بیس برس تک

آپس میں رحم کرنے والے اور حق قرابت ادا کرنے والے ہوں گے۔

پھر ان کے بعد والے لوگ ایک سو ساٹھ تک باہم ترک صحبت اور قطع تعلقات کرنے والے ہوں گے۔ پھر ان طبقوں کے بعد قتل ہی قتل سے (اس زمانے سے) نجات طلب کرو نجات طلب کرو۔

میں آئے ہوئے پانچ طبقوں کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ صحابہ کرام میں مختلف مراتب اور مدارج تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَأَنَّ جَمَاعَةَ سَلِيمِ الْفِطْرَةِ بِرْمَنَازِلِ شَتَّى بُودَهِ اند طائفہ مخلوق بر استعداد کے کہ شبیہ با استعداد انبیاء بود و نمونہ از نبوت در جوہر طبیعت ایشان مودع۔ ایشان سر و فتر امت آمدند و بشہادت دل آں داعیہ و آں علوم را تلقی نمودہ اند و پارہ از تحقیق نصیب ایشان شد۔ و طائفہ استعداد تقلید تمام داشتند و قبول اندکاس آں داعیہ و آں علوم نمودند و حصہ از سعادت یافتند و کلاً وعدہ اللہ الحسنی لہ

پھر یہ فطرت سلیمہ والے بھی مختلف مراتب پر تھے۔ بعض تو ایسی استعداد کے ساتھ مخلوق ہوتے تھے کہ وہ (استعداد) انبیاء کی استعداد سے مشابہ تھی۔ اور ان کے جوہر طبیعت کے اندر نبوت کا نمونہ امانت رکھا گیا تھا۔ یہ لوگ امت کے سر و فتر ہوتے ان لوگوں نے اپنے دل کی شہادت سے اس داعیہ کو اور ان علوم کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) سے لیا اور تحقیق کا ایک حصہ ان کو نصیب ہوا اور بعض تقلید کی استعداد کامل رکھتے تھے اور انہوں نے اس داعیہ اور ان علوم کے عکس کو قبول کیا اور سعادت سے ایک حصہ پایا اور سب کے لیے اللہ نے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

یہاں سے یہ بات الم تشریح ہو گئی کہ علم تحقیقی ہو یا تقلیدی دونوں علم ہیں اور دونوں امت کو صحابہ سے وراثت میں ملے ہیں۔ مولانا اسماعیل شہید نے منصب امامت میں یہ بات کھول کر سمجھائی ہے کہ :

علم با احکام شرعیہ بہ دو طریق حاصل میشود تقلید و تحقیق۔ و علم انبیاء از جنس علم تقلیدی اصلاً نیست بلکہ آنچہ ایشان را از پس علم بدست آمد ہمہ بطریق تحقیق حاصل شد و تحقیق را دو طریق است اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول باشد والہام بشرطیکہ از مداخلت نفسانی محفوظ باشد پس مشابہ با نبیاء و علم احکام یا مجتہدین مقبولین باشند یا ملہمین محفوظین و از بسکہ استناد احکام بسوئے کشف والہام در اوائل امت معروف نہ بود پس مشابہ با نبیاء دریں فن مجتہدین مقبولین اند پس ایشان را از ائمہ فن باید شمر و مثل ائمہ اربعہ ہر چند مجتہدین بسیار از بسیار گذشتہ اند فاما مقبول در میان جمہور امت ہمیں چند اشخاص اند پس گویا کہ مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشان گردیدہ بنار علیہ در میان جمہیر اہل اسلام از خواص و عوام بلقب امام معروف گردیدند و بقوت اجتہاد موصوف بہ

علم بہ احکام شرعیہ دو طریق پر حاصل ہوتا ہے۔ تقلید اور تحقیق۔ اور علم انبیاء منجملہ علم تقلیدی بالکل نہیں بلکہ جو کچھ ان کو علم حاصل ہوا تمام بطریق تحقیق حاصل ہوا۔ اور تحقیق کے دو طریق ہیں۔ اول اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول ہو۔ دوم الہام بشرطیکہ مداخلت سے محفوظ ہو۔ پس انبیاء علیہم السلام کے مشابہ علم احکام میں یا مجتہدین مقبولین ہیں۔ یا ملہمین محفوظین اور چونکہ کشف والہام کی طرف احکام کی نسبت اوائل امت میں معروف و مشہور نہ تھی پس مشابہ با نبیاء اس فن میں مجتہدین مقبولین، ہیں۔ سو ان کو ائمہ فن سے معلوم کرنا چاہیے۔ مثل ائمہ اربعہ، ہر چند کہ مجتہدین دین بہت کچھ گزرے ہیں۔ لیکن مقبول در میان جمہور امت یہی چند اشخاص ہیں۔ پس گویا کہ مشابہت تامہ اس فن میں انہیں کے نصیب ہوئی۔ نظر براں تمام اہل اسلام خواص و عوام میں بلقب امام معروف ہوئے اور بقوت اجتہاد موصوف بہ۔

علامہ شاطبی نے موافقات میں لکھا ہے کہ شریعت میں قابل اعتماد اور قابل اعتبار وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان میں عمل پر آمادگی ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ اہل علم تین قسم کے ہیں۔

- ۱۔ ایک وہ جن کا علم تقلید ہی ہے اور درجہ کمال حاصل نہیں ہے
 - ۲۔ دوسرے وہ جن کا علم استدلالی ہے اور دلائل و براہین سے واقف ہیں
 - ۳۔ تیسرے وہ جن کا علم تحقیقی ہے خود علم ان کے لیے مکمل کی حیثیت رکھتا ہے۔
- اگر یہ واقعہ ہے کہ شریعت میں علم معتبر وہ ہی ہے جس کے ذریعے انسان عمل پر آمادہ ہو جائے تو پھر علم تقلید ہی کے علم نہ ہونے کی وجہ کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ مقلد اپنی عملی زندگی میں جن کی تقلید کرتا ہے صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ قرآن و سنت کے ترجمان ہیں۔
- حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اہل السنۃ کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے اہل السنۃ کے تقلید ہی موقف کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ

الناس لم يأخذوا قول مالك والشافعي واحمد وغيرهم
الا لكونهم يسندون اقوالهم الى ما جاء به النبي
صلى الله عليه وسلم فان هؤلاء من اعلم الناس
بما جاء به واتبعهم لذلك واشدا اجتهادا في معرفة
ذلك واتباعه له

لوگوں نے امام مالک، شافعی اور احمد کی باتوں کو صرف اس لیے اختیار کیا ہے کہ یہ اکابر اپنی باتوں کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کی طرف نسبت کرتے ہیں کیونکہ یہ ائمہ تمام لوگوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی باتوں یعنی احادیث کے سب سے زیادہ عالم ہیں اور سب سے زیادہ احادیث کی پیروی کرنے والے اور احادیث کی معرفت اور اتباع میں سب سے اچھی قوت اجتہاد رکھنے والے ہیں۔

اسی بنا پر شاہ ولی اللہ نے اصولیین کی بنائی ہوئی عام شاہراہ سے ہٹ کر تقلید کی یہ تعریف کی ہے ان یكون اتباع الروایة دلالۃ علیہ یعنی بات نبوت کی ہو اور الفاظ امام مجتہد کے ہوں

اسے مان لینے کا نام تقلید ہے۔

الغرض ارشاد نبوت کی رو سے دونوں محدثین ہوں یا فقہاء۔ اسلام کا پیش قیمت سرمایہ ہیں۔ منطوق میں محدثین سے اخذ کرنا اور مفہوم میں فقہاء کی تقلید کرنا اسلاف کا مسلک اور اکابر کا مذہب ہے۔ میری اس تحریر کا منشا یہ ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ امام اعظم کی ذات گرامی صرف امام فقاہت ہی نہیں بلکہ امام حدیث بھی ہے۔ چونکہ امام اعظم کی زیادہ شہرت فقاہت میں ہوئی اس لیے کچھ لوگوں کی نظروں سے امام اعظم کی محدثانہ شان اوجھل ہو گئی اور فقاہت میں شہرت کی وجہ میں جو کچھ سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ امام موصوف نے بطور فن جس چیز کو تمام علوم میں کمال پیدا کرنے کے بعد اپنا یادہ علم الفقہ تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو شخص جس فن کو اپناتا ہے۔ شہرت اسی میں ہوتی ہے۔ امام بخاری اور مسلم فقہی مسائل میں صاحب رائے تھے مگر ان کو محدثین سے نکال کر فقہاء میں کسی نے شمار نہیں کیا کیونکہ فقہ کو انہوں نے بطور فن نہیں اپنایا تھا۔ تاریخ تو فن کے اپنانے کے لحاظ سے کسی شخص کا تعارف کراتی ہے۔ یہ بات ایک درجہ میں صحیح ہے کہ ایک شخص محدث ہے مگر فقیہ نہ ہو لیکن یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص فقیہ اور مجتہد ہو مگر محدث نہ ہو کیونکہ مجتہد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اولاً اس کی نظر شریعت حقہ کے پورے کے پورے سسٹم، قرآن حکیم، اسوۂ نبوت اور اعمال صحابہ پر ہو اور اس کی نظر سے شریعت کا کوئی گوشہ اوجھل نہ ہو۔ اور پھر ان سے مسائل نکالنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔

چنانچہ شاطبی لکھتے ہیں:

انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين

احدهما فهم مقاصد الشريعة على كمالها

والثاني من الاستنباط

درجہ اجتہاد صرف اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو دو صفتوں سے موصوف

ہو۔ ایک یہ کہ پوری کی پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو، دوسرے

یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔

یاد رہے کہ شریعت کے پورے سسٹم میں بصیرت ہونے اور اس سسٹم کے کسی ایک گوشے

میں فنکار کی حیثیت سے نام آوری پیدا کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ محدثین نے ایک فنکار کی حیثیت سے حدیث میں نام پیدا کیا ہے۔ لیکن ائمہ اربعہ کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا فن علم حدیث میں یہ نہیں کہ حدیث کس کس سند سے آئی ہے بلکہ ان کا مقام علم حدیث میں وہ ہے جو علامہ شافعی نے موافقات میں لکھا ہے۔

وَانْ كَانَ مَتَمَكِّنًا مِّنَ الْاِطْلَاعِ عَلَى مَقَاصِدِهَا كَمَا قَالُوا
فِي الشَّافِعِيِّ وَابْنِ حَنِيفَةَ فِي عِلْمِ الْحَدِيثِ جُلَّةً

اگر شریعت کے مقاصد پر اطلاع رکھتا ہو جیسا کہ امام شافعی اور
امام ابو حنیفہ کے متعلق علم الحدیث کے بارے میں سب کی رائے ہے

اور اجتہاد میں یہی وہ اُسوہ ہے جو صحابہ نے چھوڑا تھا۔ الغرض میں یہ بنانا چاہتا ہوں کہ
امام اعظم کی ذات گرامی صرف امام فقاہت نہیں بلکہ امام حدیث بھی ہے۔

حدیث کیا ہے

امام اعظم کی محدثانہ شان اور حدیث میں ان کی جلالت قدر کے تذکرے سے پہلے ضروری ہے
کہ کچھ حدیث کے بارے میں بتایا جائے۔ اتنی بات تو کم و بیش سب ہی جانتے ہیں کہ قرآن
میں اللہ پاک نے لوگوں کو صرف حضور انور کی نبوت و رسالت سے روشناس نہیں کیا۔ بلاشبہ
نبوت ایک عہدہ اور منصب ہونے کی وجہ سے ایمانیات سے متعلق یعنی ماننے اور باور کرنے
کی چیز ہے مگر قرآن نے منصب کے ساتھ نبی کے مقام کا بھی ذکر کیا ہے۔

منصب تو یہی ہے کہ جناب سیدنا محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب الهاشمی المکی ثم المدنی نبی
اور رسول ہیں جو قرآن کی صورت میں خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں اور مقام یہ ہے کہ آپ
رسول ہونے کے ساتھ اس پیغام الہی یعنی قرآن کے مبلغ، داعی، معلم اور مبین بھی
ہیں۔ آپ طہیبات کے محلل اور نجاست کے محرم ہیں۔ اس کے ذریعے آپ باہمی تنازعات
کے حکم، قاضی اور معاشرے کی اسلامی زندگی کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھئے کہ
نبی و رسول ہونے کی حیثیت میں امت سے آپ کے ماننے کا اور مقامات والی شخصیت

ہونے کی وجہ سے امت سے آپ کی طاعت، اتباع، توقیر، تعظیم اور محبت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔
 منصب اور مقام دونوں کو سمجھ لینے کے بعد حضور کو نبی مانتے ہوئے آپ کے کاموں،
 باتوں، عادتوں اور حالتوں کی قانونی حیثیت کو نہ ماننے کا مطلب آپ باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ
 یہ منصب کو مان کر مقام نبوت کا انکار ہے۔ کیونکہ اگر نبی کی باتوں، کاموں اور عادتوں کی
 قانونی حیثیت نہیں مانی جاتی تو پھر نبی کا نبی ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے اور اس طرح
 نبی اور غیر نبی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

قرآن و قانع کے تحت نازل ہوا ہے

رسول کے مقامات ہی کو انسانیت میں اجاگر کرنے کے لیے قرآن کا نزول بتدریج اور
 اہستہ اہستہ ہوا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ سینہ قرآن سے
 اُبلتی ہوئی صدا یہی ہے۔

وَقَرَأْنَا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَ عَلَى النَّاسِ عَلٰی مَكَّةَ وَ
 نَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ۝

اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے جدا جدا کر کے پڑھے تو اس کو لوگوں پر
 بکھڑکھڑا کر اور اس کو ہم نے اتارتے اتارتے اتارا۔

گویا اہستہ اہستہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ جیسے جیسے حالات پیش آئیں ان کے موافق
 ہدایات حاصل ہوتی رہیں اور اس کے نتیجے میں وہ جماعت بچے آگے چل کر تمام دنیا کا معلم
 بننا ہے۔ قرآن کی ہر بات اور موقع و محل کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے یاد رکھ سکے۔ اور
 آنے والی نسلوں کے لیے کسی بھی قرآنی بات کے لیے بے موقع اور بے جا استعمال کی گنجائش
 نہ ہے۔ اس طرح ان تیس سالہ نزول قرآن کے وقت میں پیش پا افتادہ حالات و وقائع
 کا نام یا صاحب قرآن کی تیس سالہ شب و روز میں قرآن ہی کی ہدایات پر اٹھی ہوئی
 عادتوں، باتوں، کاموں اور حالتوں کا نام السنہ ہے۔ دراصل یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک
 قرآن، دوسرے وقائع جن کے تحت قرآن اترا ہے۔ ان دونوں میں وہ ہی تعلق ہے

جو نقش اور نقاش میں، حکمت اور حکیم میں، پروردگار اور پروردگاری میں، معمار اور عمارت میں، نظم اور ناظم میں ہوتا ہے۔ اگر آپ چراغ کی روشنی کو چراغ سے یا چراغ کو اس کی روشنی سے الگ نہیں کر سکتے تو پھر السنہ کو قرآن سے یا قرآن کو السنہ سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ قرآن کو چراغ اور السنہ کو اس کی روشنی یا السنہ کو چراغ اور قرآن کو اس کی روشنی کہہ دیجئے۔ قرآن میں دونوں تعبیریں موجود ہیں۔ ایک مقام پر قرآن میں نبوت کو روشنی کہا گیا ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝
بے شک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب
ظاہر کرنے والی۔

اور دوسری جگہ خود قرآن کو روشنی قرار دیا ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ
نُورًا مُّبِينًا ۝

تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے رب کی طرف سے سند اور تائیدی ہم نے
تم پر روشنی واضح۔

دونوں نور ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ وحی کے ذریعے آئی ہوئی ہدایات کا نام کتاب یا قرآن اور اسی وحی کی رہنمائی میں بنے ہوئے نقشہ عمل کا نام اسوۂ حسنہ یا السنہ ہے۔

حدیث تاریخ سنت کا نام ہے

اگرچہ متاخرین نے اصطلاحی طور پر اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے لفظ السنہ کو ایک سے زیادہ معانی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ مثلاً

حضور انور کے افعال و اقوال اور آپ کی موجودگی میں ہونے والے کاموں، باتوں کو السنہ کہا گیا ہے۔ بدعت کے مقابلے پر لفظ سنت استعمال ہوا ہے۔

حضور انور کے کاموں، باتوں، عادتوں اور حالتوں کو بھی سنت کہا گیا ہے۔

لیکن فقہاء اور اسلامی قانون کے علماء کی زبان میں نبوت کے اس محسوس جادۂ عمل کو سنت

کہتے ہیں جو ذاتِ نبوت نے اسلامی معاشرے کی دینی زندگی کے لیے بطور پیمانہ عمل پیش کیا ہو اور جسے جماعت صحابہ نے دین بنا کر اختیار کیا ہو۔ چاہے یہ افعال اعمال ہوں یا اخلاق و معاملات۔ اسی بنا پر صحابہ کے معمولات کو بھی سنت کہا گیا ہے۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جیسے قرآن کے لیے قراءِ سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی سنت کے لیے محدثین کی روایات ہیں۔ نہ تو قرآن کا قرآن ہونا قراءِ سبعہ کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا روایات

لے قراءِ سبعہ قرآن پاک کے وہ سات قاری جن کی قرأت کے مطابق ساری دنیا میں تلاوت قرآن کی جاتی ہے حافظ عبد القادر قرشی الجواہر المفضیۃ میں فرماتے ہیں۔ سات ماہتابِ ائمہ قراءِ یہ ہیں

- ۱۔ عبد اللہ بن کثیر بن المطلب القرشی مولانا ہم البوعبدہ تابعین میں سے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر سے قرآن کا سماع کیا ہے۔ ۲۰۰ھ میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ بعض نے ۲۰۰ھ بتایا ہے۔
- ۲۔ نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم الیثمی مدنی۔ ان کے بزرگ اصفہان کے ہنر والے تھے۔ ابو رویم کنیت ہے ۱۶۰ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

۳۔ ابن عامر۔ یہ عبد اللہ بن عامر بن یزید بن تیم بن ربیعہ البصبی دمشقی ہیں۔ دمشق کے قاضی تھے۔ کبار تابعین سے ہیں۔ ۲۰۰ھ کے آغا نہ میں ولادت ہوئی اور عاشورہ کے دن ۲۰۰ھ کو وفات پائی۔ کچھ کی رائے میں تاریخ ولادت ۲۰۰ھ ہے اس لحاظ سے ان کی عمر ایک سو دس برس کی ہوتی ہے۔

۴۔ ابو عمرو بن العلاء بن عمار بن عبد اللہ المقرئ البصری۔ ان کا نام کسی نے بیان کسی نے بیان کسی نے سچائی کسی نے عثمان کسی نے محبوب اور کسی نے کچھ اور بتایا ہے۔ ۲۰۰ھ میں کوفہ میں انتقال ہوا۔

۵۔ عاصم بن ابی النجود البکری الاسدی۔ ۲۰۰ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔ کچھ کی رائے میں سن وفات ۲۰۰ھ ہے۔ امام سفیان ثوری اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ بہدہ ابو النجود کا نام ہے۔ اور عمرو بن علی الفلاس کہتے ہیں کہ یہ ان کی ماں کا نام ہے مگر ابو بکر ابن ابی داؤد نے اسے غلط کہا ہے۔

۶۔ حمزہ بن حبیب بن عمار بن اسماعیل الزیات التیمی مولانا ہم الکوفی ابو عمارہ بمقام حلوان ۲۰۰ھ میں وفات پائی ہے۔

۷۔ کسائی ابو الحسن علی بن حمزہ الاسدی مولانا ہم الکوفی۔ ۲۰۰ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے حمزہ اسدی کے پاس قرأت کی تھی۔

ان ساتوں میں حمزہ ابن عامر اور ابو عمرو کے کوئی عرب نہیں ہے۔ (الجواہر المفضیۃ ج ۲ ص ۲۲۲، ۲۲۳)

محدثین پر موقوف ہے۔ اگر حدیث کے نام سے اسناد و روایت کا کوئی بھی سلسلہ موجود نہ ہوتا۔ تو پھر بھی سنت اپنی جگہ ایسے ہی موجود ہوتی۔ حدیث تو دراصل تاریخِ سنت اور اس کی روایت کا نام ہے اس تاریخ اور روایتی سلسلہ سے پہلے بھی حدیث موجود تھی۔ اور اس کے بعد بھی موجود ہے۔ قرآن ہوا سنت دونوں روایتی اور تاریخی سلسلے سے الگ ہو کر متواتر ہیں۔ قرآن چونکہ خالص ایک فکری اور علمی شاہکار ہے اس لیے وہ کتابی طور پر ہی متواتر ہے۔ اور سنت چونکہ ایک عملی چیز ہے۔ اس لیے وہ عملاً ہی متواتر ہے۔ بلاشبہ اگر قرآن کا قرآن ہونا روایات قرار کا محتاج نہیں ہے۔ تو سنت کا سنت ہونا بھی روایاتِ محدثین کا محتاج نہیں ہے۔

اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ قرآن کے لیے ائمہ قرأت کی روایات بعد میں منصفہ وجود پر آئی ہیں تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ سنت کے لیے بھی ائمہ حدیث کی روایات بعد میں ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ تاریخِ قرآن ہے۔ اور یہ تاریخِ سنت ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے یہی بات کیسے لطیف انداز میں بیان فرمائی ہے۔

انما قولنا رواہ البخاری كقولنا رواه القراء السبعة
والقرآن منقول بنقل المتنواتر

ہمارا یہ کہنا کہ اسے بخاری نے روایت کیا ہے ایسا ہی ہے جیسا ہم کہیں کہ
اسے ائمہ سب سے قرار دے روایت کیا ہے حالانکہ قرآن متواتر منقول ہے
اور یہاں تک فرما سکتے

لو لم يخلق البخاري ومسلم لم ينقص من الدين شيء له

اگر بخاری اور مسلم پیدا نہ ہوتے تو دین میں کچھ بھی کمی نہ ہوتی۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دین میں جو چیز قرآن کے بعد حجیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ سنت ہے
حدیث نہیں ہے۔ حدیث تو تاریخِ سنت کا نام ہے۔

معاذ کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ

قرآن کی حفاظت کے لیے جیسے دو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ایک سینہ دوسرے صحیفہ۔

ٹھیک ٹھیک اسی طرح سنت کی حفاظت بھی دو طرح سے ہوئی ہے۔ ایک سینہ دوسرے

عمل کا محسوس پیمانہ۔

چونکہ قرآن نازل ہی علم بن کر ہوا تھا اس لیے اس کی حفاظت بھی علم ہی کی طرح سینہ اور صحیفہ سے ہوتی اور سنت چونکہ اسی علم کے پر تو اور عکس کا نام تھا اس لیے اس کی حفاظت عمل کی طرح سینہ کے ساتھ صحیفہ سے نہیں بلکہ راستے عامہ کی محسوس عملی زندگی کے ذریعے ہوتی۔ صرف نوعیت کا فرق ہوا۔ ورنہ نفس حفاظت تو قرآن و سنت دونوں کی ہوتی اور نوعیت کا یہ فرق بھی خود قرآن و سنت کے باہمی فرق کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ قرآن سراسر علم کا نام ہے اور سنت سراسر عمل اور کردار کا نام ہے سنت سن سے ہے سن الطریقۃ کے معنی راستہ چلنے کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں سن فلان طریقاً من الخیر فلاں نے نیکی کا کام کیا۔ اسی سے لفظ سنت طریقہ اور سیرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جب یہ انسانی اعمال کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی شاہراہ عمل، طریق کار کے ہوتے ہیں اسی سے ہے سنوا بہم سنتہ اہل الکتاب مجوسیوں سے اہل کتاب کا ہر تاؤ ذکر و۔

تاریخ سنت کے لیے حدیث کا لفظ

اگرچہ لغت میں لفظ حدیث کا قریب قریب وہی مفہوم ہے جو اردو میں بات کا ہے مگر تاریخ سنت کے لیے یہ لفظ محدثین کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ قرآن ہی سے لیا گیا ہے۔ انبیاء کے کاموں، عادتوں، باتوں اور حالتوں کے لیے قرآن میں الشہاک نے ایک سے زیادہ مقامات پر حدیث ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سورہ ذاریات میں حضرت ابراہیم کے متعلق ایک واقعہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَعِيفِ إِبْرَاهِيمَ الْمَكْرُومِ

کیا پہنچی تجھ کو بات ابراہیم کے مہمانوں کی جو عزت والے تھے۔

حضرت موسیٰ کے حالات میں ایک جگہ نہیں بلکہ دو جگہ فرمایا ہے:

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى

کیا پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی

حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے لیے بھی قرآن میں لفظ حدیث آیا ہے

وَإِذْ أَسْرَأَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا

اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی عورت سے ایک بات

مزید برآں یہ کہ اللہ پاک نے قرآن میں ایک مقام پر حضور انور کو حکم دیا ہے

أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ قرآن کی زبان میں دین کی نعمت کو پیش کرنے کا نام حدیث ہے۔ اللہ اکبر! امت کی علمی دیانت کو کن لفظوں میں سراہا جائے جس نے اپنے رسول کی سنت کی تاریخ اور تعلیمی زندگی کے وقائع کے لیے قرآن سے الگ ہو کر نام بھی تجویز کرنا گوارا نہیں کیا۔

حدیث کا صحیح مقام

تشریحات بالا سے یہ امور واضح ہو گئے کہ

۱۔ دین میں قرآن و سنت دونوں حجت ہیں۔ دونوں قطعی اور یقینی ہیں۔ دونوں کی حفاظت ہوتی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کو علم اور دوسرے کو عمل کی صورت میں امت کے پاس چھوڑا ہے اور پورا پورا اطمینان کر لیا کہ دونوں محفوظ ہو چکے ہیں۔ حضور انور کے بعد خلفاء راشدین نے دونوں کی حفاظت کی اور دونوں کی نشر و اشاعت کو اپنا اہم دینی فریضہ قرار دیا۔

۲۔ حدیث تاریخ سنت کا نام ہے اور سنت شناسی کا ذریعہ ہے۔ اس کے فنکاروں کو محدثین کہتے ہیں۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کا مقام دین کی زندگی میں کیا ہے؟ جنہوں نے منصب رسالت کی عظمت و عزت کو گھٹانے اور نبی کی سنت سے امت کا رشتہ توڑنے اور سنت کی حیثیت کو لوگوں کی نگاہوں میں مشتبہ بنانے کے لیے یہ بات گھڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف ایک ہی قسم کی وحی نازل ہوئی ہے جو قرآن کی صورت میں موجود ہے اور اس سے الگ کسی قسم کی وحی کو ماننا یہودیت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی بنیاد پر سنت کی تقدیس کو داغدار بنانے کے لیے یہ عمارت بھی بنائی ہے کہ سنت چوتھ کی وحی نہیں ہے اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک اجتہادی رائے ہے جسے قانونی لحاظ سے واجب الاتباع نہیں کہا جاسکتا۔ اس انداز فکر کی لغویت بالکل واضح ہے کیونکہ قرآن ہی سے ثابت ہے کہ وحی متلو کے علاوہ بھی بکثرت نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بلکہ خدا کے ہر پیغمبر پر وحی نازل ہوتی رہی ہے جس پر خود عمل کرنا اور جس کی تعمیل پوری امت سے کرنا انبیاء علیہم السلام کے مقاصد بعثت میں شامل تھا۔

قرآن اور سنت میں فرق

لیکن وحی ہونے کے لحاظ سے قرآن و سنت میں علماء نے جو جو ہری فرق بتایا ہے وہ بھی گوش گزار فرمایا ہے۔ اور قرآن کی بیان کردہ وحی کی قسموں میں قرآن و سنت دونوں کا مقام معلوم کر لیجئے۔
 دراصل قرآن ہر پاسنت دونوں اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ وحی ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن حکیم وحی ہونے کے ساتھ اپنے اندر شانِ عجاز بھی رکھتا ہے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے اس کی کتابت کا اہتمام فرمایا۔ برخلاف اس کے سنت چونکہ معجزہ نہ تھی۔ اس کے الفاظ نہیں بلکہ معانی و مطالب آپ پر نازل ہوتے تھے اور اس کو آپ اپنے لفظوں میں ادا فرماتے تھے اور یہ الفاظ بھی حسب ضرورت مختلف ہوتے تھے۔ کیونکہ آپ کو مختلف طبائع اور مختلف مذاق کے لوگوں کو سمجھانا پڑتا تھا اس لیے اس کے لفظوں کی بعینہ تلمذ کا حکم نہ تھا۔ بالفاظ دیگر قرآن و سنت میں وہی فرق ہے جو اردو زبان میں نامہ و پیام میں ہوتا ہے۔

امام الحرمین کا نظریہ

یہ فرق حافظ جلال الدین السیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں امام الحرمین کے والد امام ابو محمد الجونی سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ کلام دو قسم کا ہے ایک قسم یہ کہ اللہ سبحانہ حضرت جبریل سے فرماتے کہ ہمارے رسول کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ

۱۔ حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں کہ امام الحرمین دو عظیم المرتبت شخصیتوں کا لقب ہے ایک حنفی اور دوسرے شافعی۔ حنفی تو ابوالمظفر یوسف القاضی الجرجانی۔ اور دوسرے شافعی یعنی ابوالمعالی عبد الملک ابن الامام ابو محمد عبد اللہ بن الجونی المتوفی ۴۷۸ھ ہیں۔ چونکہ آپ کا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں جگہ قیام رہا اور آپ نے دونوں جگہ تدریس و افتاء کا کام کیا۔ اس لیے آپ کو امام الحرمین کہتے ہیں۔ امام غزالی نیشاپور میں تشریف لاتے تو امام الحرمین ہی کے پاس ہے اور ان کی ہی محنت سے امام غزالی ہر فن مولیٰ بن گئے۔ اسی سے اندازہ لگائیے کہ جن کے غزالی شاگرد ہوں خود ان کی جلالت علمی کا کیا حال ہوگا۔

اللہ سبحانہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں کام کرو ایسے کرو حضرت جبریل
رب العزت کا پیغام سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ بعد ازیں رسول خدا صلی اللہ علیہ
وسلم کے پاس تشریف لاتے ہیں اور اللہ سبحانہ کا پیغام پہنچاتے ہیں
قال له ما قال رب، ولم تکن العبارة تلك العبارة یعنی بات
اللہ سبحانہ کی ہوتی ہے اور عبارت حضرت جبریل کی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے معتمد سے کہے کہ فلاں شخص
سے کہو کہ بادشاہ کہتا ہے کام ٹھیک کیا کرو، فوج تیار رکھو۔ اس پیغام
کو اگر قاصد اپنے الفاظ میں یوں پہنچائے کہ سست مت ہو۔ محنت کرو۔ اور
فوجی نظام کو پامال نہ ہونے دو تو تبیر کے اس اختلاف سے ادائے
پیغام میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اور اسے فرض رسالت کی ادائیگی
میں کوتاہی کا نام نہیں دیا جائے گا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ سبحانہ
حضرت جبریل سے کہیں کہ یہ خط ہمارے رسول کو جا کر سناؤ اور اس
کے سامنے پڑھو۔ حضرت جبریل تشریف لاتے ہیں اور بلا کم و کاست
اور بغیر رد و بدل خط آکر سناتے ہیں اور ان کے سامنے پڑھ دیتے ہیں۔

حافظ جلال الدین السيوطی کی تائید

حافظ جلال الدین السيوطی فرماتے ہیں کہ دوسری قسم قرآن اور پہلی قسم سنت ہے اور امام جوینی کے
نظر یہ کی تائید میں لکھتے ہیں۔

وقد رآيت من السلف ما يعضد كلام الجويني۔

میں نے سلف سے ایسی چیز دیکھی ہے جس سے جوینی کے کلام کی تائید
ہوتی ہے۔

گرچہ باقرآن یعنی نامہ اپنے الفاظ و معانی دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ سنت معجزہ نہیں ہے
قرآن میں ایک لفظ بلکہ ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل جائز نہیں ہے۔ لیکن سنت یعنی پیام

روایت بالمعنی ہے۔ یعنی اصل مقصود مولیٰ سبحانہ کا ہے اور الفاظ کا جامہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ہے۔

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ چونکہ سنت کا آغاز ہی روایت بالمعنی سے ہوا ہے اس لیے اس میں روایت بالمعنی جائز ہے اور قرآن پہلے ہی چونکہ روایت باللفظ میں وحی ہوا ہے اس لیے اس میں روایت بالمعنی جائز نہیں ہے کیونکہ پیام میں اگر پیامی آپ کا منشا اور مافی الضمیر صحیح طور پر مرسل الیہ تک پہنچا دیتا ہے تو پیام رسائی کا مقصد حاصل ہو گیا خواہ پیغام رساں اسے آپ کے الفاظ میں نہ پہنچائے بلکہ اکثر اوقات اس کے لیے الفاظ میں تبدیلی کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن نامہ کی صورت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ان ہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگر قاصد نے بیچ میں خط کو چاک کر ڈالا اور اسی مضمون کا دوسرا خط تحریر کر دیا یا اس کا مطلب ہی بلا کم و کاست زبانی جا کر بیان کر دیا تو وہ کسی طرح اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوا بلکہ الٹا خیانت کا ملزم اور بددیانتی کا مرتکب ٹھہرا۔

سنت بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے

سنت بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے مگر اس کی نوعیت پہلی قسم کی ہے جس میں الفاظ کی بعینہ ادائیگی ضروری نہیں ہے اور قرآن حکیم کی نوعیت دوسری قسم کی ہے۔ یہاں اصل لفظ ہیں جو روح القدس کے ذریعے حق تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور آپ کے ذریعے امت تک پہنچے۔ ان میں نہ روایت بالمعنی کی اجازت ہے نہ کسی قسم کے

لہ علماء نے تصریح کی ہے کہ قرآن نظم و معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ درایہ میں ہے ان القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعاً ابوالحسن مرغینانی رقمطراز ہیں انا امرنا بحفظ اللفظ والمعنی فانہ دلالة علی النبوة شرح اصول میں علامہ عبدالغفر بن بخاری لکھتے ہیں القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعاً ان تصریحات کا مقصد یہی بتانا ہے کہ قرآن کی حیثیت نامہ کی ہے نہ کہ پیام کی۔ اسی بنا پر ترجمہ قرآن کو ہم قرآن نہیں کہہ سکتے۔ اُلوسی لکھتے ہیں فلا شک ان الترجمة لیست بالقرآن نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم ہے نہ کہ ترجمہ قرآن کا فاعل و اما تیسرے من القرآن اور قرآن نام ہے نظم و معنی دونوں کا۔

تغیر و تبدل کا اختیار۔ ہاں ترجمہ و تفسیر کی اجازت ہے لیکن اسے کلام الہی نہ کہا جائے گا یہ بات بھی خود قرآن ہی کی بیان کردہ حقیقت ہے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔

إِذَا قَرَأْنَا ۖ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ
جب ہم پڑھیں تو ساتھ رہ اس پڑھنے کے بلاشبہ ہمارے ذمے ہے
اس کا بیان۔

یہاں دعویٰ یہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد قرآن کا بیان بھی اللہ سبحانہ کے ذمے ہے۔ اگر قرآن کا یہ بیان خود قرآن سے کوئی علیحدہ چیز ہے اور یقیناً ہے کیونکہ اگر قرآن ہی کو قرآن کا بیان بتایا جائے تو پھر اس کے لیے بھی قرآن ہونے کی وجہ سے بیان کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ ایک غیر متناہی ہو جائے گا، ماننا پڑے گا کہ بیان قرآن خود قرآن سے الگ ہے جو قرآن نہیں ہے۔ اگر قرآن سے الگ ہے تو اللہ سبحانہ کی جانب سے ہے اور بذریعہ وحی ہے۔ یہ وحی جس کے ذریعے قرآن کا بیان عمل میں آیا ہے۔ کون سی ہے؟ خود قرآن نے نزول وحی کی تین صورتیں بتائی ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بآذُنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ مُّبِينٍ۔

کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر ان کے سے یا پر وے کے پیچھے سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے تحقیق وہ سب سے اوپر ہے محمول والا۔

۱۔ وحی

دوم : مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ

سوم : يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بآذُنِهِ مَا يَشَاءُ۔

نزول قرآن کے لیے جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ تیسری ہے یعنی بواسطہ فرشتہ اللہ سبحانہ وحی فرماتے مگر فرشتہ آنکھوں سے نظر نہ آئے بلکہ براہ راست نبی کے قلب پر فرشتہ کا نزول ہوا۔ یہی صورت ہے جسے حدیث میں یا تینی مثل صلصلة الجرس سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی کو حدیث میں ہوا شدہ علیٰ فرمایا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم پر زیادہ ترویج اسی طرح آتی تھی۔ اسی صورت کو حافظ سیوطی نے اصوب الحالین بتایا ہے علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ نزولِ قرآن اس طرح ہوا ہے کہ فرشتہ اللہ سبحانہ سے روحانی طور پر وحی حاصل کرتا ہے اور اسے لے کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے اور آپ کو القا کرتا ہے۔ اس صورت میں یقیناً بیانِ قرآن کا نزول نہیں ہوا ہے۔ ایسی ہی وہ صورت نہیں ہے جسے قرآن میں من وراء حجاب کہا ہے۔ نزولِ بیان کے لیے اگر کوئی صورت ہے تو تیسری ہے جسے قرآن وحیا کہہ رہا ہے جس میں نفث فی الردع، الہام اور روایات صادقہ سب داخل ہیں۔ حضرت امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ نے المرسلہ میں اب نہیں بلکہ اب سے بارہ سو سال پہلے بتا دیا ہے کہ صرف سنتِ قرآن کا بیان ہے۔ اور یہ بیان اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی آیا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ کلامِ الہی کی تین صورتوں میں سے جس صورت میں سنتِ آپ پر نازل ہوتی ہے۔ وہ وہی ہے جسے قرآن نے وحیا کہا ہے اور جس میں نفث فی الردع یا اراء وغیرہ داخل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

المرسلہ۔ یہ اصول فقہ میں امام شافعی کی لکھی ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ انصاف میں رقمطراز ہیں۔ مختلف نصوص میں مطابقت کرنے کے لیے قواعد بنائے تھے اس لیے اجتہادی مسئلوں میں بڑا رخنہ پڑتا تھا۔ حضرت امام شافعی نے اس کے قواعد بنائے اور ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ و هذا اول تدوین کان فی اصول الفقہ (ص ۲۸)

در اصل یہ کتاب امام شافعی نے امام عبد الرحمن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے امام شافعی کے مشہور شاگرد ابو ثور کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ امام عبد الرحمن بن مہدی نے امام شافعی کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ ایسی کتاب لکھیں جس میں قرآن کے معانی و مطالب ہوں اور جس میں اخبار و احادیث کی اقسام حجت، اجماع اور کتاب و سنت کے ماسخ و منسوخ کا تذکرہ ہو۔ امام ابو ثور فرماتے ہیں فوضع لہ المرسلۃ اس درخواست کے مطابق امام شافعی نے المرسلہ لکھا۔ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۶۵ حافظ ابن حجر عسقلانی نے توالی التامیس میں اس خط کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے کتب عبد الرحمن بن مہدی الی الشافعی وهو شاب ان یضع لہ کتاباً فوضع لہ کتاب المرسلۃ (ص ۵۵) الحاصل اصول فقہ کی کتاب المرسلہ امام عبد الرحمن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔

القی فی روعہ کل ما سن و سنتہ الحکمۃ الذی القی فی روعہ من اللہ
فکان بما القی فی روعہ سنتہ

آپ کی تمام سنت آپ پر القاء کی گئی۔ سنت ہی وہ حکمت ہے جو
آپ پر القاء ہوتی لہذا سنت نبوی اللہ سبحانہ کی جانب سے القائندہ ہے

قرآن میں حکمت سے مراد سنت ہے

یہ صرف امام شافعی کی رائے نہیں کہ حکمت سے مراد سنت ہے بلکہ قرآن کے مطالعہ سے بھی
یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکمت سے مراد سنت ہے۔ قرآن میں آپ کو ایسی متعدد آیات ملیں گی
جن سے معلوم ہوگا کہ حکمت بھی قرآن کی طرح اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل ہوتی ہے۔ سورہ نسا
میں ایک جگہ ارشاد ہے :

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ
تَكُنْ تَعْلَمُ .

اور اللہ نے ہماری تجھ پر کتاب اور حکمت اور تجھ کو سکھایا وہ باتیں جو
تو نہ جانتا تھا۔

سورہ بقرہ میں ایک موقع پر فرمایا ہے :

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ .

اور یاد کرو اللہ کا احسان تم پر ہے اور اس کو کہ جو ہماری تم پر کتاب
اور علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ .

ان آیات میں اور اس طرح کی دوسری آیات میں کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد
ہے۔ کیونکہ حکمت کا ذکر قرآن کے ساتھ آیا ہے چنانچہ امام شافعی نے اپنے ایک مناظرے میں اسے
دلائل سے ثابت کیا ہے اور جب ان سے پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ اس قسم کی آیات
میں حکمت سے کیا مراد ہے آپ نے جواباً فرمایا کہ :

حکمت سے مراد سنت ہے۔ سائل نے کہا اس کا بھی امکان ہے
کہ يعلمہم الكتاب والحكمة کا یہ مطلب ہو کہ رسول کتاب کی

تعلیم دیتا ہے اور خصوصی طور پر حکمت کی اور حکمت سے مراد اللہ کے احکام ہیں۔ امام شافعی نے جواب دیا کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول اللہ کی جانب سے لوگوں کے سامنے ایسے ہی بیان کرتا ہے جیسا کہ اس نے ان کے سامنے تمام فرائض نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کو پیش کیا ہے اور اس طرح گویا خود اللہ نے کتاب کے ذریعے فرائض کو محکم بنا دیا ہے اور اللہ نے خود ہی بیان کر دیا کہ یہ فرائض زبان نبوت پر کیسے ہیں؟ مخاطب نے کہا کہ ٹھیک ہے ایسا ہی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اگر یہی مطلب ہے تو پھر اس کا پتہ بغیر خبر نبی کے کیسے ہو سکتا ہے اس صورت میں بھی ارشادات نبوت کی ضرورت ہوگی۔ سائل بولا اگر کتاب و حکمت دونوں سے مراد ایک چیز ہو اور کلام میں صرف تکرار ہی ہو۔ امام شافعی نے فرمایا یہ آپ ہی بتائیے کہ کون سی چیز پسندیدہ ہے کتاب و حکمت دونوں الگ ہوں یا دونوں کا مطلب ایک ہو۔ سائل نے جواب دیا دونوں کا احتمال ہے چاہے تو کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے سنت ہو جیسا کہ آپ کا خیال ہے اور چاہے دونوں سے ایک ہی مراد ہو۔ امام شافعی نے فرمایا زیادہ قرین عقل یہی صورت ہے کہ کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہے جیسا کہ میرا خیال ہے اور اس پر قرآن میں شہادت ہے۔ سائل نے پوچھا کہ قرآن میں کون سی شہادت ہے امام شافعی نے جواب میں قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَإِذْ كُنَّا نَمُوتُ فَنُحْيِيهِمْ لِقَاءَ رَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْسِدُونَ

سورۃ احزاب کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں کی طرح حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاوت ازواج مطہرات کے گھروں میں ہوتی تھی۔ اور تلاوت کا مطلب جیسا کہ امام شافعی نے بتایا ہے یہ ہے کہ

انما معنی التلاوة ان ينطق بالسنة كما ينطق بالقراءان

تلاوت کے معنی یہ ہیں کہ سنت کو بھی ویسے ہی بولا جاتا ہے جیسے قرآن کو۔

نور سوچئے کہ ازدواج مطہرات کے گھروں میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآن کے سوا کیا سناتے تھے۔ اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ آپ کی سنت تھی اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے تذکار کا حکم ہے اس لیے اسی آیت سے سنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی بدیہی ہے کہ علم و ذکر خود مقصود بالذات نہیں بلکہ عمل کے لیے مقصود ہیں۔ اس لیے اسی آیت سے سنت پر عمل کا وجوب بھی معلوم ہو گیا۔ اور جب سنت کا دوسرا نام حکمت ہے تو ان آیات سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سنت بھی منزل من اللہ اور وحی خداوندی ہے۔

قرآن ہی کی ان تصریحات کی بنا پر تمام ائمہ اور علماء بر سلف اس پر متفق ہیں کہ بعلمہم الكتاب والحكمة اور اس طرح کی دوسری آیات میں جو حکمت کا لفظ آیا ہے اس سے مراد سنت ہے اور سنت بھی وحی الہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم لکھتے ہیں یہ

اللہ سبحانہ نے اپنے رسول پر دو قسم کی وحی نازل کی اور دونوں پر ایمان لانا اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا اور وہ دونوں قرآن و حکمت ہیں۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم نے وہی آیات تلاوت فرمائی ہیں جن میں کتاب و حکمت کی تشریل و تعلیم کا ذکر ہے۔ ان آیات کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

کتاب تو قرآن ہے اور حکمت سے باجماع سلف سنت مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے پاکر جو خبر دی ہے اور اللہ نے رسول کی زبان سے جو خبر دی دونوں واجب التصدیق ہونے میں یکساں ہیں۔ یہ اہل اسلام کا بنیادی اور اتفاقی مسئلہ ہے۔ اس کا انکار وہی کرے گا جو ان میں سے نہیں ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز بھی دی

گنتی یعنی سنتِ الہی

پھر یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ نے قرآن کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا اور قرآن کے بیان کو اپنا بیان بتایا ہے۔ مگر قرآن میں دوسری جگہ قرآن کے پڑھنے اور قرآن کے بیان کو حضور کا کام بتایا ہے لَتَقْرَأُوا عَلَی النَّاسِ عَلٰی مَمْلُکَتٍ یَّعْنٰی تاکہ آپ پڑھیں لوگوں کے سامنے آہستہ آہستہ اور اُنزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّکْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت تاکہ بیان کر دے تو لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتاری گئی ان کی طرف۔ اس آیت میں للناس اور ما نزل الیہم لاکر یہ بتایا ہے کہ کتاب کے ساتھ نبوت آنے کی ضرورت ہی اس لیے پیش آئی کہ نبوت کے بیان کے ذریعے کتاب الہی کا منشا صاف اور واضح ہو کر آئے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں :

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق سے کمر روانہ فرمایا تاکہ اس کو سب ادیان پر غالب کرے۔ ان پر وہ کتاب اتاری جو عمل کرنے والوں کے لیے متراسر نور و ہدایت ہے اور اپنے نبی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرآن کے ظاہر، باطن، خاص، عام اور نسخ منسوخ بتائیں۔ لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کتاب اللہ کے مفہوم معنی کے مبین تھے۔ اس کام کو صحابہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جن کو اللہ نے اپنے نبی کی رفاقت کے لیے منتخب کیا تھا۔ انہوں نے حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان اور توضیح نقل کی ہے۔ اس مشاہدہ کی وجہ سے وہی سب زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاننے والے اور اس بات سے واقف تھے کہ قرآن کی آیت میں اللہ کی مراد کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کی مراد بتانے والے صرف صحابہ کرام ہیں۔

امام ابو حنیفہ کے بارے میں امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ :

جو حدیثیں صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہیں۔ نیز جو
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے امام ابو حنیفہ اس کو
اپناتے ہیں۔

حافظ ذہبی نے امام سیحی بن معین کی سند سے امام اعظم کا جو ارشاد نقل کیا ہے اس سے بھی حدیث
کے قرآن کا بیان ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:
میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی ان صحیح حدیثوں سے جو ثقات کے ذریعے
مشہور ہوئی ہوں اور اگر یہاں بھی نہ ملے تو پھر صحابہ میں جس کا قول چاہتا
ہوں لیتا ہوں۔

صرف یہی نہیں بلکہ کئی دوسرے مواقع پر بھی انہوں نے فرمایا ہے کہ فقہ اسلام اور قوانین اسلام تک
پہنچنے کے لیے سنت ضروری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

قرآن میں اللہ سبحانہ نے ایک سے زیادہ ارشادات میں اتباع رسول کا حکم دیا ہے اور حکم بھی اس
بارے میں مطلق اور بے قید ہے۔ یعنی اتباع کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے
کسی خاص گوشے کی تعین نہیں کی۔ یہ ایک طرف اگر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ذات نبوت
زندگی کے ہر گوشے میں واجب الاتباع ہے تو دوسری طرف اس میں اس بات کی بھی رہنمائی ہے
کہ پیغمبر اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں معصوم ہوتا ہے جیسے آپ کی زندگی میں آپ کی پیروی ضروری
تھی اسی طرح آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ارشادات، اخلاق، اعمال اور احوال کی روشنی
میں زندگی کا نقشہ تیار کرنا ضروری ہے۔ غرض سنت قرآن کا بیان ہے۔ اس کے مجمل کی تبیین ہے
اس کے معنی کی توضیح و تائید کرتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

ادل قرآن کی حیثیت متن کی اور سنت کی شرح کی ہے پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن
میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا اقرار و انکار دوسرے کے اقرار و انکار کے مترادف ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن کی طرح اس کا بیان بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ فرق صرف

یہ ہے کہ ایک ما انزل اللہ جو کچھ اللہ نے آمارا، اور دوسرا ما اراک اللہ، جو کچھ تم کو اللہ نے دکھایا، ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

دوم یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرآن کے مفسر تھے۔ آپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ آیات قرآنی کی تفسیر و تاویل کرے۔ اس لیے صرف سنت ہی قرآن کا بیان ہے اور یہ بیان سنت کے علاوہ کسی دوسری راہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

سوم یہ کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اثر مروی نہ ہو تو صحابہ تفسیر کا حق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے قرآن اترا ہے۔ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیات قرآنی کی تاویل سنی اور جو سنت سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔

بہر حال سنت بھی اللہ پاک کی وحی ہے مگر اس کی حیثیت پیام کی ہے اور قرآن بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے اور اس کی حیثیت نامہ کی ہے۔ سنت میں روایت بالمعنی جائز ہے مگر قرآن میں روایت بالمعنی ناجائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں اعجاز کے ساتھ نشانِ تبد بھی ہے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں :

لے جلال الدین لقب، ابو الفضل کنیت، عبدالرحمن بن الکمال نام ہے۔ انوار کے دن یکم رجب ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے، ۸ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا بعد ازیں علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ کاشغری نے طبقات میں خود ان کی زبانی نقل کیا ہے کہ تین سو ساतذہ سے علمی استفادہ کیا ہے۔ ۱۷ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون سے نہ صرف فارغ ہو چکے تھے بلکہ میدانِ تالیف میں بھی قدم زن ہو گئے تھے۔ عربی ادب اور حدیث میں علامہ تقی الدین شبلی حنفی کے شاگرد ہیں۔ چھ علموں میں اجتہاد ہی شان رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، معانی، بیان۔

ان کی تصانیف کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے اپنے تئیں اجتہاد کے مدعی تھے مگر فرماتے تھے کہ اجتہاد دو قسم کا ہوتا ہے، اجتہاد مطلق، اجتہاد نفسی،

اجتہاد مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہے اور دوم تا قیامت باقی ہے اور مجتہد منتسب ہونے کا ان کو دعویٰ تھا۔ ہمیشہ امام شافعی کے مذہب کے مطابق مسئلہ بتاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ پوچھنے والا مذہب دریافت کرتا ہے میرا اجتہاد نہیں پوچھتا۔ اللہ اکبر! اللہ کے دین میں کس قدر احتیاط ہے تبیین الصیغہ کے نام سے امام اعظم کے مناقب پر کتاب لکھی ہے۔ ۹۱۱ھ میں بعمر ۸ سال دس ماہ گیارہ دن وفات پائی۔ (استحاف)

والسنة في ذلك ان المقصود منه التبعيد والاعجاز به

راز اس میں یہ ہے کہ قرآن سے مقصود تبعید اور اعجاز ہے۔

برخلاف سنت کے کہ اس کے الفاظ میں اعجاز نہیں بلکہ اس کے معانی میں شانِ تبعید ہے اور سنت معنی ہی کے لحاظ سے متواتر بھی ہے چنانچہ علامہ الجزائری رقمطراز ہیں۔

المرجح انه ليس في السنة متواتر الا التواتر في المعنى دون اللفظ۔

راجح یہی ہے کہ سنت میں تواتر لفظی نہیں بلکہ صرف تواتر معنوی ہے۔

اور عمل کے لیے معنی ہی کے متواتر ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے الفاظ میں نہ تبعید ہے اور نہ اعجاز۔ اسی بنا پر متواتر سے بحث کرنا محدثین کا کام نہیں۔

ان المحدثين لا يبحثون عن المتواتر لاستغنائه بالتواتر عن ايراد سند له۔

محدثین کے یہاں متواتر سے کوئی بحث نہیں ہوتی کیونکہ تواتر کو سند کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

اس موقع پر حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات لکھ گئے فرماتے ہیں کہ اس مقام پر دو اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں:-

۱۔ قرآن اپنے الفاظ اور معانی میں ایک ایسی امتیازی شان رکھتا ہے کہ اس میں کوئی کلام بھی کسی طرح اور کسی وجہ سے قرآن کی ہمہری کا دعویٰ نہیں کر سکتا نہ الفاظ میں اور نہ معنی میں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی غیر عربی میں قرأت ناجائز ہے۔ کیونکہ غیر عربی میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ ہے مگر قرآن ہرگز نہیں ہے۔ قرآن تو نظم اور معنی دونوں کا نام ہے۔ ترجمہ اگرچہ درست ہے مگر قرآن کی طرح اس کی قرأت و تلاوت ہرگز جائز نہیں۔

۲۔ قرآن میں الفاظ کے ساتھ معنی کی بھی ایک ایسی نمایاں حیثیت

ہے کہ کوئی کلام بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے معنوی
 اعجاز میں زیادہ قوت ہے۔ قرآن کی اس آیت میں جو تحدی کی گئی
 ہے وہ ہر قسم کے اعجاز کے پیش نظر کی گئی ہے
 قُلْ لِّئِنْ أَجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ
 هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُوا بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
 لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۝۱۰

امام خطابی فرماتے ہیں:

کلام کی جان تین چیزیں ہیں۔ لفظ، معنی اور نظم۔ قرآن ان تینوں
 میں بہت بلند، اشرف اور افضل مقام رکھتا ہے۔ قرآن کے
 الفاظ سے زیادہ فصیح، مختصر اور شیریں الفاظ آپ کو کہیں نہیں
 ملیں گے۔ قرآن کا نظم اپنی مثال آپ ہے۔ حسن تالیف قرآن کی
 ذاتی خوبی ہے۔ معانی کے لحاظ سے عقلاً سب ہمیشہ قرآن کا لوہا
 مانا ہے۔ یہ تینوں خوبیاں الگ الگ تو ایک سے زیادہ مقامات
 پر موجود ہیں مگر یہ ساری خوبیاں یک جا قرآن کے سوا کہیں
 موجود نہیں ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ الفاظ کی سطح موتیوں سے
 لدی ہوئی ہے۔ حسن کی نظم کی تہ میں سوتیں بہہ رہی ہیں اور
 گہرائی سے معانی اُبل رہے ہیں۔ ۱۰

اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق

اسی بنیادی اور جوہری فرق کو بتانے کے لیے قرآن میں وحی کے متعلق دو قسم کے حکم ہیں
 کہیں وحی الہی کی اتباع پر زور دیا گیا ہے۔ اور کہیں وحی الہی کی تلاوت کا حکم ہے مگر
 قرآن نے ان دونوں میں ایک جوہری فرق قائم رکھا ہے۔ قرآن میں جہاں وحی کی تلاوت
 کا حکم ہے وہاں ماوحی کے ساتھ کتاب کی قید ضرور لگائی ہے مثلاً اتل ما اوحی الیک

من کتاب ربك اور اتل ما اوحى اليك من الكتاب يا اسی قسم کے دوسرے مقامات، لیکن جہاں وحی کی اتباع کا مطالبہ ہے وہاں لفظ کتاب کو ہٹا دیا گیا۔ مثلاً اتبع ما اوحى اليك من ربك اور ان اتبع الا ما يوحى اليك واصبر اور اتبع ما يوحى اليك من ربك اور ان اتبع الا ما يوحى الي من ربى اور لا اقول لكم عندي خزائن الله ولا اعلم الغيب ولا اقول لكم اني ملك ان اتبع الا ما يوحى الي

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات میں جہاں وحی کی اتباع کا تذکرہ کیا ہے لفظ کتاب نہیں لایا گیا۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں نے اپنے مطالعہ قرآنی میں یہی محسوس کیا ہے کہ قرآن یہ جتنا چاہتا ہے کہ وحی جو ذات نبوت پر آتی ہے وہ کتاب تک محدود نہیں ہے بلکہ کتاب سے باہر بھی وحی ہے۔ کتابی وحی کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کے لفظوں میں اعجاز کے ساتھ شانِ تعبد بھی ہے۔ غیر کتابی وحی کا اتباع کیا جاتا ہے۔ گویا تلاوت الفاظ میں تعبد کی وجہ سے کتابی وحی کی خصوصیت ہے اور اتباع کا دائرہ کتابی اور غیر کتابی وحی کے لیے عام ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث ابی سعید کا منشا

اس روشنی میں صحیح مسلم کی اس حدیث کا منشا بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی زبانی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت منقول ہے۔

لا تكتبوا عني و من كتب عني غير القرآن فليسمه وحدثوا عني ولا حرج و من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار۔

مجھ سے نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا وہ اسے مٹا دے مجھ سے حدیث بیان کیا کرو اس میں کوئی سحر نہیں اور جس شخص نے میرے متعلق اراداً جھوٹ بولا اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنالے۔

اگرچہ امام بخاری اور دیگر محدثین کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں بلکہ معلول ہے چنانچہ فظ

ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں:

منہم من اعل حدیث ابی سعید وقال الصواب وقفہ علی

ابی سعید قالہ البخاری

کچھ لوگوں نے حدیث ابی سعید کو معلول قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ابی سعید ہے۔

یعنی ان کی تحقیق میں یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ خود ابوسعید خدریؓ کے ہیں جن کو غلطی سے راوی نے مرفوعاً نقل کر دیا ہے لیکن بالفرض اگر اس روایت کو موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ ممانعت وقتی اس لیے تھی کہ قرآن کے الفاظ میں تبد ہے قرآن سے الگ ہو کر کوئی وحی نہیں جس کے الفاظ میں تبد ہو اور تبدی طور پر جس کی تلاوت کی جاتی ہو، خود انداز بیان بول رہا ہے کہ مقصود یہی ہے۔ فرمایا ہے: لا تکتبوا عنی قرآناً غیر القرآن یعنی مجھ سے تلاوت کی چیز قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو۔ اس ارشاد میں قرآن کی شان تبدی کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی تائید خود حضرت ابوسعید خدری کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں درج کیے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں:

لہ شہاب الدین لقب، ابو الفضل کنیت، احمد بن علی بن محمد بن اکتابی العسقلانی نام ہے۔ تاریخ پیدائش ۴۳۳ھ ہے۔ ابن حجر سے مشہور ہیں۔ سیوطی طبقات میں رقمطراز ہیں کہ حافظ عراقی سے وفات کے وقت دریافت کیا گیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہے فرمایا کہ ابن حجر پھر ابو زرہ نے نظم العقیان فی اعیان الاعیان میں ان کا تذکرہ اس طرح شروع کیا ہے فرید زمانہ حامل لواء السنۃ ذہبی هذا العصر نصارہ وجوہہ الذی ثبت بہ علی کثیر من الاعصار فحارہ امام هذا الفن للمتقدمین و مقدم عسا کہ المسلمین و عمدة الوجود فی التوہین و التصحیح۔ حافظ زین الدین العراقي الشیخ سراج الدین البلقینی، الشیخ برہان الدین الانباسی، علامہ عز الدین بن جماعہ، علامہ مجد الدین یفروز آبادی جیسے اساطین علم کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ ڈیڑھ سو سے زائد تصانیف ہیں۔ ان کی تصانیف میں فتح الباری شرح صحیح بخاری بڑے مکرر کی شرح ہے۔ حافظ سیوطی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ اولین و آخرین میں اس جیسی کتاب نہیں ہے۔

عن ابی نصرۃ قال قلت لابن سعید الخدری الا تکتب ما
 نسمع منك قال انريدون ان تجعلوها مصاحف
 ابونصرۃ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید سے دریافت کیا کہ کیا ہمیں آپ
 سے سنی ہوئی احادیث کو لکھنے کی اجازت ہے فرمایا کیا تم ان کو مٹھانے
 بنا چاہتے ہو۔

ابونصرہ ہی نے حضرت ابو سعید خدری کے حوالے سے اس سوال کے جواب میں کہ ہمیں لکھنے کی
 اجازت دیکھتے یہ بھی نقل کیا ہے :

قال اُردتم ان تجعلوه قرآنًا لالا

فرمایا کیا تم نے اسے قرآن بنانے کا ارادہ کیا ہے نہیں نہیں۔

یہاں ڈاکٹر صبحی صالح استاذ اسلامیات دمشق یونیورسٹی کی رائے ہے کہ ابو سعید خدری کی
 روایت میں لکھنے کی جس ممانعت کا تذکرہ ہے اس کا پس منظر زمانہ نزول وحی میں وحی اور
 اس کی تشریح میں التباس کا اندیشہ ہے۔

معالم السنن میں علامہ خطابی نے اس ممانعت کے عملی مصداق کی توضیح کرتے ہوئے بتایا
 ہے کہ سنت کو قرآن کے ساتھ ایک ہی صحیفہ میں لکھنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ اختلاط نہ
 ہو اور پڑھنے والے کے لیے سامان اشتباہ نہ ہو۔ علامہ خطابی کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

انما نهى ان يكتب الحديث مع القرآن في صحيفة واحدة

لئلا يختلط به ويشبهه على القارئ

ایک صحیفہ میں قرآن کے ساتھ حدیث لکھنے سے اس لیے منع کیا

تاکہ التباس نہ ہو اور فارسی پر مشتبہ نہ ہو۔

راہرمزی نے المحدث الفاضل میں حدیث ابن سعید خدری کا ذکر کر کے لکھا ہے

فاحسبه انه كان ممنوعاً في اول الهجرة وحين كان لا يومن

الاشتغال به عن القرآن

میرا خیال ہے کہ آغاز ہجرت میں ممنوع تھا۔ بالخصوص اس وقت جبکہ اس میں لگ کر قرآن سے ہٹ جانے کا امکان تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت آغاز ہجرت میں ہوتی ہے اور معلوم ہے کہ ابو سبید خدریؓ میں جنگ اُحد میں اتنے کم عمر تھے کہ فوج میں بھرتی ہونے کے شوق میں آئے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کر دیا۔

یہاں اگر حضرت ابو ہریرہ کی ایک اور حدیث پیش نظر ہو تو راہ کی ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت تشریف لائے جب ہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھ رہے تھے۔ فرمایا کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے کہا وہ باتیں جو ہم نے آپ سے سنی ہیں۔ فرمایا کیا تم کتاب اللہ کے سوا کوئی اور کتاب چاہتے ہو؟ تم سے پہلے امتوں کو اس کے سوا کسی چیز نے نہیں گمراہ کیا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے ساتھ دیگر کتابیں بھی لکھ ڈالیں۔

ایک اور روایت اسی کے ہم معنی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب؟ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے حضرت ابو ہریرہ کی اس ممانعتی حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان تمام روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شہد یا اس کے بعد ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بہت ہی عجیب و غریب تقریر فرمائی ہے۔ میں سے نو مسلموں کی ایک جماعت مدینے آئی ان میں کئی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کو قرآن حکیم کی سورتیں یاد کرنے کے لیے دی گئیں کہ پڑھیں اور یاد کریں۔ جب ان لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تقریر سنی تو حسن عقیدت سے یہ

تقریر بھی لکھ لی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نے قرآن کے ان ہی اوراق پر جو انہیں یاد کرنے کے لیے دیے گئے تھے لکھ لی ہے۔

اس بنا پر حضور انور نے فرمایا۔ کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب؟ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔ اور اسی موقع پر یہ بات فرمائی گئی لَا تَكْتُبُوا عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ مِنْ كُتُبٍ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فليحذر۔

حضرت ابوسعید خدری نے حضور انور کا یہی ارشاد حضرت ابوہریرہ سے سنا تو اسے بطور ارشاد نبوت بیان فرمادیا۔ شاید اسی علتِ دقیقہ کے پیش نظر امام بخاری نے اسے موقوف قرار دیا ہے۔ اس صورت میں علتِ ممانعت صرف اختلاط اور قرآن و غیر قرآن کا التباس ہے۔ اس لیے یہ ان احادیث کے معارض نہیں ہے جن میں احادیث لکھنے کی صریح اجازت ہے۔ مثلاً جامع بیان العلم، تقیید العلم اور المحدث الفاضل میں حضور انور کا یہ ارشاد کہ

قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ

علم کو کتاب سے مقید کرو

یا تدریب الراوی میں یہ واقعہ کہ

عن رافع بن خدیج انه قال قلت يا رسول الله انا اسمع

منك اشياء اُفككتبها قال اكتبوا ولا حرج علیہ

رافع کہتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ سے کچھ سنتے رہتے

ہیں کیا ہمیں لکھنے کی اجازت ہے فرمایا لکھو کوئی مضائقہ نہیں ہے

علامہ احمد محمد شاہ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ

اگر حدیث ابی سعید ان احادیث کے بعد میں ہوتی تو تمام صحابہ کو

پتہ ہوتا۔ پوری امت کا اس پر مجتمع ہونا اس بات کی نشانی ہے

کہ فیصلہ یہی ہے اور اجماع تو اتر عمل سے ثابت ہے۔

اور پھر جہاں تک حدیث کے بیان کرنے کی اجازت کا تعلق ہے۔ وہ اس میں صاف اور

صریح موجود ہے کہ حدثوا عني مجھ سے حدیثیں بیان کیا کرو۔ ممانعت تو دراصل قرآن کے

سو کسی دوسری چیز کے لکھنے کی اس بنا پر کی گئی تھی کہ قرآن سے باہر کسی دوسری وحی میں نہ اعجاز ہے اور نہ شانِ تعبد۔ ورنہ نفسِ حدیث بیان کرنے کی اجازت تو خود ابو سعید خدری کی یہ حدیث بھی لے رہی ہے اور کتابت ہی کے متعلق دوسری احادیث میں صاف اجازت آتی ہے۔ چنانچہ ترمذی ہیں:

ایک انصاری صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں بیٹھتے آپ کی باتیں سنتے اور بہت پسند کرتے مگر یاد نہ رہتیں۔ بالآخر انہوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت آنحضرت سے کی کہ یا رسول اللہ! میں آپ سے حدیثیں سنتا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہیں مگر میں انہیں یاد نہیں کر سکتا اس پر آپ نے فرمایا کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو اور اپنے دستِ مبارک سے ان کو لکھنے کا اشارہ فرمایا۔

سنن ابی داؤد اور مسند دارمی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ

لہ جامع ترمذی باب ماجاء فی الرخصة فی کتاب العلم

لہ سلیمان بن الاشعث بن اسحاق بن بشیر نام، ابو داؤد کنیت، عرب کے مشہور قبیلہ ازد سے نسبی تعلق کی وجہ سے ازدی اور سجستان میں بودوباش کی وجہ سے سجستانی ہیں۔ سجستان دراصل مشہور مقام سیستان کی تعریف ہے۔ تاریخ ولادت ۲۳ھ ہے۔ امام احمد، قصبی، ابوالولید طلیاسی، مسلم بن ابراہیم اور یحییٰ بن معین کے شاگرد ہیں۔ علامہ شیخ ابوالاسحاق الشیرازی نے طبقات میں ان کو ضعیفی قرار دیا ہے۔ ان پر فقہی ذوق بہ نسبت دوسرے محدثین کے زیادہ غالب تھا۔ اسی لیے ان کی کتاب میں صرف احادیث احکام ہیں اور فقہی احادیث کا جتنا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر بن زبیر غزالی المتوفی ۳۷۷ھ رقمطراز ہیں۔ احادیث فقہ کی حصہ استیعاب میں جو بات ابو داؤد کو حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین صحاح کو نہیں۔ ان کی وفات جمعہ کے دن ۶ ایشوال المکرم ۲۵۵ھ میں بعمر ۳۷ سال ہوئی اور بصرہ میں دفن ہوئے۔

لہ عبداللہ بن عبد الرحمن نام، ابو محمد کنیت، عرب کے قبیلہ دارم سے نسبی لگاؤ کی وجہ سے دارمی، سمرقند میں رہائش کی وجہ سے سمرقندی ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۷۷ھ ہے۔ یزید بن ہارون (جو کہ امام اعظم کے شاگرد ہیں) جعفر بن عون وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ امام مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور محمد بن یحییٰ زینی نے ان کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ خراسان میں چار شخص حفاظِ حدیث ہیں۔ ابو زرہ، محمد بن اسماعیل بخاری، دارمی، حسن بن شجاع بلخی، عرفہ والے دن جمعرات کو بمقام مرو ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے کے لیے اس کو لکھ لیتا تھا۔ پھر قریش نے مجھ کو منع کیا اور کہنے لگے کہ تم جو بات سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں غصہ میں بھی کلام فرماتے ہیں اور خوشی میں بھی یہ سن کر میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اور آنحضرت سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے اپنی انگشت سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمانے لگے کہ تم لکھو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس سے بجز حق کے کچھ نہیں نکلتا۔

یہ احادیث بتا رہی ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں آمدہ ممانعت خاص تھی اور خصوصیت یہی تھی کہ الفاظ کا تعبد تلاوت کی حیثیت میں قرآن سے باہر کسی چیز میں نہیں ہے اور قرآن و حدیث دونوں کی یہ حیثیتیں آج بھی قائم ہیں۔ اس لیے روایت ابی سعید ان روایات سے معارض نہیں جن میں کتابت کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کا حکم ہے۔

اگرچہ علماء نے یہ فرض کر کے کہ ابوسعید کی روایت معارض ہے اس کے علاوہ اور بھی جوابات دیے ہیں مثلاً :

اول : یہ کہ حدیث ابی سعید موقوف ہے۔

دوم : یہ کہ ممانعت خاص اس شخص کے لیے تھی جس کے حافظہ پر پورا اعتماد تھا۔

سوم : یہ کہ ابوسعید کی حدیث منسوخ ہے۔

علامہ احمد محمد شاہ کا اصرار ہے کہ آخری جواب درست ہے اور دوسرے علماء نے بھی یہی راہ اختیار کی ہے۔ علامہ امیر میانی فرماتے ہیں :

آغاز میں ممانعت اختلاط کے اندیشے کے پیش نظر تھی۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں قرآن نے ابھی گھر نہیں کیا تھا اور حفاظ خال خال تھے جب قرآن سے رائے عامہ میں بستگی پیدا ہو گئی اور قرآن کے اسلوب، کمال بلاغت اور حسن نظم سے تعلق پیدا ہو کر ایسا امتیاز ہی ملکہ پیدا ہو گیا کہ قرآن اور غیر قرآن میں امتیاز کرنے لگے اور التباس کا

اندیشہ جاتا رہا تو ممانعت ختم ہو گئی۔

لیکن حدیث ابنی سعید کا جو محمل ہم نے بتایا ہے اس کو مانتے ہوئے تعارض کا سوال ہی درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اس سے کراہت کتابت پر استدلال کیا ہے یہ ان کی رائے ہے۔ ارشاد نبوت کا یہ مصداق نہیں ہے۔ اس کی تائید ان واقعات سے بھی ہوتی ہے جو خود کتابت حدیث کے سلسلے میں ایک سے زیادہ زمانہ نبوت میں پیش آئے ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پورے دین کی حفاظت کے لیے وہی آسان طریقہ اختیار کیا گیا جو اس دور میں اہل عرب کا فطری اور رائج الوقت طریق تھا۔ قرآن حکیم جو دین کی تمام بنیادی اور اساسی تعلیمات پر مشتمل اور جملہ عقائد و احکام کے متعلق کلی ہدایات کا علمبردار ہے۔ اس کا لفظ لفظ لوگوں نے نوک زبان کیا۔ مزید احتیاط کے لیے خود حضور اقدس نے معتبر کتابوں سے اس کو لکھوایا، حدیث جو شریعت اسلامی کی تمام اعتقادی اور عملی تفصیلات کا نام ہے۔ اس کا قوی حصہ صحابہ نے اپنی عادت کے موافق اس سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا کہ جس اہتمام کے ساتھ وہ اس سے پہلے اپنے خطیبوں کے خطبے، شاعروں کے قصیدے اور حکماء کے مقولے یاد رکھا کرتے تھے اور اس کے عملی حصے پر فوراً عمل درآمد شروع کر دیا گیا، ظاہر ہے کہ اس وقت میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد کو جب قرآن حکیم کا کافی حصہ نازل ہو چکا اور عموماً آبادی قرآنی ذوق سے آشنا ہو گئی۔ اوصغر غزوہ بدر کے بعد مدینے میں بہت سے لوگوں نے لکھنا سیکھ لیا تو پھر حدیث کے لکھنے کا سلسلہ بھی جیسے زمانہ نبوت ہی میں شروع ہو گیا جہاں تک ان واقعات کی تفصیل کا تعلق ہے۔ یہ ایک بڑی طویل طویل داستان ہے۔ ہم یہاں اشارات کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ارشادات نبوت کے لکھنے کا مسئلہ خود زمانہ نبوت ہی میں طے ہو گیا تھا۔

دور نبوت میں حدیث کا کتابی ذخیرہ

اسی کے نتیجے میں حدیث کی کتابت کے کام کا آغاز دور نبوت ہی میں ہو چکا تھا۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض و سنن کے ساتھ دیوانی اور فوجداری ضوابط

لکھا کر لوگوں کو دیے اور احکام و سنن کی یہ کتابیں حضور کی جانب سے باہر کے لوگوں کے لیے اسلام
 شناسی کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر جامع بیان العلم میں رقمطراز ہیں۔
 کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقات
 والدیات والفراتض والسنن یہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات، خون بہا، فرائض اور

سنن پر مشتمل دستاویز لکھی۔

احکام کی یہ تحریری دستاویزیں سرکار نبوت کی جانب سے مارینے سے باہر جانے والے گورنروں
 کو باقاعدہ ملتی تھیں۔

عمر بن حزم صحابی کی تالیف

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشہور صحابی عمر بن حزم کو سحران کا مکر
 بنا کر روانہ فرمایا۔

استعملہ النبی صلعم علی سحران اور استیعاب میں ہے کہ وذا لك سنة عشر

یہ واقعہ سنہ ۸۷ کا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی۔ روانگی
 کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک دستاویز کتابی شکل میں قلم بند کرا کے دی۔
 اس دستاویز میں دیوانی اور فوجداری ضوابط کے ساتھ فرائض و سنن کی بھی تفصیل تھی۔
 چنانچہ حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں۔

ابو یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر نام، ابو عمر کنیت اور قرطبہ (اندلس) سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قرطبی
 ہیں۔ ماہ ربیع الاول ۳۶۸ھ تاریخ ولادت ہے۔ اپنے وطن ہی میں اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب طے
 کیا ہے۔ بہترین تصانیف ان کا علمی کارنامہ ہیں خصوصاً الممہد کے بارے میں حافظ ابن حزم کا فیصلہ ہے کہ
 فقہ حدیث میں میرے علم میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ الاستذکار المذہب، علم الامصار،
 الاستیعاب لاسماء الصحابة، ان کے علاوہ اور بے شمار کتابیں ہیں۔ امام مالک، امام شافعی اور امام اعظم کے فضائل و مناقب
 پر بھی الانتقا کے نام سے کتاب لکھی ہے جمعہ کے دن ربیع الثانی ۴۶۳ھ کو شہر شاطبہ میں وفات پائی۔

ابو داؤد باب کتابت العلم، مسند درمی ص ۶۷، جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۱

کے اسباب ج ۴ ص ۲۹۳، الاستیعاب ج ۲ ص ۴۳۷

و کتب لہ کتابا فیہ الفرائض والسنن والصدقات والدیات
 آپ نے ان کے لیے فرائض، سنن اور صدقات و دیات پر مشتمل
 کتاب لکھی۔

حافظ عسقلانی نے تو نہیں مگر حافظ ابن عبد البر نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ عمر بن حزم کو صرف
 عامل یعنی کمشنر اور انتظامی سربراہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کو لیفقہم فی الدین و
 یعلم القرآن۔ معلم قرآن و فقہ بنا کر بھی روانہ فرمایا۔ یعنی یہ کمشنر ہونے کے ساتھ دین کے
 مفتی اور قرآن کے معلم بھی تھے۔ اور تعلیم و اقتا ہی کے لیے اس دستاویز میں الفرائض،
 السنن قلم بند کیے گئے تھے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ یہ کتاب چمڑے میں تحریر تھی۔ اور
 عمرو بن حزم کے پوتے ابوبکر بن حزم کے پاس موجود تھی۔ ابوبکر خود یہ کتاب میرے پاس
 لے کر آتے تھے اور میں نے اس کو پڑھا ہے۔

عمرو بن حزم نے اس قیمتی دستاویز کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اکیس دیگر فرامین نبوی بھی
 فراہم کیے اور ان سب کی ایک کتاب تالیف کی جو زمانہ نبوت کی سیاسی دستاویزوں اور سرکاری
 پروانوں کا اولین مجموعہ ہے۔

اس کی روایت مشہور محدث ابوجعفر الدہلی نے کی ہے۔ چنانچہ اعلام الساتلین عن کتب
 سید المرسلین کے نام سے ابن طولون نے جو کتاب لکھی ہے اور جو زیور طباعت سے آراستہ
 ہو چکی ہے۔ اس میں حضرت عمرو بن حزم کی یہ تالیف بطور ضمیمہ شامل اور محفوظ کر دی گئی ہے
 آپ آئندہ پڑھیں گے کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے ان ہی عمرو بن حزم کے پوتے
 قاضی ابوبکر کو تدوین حدیث کے کام پر مامور کیا تھا۔ نیز امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ
 ہونے کے بعد جب صدقات کے بارے میں نبوی دستاویز کی تلاش ہوئی تو یہی دستاویز
 امیر عمر کو عمرو بن حزم کی اولاد کے پاس ملی تھی۔ چنانچہ حافظ دارقطنی فرماتے ہیں۔

ان عمر بن عبدالعزیز حین استخلف ارسل الی المدینۃ
 یلمس عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصدقات

فوجده عند ال عمر و بن حزم کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی
عمر و بن حزم فی الصدقات ۱۰

عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ بننے کے بعد مدینہ اس مقصد کے لیے قاصد
روانہ کیا کہ صدقات کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی
دستاویز تلاش کرے۔ یہ دستاویز عمر و بن حزم کی اولاد کے پاس ملی۔

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مالیا فی اور فوجدارمی حصہ کو ابو داؤد، نسائی ابن
حبان اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ امام زہری نے اسی کو قاضی ابوبکر بن حزم سے روایت
کیا ہے۔ چنانچہ امام ابو داؤد نے اپنے مراسیل میں اسے درج کیا ہے۔ حافظ جمال الدین زبیلی نے
مراسیل ابی داؤد کے حوالے سے یہ دستاویز نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

نسخة کتاب عمر و بن حزم تلقاها الائمة الاربعة بالقبول
وہی متوارثہ ۱۱

عمر و بن حزم کی کتاب کو چاروں اماموں نے قبول کیا ہے۔ اور یہ
متوارث ہے۔

بلکہ صاحب الروض الباسم نے بتایا ہے کہ حافظ ابن کثیر نے ارشاد میں اس کے سائے طرق
پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ کتاب ائمہ اسلام میں زمانہ جدید و قدیم دونوں میں برقی جاتی
رہی ہے اور اس پر لوگوں کا اعتماد رہا ہے۔

فہذا الکتاب متداول بین ائمة الاسلام قديماً وحديثاً
يعتمدون عليه ۱۲

اور حافظ یعقوب بن سفیان یہاں تک فرما گئے۔ میرے علم میں عمر و بن حزم کی کتاب
سے زیادہ کوئی کتاب صحیح نہیں ہے۔ صحابہ اور تابعین کا بھی یہ کتاب مسائل میں مرجع تھی۔

كان الصحابة والتابعون يرجعون اليه ويدعون
آراءهم ۱۳

۱۰ دارقطنی ص ۲۱۰ ۱۱ نصب الراویہ للحافظ الزبیلی ج ۲ ص ۲۴۲

۱۲ الروض الباسم ج ۱ ص ۲۴ ۱۳ ایضاً

حافظ محمد بن ابراہیم وزیر لکھتے ہیں کہ یہ امر واقعہ ہے کہ عمرو بن حزم کی کتاب کی مقبولیت پر صدر اول کا اجماع تھا۔

اجماع الصدر الاول علی قبول حدیث عمرو بن حزم لے
احادیث کی کتابوں میں اس کتاب کی جستہ جستہ حدیثیں منقول ہیں اور امام بیہقی فرماتے ہیں
کہ حفاظ حدیث میں سے سلیمان بن داؤد الخولانی، امام احمد، ابو حاتم، ابو زرعة، دارمی اور ابن عدی
نے اسے شراج مستحیج ادا کیا ہے لے
اور تنقیح الانظار میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے لکھا ہے :

اسی حدیث کو مسنداً بھی روایت کیا گیا ہے۔ اور مسلاً بھی مسنداً جن
آئمہ حدیث نے اس کو روایت کیا ہے وہ یہ ہیں۔ امام نسائی نے سنن
میں امام احمد نے مسند میں، امام ابو داؤد نے مراسیل میں، امام دارمی
امام یعقوب بن سفیان، امام ابو یعلیٰ موصلی نے اپنے اپنے مسند میں
نیز حسن بن سفیان، عثمان بن سعید، عبد اللہ بن عبد العزیز بغوی
نے ابو زرعة و مشقی، احمد بن الحسن ابن عبد الجبار صوفی، حامد بن
شعیب، حافظ طبرانی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت
کیا ہے۔ امام بیہقی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث موصول الاسناد ہے۔
اور اس حدیث کو جن لوگوں نے مسلاً روایت کیا ہے وہ
ایک سے زیادہ ہیں لے

کتاب الصدقة

اس تحریری دستاویز کے علاوہ دوسرا تحریری سرمایہ بھی خود نبوت ہی کا ساختہ و پرداختہ
صحابہ کے پاس موجود تھا۔ ابو داؤد اور ترمذی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقة
تحریر فرمائی۔ حضرت ابو بکر صدیق نے اس پر عمل کیا اور حضرت صدیق اکبر کے بعد حضرت فاروق اعظم

کا بھی اسی پر عمل رہا۔ امام ابو داؤد اور امام ترمذی نے اس نوشتہ کی حدیثیں بھی نقل کی ہیں۔ اور امام ترمذی تو یہاں تک لکھ گئے۔

والعمل علیٰ هذا الحدیث عند عامة اهل العلم حضرت عمر کے بعد بہ دستاویز آپ کے خاندان میں رہی۔ امام زہری کہتے ہیں کہ مجھے خود فاروق اعظم کے پوتے حضرت سالم نے یہ تحریر دکھائی ہے میں نے اسے پڑھا ہے اور اسے حرف بحرف زبانی یاد کیا ہے قال ابن شہاب اقرا نسیہا سالم بن عبد اللہ فو عیتہا علی وجہہا۔ اس کتاب کی بھی حضرت عمر بن عبد العزیز نے مدینہ میں گورنری کے زمانے میں حضرت سالم سے نقل لی تھی۔ اور زمانہ خلافت میں اسے اپنی قلمرو میں نافذ کیا تھا۔

واضح ہے کہ حضرت سالم کو بھی عمر بن عبد العزیز نے تدوین سنن کے کام پر مامور فرمایا تھا۔ حافظ جمال الدین زبلی نے نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ میں یہ پوری دستاویز نقل کی ہے۔ بہر حال حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کا تحریری سرمایہ خود نبوت ہی نے اپنے زمانے میں لوگوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ اگرچہ محسوس و مرقی اسوۂ حسنہ کی موجودگی میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسی بنا پر جو دستاویزیں باہر روانہ نہیں کی گئیں۔ ان میں صرف صدقات جیسی چیز پیش پا افتادہ ضرورت کے لیے قید تحریر ہیں لائی گئی۔ باقی اسلام کے

اے محمد بن عیسیٰ بن سورہ نام، ابو عیسیٰ کنیت، شرب کے قبیلہ سلیم سے نسبی لگاؤ کی وجہ سے سلمیٰ اور ترمذی میں بود و باش کی وجہ سے ترمذی ہیں۔ سنن ترمذی، کتاب العلل اور شمائل نبوی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ حدیث کے مشہور اساتذہ کے سلسلے زانوے ادب طے کیا ہے۔ امام بخاری ان کے اساتذہ میں سے ہیں۔ حاکم نے عمر بن عبدک کے حوالے سے بتایا ہے کہ امام بخاری کی وفات کے بعد خراسان میں امام بخاری کا جانشین زہد و تقویٰ اور علم و حفظ میں ابو عیسیٰ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ روتے روتے آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گئے۔ اگرچہ امام ترمذی امام بخاری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں مگر ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ خود استاد نے ان سے حدیث کا سماع کیا ہے بعض مواقع پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں احادیث کی تصحیح کے سلسلہ میں امام بخاری اور مسلم سے اختلاف کیا ہے۔ تاریخ ولادت ۲۰۰ھ اور وفات ۲۵۹ھ بمقام ترمذ ہوتی۔

۱۔ دارقطنی ص ۲۰۹ ۲۔ دارقطنی ص ۲۰۹ ۳۔ تاریخ الخلفاء

۴۔ نصب الرایہ ج ۲ ص ۳۳۸

یہ خود اسوۂ حسنہ موجود تھا۔ لیکن جب مدینہ سے جانے والوں کے لیے دستاویزیں لکھی گئیں تو اس میں صرف صدقات نہیں بلکہ الذیات الفرائض اور اسنان تک قلم بند کیے گئے۔ یہ چند نوشتوں کا حال ہے ورنہ ان کے علاوہ مختلف قبائل کو تحریریں ہدایات، خطوط کے جوابات، سلاطین وقت کے نام دعوت نامے، معاہدات اور صلح نامے۔ اس قسم کا بہت سا تحریریں سرمایہ حضور انور نے چھوڑا ہے علمائے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً کتاب الاموال الامام ابو عبید القاسم بن سلام المتوفی ۳۲۴ھ اعلام السائین حافظ ابن طولون المتوفی ۵۴۳ھ اور الوثائق السیاسیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صحابہ کرام اور کتابت حدیث

حضور ہی کے زمانے میں حضور انور کی اجازت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مجموعے صحابہ کرام نے مرتب کیے۔ مثلاً

صحیفہ صادقہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حضور انور کی اجازت سے آپ کے ارشادات لکھنے شروع کیے۔ کیوں لکھتے تھے؟ خود فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے کے ارادے سے قلم بند کر لیتا تھا۔ یہی لکھی ہوتی دستاویز ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب ہو گئی تھی۔ اس کا نام انہوں نے صادقہ رکھا۔ فرماتے تھے۔ مجھے زندگی میں دو چیزیں مرغوب ہیں رہط اور صادقہ۔ رہط وہ بارغ جو ان کے والد نے وقف کیا تھا اور یہ اس کے متولی تھے۔ اور صادقہ کے متعلق فرماتے ہیں یہ

اما الصادقة فصحيفة كتبتها عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

صادقہ یعنی وہ صحیفہ جو میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھا ہے

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہی صحیفہ ان کی وفات پر ان کے پڑپوتے عمرو بن شیبہ بن محمد بن عبداللہ کو ملا تھا یہ حدیث کی کتابوں میں اس نام سے روایات کا جس قدر ذخیرہ ملتا ہے۔ وہ

اسی صحیفہ کا سرمایہ ہے۔ حافظ زبیلی نے اسے بھی عمرو بن ہزیم کی کتاب کی طرح متواتر قرار دیا ہے۔ امام ترمذی ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں اما اکثر اهل الحديث يحتجون بحديث عمرو بن شعيب و یشتونہ یعنی محدثین کی اکثریت عمرو بن شعیب کی احادیث کو صحیح اور قابل استدلال سمجھتی ہے عبد اللہ کے پڑپوتے یعنی عمرو بن شعیب کی ثقاہت میں کسی کو کوئی کلام نہیں اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ یہ صحیفہ حضرت عبد اللہ ہی کا نوشتہ ہے لیکن چونکہ ان کے والد کا انتقال اپنے والد کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ اس لیے محدثین کا اس میں اختلاف ہے کہ شعیب نے دادا سے پڑھا ہے کہ نہیں؟ اگر پڑھا ہے تو سماع متصل ہے۔ اگر نہیں پڑھا تو سماع مرسل ہے حافظ عسقلانی سید الحافظ سیحی بن معین سے ناقل ہیں۔

وجد شعيب كتب عبد الله فكان يرويه عن جده مرسل
و هي صحاح عن عبد الله بن عمرو وغيره انه لم يسمعها
شعيب نے عبد اللہ کی کتابیں پاتی ہیں اس لیے ان کتابوں کے ذریعے
اپنے دادا سے ان کی روایات مرسل ہیں۔

یہ تو ایک محدثانہ عرف ہے ورنہ آج بھی ہم حدیثیں جن کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔ تو ایک
سیکند کے لیے نہیں سوچتے کہ خود بیان کرنے والے کا کتاب کے موثق سے اسنادی رشتہ
متصل ہے یا نہیں۔

در اصل محدثین کے یہاں بہ نسبت کتابوں کے حافظہ پر زیادہ اعتماد کا اسی طرح رواج تھا۔
جیسے ہمارے عرف میں حافظ کے مقابلے میں کتابوں پر اعتماد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس دور
میں کتابت گویا اہل علم میں ایک بہت بڑی کمزوری سمجھی جاتی تھی۔ اور ان کا یہ طرز عمل صرف
اسنادی رشتہ کو متصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ لیکن آج کی دُنیا میں بہ نسبت راوی کے خود
موثق کی ذات پر اعتماد ہے۔ اس لیے اس نظریہ کا مقام محدثانہ اصطلاح سے زیادہ کچھ
نہیں ہے۔ یہ نسخہ حضرت شعیب کو اپنے دادا سے وراثت میں ملا ہے خواہ شعیب نے
دادا سے پڑھا یا نہیں۔ اور کتب حدیث میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے جس قدر
احادیث کا ذخیرہ ہے وہ سب اسی صحیفہ علمی کا سرمایہ ہے۔ ان کی مرویات کی تعداد ساٹھ

ہے۔ مسند امام احمد میں ان کی حدیثیں ۱۳۳ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

صحیفہ علی مرتضیٰ

یہ صحیفہ چمڑے کے ایک تھیلے میں تھا جس میں یہ صحیفہ پیام سمیت سما جاتا تھا۔ اس کے متعلق خود حضرت علی کا بیان ہے ما کتبتنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا القرآن وما فی هذا الصحیفۃ یعنی ہم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن اور اس صحیفہ کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ یہ وہی صحیفہ ہے جس کے متعلق صحیح بخاری میں حضرت علی کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ

لے موصوف کی حدیث میں اس اسنادی سلسلے کے ساتھ جو وہ عن ابیہ عن جدہ کر کے لاتے ہیں علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ اس ذیلیے سے آئی ہوئی موصوف کی روایات میں حجت و استدلال کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ اگرچہ محدثین کی اکثریت حسب تصریح امام ترمذی اسے حجت سمجھتی ہے مگر کچھ کی رائے میں ان کی یہ روایات قابل حجت نہیں ہیں۔ اس اختلاف کا باعث یہ ہے کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں جدہ کی ضمیر کا مرجع کون ہے اگر ضمیر کا مرجع خود عمرو کی ذات ہے تو اس صورت میں عمرو کے دادا محمد بن عبد اللہ ہیں اور حاصل یہ ہے کہ روایت عمر کے اپنے والد شعیب سے سنی ہے اور شعیب عمر کے دادا محمد بن عبد اللہ سے سنی ہے اور معلوم ہے کہ شعیب کے دادا صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں اس لیے اصطلاح محدثین میں یہ حدیث مرسل ہے اور اگر جدہ کی ضمیر کا مرجع عمرو نہیں بلکہ شعیب تو مطلب یہ ہے کہ عمرو نے روایت اپنے والد شعیب سے سنی اور شعیب نے اپنے دادا عبد اللہ بن عمرو صحابی سے سنی ہے تو اس صورت میں یہ حدیث مرفوع متصل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع جن کے خیال میں شعیب ہے ان کی رائے میں عمرو کی روایات قابل حجت ہیں کیونکہ شعیب کی ملاقات عبد اللہ بن عمرو سے ثابت ہے اور جو لوگ جدہ کی ضمیر کا مرجع عمرو بتاتے ہیں ان کے خیال میں یہ روایات تابعی طور پر صحیح نہیں ہیں اسی بنا پر حافظ دارقطنی نے تصریح کی ہے کہ جن اسانید میں دادا کے نام کی تصریح آجائے وہ بے اعتبار ہیں اور تصریح نہ ہو تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے استدلال نہ کیا جائے کچھ سوسلہ سند محدثین کے یہاں اصح الاسانید ہے امام بخاری فرماتے ہیں کہ امام احمد امام علی ابن المدینی، امام اسحاق بن راہویہ، امام ابو عبیدہ اور سہائے عام اصحاب کی رائے میں یہ سلسلہ سند قابل حجت ہے۔ اُمت میں سے کسی نے اسے رد نہیں کیا ہے۔ امام بخاری پوچھتے ہیں کہ ان آئمہ کے بعد اور کون ہے؟ بلکہ امام اسحاق نے تو اس سلسلہ سند کو الیوب عن نافع عن ابن عمر سے تشبیہ ہی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ اس سلسلہ سند کی جلال و قدر کو آشکار کرتی ہے اور یہ بھی لکھا ہے

ان الاحتجاج بہ هو الصحیح المختار الذی علیہ المحققون من اهل الحدیث وہم اهل هذا الفن وعنه یؤخذ
لے صحیح بخاری

سے منقول ہے کہ مجھے میرے والد نے بھیجا اور کہا کہ یہ کتاب لو اور حضرت عثمان بن عفان کے پاس لے جاؤ اس میں صدقہ کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں۔ نیز اس کتاب میں زکوٰۃ کے علاوہ خون بہا، قیدیوں کی رہائی، فضاصل، حرم مدینہ کے حدود، غیر کی طرف نسبت کا حکم، نقص عہد، غیر اللہ کے نام پر ذبح وغیرہ مسائل و احکام درج تھے۔

صحیفہ صدیقی

حضرت صدیق اکبر نے جب حضرت انس کو بحرین کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا تو حکومت کے واجبات کے بارے میں ایک یادداشت ان کو لکھ کر دی۔ اس دستاویز کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ہذا قرینۃ الصدقۃ التي فرض حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المسلمین والتي امر اللہ بھا علیہ امام بخاری نے اس نوشتہ کی روایات کو کتاب الزکوٰۃ کے تین

۱۔ صحیح بخاری ۲۔ جامع بیان العلم ۳۔ اسلہ کبیرت ابو عبد اللہ نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن میسر بن بزیہ ہے چونکہ برزویہ کے صاحبزادے بیان جعفری کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے اس لیے ان کو نسبت ولایت کی وجہ سے جعفری کہتے ہیں۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ امام بخاری کے دادا ابراہیم بن میسرہ کے حالات کا تاریخ سے ہمیں کوئی پتہ نہیں چلا لیکن امام بخاری کے والد محترم امام مالک، امام حماد بن زید کے شاگرد اور عبداللہ بن المبارک کے صحبت یافتہ ہیں۔ اسماعیل اور امام ابو حفص کبیر خنقی کے درمیان بہت مخلصانہ محبت تھی۔ اسماعیل کی وفات کے وقت امام ابو حفص کبیر موجود تھے۔ اس وقت ان سے اسماعیل نے کہا تھا کہ میں اپنے مال میں ایک درہم بھی حرام یا شبہ کا نہیں پاتا (مقدمہ ص ۴۸) یہ تعلقات اسماعیل کی وفات کے بعد بھی دونوں خاندانوں میں برابر استوار رہے۔ چنانچہ امام بخاری اور امام ابو حفص کبیر کے صاحبزادے ابو حفص میسر مدت تک طلب حدیث میں رفیق اور ہم سفر رہے ہیں۔ ایک بار امام ابو حفص کبیر نے امام بخاری کو اس قدر مال تجارت دیا تھا جس کو کچھ تاجروں نے پانچ ہزار کے نفع سے خریدا اور کچھ اس سے نائد نفع دے کر خریدنے کو آمادہ تھے لیکن امام بخاری نے اپنے ارادے کو بدلنا پسند نہ کیا (مقدمہ فتح) حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام ابو حفص کبیر کو (جو امام ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد ہیں) امام بخاری کے اساتذہ میں شمار کیا ہے اور ان کے حق میں ابو حفص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اس کا شہرہ ہو گا“ امام بخاری جمعہ کے دن ۱۳ شوال ۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے خود فرماتے ہیں کہ گیارہ سال کی عمر میں میں نے امام اعظم کے دونوں شاگردوں امام وکیع اور امام عبداللہ بن المبارک کی کتابیں لو کر لیں (بقیہ حاشیہ ص ۹۶ پر)

مختلف ابواب میں درج کیا ہے اور امام ابو داؤد نے اس صحیفہ کو حدیث کے مشہور امام حماد بن سلمہ سے روایت کیا ہے جس میں حماد خود تصریح کرتے ہیں کہ میں نے خود تمامہ سے اس نوشتہ کو حاصل کیا ہے۔ امام حاکم نے یہ دستاویز نقل کی ہے بلکہ حافظ ابو جعفر طحاوی نے بھی یہ دستاویز بحوالہ حماد بن سلمہ بتاتی ہے مگر اس میں حماد بن سلمہ کی یہ تصریح بھی ہے کہ مجھے ثابت البٹانی نے یہ دستاویز لینے تمامہ بن عبد اللہ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے مجھے یہ دستاویز دی۔ میں نے دیکھا ہے کہ فاذا علیہ خاتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تھی۔

صحیفہ جابر

حافظ ذہبی نے تذکرے میں حضرت قتادہ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ

(ص ۹۶ کا بقیہ حاشیہ) :۔ کمر لی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ صاحب تصنیف ہو چکے تھے۔ آپ کی تصانیف اگرچہ کافی ہیں لیکن ان میں المسند الجامع الصحیح المختصر من اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنتہ و ایامہ جو صحیح بخاری کے نام سے مشہور ہے سب سے زیادہ معمر کی کتاب ہے یہ صرف حدیث ہی کی نہیں بلکہ علوم لوائل کا خلاصہ ہے۔ تاریخ وفات یکم شوال ۲۵۶ھ ہے۔
۱۔ امام ذہبی نے ان کا تذکرہ الامام الحافظ شیخ الاسلام کے پر شوکت القاب سے کیا ہے۔ کنیت ابو سلمہ اور نام حماد بن سلمہ، بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المفضیہ میں، حافظ بزاز نے مناقب میں ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ شہاب بن تعمیر کہتے ہیں کہ امام حماد کو ابدال میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ ذہبی نے انکشاف کیا ہے کہ اسلام میں سعید بن عزیہ کے ساتھ پہلے مصنف ہیں۔ امام عبد الرحمن بن مہدی نے ان کی پارسائی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے اگر حماد سے کہا جائے کہ تم کو کھل مرناسے تو یہ عمل میں اضافہ نہیں کر سکتے یعنی پہلے سے ہی اس قدر ہمہ گیری ہے۔ عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ عابد تو دیکھے لیکن ان سے زیادہ خیر، قرأت قرآن اور عمل لوجہ اللہ پر میں نے مواظب کوئی نہیں دیکھا۔ دس ذی الحجہ بعد نماز عید ۱۶۷ھ میں وفات پائی۔

۲۔ ابو داؤد ص ۲۲۵ ۳۔ مستدرک حاکم ج ۱ ص ۳۹۰ ۴۔ شرح معانی الآثار ص ۷۱۶

۵۔ کنیت ابو عبد اللہ نام محمد بن احمد بن عثمان الترمذی الدمشقی الذہبی ہے۔ علامہ تاج الدین السبکی نے محدث العصر خاتم الحفاظ، امام العصر لکھا ہے۔ فقہ، حدیث، تاریخ، تجوید، رجال میں بے مثال تھے۔ ان گنت (باقی صفحہ ۹۸ پر)

بصرہ میں سب سے زیادہ حافظ تھے۔ ان کے سامنے حضرت جابر کا صحیفہ پڑھا گیا تو ان کو ازبر ہو گیا۔ قرات علیہ صحیفۃ جابر مرتۃ فحفظھا حضرت جابر کا صحیفہ ایک بار پڑھا گیا تو ان کو ازبر ہو گیا۔ حافظ عسقلانی نے طلحہ بن نافع کے ترجمہ میں سفیان بن عیینہ اور امام شعبہ دونوں کا بیان لکھا ہے کہ حدیث ابی سفیان عن جابر انما ہی صحیفۃ ابی سفیان جو حضرت جابر کی حدیثیں بیان کرتے ہیں وہ صحیفۃ جابر ہی سے نقل کرتے ہیں۔

صحیفہ سمرہؓ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام حسن بصری کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت سمرہ بن جندب سے ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا ہے جس کی بیشتر حدیثیں سنن اربعہ میں موجود ہیں امام علی بن المدینی اور امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ اس نسخہ کی سب حدیثیں اسی کی ہیں۔ اسی نسخہ کو امام حسن بصری کے علاوہ خود حضرت سمرہ کے صاحبزادے سلیمان نے بھی ان سے روایت کیا ہے۔ پچاس نسخہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں سلیمان روى عن ابيه نسخة كبيرة۔

۹۲ ص کا بقیہ حاشیہ: کتابوں کے مصنف ہیں امام اعظم کی سیرت پر مستقل رسالہ لکھا ہے تذکرۃ الحفاظ میں ایک مقام پر علم الحدیث اور طلب الحدیث پر ایک بڑا مفید نوٹ لکھا ہے۔ ۹۳ ص میں پیدا ہوئے اور تاریخ وفات ۱۷۷ھ ہے۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۶ لے تہذیب ترجمہ طلحہ بن نافع

۲۔ الحسن بن ابی الحسن نام ابو سعید کنیت۔ مدینہ میں نشو و نما پائی۔ شہادت عثمان کے وقت چودہ سال عمر تھی۔ حضرت عثمان غنی، عمران بن حصین، مغیرہ بن شعبہ اور ان کے علاوہ چند در چند صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ مرسل حدیثیں پیش فرماتے یعنی تابعی ہونے کے باوجود ارشاد کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے۔ اپنے اور حضور کے درمیان واسطہ کا ذکر نہ کرتے جیسا کہ عموماً سعید بن المسیب، سکول دمشقی، ابراہیم نخعی اور وکیعہ اکابر تابعین کا معمول تھا۔ امام محمد بن جریر فرماتے ہیں: ان الناس یاسرہم علی قبول المرسل تا بین سارے کے سارے مرسل کے قبول کرنے پر متفق تھے۔ امام علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ امام حسن بصری کے مراسلات صحیح ہیں (خلاصہ) ان کے متعلق امام اعظم کتاب الآثار میں فرماتے ہیں کہ میں نے امام باقر سے سنا ہے کہ عراق میں حسن بصری جیسا کوئی نہیں (ص ۲۰۹) تاریخ وفات ۱۷۷ھ لے تہذیب ج ۲ ص ۹۳۔

صحیفہ برصغیر

یہ اصل میں حضرت ابو ہریرہ کی تالیف ہے۔ جو انہوں نے اپنے شاگرد ہمام بن منبہ کے لیے ترتیب دی تھی۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہ سے اس صحیفہ کے راوی ہمام ہیں۔ اس لیے صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دراصل اس کا نام صحیفہ ابی ہریرہ لہمام بن منبہ ہونا چاہیے۔ آپ پہلے سن چکے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ صحابہ میں سے اگر کسی کی حدیث دانی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے تو وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے۔ موصوف نے الصحیفۃ الصادقہ کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ شاید حضرت ابو ہریرہ نے ان ہی کی تقلید میں اپنی تالیف کا نام الصحیفۃ الصمیمۃ رکھا ہے بہر حال یہ تالیف عہد صحابہ کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کو دمشق اور برلن میں اس کے دو قلمی نسخے ملے ہیں۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد انہوں نے پہلی صدی ہجری کی اس گراں مایہ تالیف کو شائع کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ مقابلہ کرنے پر نظر آتا ہے کہ بعد کے موقوفوں نے مفہوم تو کیا کوئی لفظ تک نہیں بدلا۔ اس صحیفہ کی ہر حدیث نہ صرف صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے ملتی ہے بلکہ مسند احمد میں آج بھی پورے کا پورا رسالہ بلا حذف و اضافہ موجود ہے۔ اس سے متعلق تفصیلات کے لیے صحیفہ ہمام بن منبہ کا مقدمہ دیکھئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہم نے زمانہ صحابہ میں حدیث کی تدوین پر ان تالیف کا تذکرہ لوگوں کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کیا ہے کہ حدیث کی تدوین ایک سو سال بعد ہوتی ہے۔ یاد رکھتے یہ بہت بڑا سنگین مغالطہ ہے۔ حدیث کے موضوع پر تالیف و تصنیف کے اس قدر سرمایہ ہونے کے۔ باوجود یہ سمجھنا تاریخ سے بہت بڑی بے انصافی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صبحی صالح نے علوم الحدیث میں تفصیلی بحث کی ہے۔

یہ صحابہ کرام کے چند نوشتے ہیں جو بہت سی احادیث پر مشتمل ہیں یا جو مستقل کتاب یا صحیفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ درنہ اگر صحابہ کی ان تمام تحریروں کو یکجا کیا جائے جس میں انہوں نے کسی حدیث کا تذکرہ کیا ہے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تدوین حدیث کے کام کا آغاز دور نبوت ہی میں ہو چکا تھا اور پھر

دو صحابہ ہیں بھی یہ کام ہوتا رہا تحریری بھی تقریری بھی۔ لیکن زیادہ تر توجہ تقریری طور پر کام کرنے کی طرف مبذول تھی کیونکہ — عرب والوں کی تاریخ اور ان کی معاشرت میں علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کا پہلے سے یہی طریقہ رائج تھا۔ وہ اپنے تمام شجرہ ہائے نسب، اہم تاریخی واقعات جنگی کارنامے، بڑے بڑے خطبے، لمبے لمبے قصیدے اور نظمیں سب زبانی یاد رکھتے تھے۔ قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے اپنے لیے اسی طریقے کو سراہا اور خود نبوت اور صحابہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُذْتُوا لَعَلَّهُ

بلکہ وہ آیتیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم ملا ہے۔
یہی طریقہ ارشاد نبوت کو محفوظ رکھنے کے لیے صحابہ نے اختیار کیا اور خود ذات نبوت نے بھی ان کو ایسا ہی کرنے کو کہا تھا۔ چنانچہ وفد عبدالقیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب حاضر ہوا تو آپ نے وفد کو زبانی ہدایات سے نوازا تو یہ خصوصی ہدایت بھی فرمائی کہ

احفظوہن ان کو زبانی یاد کر لو۔

حدیث بیان کرنے والے صحابہ کرام

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جن صحابہ کرام کے ذریعے احادیث کا ذخیرہ اُمت کو ملا ہے اور تاریخ احکام یا تاریخ سنت کی معلومات کا سرمایہ جن اکابر کی وساطت سے کتابوں میں آیا ہے ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں سے صرف چار ہزار مرد و زن ہیں۔ چنانچہ امام حاکم لکھتے ہیں:

اے یعنی جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پڑھا نہیں ایسے ہی تو دین جو وہ لے کر آئے ہیں ان کے صحابہ (جن کو اللہ کی جانب سے علم ملا ہے) کے ذریعے بن لکھے سینہ بسینہ جاری ہو گا اللہ کے فضل سے ان کے ہی سینے اس کے الفاظ و معانی کی حفاظت کریں گے الفاظ کی حفاظت کرنے والوں کو حفاظ و قرار اور معانی کی نگرانی کرنے والوں کو فقہاء و مجتہدین کہتے ہیں صراط مستقیم یہی ہے کہ دین کے پہنچانے میں حفاظ و قرار اور دین کے سمجھنے میں فقہاء پر اعتماد رکھے دونوں میں سے کسی ایک میں بھی خود رانی کرنا خسارے کو مول لینا ہے اور غالباً حدیث افراق میں مانا علیہ و اصحابی سے بھی یہی تینا مقصود ہے۔

لے الخیرات الحسان ص ۱۰

قد روی عنه صلى الله عليه وسلم من الصحابة اربعة آلاف
رجل وامرأة يله

صحابہ میں سے صرف چار ہزار مرد وزن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
روایات بیان کی ہیں۔

اتنی بڑی تعداد میں سے اس قلیل عدد ہی کے ذریعے علوم نبوت ہم تک پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ
صحابہ میں ہر شخص یہ کام نہ کرتا تھا بلکہ خاص خاص وہ حضرات ہی کرتے تھے جن کو اپنی قوت حافظہ
پر پورا پورا اعتماد تھا اور یہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ روایت کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے
ازالۃ الخفا میں لکھا ہے۔

فاروق اعظم عبد اللہ بن مسعود را با جمعی بکوفہ فرستاد و معتقل بن یسار و عبد اللہ
بن معتقل و عمران بن حصیب را بہ بصرہ و عبادہ بن الصامت و ابوالدرداء
را بشام و معاویہ بن ابی سفیان را کہ امیر شام بود قدغن بلیغ نوشت
کہ از حدیث ایشان تجاوز نکنند یلہ

فاروق اعظم نے عبد اللہ بن مسعود کو ایک جماعت دے کر کوفہ روانہ کیا۔
معتقل بن یسار، عبد اللہ بن معتقل اور عمران بن حصیب کو بصرہ اور عبادہ
ابن الصامت ابوالدرداء کو شام، معاویہ ابن ابی سفیان کو جو کہ شام
کے امیر تھے پوری تاکید فرمائی کہ ان کی حدیث سے تجاوز نہ کریں۔

یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ صحابہ میں یہ کام ہر شخص نہیں کرتا تھا اور جو کرتے تھے ان میں
بے حد فرق مراتب تھا۔ اس فرق مراتب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سب سے زیادہ احادیث
کی تعداد جن حضرات سے آئی ہے وہ صرف چار ہیں۔ مثلاً

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، ان
کے بعد اس سے کم تعداد والے تین ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، جن صحابہ کی
روایات ہزار سے زیادہ نہیں وہ صرف دس ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ،
حضرت ام سلمہؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعرؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سعد بن
ابی وقاصؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ۔

وہ صحابہ جن کی روایات سو سے زیادہ ہیں وہ تعداد میں انیس ہیں
حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبادہ بن الصامتؓ، حضرت عمران بن حصینؓ،
حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت ابو قتادہؓ، حضرت بریدہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت
ابو ایوب انصاریؓ، حضرت میسرہؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت ابو مسعود انصاریؓ،
حضرت جریر بن عبداللہؓ، حضرت سہیل بن سعدؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت
ثوبانؓ۔

ان کے بعد سینکڑوں سے نیچے احادیث بیان کرنے والے صرف چوراسی ہیں۔

انیس حدیثیں بیان کرنے والے صرف دو صحابی ہیں۔

اٹھارہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف چھ صحابی ہیں۔

سترہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف تین صحابی ہیں۔

سولہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف تین صحابی ہیں۔

پندرہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف چار صحابی ہیں۔

چودہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف گیارہ صحابی ہیں۔

تیرہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف سات صحابی ہیں۔

سب سے زیادہ تعداد ایک ارشاد بیان کرنے والے صحابہ کی ہے۔ اس کے بعد پھر تین۔ بالترتیب
ہزاروں تک۔

اور جن صحابہ کے ذریعے امت کو اپنے پیغمبر سے یہ علم کی میراث ملی ہے۔ علمائے ان کی زندگیوں
پر مفصل اور مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے قدیم کتاب اس موضوع پر اگرچہ امیڈوٹی کے
خیال میں امام بخاری کی تالیف ہے۔ لیکن اس سے زیادہ قدیم کتاب اس موضوع پر طبقات ابن سعد
ہے۔ صحابہ کے حالات میں اس سے پہلے اتنی بڑی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب عرصہ

منفرد تھی اب یورپ میں چھپ گئی ہے۔ اس کے بعد دوسری کتابیں منصفہ وجود پر آتی ہیں۔ طبع کتابوں میں سب سے مبسوط حافظ ابن حجر عسقلانی کی الاصابہ فی تمیز الصحابہ ہے۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس میں کل صحابہ ۱۲۲۷ کے تراجم آئے ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں تمام صحابہ کو پانچ طبقوں اور امام حاکم نے بارہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقات صحابہ یہ ہیں :

- ۱۔ وہ لوگ جنہوں نے مکہ میں مسلمان ہونے میں پہل کی جیسے خلفاء راشدین۔
- ۲۔ وہ لوگ جو مشرکین مکہ کے دارالندوہ میں مشاورت سے پہلے مسلمان ہوئے۔

۳۔ مہاجرین حبشہ

۴۔ اصحاب عقبہ اولیٰ

۵۔ اصحاب عقبہ ثانیہ

۶۔ وہ مہاجرین جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ جلتے ہوئے قبا میں ملے۔

۷۔ اصحاب بدر

۸۔ وہ صحابہ جنہوں نے بدر اور حدیبیہ کے درمیان ہجرت کی ہے۔

۹۔ اصحاب بیعت الرضوان

۱۰۔ وہ صحابہ جو حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان مہاجر ہوئے۔

۱۱۔ وہ صحابہ جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے۔

۱۲۔ وہ بچے جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح مکہ کے دن اور حجۃ الوداع میں زیارت

کی ہے۔

صحابہ کرام میں حفاظ و فقہاء

پھر صحابہ کرام میں خدمتِ دین کا کام علمی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھا۔
 کچھ تو وہ تھے جن کا کام صرف محفوظ سرمایہ کو آگے پہنچانا تھا۔ یہ احادیث روایت کرتے تھے
 کچھ وہ تھے جن کا کام قرآن و حدیث کے محفوظ سرمائے سے مسائل کا استنباط اور ان میں تفقہ
 اور تدبر تھا۔ اس سلسلے میں حدیث ابی موسیٰ اشعری پر حافظ ابن القیم کی تصریحات آپ پڑھ چکے ہیں۔
 ان دونوں طبقوں میں باہم علمی مسائل پر اپنے اپنے فن کے لحاظ سے گفتگو بھی ہوتی اور فقہاء کی
 جانب سے ان حفاظ پر فقہی اعتراض بھی ہوتے تھے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پیش کیا۔
لوگو! اس چیرے وضو کو جسے آگ نے بدل دیا یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں تو گرم پانی سے وضو کرتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا میرے بھائی! جب تم حضور النور کا ارشاد گرامی سنو تو اس کے لیے مثالیں نہ تراشو۔ مسند امام احمد بن حنبل میں ہے کہ ابو حسان الاعرج کہتے ہیں کہ دو شخص حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس آئے اور انہوں نے ان کو بتایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ
انما الطيرة في المرأة والدابة والدار

بے شک شگون عورت، سواری اور گھر میں ہے

حضرت عائشہؓ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے قرآن الباقی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا یا نہیں ہے۔ حضور تو یوں فرماتے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ شگون عورت، گھر اور گھوڑے میں ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ما اصاب من مصيبة في الارض ولا في انفسكم الا في كتاب

حضرت ابو ہریرہؓ نے بات کا آخری حصہ سنا آغاز نہیں سنا جتنا سنا بیان کر دیا۔

مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے کہ حضرت علقمہؓ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عائشہؓ کے پاس تھے۔ ابو ہریرہؓ آئے حضرت عائشہؓ نے کہا اے ابو ہریرہؓ کیا تم یہ حدیث بیان کرتے ہو کہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت کو تلی کے باندھنے، کھانا پینا بند کرنے کی پاداش میں عذاب ہوا۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ جی ہاں میں نے حضور سے ایسا ہی سنا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ پتہ ہے کہ یہ عورت کون تھی؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ یہ عورت کافرہ تھی۔ خوب یاد رکھو اللہ سبحانہ کے نزدیک مومن کا اس سے کہیں زیادہ اکرام ہے کہ وہ اسے صرف ایک بتی کی وجہ سے عذاب دے۔

یاد رہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ پر حضرت عائشہؓ کے ان تعقیبات سے یہ شبہ ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ اس سے حضرت ابو ہریرہؓ کی شانِ فقاہت پر کوئی حرف آتا ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کے تعقیبات صرف حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ان کی جانب سے ایسے تعقیبات تو ان پر بھی ہیں جو فقاہت میں معروف اور کثیر الفتاویٰ ہیں۔ مثلاً فاروق اعظمؓ، علیؓ بن ابی طالبؓ۔

ابن سعد نے طبقات میں ابن القیم نے اعلام میں حضرت ابو ہریرہ کو ان صحابہ میں شمار کیا ہے جو بیان فتاویٰ و مسائل میں درمیانے درجہ پر تھے۔ کسی صحابی کے کثیر الحدیث اور ضبط و حفظ میں شہرت پالینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ عظیم الفقہ ہوتے ہیں۔ اگر کثرت حدیث اور اسناد و روایت کی فن کاری کی وجہ سے ارباب طبقات نے امام احمد اور امام بخاری کو فقہاء میں شمار نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام احمد اور امام بخاری فقیہ نہ تھے۔ یقیناً تھے لیکن دوسرے ارباب فن کی طرح ان کا یہ فن نہ تھا۔ ایسے ہی حضرت ابو ہریرہ یقیناً فقیہ تھے مگر فاروق اعظم، علی بن ابی طالب اور ابن مسعود کی طرح فنکار نہ تھے ان کی فنکاری تحدیث و روایت تھی۔ علامہ عبدالغفر بن بخاری نے کشف الاسرار میں، حافظ ابن الہمام نے تحریر میں، حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیئہ میں یہ بات پوری قوت کے ساتھ واضح کی ہے۔ حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ فقیہ ہیں اور اسباب اجتہاد سے مالا مال تھے۔

حافظ عبدالقادر قرشی لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ فقیہ تھے ان کو حافظ ابن خرم نے فقہاء صحابہ میں شمار کیا ہے۔ شیخ نقی الدین السبکی نے ان کے فتاویٰ کتابی صورت میں جمع کیے ہیں۔ یہ امر آخر ہے کہ دوسرے صحابہ کے مقابلے میں ان کو فنی شہرت نہ ہو جیسا کہ الوابل الصیب میں ابن القیم حافظ ابن خرم کے حوالہ سے رقمطراز ہیں۔

ابن عباس کے فتاویٰ، تفسیر اور مسائل کا حضرت ابو ہریرہ کے فتاویٰ سے کیا مقابلہ اور کیا نسبت؟ بے شک حضرت ابو ہریرہ حفظ میں صاحب مقام ہیں بلکہ علی الاطلاق پوری امت میں حافظ ہیں۔ حدیث کو جیسا سنا ہے آگے پیش کرتے ہیں۔ ان کی ساری توجہات کا مرکز حفظ حدیث اور ان محفوظ حدیثوں کو آگے پہنچانا ہے اور ابن عباس کی توجہ کا مرکز تفقہ اور استنباط مسائل ہے۔ لیجئے خود ان کے الفاظ پڑھ لیجئے۔

فكانت همته مصروفة الى الحفظ وتبليغ ما حفظه كما سمعه

وهمة ابن عباس مصروفة الى التفقه والاستنباط۔^{۳۷}

ابو ہریرہ کی ساری توجہ حدیثوں کے یاد کرنے اور یاد شدہ حدیثوں کے پہنچانے پر لگی تھی اور ابن عباس کی ہمت و توجہ کا مرکز تفقہ فتاویٰ

اور استنباط مسائل تھا۔

اسی بنا پر اصول کی کتابوں میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ ان صحابہ کی حدیثوں کو جو فقہ و اجتہاد میں معروف ہیں ترجیح دی جائے۔ برخلاف ان کے جو فقہ و اجتہاد میں نہیں بلکہ صرف عدالت و حفظ میں ممتاز و مشہور ہیں۔ ان کی حدیث کو راجح نہیں قرار دیا جائے گا۔ فقہ و اجتہاد میں شہرت رکھنے والوں کی مثال میں خلفاء راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عید اللہ بن الزبیر، حضرت عائشہ، حضرت ابی بن کعب اور حضرت معاذ بن جبل کا نام لیا ہے اور حفظ و عدالت میں شہرت رکھنے والوں کی مثال میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس بن مالک، حضرت سلمان فارسی اور حضرت بلال کا نام لیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

ان عرف بالفقہ والتقدم فی الاجتہاد کالخلفاء الراشدين کان
حدیثہ حجۃ وان عرف بالعدالت والضبیط دون الفقہ
کابن ابی ہریرۃ۔

اگر فقہ اور اجتہاد میں مشہور ہو جیسے خلفاء راشدین تو اس کی حدیث
حجت ہے اور اگر کوئی عدالت، ضبط و حفظ حدیث میں مشہور ہو
مگر فقہ میں شہرت نہ رکھتا ہو جیسے ابو ہریرہؓ اور انسؓ۔

اب سابقہ بیانات کی روشنی میں آپ ہی فیصلہ فرمائیے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت
فاروقؓ کو کس چیز میں شہرت حاصل ہے یقیناً حضرت ابو ہریرہؓ کو حفظ میں اور حضرت فاروقؓ
اعظمؓ کو فقہ و اجتہاد میں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک حضرت
ابو ہریرہؓ فقیہ نہیں ہیں۔ حاشائے حاشا فقیہ ہیں مگر حضرت ابن عباسؓ، حضرت فاروقؓ اعظمؓ
اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرح فقہ میں معروف نہیں اور کسی فن میں شہرت نہ ہونا کوئی
عیب نہیں یہ تو فرق مراتب ہے۔

حافظ زرکشی نے حضرت عائشہؓ کے ایسے تعقیبات کو ایک رسالہ نامی ”الاجابۃ فیما استدرکتہ
عائشہ علی الصحابۃ“ میں جمع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو چکا ہے۔ حافظ سیوطی نے اپنی
عادت کے مطابق اسی کی تلخیص ”عین الاجابہ فی استدراک عائشہ علی الصحابہ“ کے نام سے کی
ہے۔ یہ مطبع معارف اعظم گڑھ ہندوستان میں طبع ہوا ہے۔

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صحابہ میں اس لحاظ سے فرق مراتب تھا اور فرق مراتب کی یہی میراث

تابعین اور تبع تابعین کو بھی صحابہ سے ملی ہے۔
اور یہاں سے یہ حقیقت بھی الم نشرح ہو گئی کہ حضرت فاروق اعظم کے متعلق جو یہ تصریحات ملتی ہیں کہ

اَقْلُوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔

یا حضرت قرظہ کا یہ کہنا کہ نہانا عمر (منع کیا ہم کو عمر نے) اور یا حضرت ابو ہریرہ کا ابو سلمہ کے سوال پر یہ کہنا کہ

لَوْ كُنْتُ أَحَدَ ثَلَاثٍ فِي زَمَانِ عُمَرَ مِثْلًا أَحَدُ ثَلَاثٍ يَصِيرُنِي بِمُخَفَقَةٍ لَّهِ

اگر میں زمانہ عمر میں ایسے حدیث بیان کرتا جیسے تم سے کرتا ہوں تو مجھے

وہ درے لگاتے۔

تو ان کا منشا وہ نہیں جو عموماً آج سمجھ لیا گیا ہے بلکہ اس کا پس منظر یہ ہے کہ فاروق اعظم نے حدیث اور اشاعت سنت کے لیے سرکاری طور پر شخصیتیں مقرر کی تھیں۔ ہر کس و ناکس کو یہ کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ امام دارمی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا یہ منشا تھا کہ غزوات اور جنگی سرگرمیوں کے واقعات رائے عامہ کے سامنے نہ بیان کیے جائیں۔ صرف فرائض و سنن سے ان کو روشناس کیا جائے اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا مطلب یہ تھا کہ حضور انور کی وہ حدیثیں جن کا تعلق عادات و شمائل سے ہے وہ نہ بیان کی جائیں کیونکہ ان سے کوئی غرض شرعی متعلق نہیں یا وہ حدیثیں مقصود ہیں جن کے حفظ و ضبط کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ ان تاویلات کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عمر کا موقف خود ان کے طرز عمل سے متعین ہو سکتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے تمام ممالک محروسہ میں معلمین مقرر کیے تھے اور ہر جگہ تاکید می احکام روانہ کیے تھے کہ ان معلمین سے فرائض اور سنن سیکھو جیسا کہ قرآن سیکھتے ہو۔ چنانچہ مسند دارمی میں ہے۔ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالسُّنَنَ كَمَا تَتَعَلَّمُونَ الْقُرْآنَ۔ اور قرآن کے ساتھ صحت الفاظ و اعراب بھی سیکھو۔ ان کے خاص الفاظ حسب روایت

ابن الانباری یہ ہیں۔ تعلموا اعراب القرآن کما تعلمون حفظہ اعراب قرآن سیکھو جیسے اس کو یاد کرنا سیکھتے ہو۔

مورخین نے چونکہ زمانہ فاروق اعظم میں تعلیمی نظم کے لیے کوئی خاص عنوان قائم نہیں کیا اس لیے ان معلموں کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی مگر جیسے جیسے تصریحات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر شہر میں متعدد صحابہ اس کام پر مامور تھے۔ قرۃ العینین میں ہے کہ دور ہر شہر کے مقرے و محدثے رافرتا۔ آپ نے ہر شہر میں ایک فارسی اور ایک محدث بھیجا۔ اور روضۃ الاحباب کے حوالے سے لکھا ہے کہ زمانہ فاروق اعظم میں ایک ہزار چھتیس شہر فتح ہوئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ فاروق اعظم نے اپنے دور خلافت میں ایک ہزار چھتیس صحابہ کرام کو حدیث کی اشاعت کے لیے مقرر فرمایا۔ آپ چاہیں تو تذکرۃ الحفاظ، سداۃ المعانی اور الاصابہ جیسی کتابوں سے ایسے صحابہ کی ایک فہرست مرتب کر سکتے ہیں۔ جن کو حضرت عمرؓ نے معلمین سنن اور محدثین کی حیثیت سے روانہ کیا۔ ایک بار مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے یہ بات واشکاف نقطوں میں فرمائی۔

انی اشہدکم علی امراء الامصار انی لم ابعثہم الا لیفقهوا الناس فی دینہم۔
میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے امراء کو شہروں میں دین سکھانے کے لیے روانہ کیا ہے۔
ایک اور تقریر میں اس سے زیادہ وضاحت ہے۔

انی واللہ ما ابعث الیکم عمالی لیضربوا البشارکم و لکنی ابعثہم الیکم
لیعلموا دینکم و سنتہ نبیکم۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ میں نے امراء کو صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں دین اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں۔

گویا فاروق اعظمؓ کے زمانے میں ہر ملکی افسرانظامی سربراہی کے ساتھ محدث اور معلم فقہ ہوتا تھا اور یہ التزام صرف انتظامیہ تک محدود نہ تھا، بلکہ فوجی افسروں میں بھی اس کا خاص لحاظ ہوتا تھا۔ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

۱۔ قرۃ العینین ص ۱۳۱ لکھ کتاب الخراج ص ۱۱۸

۲۔ کتاب الخراج ص ۱۱۵

ان عمر بن الخطاب کان اذا اجتمع الیہ حبیش من اهل الایمان لبحث
علیہم رجلاً من اهل الفقه والعلم -

حضرت عمر کے پاس مسلمان فوجی آتے تو ان پر اہل فقہ اور علم کو امیر بناتے۔
یاد رہے کہ صدر اول میں فقہ سے مراد سنت ہوتی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :
مسلمین در زمان شیخین متفق بودند باخذ بہ سنت ظاہر کہ معتبر بفقہ است۔
مسلمان شیخین کے زمانے میں سنت کو اپنانے پر متفق تھے جسے فقہ
کہتے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ تاریخ کی اتنی بڑی شہادت ہوتے ہوئے روایت
حدیث سے ممانعت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ کام ہر کس و ناکس کے کرنے کا نہیں
بلکہ ہر کاری طور پر اس کے لیے خاص شخصیتیں مقرر تھیں۔

خلافت راشدہ اور تدوین حدیث

خلفاء راشدین کے سائے دور میں ارشادات پیغمبر کی عمومی حفاظت رائے عامہ نے اسی طرح
کی اور اسی کا نام ان کی زبان میں العلم تھا۔ اور یہ علم کی نگرانی سابقہ رواج کے مطابق بطریق
الروایت تھی۔

یہ بات کہ خلافت راشدہ میں باقاعدہ قانونی طور پر کتابی صورت میں حدیث کی تدوین کیوں نہیں
کی اس کے لیے ہم یہاں حافظ ابو بکر بن عقیل کے بیان کا ایک اقتباس بدریہ ناظرین کرتے ہیں۔
ابو بکر بن عقیل الصقلی بروایت ابن بشکوال رقمطراز ہیں کہ۔ حدیث کا سارا ذخیرہ زمانہ نبوت
کے بعد صحابہ کے سینوں میں الگ الگ تھا۔ یعنی کسی کو کچھ معلوم تھا۔ ساری زندگی ایک ہی شخص
کو معلوم نہ تھی اور پھر جسے جو کچھ بھی معلوم تھا وہ بھی معانی کی حد تک۔ کیونکہ الفاظ کی حفاظت کا
اس کے لیے کوئی قانونی اہتمام روز اول ہی سے نہیں کیا گیا تھا۔ برخلاف قرآن کے اس کے
الفاظ کی قانونی طور پر نگرانی کی گئی تھی۔

ایسی حالت میں اگر صحابہ کرام زمانہ خلافت راشدہ میں قرآن ہی کی طرح احادیث کو بھی لکھی کر لیتے

اس میں ایک طرف یہ خوبی ضرور ہوتی۔ کہ ایک قابل اعتماد علمی سرمایہ کتاب کی صورت میں لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا مگر یہ قباحت بھی یقینی طور پر پیش آتی کہ قرآن اپنے اعجاز کی وجہ سے متعینہ الفاظ میں محفوظ تھا یہ خلاف سنت کے کہ اس کے معانی و مطالب مقرر تھے مگر الفاظ کا اعجاز نہ ہونے کی وجہ سے قرآن جیسی حفاظت نہیں کی گئی۔ اس لیے حدیث کا جو ذخیرہ کتاب سے باہر رہتا وہ حدیث ہونے کے باوجود بے اعتبار ہو جاتا۔

ان وجوہ سے خلافت راشدہ نے حدیث کو خود سرکاری طور پر کتابی طرز پر جمع نہیں کیا بلکہ اس کو بعد میں آنے والوں پر چھوڑ دیا۔
اس کے ساتھ یہ ذہن میں رکھئے کہ

۱۔ نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دوسرے انبیاء کی نبوتوں کے مقابلے میں ایک نمایاں حیثیت لے کر آئی ہے۔ دوسری نبوتوں سے اس کو ممتاز کرنے والی چیز یہ ہے کہ یہ نبوت اپنے ساتھ خلافت لے کر آئی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے نبوت کے اس امتیاز کو قرآن کا منطوق قرار دیا ہے۔ قرآن کی مشہور آیت نسخ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَسِيَهَا نَاتٍ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا
فَقَوْلُهُ بِخَيْرٍ مِنْهَا فِيمَا تَكُونُ النَّبِيُّ مَضْمُومَةٌ بِالْخِلَافَةِ
جو نسخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلائیے ہیں تو لے آتے ہیں
اس سے اچھی یا اس جیسی۔ اس سے اچھی اور بہتر کا مطلب یہ
ہے کہ ہم وہ نبوت عطا کرتے ہیں جو خلافت سے وابستہ ہو۔

حجۃ اللہ ہی میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

اعظم الانبياء مثاناً من له نوع آخر من البعثة وذلك
ان يكون مراد الله تعالى فيه ان يكون سبباً لخروج الناس
من الظلمات الى النور وان يكون قومه خيراً أمة اخرجت
للناس فيكون بعثته يتناول بعثاً آخر۔

نبیوں میں بڑی شان کا نبی وہ ہے جو نبی ہونے کے ساتھ ایک اور
بعثت بھی ساتھ لے کر آئے۔ یہ اس طرح کہ نبی کی نبوت کے ذریعے
اللہ سبحانہ کا مقصد ایک تو لوگوں کو کفر کی ظلمت سے نکال کر ایمان

کی روشنیوں میں لانا ہوا اور دوسرا یہ کہ اس کی قوم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے روانہ کیا گیا ہو۔ اس لیے آپ کی بعثت ایک دوسری بعثت کے کمر آتی ہے اور یہ آپ کی قوم کی بعثت ہے۔

۲۔ اسلام میں خلافت راشدہ کی حد تک قول خلیفہ کا مقام حجت اور دلیل کا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے خلفائے ارشاد و کردار کی حجیت پر ازالۃ الخفا ص ۴۳۰ پر تفصیلی بحث کی ہے اور اپنے دعویٰ کو قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کہ
وَلَيُمْكِنَنَّ لَهُمْ دِينُهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ

پر لکھا ہے

دریں آیت افادہ ہے فرماید انچہ بسعی ایشان ممکن و شائع و مشہور ہے
شود دین مرتضیٰ است

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ کی کوشش سے اس کو جو قوت ملی اور دین کی جو اشاعت اور شہرت ہوئی وہ دین پسندیدہ ہے۔

اور آیت :

الَّذِينَ اِنْ مَكَّنَّا هُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ

پر لکھتے ہیں کہ :

در این آیت افادہ فرمود ہر نماز سے ترک کو اتنے و امر معروف و نہی منکر کے کہ از ممکنان ظاہر شود محمود و محل رضا است

یعنی خلافت راشدہ کے قول و فعل کے دین میں حجت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے قرآن میں دین کو ان کی طرف نسبت کر کے اسے اپنا پسندیدہ قرار دیا ہے اس لیے ان کے تمام اعمال دین میں محمود و محل رضا ہیں۔

۳۔ اسلام میں جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت واجب الاتباع ہے ایسے ہی خلفاء راشدین کی سنت بھی واجب الاتباع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس نے ان کو معیار حق گردانتے ہوئے ہمیں ان کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عرابی بن ساریہ سے

روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهَدِيِّينَ
 تَمَسَّكُوا بِهَا وَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ
 میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت سے چمٹ جاؤ، اسے تمام لو
 اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔
 اسی سنت کی تعریف یہ کی جاتی ہے:

السُّنَّةُ هِيَ الطَّرِيقَةُ الْمَسْلُوكَةُ فَيَشْتَمِلُ ذَالِكَ التَّمَسُّكُ
 بِمَا كَانَ عَلَيْهِ وَ خُلَفَاؤُهُ الرَّاشِدُونَ مِنْ الْأَعْتِقَادَاتِ وَالْأَعْمَالِ
 وَالْأَقْوَالِ وَ هَذِهِ هِيَ السُّنَّةُ الْكَامِلَةُ ۚ

سنت طریقہ مسلوکہ کا نام ہے۔ یہ حضور النور کی سنت اور خلفاء راشدین
 کے تمام اعتقادات، اعمال اور اقوال کو شامل ہے یہی سنت کاملہ ہے۔
 ۴۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اُمت کے اختلاف و افتراق کا پتہ دیا ہے وہاں
 اُمت کے لیے اختلاف کے اسی دلدل میں شاہراہ نجات کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ہے
 مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِي (وہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں) یہاں آپ نے اپنے ساتھ صحابہ
 کو ملا کر راونجات کی تعبیر فرمائی ہے۔
 اسی بنا پر فرقہ ناجیہ کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

الْفَرْقَةُ النَّاجِيَةُ هُمُ الْأَخِذُونَ فِي الْعَقِيدَةِ
 وَ أَعْمَلُ جَمِيعًا بِمَا ظَهَرَ مِنَ الْكِتَابِ وَ السُّنَّةِ وَ جَرَى
 عَلَيْهِ مَجْمُوعُ أَصْحَابِهِ وَ تَابِعِيْن ۚ

فرقہ ناجیہ وہ ہی لوگ ہیں جو عقیدہ و عمل دونوں میں کتاب و سنت
 کے ظواہر اور جمہور صحابہ و تابعین کی شاہراہ پر ہوں۔

یعنی فرقہ ناجیہ معنوم میں کتاب و سنت اور مصداق میں صحابہ و تابعین سے استفادہ کرتا ہے

۱۔ ترمذی ج ۲ ص ۹۲، ابن ماجہ ص ۵، البدایہ و النہایہ ج ۲ ص ۲۷۹، مسند دارمی ص ۲۶، مسند احمد ج ۲
 ص ۲۷، مستدرک ج ۱ ص ۹۵ - ۲ جامع العلوم والحکم ج ۱ ص ۱۹۱ -
 ۳ حجة اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۷۰

اور اسی مفہوم و مصداق کی ہم آہنگی کو بتانے کے لیے اس فرقہ ناجیہ کا نام اہل السنۃ والجماعۃ رکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اسلام کا علمی، اخلاقی اور روحانی نظام نبوت اور خلافت سے مل کر بنا ہے۔ یعنی قرآن کی ہدایات، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی تشریحات اور خلافت کی آئینی اور قانونی ترتیب کا نام مکمل اسلام ہے۔ اگر صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ میں سے کوئی بھی تدوین سنن کا یہ کام کرتا تو یقیناً یہ تدوین پورے اسلام کی آئینہ دار نہ ہوتی بلکہ خلفاء کے ادوار اربعہ میں سے ایک کے رہ جانے سے بھی سنت کی تدوین اور صورتی ہوتی۔ اس لیے ان اکابر میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے۔

۵۔ قرآن حکیم میں اللہ سبحانہ نے مسلمان کا منتہائے نظر صراطِ مستقیم قرار دیا ہے اور اسی کی طلب گاری کے لیے ہر نماز ہی نماز کی ہر رکعت میں درخواست کرتا ہے صراطِ مستقیم کے تعارف یا تعریف میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ نہیں کہ وہ صرف انبیاء کا راستہ ہے بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ پاک نے انعام فرمایا ہے صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے، اور ان انعام یافتگان کی قرآن ہی نے خود جو تعبیریں کی ہیں وہ دنیا کے سامنے ہے فرمایا :

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ
وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ -

یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا انبیاء، صدیقین، شہداء،
اور صالحین۔

یہ آیت گرامی اس بات میں فیصلہ کن ہے کہ صرف انبیاء کی نہیں بلکہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ قرآن کی زبان میں صراطِ مستقیم ہے۔

آیت استخلاف میں جہاں منجانبوں سے منکسر کے ذریعے خلافت کا وعدہ کیا ہے وہاں ان کی صلاحیت کا پہلے ذکر کیا ہے اور ایک دوسرے موقع پر کلمہ حصر لا کمر صدیقیت اور شہادت کو صحابہ کا وصف خصوصی بتایا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

وَالشَّهَادَةُ عِنْدَ رَبِّهِمْ -

اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے یہی لوگ
صدیقین اور شہداء ہیں اپنے پروردگار کے حضور -
ایک اور موقع پر کلمہ خطاب کے ذریعے صحابہ کو کہا ہے -
لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ
تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ -

اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک عقائد، اعمال، اخلاق اور آداب میں
نبوت اور خلافت کے قائم کیے ہوتے نقوش کا نام صراطِ مستقیم ہے -
اسی بنا پر قرآن نے نبوت کے سارے کاموں کو اپنے مخاطبوں کے فرائض بتا دیے مثلاً
نبوت کا کام دعوت ہے قرآن نے منکم کے خطاب کی زور سے اسے اپنے مخاطبوں کا فرض قرار
دیا ہے -

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ -

چاہیے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے -
نبوت کا مشن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے قرآن نے اسے امت کی خیریت کا مبنی
قرار دیا ہے -

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ -

تم بہترین امت ہو لوگوں کے لیے بپا کیے گئے ہو نیکی کا حکم دیتے
ہو اور پُرانی سے روکتے ہو -

نبوت کا مقام شہادت علی الناس ہے قرآن نے اسی کو اپنے مخاطبوں کے نقطہ اعتدال
پر ہونے کی علت بنا کر خلافت کا فرض قرار دیا ہے -

كَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ
عَلَى النَّاسِ

ایسے ہی بنا دیا ہم نے تم کو درمیان فی امت تاکہ تم ہو جاؤ گواہ لوگوں پر
نبوت کا کام تبلیغ ہے مگر قرآن میں اسی کو خصوصی طور پر خلافت راشدہ کا فریضہ

قرار دیا ہے۔ فرائض کا یہ اشتراک بول رہا ہے کہ اسلام نبوت اور خلافت کے مجموعہ کا نام ہے۔
 اس تمام تفصیل سے مجھے یہ بتانا مقصود ہے کہ چونکہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت
 نبوت کا خلافت کے ساتھ پیوند ہے۔ نبوت اگر انفرادی اسوہ ہے تو خلافت اسی کی اجتماعی تشکیل
 کا نام ہے اس لیے خلافت راشدہ کے اس دور میں جو اسلامی نقطہ نظر سے معیار حق اور حجت و
 دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنن کو کتابی صورت میں مدون نہیں کیا گیا اگر ایسا کیا جاتا تو دور
 خلافت تدوین سے رہ جاتا اور سنت کی ادھوری تدوین ہوتی۔

خلافت راشدہ کے دور میں خدمتِ حدیث

دورِ خلافت راشدہ میں حدیث کی اشاعت میں سب سے زیادہ کوشش حضرت فاروق اعظمؓ
 نے کی ہے اور صرف حدیث نہیں بلکہ روایت کے اصول کے موجد و حقیقت حضرت عمرؓ ہی ہیں
 جیسا کہ آپؓ آئندہ پڑھیں گے۔

حدیث کے سلسلے میں جو کام حضرت فاروق اعظمؓ نے کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ
 ۱۔ احادیثِ نبوت کو نقل کر کے وقتاً فوقتاً گورنروں اور ضلعی حکام کے پاس روانہ کرتے۔
 ان احادیث کا تعلق سنن و فرائض سے ہوتا۔

۲۔ صحابہ میں جو لوگ فنِ حدیث کے امام تھے ان کو مختلف ممالک میں حدیث کی تعلیم کے لیے
 روانہ کیا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

فاروق اعظمؓ عبد اللہ بن مسعودؓ را با جمعی بکوفہ فرستاد و معقل بن یسارؓ
 و عبد اللہ بن معقلؓ و عمران بن حصینؓ را بہ بصرہ و عبادہ بن الصامتؓ
 و ابوالدرداءؓ را بہ شام و معاویہ بن ابی سفیانؓ کہ امیر شام بود قدغن بلین
 نوشت کہ از حدیث ایشان تجاوز نہ کند۔

فاروق اعظمؓ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت کے ساتھ
 کوفہ روانہ کیا اور معقل بن یسارؓ و عبد اللہ بن معقلؓ اور عمران بن حصینؓ
 کو بصرہ، عبادہ بن الصامتؓ، ابوالدرداءؓ کو شام روانہ کیا اور حضرت

معاویہ کو بڑی تاکید سے لکھا کہ ان کی حدیثوں سے آگے نہ بڑھیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں بیادمی النظر فہنوں میں یہ خلش پیدا ہو سکتی ہے کہ فاروق اعظم نے اگر واقعی اشاعتِ حدیث کا اتنا اہتمام فرمایا ہے تو پھر حضرت عمر سے دفترِ حدیث میں احادیث کیوں کم مروی ہیں؟ یہ خلش بظاہر وزنی ہے لیکن دراصل یہاں ایک مغالطہ اور غلط فہمی ہے۔

محدثین کے یہاں یہ مانا ہوا اصول ہے کہ صحابی جب کوئی ایسا مسئلہ بیان کرے جس میں رائے کو دخل نہ ہو تو اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لے مطلب یہی ہوگا کہ حدیث مرفوعہ ہے جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے حافظ ابن عبد البر اور دوسرے محدثین سے نقل کیا ہے اور ہے بھی یہ ایک عقلی قانون۔ اس اصول کی روشنی میں حضرت فاروق اعظم کی تقریروں اور تحریری فرامین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے جس قدر اصولی مسائل بیان ہوئے ہیں وہ سب احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث نے یہ بات کھول کر بیان کی ہے:

مضمونِ احادیث در خطب خود ارشاد می فرماید تا اصل احادیث
بآں موقوف خلیفہ قوت یابد۔ یا را اینکه بنور سخن نرسند این را نمی فهمند
و نمی دانند کہ فاروق اعظم تمام علم حدیث را جملاً تقویت دادہ و
اعلان نمودہ ہے

فاروق اعظم اپنی تقریروں میں حدیثوں کا حوالہ دیتے تاکہ حدیث کا
ذخیرہ موقوف خلیفہ ہونے کی وجہ سے زیادہ مستند ہو جائے جو لوگ
غور و فکر سے کام نہیں لیتے وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ فاروق
اعظم نے تمام علم حدیث کو اس طرح قوی سے قوی تر بنا دیا ہے
اور اس کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔

قرۃ العینین میں یہاں تک لکھا ہے کہ:

حضرت فاروق اعظمؓ کی حدیثیں صرف اس قدر نہیں جو ان کے نام سے
مسانید میں موجود ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر صحابہ سے جس قدر
روایات مرفوعہ نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں وہ سب فاروق اعظم ہی
کی روایات ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ
اور حضرت ابوہریرہؓ کی بے شمار روایات کا وہ ذخیرہ ہے جن کو ان
بزرگوں نے فاروق اعظمؓ سے سُن کر براہِ راست حضور النور صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

خدمتِ حدیث کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں حضرت فاروق اعظمؓ کا
ایک کارنامہ یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی تمام تر توجہ ان احادیث کی اشاعت پر صرف کی جن
سے عبادات، معاملات یا اخلاق کے مسائل متنبط ہوتے تھے۔

سنن ہدیٰ اور سنن زوائد میں امتیاز

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی چند در چند اعمال و افعال کا مجموعہ تھی اور آپ
رسول اللہ ہونے کے ساتھ عربی ہونے اور قریشی ہونے کی بھی حیثیت رکھتے تھے اس لیے فاروق
اعظمؓ نے ان سب حیثیتوں میں بھی ایک نمایاں امتیاز اور خطِ فاصل قائم کیا تا کہ سنن ہدیٰ اور
سنن زوائد میں اختلاط اور التباس نہ ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

فاروق اعظمؓ نظر دقیق در تفریق بیان احادیث کہ بتبلیغ شرائع و
تکمیل افراد بشر تعلق دارد از غیر اُن مصروف ساخت لهذا احادیث
شما اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و احادیث سنن زوائد و لباس
و عادات کمتر روایت کے کرد بدو وجہ۔ یکے اُنکے اینہا از علوم تکلیفیہ و
تشریعیہ نیست۔ تحمل کہ چوں اہتمام تام بروایت اُن بکار برند بعض
اشیاء از سنن زوائد و سنن ہدیٰ متشبه گرد آئے
فاروق اعظمؓ نے وقتِ نظر سے دو قسم کی حدیثوں میں ایک جوہری فرق

قائم کیا اور بتایا کہ وہ حدیثیں کون سی ہیں جن کا تعلق شرائع سے ہے اور وہ کون سی ہیں جو ان سے متعلق نہیں ہیں اسی لیے حضرت عمرؓ وہ احادیث کم بیان کرتے جن کا تعلق سنن زوائد سے ہوتا اور اس میں دو وجہ پیش نظر تھیں ایک یہ کہ سنن زوائد کا تعلق تشریح سے نہیں ممکن ہے کہ ان کی روایت کا اہتمام لوگوں میں سنن زوائد اور سنن بدعی میں اشتباہ پیدا کر دے۔

شاہ صاحب نے قرۃ العینین میں بالکل درست لکھا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صحابہ کو خاص اسی مشن پر تمام اطراف مملکت میں روانہ فرمایا اور ان کو روایت کا طریقہ سکھایا اور روایت حدیث کی ان کو زیادہ سے زیادہ تحریض فرمائی اور رائے عامہ کو ان حضرات سے احادیث سیکھنے کی ترغیب دی اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی پوری پوری نگرانی خود کی اور ان کی بیان کردہ حدیثوں کو جانچا اور پرکھا اور اس کے ساتھ ان محدثین کو قرآن و حدیث میں باہم ربط، قرآن میں آئی ہوئی عام بات کی سنت کے ذریعے تخصیص اور مجملات قرآن کے لیے سنت کے ذریعے بیان کے قواعد سکھائے۔

اللہ اکبر! ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو حدیث بیان کرنے سے روکتے تھے۔ بزرگوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات لوگ خود نہیں سمجھتے اور بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ایسا نہ ہو کہ دامن مقصود ہاتھ سے نکل جاتے ہیں تب یہ رہا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کا نام حدیث ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اس فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ بتانے سے پہلے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ امام اعظم کے بارے میں چند ضروری اور بنیادی باتیں ناظرین کے سامنے رکھوں۔

نام، کنیت اور لقب

نام نعمان، کنیت ابو حنیفہ اور لقب امام اعظم ہے۔ پیدائش کا سال ۶۹۹ھ مطابق ۶۹۹ھ ہے ابن حجر مکی نے امام صاحب کو یہ کہہ کر اسم بالمسمیٰ قرار دیا ہے کہ نعمان لغت میں دراصل اس خون کو کہتے ہیں جس پر بدن کا سارا ڈھانچہ قائم ہے اور جس کے ذریعے جسم کی ساری مشینری حرکت

کہتی ہے۔ اسی لیے رُوح کو بھی نعمان کہتے ہیں چونکہ امام اعظمؒ کی ذات گرامی اسلام میں قانونِ سلطہ کے فن کے لیے محور اور اس کے مدارک و مشکلات کے لیے مرکز ہے اس لیے آپ کا نام نعمان ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں فَاَبُو حَنِيفَةَ بِهِ قِسْوَامُ الْفِقْهِ (ابو حنیفہ فقہ کا آئینہ ہیں) سمرخ اور خوشبودار گھاس کو بھی نعمان کہتے ہیں اور امام صاحب کی کمالاقتی مہم اور لہمک سے اسلامی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہے۔

طَابَتْ خِلَالُهُ وَ بَلَغَ الْغَايَةَ كَمَالَهُ ۛ

عادات میں پاکیزگی اور کمال انتہا کو پہنچ گیا۔

ابن حجر عسقلانیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ نِعْمَانُ فُعْلَانُ کے وزن پر نعمت سے بنا ہے۔ اسم گرامی میں معنوی رعایت یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی مخلوق خدا کے لیے ایک نعمت ہے اسی لیے آپ کا

ابو حنیفہ کو امام اعظم کہنے والے صرف احناف ہی نہیں بلکہ یگانے اور بیگانے سب ہی ان کو اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ حافظ ذہبیؒ نے تذکرہ میں، حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے الروض الباسم میں اور ملک العلماء عزالدین بن عبد السلام نے قواعد الاحکام میں اسی لقب سے پکارا ہے اور کیوں نہ پکاریں جبکہ بقول حافظ محمد بن ابراہیم آپ کی علمی بزرگی، عدالت تقویٰ اور امانت تو اتنے ثابت ہے اور آپ کا علمی مقام تمام عالم اسلامی میں شرفاً و غرباً شہید سے آج تک علماء میں مانا ہوا ہے۔

۱۰۔ الخیرات الحسان ص ۱۰ ۱۱۔ الخیرات الحسان

۱۲۔ پورا نام احمد بن محمد بن علی بن حجر ہے۔ ان کو الہشیمی مصر غربی میں ایک شہر کے محلہ ابی الہشیم میں بود و باش کی وجہ سے کہتے ہیں اور قبیلہ بنی سعد سے نسب تعلق کی وجہ سے ان کو اسعدی بولتے ہیں (النور السافر فی القرن العاشر) رجب ۹۸۷ھ میں ولادت ہوئی بچپن ہی میں والد کا سایہ سے اٹھ گیا یتیمی کا سارا وقت عارف باللہ شمس الدین بن ابی الجامل اور امام شمس الدین الشاذلیؒ کی کفالت میں گزارا، الشاذلیؒ ان کو ابی الہشیم سے مقام قطیف الشریف میں لے گئے ابتدائی کتابیں اسی جگہ پڑھیں پھر جامع ازہر میں داخل ہو گئے اچھے اور مہربان اساتذہ کی آغوش میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، منطق اور فرائض میں خاص مہارت پیدا کی ۳۲۳ھ کے آخر میں مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حج کے بعد واپس آ گئے لیکن ۳۴۹ھ میں گھر بار سمیت مکہ معظمہ میں ڈیرا لگالیا اور تا وفات یہیں درس و افتاء کا کام کیا ان کی تصانیف میں بڑی مفید کتابیں ہیں تاریخ وفات ۳۹۵ھ ہے۔ مناقب امام اعظم پر الخیرات الحسان کے نام سے کتاب لکھی ہے مسک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔

نام نامی نعمان ہے۔ فرماتے ہیں۔

فَاكْبُوْ حَنِيفَةً نِّعْمَةً اللّٰهُ عَلٰی خَلْقِهِۦ

ابو حنیفہ مخلوق کے لیے اللہ کی نعمت ہے۔

آپ کی کنیت ابو حنیفہ ہے لغت میں حنیفہ حنیف کا مونث ہے حنیف اسے کہتے ہیں جو سب سے ہٹ کر اللہ کا ہو رہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو حنیف کہتے ہیں۔ امام اعظم نے یہ کنیت اپنے لیے کیوں تجویز فرمائی ہے؟ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ صرف تفاؤل کی وجہ سے اختیار کی گئی ہے جیسے عموماً ابو المحاسن، ابو الحسان، ابو الکلام وغیرہ کنیتیں رکھی جاتی ہیں ورنہ اس نام کی آپ کی کوئی صاحبزادی نہیں ہے۔

وَلَا يُعْلَمُ لَكَ ذَكَرٌ وَلَا أَنْتَ غَيْرُ مُحَمَّدٍ

آپ کی کوئی لڑکی نہیں ہے اور نہ حماد کے سوا کوئی لڑکا

اور یہ محض قیاس آرائی ہے کہ عراقی زبان میں حنیفہ ودات کو کہتے ہیں اور آپ کا قلم ودوات سے چونکہ گہرا لگاؤ رہا ہے اس لیے آپ کو ابو حنیفہ کہتے ہیں۔

در اصل جیسے اشخاص میں حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف ہیں ایسے ہی ادیان میں ان کا دین حنیف اور مل میں ان کی ملت حنیفہ ہے حنیف دراصل وہ شخص کہلاتا ہے جو سب سے کٹ کر مولیٰ کا ہو رہے۔ اسی بنا پر غلط دین سے ہٹنے اور کٹ کر اسلام اختیار کرنے والے کو حنیف کہتے ہیں۔ اسلام کو دین حنیف اور ملت حنیفہ کہتے ہیں حتیٰ کہ ستخف مسلمان ہو جانے کے مترادف ہو گیا۔ زرخشتری نے اساس البلاغہ میں اس کے سائے مجازات جمع کر دیے چونکہ امام اعظم میں دین حنیف اور ملت حنیفہ کی خدمت کا جذبہ و شوق شروع ہی سے تھا اور اسی جذبہ و شوق کی بنا پر آپ نے تمام فنون کی تکمیل کے بعد فن کاری کے لیے علم الشرائع کو اپنایا جس کے ذریعے پورے دین کی خدمت ہو سکے میری مراد علم الفقہ ہے اس لیے آپ نے ان ہی لطیف احساسات کے اظہار کی خاطر بر بنائے تفاؤل اپنی کنیت ابو حنیفہ تجویز فرمائی۔ اصل میں ابو الملتہ الحنیفہ ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے زرخشتری کے حوالہ سے لکھا ہے :

وَتَدَّ اللّٰهُ الْاَرْضَ بِالْاَعْلَامِ الْمُنِيفَةِ كَمَا وَطَّدَ الْحَنِيفِيَّةَ

بَعْلُومُ ابْنِ حَنِيفَةَ - الْأُمَّةُ الْجَلَّةُ الْحَنِيفَةُ أُمُّ مِلَّةٍ الْمِلَّةُ
الْحَنِيفَةُ الْجَوْدُ وَالْعِلْمُ حَاتِمِي وَ أَحْنَفِي وَالِدَيْنِ وَالْعِلْمُ
حَنِيفِي وَ حَنْفِي

اللہ تعالیٰ نے زمین کو بلند پہاڑوں سے جکڑ دیا اور دین حنیف کو علوم
ابی حنیفہ کے ذریعے مضبوط بنا دیا۔ ائمہ احناف ہی ملت حنیفہ کی بائیں
پس جیسے سخاوت حاتمی اور علم احنفی ہے ایسے ہی دین حنیفی اور علم حنفی ہے۔

امام اعظم کا نسب نامہ

مشہور مورخ ابن خلکان نے امام اعظم کا سلسلہ نسب اس طرح لکھا ہے،
ابو حنیفہ نعمان پسر ثنابت زوطی پسر ماہ۔ لیکن امام صاحب کے پوتے اسماعیل نے امام صاحب
کا جو شجرہ نسب خود بتایا ہے وہ اس طرح ہے۔ نعمان پسر ثنابت نعمان پسر مرزبان۔ دونوں درست
ہیں فرق ہے تو صرف یہ کہ ابن خلکان نے جس شخص کو زوطی اور امام صاحب کے پوتے نے جسے نعمان
قرار دیا ہے ایک ہی شخص کے دو نام ہیں کیونکہ جو شخص مسلمان ہونے سے پہلے زوطی ہے وہی مسلمان
ہونے کے بعد نعمان ہے۔ اسی طرح جس شخص کا نام ماہ ہے اسی کا لقب مرزبان ہے۔ کچھ بھی ہو آپ

لہ الروض الباسم ج ۱ ص ۱۵۹ لے قاضی القضاة شمس الدین ابوالعباس احمد بن ابراہیم بن ابی بکر بن خلکان
تاریخ پیدائش شکر ہے۔ صحیح بخاری حافظ ابن مکرم سے پڑھی ہے الموبد طوسی بھی ان کے اساتذہ میں سے ہیں
علم الفقہ موصل میں الکمال بن یوسف سے اور شام میں ابن شداد سے پڑھا ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر علماء سے
استفادہ کیا ہے۔ شام میں پورے دس سال منصب قضا پر فائز ہے اور ایک عرصہ مصر میں گزارا۔ ان کی تصانیف میں سب سے
زیادہ معرکہ کی کتاب دنیات الاعیان و انباء الزمان ہے لفظ خلکان کی اصلیت اور اس نام سے شہرت کی علما نے مختلف
توجہات کی ہیں عبد القادر البیدروس نے النور السافر میں قطب الدین مکی سے نقل کیا ہے کہ لفظ خلکان دو فعلوں سے
مرکب ہے اول تخلیہ سے خل امر اور دوم کون سے کان فعل ماضی اور تلفظ بکسر لام ہے اور وجہ تسمیہ یہ بتاتی ہے
کہ خلکان کا تکیہ کلام یہ تھا کہ کان والدی کذا۔ لوگوں نے تشکک کر کہا کہ خل کان و کان کو چھوڑا پس یہیں سے
خلکان نام پڑ گیا۔ الیافعی نے مرآة الجنان میں تاریخ وفات ۶۸۲ھ بتاتی ہے۔

لے ، لے او جز المسالك ج ۱ ص ۵۶

عجمی اور قبیلہ تنیم سے نسبت ولاء کی وجہ سے تیمی ہیں جس طرح امام بخاری کو اسی تعلق کی بنا پر حنفی اور امام ابن ماجہ کو ربیع کہا جاتا ہے ایسے ہی امام صاحب کو تیمی کہتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللقبات کے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ لفظ مولیٰ زیادہ تر دوستی کے عہد و پیمان یعنی مولیٰ الموالات کے معنے میں استعمال ہوتا ہے تاہم مولیٰ چونکہ غلام کو بھی کہتے ہیں اس لیے امام اعظم کے بارے میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے اور وہ مولیٰ کے معنے غلام کے سمجھ بیٹھے لیکن چونکہ خود امام صاحب کی اپنی تصریح موجود ہے کہ یہ نسبت دوستی کے عہد و پیمان کی نسبت ہے اس لیے اب دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں ہے چنانچہ امام طحاوی مشکل الآثار میں جو فن حدیث میں اپنے موضوع پر بے مثال کتاب ہے عقد الموالات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عبداللہ بن یزید کہتے ہیں میں امام ابو حنیفہ کے پاس گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا تم کون ہو، میں نے عرض کیا کہ ایسا شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا یعنی نو مسلم۔ امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے تعلق پیدا کر لو پھر تمہاری نسبت بھی

لے ابو زکریا کنیت، محی الدین لقب، بیسجی بن اشرف نام ہے تاریخ ولادت محرم الحرام ۲۳۶ھ ہے دمشق کے مضافات میں "نومی" نامی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ نووی اور نوادی دونوں طرح بولا جاتا ہے بسجیہ ہیں دمشق "تشریف لے گئے اور علامہ کمال الدین مغربی کے پاس رہے اور ان کے فیض صحبت سے اس درجہ علمی کمال کے مالک ہو گئے کہ فنون میں محقق اور حافظ حدیث تھے۔ ساری عمر بغیر شادی کے گزار دی ایک لمحہ بھی بیکار نہ تھے شب و روز تین ہی کام تھے مطالعہ، تصنیف اور ذکر الہی، کھانا چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار نوش فرماتے مدرسہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث تھے۔ آپ کی تصانیف میں شرح صحیح مسلم، الروضۃ، شرح المہذب، کتاب الاذکار، اور ریاض الصالحین مشہور ہیں۔ تاریخ وفات ۴۱۴ھ رجب ۲۶ھ ہے۔

بجہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ مولیٰ صرف غلام ہی کو نہیں کہتے ہیں بلکہ ولاء اسلام، ولاء حلف اور ولاء لزوم کو بھی ولاء کہتے ہیں اور ان تعلقات والوں کو مولیٰ کہا جاتا ہے امام بخاری کو ولاء اسلام کی وجہ سے حنفی امام مالک کو ولاء حلف کی وجہ سے تیمی اور تقسم کو حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس زیادہ رہنے کی وجہ سے مولیٰ ابن عباس کہتے ہیں۔

ان کی طرف ہوگی میں خود بھی ایسا ہی تھا۔

یہ عبداللہ بن یزید امام اعظم کے شاگرد ہیں چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ سمیع من ابن عون وابی حنیفہ، یہ ابن عون اور ابو حنیفہ کے شاگرد ہیں بلکہ فن حدیث میں ان کا شمار امام بخاری کے ساتھ میں ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ مغرضہ تھا۔ بتایا رہا تھا کہ امام اعظم کو تیمی غلامی کی وجہ سے نہیں بلکہ دوستی کے عہد و پیمان کی وجہ سے کہتے ہیں۔ الصیمری نے مناقب میں اور الخطیب نے تاریخ بغداد میں امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہ بیان لکھا ہے کہ:

میں اسماعیل پسر حماد پسر نھان پسر ثابت پسر نھان پسر مرزبان ابنہ فارس

سے ہوں اور ہم آزاد ہیں واللہ ہم پر غلامی کا دور کبھی نہیں آیا ہے۔

اس تاکید اور قسم والے بیان سے اس غلط شہرت کی تردید ہوتی ہے جو امام صاحب کے دادا کے بارے میں پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بنی تیم کے آزاد کردہ غلام تھے اور اس غلط فہمی کا سرچشمہ ابو حاتم عبد الحمید کا وہ بیان ہے جو حافظ ذہبی نے مناقب میں درج کیا ہے لیکن اس بیان کا محور و مرکز

۱۔ مشکل الآثار ج ۳ ص ۵۴، ۵۵، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴

۲۔ الصیمری صیمر بردزن حیدر ہے اور اس کی صیمری نسبت ہے صیمر ایک شہر کا نام ہے۔ پورا نام الحسن بن علی بن محمد بن جعفر ہے ابو عبد اللہ کنیت ہے صیمری صرف پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں خطیب بغدادی ان کے تلامذہ میں سے ہیں خطیب نے امام صیمری کی زبانی لکھا ہے کہ میں نے حافظ دارقطنی سے ان کی کتاب السنن کا سماع کیا ہے۔ ان کی تاریخ وفات آوار کا دن ۲۱ شوال ۲۵۳ھ اور ولادت ۲۵۱ھ ہے خطیب نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ صدوق، دافر، عقل، جمیل، المعاشرة، عارف، جعوق، اہل علم حافظ عبد القادر قرطبی فرماتے ہیں کہ بمقام ربع الکرخ منصب قضا پر تا وفات فائز ہے ہیں۔ امام ابوالولید الباجی فرماتے ہیں کہ بغداد میں ان کو احناف کی امامت حاصل تھی اور لکھا ہے کان قاضیا عالما خبیرا مولانا علی نے الفوائد البہیہ میں بتایا ہے کہ صیمری نے امام اعظم کے حالات پر ایک ضخیم کتاب اخبار ابی حنیفہ کے نام سے لکھی ہے۔ الجواهر المضیۃ ج ۱ ص ۲۱۴، الفوائد البہیہ ص ۲۸، التعلیقات علی المناقب ص ۸۔

۳۔ پورا نام عبد الحمید بن قاضی عبد العزیز ہے موصوف صرف ایک واسطہ سے امام محمد کے شاگرد ہیں اور حافظ ابو جعفر طحاوی کے استاد ہیں۔ ملا علی قاری نے ان کی تاریخ وفات ۱۹۲ھ لکھی ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بہترین قاضی اور بلند پایہ فقیہ تھے، امانت و دیانت میں مثال تھے بن الجوزی نے المنتظم میں ان کے آثار جمیلہ کے بڑے گن گائے ہیں۔ المحاضر کتاب ادب القاضی اور کتاب الفرائض ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

جسے قرار دیا گیا ہے وہ بے نام ہے اس لیے گمنام شخص کی بات پر فیصلے کی بنیاد رکھنا قرین انصاف نہیں ہے جب کہ خود امام صاحب اور ان کے پوتے کا بیان اس موضوع پر موجود ہے اور اس باب میں اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جس موالات کا تاریخ میں تذکرہ ہے وہ ولادت و موت ہے۔ ولادت و عتاق نہیں ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی نو مسلم مشرف بہ اسلام ہوتا تو وہ جس قبیلہ کے کسی شخص سے عقد موالات یعنی دوستی و قرابت کا عہد و پیمان کرتا اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہو جاتا اور اس کا حلیف مولیٰ کہلاتا۔ بالتصریح تو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ عقد موالات کس نے کیا تھا۔ امام صاحب کے والد کے بارے میں ملا علی قاری فرماتے ہیں :

وَلِدَ آبُوهُ ثَابِتٌ عَلَى الْإِسْلَامِ لِه

ان کے والد ثابت مسلمان پیدا ہوئے۔

اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ زوطی نے مسلمان ہونے کے بعد یہ تعلق قائم کیا ہو گا۔ زوطی کا اسلامی نام نعمان ہے۔ حضرت امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہ بیان بھی ہے کہ ہمارے پردادا ثابت حضرت علیؑ کے پاس گئے۔ حضرت علیؑ نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دُعا کی ہے۔ ابن حجر عسقلانی نے خود اسماعیل کا اس دُعا کے بارے میں یہ تاثر لکھا ہے :

ہمیں اُمید ہے کہ اللہ سبحانہ نے ہمارے بارے میں حضرت علیؑ کی یہ دُعا

ضرور قبول فرمائی ہے۔

بالفاظ دیگر اُمت کو حضرت امام اعظم امیر المومنین علیؑ رضی اللہ عنہ کی دُعاؤں کے صدقے میں ملے ہیں۔

ملا علی قاری نے بھی مناقب امام میں اسماعیل بن حماد کا یہ بیان نقل کیا ہے یہ

امام اعظمؑ کے متعلق نبوی پیش گوئی

بہر حال امام اعظمؑ انجمنی ہیں۔ ماہ یا مری زبان آپ کے پردادا کا نام فارسی ہے اس لیے آپ کا نسل

فارسی ہونا یقینی ہے۔

فارسی کے بارے میں صحیحین اور جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے جناب رسول اللہؐ

۱۔ الجواهر المضية ج ۲ ص ۴۵۲ ۲۔ عمدة الرعاية ص ۳۴

۳۔ الخيرات الحسان ۴۔ مناقب امام ملا علی قاری علیہ السلام الجواهر المضية ج ۲ ص ۴۵۴

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اسی صحبت میں سورۃ جمعہ نازل ہوئی جب آپ نے یہ آیت پڑھی۔ **وَآخِرُ بَيْنَ مِنْهُمْ لَنَا يَلْحَقُوا بِهِمْ حاضِرین** میں سے کسی نے عرض کیا کہ یہ دوسرے کون ہیں؟ جو ابھی تک ہم سے نہیں ملے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں خاموشی اختیار فرمائی پوچھنے والے نے یہی سوال دوبارہ کیا سہ بارہ کیا تب آپ نے حضرت سلمان فارسی کے کاندھے پر دست مبارک رکھ دیا اور فرمایا کہ **لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهُ رِجَالٌ مِّنْ هَؤُلَاءِ** اگر ایمان کہکشاں میں بھی ہو گا تو ان کے کچھ آدمی ضرور اسے پالیں گے۔

مسند احمد میں ایک اور سند کے ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں:

لَوْ كَانَ الْعِلْمُ بِالثُّرَيَّا لَنَالَهُ نَاسٌ مِّنْ أَبْنَاءِ خَاصِرٍ

اگر علم ثریا میں ہو تو فارسی لوگ اسے پالیں گے۔

ابو نعیم صنفی، الشیرازی، الطبرانی اور امام مسلم نے یہی حدیث بالفاظ مختلفہ روایت کی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کا ایک مصداق شارحین حدیث نے امام اعظمؒ کو قرار دیا ہے حافظ سیوطی فرماتے ہیں **فَهَذَا أَصْلٌ صَحِيحٌ يُعْتَمَدُ عَلَيْهِ فِي الْبَشَائِرِ** (بشارت میں یہ قابلِ اعتماد اصل صحیح ہے)، حافظ ابن حجر مکی نے حافظ سیوطی کے بعض شاگردوں کے حوالے سے

اے حافظ ابو نعیم صنفی نے تاریخ صنفی میں اس حدیث کے سارے طرق جمع کر دیے ہیں۔ امام بخاری کے الفاظ آپ پڑھ چکے، امام مسلم نے رجال کی جگہ جل من انباء فارس نقل کیے ہیں۔ امام احمد اور ترمذی نے ایمان اور دین کی جگہ العلم روایت کیا ہے۔ **۱۔ تبیین الصغیفہ ص ۱۔**

تھے بعض شاگردوں سے مروی سیرت شامیہ کے مصنف حافظ محمد بن یوسف شامی ہیں۔ علامہ ابن عابدین الشامی نے مواہب کے حاشیہ میں لکھا ہے علامۃ الشامی تلمیذ الحافظ السیوطی، جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف میں یہاں پر حافظ سیوطی اور حافظ محمد بن یوسف پر سخت برہمی کا مظاہرہ کیا کہ انہوں نے اس حدیث کا مصداق خاص امام اعظمؒ کو کیوں قرار دیا ہے اور عون الباری علی ادلۃ البخاری میں اس پیش گوئی (باقی ص ۱۲۶ پر)

لکھا ہے کہ:

ہم اے اُستاد نے یقین کیا کہ اس حدیث سے امام ابو حنیفہ ہی مراد ہیں،
کیونکہ یہ بات بالکل عجیب ہے کہ امام صاحب کے زمانے میں اہل فارس
میں سے کوئی بھی امام صاحب کے علمی مقام کو نہیں پہنچ سکا اور آپ
تو آپ بلکہ آپ کے تلامذہ کا بھی کوئی مقام نہ پاسکا بلکہ

صرف حافظ جلال الدین السیوطی اور حافظ محمد بن یوسف ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ دوسرے محققین
نے بھی حدیث کا مصداق امام اعظم ہی کو قرار دیا ہے۔ علامہ حنفی فرماتے ہیں:
حَمَلَهُ بَعْضُ الْمُحَقِّقِينَ عَلَى أَبِي حَنِيفَةَ - ۱۷
بعض محققین نے اسے امام ابو حنیفہ پر محمول کیا ہے۔

اور علامہ عزیزی لکھتے ہیں کہ:
عَلَى الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ أَبِي حَنِيفَةَ وَأَصْحَابِهِ - ۱۸

اس کا مصداق امام اعظم اور ان کے اصحاب ہیں۔
حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:
ایک روز اس حدیث پر ہم نے گفتگو کی میں نے کہا کہ امام ابو حنیفہ اس
حکم میں داخل ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ علم فقہ کی اشاعت ان کے ہاتھوں

۱۲۵ (کا بقیہ حاشیہ):۔ کو صرف زمرہ محدثین تک محدود رکھا ہے لیکن شاہ ولی اللہ نے محدثین کے ساتھ فقہاء کو بھی
شامل کر لیا ہے اور شاہ صاحب کے مشہور شاگرد بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی مرحوم نے اس کو اور زیادہ عام
کر کے فقہاء محدثین کے ساتھ مشائخ طریقت کو بھی اس کا مصداق بتایا ہے (منظری ج ۳ ص ۲۵۸) اگرچہ ارشاد
کے الفاظ رجال من ہولاء اس سے مانع نہیں ہیں مگر اس بشارت میں داخل ہونے کے لیے صرف توطن کافی نہیں
ہے بلکہ نسل فارس سے ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ حدیث میں ابناہ فارس کی صاف تصریح ہے اور معلوم ہے کہ
توطن سے نسل تبدیل نہیں ہوتی ہے۔ لے الخیرات الحسان ص ۱۴

۱۲۶، لے السراج المنیر ج ۳ ص ۲۱۸

۱۲۷ احمد نام، قطب الدین تارکین نام، ولی اللہ عرف ہے۔ تیس واسطوں سے نسباً فاروقی ہیں۔ جیزہ لطیف
میں فرماتے ہیں کہ ولادت چہار شنبہ کے روز ۴ شوال المکرم ۱۱۱۱ھ میں ہوئی ہے۔ حفظ قرآن کے بعد درسی
(باقی ص ۱۲۷ پر)

کرائی اور اہل اسلام کی اس کے ذریعے اصلاح فرمائی بالخصوص اس آخری دور میں کہ دولت بس یہی مذہب ہے سائے شہروں میں بادشاہ حنفی ہیں۔ قاضی حنفی ہیں اور مدرسین حنفی ہیں۔
نواب صدیق حسن صاحب نے استخاف النبلاء المتیقن میں بہت کچھ چینی و چناں کے بعد لکھا ہے کہ ہم امام درال داخل است و ہم جملہ محدثین فرس لہ
لیکن ہم جملہ محدثین، سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی ان ہی کی زبانی سنئے فرماتے ہیں کہ
جہاں جملہ محدثین مثل بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ و امثال
ایشان۔

کیوں؟ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ
زیرا کہ ہمہ ایشاں از عجم و سرزمین فارس بودند۔
کیونکہ یہ تمام عجمی تھے اور زمین فارس سے تعلق رکھتے تھے۔
حیرت ہے کہ نواب صاحب نے جملہ محدثین کو ارشاد نبوت کا مصداق بنانے کے شوق میں
عجمی اور فارسی بنادیا حالانکہ تاریخ سے امام بخاری اور ابن ماجہ کے سوا کئی عجمی ہونا ثابت نہیں ہے۔

ط ۱۲۱ کا بیقیہ حاشیہ:۔ کتابوں سے پندرہ سال کی عمر میں فراغت حاصل کر لی۔ حدیث پہلے ہندوستان میں ایشیغ محمد فضل
سیالکوٹی سے پڑھی ہے۔ ۱۲۲ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ ایشیغ طاہر مدنی سے صحیح بخاری کا سماع کیا، موٹا،
مسند دہلوی اور امام محمد کی کتاب الاثر پڑھی۔ شاہ صاحب کی تصانیف علماء کے لیے مشعل ہدایت ہیں۔ شاہ صاحب
اپنے دور کے مجتہد اور مسائل فرعیہ میں عملاً حنفی تھے اور صرف از خود ہی عملاً حنفی نہ تھے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ
ایسا ہی رہنے کی مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی ہے۔ فیوض الحرمین میں حضور انور
صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ان لفظوں میں لکھی ہے اَیَاکَ اَنْ تُخَالِفَ الْعُتُمَ فِی الْفُرُوعِ دینی
قوم کے فروع میں اختلاف سے بچ کر رہو، علامہ نواب صدیق حسن مرحوم نے الحطہ میں ان کے طریق علمی پر
ایک جامع تبصرہ کے بعد لکھا ہے کہ طریقیہ، کلمہ حنفی اور صرف شاہ صاحب ہی نہیں بلکہ
پورے خاندان کے باپے میں لکھا ہے کہ خاندان ادھنی بود۔ وہ مجدد تھے تاریخ وفات "ابو داؤد امام اعظم
دین، ۱۲۶ھ ہے۔

لے مکتوبات ص ۱۶۸ لے، لے استخاف النبلاء المتیقن ص ۲۲۲

امام مسلم کے متعلق خود امام نووی کی تصریح ہے کہ عَرَبِيٌّ صُلْبِيَّةٌ کیونکہ وہ نسباً قشیری ہیں خود لوہ صاحب فرماتے ہیں۔

نِسْبَةُ إِلَى قَشِيرٍ مُصْغَرٌ أَقْبِيلَةُ مَعْرُوفَةٌ مِنَ الْعَرَبِ

عرب کے مشہور قبیلہ قشیر کی طرف اسم نسبت ہے۔

اور امام ابو داؤد عربی نثر ادیب اور عرب کے مشہور قبیلہ ازد سے تعلق کی وجہ سے ازدی ہیں ترمذی قبیلہ بنی سلیم کی طرف نسبت کی وجہ سے سلمی ہیں۔ محدث حاکم ضبی اور امام دارمی بنی دارم کی طرف منسوب ہیں جو قبیلہ تمیم کی مشہور شاخ ہے اور امام المحدثین مالک بن انس خالصاً عربی ہیں اور امام احمد الشیبانی الذہلی ہیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں امام احمد کا پورا نسب ان کے صاحبزادے کی زبانی درج کیا ہے۔

انصاف فرمائیے کہ جملہ محدثین میں بخاری اور ابن ماجہ کے سوا کون سا محدث فارسی الغسل ہے۔ اگر ایسا ہی ہے اور ایسا نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ تاریخ کی کھلی شہادت موجود ہے تو پھر واقعات کی روشنی میں اس ارشاد نبوت کا اولین مصداق امام اعظمؒ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

امام اعظمؒ اور اعجاز نبویؐ

بہر حال اگر یہ حدیث صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ صحیحین میں موجود ہے تو پھر

۱۔ ابو الحسین کینت، عساکر الدین لقب، مسلم بن الحجاج نام ہے ۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۵ سال کی عمر میں نصر آباد میں ۲۷۶ھ کو وفات پائی۔ علمی طلبگیاریوں کے سلسلہ میں حجاز، عراق، شام اور مصر آپ کی جولانگاہ رہی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں حلیل القدر تصنیف صحیح مسلم ہے۔ آپ نے اس کتاب کا انتخاب تین لاکھ ایسی روایات سے کیا ہے جن کو انہوں نے براہ راست اپنے شیوخ سے سنا تھا جیسا کہ محدث حاکم نے خود امام مسلم سے نقل کیا ہے حافظ مسلم بن قاسم نے اپنی تاریخ میں صحیح مسلم کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام میں کسی نے ایسی کتاب تصنیف نہیں کی۔ (فتح الباری) ۲۔ کینت ابو عبد اللہ نام احمد، امام بخاری نے آپ کو تاریخ میں الشیبانی الذہلی لکھا ہے۔ حافظ ذہبی نے تاریخ میں آپ کا پورا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ آپ مازن بن شیبان بن ذہل کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے عربی نثر ادیب اس لیے آپ ذہلی بھی ہیں اور شیبانی بھی۔ سکونت کے لحاظ سے مرزی اور بغدادی ہیں۔ آپ کے اساتذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔

بتانے والوں نے اگر بتایا ہے کہ امام اعظم اس نبوی پیش گوئی کا مصداق اولین ہونے کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک اعجازی کارنامہ ہیں تو اس میں مبالغہ ہی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر ہمشمی نے لکھا ہے:

فِيهِ مُعْجَزَةٌ ظَاهِرَةٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرَنَا
سَيِّقُ بَلِّ

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا معجزہ ہے۔ آپ نے ہونے والی بات کا پتہ دیا ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی برتری کے لیے یہ شرف کافی ہے کہ وہ نبوت کا معجزہ ہیں۔ اور اس سے بڑا شرف ہی کیا ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی مکاتیب میں سے ہر مکتب فکر نے امام اعظم کے مناقب کو اپنے لیے زور و راہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شوافع میں حافظ جلال الدین السیوطی، حافظ ابن حجر مکی، حافظ ذہبی، ابن خلدون، الیافعی، علامہ نووی، امام غزالی اور حافظ ابن حجر عسقلانی، موالک میں سے حافظ ابن عبد البر اور حنابلہ میں سے علامہ یوسف بن عبد الوہاب۔ الغرض اس نادرة الدرہ کی بے ہمتائیوں کا یہ حال تھا کہ محدثین اور فقہاء میں سے کوئی نہیں جس کی زبان ان کے مفاد اور مآثر کے گیت نہ گارہی ہو۔

الانتقام فی فضائل الثلاثة الائمة الفقہاء اور مناقب ذہبی سے اگر اس دور کے صرف ایسے علماء کی ایک فہرست تیار کی جائے جنہوں نے امام صاحب کے کمال علم و عمل کو سراہا ہے تو ان کی تعداد صو سے متجاوز ہوگی۔ مسعر بن کدام، ایوب السخنیانی، سلیمان بن مہران، شعبۃ بن الحجاج، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن زید، ابن ابی عروبہ، ابن شبرمہ، یحییٰ بن سعید القطان، ان خوبان زمانہ کے حسن و جمال پر کون نام دھر سکتا ہے۔ لیکن وہ سب یک زبان ہیں کہ امام اعظم جیسا جمال ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔

امام اعظم کی محبت سنی ہونے کی علامت ہے

یکانے اور بیگانے نے سب ہی متفق ہیں کہ کہنے والوں نے اس ذات گرامی کو معیار سنیت

بنادیا اور ہر ملا کہہ دیا کہ

مَنْ أَحَبَّ أَبَا حَنِيفَةَ فَهُوَ سُنِّيٌّ وَمَنْ أَبْغَضَهُ
فَهُوَ مُبْتَدِعٌ ۱۷

جو ابو حنیفہ سے پیار کرتا ہے وہ سنی ہے اور جو آپ سے بغض رکھتا
ہے وہ بدعتی ہے۔

اور ان ہی کی زبانی مسلمانوں کو یہ پیغام ملا ہے کہ

ہم اے اور لوگوں کے درمیان ابو حنیفہ ہیں جو ان سے محبت و تعلق رکھتا
ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ اہل سنت ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے
ہم یقین سے کہتے ہیں کہ وہ بدعتی ہے ۱۸

معلوم ہے کہ یہ کہنے والے کون ہیں اور کس وقت کہہ رہے ہیں؟ یہ حافظ عبد العزیز بن میمون
ہیں۔ حضرت نافع، حضرت عکرمہ اور حضرت سالم کے سامنے ان کو زالتی تلمذ طے کرنے کا شرف
حاصل ہے۔ اور ان کے تلامذہ میں یحییٰ القطان، عبد اللہ بن المبارک، عبد الرزاق اور وکیع بن الجراح
جیسے اساطین حدیث ہیں۔ ان کی وفات ۱۵۹ھ میں ہوئی ہے۔ یہ امام اعظم کے ایک معاصر کی
شہادت ہے اور معاصر کی شہادت ہی سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر بڑے
بڑے جلیل القدر ائمہ حدیث مسائل میں امام اعظم کا لوہا مانتے ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع
بیان العلم وفضلہ میں امام علی بن المدینی اور ملک الحافظ یحییٰ بن معین کے استاد امام وکیع بن الجراح
کے متعلق لکھا ہے كَانَ يَفْتِي بَرَأً يَ آبِي حَنِيفَةَ حَافِظُ ابْنِ كَثِيرٍ وَامَامُ ذَهَبِي نَعِي بْنِ
سَعِيدِ الْقَطَّانِ كَمَا فِي تَبَايَاهُ كَانَ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ يَخْتَارُ قَوْلَهُ فِي الْفُتُوَى ۱۹
سمجھ دار آدمی کے لیے اس میں یہ بات سوچنے کی ہے کہ یحییٰ القطان کی وفات اگر ۱۹۵ھ میں
ہوئی ہے تو امام ابو حنیفہ کی تقلید ۱۹۵ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی عوام تو عوام یحییٰ جیسے
اخص الخواص ان کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر اور حافظ ابن کثیر نے تصریح
کی ہے کہ امام یحییٰ القطان نے جامع صغیر باقاعدہ قاضی ابو یوسف سے سبقاً پڑھی ہے۔

۱۷ الجواہر المضیئہ ج ۲ ص ۲۸۲ ۱۸ الجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۱۸۲

۱۹ البدایہ ج ۲ ص ۱۵۷ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲

سیحی امام عبدالرحمن بن مہدی اور امام احمد کے اُستاد حدیث ہیں اور حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ میں نے سیحی جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ امام علی بن المہدینی کہتے ہیں کہ علم رجال میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔ عباس دوری نے سید الحفاظ سیحی بن معین کے حوالہ سے بتایا ہے کہ وہ فرماتے ہیں :

کُتِبَتْ الْجَامِعُ الصَّغِيرُ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحُسَيْنِ

میں نے جامع صغیر امام محمد سے لکھی ہے۔

سیحی بن معین کے امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابوزرعه اور ابویعلیٰ شاگرد ہیں۔

رُخ النور اور سرِ پائے امامت

سن آئے ہو کہ امام اعظم کی ولادت سنہ ۶۹۹ء بمقام کوفہ ہوئی حافظ مزہبی نے تہذیب الکمال میں اور ابن خلکان نے تاریخ میں اسے راجح قرار دیا ہے۔ لیکن ایک روایت میں حافظ سمعانی اور ان کے ساتھ حافظ ابن حبان نے کتاب الجرح والتعديل میں اور ابوالقاسم سمنانی نے روضۃ الصفا میں اسے کوراجح بتایا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری کی رائے میں یہی صحیح ہے ان کا دعویٰ ہے کہ آپ معمر بن یس سے ہیں۔

جَاوَزَ السَّعِیْنِ فِي الْعُمُرِ

عمر نوے سے زیادہ ہے۔

حافظ وہابی نے مشہور محدث ابوالنعیم الفضل بن دکین سے نقل کیا ہے کہ امام اعظم خوش رو، خوش پوش، خوش مجلس، کریم النفس، خوشبو پسند اور اپنے رفقاء کے بڑے ہی ہمدرد تھے یہ امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قدمیانہ تھانہ بہت لائے تھے اور نہ کوتاہ، نہایت شیریں زبان، بڑے دلکش اور قادر الکلام تھے یہ

امام اعظم کے پوتے اسماعیل بن حماد فرماتے ہیں کہ امام اعظم کسی قدر دراز قد تھے۔ آپ کے رنگ پر گندم کوئی غالب تھی، اچھا لباس پہنتے، عام زندگی میں اچھی حالت میں رہتے، خوشبو کا اتنا استعمال کرتے تھے کہ آپ کی نقل و حرکت کا اندازہ خوشبو کی مہک سے ہوتا تھا یہ

امام اعظمؒ تابعی ہیں

اللہ سبحانہ کی مخلوقات میں سب سے برتر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آپ کے بعد اولوالعزم من الرسل ہیں ان کے بعد باقی انبیاء کا مقام ہے۔ انبیاء کے بعد صحابہ کرام اور صحابہ کے بعد تابعین عظام سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے۔

اسلام میں صحابہ کا مقام

صحابہ اور تابعین کو قرآن حکیم میں اللہ سبحانہ نے اپنی دائمی خوشنودی کا پروانہ عنایت فرمایا ہے:

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ
اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُمْ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے
اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی خوبی کے ساتھ پیروی کی۔ اللہ ان سے راضی
ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ جن مہاجرین نے ہجرت میں اولیت اور سبقت کا ثمر حاصل کیا اور جن انصار نے نصرت و اعانت میں پہل کی اور وہ لوگ جنہوں نے نیکو کاری اور حسن نیت سے ان پیش روان اسلام کی پیروی کی ہے۔ ان سب کو اللہ سبحانہ کی خوشنودی کا پروانہ مل چکا ہے۔ قرآن کی یہ آیت صحابہ کی عدالت، ثقاہت، صداقت اور دیانت کی کھلی شہادت ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر مدار اسلام ہے اور ان پر ہرج کرنا دین کی پوری عمارت گرا دینے کے مترادف ہے۔

چنانچہ ملا علی القاری فرماتے ہیں:

لے اولوالعزم من الرسل کی تعداد میں علماء کا اختلاف ہے حافظ سیوطی نے قول صحیح کے مطابق پانچ بتائے ہیں
نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

اولوالعزم نوح و الخلیل المجد و موسیٰ و عیسیٰ و الحبیب محمد

الصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُولٌ مُطْلَقًا لَطَوَاهِرُ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ
وَأَجْمَاعٍ مَنْ يَعْتَدُّ بِهِ ۱

تمام صحابہ بلا قید عادل ہیں۔ قرآن و سنت اور امت کی اجتماعی قوت کا
تقاضا یہی ہے۔

امام ابن الاثیر عز الدین علی بن محمد الحمزی رحمہ فرماتے ہیں :
الصَّحَابَةُ يُشَارِكُونَ سَائِرَ الْمَوَدَّاتِ فِي جَمِيعِ ذَلِكَ إِلَّا فِي
الْجُرْحِ وَالتَّعْدِيلِ فَإِنَّهُمْ كُلُّهُمْ عَدُولٌ ۲
صحابہ ان تمام میں راویوں کے شریک ہیں لیکن ان کی جرح و تعدیل سے
بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ عادل ہیں۔

۱۔ مرقات ج ۵ ص ۵۱۷۔ ۲۔ عدول عادل کی جمع ہے۔ عدالت عربی زبان کا مصدر ہے اس کے خاص معنی ہیں
اس لیے اس کے اصطلاحی اطلاقات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔
۱۔ عدل ظلم و جور کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اس وقت اس کے معنی معاملات و حقوق میں انصاف برتنے
کے ہیں مثلاً سلطان عادل، حکومت عادلہ، یہ علم الاجتماع کی اصطلاحی عدالت ہے۔
۲۔ عدل فسق و عصیان کے مقابلے میں بھی بولا جاتا ہے کہتے ہیں نماز میں امام عادل ہو یعنی متقی ہو فاسق نہ ہو
یہ فقہاء کی اصطلاح ہے۔

۳۔ عدل کے معنی اس ملکہ کے بھی آتے ہیں جو گناہوں سے دور رکھے یہ علم کلام کی اصطلاح ہے۔
۴۔ عدل کے معنی گناہوں سے محفوظ ہونے کے بھی آتے ہیں یہ خالص علم تصوف کی اصطلاح ہے۔
۵۔ عدل کے معنی بالا راوہ روایت میں جھوٹ سے بچنے کے آتے ہیں یہ اصطلاح محدثین ہے اور یہی معنی اس
وقت مراد ہوتے ہیں جب حدیث کے فن میں راویوں کی عدالت کا دعویٰ کیا جاتا ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے
ہیں۔ پوری تلاش و جستجو کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صحابہ کرام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھوٹ کو سخت
گناہ اور عیب سمجھتے تھے اور اس سے بید تمنا طرہ سے تھے اس لیے عدالت نام ہے روایت میں جھوٹ سے بچنے اور
ہر ایسے عمل سے دور رہنے کا جس سے روایت پر کوئی حرف آتا ہو۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر الروض الباسم میں امام شافعی
سے نقل کرتے ہیں کہ اگر عادل بے گناہ کو کہتے ہیں تو پھر انبیاء کو مستثنیٰ کرنے کے بعد پورے انسانی معاشرے میں کوئی
عادل نہیں ہے اور اگر گناہگار عادل ہے تو پھر مجروح و مقدوح کوئی نہیں اس لیے عادل وہ ہے جس کا دامن
(باقی ص ۱۳۳ پر)

تابعین کی بزرگی

صحابہ کرام کے بعد تابعین بھی اسلام میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں چند ارشادات نبوت مدنیہ ناظرین ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُ النَّاسِ قُرُونِي ثُمَّ
الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ يَجِيئُ
أَقْوَامٌ تَسْبِقُ شَهَادَةً أَحَدِهِمْ يَمِينُهُ وَيَمِينُهُ شَهَادَتُهُ
حضور انورؐ فرماتے ہیں کہ بہترین لوگ میرے زمانہ کے ہیں بعد ازیں وہ جو ان کے بعد آئیں گے پھر
جو ان کے بعد آئیں گے اس کے بعد ایسی قومیں رونما ہوں گی جن کی شہادت قسم سے لگے
اور قسم شہادت سے پیش پیش ہوگی۔

ص ۱۳۳ کا بقیہ حاشیہ) کیا تم کی اودگی سے پاک ہو اور جس کی زندگی میں نیکیاں غالب ہوں، امام نووی نے روضہ میں یہی
معنی نقل کیے ہیں۔ الغرض ارباب حدیث کے یہاں عدالت یہ ہے کہ بیان روایت میں جان بوجھ کر جھوٹ نہ
بولے اور اس کے دامن میں نیکیاں زیادہ ہوں۔ امام غزالی فرماتے ہیں عدالت دینی زندگی میں سیرت کی استقامت
کو کہتے ہیں۔ حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ عدالت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دامن کیا تر سے اور صفائے پر اصرار سے پاک
ہو اور ان چیزوں سے محتاط ہو جو وقار کے منافی ہوں۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں عادل وہ ہے جس میں ایسا
ملکہ ہو جو اس کو ملازم تقویٰ و مروت بنائے۔ علامہ جزائری رقمطراز ہیں کہ عدالت کے بھی مراتب ہیں۔

اے عبداللہ نام اور ابو عبدالرحمن کنیت ہے والد کا نام مسعود اور ندی قبیلہ سے نسب تعلق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور بدیعین میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو تذکرۃ الحفاظ میں الامام الربانی،
الفقیہ اور مقرئ کے بابرکت القاب سے پکارا ہے روایت حدیث میں حد و وجہ محتاط تھے۔ حافظ عسقلانی
فرماتے ہیں کہ اسلام لانے والوں میں ان کا چھٹا نمبر تھا مکہ میں سب سے پہلے باذانہ قرآن خوانی کرنے والے یہی تھے۔
ان کو دونوں ہجرتوں حبشہ اور مدینہ کی سعادت حاصل ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا کوفہ میں
دینی تعلیم کی اساس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ امام اعظم کے فقہ کی
بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتاویٰ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان فیصلوں پر ہے جن کو تلامذہ ابن
مسعود مانتے ہوں اور جانتے ہوں۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ
قَالَ الْقَرْنُ الَّذِي أَنَا فِيهِ ثُمَّ الثَّانِي ثُمَّ الثَّلَاثُ
ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے
اچھے لوگ کون ہیں؟ فرمایا میرے زمانے کے پھر دوسرے کے پھر تیسرے کے پھر
حضرت امام محی الدین ابو زکریا النووی خیر القرون کی حدیث پر نوٹ لکھتے ہیں:
دُرست یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور صحابہ کا زمانہ ہے دوسرا
تابعین کا تیسرا اتباع تابعین کا چوتھا

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ
مراد ہے۔

جناب علامہ مولانا صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

یہی صدرِ اول اور سلف صالح ہیں۔ ان ہی کو ہر موضوع پر بطور دلیل
پیش کیا جاسکتا ہے ان ہی پر دین کی زندگی میں اعتماد ہے۔ دینی
زندگی کے سائے احوال، اعمال، اخلاق اور احکام میں یہی سند ہیں۔
ان تینوں دوروں میں دورِ اول یعنی زمانہ صحابہ (جو اللہ تک ہے) کمالِ علم، کمالِ ایمان
کے لحاظ سے دوسرے اور تیسرے دور سے افضل ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:-
قرنِ اول کمالِ علم اور کمالِ ایمان میں ایسے مقام پر تھا کہ قرنِ ثانی اور
قرنِ ثالث کی وہاں تک رسائی نہیں ہوتی۔
ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

ان تینوں دوروں میں بہترین دور ان لوگوں کا ہے جن کی نگاہوں

۱۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۱۰ لے شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰۹

۲۔ فتح الباری ج ۱ ص ۴۴ لے الحطہ ص ۲۲

۳۔ شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص ۱۳۷

نے جمالِ جہاں آرا کا بحالتِ ایمان مشاہدہ کیا ہے یہی لوگ حق و باطل میں
فرق کو سب سے زیادہ جانتے والے، حق کے سب سے زیادہ ملنے والے،
حق کے سب سے زیادہ فریفتہ، باطل کے پیری اور حق کی خاطر سب سے
زیادہ جان کھپانے والے ہیں۔ بعد میں آنے والوں کے مقابلے میں علم و
دیانت، سرفروشی و حق آشنائی، حق پذیری اور حق کی خاطر مصائب کے
استقبال میں سب سے پیش پیش ہیں یہ

حضرت امام اعظم کی پیدائش دورِ نبوت یعنی ۶۹۹ھ مطابق ۶۹۹ھ میں ہوئی ہے۔ آخری
صحابی کی وفات کے وقت یعنی ۳۰ھ میں آپ کی عمر تیس سال ہے اور اگر حافظ سمعانی، حافظ

لے النبوات ص ۸۵۔ یاد ہے کہ جمہور کا تو یہی خیال ہے کہ قرنِ اول سے زمانہ صحابہ قرنِ ثانی سے زمانہ تابعین
اور قرنِ ثالث سے زمانہ اتباع تابعین مراد ہے لیکن ازالۃ الخفاء میں حکیم الامت نے جدید تحقیق فرمائی ہے کہ قرنِ اول
زمانہ آنحضرتؐ بود از ہجرت تا وفات و قرنِ ثانی زمانہ شیخین و قرنِ ثالث زمانہ زوی النورین، ایک دوسرے موقع
پر فرماتے ہیں کہ قرنِ اول زمانہ ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم است تا زمانہ وفات و قرنِ ثانی از ابتدائے
خلافت صدیق تا وفات فاروق و قرنِ ثالث قرنِ حضرت عثمان، مشاہدہ صاحب نے جمہور سے الگ اپنے اس
دعوے کی توجیہ یہ بتائی ہے کہ قرنِ لغت میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو عمر میں قریب قریب ہوں اور عرف
میں ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو ریاست و خلافت میں قریب قریب ہوں۔ جب خلیفہ دوم امیر ہو اور وزیر و سردار
بھی دوم ہو فوجی انسر سپاہی اور شہری بھی اور ہوں تو قرن بدل جاتا ہے (ازالۃ الخفاء ص ۷۸) یہ تو لغت اور عرف
کے لحاظ سے قرن کی توجیہ ہے اس کے علاوہ جو محدثانہ تحقیق فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمایا ہے فرماتے ہیں۔ جب ہم
ان تمام روایات کو جو عبارت میں مختلف اور مقصود میں متحد ہیں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قرونِ ثلاثہ سے اسی
مدت کی تفصیل کی ہے اور اس مدت کو تین قرون میں تقسیم کر کے ان کی تعریف صرف اس لیے کی ہے کہ ان قرون کے مدبر اور
صاحبانِ حکومت بے حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور اعمالِ خیر کی اشاعت اور غلبہ اسلام کے بارے میں اللہ سبحانہ کا وعدہ ان قرون
میں پروان چڑھا (ازالۃ الخفاء ص ۷۶) مشاہدہ صاحب کی یہ تحقیق از روئے لغت بالکل جچی تلی ہے اور اس تحقیق کی
رو سے جن حدیثوں میں زمانہ صحابہ و تابعین میں فتنوں کی خبر دی گئی ہے ان میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی ہے اور
چونکہ جمہور علمائے ان تین قرون سے وہ ہی کچھ مراد لیا ہے جسے ہم نے کتاب میں اختیار کیا ہے اس لیے ان کو ان تمام
حدیثوں میں تاویل کی راہ اختیار کرنی پڑی ہے اور ان تمام حدیثوں کے لیے مطالب کے نت نئے جانے بنائے جن میں
صحابہ اور تابعین کے زمانے میں فتنوں کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

ابن حبان، حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کی پیش فرمودہ تاریخ ولادت ۱۱۳ھ پر اعتماد کیا جاتے تو آپ کی عمر ۵۱ سال ہو چکی ہے۔ اگر ۱۱۳ھ ہی کو مان لیا جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عمر کی تیس بہاریں دیکھنے کے باوجود آپ نے کسی صحابی کی زیارت نہیں کی جبکہ ابوالطفیل جنگ احد والے دن پیدا ہوئے آٹھ سال زمانہ نبوت پایا کوفہ میں قیام کیا حضرت علیؑ کے ساتھ تمام مشاہد میں شریک ہے اور حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق ۱۱۳ھ میں وفات ہوئی۔ حافظ ابن حجر بھی امام ذہبی کے تقریب میں ہمنوا ہیں۔

مَاتَ سَنَةَ عَشَرَ وَ مِائَةَ سِتَّةٍ فِي وَفَاتِ بَاقِي

اس وقت حضرت امام اعظم کی عمر تیس سال تھی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ابوالطفیل شہادت علی رضی اللہ عنہ کے بعد مکہ تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوا تو حضرت امام اعظم سولہ سال کی عمر میں حج کو تشریف لے گئے وہاں ابوالطفیل موجود تھے زیارت نہ ہونا ایک حیرت والی بات ہے اور اگر یہ درست ہے کہ ابوالطفیل نے کوفہ ہی میں باقی زندگی گزار دی تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک شخص ایک شہر میں پورے تیس سال گزارے اور اس شہر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی موجود ہوں مگر زیارت نہ ہو۔

محدثین کی زبان میں تابعی

سب مانتے ہیں کہ امام اعظم نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور حافظ ذہبی، حافظ عسقلانی، حافظ قسطلانی، حافظ دارقطنی، ابن الجوزی، خطیب بغدادی، ابن سعد، قاضی ابن خلکان، امام یافعی، شیخ ابن حجر مکی، شیخ جزیری اور حافظ توربشتی کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ امام اعظم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے اور جیسا صحابی ہونے کے لیے بحالت ایمان ذات نبوت کا دیدار کافی ہے ایسا ہی تابعی ہونے کے لیے صرف صحابی کا دیکھ لینا کافی ہے۔ روایت نہ تابعی ہونے کے لیے شرط ہے اور نہ صحابی ہونے کے لیے، خود امام بخاری نے صحیح میں صحابی کی یہ تعریف کی ہے کہ

مَنْ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ رَأَاهُ

مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَهُمْ مِنْ أَصْحَابِهِ لَہ
جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یا دید کا شرف بحالت ایمان
حاصل ہو وہ صحابی ہے۔

اور یہ تعریف ارشادات نبوت سے لی گئی ہے۔ ترمذی میں ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم سے سنا ہے کہ کسی ایسے مسلمان کو آگ نہ لگے گی جس نے مجھے
دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا لہ

صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت جابرؓ نے بحوالہ حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کی ہے :
حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ان میں سے لشکر روانہ
کیا جائے گا وہ کہیں گے دیکھو کیا تم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
کے صحابہ میں سے کوئی ہے اگر ہو گا تو اس کی برکت سے ان کو فتح
ہو گی۔ پھر دوسرا لشکر روانہ کیا جائے گا وہ کہیں گے ھَلْ فِیْہُمْ
مَنْ رَأٰی اَصْحَابَ النَّبِیِّ؟ کیا ان میں کوئی حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم کے صحابہ کو دیکھنے والا ہے پس ان کی فتح ہو گی، پھر تیسرا لشکر
روانہ کیا جائے گا کہا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے
جس نے اصحاب نبوت کی زیارت کرنے والوں کو دیکھا ہو لہ

اس ارشاد نبوت سے صحابی اور تابعی کی تعریف واضح ہو کر سامنے آگئی کہ نبوت کی دید کا
بھسے بحالت ایمان شرف حاصل ہو وہ صحابی ہے اور اس میں تمام محدثین یک زبان ہیں۔ اس موضوع
پر محدثین میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں ایسے ہی جن آنکھوں نے صحابہ کو مسلمان ہونے کی حالت
میں دیکھا ہو وہ تابعی ہے لہ

لہ صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۸۷ لہ ترمذی ص ۲۸۸ لہ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۲۴
کہ بعض لوگوں کو کتابوں میں تابعی کی یہ تعریف پڑھ کر مَنِ لَقِيَ الصَّحَابَ... الخ غلط فہمی ہو گئی ہے
اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ دیکھنے والا تابعی نہیں بلکہ ملاقات کرنے والا تابعی ہے لیکن وہ اگر لقا کر کے
(باقی ص ۱۳۹ پر)

یہ بات کہ امام اعظم کو شرف دید حاصل ہے ایک بے غبار حقیقت ہے اور اسی بنا پر ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ محدثین کا فیصلہ ہے کہ امام اعظم تابعی ہیں۔ ان اکابر کے نام آپ سُن چکے ہیں جنہوں نے صحابہ کی دید کی تصریح کی ہے۔ ان کے اسمائے گرامی سُن لیجئے جنہوں نے امام صاحب کے تابعی ہونے کا واضح کاف لفظوں میں اقرار کیا ہے۔ امام ابوالبرکات عبد اللہ شافعی، حافظ بدر الدین عینی، حافظ ابن الجہا، حافظ ولی الدین العراقي، حافظ زین الدین العراقي، ابو معشر عبد الکبیر شافعی، حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ جلال الدین السیوطی، شیخ ابن حجر مکی، علامہ قسطلانی، شیخ عبد الحق دہلوی، امام بن باز کرم درسی، ملا علی نقاری، حافظ عبد القادر قرشی وغیرہم نے تصریح کر دی ہے کہ امام اعظم تابعی ہیں۔ سب کا استقصاء تو مشکل ہے لیکن کُلے از کُلزار چند تصریحات ہدیہ ناظرین ہیں۔

۳۴۸ کا بقیہ حاشیہ:- معنی بھی محدثین ہی سے پوچھ لیتے تو پھر اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ حافظ ابن حجر نے شرح منہج میں لقاء کے معنی جو بتائے ہیں اس میں بیٹھنا، ساتھ چلنا، ایک دوسرے سے بغیر گفتگو ملنا اور ایک دوسرے کو دیکھنا سب داخل ہے چنانچہ وہ صراحت لکھتے ہیں دَخَلَ فِيهَا رُؤْيَا أَحَدِهِمَا الْآخَرُ اس لیے مَنْ لَقِيَ الصَّحَابِيَّ کے معنی یہ ہیں کہ تابعی وہ شخص ہے جو صحابی سے ملا ہو یعنی اس کے پاس بیٹھا، اس کے ساتھ چلا ہو بغیر گفتگو کے ملا ہو، ایک دوسرے کو باہم دیکھا ہو، شرح منہج میں حافظ عسقلانی نے صحابی اور تابعی کی جو تعریف کی ہے اسے بھی سُن لیجئے، هُوَ مَنْ لَقِيَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُؤْمِنًا بِهِ وَمَاتَ عَلَى الْإِسْلَامِ جس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان ہی پر اس کی موت ہوئی ہو وہ صحابی ہے۔ اب تابعی کی تعریف بھی پڑھ لیجئے هُوَ مَنْ لَقِيَ الصَّحَابِيَّ كَذَلِكَ اور ملاقات کا مطلب آپ سُن چکے ہیں۔ اسی تعریف کو علامہ نووسی نے تقریب میں اظہر بتایا ہے۔ اسی کو علامہ محمد بن اسماعیل الیما نے توضیح الافکار میں اختیار کیا ہے۔ یہی امام حاکم کا مسلک ہے حافظ ابن الصلاح نے اسی کو اقرب اور حافظ عراقی نے اسی پر محدثین کی اکثریت کا عمل بتایا ہے۔ امام اعمش کے بارے میں اگرچہ ترمذی کی تصریح یہ ہے کہ انہوں نے کسی صحابی سے کوئی حدیث نہیں سنی مگر اس کے باوجود صرف شرف دید کی وجہ سے امام مسلم اور امام ابن حبان نے امام اعمش کو طبقہ تابعین میں شمار کیا ہے۔ امام عراقی فرماتے ہیں کہ حضور انور نے اس ارشاد میں کہ طُوبَى لِمَنْ سَرَّاهُ مِنْ رَأْيِي وَطُوبَى لِمَنْ سَرَّاهُ مِنْ رَأْيِي صحابی اور تابعی کی تعریف کر دی اور تابعی اور صحابی ہونے کا مدار دید کو قرار دے دیا۔ (تدریب ص ۴۱۶)

حافظ ابن حجر عسقلانی کی رائے

حافظ ابن حجر عسقلانی سے کسی نے دریافت کیا کہ امام اعظم تابعی ہیں یا نہیں؟ حافظ صاحب نے اس کا جواب دیا ہے حافظ ابن حجر مکی نے الخیرات الحسان ص ۲۱ پر ملا علی قاری نے مشرح مسند امام اعظم ص ۲۸۴ پر اور حافظ جلال الدین السیوطی نے تبصیر الصغیرہ ص ۵۰۴ پر نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

امام اعظم نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے کیونکہ آپ کی تاریخ ولادت ۳۰ کو ف میں ہے۔ کو ف میں اس وقت حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ موجود تھے کیونکہ ان کی وفات بالاتفاق بعد میں ہوئی، بصرے میں حضرت انس بن مالکؓ تھے ان کی وفات ۳۹ کے بعد ہوئی۔ ابن سعد نے ایک بے غبار سند سے یہ بیان درج کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے ان دو کے علاوہ اور بھی صحابہ بقید حیات تھے، بعض اکابر نے صحابہ سے امام صاحبؒ کی روایت کے موضوع پر کچھ رسائل بھی لکھے ہیں لیکن ان کی سندیں ضعیف سے خالی نہیں ہیں۔ بہر حال اتنی بات مستند اور طے شدہ ہے کہ آپ نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور ابن سعد کی تصریح کے مطابق یہ بھی امر واقعہ ہے کہ کچھ صحابہ کرام کی زیارت کا امام ابوحنیفہؒ کو شرف حاصل ہے اس لحاظ سے امام صاحبؒ کا شمار طبقہ تابعین میں ہے اور یہ شرف امام صاحبؒ کے سوا امام صاحبؒ کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہیں ہے۔ نہ امام اوزاعیؒ کو شام میں نہ حماد بن زیدؒ اور حماد بن سلمہؒ کو بصرہ میں نہ سفیان ثوریؒ کو کو ف میں نہ امام مالکؒ کو مدینہ میں نہ امام مسلم بن خالدؒ کو مکہ میں اور نہ لیث بن سعدؒ کو مصر میں ہے۔

لے یہ جو فرمایا کہ ان کی سند ضعیف سے خالی نہیں تو اس سے غلط فہمی نہ ہو جائے ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ضعیف الاسناد ہے یہ نہیں ہے کہ ثابت نہیں ہے تدریب میں حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ اگر بند ضعیف ہو تو ہم اسے ضعیف الاسناد تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کے ہونے کا انکار نہیں کر سکتے اگر اس کے خلاف کوئی شہاد (باقی ص ۱۴۱ پر)

اسی قسم کا ایک اور سوال حافظ ولی الدین عراقی کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا امام اعظمؒ تابعی ہیں؟ حافظ عراقی نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ حافظ سیوطی نے تبیض الضعیفہ میں نقل کیا ہے۔ اس میں حافظ عراقی نے صاف اقرار کیا ہے کہ اگر صحابی کے دیکھنے کا نام تابعیت ہے تو امام ابو حنیفہ کا شمار بلاشبہ تابعین میں ہے اور کوئی نہیں جو اس بنیاد کو مان کر امام اعظم کی تابعیت کا انکار کر سکے۔

حافظ زین الدین عراقی کا تبصرہ

علامہ محی الدین نووی نے تقریب میں نسوع الحادی والاربعون میں روایت الا کا بر عن الاصاغر پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑوں کا چھوٹوں سے استفادہ کی ایک قسم یہ بتاتی ہے کہ ایک شخص تابعی ہو کر کسی ایسے شخص سے روایت لے جو تابعی نہیں ہے جیسے عمرو بن شعیب کہ یہ تابعی نہیں ہیں لیکن تابعین نے ان سے روایات لی ہیں۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے باوجود تابعی ہونے کے عمرو بن شعیب سے استفادہ کیا ہے ان کی تعداد حافظ عراقی نے پچاس سے زائد بتاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ

وعدھم الحافظ العراقی ابو الفضل نیفا وخمینؒ
حافظ عراقی نے ان کو پچاس سے زیادہ شمار کیا ہے۔

صفحہ ۱۴ کا بقیہ حاشیہ)۔ نہ ہو تو وہ قابل پذیرائی ہے حافظ ابن قیم نے اعلام میں لکھا ہے کہ الاصل الرابع الاخذ بالمرسل والحدیث الضعیف اذا لم یکن فی الباب شیئاً یفدہ ص ۱۱۔ سائے دفتر حدیث و رجال میں ایسی کوئی شہادت نہیں جس میں کوئی امام کے متعلق یہ بتائے کہ آپ نے صحابہ کو نہیں دیکھا ہے بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اصحابہ اثبتوہ بالاسانید الصحاح والاحسان اور اصولاً یہی رائج ہے۔

۱۵ پورا نام احمد بن عبد الرحیم بن الحسین ہے ولی الدین لقب ابو زرعہ کنیت ہے اپنے والد زین الدین عراقی کے ہاتھوں پر وہ ان پڑھے ہیں ۱۶ میں ولادت ہوئی ۳ سال کی عمر میں ان کو ان کے والد دمشق لے گئے، جو ان ہوئے مصر آگئے، یہاں کے مشائخ سے استفادہ کیا دوبارہ دمشق گئے اور وہاں کے مشائخ سے فیض یاب ہوئے ان کو یہ شرف ہے کہ ان کی جملہ روایات اور مصنفات کا ان سے ان کے اکابر اور بزرگوں نے سماع کیا۔ فقہ، اصول، معانی و بیان ادب عربی میں کمال حاصل تھا۔ نوجوانی ہی میں مسند تدریس پر بیٹھ گئے تھے ان کی تصانیف میں کافی کتابیں ہیں ان کا مبسوط ترجمہ ابن فہد نے لحظہ الالحاظ از ص ۲۸۴ تا ۲۹۰ لکھا ہے۔ ان کی وفات، اشعبان ۳۶۰ھ کو ہوئی۔

۱۷ پورا نام عبد الرحیم بن الحسین بن عبد الرحمن المکرمی الرازبانی ہے، حافظ ابن فہد نے لحظہ الالحاظ میں اور حافظ (باقی ص ۱۲۳ پر)

اس کے بعد حافظ عراقی کے بیان کردہ تابعین کے ناموں کی یہ فہرست دی ہے ابراہیم بن میسر ابوب
 اسحق ثانی، بکر بن الاشج، ثابت بن عجلان، ثابت البنانی، جریر بن حازم، حبان بن عطیہ حبیب ابن ابی
 موسیٰ، جریر بن عثمان، المحکم بن عتیہ حمید الطویل، داؤد بن قیس، داؤد بن ابی ہند الزبیر بن عدی، سعید
 بن ابی ہلال، سلمہ ابن دینار سلیمان الشیبانی، سلیمان الاعمش، عاصم الاحوال، عبد اللہ بن عبد الرحمن الطائفی
 عبد اللہ بن عون، عبد اللہ بن ابی ملیکہ، عبد الرحمن بن حرمہ عبد الغزیز بن رفیع عبد الملک بن جریر، عبد اللہ
 العمری، عطاء ابن ابی رباح عطاء ابن السائب، عطاء الخراسانی، العلاء ابن الحارث، علی بن الحکم، عمرو بن دینار،
 ابوالسحاق السبعی، قتادہ، محمد بن اسحق، محمد بن مجاہد، محمد بن عجلان ابوالزبیر، زہری، مطر الوراق، مکحول،
 موسیٰ ابن ابی عائشہ، ابو حنیفہ النعمان بن ثابت، ہشام بن عروہ ہشام بن العاز، وہب بن منبہ، یحییٰ
 ابن ابی کثیر، یزید بن ابی حبیب نے عمرو بن شعیب سے روایت کی ہے ان تابعین میں امام اعظم کا بھی
 اسم گرامی موجود ہے اس لیے معلوم ہوا کہ امام اعظم حافظ عراقی کے نزدیک تابعی ہیں یا دوسرے کہ حافظ
 عراقی فن حدیث میں بڑے پائے کی شخصیت ہیں۔

علامہ قسطلانی کی رائے

علامہ قسطلانی نے امام اعظم کو تابعین کے زمرے میں شمار کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔
 ہذا مذہب الجہور من الصحابہ کابن عباس وعلی و معاویہ و انس بن مالک و
 خالد و ابی ہریرہ و عائشہ و ام ہانی و من التابعین الحسن البصری و ابن
 سیرین و الشعمی و ابن المہذب و عطاء و ابو حنیفہ و من الفقہاء ابو یوسف
 و محمد و الشافعی و مالک و احمد

صلۃ کا بقیہ حاشیہ:۔ سیوطی نے ذیل طبقات الحفاظ میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے عزالدین بن جماعة فرماتے تھے کہ مصر
 میں ان کے سوا کوئی حدیث دانی کا دعویٰ کرتا ہے وہ صرف مدعی ہے علامہ سبکی، العلائی اور ابن کثیر نے ان کی بے حد تعریف کی ہے
 ان کی تصانیف میں الفیہ اس کی شرح، تخریج اجماع تکملہ شرح الترمذی وغیرہ ہیں۔ ابن فہد لکھتے ہیں کہ تین سال کی عمر میں
 سایہ پدری سے محروم ہو گئے تھے ۸ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا علم حدیث انہوں نے ابوشیخ علاؤ الدین ابن الترمکانی
 الحنفی سے حاصل کیا اور ان سے ہی حدیث کی دستا فضیلت لی تحصیل علم کے لیے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔
 بہت خوبیوں، فضیلتوں اور بزرگیوں کا سرمایہ تھے۔ بدھ کے دن ۸ شعبان ۷۸۷ھ میں بمقام قاہرہ اللہ کو پیارے
 ہو گئے تعذہ اللہ برحمتہ۔ لے ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۸۲

یہ تمام صحابہ تابعین اور فقہاء کا مذہب ہے صحابہ جیسے ابن عباسؓ، علیؓ، معاویہؓ، انسؓ، خالدؓ، ابو ہریرہؓ، عائشہؓ، ام ہانیؓ، تابعین میں جیسے حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، شعبیؒ، ابن المسیبؒ، عطاءؒ اور ابو حنیفہؒ اور فقہاء میں جیسے ابو یوسفؒ، محمدؒ، شافعیؒ، مالکؒ اور احمدؒ۔

اس میں امام اعظم کا تابعین کے زمرے میں صاف تذکرہ موجود ہے۔
محدثین میں سے حافظ ابو عمرو بن عبد البر کی شخصیت سے کون ناواقف ہے، موصوف نے حضرت انسؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابی عبد اللہ بن الحارث بن جرز کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے۔

إِنَّ أَبَا حَنِيفَةَ رَأَى أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ الْحَارِثِ
بْنِ جَزْءٍ۔

امام ابو حنیفہ کو حضرت انس بن مالک اور حضرت عبد اللہ کی دید کا شرف ہے۔
عبد اللہ بن حارث کی حدیث پر تفصیلی کلام انشاء اللہ آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی بیش بہا تصنیف الانتصار میں لکھا ہے کہ
مات عبد اللہ بن الحارث بن جزء سنة سبع وتسعين لله

یاد رہے کہ حافظ ابو بکر الجعابی اپنے وقت میں علل حدیث اور تاریخ رجال کے بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ مشہور محدث دارقطنی ان کے شاگرد ہیں۔ ابو علی نیشاپوری کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ حافظ حدیث کوئی نہیں دیکھا۔ ان کو چار لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے درس حدیث میں آنا ہجوم ہوتا تھا کہ گھر، گلی، شاہراہوں پر انسان ہی انسان ہو جاتے تھے۔ ابو الفضل القحطان کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابو بکر الجعابی کی زبانی سنا ہے کہ میں جب رقد پہنچا وہاں میرے پاس حدیث کی کتابوں کا گٹھا تھا۔ ایک روز ملازم غمگین صورت بناتے ہوئے آیا، بولا کہ آپ کی ساری کتابیں ضائع ہو گئیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں ان میں صرف دو لاکھ حدیثیں تھیں وہ سب مجھے زبانی یاد ہیں۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ علل رجال کے امام تھے۔

یہ امام اعظم کے بارے میں دید کی شہادت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مثبت دعویٰ ہے اس کے

مقابلے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ایک منفی چیز ہے۔ اصولی طور پر مثبت کو منفی پر مقدم ہونا چاہیے۔ امام بخاری نے جزء رفع یدین میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ ایک بات کے بیان کرنے والے دو شخص ہوں۔ ایک کہے میں نے کرتے دیکھا ہے دوسرا کہے میں نے نہیں دیکھا ہے۔ ان میں مثبت ثابت ہے۔ نافی شاید نہیں ہے کیونکہ اسے کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ عبد اللہ بن زبیر کہتے ہیں دو شاہدوں نے گواہی دی ایک نے کہا حمید نے اقرار کیا ہے کہ اس کے ذمہ ایک ہزار روپیہ ہے، دوسرا کہتا ہے کوئی اقرار نہیں کیا جو شخص مثبت کا اظہار کر رہا ہے وہ شاید ہے اسی کو اپنا یا جائے گا۔ یا مثلاً بلال کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اور فضل بن عباس کہتے ہیں کہ آپ نے نماز نہیں پڑھی، بلال کی بات کو قبول کیا جائے گا کیونکہ یہ شہادت ہے اور نافی کی بات ناقابل التفات ہے۔

لیجئے اسی ترازو میں امام اعظم کی تابعیت کے معاملے کو تول کر دیکھ لیجئے۔ ایک طرف حافظ ذہبی اور ابن سعد سیف ابن جابر کی زبانی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ امام اعظم نے انس بن مالک کو دیکھا ہے اور دوسری طرف یہ کہنے والا کوئی نہیں کہ، نہیں دیکھا، اگر بالفرض ایسی کوئی بات ہوتی بھی ہو تو پھر بھی کہا جاسکتا تھا کہ مثبت ثابت ہے اسی ترازو میں روایت کے مسئلہ کو بھی تول لیجئے۔ ایک طرف کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ امام اعظم نے صحابہ سے روایت کی ہے اس کے مقابلے میں دارقطنی صدیاں گزرنے پر کہتے ہیں کہ امام اعظم نے روایت نہیں کی، فرمائیے امام بخاری کے پیش کردہ ضابطہ کے مطابق شاید کون ہے؟ وہ جو وجود کا پتہ دے رہا ہے یا وہ جو نہیں، نہیں کر رہا ہے آپ ہی انصاف فرمائیے۔

الفرض امام اعظم کا زمانہ صحابہ میں ہونا اور حضرت انس کا دیکھنا محدثین کے یہاں اتفاق ہے اس لیے وہ یقیناً تابعی ہیں اور تابعی ہونے کی وجہ سے اللہ سبحانہ کے اس ارشاد کا مصداق ہیں۔
وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ۔
کیونکہ اس آیت میں مہاجرین و انصار سے جمیع صحابہ مراد ہیں چنانچہ حمید بن زیاد کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے محمد بن کعب قرظی سے صحابہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں تمام صحابہ کی بخشش کا اعلان کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کہاں؟ فرمایا کیا تم نے

قرآن نہیں پڑھا۔ قرآن میں ہے والسابقون... الخ اس آیت نے تمام صحابہ کرام کو بخشش کا شرف ٹھیک کر دیا ہے البتہ تابعین کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ احسان کے ساتھ صحابہ کے پیروکار ہوں، اس لیے اس آیت نے مسلمانوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک صحابہ دوسرے وہ جو احسان کے ساتھ صحابہ کے تابعین ہوں اور دونوں کے لیے اس آیت میں چار ہتم بانٹان وعدے کیے گئے ہیں۔
 اول یہ کہ اللہ سبحانہ ان سے راضی ہو گیا۔

دوم یہ کہ صحابہ اور تابعین اللہ سے راضی ہو گئے۔

سوم یہ کہ وہ جنتی ہیں۔

چہارم یہ کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

امام اعظم تابعی ہونے کی وجہ سے ان تمام وعدوں کے مصداق ہیں اور یہ شرف آپ کے سوا ائمہ اربعہ میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے امام اعظم کو دوسرے اماموں پر مقدم کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے۔

لَا نَبِيَّ بَعْدَ مُحَمَّدٍ وَرَأَى النَّبِيُّ بَنِي مَالِكٍ

امام اعظم کا زمانہ طلب علم

امام اعظم کے بچپن کا زمانہ علوم کے لیے نہیں بلکہ فزون کے لیے باغ و بہار کا زمانہ تھا۔ آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو شہ مطابق ۱۹۷ھ میں ولید بن عبد الملک سریر ارٹے حکومت ہوا بنو امیہ کا آفتاب اقبال اس وقت نصف النہار پر تھا۔ عہد ولید خلافت اموی کے اوج شباب کا زمانہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ فتوحات ملکی اور رفاد عامہ کے کاموں کی جو سرپرستی ولید نے اپنے دور حکومت میں کی ہے۔ بنو امیہ میں سے کسی نے کم ہی کی ہوگی۔ ولید کی حکومت کا دائرہ مشرق مغرب، شمال و جنوب میں حجاز و عراق سے افریقہ، شام، ایشیائے کوچک، ترکستان، ایران، افغانستا اور پاکستان میں شہر ملتان تک پھیلا ہوا تھا۔ حسن اتفاق سے ولید کو تین کارآمد اور مفید سپہ سالار مل گئے تھے۔ قتیبہ بن مسلم الباہلی جس کے ذریعے ایشیائے کوچک کے قلعہ تک اسلامی فتوحات پہنچیں، موسیٰ بن نصیر جس کے ذریعے اندلس میں جبرالطہ تک اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع

ہوا اور محمد بن قاسم جس کے ذریعے پاکستان میں ملتان تک اسلامی فتوحات کا پھر سرا لہرایا۔
غرض ایک ہی وقت میں مسلمانوں کی فوجیں مشرق و مغرب، شمال، جنوب میں فتح و نصرت کے
پرچم اٹھا رہی تھیں اس کے بعد مسلمانوں کو ایسا کامیاب دور دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ ولید کا زمانہ
حکومت ۶۶۱ء سے ۶۹۶ء تک ہے اور یہی دور امام اعظم کے چھٹنے اور لڑکپن کا دور ہے
یہ سارا زمانہ امام اعظم نے کوفہ میں گزارا ہے۔

کوفہ کی مرکزی حیثیت

کوفہ کی علمی حیثیت کیا ہے؟ اس پر تفصیلی بحث تو امام اعظم کے اساتذہ حدیث کے سلسلہ میں
آئے گی مگر اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ وادی و حبلہ اور فرات کا جنوبی حصہ جسے علماء جغرافیہ
عراق کہتے ہیں ایک خوشگوار، سرسبز و شاداب علاقہ اور تین ہزار سالہ مدینیت و تہذیب کا علمی گہوارہ
ہے۔ بابلیوں، آشوریوں، کلدانیوں، فارسیوں اور یونانیوں کی جڑ لگاہ رہا ہے۔ زمانہ خلافت فاروقی
میں اس پر پرچم اسلام لہرایا تو مسلمانوں نے اپنے عہد تمدن میں دو نئے شہر بسائے، کچھ تو اس لیے
کہ مدائن دار الخلافہ کی آب و ہوا ان کو راست نہ آئی تھی اور کچھ اس لیے کہ ممالک محروسہ کا تعلق
مدینہ طیبہ سے انتظامی طور پر حمل و نقل کے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے مشکل رہتا تھا۔ حضرت
فاروق اعظم نے شہر بسانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل فرمائی اس کمیٹی کے حسب ذیل ارکان تھے۔
حضرت سعد بن وقاص اللیثی، حضرت سلمان فارسی، حضرت خذیفہ بن الیمان، ان حضرات
نے شہر کے لیے دریائے فرات کا کنارہ تجویز کیا۔ رپورٹ مرکزی حکومت کو پیش ہونے پر شہر
بسانے کی اجازت ملی۔ منظوری ہو جانے پر محرم الحرام ۳۸ھ جنوری ۶۵۸ء کو حضرت سعد بن
وقاص جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں مدائن چھوڑ کر کوفہ آئے اور آپ کے ساتھ چالیس ہزار نفوس
کوفہ میں آباد ہوئے۔

عددھما ربسون الفاً ان کی تعداد چالیس ہزار ہے۔

اولین رہائش کے لیے نیچے اور چھپر اختیار کیے گئے۔ لیکن خیموں اور چھپروں کے یہ
گھر دندے آئے دن آگ کی تباہ کاریوں کا شکار رہتے تھے اس لیے کچھ عرصہ بعد حضرت فاروق اعظم

نے پختہ عمارات کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے پر عراقی تمدن کے مطابق حضرت ابو الہیاج الاسدی کو پورے شہر کا سروے کرنے پر مقرر کیا گیا۔ آپ نے بڑی محنت سے شاہراہوں، کوچوں، گورنمنٹ ہاؤس اور جامع مسجد کے لیے پلاٹ مقرر کیے۔ نقشہ اس طرح ترتیب دیا کہ شہر کے مرکزی مقام پر جامع مسجد ہو، جامع مسجد سے چاروں طرف چوڑی چوڑی سڑکیں ہوں۔ حافظ ابن کثیر نے سڑکوں کی چوڑائی چالیس ہاتھ یعنی ساٹھ فٹ اور گلیوں کی گیارہ فٹ لکھی ہے۔ اور جامع مسجد کے بڑے دروازے کے سامنے کافی فاصلہ پر گورنمنٹ ہاؤس بنایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی عظیم الشان ترقی کی کہ مدائن کے خزانے، بابل و بصرہ کا تمدن اور عربی تہذیب یہاں اُمڈ کر آگئی حتیٰ کہ لفظ عراق کا مفہوم ہی کوفہ بن گیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ الطبری نے لکھا ہے کہ کوفہ کے تمدن جدید اور تمول کی داستانیں سن کر تمام عرب میں یہاں آباد کاری کے لیے ایک ولولہ پیدا ہوا۔ حضرت عتبہ نے انس بن جحبہ کو حضرت فاروق اعظم کے پاس روانہ کیا۔ حضرت فاروق نے ان سے پوچھا کہ کوفہ میں مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ اس کا جواب جو انہوں نے دیا وہ سننے کے لائق ہے فرمایا کہ:

انثالت علیہم الدنیا فہم یہیلون الذہب والفضة

ان پر دنیا بہ پڑی اس لیے وہ سونا اور چاندی بہا رہے ہیں۔

یہ تو آپ سن چکے ہیں کہ کوفہ میں آباد کاری کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص کے ساتھ چالیس ہزار حضرات تھے۔ ان میں صحابہ کس قدر تھے۔ تصریح تو نہیں ملتی ہے مگر حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں مدائن چھوڑنے کے اسباب بتاتے ہوئے جو یہ فقرہ لکھ دیا ہے کہ

ان الصحابة استخرجوا المدائن صحابہ کو مدائن کی آب و ہوا موافق نہ آئی

تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری تعداد ہی صحابہ کرام پر مشتمل تھی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پوری تعداد نے کوفہ کو وطن بنا لیا ہو۔ اگرچہ کوفہ کے تمدن اور تمول کو دیکھ کر زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ صحابہ کا یہ جم غفیر اسی جگہ آباد ہوا ہو، لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ ان میں سے کچھ حضرات اپس ہو گئے ہوں مگر حافظ سخاوی کے بیان سے پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے وہ حافظ ذہبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

لے البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۷۵ ۷۶ تاریخ اسلام سیاسی ج ۱ ص ۱۰۱۰ فخر الاسلام ص ۱۰۰

۷۶ تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۴۱

کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت علی ابن ابی طالبؓ جیسے حضرات نیز صحابہ کرام کی ایک خلقت یہاں اکرا تری ہے۔

اس موضوع پر ان بزرگوں نے یہ اپنے علم کی حد تک بتایا ہے اور اسی لیے خیالات مختلف ہیں۔ چنانچہ امام حاکم نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں ان مشاہیر کے نام لکھے ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ طیبہ سے دوسرے اسلامی شہروں میں منتقل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے کوفہ سے ابتدا کی ہے اور سب سے زیادہ اسی جگہ آنے والوں کی تعداد بتائی ہے حافظ ابوبشر دولابی نے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص اور پچاس وہ بزرگ کہ جو غزوہ بدر میں آپ کے ہمراہ تھے کوفہ میں فروکش ہوئے۔ امام ابوالحسن احمد بن عبد اللہ نے اپنی تاریخ میں اس سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ اکرا آباد ہوئے۔

حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابوبشر دولابی اور امام ابوالحسن عجمی کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے، صحابہ کی تعداد تو زیادہ ہی ہے مگر تعین عدد ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق کی ہے۔ خود صحابہ کی تعداد کے بارے میں علماء کا ایسا ہی اختلاف ہے۔ حافظ البزرجی نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے حافظ ابن عبد البر نے حجۃ الوداع میں شریک ہونے والے صحابہ کی تعداد ۹۰ ہزار لکھی ہے۔ حافظ ابن حزم نے ایک لاکھ بتیس ہزار لکھی ہے اور شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو تعداد بتائی ہے وہ بھی سن لیجئے :

شَمَّ خَرَجَ إِلَى الْحُجِّ وَحَضَرَ مَعَهُ مِائَتُونَ مِنْ مِائَةِ أَلْفٍ وَارْبَعَةِ
وَ عِشْرِينَ أَلْفًا ۝

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق تعداد لکھی ہے صحابہ کی اس کثرت کے ساتھ احمد ابن نے کوفہ کا علمی نسب نامہ جو لکھ دیا ہے وہ ان کی زبانی سن لیجئے :

کوفہ میں بے حد و حساب صحابہ کرام کا ورود ہوا۔ علم میں ان میں زیادہ مشہور حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں۔ حضرت

علی کو علمی نشر و اشاعت کے لیے سیاسی جھگیلوں کی وجہ سے وہ فراغت نہیں ہوئی جو حضرت عبداللہ بن مسعود کو نصیب ہوئی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود کی شخصیت صحابہ میں سب سے بڑی علمی اور اثری شخصیت تھی، مسلمان ہونے میں ان کا چھٹا نمبر تھا۔ مہاجرین حبشہ کے ساتھ حبشہ بھی ہجرت کی اور بعد ازیں مدینہ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملازم صحبت تھے۔ آپ کو حضور میں جاننے کی اجازت تھی۔ قرآن خوانی اور قرآن فی سب سے حد شغف تھا۔ اسلامی تعلیم تفسیر قرآن میں امتیازی مقام کی وجہ سے آپ کا کبار علماء صحابہ میں شمار تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کو کوفہ کے شہریوں کا معلم بنا کر بھیجا تھا۔ اہل کوفہ نے ان سے علم حاصل کیا اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا۔

اور صرف علم ہی نہیں بلکہ اخلاق و آداب بھی ان سے ہی لیے ان کے شاگردوں کے ہائے میں سعید ابن جبیر کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ ہی اس شہر کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ لوگوں کو قرآن بھی پڑھاتے، تفسیر بھی سکھاتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی بیان کرتے اور پیش پا افتادہ حالات میں فتاویٰ بھی کتاب و سنت سے یا پھر اپنے اجتہاد سے دیتے۔ آپ کے مدرسہ کے چھ شاگرد مشہور ہیں۔ علقمہ، اسود، مسروق، عبیدہ، عارث اور عمرو بن شمر جلیل۔ یہ حضرات کوفہ میں تعلیم و افتاء میں حضرت عبداللہ کے جانشین ہیں لیکن سب علماء کوفہ کا علمی مرکز صرف حضرت عبداللہ ہی کی شخصیت نہ تھی بلکہ ان میں سے بہتوں نے مدینہ جا کر حضرت فاروق اعظم، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت معاذ بن جبل اور دوسرے صحابہ سے علمی استفادہ کیا ہے اس کے نتیجے میں کوفہ کو ایک علمی گھرانہ کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ کوفہ کے علماء میں مشرک، شعبی، سفینی، اور سعید بن جبیر بہت مشہور ہیں۔ اس بستی میں علمی ترقی ہوئی رہی تا آنکہ علم کا مئی تاج امام اعظمؒ کے سر رکھا گیا ہے

فی الواقع صحابہ کی اس کثرت کے باوجود علماء کوفہ نے صرف حضرت عبداللہ ہی پر علمی استفادہ میں قناعت نہیں کی بلکہ ان کے شوق طلب کا عالم یہ تھا کہ وہ اس کی خاطر مدینے کا سفر کرتے تھے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

ابو عبد الرحمن السلمی اور دیگر علماء کوفہ جیسے علقمہ، اسود، حارث، ذہب، جبیش کہ جن کے پاس عاصم بن ابی النجود نے قرآن پاک کی قرأت کی ہے۔ ان سب لوگوں نے حضرت ابن مسعود سے قرآن سیکھا۔ نیز یہی حضرات مدینہ جاتے اور حضرت عمر، حضرت عائشہ، سے علم حاصل کرتے تھے اور کوفہ کے قاضی شریح نے فقہ کی تعلیم مین میں حضرت معاذ بن جبل سے لی تھی۔

اور پھر خپداوراق کے بعد لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ ابن مسعود کے تلامذہ حضرت عمر، علی اور ابوالدردار سے علم حاصل کرتے تھے۔

اس پر تفصیلی تبصرہ آئندہ اوراق میں آ رہا ہے یہاں مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ امام اعظم کی یہ بستی علمی بستی ہے۔ خلاصہ کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ فن قرأت و تجوید کے اگر سات امام ہیں جن کو قرار سابعہ کہتے ہیں تو ان میں سے تین عاصم، حمزہ اور کسائی کوفی ہیں۔ علم التفسیر میں خود عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کو اعلم الناس بالتفسیر بتایا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر جن کو حضرت قتادہ تفسیر کا سب سے بڑا عالم مانتے ہیں وہ کوفہ ہی کے رہنے والے ہیں۔ عربیت اور نحو کی تدوین بھی کوفہ اور بصرہ ان دو شہروں میں ہوئی ہے۔ چنانچہ لغت اور نحو کی کتابوں میں ان دو شہروں کے سوا کسی اور شہر کے علماء کا اختلاف ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے کیسی اچھی بات لکھی ہے:

علم نحو نے کوفہ و بصرہ کے ان دو شہروں میں نشوونما پائی ہے جو پہلی صدی ہجری میں اسلامی ثقافت کا سب سے اہم مرکز تھے جہاں علم کلام اور علم فقہ کی اساس رکھی گئی ہے اور جہاں ادب اور فنون

کے مدرسے قائم ہوتے رہے

الغرض امام اعظم نے جس بستی میں آنکھ کھولی اور جس میں بچپن اور لڑکپن گزارا ہے۔ وہ صرف تمدن و تمدن ہی کا گہوارہ نہیں بلکہ علوم و فنون کی نگرہی ہے۔

امام اعظم کی علمی طلبگاریوں کا زمانہ

اگرچہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ امام کی علمی طلبگاریوں کی محرک علامتہ التابعدین امام شعبی کی ذات گرامی ہے اور اس سے سمجھنے والوں نے یہی سمجھا ہے کہ امام صاحب نے طلب علم کا سلسلہ بچپن میں نہیں بلکہ بڑے ہو کر شروع کیا ہے لیکن یہ محض اندازہ اور خیال ہے۔

در اصل بات یہ ہے کہ علمی طلبگاریوں کا آغاز تو بچپن ہی میں ہو گیا تھا مگر امام شعبی کی ذات گرامی نے امام اعظم کو علم الشرائع کی طرف مائل کیا ہے چونکہ امام اعظم کو دوسرے فنون کے ساتھ علم الکلام سے خاص دلچسپی تھی اور اس دلچسپی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ علم کلام میں اصول دین سے بحث ہوتی ہے اس لیے یہ علم تمام علوم سے برتر ہے۔ اس علم میں تکمیل کی اور صرف تکمیل ہی نہیں بلکہ اس درجہ امامت اور مہارت پیدا کر لی کہ:

بَلَغَ فِيهِ مَبْلَغًا يُشَارُ إِلَيْهِ بِالْأَصَابِعِ

اس مقام پر پہنچ گئے کہ انگلیاں ان ہی کی طرف اٹھتی ہیں۔

اور اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو صدر الامم نے یحییٰ ابن بکیر کے حوالہ سے امام اعظم کی زبانی لکھا کہ:

میں ایک روز بازار جاتے ہوئے امام شعبی کے پاس سے گزرا، امام شعبی نے مجھے بلایا اور دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ بازار، آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ علمی مشغلہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں علماء کے پاس کم جاتا ہوں فرمایا کہ اس بارے میں غفلت کو راہ نہ دو۔ مطالعہ اور اہل علم کی صحبت کو اپنے لیے ضروری کر لو۔ مجھے

۱۔ تاریخ اسلام سیاسی ج ۲ ص ۳۹۱ ۲۔ مناقب للموفق ج ۱ ص ۶۴

۳۔ مناقب کردری ج ۱ ص ۶۴ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۳۲

تم میں ہونہاری اور بیداری نظر آرہی ہے

یہ واقعہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ آغاز طلب کا مشورہ نہیں بلکہ نظر فی العلم اور مجاہد علماء کا مشورہ دے رہے ہیں۔ آپ خود ہی سوچتے کہ ایک شخص جو علم کی راہ سے واقف نہیں ہے، علمائے ربط و ضبط نہیں رکھتا ہے صرف دکاندار ہے۔ اس میں ایک اجنبی شخص کے لیے کون سی کشش ہے جو اسے یہ کہنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم میں مجھے علمی بیداری نظر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام شعبی کو امام اعظم کی کلامی مسائل میں ہونہاری اور بیداری کی داستان معلوم تھی۔ اس بنا پر انہوں نے امام اعظم کو الشرائع کی طرف لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کے نتیجے میں خود امام صاحب فرماتے ہیں کہ:

امام شعبی کی بات دل میں گھر کر گئی اور بازار چھوڑ کر میں علم ہی کا ہو رہا۔
گو یا علم ہی کے ہوئے کا معاملہ اب پیش آیا ورنہ طلب علم کا آغاز تو اب سے بہت پہلے ہو چکا ہے
غیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو ایک غلطی کے ازالہ کی خاطر لکھنا پڑا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ
کے طلب علم کی داستان میں علم کلام کو بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے۔

امام اعظم اور فنونِ عصریہ

قرآن حکیم کی تعلیم سے فراغت کے بعد امام اعظم ان فنونِ عصریہ کی طرف پہلے متوجہ ہوئے جو اس زمانے میں رائج تھیں۔ اس کی تائید اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو صدر الائمہ نے امام صاحب کی زبانی لکھا ہے اس میں خود امام صاحب نے ان علوم و فنون کو نام بنام بتایا ہے جن میں امام صاحب نے کمال پیدا کیا تھا۔

جب میں نے علم سیکھنے کا ارادہ کیا تو میں نے تمام علوم و فنون کو پیش نظر رکھا۔ اور پھر ان میں سے ایک ایک فن کو پڑھا ہے

اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ علم الشرائع کو اپنانے سے پہلے امام صاحب نے اسی بستی میں جسے خود امام صاحب نے معدن العلم والفقہ کا نام دیا ہے۔ علم ادب، علم الشعر والتغنیہ اور علم القراءۃ اور علم الکلام میں سے ایک ایک فن کو باقاعدہ پڑھ لیا تھا اور علم الکلام میں اس درجہ مہارت پیدا

کر لی تھی کہ خود فرماتے ہیں کہ اس میں میری طرف ہی لوگوں کی انگلیاں اٹھتی تھیں۔ اسی سلسلے میں صدرالائمہ اور خطیبِ ہند اسی کی بیان کردہ داستان بھی گوش گزار کر لیجئے جو سچائی ابنِ شیبان کے حوالہ سے ہم تک پہنچی ہے۔

مجھے علمِ کلام میں کافی دسترس تھی ایک عرصہ اسی میں بیت گیا۔ لوگوں سے مناظرے کرتا۔ اسی فن کی حمایت اور مدافعت میرا مشغلہ تھا۔ بصرہ مختلف مدارس فکر کا گڑھ تھا۔ میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا ہوں۔ سال بھر یا اس سے زیادہ قیام رہتا تھا۔ اس زمانے میں میری خارجیوں کے فرقوں سے ٹکڑے ہوئی۔ میں علمِ کلام کو افضل ترین علم سمجھتا اور کہا کرتا تھا کہ یہی دین کی بنیاد کی نگرانی ہے۔ عرصہ گزرنے پر میں نے خود اپنے تئیں غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ اور تابعین کہا نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے بے بہرہ نہ تھے بلکہ ہم سے زیادہ ان کے علم میں گہرائی تھی۔ حقائق سے واقف تھے مگر اس کے باوجود ان کی زندگیاں مجاہدانہ شورشوں سے یکسر خالی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کا مشغلہ نہ تھا بلکہ وہ لوگوں کو اس سے روکتے تھے۔ ان کے غور و فکر کی بھولا نگاہ علمِ الشرائع اور البوابِ فقہ تھتے یہی ان کا موضوع تھا یہی ان کی مجلسی زندگی کی رونق تھی۔ اسی کی لوگوں کو تعلیم دیتے اور اسی کے سیکھنے کی ترغیب دیتے۔ صدرِ اول ایسے ہی گزرا ہے تابعین بھی ان کے نقشِ قدم پر تھے۔ اس موقف پر پہنچ کر میں نے علمِ کلام کو خیر باد کہہ دیا۔ صرف فنی معرفت باقی تھی۔ اور زندگی میں بطور فن سلف کے علوم کو اپنالیا۔ وہی کام شروع کیا جو وہ کرتے تھے اور اس کے فن کاروں سے رابطہ پیدا کر لیا اور ان کی ہی مجلسوں کو اپنالیا اور اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا کہ متکلمین کا گروہ اسلاف کے نقشِ قدم سے ہٹا ہوا اور صالحین کے مقام سے دُور ہے ان کے دلوں میں قساوت ہی قساوت ہے کتاب و سنت کی مخالفت سے بے پروا بے روح اور تقویٰ سے دُور طبقہ ہے بلکہ

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی طلب کاریوں کا سلسلہ بچپن میں شروع ہوا ہے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ امام حماد کا انتقال سنہ ۲۱۷ میں ہوا ہے اور یہ بھی تاریخ بغداد میں ہے کہ امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں امام حماد کی خدمت میں پورے اٹھارہ سال رہا ہوں، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ امام اعظم ایک تلمیذ علم الشرائع کی حیثیت سے تمام علوم میں تکمیل کے بعد امام حماد کی خدمت میں سنہ ۲۱۷ میں تشریف لے گئے جب کہ امام اعظم کی عمر ۲۴ سال تھی اور یہ بات خود امام اعظم کے بیانات کی روشنی میں بے غبار ہے کہ امام حماد کی خدمت میں تشریف آوری علم الشرائع کی خاطر تمام علوم و فنون کے پڑھنے کے بعد ہوئی ہے۔

امام اعظم کے زمانے میں علم چار حصوں میں تقسیم تھا

الف: ادبی فنون کے مدرسے

ب: علوم عقلیہ کے حلقے

ج: مذاکرہ حدیث کی جماعتیں

و: استنباط مسائل کے مرکز

اگر ترتیب یوں قائم کی جائے کہ امام اعظم نے

اولاً: قرأت عاصم کے مطابق قرآن حفظ کیا۔

ثانیاً: آپ نے نحو، ادب اور شعر پر وقت صرف کیا۔

ثالثاً: آپ نے علم کلام اور علوم عقلیہ میں مہارت پیدا کی۔

رابعاً: آپ نے مذاکرہ حدیث کے حلقوں میں شرکت کی۔

خامساً: آپ نے استنباط واستخراج مسائل اور فقہ واجتہاد کے لیے حماد کے سامنے زانوئے ادب تہ

کیا ہے۔

توصاف پتہ لگ جاتا ہے کہ امام موصوف نے تعلیم کا آغاز بچپن میں کیا ہے اور ابھی بچپن سے گزر

کر لڑکپن ہی تھا کہ آپ نے نحو، قرأت، ادب و شعر اور علوم عصریہ کی تکمیل فرمائی تھی۔ اس کی وضاحت

امام صاحب کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو امام مرغینانی نے نعیم بن عمرو کی زبانی نقل کیا ہے،

کہتے ہیں:

میں نے امام ابو حنیفہ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ میں زمانہ حجاز میں لڑکپن

کی عمر میں بازار جانا تھا اور لوگوں سے علم کلام کے ذریعے عقائد پر باتیں

کرنا تھا۔ ایک روز مجھ سے ایک شخص نے دینی فرائض کے بارے ایک مسئلہ پوچھ لیا مجھے کوئی جواب نہ آیا۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ ایسے مسائل میں لب کشائی کرتے ہو جو بال سے بھی زیادہ باریک ہیں اور نظر بظاہر سہمی ہو شمند، مگر تمہیں ایک دینی فریضہ کا پتہ نہیں ہے۔ میں یہ سن کر شرمندہ ہو گیا۔

حجاج کی وفات جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ ۹۵ھ میں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ۹۴ھ میں امام اعظم کی عمر صرف چودہ سال کی ہوتی ہے اور اسی عمر کے شخص کو عربی زبان میں غلام کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سال کی عمر میں امام اعظم علم کلام اور علوم عقلیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔

امام اعظم اور علوم عقلیہ

قرآن حکیم اور فنون ادب کے بعد امام اعظم نے اپنی پوری توجہ علوم عقلیہ پر مرکوز کر دی تھی اور علوم عقلیہ میں مہارت کا یہ مشغلہ بیس سال کی عمر تک قائم رہا۔ امام زرنکری نے امام ابو عبد اللہ ابن ابی حفص کی زبانی جو واقعہ لکھا ہے کہ :

امام اعظم کوفہ میں پیدا ہوئے اور علم الکلام کی تلاش کرتے رہے اور لوگوں سے اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے تا آنکہ اس میں ماہر ہو گئے۔

تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی طلب گاریوں میں مرکزی مقام علوم عقلیہ کو حاصل تھا اور یہ بھی لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ ایک عرصہ تک اس فن کے زور سے مختلف مدارس کا مقابلہ کیا۔ رائے عامہ کے دماغی سکون کے لیے دلائل کا سامان فراہم کیا۔

آپ کی کلامی اور عقلی علوم کی جو لانگاہ صرف کوفہ ہی نہ تھا بلکہ آپ کی اس فن میں اس درجہ شہرت ہو چکی تھی کہ جہمیت اور ارجار کے استیصال کی خاطر کوفہ سے باہر بھی جانا پڑا۔ شیعہ اور خوارج کے ساتھ امام اعظم نے علوم عقلیہ میں اپنی خداداد علمی صلاحیتوں سے جن جن فرقوں کو ان کے غلط عقائد پر خبردار کیا یہ ہیں جہمیت اور مرجئہ۔ ان فرقوں کے ظہور سے ایسے مسائل منصفہ شہود پر آئے جن کا براہ راست اسلامی عقائد سے تعلق تھا۔ ان مسائل میں جو مسئلے خاص طور پر توجہ علمی کے مستحق رہے ہیں یہ ہیں۔

ایمان، تقدیر، صفات الہی۔ ان میں سب سے اہم ایمان ہے اور یہ بے حد افسوس اور صدمہ والی بات ہے کہ جو چیز اسلام میں سب سے اہم ہے اُمت میں سب سے پہلا اختلاف اسی میں رونما ہوا۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں:

یہ مسائل یعنی اسلام، ایمان، کفر و ایمان وہ بنیادی مسائل ہیں جن پر تفاوت اور سعادت اور جنتی و ناری ہونے کا دار و مدار ہے مگر اُمت ان ہی میں سب سے زیادہ اختلاف کا نشانہ بنی ہے۔

اس اختلاف کی نزاکت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی بنیاد پر امام اعظم ہی کے زمانے میں ایک سے زیادہ مدارس فکرم پیدا ہو گئے تھے۔

حافظ ابن تیمیہ شرح العقیدۃ الاصفہانیہ میں فرماتے ہیں کہ جہم بن صفوان کی اُتے میں ایمان صرف فقہ کا نام ہے۔ حافظ ابن حزم نے الفصل فی الملل والاہواء والنحل میں لکھا ہے کہ اس کے نزدیک اگر ایک شخص زبان سے بھی انکار کرے۔ بتوں کی پوجا بھی کرے، قلاوۃ یہودیت ڈال لے مگر اسے معرفت قلبی حاصل ہو تو مومن کامل ہے۔

خوارج کا خیال ہے کہ ایمان دل کی تصدیق، زبانی اقرار اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن نہیں ہے کیونکہ عمل ایمان کا رکن ہے۔

ان مدارس کے سامنے امام اعظم نے بھی اس مسئلہ پر گفتگو فرمائی۔ اولاً اس لیے کہ ایمان اسلامی زندگی کی بنیادی اینٹ ہے اگر یہی غلط ہو تو اس پر اٹھی ہوئی ساری عمارت غلط ہو کر رہ جائے گی۔ دوسرے اس لیے بھی کہ یہی اسلامی شہریت کے لیے فیصلہ کن چیز ہے۔ اس کا فیصلہ ہونے پر اسلام کا مالیاتی نظام، اقتصادی اور اجتماعی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر امام اعظم کے لیے ناگزیر اور سچ ناگزیر تھا کہ یہ واضح کریں کہ ایمان کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟

مسئلہ ایمان اور امام اعظمؒ

افراط و تفریط کی ان دونوں صورتوں میں کہ ایک فریق صرف قلبی معرفت کو ایمان کہتا ہے اور دوسرا اس کے مقابلے میں عمل کو بھی ایمان قرار دیتا ہے۔ امام اعظم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک

طرف اگر قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق ہے تو دوسری طرف عقل کو بھی اپیل کرتی ہے اور خود وجدان بھی اسے باور کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا ہے۔ امام اعظم نے بتایا ہے کہ ایمان نام ہے ان تمام باتوں کو جو نبوت محمدیہ لے کر آتی ہے باور کر لینے اور ماننے اور اس کے اقرار کرنے کا۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ دراصل یہاں تین چیزیں ہیں۔ دل کی تصدیق، زبان کا اقرار اور اعمال۔ تصدیق ایمان کا رکن ہے۔ اقرار شرط اور اعمال کی حیثیت مکمل اور متمم کی ہے۔ اگرچہ قرآن و سنت میں ان گنت مقام پر ایمان کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ قرآن کا اور نبوت کا طریق تعلیم اور اسلوب بیان دونوں فطری ہوتے ہیں اس لیے وہاں ہر بات فنی اصطلاحات سے بالا ہو کر سادہ طور پر سامنے آتی ہے۔ اسی ایمان کو دیکھ لیجئے جس میں دل کی تصدیق، زبان کا اقرار اور اعمال سب ہی داخل ہیں لیکن ان میں ہر ایک کا مقام الگ ہے۔ دل کی تصدیق اور اعمال میں باہمی ربط، اقرار کی حیثیت اور پھر اعمال میں باہم مراتب کا فرق سمجھنا کس قدر مشکل ہے مگر ذاتِ نبوت نے ان سب کو نہایت سادہ طریق پر سمجھا دیا ہے ارشاد ہے کہ **بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ**۔ اے اسلام کا مکمل پانچ ستونوں پر قائم ہے محل میں چھت ہوتی ہے، ستون ہوتے ہیں، در و دیوار ہوتے ہیں اور ان سب کے مجموعہ کا نام محل ہے پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ہے جس پر یہ پوری عمارت کھڑی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اتنا بڑا مکان تو آنکھوں سے نظر آتا ہے لیکن بنیاد جس پر محل کی یہ عمارت قائم ہے آنکھوں سے اچھل رہتی ہے وہ زمین نیچے ہوتی ہے اسی طرح اسلام بھی ایک مجموعہ کا نام ہے اس کے بھی اجزاء ہیں اس کی بھی ایک بنیاد ہے اس کے اجزاء میں ایسا ہی فرق ہے جیسے مکان کے اجزاء میں۔ ظاہر ہے کہ مکان کی قیام کے لیے جس قدر ستونوں کی حاجت ہے اتنی طاق اور روشندان کی نہیں۔ اسی طرح یہاں ارکانِ خمسہ، اقرار شہادتین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اسلام کے ستون ہیں اور یہ پانچوں ستون تصدیقِ قلبی کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ جس طرح مکان کی بنیاد زمین میں مدفون ہوتی ہے ایسے ہی تصدیق بھی دل میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایک موٹی سی مثال سے صاحبِ نبوت نے جاوہِ اہل حق کیسے واضح فرما دیا اور تصدیق و عمل کے باہمی ربط اور پھر اعمال کے باہم مراتب کو کس عمدگی سے سمجھا دیا ہے اسی بات کو امام اعظم نے علومِ رسمییہ کے شیدائیوں کے سامنے رکن، شرط اور مکمل کا نام لے کر پیش کیا ہے چونکہ تصدیق کا معاملہ دل سے متعلق ہے اور دل کے حالات کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے ارکانِ خمسہ میں سے زبان کے اقرار کو قرآن و سنت میں ضروری بتایا ہے۔ حافظ

ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

اسلام کے ثبوت کا دار و مدار کسی ایسی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم
یکساں طور پر سب کو ہو سکے اس لیے توحید کا زبانی اقرار ہی مسلمان
ہونے کا معیار قرار دیا گیا اور اسی ایک کلمہ کو جنگ کے آغاز و
خاتمہ کا مدار بنا دیا گیا یہ

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

جب تک اقرار نہ ہو ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے
دل میں تصدیق موجود ہے یا نہیں۔ لہذا اگر ایک شخص اقرار نہیں
کرتا تو ہم سمجھیں گے کہ اس کو تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے۔ اس
لیے اقرار کا ہونا نہایت ضروری ہے یہ

اسی لیے امام اعظم ایمان میں دل کی تصدیق کے ساتھ زبان کے اقرار کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں
اگرچہ بعد میں آنے والے فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ اقرار کی حیثیت کیا ہے۔ ایک جماعت
رکن بتاتی ہے اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ شرط ہو یا رکن، صرف تصدیق کا نام
ایمان نہیں ہے اس کی پوری وضاحت امام اعظم کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابو
عمر بن عبد البر نے ابو مقاتل کے حوالے سے نقل کیا ہے:

امام اعظم فرماتے ہیں کہ ایمان تصدیق و معرفت کے ساتھ اسلام
کے زبانی اقرار کا نام ہے۔ لوگ تصدیق میں تین قسم کے ہیں کچھ زبان و
دل دونوں سے مانتے ہیں، کچھ زبان سے مانتے ہیں مگر دل سے
منہیں مانتے، کچھ دل سے مانتے ہیں مگر زبان سے منہیں مانتے۔
پہلا طبقہ تو اللہ اور لوگوں کے نزدیک مومن ہے۔ دوسرا طبقہ محمد اللہ
تو مومن نہیں مگر لوگوں میں مومن ہے کیونکہ لوگوں کو دل کا حال
معلوم نہیں اقرار کی بنا پر ان کے ذمہ ان کو مومن ہی کہنا ہے تیسرا
طبقہ اللہ کے یہاں مومن ہے مگر عند الناس کافر ہے یہ

یہاں تصدیق کے ساتھ اقرار ہی پر زور دیا ہے اور اسلامی زندگی میں اس کی اہمیت بتائی ہے
 اقرار کو ایمان میں کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو صدر الافاضل نے
 لکھا ہے :

جہم بن صفوان آپ کے پاس آیا اور ایمان کے موضوع پر گفتگو کی ،
 بولا کہ میں آپ سے ایمان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ، امام
 صاحب نے فرمایا کہ تا حال تمہیں ایمان کا پتہ نہیں ہے بولا کہ پتہ تو ہے
 مگر کچھ شک ہے فرمایا کہ ایمان میں شک کا نام کفر ہے ۔ بولا ذرا
 میری بات تو سن لیجئے فرمایا کہ بولا یہ بتائیے کہ ایک شخص جسے اللہ
 کی ذات کی معرفت حاصل ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا ہے
 کیا وہ مومن ہے یا کافر؟ فرمایا کہ جب تک زبان سے اقرار نہ کرے
 کافر ہے ۔ بولا کافر کیونکہ ہو سکتا ہے اسے معرفت حاصل ہے امام
 صاحب نے فرمایا کہ اگر تم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہو اور اسے حجت
 بھی سمجھتے ہو تو دلائل قرآن سے دوں در نہ غیروں کے انداز پر گفتگو
 کروں ۔ جہم بن صفوان نے کہا کہ میں قرآن کو اللہ کی کتاب مانتا ہوں ،
 امام صاحب نے فرمایا کہ قرآن میں اللہ سبحانہ کا ارشاد گرامی ہے ۔ وَ اِذَا
 سَمِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَى الْاَلَةِ سُوْلٍ تَرٰى اَعْيُنُهُمْ تَفِيضٌ مِّنَ الدَّمْعِ
 مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ۔ اِلٰی ۔ فَاتَّبَعُوْهُمْ
 اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا ۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے عَرَفُوْا کے ساتھ
 يَقُوْلُوْنَ (کہتے ہیں) اور قَالُوْا (انہوں نے کہا) لاکر بتا دیا
 کہ ایمان کے لیے دل کی معرفت کے ساتھ زبان کا اقرار بھی شرط ہے ۔
 اور ایمان قلب و زبان دونوں سے مطلوب ہے ۔ ایک ارشاد ہے
 قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ اٰیٰک اور ارشاد ہے وَ اَلْزَمَهُمْ کَلِمَةَ
 التَّقْوٰی یہاں بھی کلمۃ التقویٰ سے اقرار شہادتین مراد ہے ۔ ایک
 اور مقام پر ہے هُدُوْا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ یہاں الطیب
 من القول سے توحید و رسالت کا اقرار ہی مقصود ہے ۔ نیز فرمایا :

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ - اور يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ - ان آیات میں بھی الکلم الطیب اور القول الثابت
سے مراد زبان ہی کا اقرار ہے - یہ تو قرآن ہے -

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سلسلے میں فرمایا ہے قُولُوا
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَقْلَحُوا اس میں لا الہ الا اللہ کہنے پر فلاح کو موقوف
قرار دیا ہے - قرآن و حدیث کے بعد خود انسانی بصیرت بھی یہی کہتی ہے
کہ اگر ایمان صرف دل کی معرفت کا نام ہوتا اور اقرار کی ضرورت نہ ہوتی
تو پھر ہر منکر قلبی معرفت کے بعد مومن ہوتا اور ابلیس کا مومنوں میں
شمار ہوتا کیونکہ اسے یہ معرفت تو کہ اللہ ہی اس کا خالق، مالک،
محب، اور نمیت ہے، حاصل ہے اور تمام کافر بھی مومن ہونے چاہئیں
کیونکہ قرآن میں ان کی معرفت کا اقرار ہے اس کے بعد متعدد قرآنی
آیات پیش فرمائی ہیں

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام اعظم اقرار کو ایمان میں رکنیت کا درجہ دیتے ہیں کیونکہ اقرار
بھی ایک قسم کی تصدیق کا نام ہے - فرق ہے تو صرف یہ کہ ماننا دل کی اور اقرار زبان کی تصدیق ہے -
امام اعظم کے نزدیک ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام نہیں ہے بلکہ اقرار اور التزام طاعت بھی
اس کا اہم جز ہے - اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد و فاداری نہیں کرتا تو وہ مومن
نہیں کہلا سکتا - ابو مفضل نے امام اعظم سے جو ایمان کی تعریف نقل کی ہے اس میں اقرار کا متعلق
اسلام کو قرار دیا ہے - چنانچہ فرماتے ہیں :

الْإِيْمَانُ هُوَ الْمُعْرِفَةُ وَالتَّصَدِيقُ وَالْإِقْرَارُ بِالْإِسْلَامِ
ایمان معرفت، تصدیق اور طاعت کے اقرار کا نام ہے -

الفقہ الاکبر میں اسلام کی حقیقت خود امام اعظم نے جو بتائی ہے یہ ہے :
الْإِسْلَامُ هُوَ التَّسْلِيمُ وَالْإِقْبَادُ لِأَمْرِ اللَّهِ
اسلام ماننے اور احکام الہی کی سرپا پیروی کا نام ہے -

اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام نہیں بلکہ انقیاد اور التزام طاعت بھی اس کا اہم رکن ہے جیسے تصدیق رکھ کر التزام طاعت کا عہد نہ کرنا اسلام نہیں ہے ایسے ہی صرف فرمانبرداری کا التزام رکھ کر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہ ہونا ایمان نہیں ہے ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ زبان و دل تصدیق سے مزین ہوں اور اسلامی دستور حیات کو اپنانے کا عزم مصمم ہوا قرار کا لفظ ایمان میں بے معنی اور بے جان نہیں ہے۔

امام اعظم کے ایمان میں اس قانونی موقف نے کہ ایمان نام ہے اقرار و تصدیق دونوں کا۔ دونوں فرقوں کی تردید کر دی جہمیہ کی بھی اور مرجئیہ کی بھی۔

ایمان کی اسی حقیقت کو امام احمد بن حنبل نے اس طرح پیش فرمایا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ مومن کی تعریف یہ ہے کہ اس کی شہادت دے کہ اللہ سبحانہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں وہ بیگانہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور شہادت دے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ نیز دوسرے پیغمبر جو کچھ لائے ہیں ان باتوں کا زبان سے اقرار کرے اور جو کچھ اس کی زبان کہے دل اس کا ساتھ دے ایسے آدمی کے ایمان میں کوئی شک نہیں ہے

امام اعظمؒ کی علم کلام میں تصانیف

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں امام اعظم نے علم الکلام کے موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں ان فرقوں کے مقابلے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کو واضح فرمایا ہے۔ یہ بات کہ اس موضوع پر امام اعظم کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ معتزلہ کی اڑائی ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں:

هَذَا كَلَامُ الْمُعْتَزَلَةِ وَدَعَاؤُهُمْ أَنَّهُ لَيْسَ لَهُ فِي عِلْمِ الْكَلَامِ
لَهُ تَصْنِيفٌ ۚ

یہ معتزلہ کی بات ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ امام اعظم کی علم کلام میں کوئی تصنیف نہیں ہے

اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس قسم کی افواہوں سے معتزلہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ امام اعظم کو اپنے مزعومات کی اشاعت کے لیے استعمال کر سکیں۔

علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں علم الکلام کے موضوع پر امام اعظم کی جن تصانیف کی نشاندہی کی ہے وہ یہ ہیں۔ الفقہ الاکبر، الرسالة، الفقہ الاوسط، کتاب العالم والمتعلم اور الوصیۃ۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کتابوں کی تالیف بھی اس زمانے کے رواج کے مطابق املاتی طرز پر ہوئی ہے۔

أَمْلَاهَا عَلَى أَصْحَابِهِ مِنَ الْفُقَهَاءِ الْأَكْبَرِ وَالرِّسَالَةِ وَالْفِقْهِ
الْأَوْسَطِ وَكِتَابِ الْعَالِمِ وَالْمُتَعَلِّمِ وَالْوَصِيَّةِ۔ ۱۷

علامہ طاش کبریٰ زادہ نے پوری قوت سے یہ بات بتائی ہے کہ :

امام اعظم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ الفقہ الاکبر اور العالم جیسی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ کتابیں امام اعظم کی نہیں معتزلہ کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں۔

علامہ بزازمی نے تصریح کی ہے کہ :

یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ علم کلام میں امام ابو حنیفہ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ الفقہ الاکبر اور العالم والمتعلم میں نے خود علامہ شمس الدین کی ارقام فرمودہ دیکھی ہیں اور ان پر لکھا ہوا تھا کہ یہ امام اعظم کی تصانیف ہیں۔

صدر الاسلام ابو الیسر بزدوی نے اپنی مشہور کتاب اصول دین میں جو حال ہی میں مصر میں ڈاکٹر ہانس پیٹر لنس کی تحقیق سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آتی ہے اس میں امام اعظم کے بارے میں تصریح کی ہے کہ :

قَدْ صَنَّفَ فِيهَا كُتُبًا وَقَعَ بَعْضُهَا إِلَيْنَا۔ ۱۸

آپ نے علم کلام میں کچھ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کچھ ہمیں ملی ہیں۔

یہ ابو الیسر فروع و اصول میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور لکھا ہے كَانَ إِمَامَ الْأُمَّةِ عَلَى الْإِطْلَاقِ

۱۷ اشارات المرام ص ۲۱ ۱۸ مفتاح السعادة ج ۲ ص ۲۹ ۱۹ مناقب کردوسی ج ۱ ص ۱۰۸

۲۰ اصول دین بزدوی ص ۴

صرف پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں چنانچہ ان کی سند یہ ہے :
 عَنْ اسْمَعِيلَ بْنِ عَبْدِ الصَّادِقِ عَنْ جَدِّهِ ابْنِ أَبِي الْيَسْرِ عَبْدِ الْكَرِيمِ
 عَنْ ابْنِ الْمَنْصُورِ الْمَازِنِيِّ عَنْ ابْنِ بَكْرِ الْجَوْنِي عَنْ ابْنِ سُلَيْمَانَ
 عَنْ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ

علامہ بیاضی نے امام اعظم کی ان کتابوں کی تاریخی اور روایتی حیثیت کو شرح و بسط سے لکھا ہے
 وہ فرماتے ہیں :

الفقه الاکبر، الرسالة، الفقه الاوسط، العالم والمتعلم اور الوصیۃ کی امام اعظم سے
 روایت میں مرکزی حیثیت حماد بن ابی حنیفہ، قاضی البر یوسف، ابو مطیع
 المحکم بن عبد اللہ اور ابو مقاتل حفص بن مسلم کی ہے۔ ان ائمہ سے ان
 کتابوں کو اسماعیل بن حماد، محمد بن مقاتل، محمد بن سماعہ، نصیر بن یحییٰ
 اور شداد بن حکیم نے روایت کیا ہے۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کو نصیر بن یحییٰ اور محمد بن مقاتل سے امام ابو منصور ترمذی نے
 روایت کیا ہے۔ علامہ زاید کوثری رقمطراز ہیں :

علم کلام میں امام اعظم کا یہ علمی سرمایہ اُمت کو وراثت میں ملا ہے۔ الفقه
 الاکبر، اس کی سند یہ ہے علی بن احمد الفارسی عن نصیر بن یحییٰ عن ابی مقاتل
 عن عصام بن یوسف عن حماد بن ابی حنیفہ عن ابی حنیفہ۔ الفقه الاوسط،
 اس کی سند یہ ہے۔ ابو زکریا یحییٰ بن مطرف عن نصیر بن یحییٰ عن ابی مطیع
 البلیخی عن ابی حنیفہ۔ العالم والمتعلم۔ اس کی سند یہ ہے۔ الحافظ احمد بن
 علی عن حاتم بن عقیل عن الفتح بن ابی علوان و محمد بن یزید عن الحسن بن
 صالح عن ابی مقاتل عن ابی حنیفہ۔ الرسالة۔ نصیر بن یحییٰ عن محمد بن
 سماعہ عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ کی سند سے مروی ہے اور اسی سلسلہ
 سند سے الوصیۃ بھی مروی ہے۔

تاریخ و روایت کی یہ شہادتیں تباہی ہیں کہ علم کلام میں امام اعظم نے جو علمی سرمایہ چھوڑا ہے

وہ امام اعظم ہی کا ساختہ و پرواختہ ہے۔ اس پر تفصیلی مباحث انشاء اللہ ہمارے کتاب ”امام اعظم اور علم الکلام“ میں آئیں گی۔

علم کلام اور اس کا حکم

علم کلام کے موضوع پر امام اعظم کے بیانات پڑھ کر شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ امام صاحب علم الکلام کی تعلیم و تعلم کی اشاعت کو امت میں پسند نہ کرتے تھے لیکن ایسا نہیں ہے۔ صدر الاسلام ابوالبیسر نذوی نے اپنی کتاب اصول دین میں اس کی وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

علم کلام دراصل ان مسائل کا نام ہے جن کی حیثیت اسلام میں اصول دین کی ہے اور جن کا سیکھنا فرض عین ہے۔ امام ابوحنیفہ نے یہ علم حاصل کیا ہے اور اس کے ذریعے معتزلہ اور تمام اہل بدعت سے مناظرہ کیا ہے۔ آغاز میں آپ اپنے اصحاب کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے اور اس علم میں آپ نے کتابیں بھی تصنیف فرماتی ہیں جن میں سے کچھ تک ہماری رسائی ہوئی ہے اور کچھ کو اہل بدعت نے خورد و برد کر دیا۔ جو کتابیں امام اعظم کی ہم کو ملی ہیں ان میں العالم والمتعلم اور الفقہ الاکبر ہے۔ العالم والمتعلم میں امام اعظم نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے کہ علم کلام پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ چنانچہ اسی کتاب میں ہے کہ متعلم کہتا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علم کلام نہ پڑھنا چاہیے کیونکہ صحابہ کرام نے یہ علم نہیں پڑھا ہے۔ عالم کہتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہاں ٹھیک ہے ہمیں بھی علم کلام نہ پڑھنا چاہیے جیسے صحابہ نے نہیں پڑھا لیکن تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہمارے اور صحابہ کے معاشرے میں کیا فرق ہے جن حالات سے ہمیں دین کی زندگی میں دوچار ہونا پڑ رہا ہے ان سے صحابہ دوچار نہیں تھے۔ ہمارا ایسے معاشرے سے سابقہ پڑا ہے جن کی باتیں مسلک حق کے خلاف چھوٹ اور بے لگام ہیں۔ جن کے یہاں ہمارا خون روا ہے کیا اس ذہن کے گرد و پیش میں ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ راستہ روا اور غلط کار میں ایک حد فاصل اور خط تمیز قائم کریں۔ یوں

سمجھو کہ صحابہ ایسے خوش آئند ماحول میں تھے جہاں جنگ کا نام و نشان نہ تھا
امن و سکون کی زندگی تھی۔ یقیناً ایسے ماحول میں سامان جنگ اور جنگی تیاری
کی ضرورت نہیں ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ایک جنگجو طبقہ نے حملہ کر کے
ایمان و اعتقاد کی زندگی کا امن و سکون تو بالاکر دیا ہے۔ اس لیے
ہمیں ان سے نمٹنے کے لیے سامان جنگ کی ضرورت ہے۔ اور فوجی
ٹریننگ کی بھی۔ ہمارے اکثر فقہاء نے لوگوں کو علم کلام سکھنے سے
روک دیا ہے لیکن جو امام ابو حنیفہ کے پیروکار ہیں وہ اس کی تعلیم و
تعلیم کے جواز کے قائل ہیں البتہ انہوں نے عمر کے آخری حصہ میں اس
میں مناظرے سے روک دیا تھا۔

گویا امام اعظم کی نظر میں علم کلام کو ایمان کے لیے ایک دفاعی سرمایہ کی حیثیت میں اپنانے میں کوئی مضائقہ
نہیں ہے۔ علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں بھی امام صاحب کے اس بیان کی وضاحت فرمائی
ہے جو بات روزِ اول علم الکلام کے بارے میں امام اعظم نے فرمائی ہے کہ اس کی حیثیت ایک دفاعی
سرمایہ کی ہے وہ ہی بات اس علم کے بڑے بڑے شہسواروں نے آخر میں کہی ہے۔ چنانچہ امام الحرمین
ابو محمد جوینی نصیحتۃ المسلمین میں فرماتے ہیں۔

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا
سکتا ہے۔ کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں ہیں کچھ کے لیے سود مند
مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی تصریحات
پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی کچن کے
روحانی کھانے صرف طاقتور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی نہ بادہ سے
گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

امام غزالی جیسے کلامی محقق نے اپنی زندگی کی آخری تالیف میں اقرار کیا ہے کہ:
إِنَّمَا الْمَقْصُودُ مِنْهُ حِفْظُ عَقِيدَةٍ أَهْلِ السُّنَّةِ وَحِرَاسَتُهَا
عَنْ تَشْوِيشِ أَهْلِ الْبِدْعَةِ ۖ

علم کلام سے مقصود صرف بدعتیوں سے اہل السنہ کے عقیدہ کی حفاظت اور نگرانی ہے۔

ان اقراروں سے میں تو یہی سمجھا ہوں کہ جو بات اولاً امام صاحب کی زبان پر آئی بالآخر وہی وقت کا آوازہ بن گیا۔ امام اعظم نے یہی تو بتایا ہے کہ علم الکلام کا اساسی مقصد اسلامی سوسائٹی کے لیے عقائد کی فراہمی کا کسی خاص عقلی ہنج پر سلیبس تیار کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی غایت صرف یہ ہے کہ جن لوگوں نے خود فریبی سے شک وارتیاب کی گود میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پر جتے ہوئے اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اس عمل کے لیے یونانی فلسفے کے میگزین سے ہتھیار مانگ کر لاتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس طرح وہ اسلام کی عمارت کو گرا دیں گے۔ اصول جنگ کے مطابق یہ تو سب ہی کرتے ہیں کہ اپنے ہتھیاروں سے دوسروں کا مقابلہ کریں۔ اپنی قوت دوسروں کے مقابلے پر صرف کریں لیکن یہ تو انتہائی فراست اور زیر کی کہتے یا وقت کی سیاسی مہارت کہ گھر سے مقابلہ کے ارادے سے نکلے ہیں اور خالی ہاتھ ہیں۔ ارادہ ہے کہ اپنی دولت اور سرمائے کو اپنچ نہ آئے اور میدان بھی ہاتھ آجائے چنانچہ ایسا ہی ہوا قرآنی دلائل اپنی جگہ ہے سنت کی پکار اپنے مقام پر۔ ان ہی کے میگزین سے دلائل کا اسلحہ لے کر ان سے مقابلہ کیا اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے امام غزالی نے لکھا ہے :

لَكِنَّهُمْ اعْتَمَدُوا فِي ذَلِكَ عَلَى مَا تَسْمُوهُمِنْ نَحْوِهِمْ
لیکن متکلمین نے اس معاملے میں اپنے مد مقابل کے مسلمات کا ہی
سہارا لیا ہے۔

اور

وَكَانَ أَكْثَرُ خُوضِهِمْ فِي اسْتِخْرَاجِ مُنَاقِضَاتِ الْخُصُومِ
وَمُسَاخَذَةِ تَهْمٍ لِلْوَازِمِ مُسْلِمَاتِهِمْ۔

ان کی فکری توجہ صرف یہ تھی کہ مد مقابل کا توڑ کیا جائے اور ان کے
مسلمات کے لوازم ہی سے ان کی گرفت کی جائے۔

اس سے مقصود یہی تھا نا ہے کہ علم الکلام کا مقصد اصلی اپنوں کو مطمئن کرنا نہیں بلکہ دوسروں
کو چپ کرانا ہے۔

الغرض امام اعظم کے بارے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ امام موصوف علم کلام کو کسی
وجہ میں ابھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ امام اعظم کے موقف کو اس روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ

علم کی دنیا نے علم الکلام میں امام اعظم کو متکلم اول کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ امام عبد القاہر بغدادی شافعی نے بتایا ہے کہ علم الکلام کے موضوع پر اولیت کا شرف امام اعظم کو حاصل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

أَوَّلُ مُتَكَلِّمِيهِمْ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَ أَرْبَابِ الْمَذَاهِبِ أَبُو حَنِيفَةَ
وَ أَشَافِعِي فَإِنَّ أَبَا حَنِيفَةَ لَهُ كِتَابٌ فِي الرَّدِّ عَلَى الْقَدْرِيَّةِ
سَمَاءُ الْفِقْهِ الْأَكْبَرِ وَ لَهُ رِسَالَةٌ أَمْلَأَهَا فِي نُصْرَةِ
قَوْلِ أَهْلِ السُّنَّةِ أَنَّ الْأِسْطِطَاعَةَ مَعَ الْفِعْلِ لَهُ

فقہاء میں سب سے پہلے متکلم ابو حنیفہ اور شافعی ہیں۔ ابو حنیفہ نے قدریہ کے رد میں فقہ اکبر نامی کتاب تہنیف کی ہے۔ موضوع استطاعت پر اہل السنۃ کے موقف کی نصرت میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔

علامہ ابوالمنظر اسفرائینی نے امام اعظم کی کلامی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن النذیم نے بھی ان کتابوں کا پتہ دیا ہے اور آخر میں آپ کی وسعت علمی کے بارے میں لکھا ہے :-
أَلْعِلْمُ بَحْرًا وَ بَرًّا شَرُّ قَادَعَرُ بَا بُعْدَاو قَرَبًا لَهُ

دور، نزدیک، مشرق، مغرب اور خشکی و تری میں آپ ہی کا علم ہے۔

تاریخ الاسلام سیاسی کے مؤلف حسن ابراہیم حسن نے بھی ابن النذیم کی ہمنوائی کی ہے۔ الغرض میں بتایا رہا تھا کہ امام اعظم کی طلب علم کی داستان میں علوم عقلیہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس میں ناموری اور شہرت کے پیش نظر امام شعبی نے امام اعظمؒ کو ۹۴ھ میں علم الشرائع کے لیے مطالعہ علمی اور مجالست علماء کا مشورہ دیا۔ علم الشرائع کے طالب علم کی حیثیت سے امام اعظمؒ اپنے استاد حماد کے پاس ۱۰۰ھ میں یعنی چوبیس سال کی عمر میں گئے اور پورے اٹھارہ سال کے بعد علم الشرائع کی تعلیم و تمرین سے فراغت کے بعد مجتہد کی حیثیت سے ۱۲۰ھ میں لوگوں میں رونما ہوئے۔ ۹۵ھ سے ۱۰۴ھ تک کا پورا وقت امام اعظمؒ نے علم حدیث پر صرف کیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے آپ کو ذرا انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔ سر دست تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پندرہ سال کی عمر میں علوم عقلیہ

اور فنونِ عصریہ میں اتنی مہارت ہو جانا کہ اسی کوفن کی حیثیت سے اپنا لینا اور اسی پر مختلف مدارس فکر سے مقابلہ کرنا امام صاحب کا ایک ممتاز کارنامہ ہے۔ جہم سے مقابلہ کی داستان آپ سن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کلامی مسائل میں امام صاحب کے دوسرے فرقوں سے بھی مناظرے ہوتے ہیں مگر ہم ان کو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسائل بہت طویل الذیل ہیں اندیشہ ہے کہ اپنے موضوع سے دور نہ ہو جائیں۔

امام اعظم طالب علمِ علم حدیث کی حیثیت سے

۹۶ھ میں امام اعظم نے پہلا حج کیا ہے جیسا کہ حافظ ابن عبد البر اور خوارزمی نے تصریح کی ہے اور اسی حج میں تفقہ فی الدین کے موضوع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبد اللہ بن الحارثؓ کی زبان مبارک سے یہ ارشاد منسا ہے یہ گویا علم حدیث کی ابجد ہوتی ہے۔
مَنْ تَفَقَّهَ فِي دِينِ اللَّهِ كَفَاهُ اللَّهُ حِمَّةً وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْسَبُ۔

جس نے اللہ کے دین میں فقہیت پیدا کر لی۔ اللہ اس کے رنج و غم میں کافی ہے اور اس کو ایسے مقام سے رزق دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا۔

امام شعبی کے کہنے سے دل پہلے ہی مائل ہو چکا تھا۔ اس ارشاد نبوت سے زخمی ہو گئے اور ۹۶ھ سے ہی علم الشرائع کی طرف رخ کر لیا۔ اور زندگی کے اس موڑ پر آپ نے تمام علوم کا باہم موازنہ کیا مگر علم الشرائع کے لیے چونکہ علم الحدیث ناگزیر تھا اس لیے آغاز یہیں سے کیا اور ۹۷ھ سے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت اختیار کر لی اور ۹۸ھ سے شروع ہو کر ۱۰۲ھ تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اگرچہ کام کا آغاز تو علم حدیث میں ۹۸ھ میں ہو چکا تھا مگر پوری باقاعدگی کے ساتھ پورا کا پورا وقت ۱۰۲ھ سے لکایا ہے۔ ۱۰۲ھ تک یہ سلسلہ قائم رہا اور سب سے پہلے اپنے شہر کے مشہور محدث علامۃ التابعین سے استفادہ کیا۔ امام شعبی کی حدیث میں جلالتِ شان کا اندازہ کرنا ہو تو امام زہری کا حسب ذیل بیان پڑھیے :

علماء چار ہیں سعید مدینے میں، شعبی کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں اور
مکحول شام میں۔^{۱۷}

فن حدیث میں یہ امام اعظم کے اکابر شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں
امام ذہبی نے جہاں امام شعبی کے تلامذہ ہیں امام اعظم کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی تصریح کر دی ہے وَهُوَ
اَكْبَرُ شَيْخٍ لِابْنِ حَنِفَةَ۔^{۱۸}

اور معلوم ہے کہ امام شعبی متکلم نہ تھے۔ ان سے امام اعظم کا تلمذ صرف ان کے فن ہی میں ہو سکتا
ہے اور ان کا فن علم حدیث کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

امام عبداللہ بن عون البصری^{۱۹} جو امام شعبی کے بھی شاگرد ہیں اور جن کے بارے میں امام
عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں مَا كَانَ بِالْعِرَاقِ اَعْلَمَ بِالسُّنَنِ عِرَاقِيٌّ مِنْ اَنْ يَزِيْدَ
حدیث کا عالم کوئی نہ تھا۔ ان کا امام شعبی کے بارے میں بیان ہے:

اِذَا وَقَعْتَ الْفُقُوْىَ الْقُبُصَ الشَّعْبِيَّ

جب کوئی فتویٰ آجاتا تو امام شعبی کو گھٹن ہوتی تھی۔^{۲۰}

اس سے معلوم ہوا کہ فقہ بھی امام شعبی کا فن نہ تھا بلکہ ان کا فن خود ان کے اعتراف کے مطابق

حدیث اور صرف حدیث تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اِنَّا لَسْنَا بِالْفُقَهَاءِ وَلَكِنَّا سَمْعُنَا الْحَدِيْثَ فَرَّوْا يَنَا الْفُقَهَاءَ

ہم فقہاء نہیں ہیں ہم تو احادیث سن کر فقہاء کے سامنے پیش کرتے ہیں۔^{۲۱}

امام شعبی کا اپنا فن حدیث تھا اور اس میں اس قدر جامعیت تھی کہ مشہور محدث عام لاسول
جو امام الحفاظ شعبہ بن الحجاج، امام المحدثین یزید بن ہارون، امیر المومنین فی الحدیث عبداللہ
بن مبارک کے استاد ہیں فرماتے ہیں:

مَا رَأَيْتُ اَحَدًا اَعْلَمَ بِحَدِيْثِ اَهْلِ الْكُوفَةِ وَالْبَصْرَةِ

وَالْحِجَازِ مِنَ الشَّعْبِيَّ۔

میں نے کوفیوں، بصریوں اور حجازیوں کی حدیث کا امام شعبی سے زیادہ عالم کوئی نہیں دیکھا۔^{۲۲}

^{۱۷} تذکرۃ الحفاظ ۱۷ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۵، ۷۶ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۹

^{۱۸} ۷۵، ۷۶ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۹

اس تمام تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ناظرین اوراق کے سامنے امام اعظم کی داستان طلب علم حدیث واضح اور صاف ہو کر آجائے۔

آپ چاہیں تو ان تاریخی حقائق کی روشنی میں اس داستان کو اس طرح سمیٹ سکتے ہیں۔

۱۔ حفظ قرآن بقرآت عاصم ۱۰۰ تا ۱۰۰ سال بجز ۱ سال

۲۔ نسخ و ادب ۱۰۰ تا ۱۰۰ سال بجز ۱ سال

۳۔ علم الکلام ۱۰۰ تا ۱۰۰ سال بجز ۱ سال

۴۔ مناظرہ ۱۰۰ تا ۱۰۰ سال بجز ۱ سال

۵۔ علم الحدیث ۱۰۰ تا ۱۰۰ سال بجز ۱ سال

۶۔ فقہ و علم الشرائع ۱۰۰ تا ۱۰۰ سال بجز ۱ سال

گویا چالیس سال کی عمر میں امام اعظم اپنے استاد کی جگر پر بحیثیت ایک مقنن، مجتہد، فقیہ، محدث اور مفسر کے تشریف فرما ہوئے۔

بیس سال کی عمر میں علم حدیث پڑھنے کی وجہ

اس عمر میں حدیث کا طالب علم بننے میں کوفہ کے اس رواج کو بہت بڑا دخل ہے جس کی کچھ نشاندہی محدث خطیب بغدادی نے کی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کوفہ میں کچھ رواج ہی یہ چل پڑا تھا کہ طلب حدیث کی طرف بیس سال کی عمر میں قدم بڑھایا جائے چنانچہ الخطیب رقمطراز ہیں۔

إِنَّ أَهْلَ الْكُوفَةِ لَمْ يَكُنِ الْمَوْأَدُّ يَسْمَعُ الْحَدِيثَ إِلَّا
بَعْدَ اسْتِكْمَالِهِ عَشْرِينَ سَنَةً۔

کوفہ والوں میں سے کوئی شخص بیس سال کی عمر سے پہلے حدیث کا طالب علم نہ بنتا تھا یہ

امام الحسن بن عبدالرحمن راہر مزی کہتے ہیں کہ میرے سے ایک سے زیادہ مشائخ نے ذکر کیا ہے کہ محدث موسیٰ بن اسحاق سے جب دریافت کیا گیا کہ تم نے ابو نعیم سے حدیث کیوں نہیں لی؟ تو انہوں نے جواب دیا:

اہل کوفہ اپنے بچوں کو بچپن میں علم حدیث کا طالب علم نہ بنانے تھے بلکہ
بیس سال کی عمر میں اس کے لیے روانہ کرتے تھے۔

موسیٰ بن ہارون کہتے ہیں کہ بصرہ میں حدیث پڑھنے کے لیے دس سال، کوفہ میں بیس سال اور شام میں
تیس سال کا طریقہ رائج تھا۔

اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ امام اعظم کے اس عمر میں طلب حدیث کے عزم
میں کوفہ کے اس رواج کو بہت بڑا دخل ہے۔ الغرض بیس سال کی عمر میں ۹۹ھ میں امام اعظم نے
سب سے پہلے اپنے شہر کے جلیل القدر محدث امام شعبی کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا جیسا کہ
ملا علی قاری نے حافظ ابوسعید السمعی کے حوالے سے خود امام صاحب کی زبانی لکھا ہے کہ:

میں دینی علوم میں لوگوں سے گفتگو کرتا تھا ایک بار مجھ سے ایک قریضہ

کے بارے میں پوچھا گیا مجھے جواب نہ آیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ الدین، عطاء،

میں موٹگافیاں کرتے ہو اور فرائض کا پتہ بھی نہیں ہے۔ میں شرمندہ

ہو گیا بعد ازیں میں امام شعبی کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔

امام شعبی کی خدمت میں جیسا کہ بتا چکا ہوں صرف حدیث کے لیے آئے تھے اور آنے کی وجہ

الکوردی نے خود امام صاحب ہی کی زبانی یہ بتائی ہے۔

كَانَ الشَّعْبِيُّ مِنْ أَغْلَمِ النَّاسِ

علم حدیث میں زمانہ طالب علمی میں امام اعظم کی سبقت

بہر حال شاہد ہیں امام اعظم نے بیس سال کی عمر میں علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا اور جس محنت و

کوشش سے انہوں نے اس علم کو حاصل کیا ہے ان کے ہم عصروں میں سے بہت ہی کم نے اس محنت
سے حاصل کیا ہوگا حافظ سمعی لکھتے ہیں:

اِسْتَخْلَ بِطَلَبِ الْعِلْمِ وَبَالَغَ فِيهِ حَتَّى حَصَلَ لَهُ مَا

لَمْ يُحْصَلْ لِغَيْرِهِ۔

وہ طلب علم میں مشغول ہوئے تو اس درجہ ہوئے کہ جس قدر ان کو حاصل

ہوا دوسروں کو نہ ہو سکا بلکہ

حافظ ذہبی الامام الحافظ مسعر بن کدام سے جو زمانہ طالب علمی میں کوفہ کے اندر امام صاحب کے رفیق ہیں نقل کرتے ہیں :

میں امام اعظم کا رفیق مدرسہ تھا وہ علم حدیث کے طالب علم بنے تو حدیث میں ہم سے آگے نکل گئے یہی حال زید و تقویٰ میں ہوا اور فقہ کا معاملہ تو تمہارے سامنے ہے یہ

کوفہ ہی میں رہتے ہوئے امام صاحب کا علم حدیث میں مسعر بن کدام اور ان کے ساتھیوں سے آگے نکل جانا اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ سب سے پہلے امام اعظم نے کوفہ میں جس قدر علم حدیث تھا اس کی تحصیل کی کیونکہ مسعر بن کدام کی علمی رفاقت امام اعظم کو کوفہ ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ علم کی خاطر مسعر بن کدام کا کوفہ سے باہر جانا ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام مسعر بن کدام نے حدیث کی خاطر کبھی کوفہ سے باہر کا سفر نہیں کیا بلکہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مسعر بن کدام کا مفصل اور مبسوط چہرہ قلم بند کیا ہے۔ علم حدیث میں ان کا پایہ معلوم کرنا ہو تو حافظ ابو محمد راہر مزنی کا یہ بیان پڑھئے کہ امام شعبہ اور سفیان ثوری میں جب کسی حدیث میں اختلاف ہوتا تو دونوں کہا کرتے تھے۔

ہم دونوں کو مسعر کے پاس لے چلو جو اس علم حدیث کی ترازو ہیں بلکہ

امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ کہتے ہیں کہ ہم نے بہت زیادہ تقدس کی وجہ سے ان کا نام ہی مصحف رکھا ہوا تھا۔

غور فرمائیے کہ امام شعبہ اور سفیان ثوری امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ ان کا علم جس شخص کے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ وہ علم حدیث کی ترازو ہے۔ علم حدیث میں اس کی جدالت قدر کا کیا حال ہو گا؟ اور پھر خود یہ میزان علم حدیث جس شخص کے بارے میں یہ انکشاف کرے کہ وہ علم حدیث میں مجھ سے بھی آگے ہے تو پھر اس کا علم حدیث میں کیا مقام ہو گا۔ اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوفہ ہی میں جس قدر علم حدیث پھیلا ہوا تھا اسے امام اعظم نے سمیٹ لیا تھا۔ اسی بنا پر امام الجرح والتعديل یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ :

بخدا امام اعظمؒ اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتوں کے اس دُنیا میں سب سے بڑے عالم تھے۔

اور جس کی علمیت کا نہیں بلکہ علمیت کا سیجی دعویٰ کریں علم حدیث میں اس کی جلالت قدر کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ یاد رہے کہ خطیب نے بحوالہ سیجی بن معین تصریح کی ہے کہ سیجی بن سعید القطن فتویٰ میں امام اعظمؒ کے قول کو اپناتے تھے اور اہل کوفہ میں سے امام صاحب ہی کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ کبھی فرماتے کہ ابو حنیفہؒ نے بے شمار باتیں بہترین فرمائی ہیں اور کبھی کہتے کہ بخدا ہم نے ابو حنیفہؒ سے زیادہ بہتر رائے والا کوئی نہیں سنا ہے ہم ان کی اکثر و بیشتر باتوں کو اپناتے ہیں۔

امام اعظمؒ کے حدیث میں اساتذہ

امام اعظمؒ کے اساتذہ حدیث میں صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین تینوں ہیں۔ ان سے باہر کوئی نہیں ہے۔ یعنی سب اساتذہ اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کی حیرت کی زبان نبوتؐ نے شہادت دی ہے۔ حافظ ابوالحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں اگرچہ اساتذہ کا شمارہ صرف ۴ بتایا ہے جن کی تفصیل حافظ سیوطی نے تبیض الصغیفہ میں پوری درج کر دی۔ لیکن حافظ ذہبی نے عَدَدٌ کَثِيرٌ مِّنَ التَّابِعِينَ کہہ کر مشہور محدث ملا علی قاری کے دہانِ قلم سے نکلی ہوئی اس بات کو سچا کر دیا جو انہوں نے مشرح مسند امام میں لکھی ہے کہ:

امام اعظمؒ کے اساتذہ صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین میں سے

بہت ہیں جن کی مجموعی تعداد چار ہزار ہے۔

اور اس کی حافظ ابن حجر مکی نے بھی یہ لکھ کر تصدیق کی ہے کہ:

ابو حفص کبیر نے ان میں سے چار ہزار اساتذہ حدیث ذکر کیے ہیں۔

حافظ ابوبکر الجعفی نے اپنی کتاب الانصار میں ان مشائخ کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے اور

ان سے صدر الائمہ نے مناقب میں نقل کیا ہے۔

امام اعظمؒ کے اساتذہ حدیث کی عظمت

امام اعظمؒ کو اساتذہ کے معاملے میں سب ائمہ حدیث سے ممتاز کرنے والی چیز صحابہ کرام کے سامنے

زائونے اور بڑے کرنا ہے۔ یہ اساتذہ ہی کی عظمت ہے جس کا اظہار خود امام صاحب نے سربراہ حکومت عباسیہ ابو جعفر منصور و دانیشقی کے سامنے برسر دربار کیا ہے۔

ربیع بن یونس کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ امیر المومنین ابو جعفر منصور کے پاس آئے اس وقت دربار میں امیر کی خدمت میں عیسیٰ بن موسیٰ بھی موجود تھے۔ عیسیٰ نے امیر المومنین کو مخاطب کر کے کہا اے امیر المومنین **هَذَا عَالِمُ الدُّنْيَا الْيَوْمَ**۔ یہ آج تمام دنیا کے عالم ہیں۔ ابو جعفر منصور نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ اے نعمان! تم نے کتنے لوگوں کا علم حاصل کیا ہے امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین! میں نے فاروق اعظمؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، اور عبداللہ بن عباسؓ کا علم حاصل کیا ہے۔ ابو جعفر نے کہا کہ آپ آپ تو علم کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہیں۔

تلامذہ کی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ کی عظمت سے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ میں امام بخاری کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے اولین طبقہ تابعین کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

الطَّبَقَةُ الْأُولَى مِمَّنْ حَدَّثَ عَنْ الثَّابِعِينَ

اور پھر ان تابعین کے یہ نام بتاتے ہیں۔ مکی بن ابراہیم، ابو عاصم النبیل، عبید اللہ بن موسیٰ، ابونعیم الفضل بن دکین اور خلاد بن یحییٰ، مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جن اساتذہ پر امام بخاری کے لیے طبقہ اولیٰ ہونے پر حافظ ابن حجر عسقلانی کو فخر ہے وہ خلاد بن یحییٰ کو چھوڑ کر سب کے سب امام اعظم کے شاگرد ہیں۔

صدر الامم مکی شمس الامم زرنجری سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حفص صغیر کے زمانے میں ایک بار احناف و شوافع میں بحث چھڑ گئی کہ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ میں افضل کون ہے؟ امام ابو حفص صغیر نے فرمایا کہ دونوں کے اساتذہ شمار کر لو۔ چنانچہ امام شافعی کے اساتذہ گنے گنے گئے تو اسی ہوئے پھر امام اعظم کے مشائخ کا حساب لگایا گیا تو چار ہزار نکلے۔ امام ابو حفص نے فرمایا

کہ ہذا آذی من فضائل ابی حنیفۃ۔ یہ امام اعظمؒ کی برتری کی ادنیٰ شہادت ہے۔
 امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں عبداللہ بن المبارک کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے چار ہزار اساتذہ
 سے علم حدیث حاصل کیا ہے اور پھر ایک ہزار سے روایت کی۔ عباس کہتے ہیں کہ ان میں سے
 آٹھ سو کی روایات مجھے بھی ملی ہیں۔ حافظ کبیر ابو داؤد طیالسیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک
 ہزار اساتذہ سے احادیث لکھی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں:

میں نے ایک ہزار اسی حضرات سے حدیث لکھی ان میں ہر ایک
 محدث تھا۔

حافظ ابو یوسف یعقوب بن سفیان کا بیان ہے کہ میں نے پورے تیس سال رحلت میں ہر
 کیے اور ایک ہزار سے زائد اساتذہ سے حدیثیں سنی ہیں جو سب کے سب ثقاہت کی ترازو
 میں پورے تھے مگر سوچنے کی بات ہے کہ امام بخاری، امام ابو داؤد اور امام یعقوب کے اساتذہ
 کی یہ تعداد کوئی قابل تعجب نہیں ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ محدثین اطراف و آفاق عالم
 اسلامی میں پھیل چکے تھے اور جا بجا اسناد و روایت کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔ اتباع تابعین
 میں سے ایک شخص کے ہزار ہا شاگرد اور پھر ہر شاگرد کے ہزار ہا شاگرد تھے۔ تمام بلاد اسلامیہ
 میں سینکڑوں منہیں بلکہ ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں اور بڑے زور شور سے درس حدیث
 ہو رہا تھا۔ اس زمانے کی شہری زندگی میں علم حدیث اور تدریس کا ایک ایک محدث کے
 حلقہ درس میں ہزار ہا طلبہ کی شرکت ایک معمولی بات تھی۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مسند
 عراق امام علی بن عاصم واسطی امام اعظمؒ کے مشہور شاگرد کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے حلقہ درس
 میں تیس ہزار سے زیادہ طلبہ کا ہجوم ہوتا تھا۔ اور ان ہی کے صاحبزادے امام ابو الحسین
 عاصم بن علیؒ جو امام بخاری کے بھی استاد ہیں اور جن سے انہوں نے اپنی صحیح میں
 روایات بھی لی ہیں ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے۔ بغداد آئے ان کے
 اعلیٰ درجہ میں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ابو الحسین بن المبارک کا بیان ہے کہ ان کی مجلس درس
 میں طلبہ کا اندازہ ایک لاکھ انسانوں سے اوپر لگایا جاتا تھا۔ عمر بن حفص کہتے ہیں کہ مقتصد باللہ

۱، ۲ مناقب موفق ص ۳۸۔ ۳ مقدمہ فتح الباری ص ۵۲۴۔

۴، ۵ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۵۹۔

نے ایک بار اپنے کارندوں کو رعبۃ النخل میں صرف اس مقصد کی خاطر روانہ کیا تھا کہ اندازہ لگائیں کہ امام عاصم کے درس حدیث میں کتنی تعداد ہے؟ امام عاصم چھت پر بیٹھ کر لوگوں کو سنتے تھے میں نے ایک روز سنا ہے کہ فرمایا ہے تھے حدیثنا للیث بن سعد ہجوم اتنا تھا کہ آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی آپ نے اسی روز ایک کلمہ چودہ بار کہا اس مجلس کے شرکار کا اندازہ لگایا گیا تو ایک لاکھ بیس ہزار تھے بچے امام اعظم ہی کے ایک اور شاگرد خاص ہیں نیرید بن ہارون جو فن حدیث میں مشہور امام ہیں ان کے متعلق یسعی بن طالب کا بیان ہے کہ ان کی مجلس میں ستر ہزار کی حاضری ہوتی تھی بلکہ امام محمد کے بارے میں حضرت امام شافعی کا بیان ہے کہ امام محمد جب کوفہ میں موٹا کا درس دیتے تو ان کی فرد گاہ پر لوگوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ جگہ تنگ ہو جاتی اسی زمانے میں امام شافعی تحصیل علم کی خاطر کوفہ تشریف لاتے تھے کیونکہ یہ بتانے سے پہلے امام شافعی نے امام محمد کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ امام محمد فرماتے ہیں کہ میں امام مالک کی خدمت میں تین سال رہا ہوں اور اس عرصہ میں میں نے ان سے سات سو حدیثیں سنی ہیں اور یہ ساری داستان امام مالک کی وفات کے بعد کی ہے اس کی پوری تفصیل اسد بن فرات نے اس طرح بتائی ہے کہ :

ہم ایک روز امام محمد کے حلقہ درس میں موجود تھے دفعۃً ایک شخص گرو میں پھلانگتا ہوا امام محمد کے پاس آیا اور ہم نے امام محمد کی زبان سے یہ الفاظ سنے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ مُصِیْبَةٌ مَا اَعْظَمَہَا مَاتَ مَالِکُ بْنُ أَنَسٍ أَمِیرُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الْحَدِیْثِ اِنَّا لِلّٰہِ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ امیر المؤمنین فی الحدیث امام مالک کی وفات ہو گئی ہے۔ امام محمد جب اس کے بعد امام مالک سے حدیثیں بیان کرتے تو لوگ امام مالک کی حدیثوں کے شوق میں اس کثرت سے آپ کی خدمت میں آتے کہ آپ کے یہاں آنے کے راستے بند ہو جاتے اور جب امام مالک کے سوا کسی اور کی حدیثیں

بیان کرتے تو خواص ہی خواص آتے لے

خیر یہ تو ایک جملہ معترفہ تھا کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس دور میں جب گھر گھر حدیث کا پتہ چلتا
محدثین کے لیے اساتذہ کی یہ تعداد و حیرت انگیز نہیں سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس
وقت امام اعظم کے لیے اساتذہ کی یہ تعداد کیسے پیدا ہو گئی جبکہ علم حدیث کی ابھی صریح و صاف
ہی طلوع ہوئی ہے۔ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے سلسلہ میں سرکلر جاری کیا
گیا کہ احادیث جمع کی جائیں جیسا کہ آپ انشاء اللہ اساتذہ اوراق میں اس کی تفصیل پڑھیں
گے۔ اس سرکلر کے بارے میں حافظ ابوالنعیم نے بتایا ہے کہ یہ آفاق یعنی اطراف مملکت میں
روانہ کیا گیا۔ اس آفاق سے مراد مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق ہیں۔ کیونکہ اس زمانے
میں یہی وہ مقامات تھے جہاں سے علم نبوی کے چشمے ابل ابل کر ساسے عالم میں رواں ہوئے
چنانچہ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

یہ پانچ شہر مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام ہی ہیں جن سے علوم

نبوت یعنی ایمانی، قرآنی اور شرعی علوم نکلے ہیں لے

دورنہ علم حدیث کی تدوین فن روایت و اسناد کے لحاظ سے دور تابعین کے آخر میں وجود پذیر
ہوئی ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں ۔

زمانہ تابعین کے آخر میں تدوین آثار کا کام رونما ہوا ہے ۔

الغرض اس دور میں جبکہ روایت و اسناد کی فنی طور پر ابھی صریح و صاف ہی طلوع ہوئی
ہے۔ اساتذہ کی یہ تعداد کثیر اس بات کی شہادت ہے کہ امام اعظم نے علم حدیث حاصل کرنے
میں بہت بڑی محنت، عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ الغرض امام اعظم نے
علم حدیث میں اس درجہ کمال پیدا کر لیا تھا اور ایسی محنت کی کہ امام علی بن عاصم جیسا نامور محدث
امام اعظم کے بارے میں یہ اقرار چھوڑ گیا ۔

اگر ابوحنیفہ کے علم کو دوسروں کے علم کے مقابلے میں تو لا جائے تو ابوحنیفہ
کا پلٹا بھاری ہو جائے گا ۔

۱۔ نیل الامانی ۲۔ منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۴۲ ۳۔ مقدمہ فتح الباری ص ۶

۴۔ مناقب امام اعظم الذہبی ص ۴ ۔

امام اعظم کے اساتذہ میں پہلا طبقہ

امام اعظم کے ان اساتذہ میں سب سے پہلا طبقہ صحابہ کرام کا ہے محدثین کے ایک طبقہ نے مثلاً حافظ ولی الدین عراقی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سخاوی نے خالص اسنادی اور روایتی نقطہ نظر سے امام اعظم کے صحابہ کے تلمذ پر لمحہ تصحیح و ابیتہ روایت صحیح نہیں ہے لکھ دیا ہے۔ اس سے بہتوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ امام اعظم کو صحابہ سے شرف تلمذ ثابت نہیں بلکہ اس کا عدم ثابت ہے اور صحابہ کے نام سے امام کی روایات موضوع ہیں حالانکہ اصول محدثین کی رو سے ایسا سمجھنا خطرناک غلطی ہے اور نہ صرف غلطی بلکہ فتنہ روایت کے مسلمہ اصول و قواعد سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ:

محدثین بسا اوقات لایصح اور لایثبت کا لفظ بولتے ہیں نادان اس کا مطلب یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ حدیث محدثین کے یہاں موضوع یا ضعیف ہے ایسا سوچنا ان کی اصطلاح سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

مشہور محدث ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے کہ صحیح نہیں ہے، کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بات گھڑی ہوئی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حسن یا ضعیف ہے۔ علامہ نور الدین جوہر العقیدین فی فضل الشرفین، میں فرماتے ہیں کہ امام احمد کے حدیث عاشوراء پر لایصح کے ریمارکس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باطل ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح تو نہ ہو لیکن قابل استدلال ہو کیونکہ صحیح اور ضعیف کا درمیانی درجہ حسن ہی ہے۔ امام زرکشی نکت علی ابن الصلاح میں فرماتے ہیں کہ محدثین کی دونوں تعبیروں موضوع اور لایصح میں بہت بڑا فرق ہے۔ موضوع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راوی کا جھوٹ اور بات کا گھڑی ہوئی ہونا ثابت ہو گیا ہے اور لایصح میں صرف صحیح نہ ہونے کی خبر ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا عدم بھی ثابت ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی "القول المسدود فی الذب عن مسند احمد" میں لکھتے ہیں کہ حدیث کے صحیح نہ ہونے سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ علامہ محمد بن عبدالباقی شرح مواہب لدنیہ میں حدیث

يُطْلَعُ اللَّهُ كَيْلَةَ النُّصْفِ مِنْ شُعْبَانَ فَيُخَفِّرُ لِمَنْ جَعَلَ خَلْقَهُ إِلَّا
الْمُشْرِكَ أَوِ الْمُشَاقَّ

پیر ابن وحیہ کا کلام لے صبح فی لیلۃ نصف شعبان شیء نقل کر کے رقمطراز ہیں کہ
شاید ابن وحیہ کی مراد اصطلاحی صحت ہے کیونکہ یہ حدیث حسن ہے اگرچہ
درجہ صحت کو نہیں پہنچی ہے
مولانا عبدالحی فرماتے ہیں :

کسی حدیث پر محدثین کا عدم ثبوت اور عدم صحت کا حکم لگانا عرف
محدثین کے مطابق حدیث کے ضعیف اور موضوع ہونے کو لازم نہیں
بلکہ ممکن ہے کہ حدیث حسن لذاتہ یا لغيرہ ہوئے

اسی بنا پر امام ترمذی اپنی جامع میں ایک حدیث لاتے ہیں اور خود اس کی تضعیف بھی کرتے ہیں
لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ والعمل علی هذا عند اهل العلم۔ اس کا مطلب یہی
ہے کہ اسنادی اور روایتی طور پر صحیح نہ ہونے سے اصل بات کا نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دراصل یہاں
حدیث ضعیف بھی دو قسم کی ہیں ایک وہ جس میں شرائط صحت میں سے کوئی شرط نہ ہو اور دوسری
وہ جس میں شرائط قبول میں سے کوئی شرط نہ ہو۔ اس لیے امام اعظم کے صحابہ سے تلمذ کے موقع پر
محدثین کے یہاں لا یصح دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا کہ ان اکابر کے نزدیک یہ داستان
گویا بناوٹی ہے بہت بڑی جہرات اور بے باکی ہے۔ مشہور حدیث افراق امت کے متعلق مجاہد الدین
فیروز آبادی نے سفر السعادتہ کے خاتمہ میں یہ لکھا ہے کہ لے ثبت فیہ شیء (اس موضوع
پر کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے) حالانکہ چند در چند طرق سے آنے کی وجہ سے درجہ صحت
کے قریب قریب ہے جیسا کہ امام حاکم لکھتے ہیں کہ ایک سے زیادہ طرق سے اس حدیث
کا آنا اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ :

صاحب قاموس علامہ مجاہد الدین نے سفر السعادتہ میں ایک سے زیادہ
احادیث کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ ثابت نہیں ہیں
اس سے ہمارے زمانے کے ناواقفوں کو دھوکا ہو گیا ہے۔ اور

انہوں نے احادیث ثابتہ پر موضوع، ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے کا فتویٰ لگا دیا۔

صحابہ سے روایت کا شرف

ذرا اس پر بھی تو غور فرمائیے کہ امام اعظم کی صحابہ سے روایت کی حیثیت واقعات کی دنیا اور قانون کی نظر میں کیا ہے؟ یہی نہ کہ امام اعظم کے لیے ایک جزوی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ فضل و بزرگی ہے جس میں ائمہ میں سے امام اعظم کا شریک کوئی نہیں ہے۔ اگر صرف اتنی بات ہے تو اس میں روایتی و اسنادی کمزوریوں سے صرف نظر تو خود محدثین کی طے کردہ پالیسی ہے حلال و حرام میں اسنادی کمزوریوں کو تلاش کرنا محدثین نے ناگزیر بتایا ہے لیکن جہاں تک فضائل اور سیر کا میدان ہے اس میں وہ ضعیف روایات کو بھی شرف قبول عطا کر دیتے ہیں۔ مشہور محدث علی الحلبي "انسان البیون فی سیرۃ الایمن والمامون"، میں رقمطراز ہیں کہ — سیرت میں صحیح، ضعیف، موضوع، مرسل، منقطع اور معضل سب اسی قسم کی روایات ہوتی ہیں۔ امام احمد نے فرمایا ہے کہ جب ہم حلال و حرام کو موضوع بحث بناتے ہیں تو ہم متشدد ہوتے ہیں اور فضائل میں ہم متساهل ہوتے ہیں خطیب بغدادی نے اس موضوع پر الکفایہ میں ایک مستقل عنوان قائم کر کے ائمہ کی تصریحات جمع کر دی ہیں علامہ ابن سید الناس نے "عیون الاثر فی فنون المغازی والسير"، میں مشہور مؤرخ محمد بن اسحاق کی توثیق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

کلی سے زیادہ تر روایات انساب ایام عرب اور لوگوں کے احوال سے متعلق ہیں اس موضوع پر علماء چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ان لوگوں سے بھی روایات لے لیتے ہیں جن کی احکام میں احادیث معتبر نہیں ہوتی ہیں اس میں رخصت ہے اور یہ رخصت امام احمد سے منقول ہے۔
ملا علی قاری نے مشہور رسالہ "المحظ الاو فر فی الحج الاکبر" میں اس حدیث پر کہ
أَفْضَلُ الْأَيَّامِ لِيَوْمِ عَرَفَةَ إِذَا وَافَقَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَهُوَ
أَفْضَلُ مِنْ سَبْعِينَ حَجَّةً
یہ نوٹ لکھا ہے کہ

۱۔ تحفۃ اکملہ علی حواشی تحفۃ الطلیبہ ص ۵۔ ۲۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والسير ج ۱ ص ۱۵

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حدیث ضعیف فضائل میں تمام علماء کے نزدیک قابل اعتبار ہے یہ حافظ سیوطی نے بھی یہ بات طلوع الثریا، التعظیم والمنہ اور المقامۃ السندیہ میں لکھی ہے۔ حافظ عراقی نے شرح الفیہ میں، امام نووی نے تقریب میں اور سیوطی نے اس کی شرح تدریب میں اس بات کو بار بار صاف کیا ہے۔ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر امام اعظم کی اس جزوی فضیلت کے موضوع پر یہ رد و کد کچھ بے معنی سی بات ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے سب سے پہلے دارقطنی نے صدیاں گزرنے پر یہ بات لوگوں کو بتائی ہے کہ :

امام ابو حنیفہ نے کسی صحابی سے ملاقات نہیں کی البتہ انہوں نے حضرت انس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر ان سے کوئی بات نہیں سنی۔
دارقطنی کے بعد خطیب بغدادی نے بھی تاریخ بغداد میں یہی بات دہرا دی ہے چنانچہ سعید بن ابی سعید نیشاپوری کے ترجمہ میں امام اعظم کی ایک حدیث کو بواسطہ امام ابو یوسف بالاسناد نقل کرتے کے بعد کہ جس میں حضرت انس سے امام اعظم کے سماع کی تصریح موجود ہے لکھتے ہیں :
امام ابو حنیفہ کا حضرت انس سے سماع صحیح نہیں ہے یہ

اور امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں :
امام ابو حنیفہ نے انس بن مالک کو دیکھا ہے۔ ۳۵
اس کے بعد شوافع میں زین الدین عراقی اور ابن حجر عسقلانی بھی ان کے ہی ہم زبان ہو گئے
رنہ اس سے پہلے اس موضوع پر متقدمین میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا اسی بنا پر ملا علی قاری
شرح مستدرک میں فرماتے ہیں ۔

وَالْمُعْتَمَدُ ثَبُوتُهَا

یائیدر بات یہی ہے کہ امام اعظم کا صحابہ سے تلمذ ثابت ہے

امام اعظم کا حضرت انس بن مالک سے تلمذ

صحابہ میں جن اکابر کے سامنے امام اعظم نے زانوئے ادب نہ کیا ہے ان میں حضرت انس بن

مالک کا مقام سب سے اونچا ہے ان کی کنیت ابو حمزہ ہے۔ انصارِ مدینہ میں بنی سنجار سے تعلق کی وجہ سے سنجاری ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ملکہ بنتِ طحان اور کنیت ام حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہیں۔ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت مدینہ تشریف لائے میری عمر دس سال تھی حضور انور رحلت فرمائے وارث بقاء ہوئے تو میں بیس سال کا تھا ان کو ان کی والدہ ہی خدمتِ اقدس میں لائی تھیں اور عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! خدمت کے لیے خادم لاتی ہوں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرف قبول عطا فرمایا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور انورؐ سے ایک بار دعا کی درخواست کی آپ نے دعا فرمائی اَللّٰهُمَّ اَکْثِرْ مَالَهُ وَوَلَدَهُ فرماتے ہیں کہ مال کی اتنی فراوانی ہوتی کہ میرے سختان اور تانستان میں سال بھر میں دو بار پھیل آتا۔ اولاد کا حال یہ ہے کہ میری اولاد اور اولاد کو اولاد کو اگر اس وقت شمار کیا جائے تو ایک سو کے قریب ہیں۔ حضرت ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے ہاتھوں نے حضور انورؐ کے ہاتھوں کو چھویا ہے؟ فرمایا کہ ہاں حضرت ثابتؓ نے فرمایا ذرا ہاتھ دیکھتے ہیں اس کو بوسہ دوں۔ مسند امام احمد میں ہے نضر بن انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے روز قیامت کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کی حضور انورؐ نے وعدہ فرمایا حضرت انسؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ سے قیامت کے روز کہاں ملوں؟ فرمایا پل صراط پر دیکھنا وہاں نہ ملوں تو میرا ان عمل پر دیکھنا وہاں بھی نہ ملوں تو حوض کوثر پر ملنا ہے

حافظ ابن کثیر نے ابو بکر بن عیاش کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت انسؓ کے عبد الملک بن مروان کے پاس حجاج بن یوسف ثقفی گورنر حجاز کے متعلق ایک شکایتی خط بھیجا اور لکھا کہ یہودی اور عیسائیوں کو اگر کہیں اپنے نبی کا خادم مل جائے تو وہ اس کا حد درجہ اکرام کریں۔ میں نے پورے دس سال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارے ہیں اور آپ کی خدمت کی ہے لکھ ہے کہ عبد الملک نے حجاج کو خط لکھا خط میں یہ درج تھا :

جب میرا خط تم کو ملے، تو ابو حمزہ کے پاس جاؤ ان کو راضی کرو ان کے ہاتھ اور پاؤں چومو در نہ تم کو میری جانب سے ایسی سزا ملے گی جس کے تم مستحق ہو۔

خط پہنچتے ہی حجاج نے حضرت انسؓ کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن حجاج ہی کے ایک دوست نے صلح کرادی۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں عرصہ دراز تک رہے آپ بے شمار احادیث کے امین تھے۔ عمر طویل پائی ہے آپ بصرہ میں دنیا رولنے والے صحابہ میں آخری صحابی تھے۔ امام بخاری نے ان سے اسی حدیثیں لی ہیں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ۳۹ھ میں بصرہ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔ ہذا هو المشہور وعلیہ الجہور۔ اُس وقت امام اعظم کی عمر تیرہ سال تھی۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں، صدر الامہ مکی نے مناقب میں، حافظ جلال الدین السیوطی نے تبصیر فی تصحیف میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث بحوالہ امام اعظم درج کی ہے۔

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ

جیسا کہ امام اعظم کی داستانِ علم میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام اعظم کا زمانہ طلبِ علم چھپٹنا اور بچپن سے اور آپ کی علمی طلبِ نگاریوں کا آغاز علمِ کلام سے ہوا ہے۔ بصرہ اس زمانے میں علمِ کلام کی منڈی تھی۔ علمِ کلام کی تحصیل کے لیے امام اعظم کا کوفہ سے بصرہ جانا اور بصرہ میں قیام کرنا مشہور

۱۷ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۴۲

۱۷ یہ حدیث حافظ خسرو نے بحوالہ قاضی ابویوسف عن ابی حنیفہ تین متصل سندوں سے اور قاضی ابوبکر محمد بن عبد الباقی نے اپنے سند میں دو متصل سندوں سے بیان کی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی حافظ ابومعشر سے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں میری رائے میں یہ حدیث صحیح کے ہم پلہ ہے کیونکہ میرے علم میں یہ حدیث سچاں طرق سے مروی ہے (تبصیر فی تصحیف ص ۴) حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے کچھ طرق کی بعض ائمہ نے تصحیح فرمائی ہے۔ حافظ ابوالحجاج المزنی کا اعتراف ہے کہ کثرتِ طرق کی وجہ سے یہ حدیث حسن کے درجے میں ہے اس موضوع پر ان اکابر سے احادیث آتی ہیں۔ ابی جابر، حذیفہ، الحسین بن علی، سلمان، سکرہ، ابن عباس، ابن عمر، ابن مسعود، علی، معاویہ، نبیط، ابو سعید، ابو ہریرہ، عائشہ، ام ہانی وغیرہ وغیرہ۔

ہے امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں بصرہ میں بیس سے زیادہ بار گیا ہوں۔ اسی زمانے میں آپ کو حضرت انس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حافظ ابو نعیم نے بالتصریح لکھا ہے کہ امام اعظمؒ نے حضرت انس کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں سنی ہیں۔

امام اعظمؒ کا حضرت عبداللہ بن الحارث سے تلمذ

یہ بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ان کی بود و باش مصر میں تھی، ارشادات پیغمبر کے امین تھے۔ اہل مصر نے ان سے ارشادات کو سن کر آگے نقل کیا ہے۔

حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم و فضلہ میں بسند متصل خود امام اعظمؒ کی زبانی نقل کیا ہے:

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ میں سولہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ حج کو گیا میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم ہے میں نے والد محترم سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ والد صاحب نے بتایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ ان کا نام نامی عبداللہ بن الحارث ہے میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا فرمائیے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنائیے ہیں۔ میں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے بھی آگے لے چلتے تاکہ میں بھی ان کی زبان مبارک سے ارشاد گرامی سنوں۔ والد محترم لوگوں کو چیرتے پھاڑتے آگے آگے ہو گئے تاکہ میں حضرت عبداللہ کے پاس پہنچ گیا میں نے سنا کہ آپ فرمائیے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس شخص نے اللہ کے دین میں فقہیت بہم پہنچائی اللہ اس کو اس کے غم میں کافی ہوگا اور اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچائے گا جہاں کا اس کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

سبط بن الجوزی نے الانقصار والترجیح میں حافظ ابو نعیم اصفہانی کے حوالے سے جن صحابہ کرام

کے بارے میں امام اعظم کی دید و شنید کو مانا ہے ان میں حضرت عبداللہ بن الحارث بن جہز بھی ہیں نیز اس روایت کو الحافظ الاثناسیوس ابو محمد حارثی، الحافظ ابو عبد اللہ الحسین بن محمد اور حافظ ابو بکر محمد بن عبد الباقی نے اپنے مسانید میں باسانید متصلہ درج کیا ہے۔ تاج الاسلام حافظ عبد الکریم سمعانی فرماتے ہیں کہ حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی کتاب الانصار میں بسند متصل اس کی تخریج کی ہے۔

حافظ ابن عبد البر جو خطیب بغدادی کے معاصر بھی ہیں جامع بیان العلم میں حضرت عبداللہ کی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد جس میں امام اعظم نے اپنے سماع کی تصریح کی ہے سماع کے ثبوت میں لکھا ہے کہ ابن سعد کا بیان ہے کہ امام اعظم نے حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن الحارث کو دیکھا ہے اگرچہ حضرت عبداللہ کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے اور اختلاف کی وجہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے جو حافظ ذہبی نے اپنی تاریخ کبیر کے مقدمہ میں بتائی ہے کہ متقدمین نے ضبط تاریخہ کے وفات کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے صرف اپنے حافظ پر ہی بھروسہ کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے صحابہ کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی اور یہی صورت حال زمانہ شافعی تک تابعین کے بارے میں رہی ہے لیکن حضرت عبداللہ کی اسی حدیث کو حافظ ابو بکر الجعابی نے نقل کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن الحارث کی تاریخ وفات صحیح ہے۔ واضح ہے کہ حافظ ابو بکر الجعابی علل حدیث اور تاریخ رجال میں بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی، حافظ ابو عبد اللہ الحاکم اور حافظ دارقطنی نے فن حدیث میں ان کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا ہے

لے یہ حدیث اگرچہ متعدد سندوں سے آتی ہے لیکن ہم نے جو روایت نقل کی ہے اس کی تخریج حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں بطریق یوسف ابن احمد المسکی از ابی جعفر العقیلی ابی علی الرازی و محمد بن سماعہ از قاضی ابی یوسف امام اعظم سے کی ہے۔ حافظ ابو الحسن علی بن محمد الکفانی نے اس کو ابو العباس احمد بن الصلت بن المفلس والی روایت کا متابع قرار دیا ہے بلاشبہ احمد بن الصلت پر محدثین کی ایک جماعت نے کچھ کلام کیا ہے مگر حافظ ابو زرعه حافظ ابو حاتم جیسے ائمہ فن رجال نے ان کی صداقت اور ثقاہت کو سراہا ہے دراصل بعد میں آنے والوں کی برہمی کا باعث یہ ہے کہ احمد صاحب نے ایک ضخیم کتاب امام اعظم کے مناقب پر کیوں لکھی یہ کتاب بعض ارباب ظالموں کے لیے ان کے خلاف برہمی کا باعث ہو گئی حتیٰ کہ دارقطنی کو تو ان پر اس قدر غصہ آیا کہ ان کی اس کتاب ہی کو موضوع قرار دے دیا لیکن حافظ دارقطنی کو جو امام اعظم سے سو عقیدت ہے اس کی موجودگی میں ان سے کچھ اور توقع ہی بیکار ہے۔

چار لاکھ حدیثوں کو نوک زبان کیسے ہوتے تھے حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

كَانَ بَارِعًا فِي مَعْرِفَةِ الْجُلَلِ وَثِقَاتِ الرِّجَالِ وَتَوَارِيخِهِمْ ۝

حدیثوں کی علل شناسی رجال اور ان کی تاریخ میں بڑے ہی ماہر تھے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ان کے چہرے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے۔ الحافظ البارع فرید زمانہ۔ اگرچہ حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی کتاب الانصار میں صرف ان دو صحابہ ہی کا تذکرہ کیا ہے مگر امام ابو نعیم عبد الکریم نے ان دو کے ساتھ چار کے اور نام بھی بتائے ہیں۔ صدر الامم مکی بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ حافظ ابو نعیم صفہانی نے جن کے آگے فن حدیث میں خطیب بغدادی نے بھی زانوئے شاگردی طے کیا ہے لکھا ہے کہ امام اعظم نے صحابہ میں سے حسب ذیل حضرات کو دیکھا اور ان سے حدیثیں سنی ہیں۔ حضرت انس بن مالک، حضرت عبد اللہ بن الحارث اور حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ۔ ملک الحفاظ یحییٰ بن معین جو فن جرح و تعدیل میں مسلم الثبوت امام اور علم حدیث کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں اپنی تاریخ میں رقمطراز ہیں،

إِنَّ أَبَا حَنِيفَةَ صَاحِبَ الرَّأْيِ سَمِعَ عَائِشَةَ بِنْتَ عُمَرَ وَتَقُولُ
سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكْثَرَ حَبْنَدِ اللَّهِ
فِي الْأَرْضِ الْجَرَّادُ لَا أَكْلُهُ وَلَا أَحَرِمُهُ ۝

حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے امام اعظم کا تلمذ

ان کی کنیت کچھ کی رائے میں ابو معاویہ اور کچھ کہتے ہیں کہ ابو البراءیم ہے۔ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ ۱۰۰ھ میں کوفہ تشریف لائے اور حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے والے صحابہ میں یہ آخری صحابی ہیں اور امام بخاری کے حوالے سے ان کی تاریخ وفات ۱۰۹ھ بتائی ہے۔ اگر ان کی تاریخ فی الواقع ۱۰۹ھ ہے تو اس وقت امام اعظم کی عمر نو سال ہے اس عمر میں نہ دیکھنا مستبعد ہے اور نہ سننا۔ اور جب کہ امام اعظم کے خاندان میں اس کا مزید اہتمام بھی تھا کہ بچوں کو صحابہ کی خدمت میں لے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کے والد ماجد ثابت بھی بچپن میں حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعا بھی فرمائی تھی۔ ایسی صورت میں اگر

امام اعظم نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی نو سال کی عمر میں زیارت کی اور حدیثیں سُنی ہیں تو اس میں انکار کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں جہاں تک روایت سننے کا معاملہ ہے وہ محدثین کے یہاں اتفاقی ہے۔

تَحْمَلُ رَوَايَتِ كِي عَمْرٍا وَرِ مَحْدَثِينَ

تَحْمَلُ رَوَايَتِ كے لیے نو سال تو بڑی عمر ہے امام بخاری نے کتاب العلم میں مثنیٰ یصح سماع الصغیر کا عنوان قائم کر کے محمود بن الریبع کی زبانی ایک واقعہ نقل کیا ہے اس واقعہ میں خود ان صحابی کا بیان ہے کہ میری عمر پانچ سال تھی اور الخطیب نے بھی لکھا ہے کہ محمود کی عمر حضور انور کی وفات کے وقت پانچ سال تھی یہ حافظ ابن عبدالبر نے اس عمر میں روایت لینے پر محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے اور حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ میں محمود کی اس روایت کی وجہ سے پانچ سال پر محدثین کا عمل بتایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي اسْتَقَرَّ عَلَيْهِ اَهْلُ الْحَدِيثِ لِيَهِيَ
اسی پر محدثین کا عمل ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی عمر حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کے دنیا سے رحلت فرماتے وقت نو سال تھی اور یہ محدثین کی قائم کردہ اس تحدید سے کہیں زیادہ ہے جو انہوں نے تَحْمَلُ رَوَايَتِ کے لیے ضروری قرار دی ہے جیسا کہ حافظ ابن الصلاح نے قاضی عیاض کے حوالے سے بتایا ہے۔

محدثین نے اس میں ضابطہ یہی بتایا ہے کہ تَحْمَلُ رَوَايَتِ کی کم از کم عمر محمود کی ہے۔ اس لیے اس کی پذیرائی ہر شک و شبہ سے قطعی طور پر بالا ہے فَاذَنْ لَا يُنْكِرُ سَمَاعُ الْإِمَامِ مِنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى اِسْتَعْلَا
اس لیے امام اعظم کا سماع حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے ناقابل انکار ہے۔

حافظ ابو معشر عبدالکریم نے اپنے رسالہ میں ان کے حوالے سے امام اعظم کی یہ روایت نقل کی ہے امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے سنا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

جس نے مسجد بنائی خواہ وہ چیل کے آشیانے جتنی ہوا اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

ان مذکورہ صحابہ کے علاوہ حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ ۹۱ھ اور ابوالطفیل عامر بن واثلہؓ ۳۲ھ مکہ میں بقید حیات تھے۔ محدثین نے ان سے بھی امام اعظم کی دید و شنید بتاتی ہے۔ اگر امام اعظم نے ان سے بھی کچھ حدیثیں سنی ہیں اور ان کے سامنے بھی چھپنے میں زانوئے ادب طے کیا ہو تو اس میں انکار کی کیا بات ہے؟

اتصالِ روایت کی شرط

اتصالِ روایت کی حد تک امام بخاریؒ تو اگرچہ ایک بار ملاقات کو ضروری بتاتے ہیں لیکن امام مسلمؒ کے خیال میں اتصال کے لیے ملاقات ضروری نہیں وہ تو صرف ہم عصر ہونا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ ہم عصری ثابت ہو جانے کے بعد روایت کو بلفظ عن پیش کرنا درست ہے بلکہ امام مسلمؒ تو معاشر کے ساتھ ملاقات کی شرط کو من گھڑت اور من مانی بات قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

إِنْ اشْتَوَا طَلَقَ الْقَوْلُ "مُخْتَرَعٌ لَمْ يُسَبِّحْ قَائِلُهُ إِلَيْهِ"
ملاقات کی شرط ایک من گھڑت بات ہے اس سے پہلے اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

اور پھر امام مسلمؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دعوے کے پیچھے اجماع کی طاقت ہے۔ یاد رہے کہ امام مسلمؒ کا یہ اختلاف صرف حدیث معنیٰ میں ہے۔ بہر حال ایسی حالت میں امام اعظمؒ کی احادیث معنیٰ کو جو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں دراصل وہ فن کا منہ چڑھاتے ہیں کیونکہ اگر یہ روایت پایہ ثبوت کو نہ پہنچتیں تو امام سیحی بن معینؒ، حافظ ابوالنعمان شافعیؒ، حافظ ابن عبد البر مالکیؒ جو حدیث و روایت کے اراکین خیال کیے جاتے ہیں ہرگز اس بات کی تصریح نہ کرتے کہ امام اعظمؒ نے صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں۔

الغرض میں اس داستان کو یہیں ختم کرتا ہوں اور بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ نے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے سب سے پہلے اپنے شہر کوفہ کے اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ آئیے پہلے ملاحظہ فرمائیے کہ کوفہ میں علم حدیث کا حال سن لیجئے۔

کوفہ میں علم حدیث

فتوح البلدان میں امام احمد بن حنبل نے بغدادی نے بحوالہ نافع بن جبر بن مطعم حضرت عمر کا کوفہ کے بارے میں یہ تاثر لکھا ہے بِالْكُوفَةِ وَجُوهُ النَّاسِ (کوفہ میں بڑے لوگ ہیں)۔

ظاہر ہے کہ حضرت فاروق اعظم یہاں جس وجاہت کا تذکرہ فرما رہے ہیں وہ دینی اور علمی وجاہت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی تائید خود حضرت فاروق اعظم کے اسی خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے کوفہ والوں کے نام لکھا ہے اور جسے حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے :

میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسر کو بحیثیت امیر اور عبداللہ بن مسعود کو بحیثیت معلم اور وزیر روانہ کیا ہے۔ یہ دونوں حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں منتخب اور برگزیدہ ہستیاں ہیں صرف صحابی نہیں بلکہ شہر کا رہبر ہیں سے ہیں تم ان کی اقتدار کرو دیکھو عبداللہ کے معاملے میں میں نے تم کو اپنے اوپر ترجیح دی ہے۔

اس خالص علمی وجاہت کی وجہ سے حضرت فاروق اعظم نے امام ربانی حضرت عبداللہ بن مسعود کو ایک بار کھڑا دیکھ کر فرمایا تھا۔

كَيْفَ مَلِيٍّ عَلِيٍّ علم سے بھرا ہوا برتن ہے۔

اور اسی علمی وجاہت اور جلالت قدر کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی وفات کے بعد جب حضرت علی کوفہ تشریف لائے تو آپ نے یہاں کی فضا کو علم سے مسمور پایا۔ چنانچہ مشہور امام ابوبکر عتیق بن داؤد فرماتے ہیں کہ :

حضرت عبداللہ بن مسعود کی وفات کے بعد جب حضرت علی کوفہ تشریف لائے تو حضرت عبداللہ کے تلامذہ لوگوں کو فقہ پڑھانے میں مشغول تھے جناب امیر نے کوفہ کی جامع میں آکر دیکھا کہ چار صد کے قریب دو آئیں رکھی ہوئی تھیں اور طلبہ لکھنے میں ہمہ تن مصروف تھے یہ دیکھ کر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ :

لَقَدْ تَرَكْتُ ابْنَ أُمِّ عَبْدِ هَاشِمٍ لَدَى سُرُجِ الْكُوفَةِ ۖ

جب فقہ یعنی علم قانون جو علوم شرعیہ کا آخری درجہ ہے اس کے طلبہ کی تعداد یہ تھی تو ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کے طلبہ کی تعداد تو اس سے کئی گنا زائد ہوگی۔ چنانچہ امام ابو بکر الجصاص رازی نے احکام القرآن میں حجاج کے خلاف عبدالرحمن بن الاشعث کی قیادت میں اٹھی ہوئی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اس تحریک میں نکلنے والوں میں چار ہزار قاریوں کی تعداد تھی ۖ

اور حافظ جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی میں امام ابن سیرین سے جو اکابر تابعین سے ہیں حدیث کے طالب علموں کے بارے میں یہ بیان نقل کیا ہے کہ

قَدِمْتُ الْكُوفَةَ وَبِهَا أَرْبَعَةُ آلَافٍ يَطْلُبُونَ الْحَدِيثَ ۖ

میں کوفہ آیا تو وہاں چار ہزار حدیث کے طالب علم تھے۔

طبقات ابن سعد کی ایک پوری جلد میں کوفہ کے علماء کا تذکرہ ہے۔ ان میں صحابہ، تابعین، اتباع تابعین کے علماء کا ایک طویل تذکرہ ہے ہم نے ہر سری طور پر طبقات میں کوفہ کے علماء کو شمار کیا۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ نکلی جبکہ اسی کتاب میں دوسرے شہروں کے علماء کا شمار اس کے عشر عشر بھی نہیں ہے۔

مشہور محدث حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں اسلامی شہروں کے نامور محدثین کا تذکرہ کیا ہے مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ تمام شہروں میں یہ شرف صرف کوفہ ہی کو حاصل ہے کہ اس کے ائمہ حدیث کا تذکرہ کتاب کے پورے ساڑھے سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے جبکہ دوسرے شہروں میں سے کسی بھی شہر کے محدثین کا تذکرہ اسی کتاب میں ایک صفحہ سے زائد نہیں ہے۔ حافظ ابو محمد رامہرمزی نے اپنی کتاب "المحدث الفاضل" میں کوفہ میں علم حدیث کے موضوع پر مشہور محدث عفان بن مسلم سے بند متصل نقل کیا ہے۔

عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہم فلاں کتابیں نقل کر چکے ہیں۔ اس پر فرمانے لگے کہ ہماری راتیں میں اس قسم کے لوگ کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ ہمارا دستور تو یہ تھا کہ جب ایک استاد کے

پاس جاتے تو اس سے وہ روایتیں سنتے جو کسی اور سے نہ سنی ہوتیں اور
دوسرے سے وہ سنتے جو پہلے سے نہ سنی ہوتیں۔ چنانچہ جب ہم کوفہ
آئے تو چار ماہ بٹھرے اگر ہم چاہتے کہ ایک لاکھ حدیثیں لکھ لیں تو
لکھ سکتے تھے مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔ ہم نے
کوفہ میں کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو عربیت میں غلطی کرتا ہو لے
اور علامہ تاج الدین سبکی نے الطبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں حافظ ابو بکر بن ابی داؤد کی زبانی یہ
بیان لکھا ہے کہ :

میں جب کوفہ میں آیا تو میرے پاس ایک ہی درہم تھا میں نے اس درہم
سے تیس مد باقلا خرید لیا۔ ایک مد کھانا اور اشج سے ایک ہزار حدیثیں
لکھتا۔ اس طرح ایک ماہ میں میں نے تیس ہزار حدیثیں جن میں مقطوع
اور مرسل بھی شامل تھیں لکھ لیں لے
ذرا غور فرمائیے اس شہر میں حدیث کی بہتات کا کیا حال ہو گا عفان بن مسلم جیسا امام، عالم، حافظ

۱۔ مقدمہ علی نصب الرایہ ص ۲۵ - ۲۶ طبقات ص ۱۲۰ -
۲۔ عفان بن مسلم امام احمد اور امام بخاری کے اُستاد ہیں علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ ان کی عادت تھی کہ اگر
حدیث کے کسی بھی لفظ میں ان کو ذرا شبہ ہوتا تو اسے سرے ہی سے چھوڑ دیتے (تقریب) حدیث میں ان کی
جلالت شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مشہور محدث یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ جب کسی حدیث میں مجھے
عفان کی مبنوائی حاصل ہو جائے تو پھر مجھے کسی کی بھی مخالفت کی پرواہ نہیں۔ امام یحییٰ بن مہین کہتے ہیں کہ محدثین
پانچ ہیں، مالک ابن جریر، ثوری، شعبہ اور عفان (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۵) امام احمد فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں عبد الرحمن بن مہدی
سے زیادہ رُسخ کے مالک ہیں کتاب الجرح والتعديل ج ۳ ص ۳۰ ابن ابی حاتم نے ان کے اساتذہ میں حماد بن زید، حماد بن سلمہ اور
امام شعبہ کو شمار کیا ہے اور حافظ ابن عبد البر نے الانتقاء میں حماد بن زید کے بارے میں انکشاف کیا ہے، روای حماد بن زید عن
ابی حنیفۃ احادیث کثیرہ (ص ۱۲) حافظ ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مامون انہر شید کی جانب سے ان کو سرکاری وظیفہ ملتا تھا۔
خلیف قرآن کے مسئلہ میں یہ بھی امام احمد کے مبنو تھے۔ سرکار مامون نے ان کو اپنانے کی کوشش کی اسی سلسلے میں ان کا سرکاری وظیفہ
بند کرنے کی دھمکی دی گئی تو فرمایا وفی السماء رزقکم۔ الخ خطیب نے وظیفہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کان المامون بخری علی
عفان خمساً درہم کل شہر امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۲۲ھ میں ہوئی۔ بخاری ابو داؤد کی بھی یہی رائے ہے

چار ماہ ہیں سچا پس ہزار حدیثیں لکھ لے۔ کیا حدیث کی اس بستی کو کوئی ذہین آدمی قلیل الحدیث بستی کہہ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ جب ان کے صاحبزادے عبداللہؒ نے دریافت کیا کہ آپ کی راتے میں طالب علم کو کیا کرنا چاہیے؟ یا ایک ہی استاد کی خدمت میں برابر حاضر رہ کر اسی سے حدیثیں لکھتا ہے یا ان مقامات کا رخ کرے جہاں علم کا چرچا ہے اور وہاں جا کر علماء سے استفادہ کرے تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اسے سفر کرنا چاہیے اور دوسرے مقامات کے علماء سے حدیثیں لکھنی چاہئیں اور ان علماء میں سے پہلے امام احمدؒ نے کو فیقین ہی کا ذکر کیا۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

يَرْحَلُ وَيَكْتُبُ مِنَ الْكُوفِيِّينَ وَالْبَصَرِيِّينَ وَاهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَكَّةَ لَہ

سفر کرے اور کو فیوں، بصریوں اور مدینہ اور مکہ والوں سے احادیث لکھے۔

امام بخاریؒ نے طلب حدیث میں بخارا سے لے کر مصر تک تمام اسلامی شہروں کا سفر کیا تھا۔ دو دفعہ جزیرہ گئے چار بار بصرہ جانا ہوا چھ سال تک حجاز میں مقیم رہے مگر اس کے باوجود مکہ و بغداد کو اتنی اہمیت تھی کہ فرماتے ہیں:

میں شمار نہیں کر سکتا کہ محدثین کی ہر کتابی میں کوفہ اور بغداد کتنی بار مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

آج بھی اگر آپ رجال کی کتابیں کھول کر بیٹھیں تو ہزاروں راوی آپ کو کوفہ کے نظر آئیں گے جن کی روایات سے صحیحین اور غیر صحیحین بھری پڑی ہیں۔ صرف بخاری شریف کو اٹھالیجے اور اس میں جس قدر صحابہ سے احادیث منقول ہو کر آتی ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بترتیب حروف تہجی مقدمہ فتح الباری میں تمام صحابہ کو نام بنام لکھ دیا ہے۔ ان صحابہ میں سے جو خاص کوفہ میں آکر جاگزین ہوتے وہ ان کے نام پڑھ لیجئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ امام بخاریؒ کے ان گنت بار کوفہ جانے کا کیا باعث تھا اور پتہ لگ جاتے کہ کوفہ کا حدیث میں کیا مقام ہے۔

۱۔ حضرت اشعث بن قیس الکندیؒ۔ ۲۔ حضرت عدی بن حاتمؒ۔ ۳۔ حضرت ابیان بن اوس الکلمیؒ۔ ۴۔ حضرت عقبہ بن عمروؒ۔ ۵۔ حضرت بریدہ بن الحصیبؒ۔ ۶۔ حضرت علی بن ابی طالبؒ۔ ۷۔ حضرت جابر بن سمرہؒ۔ ۸۔ حضرت عمران بن الحصیبؒ۔ ۹۔ حضرت جبریر بن عبداللہؒ۔ ۱۰۔ حضرت عمرو بن حریثؒ۔ ۱۱۔ حضرت

جندب بن عبد اللہؓ، ۱۲۔ حضرت مرواس بن مالکؓ، ۱۳۔ حضرت حارثہ بن وہبؓ، ۱۴۔ حضرت مسیب بن حزنؓ،
 ۱۵۔ حضرت خدیفہ بن الیمانؓ، ۱۶۔ حضرت معن بن یزیدؓ، ۱۷۔ حضرت خباب بن الارتؓ، ۱۸۔ حضرت میغرہ
 بن شعبہؓ، ۱۹۔ حضرت زید بن ارقمؓ، ۲۰۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ، ۲۱۔ حضرت سلمان بن مروءؓ، ۲۲۔ حضرت
 نعمان بن مقرنؓ، ۲۳۔ حضرت سمرہ بن خبابؓ، ۲۴۔ حضرت نفیع بن الحارثؓ، ۲۵۔ حضرت سنین الجعفیؓ،
 ۲۶۔ حضرت وہب بن عبد اللہؓ، ۲۷۔ حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیؓ، ۲۸۔ حضرت عبد اللہ بن یزیدؓ،
 ۲۹۔ حضرت عبد الرحمن بن انبریؓ۔

یہ ان کو فی صحابہ کے اسمائے گرامی ہیں جن کے حوالے سے امام بخاری نے صحیح میں ارشادات نبوت
 لیے ہیں اسی پر تمام صحاح ستہ کو قیاس کر لیجئے۔
 ذرا ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور بخاری شریف ہی کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے راویوں
 میں سب سے زیادہ تعداد جس شہر کے راویوں کی ہے وہ کوفہ ہی ہے۔ راقم الحروف نے اس ارادے سے
 بخاری شریف کے راویوں کا جائزہ لیا تو صرف شہر کوفہ کے راویوں کی تعداد صحیح بخاری میں تین سو سے
 زائد ملی ہے۔ اگر کتاب کی ضخامت کے زائد ہونے کا اندیشہ نہ ہو تا تو ہم ان کے نام بدریہ ناظرین کرتے۔
 علماء محدثین نے حفاظ حدیث کے حالات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں صرف ان لوگوں کا
 تذکرہ ہے جو اپنے وقت میں حفاظ حدیث تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "تذکرۃ الحفاظ" ہے
 یہ حافظ شمس الدین الذہبیؒ کی تصنیف ہے، حافظ موصوف نے اس کتاب میں کسی ایسے شخص
 کا تذکرہ نہیں لکھا ہے جس کا شمار حفاظ حدیث میں نہ ہو۔ چنانچہ علامہ ابن قتیبہ کے متعلق لکھتے ہیں۔
 ابن قتیبہ علم کا خزانہ ہیں لیکن حدیث میں ان کا کام ٹھوڑا ہے اس لیے میں
 نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

اور خارجہ بن زید اگرچہ فقہاء سبہ میں سے ہیں مگر ان کے بارے میں صاف تصریح کر دی ہے کہ
 چونکہ وہ قلیل الحدیث تھے اس لیے میں نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار
 نہیں کیا ہے۔

ایسے ہی اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے جو حفاظ حدیث تو ہیں مگر محدثین کے
 یہاں پایہ اعتبار سے ساقط ہیں چنانچہ امام ذہبی نے واقعی اور ہشام کلبی کو اسی لیے حفاظ حدیث

میں شمار نہیں کیا۔

- اس کتاب میں سے صرف ۲۵۶ تک کے ان محدثین کا تذکرہ پڑھ لیجئے جن کو امام ذہبی نے کوئی کہا ہے ہم یہاں صرف ان محدثین کا ذکر کریں گے جن کے لیے امام ذہبی نے کتاب میں مستقل عنوان قائم کیا ہے۔
- ۱۔ علقمہ بن قیس الامام ۶۳ھ، ۲۔ مسروق الہمدانی ۶۳ھ، ۳۔ الاسود بن یزید النخعی ۶۳ھ، ۴۔ عبیدہ بن عمرو السملانی ۶۵ھ، ۵۔ سوید بن غفلہ الکوفی ۶۵ھ، ۶۔ زبیر بن جہش البومریم الاسدی ۶۵ھ، ۷۔ ربیع بن خثیم البوزید الثوری ۶۳ھ، ۸۔ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ ۶۳ھ، ۹۔ ابو عبد الرحمن السملی ۶۳ھ، ۱۰۔ ابوامیہ شریح بن الحارث ۶۵ھ، ۱۱۔ ابو مقدم شریح المذحجی ۶۵ھ، ۱۲۔ ابو ذائل شقیق بن سلمہ ۶۵ھ، ۱۳۔ قیس بن ابی حازم ۶۵ھ، ۱۴۔ عمرو بن میمون ابو عبد اللہ ۶۵ھ، ۱۵۔ زبید بن وہب ابو سلیمان ۶۵ھ، ۱۶۔ معمر بن سوید ابوامیہ الاسدی ۶۵ھ، ۱۷۔ ابو عمرو سعد بن ایاس الشیبانی ۶۵ھ، ۱۸۔ ربیع بن حراش ۶۵ھ، ۱۹۔ ابراہیم بن یزید الیتمی ۶۵ھ، ۲۰۔ ابراہیم بن یزید ابو عمران ۶۵ھ، ۲۱۔ سعید بن جبیر ۶۵ھ، ۲۲۔ عامر بن شراحیل الہمدانی ۶۵ھ، ۲۳۔ عمرو بن عبد اللہ ابواسحاق ۶۵ھ، ۲۴۔ حبیب بن ابی ثابت ۶۵ھ، ۲۵۔ الحکم بن عتیبہ ابو عمرو الکندی ۶۵ھ، ۲۶۔ عمرو بن مرہ ابو عبد اللہ ۶۵ھ، ۲۷۔ القاسم بن مخیمر ابو عروہ ۶۵ھ، ۲۸۔ عبد الملک بن عمیر ۶۵ھ، ۲۹۔ منصور بن المعتمر ۶۵ھ، ۳۰۔ میسرہ بن مقسم ۶۵ھ، ۳۱۔ حصین بن عبد الرحمن ۶۵ھ، ۳۲۔ سلیمان بن فیروز ۶۵ھ، ۳۳۔ اسمعیل بن ابی خالد ۶۵ھ، ۳۴۔ سلیمان بن مہران الاعمش ۶۵ھ، ۳۵۔ عبد الملک بن سلیمان ۶۵ھ، ۳۶۔ نبحان بن ثابت ۶۵ھ، ۳۷۔ محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ ۶۵ھ، ۳۸۔ حجاج بن ارطاة ۶۵ھ، ۳۹۔ مسعر بن کدام الہمدانی ۶۵ھ، ۴۰۔ عبد الرحمن بن عبد اللہ المسعودی ۶۵ھ، ۴۱۔ سفیان بن سعید الثوری ۶۵ھ، ۴۲۔ اسرائیل بن یونس السبیعی ۶۵ھ، ۴۳۔ زائدہ بن قدامہ ۶۵ھ، ۴۴۔ الحسن بن صالح ۶۵ھ، ۴۵۔ شیبان بن عبد الرحمن ۶۵ھ، ۴۶۔ قیس بن الربیع ابو محمد ۶۵ھ، ۴۷۔ ورقہ بن عمر ۶۵ھ، ۴۸۔ شریک بن عبد اللہ القاضی ۶۵ھ، ۴۹۔ زبیر بن معاویہ ابو خثیمہ ۶۵ھ، ۵۰۔ القاسم بن معن ۶۵ھ، ۵۱۔ ابوالاحوص سلام بن سلیم ۶۵ھ، ۵۲۔ بشر بن القاسم ۶۵ھ، ۵۳۔ سفیان بن عیینہ ابو محمد ۶۵ھ، ۵۴۔ ابوبکر بن عیاش ۶۵ھ، ۵۵۔ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ۶۵ھ، ۵۶۔ عبد السلام بن حرب ۶۵ھ، ۵۷۔ جریر بن عبد الحمید ۶۵ھ، ۵۸۔ سلیمان بن حبان الاحمر ۶۵ھ، ۵۹۔ ابراہیم بن محمد الفزاری ۶۵ھ، ۶۰۔ عیسیٰ بن یونس السبیعی ۶۵ھ، ۶۱۔ عبد اللہ بن ادريس ۶۵ھ، ۶۲۔ یحییٰ بن یمان ابو زکریا ۶۵ھ، ۶۳۔ حمید بن عبد الرحمن ابو عوف ۶۵ھ

۶۴۔ علی بن مسهر الواسع ۹۵ھ، ۶۵۔ عبد الرحیم بن سلیمان ۹۵ھ، ۶۶۔ یعقوب بن ابراہیم الانصاری ۹۵ھ،
 ۶۷۔ ابو معاویہ محمد بن حازم ۹۵ھ، ۶۸۔ مروان بن معاویہ ۹۳ھ، ۶۹۔ حفص بن غیاث النخعی ۹۳ھ،
 ۷۰۔ وکیع بن الجراح ۹۴ھ، ۷۱۔ عبیدہ بن حمید ۹۴ھ، ۷۲۔ عبید اللہ الاشجعی ۹۲ھ، ۷۳۔ عبیدہ بن
 سلیمان ۹۴ھ، ۷۴۔ عبد الرحمن بن محمد ۹۵ھ، ۷۵۔ محمد بن فضیل ۹۵ھ، ۷۶۔ حماد بن اسامہ ۹۳ھ،
 ۷۷۔ محمد بن بشر ۹۳ھ، ۷۸۔ یحییٰ بن سعید القرشی ۹۲ھ، ۷۹۔ یونس بن بکر ۹۹ھ، ۸۰۔ عبد اللہ بن
 نمیر ۹۹ھ، ۸۱۔ شجاع الولید البدر ۹۲ھ، ۸۲۔ محمد بن عبید الیادی ۹۲ھ، ۸۳۔ عبد اللہ بن داؤد
 ۹۲ھ، ۸۴۔ الحسین بن علی ابو علی ۹۲ھ، ۸۵۔ زید بن الحباب ۹۲ھ، ۸۶۔ عبید اللہ بن موسیٰ ۹۲ھ،
 ۸۷۔ اسحاق بن سلیمان ۹۲ھ، ۸۸۔ محمد بن عبد اللہ ۹۲ھ، ۸۹۔ یحییٰ بن آدم ۹۲ھ، ۹۰۔ داؤد
 بن یحییٰ ۹۲ھ، ۹۱۔ عبد اللہ بن یزید ۹۲ھ، ۹۲۔ ابو نعیم الفضل بن دکن ۹۲ھ، ۹۳۔ قبیصہ
 بن عقبہ البوعامر ۹۲ھ، ۹۴۔ موسیٰ بن داؤد ۹۲ھ، ۹۵۔ خلف بن نجیم ۹۲ھ، ۹۶۔ یحییٰ بن ابی
 بکر ۹۲ھ، ۹۷۔ عبید اللہ ۹۲ھ، ۹۸۔ زکریا بن عدی ۹۲ھ، ۹۹۔ احمد بن عبد اللہ ۹۲ھ،
 ۱۰۰۔ مالک بن اسماعیل ۹۲ھ، ۱۰۱۔ خالد بن محمد ۹۲ھ، ۱۰۲۔ یحییٰ بن عبد الحمید ۹۲ھ، ۱۰۳۔ عبد اللہ
 بن محمد البکر ۹۲ھ، ۱۰۴۔ محمد بن عبد اللہ بن نمیر ۹۲ھ، ۱۰۵۔ عثمان بن ابی شیبہ ۹۲ھ، ۱۰۶۔
 علی بن محمد بن اسحاق ۹۲ھ، ۱۰۷۔ احمد بن حمید الواسع ۹۲ھ، ۱۰۸۔ الحسن بن الربیع ۹۲ھ، ۱۰۹۔
 محمد بن العلاء ۹۲ھ، ۱۱۰۔ نہاد بن السری ۹۲ھ۔

ان حفاظ کے علاوہ دوسرے بھی کوفہ کے لاتعداد محدثین ہیں لیکن ہم نے صرف تذکرۃ الحفاظ
 سے ان حفاظ حدیث کا ذکر کیا ہے۔ جو ۲۴۴ھ تک ہوئے ہیں۔

یتنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ جس بستی میں سب سے پہلے امام اعظم نے طلب حدیث کے میدان میں
 قدم رکھا وہ بستی حدیث کی نعمت سے مالا مال تھی اور اس وقت اس میں دنیائے علم حدیث کے
 وہ آفتاب و ماہتاب تھے جو اپنی تابانیوں سے دنیا کو محو حیرت کر رہے تھے اور جو امام اعظم کے علم
 حدیث میں اساتذہ ہیں۔ یہاں سب کا استقصاء نواز بس دشوار ہے مگر گلے از گلزار چند گرامی قد
 ہستیاں پیش کرتا ہوں۔

علامۃ الابعین امام شعبی سے تلمذ

خطیب بغدادی نے امام علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا علم

تین پر ختم ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، اور زید بن ثابتؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سارے علوم چھ حضرات کی طرف منتقل ہوئے ہیں۔ علقمہ، اسود، عبیدہ، الحارث، مسروق، عمرو، اور ان اکابر کی علمی میراث صرف دو کو ملی ہے۔ ابراہیم نخعی اور امام شعبی۔ (تلیق فہوم اہل الاثر ص ۲۳) سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بعد لوگوں میں محدث کی حیثیت سے صرف دو ہیں امام شعبی اور سفیان ثوریؒ

حافظ ذہبی نے خود امام شعبی کی زبانی یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:

أَدْرَكَ كَثْرَتُ خُصْمَائِهِ مِنَ الصَّحَابَةِ

میں نے پانچ سو صحابہ سے ملاقات کی ہے۔

ان کی علمیت کا اندازہ کرنا ہو تو عبد الملک بن عمیر کا وہ بیان پڑھیے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے:-

ایک بار امام شعبی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان فرما رہے تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ پاس سے گزرے سن کر فرمایا کہ میں خود ان غزوات میں شریک ہوا ہوں۔ لیکن شعبی کو غزوات زیادہ محفوظ ہیں اور مجھ سے زیادہ عالم ہیں۔

امام شعبی کا دور حدیث کی زبانی یادداشت کا زمانہ ہے اس عہد میں حدیثوں کو سن کر زبانی یاد کرنے کا ایسا ہی رواج تھا جیسا کہ اس گئے گزرے آج کے زمانے میں مسلمانوں میں قرآن کو یاد کرنے کا معمول ہے اس دور کے لوگوں کا فیشن ہی یہ تھا کہ سب کچھ زبانی یاد ہو کتابت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ امام شعبی بھی کتابت حدیث کے قائل نہ تھے خود فرماتے ہیں:

مَا كَتَبْتُ سِوَا دَاقِي بَيْضَاءَ إِلَى يَوْمِي هَذَا

میں نے کبھی بھی روشنائی اور کاغذ سے کام نہیں لیا۔

قوتِ حافظہ اس قدر غضب کی تھی کہ جو کچھ بھی سنتے فوراً یاد ہو جاتا۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ روایات شری مجھے کم یاد ہیں مگر کم یاد ہونے کے باوجود حال یہ ہے۔

إِنْ شِئْتُ لَأَنْتَدُّكُمْ شَهْرًا وَلَا أُعِيدُ بِهِ

اگر میں چاہوں تو ایک ماہ تک اشعار پڑھتا رہوں اور تکرار نہ ہو۔

ابن شبرمہ کی زبانی منقول ہے کہ امام شعبی فرماتے تھے :

اے شباک میں تم سے دوبارہ حدیث بیان کر رہا ہوں حالانکہ میں نے

کبھی کسی سے حدیث سن کر تکرار کی درخواست نہیں کی۔

لَا أَحْبَبْتُ أَنْ يُعِيدَهُ عَلَيَّ مَجْهُدًا تَكْرَارًا بِسُنْدٍ نَهَيْتُ بِهِ

علم حدیث میں اس قدر اوسچا مقام رکھتے تھے کہ عاصم احوال فرماتے ہیں کہ :

میں نے بصرہ، کوفہ اور حجاز والوں کی حدیث کا امام شعبی سے زیادہ

عالم کوئی نہیں دیکھا ہے۔

خطیب نے لکھا ہے کہ حدیث کے مشہور امام زہری کا کہنا ہے :

علماء چار ہیں مدینے میں سعید بن المسیب، کوفہ میں شعبی، بصرہ میں

حسن بصری اور شام میں مکحول۔

امام اعظم نے شعبی کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ امام اعظم

تلامذہ میں بھر بیس سال امام شعبی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرہ

میں امام شعبی کے تلامذہ میں امام اعظم کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور صرف نام ہی نہیں لیا بلکہ

یہ بتایا ہے کہ :

هُوَ أَكْبَرُ شَيْخٍ لِأَبِي حَنِيفَةَ

اور تو اور دور جدید کے بہت بڑے محقق ڈاکٹر فلیپ حتی نے بھی اپنی شہرہ آفاق کتاب

تاریخ العرب میں اس کا اقرار کیا ہے کہ

كَانَ مِنْ أَكْبَرِ الَّذِينَ تَخَّرَجُوا عَنْ الشَّعْبِيِّ الْإِمَامُ أَبُو

حَنِيفَةَ الْمَشْهُورُ

امام شعبی کے بلند پایہ تلامذہ میں سے مشہور امام ابو حنیفہ ہیں۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

عبداللہ بن داؤد الحریبی کہتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ کبرائتا بعین میں سے آپ نے کس کس سے استفادہ کیا ہے؟ فرمایا

قاسم بن محمد، طاؤس، عکرمہ، عبداللہ بن دینار، حسن بصری، عمرو بن دینار، ابوالزبیر، عطاء بن ابی رباح، قتادہ، ابراہیم، شعبی اور امام نافع اور ان جیسوں سے ملا ہوں۔

مسند امام میں خود ان کے حوالہ سے احادیث آتی ہیں۔ چنانچہ خوارزمی نے جامع المسانید کے نام سے جو مجموعہ ترتیب دیا ہے اس میں بحوالہ امام شعبی ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں اور علامہ حنفی نے اس مسند میں امام شعبی کے حوالہ سے روایات درج کی ہیں جس کی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے:

أَبُو حَنِيفَةَ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ
رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُمَسِّحُ عَلَى
الْخُفَّيْنِ -

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم موزوں پر مسح فرماتے تھے۔

اس روایت کی تخریج بحوالہ امام اعظم الحافظ الحارثی کے علاوہ حافظ ابو محمد بخاری، حافظ طبرانی، بن محمد، حافظ حسین بن محمد، حافظ ابوبکر بن عبدالباقی اور خود امام محمد نے کتاب الآثار میں کی ہے ویسے تو جیسا کہ حافظ بزاز فرماتے ہیں اس حدیث کو روایت کرنے والے حضرات کی تعداد ساٹھ ہے مگر اسی روایت کو جو امام بخاری نے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

إِنَّهُ خَرَجَ لِحَاجَتِهِمْ فَاتَّبَعَهُ الْمُغِيرَةُ بِأَدَاةٍ فِيهَا
مَاءٌ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ حِينَ فَرَغَ مِنْ حَاجَتِهِمْ فَتَوَضَّأُوا
وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ -

آپ ضرورت سے گئے منیرہ پانی کا برتن پیچھے سے لے کر آئے
پانی آپ نے ضرورت سے فراغت کے بعد استعمال کیا۔ وضو فرمایا
اور خفین پر مسح فرمایا۔

اسی روایت کو امام مسلم نے بھی اپنے مخصوص انداز میں کئی طریقوں سے بیان کیا ہے ان میں سے ایک طریق میں حضرت امام شعبی نے بھی حدیث بحوالہ عروۃ بن مفرہ اپنے شاگرد عمر بن زائدہ سے بیان کی اس طرح ہے۔

عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ رَضِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَحَّاهُ
وَمَسَحَ عَلَى الْخُضَيْنِ فَقَالَ لَهُ إِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ لِي

حضرت مفرہ نے حضور النور کو وضو کرایا۔ آپ نے وضو فرمایا خضین پر
مسح فرمایا اور فرمایا کہ میں نے موزے سجالت طہارت پہنے تھے۔

واضح رہے کہ حافظ ذہبی نے امام شعبی کو حفاظ حدیث کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے اس طبقے میں کم و بیش تیس حفاظ حدیث ہیں۔ امام ذہبی کی تصریح کے مطابق امام اعظم حضرت شعبی کے شاگرد ہیں اور یہ بھی ذہبی نے ہی لکھا ہے کہ وکیع بن الجراح، امام یزید بن ہارون، امام ابو عاصم النبیل، امام عبد الرزاق، امام عبید اللہ بن موسیٰ، امام ابو نعیم فضل بن وکین اور امام ابو عبد الرحمن المقرئ جیسے ائمہ حدیث نے امام ابو حنیفہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ شجرہ علم حدیث کے تمام برگ و بار ان ہی اکابر سے نکلے ہوئے ہیں۔ امام عبد الرزاق، امام عبید اللہ بن موسیٰ، امام ابو نعیم اور امام ابو عبد الرحمن المقرئ کے تلامذہ ہیں آپ کو امام احمد اور امام بخاری ملیں گے چنانچہ حافظ ذہبی نے جہاں امام مقرئ کے ترجمہ میں یہ بتایا ہے کہ

سَمِعَ مِنْ ابْنِ عَوْنٍ وَابْنِ حَنِيفَةَ رَضِيَ

وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ مروی عنہ البخاری و احمد۔ امام مقرئ بخاری اور احمد کے استاد ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ جیسے مسلم اور ابوداؤد امام احمد کے شاگرد ہیں ایسے ہی ترمذی اور ابن خزمیہ حضرت امام بخاری کے شاگرد ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام شعبی کی ذات گرامی بواسطہ امام اعظم علم حدیث میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

امام حماد بن سلیمان سے تلمذ

والد کا نام مسلم اور کنیت ابوسلیمان ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ حماد حدیث میں حضرت

انس بن مالکؓ، زید بن وہبؓ، سعید بن المسیبؓ، سعید بن جبیرؓ، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، ابو وائلؓ، ابراہیم نخعیؓ، عبد اللہ بن بریدہ اور عبد الرحمن بن سعد کے شاگرد ہیں اور مشہور محدث عاصم الاحولؓ، امام شعبہؓ، امام سفیان ثوریؓ، امام حماد بن سلمہؓ، امام مسعر بن کلامؓ، امام ابو حنیفہؓ اور سلیمان بن مہران کے اُستاد ہیں۔ امام مسلمؓ، ابو داؤدؓ، ترمذیؓ اور ابن ماجہ نے اپنی کتابوں میں ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ حافظ عسقلانی اور حافظ ذہبی دونوں اس پر متفق ہیں کہ حماد ابراہیم نخعی کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔

ابو ایشخ نے تاریخ اصفہان میں لکھا ہے کہ ایک روز ان کو ان کے اُستاد ابراہیم نخعی نے ایک درہم کا گوشت لانے کے لیے روانہ کیا۔ زبیل ان کے ہاتھ میں تھی اور ان کے والد کہیں سے گھوڑے پر سوار اُسے تھے۔ صورت حال دیکھ کر حماد کو ڈانٹا اور زبیل لے کر پھینک دی جب ابراہیم نخعی کی وفات ہو گئی تو حدیث کے طالب علم ان کے گھر آئے، دستک دی ان کے والد چرغ لے کر باہر آئے، طلبہ نے دیکھ کر کہا کہ ہمیں آپ کی نہیں آپ کے صاحبزادے کی ضرورت ہے۔ یہ شرمندہ ہو کر اندر تشریف لے آئے اور حماد سے کہا کہ جاؤ باہر جاؤ۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زبیل کے صدقے میں ملا ہے۔

علامہ خوارزمی نے امام بخاری کے حوالہ سے سند متصل نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ:

لَقَدْ سَأَلْتُ هَذَا يَحْيَى حَمَادًا مِثْلَ مَا سَأَلْتَنِي جَمِيعُ النَّاسِ

حافظ عبد اللہ بن وہب دینوری کہتے ہیں کہ:

ایک بار حافظ ابو زرعمہ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ ایک خراسانی ان کے سامنے موضوع حدیثیں بیان کر رہا ہے اور یہ ان روایات کو غلط بتا رہے ہیں۔ وہ شخص ان کی باتوں پر ہنس رہا ہے کہ واہ کیا خوب! جو روایت تم کو یاد نہیں اس کو غلط بتا رہے ہو۔ اس پر میں نے اس شخص سے پوچھا ما اسند ابو حنیفہ عن حماد؟ بتاؤ امام ابو حنیفہ کی بواسطہ حماد کیا روایات ہیں؟ بیچارہ چپ ہو گیا۔ پھر میں نے حافظ ابو زرعمہ سے دریافت کیا ما تحفظ لابی حنیفہ؟ آپ کو حماد کی سند سے

امام ابو حنیفہ کی کتنی حدیثیں یاد ہیں؟ اس پر حافظ البوزرعی نے حدیثوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے

یاد رہے کہ امام حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ امام اعظم چار ہزار حدیثیں روایت کرتے تھے جن میں دو ہزار حماد کی تھیں۔ چنانچہ امام حافظ زکریا نیشاپوری بسند متصل امام موصوف سے ناقل ہیں؛ امام ابو حنیفہ کی کل روایات چار ہزار تھیں ان میں دو ہزار حماد کی اور دو ہزار تمام اساتذہ کی ہیں۔

نقد و رجال کے امام حضرت شعبہ امام حماد کی صداقت کا لوہا مانتے ہیں اور سید الحفاظ یحییٰ بن معین ان کی ثقاہت کو سراہتے ہیں۔ امام ابو عبد اللہ المحکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں جہاں ان ائمہ حدیث کا تذکرہ کیا ہے جن کی علم حدیث میں امامت مسلم ہے اور جن کی ثقاہت پر فن حدیث میں اعتماد ہے ائمہ حدیث کی اس فہرست میں حماد بن ابی سلیمان کا بھی ان میں تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں ارباب فتویٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حماد کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا تذکرہ باوجود عدالت، صداقت اور ثقاہت کے اس معذرت کے ساتھ کیا ہے۔

لَوْ لَا ذُكِرَ ابْنُ عَدِيٍّ فِي الْكَامِلِ لَمَّا أُورِدَتْهُ رُكْنٌ

اگر ابن عدی ذکر نہ کرتا تو میں میزان میں ان کا ترجمہ نہ لکھتا۔

در اصل تینا یہ چاہتے ہیں کہ امام حماد اپنی جلالت قدر کی وجہ سے اس قدر اونچے مقام پر ہیں کہ ان کا ذکر میزان میں نہ آنا چاہیے کیونکہ یہ امام ذہبی کی اس پالیسی کے خلاف ہے جس کا تذکرہ خود امام ذہبی نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔

میزان الاعتدال میں ائمہ متبوعین کا ذکر

میرا اشارہ اس وعدے کی طرف ہے جو امام موصوف نے میزان کے مقدمہ میں کیا ہے کہ:

لَا أَذْكَرُ فِي كِتَابِي مِنَ الْأُئِمَّةِ الْمُتَّبُوعِينَ فِي الْفُرُوعِ

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۲۵۸ - ۲۔ مناقب الموفق ج ۱ ص ۹۶ - ۳۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۱۰ -

۴۔ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۷۹ -

أَحَدًا لِّجَلَالَتِهِمْ فِي الْإِسْلَامِ وَعَظَمَتِهِمْ فِي النَّفُوسِ مِثْلُ
أَبْنِي حَنِيفَةَ وَالشَّافِعِي لَهُ

میں اپنی کتاب میں ان اماموں کا ذکر نہ کروں گا جن کی فروع میں تقلید
کی جاتی ہے کیونکہ اسلام میں ان کی جلالت اور لوگوں میں ان کی عظمت
موجود ہے جیسے ابو حنیفہ اور شافعی۔

ظاہر ہے کہ امام حماد صرف امام نہیں بلکہ امام الائمہ ہیں پھر ان کا میزان میں تذکرہ اس وعدہ
کی خلاف ورزی ہے۔ امام ذہبی نے اسی سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ میں نے میزان میں ان کا
تذکرہ ان کی ثقاہت، صداقت اور عدالت کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ صرف اس
لیے کیا ہے کہ امام عدی نے الکامل میں ان کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ کا المناک حادثہ

شاید آپ غلش محسوس کریں کہ خیر امام حماد کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن اس سے زیادہ
حیرت کی بات یہ ہے کہ جن کا نام لے کر کہا جا رہا ہے کہ ان جیسوں کا میزان میں ذکر نہ ہو گا خود ان
کا بھی میزان میں ذکر ہے اور ذکر بھی کوئی طویل نہیں بلکہ صرف ایک سطر ہی۔

یہ تاریخ صحافت کا بڑا ہی المناک اور دردناک حادثہ ہے دراصل میزان الاعتدال اولاً جب ہندوستان
میں چھپی تو امام صاحب کا تذکرہ تقطیع نوں کتاب کے اندر نہیں بلکہ کتاب کے حاشیہ پر پریس
والوں نے چھاپ دیا اور خود پریس والوں نے ایسا کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ میزان کے کئی نسخوں
میں سے ایک کے حاشیہ پر چونکہ ایسا ہی درج تھا اس لیے اس کو اصل کتاب میں جگہ نہیں دی گئی
اس کے بعد مصر کے پریس سے جو میزان چھپ کر آئی تو یار لوگوں نے کتاب کے اندر داخل کر دیا۔
واقعہ یہ ہے کہ میزان میں امام اعظم کا کوئی ذکر نہ تھا غالباً کسی نے مطالعہ میں اپنی یادداشت حاشیہ
میں درج کر دی تھی اور بعد کو مطابع والوں نے اسے اصل کتاب ہی میں داخل کر دیا۔

مولانا عبدالحی صاحب غیث النعمان میں فرماتے ہیں کہ میزان کے جن نسخوں کا میں نے مطالعہ
کیا ہے ان میں اس عبارت کا نام تک نہیں ہے اور نہ ہونے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حافظ

عراقی تہذیب میں فرماتے ہیں کہ ابن عدی نے کامل میں ان سب حضرات کا تذکرہ کیا ہے جن پر کسی نہ کسی وجہ سے کلام ہے چاہے وہ ثقہ ہی ہوں لیکن امام ذہبی نے میزان اس التزام کے ساتھ لکھی ہے کہ اس میں کسی صحابی اور ائمہ مقبوعین میں سے کسی امام کا ذکر نہ ہو گا۔ حافظ سخاوی نے تہذیب الفیہ میں بھی یہ بات لکھی ہے کہ امام ذہبی نے ائمہ مقبوعین کے ذکر نہ کرنے کا التزام کیا ہے اور حافظ سیوطی نے بھی تہذیب الراوی میں میزان کی اسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ ان اکابر کی تصریحات کھلے بندوں کہہ رہی ہیں کہ میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہیں ہے۔ مشہور محدث علامہ محمد بن اسماعیل ایمانی توضیح الافکار میں رقمطراز ہیں کہ امام ذہبی نے میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہیں لکھا ہے لیکن امام نووی نے تہذیب الاسماء میں امام صاحب کا تذکرہ لکھا ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ خود حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لسان المیزان میں امام اعظم کا کوئی ترجمہ نہیں لکھا حالانکہ لسان المیزان الاعتدال ہی کا چرہ ہے۔ یہ اس بات کی صریح شہادت ہے کہ میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہ تھا۔ خیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ بتایا رہا تھا کہ امام حماد کی ذات گرامی اپنی ثقاہت کی وجہ سے بہت اونچے مقام پر ہے۔ قلم کو روکنا چاہتا ہوں مگر کیا کروں رکتا نہیں ہے۔ بزرگان دین کی عدالت و ثقاہت تو اپنی جگہ ہے افسوس تو اس پر اتنا ہے کہ لوگ اکابر کے منہ سے نکلی ہوئی بات کا غشا خود نہیں سمجھتے اور بات کا خواہ مخواہ بنگڑ بنا دیتے ہیں۔ انا للہ خالی اللہ المشتکی۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک بار امام حماد حج کر کے کوفہ واپس آتے لوگ ملاقات کی خاطر حاضر ہوئے۔ آپ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے کوفہ والو! انم اللہ سبحانہ کا شکر ادا کرو میں عطاء بن ابی رباح، طاؤس اور مجاہد سے ملا ہوں لیکن تمہارے بچے اور بچوں کے بچے بھی علم میں ان سے آگے ہیں اس میں کون سی ٹوہین کی بات ہے یہ تو کوفہ میں علم کی بہتات پر تحدیثِ نہمت ہے۔

امام حماد پر ارجاء کی مہمت

ظلم بالائے ظلم یہ کہ ان کے متعلق رجال کی کتابوں میں یہ فقرہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

تکلم فیہ للارجاء

حالانکہ امام حماد کا دامن اس مہمت سے بالکل پاک ہے صرف امام حماد نہیں بلکہ ان کی طرح بخاری اور مسلم کے کتنے ہی راویان حدیث ہیں جن کی ثقاہت اور عدالت مسلم ہے مگر ان پر صرف فکری اختلاف کی وجہ سے ارجاء کی مہمت جھڑوی ہے۔ خدا بھلا کرے الشہرستانی کا کہ انہوں نے

رجال المرتبة کے عنوان سے مختلف اکابر مثلاً الحسن بن محمد، سعید بن جبیر، طلق بن حبیب، محارب بن دثار، حماد بن ابی سلیمان، امام اعظم، قاضی ابو یوسف، امام محمد وغیرہ کا نام لکھ کر یہ بات لکھ دی ہے کہ:

هَذَا كُلُّهُمْ أُمَّةٌ الْحَدِيثُ لَهُ

حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں جہاں بخاری و مسلم کے ان راویوں کی فہرست دی ہے جن کو کہنے والے مرتبہ کہہ گئے ہیں وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی طرف جس ارجاء کی نسبت کی گئی ہے اس سے مقصود مرتبہ کا وہ ارجاء نہیں ہے جو اہل السنۃ کی اپوزیشن ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے:

تَاخِيرُ الْقَوْلِ فِي الْحُكْمِ عَلَى مَرْتَبِ الْكِبَارِ لَهُ

اگر ارجاء یہی ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہے لیکن اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ بخش دے خواہ نہ دے۔ تو سب اہل السنۃ ہی ارجاء کے شکار ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں:

مُرَجِيٌّ أَمْرُهُ وَمُفَوَّضٌ مَصِيرُهُ إِلَى رَبِّهِ إِنْ شَاءَ عَذَابُهُ وَإِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ۔

امام اعظم، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد سب کا یہی مسلک ہے۔ ابن الجوزی نے مناقب میں امام احمد کی یہی رائے لکھی ہے کہ

اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا چاہے اس نے کیا کرے
ہی کا ارتکاب کیوں نہ کیا ہو۔

خود امام بخاری نے صحیح میں یہ عنوان قائم کر کے کہ

الْمُعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَكْفُرُ صَاحِبَهَا بِإِثْمِهَا

إِلَّا بِالشِّرْكِ هـ

یہی بتایا ہے کہ شرک کے سوا گناہ خواہ کیسا ہی سنگین ہو مگر گنہگار کافر نہیں ہوتا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ حافظ بدر الدین عینی نے امام بخاری کے دعویٰ اور دلائل کی توضیح

۱۔ الملل والنحل ج ۱ ص ۲۳۴۔ ۲۔ تدریب الراوی ص ۲۱۹۔ ۳۔ تدریب الراوی ص ۱۱۲

۴۔ مناقب ابن الجوزی ص ۹۶۔ ۵۔ صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۔

کے بعد لکھا ہے :

هَذَا هُوَ مَذْهَبُ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ بِهٖ

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مرجعہ جو کہتے ہیں کہ گناہ سے کچھ نہیں ہوتا اور خوارج جو کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ کی رائے میں مرتکب کبیرہ کی ہرگز بخشش نہ ہوگی ان میں سلامتی کی راہ وہی ہے جو اہل السنۃ نے اختیار کی ہے اور جس کی قانونی تعبیر یہ ہے کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی اور اقرار زبانی کا۔ جس طرح ایک تندرست آدمی بیمار ہو سکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔

اگر اسی کا نام ارجاء ہے جو آپ حافظ سیوطی کی زبانی سن آتے ہیں تو پھر مرجعہ ہونے کی پھبتی کیوں ہے؟ اور زبان و قلم کے یہ سارے ہنگامے کیوں ہیں؟ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ غصہ صرف اس پر ہے کہ ایمان کے بارے میں قانونی تعبیر فقہاء محدثین نے الگ کیوں اختیار کی ہے۔ اور فقہائے اس موضوع پر وہی زبان کیوں اختیار نہیں کی جو بعد میں محدثین نے کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جس کسی نے فقہار کو مرجعہ کہا ہے اس نے عقائد کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف ان الفاظ کی وجہ سے کہا ہے جن سے مرجعہ کی موافقت کی جاتی ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آئندہ اوراق میں آئے گی۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ امام حماد حضرت امام اعظم کے استاد فقہ ہونے کے ساتھ استاد حدیث بھی ہیں۔

قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار میں امام حماد کے حوالہ سے امام ابو حنیفہ کی روایا موجود ہیں۔

عَنْ أَبِي يُوسُفَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ إِبْرَاهِيمَ
أَنَّهُ قَالَ لَمْ يَجْمَعْ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ عَلَى شَيْءٍ كَمَا اجْتَمَعُوا عَلَى التَّوْبِ بِالْفَجْرِ
وَالْتَبْكِيرِ بِالْمَغْرِبِ وَلَمْ يَتَأَبَّرُوا عَلَى شَيْءٍ مِنَ
التَّطَوُّعِ كَمَا تَأَبَّرُوا عَلَى أَرْبَعٍ قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَكَعَتِي
الْفَجْرِ بِهٖ

ابراہیم کہتے ہیں کہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا کسی کام پر اتنا ایک نہیں ہوا جتنا صبح کی نماز کو چاندنا کر کے پڑھنے اور مغرب کی نماز کو سویرے پڑھنے پر ہوا ہے اور کسی بھی نفل پر اتنی ہمیشگی نہیں کی جتنی کہ ظہر سے پہلے چار سنتوں اور صبح کی نماز سے پہلے دو سنتوں پر کی ہے۔

امام محمد نے مؤطا میں امام مالک کے ساتھ کچھ امام اعظم کی روایات بھی درج کی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مُحَمَّدٌ أَخْبَرَنَا أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ ابْنِ إِسْحَاقَ
أَنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ سُئِلَ عَنِ الْوُضُوءِ مِنْ مَكْتَسِبِ
الذِّكْرِ فَقَالَ إِنْ كَانَ قَاطِعَهُ لَمْ
يُحْتَسِبْ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ دَرِيْفَتٌ كَمَا كَانَتْ يَتَابُ كَاهُ كَوَاهُ لَكَ
سَ وَضُو كَا حَكَمَ كَمَا هَ؟ فَرَمَا إِنْ كَرْنَا كَا هَ تَوَكَّاتُ دَو۔

سے مؤطا امام محمد ص ۵۴۔ نوٹ:- آج مؤطا امام مالک کے دو ہی نسخے متداول ہیں ایک امام سیحی بن یحییٰ لیشی کا۔ اور دوسرا امام محمد کا، جن کے متعلق امام ذہبی نے لکھا ہے کان من بھور العلم والفقہ قویانی مالک (میزان العدل) علم اور فقہ کے سمندر تھے اور امام مالک سے آمدہ بیانات میں بیحد قابل اعتماد ہیں۔ امام مالک کے سائے تلامذہ میں امام محمد کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے امام مالک کی ساری حدیثوں کو امام مالک کی زبان سے سُنا ورنہ عام طور پر امام مالک کے شاگرد پڑھتے اور وہ سنتے۔ یہی وجہ ہے کہ امام محمد کو امام مالک سے مؤطا سننے میں پورے تین سال لگے نیز جتنے لوگوں نے امام مالک سے مؤطا کی روایت کی ہے ان میں کوئی بھی جلالتِ شان میں امام محمد کا ہمسر نہیں بلاشبہ امام شافعی مؤطا کے رواۃ ہیں لیکن قطع نظر اس بات کے کہ ان سے مؤطا کا کوئی نسخہ مروی نہیں ہے ان کو امام محمد سے وہی نسبت ہے جو امام مالک سے ہے کیونکہ امام شافعی نے دونوں اماموں سے یکساں استفادہ کیا ہے اور گواہوں نے امام محمد سے حدیث کا علم بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے جیسا کہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے اور الشافعی فاضل محمد بن الحسن فی الحدیث (ص ۵۹) لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ فقہ میں وہ خاص طور پر امام محمد ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں امام شافعی سے نقل میں من الناس علی فی الفقہ محمد بن الحسن اور حافظ کفانی نے ابو یعلیٰ کی زبانی امام شافعی کے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ اعانی اللہ برجلین بابن عیینہ فی الحدیث و محمد فی الفقہ (بلوغ الامانی ص ۲۳)

امام محمد نے کتاب الآثار میں بھی بحوالہ امام اعظم از حماد بے شمار روایات درج کی ہیں۔
 مُحَمَّدٌ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ إِبْرَاهِيمَ قَالَ
 ثَلَاثَةٌ يُؤَجَّرُ فِيهِنَّ الْمَيِّتُ بَعْدَ مَوْتِهِ وَلَدٌ
 يَدْعُو لَهُ بَعْدَ مَوْتِهِ فَهُوَ يُؤَجَّرُ فِي دُعَائِهِ وَ
 رَجُلٌ عِلْمٌ عِلْمًا يَعْمَلُ بِهِ وَيُعَلِّمُهُ النَّاسُ فَهُوَ
 يُؤَجَّرُ عَلَى مَا عَمِلَ وَ عِلْمَهُ وَ رَجُلٌ تَرَكَ صَدَقَتَهُ
 تَيْنِ چیزوں سے مرنے کے بعد مرنے والا فائدہ اٹھاتا ہے۔ بیٹا جو
 مرنے کے بعد اس کے لیے دعا مانگے، عالم جس نے علم حاصل کیا
 کیا اور لوگوں کو تعلیم دی لوگوں کے علم و عمل کا میت کو بھی فائدہ
 ہوتا ہے تیسرے وہ زمین جسے خیراتی کاموں کے لیے صدقہ بنا
 کر چھوڑ دیا گیا۔

ایسے ہی حافظ ابو محمد حارثی نے اپنے مسند میں بحوالہ حماد امام اعظم کی بہت سی روایات درج

کی ہیں :

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ
 عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ لَمْ يَقْنُتْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى
 اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي النَّجْرِ إِلَّا شَهْرًا حَارَبَ حَيًّا
 مِنَ الْمُشْرِكِينَ فَقَنَّتْ يَدْعُو لَهُ

حضرت عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم نے
 صبح کی نماز میں صرف ایک ماہ قنوت کی جبکہ مشرکین کے ایک
 قبیلہ سے جنگ تھی۔

امام اعظم ہی کا جو مسند بروایت حنفی موجود ہے اس میں حضرت حماد کے حوالہ سے
 روایات موجود ہیں۔

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ وَالْأَسْوَدِ

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ إِلَّا عِنْدَ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ وَلَا يُصَوِّدُ لَشَيْءٍ مِمَّنْ ذَاكَ لَهُ

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صرف تبریک تحریم کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

لہ شرح مسند ملا علی قاری ص ۷۰۔ نوٹ: یہ حدیث مختلف الفاظ میں دوسرے محدثین ابو داؤد، ترمذی، اور نسائی نے بھی روایت کی ہے ابو داؤد کی روایت میں اس حدیث کو بیان کرنے والے چھ راوی ہیں عثمان، وکیع، سفیان، ثوری، عاصم، عبدالرحمن اور علقمہ۔ اور اسی سند کے ساتھ یہ حدیث ترمذی میں موجود ہے مگر اس میں ہناد کی جگہ محمود بن غیلان ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کو ان زوائد کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ وکیع، سفیان، عاصم، عبدالرحمن اور علقمہ۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں لامر یثبت حدیث ابن مسعود۔ واصل یہ ایک سنگین مغالطہ ہے حدیثیں دو ہیں اور دونوں ابن مسعود کی ہیں ایک یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار کے علاوہ نماز پر رفع یدین نہیں کیا۔ دوسری یہ کہ عبداللہ کہتے ہیں کہ کیا میں تم کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھاؤں۔ عبداللہ نے نماز پڑھاؤں اور تبریک تحریم کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔ دونوں میں فرق ہے۔ پہلی حدیث میں حضور کے بارے میں ہے کہ آپ نے نہیں کیا اور دوسری میں آپ کے عمل کا نہیں بلکہ خود عبداللہ کے عمل کا ذکر ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں پہلی مرفوع ہے اور دوسری موقوف ہے۔ کچھ راویوں نے دونوں کو منقوط کر دیا تھا۔ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ روایتی حیثیت سے پہلی بات ثابت نہیں ہے اور ثابت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس اسناد سے پہلی روایت عبداللہ بن المبارک کو پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ثابت نہ ہونے سے مطلقاً نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف اس اسناد کی صحت کی نفی ہے۔ علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ ابن المبارک کے نزدیک کسی حدیث کا ثابت نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اور بھی کسی کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ مشہور محدث سبکی القطان اسے صحیح کہتے ہیں۔ حافظ ابن حزم کی رائے میں صحیح ہے اور امام ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے۔ یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے صرف اتنی بات یاد رکھئے کہ حدیثیں دونوں طرح آئی ہیں رفع یدین کرنے اور نہ کرنے کی۔ امام اعظم نے تبریک تحریم کے علاوہ نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی سنت کو اولیٰ و افضل قرار دیا ہے کیونکہ صحابہ کی زیادہ تعداد اسی پر عمل پیرا تھی اور محدثین کا بتایا ہوا ضابطہ ہے کہ إِذَا تَنَازَعُوا فِي الْحَدِيثِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَطُرَ إِلَى مَا عَمِلَ عَلَيْهِ أَصْحَابُهُ۔ (ابو داؤد)

بطور گئے از کلزار چند روایات ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام حماد حضرت امام اعظم کے اُستادِ حدیث ہیں اور اُستاد بھی ایسے شفیق کہ حافظ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے والد بزرگوار نے امام حماد سے ایک مسئلہ دریافت کیا حماد نے جواب دیا۔ امام صاحب نے جواب پر ایک سوال کر دیا۔ بات لمبی ہو گئی۔ حضرت حماد خاموش ہو گئے۔ امام صاحب جب مجلس سے رخصت ہو گئے تو امام حماد نے فرمایا:

هَذَا مَعَ فَتْهُمْ يُحْيِي اللَّيْلَ - ۱

یہ صرف فقیہ نہیں بلکہ شب زندہ دہ بھی ہیں۔

امام حماد کے فرزند کہتے ہیں کہ ایک بار میرے والد محترم سفر میں تشریف لے گئے واپسی پر میں نے دریافت کیا کہ اس دوران میں زیادہ کون یاد آیا؟ میرا خیال تھا کہ وہ یہی فرمائیں گے کہ تو! لیکن انہوں نے امام ابو حنیفہ کا نام لیا اور فرمایا کہ اگر مجھے یہ قدرت ہوتی کہ میں ابو حنیفہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔ ۲

ابو اسحاق السبعی سے تلمذ

ان کا نام عمرو بن عبد اللہ اور کنیت ابو اسحاق ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں ان کو علم حدیث میں امام اعظم کا اُستاد لکھا ہے یہ خود علم حدیث میں صحابہ کرام یعنی زید بن ارقم، عبد اللہ بن عمرو، عدی بن حاتم طائی اور برابر بن عازب کے شاگرد ہیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ:

حَدَّثَ عَنْ ثَلَاثِ مِائَةِ شَيْخٍ - ۳

ان کے تین سو اُستاد ہیں۔

ان میں ارقم صحابہ کرام ہیں۔ امام ابو داؤد طیالسی کہتے ہیں کہ حدیث ہمیں چار شخصوں سے ملی ہے۔ زہری، قتادہ، ابو اسحاق السبعی اور امام اعظم۔ پھر سب کے بارے میں ایک ایک فن کی امامت کا ذکر کرتے ہوئے ابو اسحاق کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ

أَعْلَمُهُمْ بِحَدِيثِ عَلِيٍّ وَابْنِ مَسْعُودٍ - ۴

انہوں نے قرآن حکیم امام ابو عبد الرحمن السلمی سے پڑھا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ

امام آتش فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ ان کو دیکھتے تو پکار اُٹھتے۔
هَذَا عَمْرُو الْقَارِي لَهُ

ابو عبدالرحمن اسلمی حضرت عبداللہ بن مسعود کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

ابو عبدالرحمن اسلمی اور ان کے علاوہ کوفہ کے دوسرے علماء جیسے علقمہ، اسود،
حارث اور زہر بن جہیش نے قرآن عزیز عبداللہ بن مسعود سے حاصل کیا ہے۔
صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ مدینہ جا کر حضرت عمر، حضرت عائشہ سے بھی استفادہ
کرتے تھے۔

ابو اسحاق السبئی کی وفات ۲۸ھ میں ہوئی ہے۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ امام ابو اسحاق السبئی
مجھ سے سال یا دو سال بڑے ہیں ان سے امام اعظم نے بہت احادیث روایت کی ہیں۔ چنانچہ
کتاب الآثار میں قاضی ابویوسف فرماتے ہیں :

أَبُو يُونُسَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ السَّبْيِيِّ عَنْ شُرَيْحٍ
أَنَّهُ قَالَ إِذَا مَضَتْ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ بَانَ بِلَالٌ يَدًا -

شریح کہتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے پر عورت ایسا رستے بانہ ہو جائے گی یہ
حافظ ابو محمد حارثی اپنے مسند میں فرماتے ہیں :

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ السَّبْيِيِّ عَنْ الْأَسْوَدِ عَنْ هَاشِمَةَ قَالَتْ
لَمْ يَكُنْ بَيْنَ أَذَانِ بِلَالٍ وَابْنِ أُمِّ مَكْتُومٍ إِلَّا قَدْ رَمَا يَنْزِلُ
هَذَا وَيُصْعَدُ هَذَا -

بلال اور ابن ام مکتوم کی اذانوں میں صرف دونوں مؤذنوں کے اترنے
اور چڑھنے کا فرق ہوتا تھا۔

حافظ موسیٰ بن زکریا نے اپنے مسند میں بھی بحوالہ ابو اسحاق السبئی بہت روایات لکھی ہیں۔
أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ السَّبْيِيِّ عَنِ الْبَرَاءِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعَلِّمُنَا التَّشْدِيدَ كَمَا يُعَلِّمُ السُّورَةَ مِنَ الْقُرْآنِ
 حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد ایسے ہی سکھاتے تھے جیسے قرآن کی سورتیں
 امام ابواسحاق السبئی کو حافظ ذہبی نے حفاظ کے چوتھے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ امام شعبہ، امام عثم
 اور امام سفیان ثوری جیسے اجلہ ائمہ حدیث ان کے شاگرد ہیں۔

الامام الحافظ شعبان سے امام اعظم کا تلمذ

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے۔ الامام، الحافظ، الحجۃ، صل
 میں بصرہ کے رہنے والے ہیں مگر کوفہ میں اقامت فرمائی تھی۔ حکم بن عتیبہ، زیاد بن علاقہ، منصور بن المعتمر،
 عبد الملک بن عمیر، سماک بن حرب، سلیمان بن مہران اور حسن بصری سے حدیث کی تعلیم پاتی ہے سید الحفاظ
 یحییٰ بن معین سے ان کے باپ کے پاس پوچھا گیا۔ فرمایا کہ ہر پہلو سے ثقہ ہیں۔ تمام ائمہ نقد و جرح ان کی
 ثقاہت و صداقت پر متفق ہیں۔ حافظ عسقلانی نے جن ائمہ فن سے ان کی ثقاہت و صداقت نقل
 کی ہے ان میں ابوالقاسم البغوی، یعقوب بن شعبہ، ابو حاتم، العجلی، النسائی اور یحییٰ بن سعید خاص طور پر
 قابل ذکر ہیں۔ زائدہ بن قدامہ، ابوداؤد طیالسی، الحسن بن موسیٰ، عبد الرحمن بن مہدی علم حدیث ہیں ان کے
 شاگرد ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کے شاگردوں کی فہرست میں امام اعظم کا بھی ذکر کیا ہے
 اور حافظ ذہبی نے امام صاحب کی شاگردی کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا ہے۔
 حَدَّثَنَا الْإِمَامُ أَبُو حَنِيفَةَ عَنْهُ يَهُ

حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ عبد الرحمن بن مہدی کو ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے پر بڑا ہی
 ناز تھا منجملہ اور شاگردوں کے مشہور امام المسند علی بن الجعد جو ہری بھی ان کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری،

۱۔ شرح مسند احمد ص ۱۲۰۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ شعبانی۔

۳۔ علی بن الجعد حدیث کے مشہور امام ہیں۔ امام بخاری اور ابوداؤد کے استاد ہیں اور حدیث میں جیسے ابن ابی ذئب
 اور شعبہ کے شاگرد ہیں ایسے ہی قاضی ابویوسف سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے اور قاضی صاحب کے اصحاب میں
 سے ہیں۔ ان کا پورا نام ابوالحسن علی بن الجعد الجوهری ہے ان کی حدیث دانی کا اندازہ کرنا ہو تو مشہور محدثین حمزہ احمد
 اسحاق بن راہویہ اور یحییٰ بن معین کا یہ اتفاق فیصلہ پڑھیے۔ امام حمزہ کہتے ہیں کہ ہم چاروں ایک روز ان کے

امام مسلم، امام ابو داؤد اور امام ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان سے کافی روایات لی ہیں اور امام اعظم کے مسابہ میں بھی ان کے حوالہ سے احادیث آتی ہیں۔

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ شَيْبَانَ عَنْ يَحْيَى عَنْ الْمُهَاجِرِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ
قَالَ تَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ
الْعَمَّتِ وَالْوَصَالِ -

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے چپ رہنے اور ہمیشہ کے روزے سے منع فرمایا ہے۔

یہی روایت بحوالہ عکرمہ الحافظ الحارثی بخاری نے بھی اپنے مسند میں بیان کی ہے۔

الحکم بن عتیبہ سے امام اعظم کا تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کو شیخ الکوفہ لکھا ہے۔ قاضی شریح، ابو وائل، ابراہیم نخعی، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اور سعید بن جبیر سے علم حدیث پڑھا ہے۔ خلاصہ میں ان کو احادیث اعلام بتایا ہے۔ امام اوزاعی، امام مسعر بن کدام، حمزہ الزیات، امام شعبہ اور ابو عوانہ نے خلاصہ میں امام اعظم کو ان کا شاگرد قرار دیا ہے ان کے بارے میں سفیان بن عیینہ کا تاثر یہ تھا کہ حکم اور حماد جیسا کوئی نہیں ہے۔ ائمہ اربعہ حدیث نے اپنی کتابوں میں ان کی سند سے حدیثیں لی ہیں۔ امام اعظم نے بھی ان کے حوالہ سے ایک سے زیادہ روایات لی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابراہیم نخعی سے احادیث میں حکم سے زیادہ پائیدار

صفحہ ۲۱۱ کا بقیہ حاشیہ :- در دولت پر حاضر ہوئے آپ اپنی کتابیں لے آئے اور واپس اندر چلے گئے ہمیں خیال ہے کہ کھانا لینے گئے ہیں ہمیں ان کی کتابوں میں کوئی غلطی نہیں ملی، کھانے سے فراغت کے بعد کتابوں میں در شدہ ساری احادیث ہمیں زبانی سنا دیں۔ محدث خوارزمی فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ امام اعظم جب حدیثیں پیش کرتے ہیں وہ موتی کی طرح ابداً ہوتی ہیں۔ (ج ۲ ص ۳۰۸) اگرچہ بخاری، ابو داؤد، اور مسلم سب ہی کو ان کے سامنے زانوئے ادب کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے مگر افسوس کہنا پڑتا ہے کہ امام مسلم اپنی صحیح میں حدیث ان اس لیے نہیں لی ہے کہ یہ بزرگ ان لوگوں میں سے تھے جو خلق قرآن کے مسئلہ میں متشددین ہیں نہ؟ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کا کہنا تھا کہ مَنْ قَالَ الْقُرْآنُ مَخْلُوقٌ لَعْنَةُ عَنُفٍ اُسی بنا پر ان پر بدعتی ہونے کی تہم لگائی گئی ہے۔ لے کتاب الآثار

کوئی نہیں ہے۔ امام ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ حکم یہ روایت درج کی ہے :

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنِ الْحَكَمِ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مَخِيَمَةَ عَنْ شَرِيحٍ
أَنَّهُ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنِ الْمَسِيحِ فَقَالَ سَلْ عَلَيْهَا فَإِنَّهُ
كَانَ يُسَافِرُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلْتُ عَلَيْهَا
فَقَالَ امْسُحِي -

شریح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے منوروں پر مسح کے بارے میں
پوچھا فرمایا کہ حضرت علیؓ سے پوچھو وہ حضور النورؐ کے رفیق ہوتے تھے۔
میں نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا فرمایا کہ مسح کر لو۔

الامام الحافظ ابو محمد حارثی اپنے مسند میں ایک سے زیادہ حدیثیں لاتے ہیں :

أَبُو حَنِيفَةَ عَنِ الْحَكَمِ بْنِ عَتِيْبَةَ عَنِ الْقَاسِمِ عَنِ
شَرِيحٍ عَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ
قَالَ يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ -
حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رضاعت سے وہ سب رشتے
حرام ہیں جو قرابت سے حرام ہیں۔

کوفہ کے سب اساتذہ کا استقصاء منظور نہیں ہے صرف بطور گلے از گلزار چند کا تعارف
بدیہ ناظرین ہے ان کے علاوہ کوفہ کے جن محدثین سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے۔ ان میں سے
خاص خاص کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ اسماعیل بن خالدؒ، بیان بن بشر، جامع بن ابی راشدؒ،
جامع بن شداد الحارثیؒ، الحسن بن سعد بن معبدؒ، زید بن ابی ایسہؒ، زیاد بن علاقہؒ،
سہیلؒ، زیاد بن حذیر الاسدیؒ، ابو عبد الرحمنؒ، سعید بن مسروقؒ، سلمہ بن کہیلؒ،
سلیمان بن ابی سلیمانؒ، سماک بن حربؒ، عبد الملک بن عمیرؒ، ابو الحارث علقمہؒ،
بن مرثدؒ، ابو رزق عطیہ بن الحارث الہمدانیؒ، عبد الرحمن بن عبد اللہؒ، ابو عبد اللہؒ،
عون بن عبد اللہؒ، عتبہ بن عبد اللہ بن عتبہؒ، قاسم بن عبد الرحمنؒ، منصور بن
المعتمرؒ، منصور بن دینارؒ، یزید بن عبد الرحمن ابو داؤدؒ، خالد بن علقمہؒ،

زکریا بن ابی زائدہ رحمہ اللہ

حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان سب کا ترجمہ لکھا ہے۔ مسانید امام اعظم میں ان سب سے روایات موجود ہیں۔

امام اعظم کا طلب علم کے لیے سفر

اس میں شک نہیں ہے کہ امام اعظم کے اپنے گھر میں اتنا ذخیرہ وافر تھا کہ اگر صرف اسی جگہ کا علم حاصل کرتے تو علم میں کمی نہ آتی۔ امام یحییٰ بن معین جو سید الحفاظ اور ناقہ دفن کہلاتے ہیں۔ کوفہ کے مشہور امام مسعر بن کدام کے متعلق فرماتے ہیں کہ

لَمْ يَزُحَلْ مِسْعَرٌ فِي حَدِيثٍ قَطُّ رحمہ اللہ

لیکن اس کے باوجود صرف کوفہ ہی رہ کر علم حدیث میں ان کی معلومات کا حال یہ تھا کہ امام شعبہ جیسا امام حدیث ان کو علم حدیث کی ترازو کہتا تھا اور محمد بن بشر کہتے ہیں کہ میں نے ان کے دس کم ایک ہزار حدیثیں لکھی ہیں یہ صحابہ و تابعین اگرچہ تمام اسلامی شہروں میں گتے ہیں مگر روایت و حدیث کے باب میں جو مرکز بیت کوفہ اور مکہ و مدینہ کو حاصل تھی وہ دوسرے شہروں کو نہ تھی۔ حافظ ابن عبد البر نے بسند متصل امام ابن وہب کی زبانی نقل کیا ہے کہ ایک بار امام مالک سے کسی نے مسئلہ پوچھا۔ آپ نے اس کا جواب دیا اس پر پوچھنے والے کے منہ سے نکل گیا کہ شام والے تو اس مسئلہ میں کچھ اور ہی بتاتے ہیں اور آپ کے خلاف ہیں۔ آپ نے فرمایا متی کَانَ هَذَا الشَّانُ فِي الشَّامِ؟ شام والوں کو یہ مقام کب سے ملا ہے؟ اِنَّمَا هَذَا الشَّانُ وَقَفَّ عَلَى أَهْلِ الْمَدِينَةِ وَأَهْلِ الْكُوفَةِ يَهْ شَانُ تَوْصِفُ كُوفًا وَرَدِينَةً كِي هِيَ۔ شاید اسی لیے امام مالک نے بھی کبھی طلب علم کے لیے سفر نہیں کیا کیونکہ مدینہ دارالعلم تھا۔ اس کے باوجود امام اعظم نے حدیث کی خاطر رخت سفر باندھا تا کہ آپ کے خزانہ علمی میں صرف مقامی نہیں بلکہ بیرونی معلومات کا بھی سرمایہ ہو۔

۱۔ تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ

۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۸

۴۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۸

علم کی خاطر اسلام میں سفر کی اہمیت

علم دین حاصل کرنے کے لیے جو سفر کیا جاتا ہے اسے رحلہ کہتے ہیں۔ قرآن و سنت میں اس مبارک سفر کی بہت زیادہ ترغیب ہے۔

ارشاد ہے :

فَلَوْ لَا نَفَرٌ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لَتَفَقَّهُوا
فِي الدِّينِ وَلَيُنَذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ
پھر کیوں نہ نکلیں ان کی ہر جماعت میں سے چند لوگ تاکہ تفقہ پیدا
کریں دین میں اور تاکہ لوگوں کو بیدار کریں جب پلٹ کر جائیں یہ

۱۔ یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے اس میں صرف یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ علم دین حاصل کرنا بھی بات ہے اور اس کے لیے سفر کی مختلف بر داشت کرنا ایک امر مستحب ہے کیونکہ یہ تو اس آیت کا ظاہر ہے چنانچہ ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں انما يقتضى ظاهر هذه الآية الحث على طلب العلم والندب اليه واستحباب الرحلة (ج ۱ ص ۷۲۱) یعنی آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ علم کی طلب گامی میں ہر شامی ہونی چاہیے اور اس کی خاطر سفر مستحب ہے اور ساتھ ہی اس آیت کے منطوق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں دین سیکھنے کا کام ضرور ہونا چاہیے فی هذه الآية دليل على طلب العلم (ج ۱ ص ۱۹۸) لیکن دین سیکھنے کا یہ بوجھ سب پر نہیں ہے ان الخرج فی طلب العلم لا يلزم الاعيان۔ طلب علم کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا سب کے ذمہ نہیں ہے بلکہ کچھ کے ذمہ ہے۔ سیکھنے کے بعد جو سیکھ کر آئیں ان کا کام اس آیت میں لوگوں کو بیدار کرنا (انذار بتایا ہے یعنی پوری جماعت کی پیش پا افتادہ شہری زندگی میں رہنمائی کا فرض انجام دیں اور جن کی دینی زندگی میں رہنمائی کریں۔ وہ ان کی طاعت کریں الانذار يقتضى فعل المأمور به والالہدیکن انذاراً انذار حکم کی تعمیل چاہتا ہے ورنہ انذار ہی نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۱۹۹) اسی آیت سے دین اُشناؤں کے لیے صدر اول ہی میں فقہا کی تعبیر پیدا ہو گئی تھی۔ امام ترمذی نے لکھا ہے کہ الفقهاء اعلیٰ بمعانی الاحادیث حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ طائفہ لغت میں ایک شخص کو بھی کہتے ہیں ابوبکر بن العربی نے شیخ ابو الحسن اور قاضی ابوبکر کی بھی یہی رائے لکھی ہے اگر یہ صحیح ہے تو آیت کے مدلول سے نہ صرف تعلیم شخصی کا جواز بلکہ وجوب بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حدیث ثبر و احد ہونے کی صورت میں دین میں حجت اور واجب العمل ہے۔ الجصاص کہتے ہیں فیہ دلالۃ علی لزوم خبر الواحد (ج ۳ ص ۱۹۸)

قرآن کی اس آیت میں جس مقصد کی خاطر رختِ سفر تیار کرنے اور گھر سے بے گھر ہونے کا حکم دیا گیا ہے وہ دین میں تفقہ ہے اسی کو علم الشریعہ، علم الفقہ اور علم قانون کہتے ہیں۔ علومِ شرعیہ میں علم فقہ کا مقام بالکل انتہائی اور آخری ہے۔ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں کہ یہ آیت فقہانیت کی تلاش کے لیے ہے۔ قرآن میں جس موقع پر یہ آیت آئی ہے وہاں جہاد کا تذکرہ ہے جہاد اور طلبِ فقہ میں مناسبت جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ طالبِ فقہ اور مجاہد دونوں کا نکلنا اللہ کی راہ میں نکلنا ہے اور دونوں کا مقصد اللہ کے دین کی برتری ہے چنانچہ ترمذی میں ارشادِ گرامی ہے۔

مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى يَرْجِعَ
جو شخص علم کی تلاش میں نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہے۔

حدیث اور فقہ کا باہمی تعلق

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی زبان میں اور صحابہ کرام کے محاورات میں علم نام ہی فقہ کا ہے یعنی صدرِ اول میں علم کے نام پر جو چیز معروف تھی وہ روایتِ حدیث نہیں بلکہ فقہانیت تھی۔ حافظ ذہبی نے مذکورہ الحفاظ میں صحابہ و تابعین کا علمی تعارف زیادہ تر فقہانیت ہی سے کرایا ہے چنانچہ حضرت امام ربانی حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں لکھتے ہیں مِنْ نُبَلَاءِ الْفُقَهَاءِ (ج ۱ ص ۱۲) حضرت معاذ بن جبلؓ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں مِنْ نَجَبَاءِ الْقَضَايَةِ وَفُقَهَائِهِمْ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے ترجمہ میں ہے أَقْوَدُ أَهْلِ الْبَصْرَةِ وَافْقَهُهُمْ، حضرت ابو الدرداءؓ کے متعلق لکھا ہے مُقَرَّبِي أَهْلِ دِمَشْقَ وَفُقَيْهِمْ، حضرت عائشہ کے بارے میں تصریح ہے مِنْ الْكِبَرِ فَقَهَاءِ الْقَضَايَةِ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق ہے۔ الْفَقِيهُ الْمَدَنِي، حضرت جابرؓ کے ترجمہ میں لکھا ہے الْفَقِيهُ الْمَقْنِي۔ اس طبقہ اولیٰ میں سارے صحابہ میں دو کو مستثنیٰ کر کے کسی ایک کا بھی تعارفِ تحدیث و روایت کے ذریعے نہیں کرایا۔ دوسرے میری مراد حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ رَوَى حَدِيثًا كَثِيرًا، ورنہ کسی بھی صحابی کا علمی چہرہ پیش کرتے ہوئے حدیث کا نام تک نہیں لیا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ فقہ علومِ شرعیہ کا آخری درجہ ہے۔

فقہ اور حدیث میں باہمی ربط کیا ہے؟ یہ بات شاہ ولی اللہ محدثؒ کی زبانی سنئے۔ شاہ صاحب علم الحدیث کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں :

علم الحدیث کے کچھ طبقات اور اس میں فن کاروں کے کچھ مراتب ہیں۔
 علم حدیث کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ چھلکے اور سیپی کا ہے اور دوسرا
 درجہ مغز اور موتی کا ہے۔ علمائے دو فلوں کی خدمت کی ہے علم حدیث
 میں چھلکے اور سیپی کے درجے کی چیز حدیثوں کو صحت و ضعف، غرابت
 اور شہرت کی حد تک جاننا ہے یہ خدمت محدثین نے سرانجام دی ہے
 علم حدیث ہی کا ایک فن یہ بھی ہے کہ اس کے معافی شرعیہ کو سمجھا جائے
 اس سے احکام جزئیہ مستنبط کیے جائیں۔ عبارت، دلالت، اشارہ و مفہوم
 کی بنا پر منصوص حکم پر غیر منصوص کو قیاس کیا جاتے منسوخ و محکم، مرجوح
 و مبرم کا پتہ لگایا جاتے حدیث کا یہ فن موتی اور مغز کی حیثیت رکھتا
 ہے اس فن کی خدمت کرنے والے فقہاء اور مجتہدین ہیں۔

علامہ خطابی نے حدیث وفقہ میں اس سے بھی زیادہ لطیف ربط بتایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ
 حدیث وفقہ میں باہم وہی تعلق ہے جو مکان کی دیواروں اور اس کی بنیاد میں ہوتا ہے۔ فقہ
 حدیث کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے، لکھتے ہیں :

حدیث کی حیثیت مکان کی اساس و بنیاد کی ہے اور فقہ اس بنیاد
 پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے جو عمارت بغیر بنیاد کے بنائی جاتے
 اس میں استحکام نہیں ہوتا اور صرف بنیادیں بغیر عمارت کے خراب
 اور چٹیل میدان ہوتا ہے۔

ابوبکر الحارمی نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ :

احادیث میں ایک دوسری کو باہم ترجیح دینا یہ فقہاء کا کام ہے کیونکہ
 ان کا پیش نہاد احادیث میں احکام کو ثابت کرنا ہوتا ہے اور اس
 موضوع پر ان کی جولانگاہ کی وسعتیں اور پہنائیاں بے حد ہیں۔

الغرض اس آیت میں علم کی خاطر رخت سفر باندھنے کا حکم ہے اور اس کا جیسا مجتہد

اور فقیہہ مخاطب ہے ایسا ہی محدث بھی ہے کیونکہ قرآن و حدیث ہی فقہ کا سرچشمہ اور مرکز ہیں۔
 قرآن میں علم کی خاطر حضرت موسیٰ کے سفر کا تذکرہ ہے چنانچہ امام بخاری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام
 کے سفر علمی کے لیے اپنی صحیح میں ایک مستقل عنوان قائم کیا اور عنوان کی بنیاد ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام
 کی اس درخواست پر رکھی ہے جو اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں نقل کی ہے۔
 هَلْ أَتَبَعَكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَ مَعًا عَلَّمْتَ رُشْدًا ۖ
 کیا میں تیرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے
 کچھ جو تجھ کو سکھلاتی ہے بھلی راہ۔

صرف اسی باب پر امام بخاری نے اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد امام صاحب نے ایک اور باب
 الخروج في طلب العلم کے عنوان سے قائم کیا ہے اور دونوں میں ایک حدیث یعنی حضرت موسیٰ
 علیہ السلام کا بھی واقعہ کہ آپ نے طلب علم کے لیے مجمع البحرین کا سفر کیا نقل کیا ہے۔ اور ان دو بابوں
 کے بعد پھر اعتبار علم و حکمت کا عنوان لائے ہیں گویا ان دونوں عنوانوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام
 کے سفر علمی کا تذکرہ چھڑ کر امام بخاری یہ ترغیب دے رہے ہیں کہ طلب علم کی راہ میں کسی حال میں
 کسی مشقت سے مرنے نہ پھیرنا چاہیے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سیادت و نبوت کے مقامِ عالی
 پر پہنچنے کے باوجود بھی طلب علم کے لیے سفر کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:
 لِأَنَّ مُوسَىٰ لَمْ يَنْفَعَهُ بُلُوغُهُ مِنَ السِّيَادَةِ الْمَحَلِّ الْأَعْلَى
 مِنْ طَلَبِ الْعِلْمِ وَرُكُوبِ الْبَحْرِ وَالْبَرِّ لِأَجْلِهِ ۖ

اے لیکن یاد رہے کہ حدیث اور روایت حدیث دو الگ الگ چیزیں ہیں جیسے قرآن اور روایت قرآن الگ الگ
 ہیں فقہ کی بنیاد قرآن ہے نہ کہ روایت قرآن۔ ایسے ہی اساس و بنیاد کی حیثیت میں فقہ کا مدار و مرکز حدیث
 ہے نہ کہ روایت حدیث۔ یہی مطلب ہے۔ امام ابن الما جشون کے اس بیان کا جو حافظ ابن عبد البر نے جامع
 بیان العلم میں عبد الملک بن حبیب کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ فقہ میں وہ شخص
 امام نہیں ہو سکتا جو علم قرآن اور حدیث و آثار کے متون نہ جانے اور ان کے معانی پر قابو نہ پائے جنہوں
 انور کے ایک ارشاد کے مختلف طرق چند در چند سندیں محفوظ رکھنا روایت و اسناد ہے اور زمانہ فتن میں
 ضرورت کے تحت رونما ہوتی ہے۔ حدیث پہلے سے بھی موجود تھی اور آج بھی موجود ہے۔

۱۵، سورہ کہف۔ کہ فتح الباری ج ۱ ص ۴۷۔

حضرت موسیٰ کا امامت کے بزرگترین مقام پر پہنچنا طلب علم اور اس کی خاطر
بحری و بری سفر سے مانع نہیں ہوا ہے۔

امام مسلم نے صحیح میں حضرت ابو ہریرہ کی زبانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے
مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًا
إِلَى الْجَنَّةِ يَه

ترمذی میں حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے
مَنْ حَاجَّ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى يَرْجِعَ -
جو بھی طلب علم کے لیے نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہے
ابوداؤد میں کثیر بن قیس کی زبانی یہ واقعہ آیا ہے :

کثیر بن قیس کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک
شخص آیا اور بولا کہ اے ابوالدرداء! میں آپ کے پاس مدینۃ الرسول
سے آیا ہوں اور آیا بھی صرف اس لیے ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بیان کرتے ہیں۔
میرے آنے کا مقصد صرف یہ ارشاد گرامی سننا ہے اور کوئی ضرورت
نہیں ہے۔ ابوالدرداء نے فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لے حافظ ابن رجب فرماتے ہیں کہ تلاش علم کی خاطر چلنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ فی الواقع چلے اور
علمی مجلسوں میں شرکت کرے اور دوسرے یہ کہ وہ راہ اختیار کرے جو حصول کا ذریعہ ہو مثلاً یاد کرے یا ہم مل کر
کرے، مذاکرہ اور مطالعہ میں مشغول رہے، لکھے اور سمجھے اور اس کے علاوہ جو بھی علم کے حصول کا طریق
ہو اسے اپناتے۔ پہلے چلنے کو حقیقی اور دوسرے کو معنوی کہتے ہیں۔ ارشادِ نبوت میں دونوں داخل
ہیں (جامع العلوم والحکم ص ۲۹۹) اور یہ جو فرمایا ہے کہ اللہ پاک اس کی برکت سے جنت کا راستہ آسان فرمادے گا تو اس کا
مطلب بھی یہی ہے کہ طلب علم میں اگر رضائے الہی مقصود ہوگی تو اللہ پاک طالب علم کے لیے علم سے انتفاع اور اس پر
عمل آسان فرمائے گا اور یہی اس کے مدلول میں داخل ہے کہ اس کی برکت سے دوسرے علوم بھی آسان ہو جائیں گے
اور یہ علوم بھی جنت کا ذریعہ ہوں گے قرآن عزیز میں اس کی شہادت ہے وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادْهُمْ هُدًى
وَاتَّاهَمُ تَقْوَاهُمْ۔ (جامع العلوم والحکم ص ۳)

سے سنا ہے کہ جو شخص طلب علم کی خاطر راہ چل کر آئے اللہ پاک اس کو جنت کے راستہ پر چلائے گا اور اللہ کے فرشتے طالب علم کی خاطر اپنے بازو بچھاتے ہیں اور آسمان و زمین والے تانکے سمندر کی گہرائی میں مچھلیاں اس کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہیں۔ عالم عابد پر ایسی ہی برتری رکھتا ہے جیسے چودھویں رات کا چاند عام ستاروں پر، اور علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء نے میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑے ہیں بلکہ انبیاء کی میراث تو علم ہے جو اسے لیتا ہے خوب لیتا ہے۔

امام بخاری نے اپنی مشہور کتاب الادب المفرد میں، امام احمد نے اپنے مسند میں اور حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں بحوالہ عبد اللہ بن محمد بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ ت حابر بن عبد اللہ کا طلب علم کے لیے سفر اختیار کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے :

مجھے ایک صاحب کے متعلق اطلاع ملی ہے۔ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے۔ میں نے فوراً اونٹ خریدا اس پر کجاوہ کسا اور ان صاحب کی طرف ایک ماہ کا سفر اختیار کر کے سیدھا ملک شام پہنچا۔ یہ صاحب عبد اللہ بن انیس تھے۔ میں نے ان کے دربان سے کہا کہ جا کر کہو جابر دروازے پر کھڑا ہے۔ انہوں نے سنتے ہی پوچھا کیا ابن عبد اللہ! میں نے کہا کہ ہاں فوراً باہر تشریف لائے اور مجھ سے بغلیگر ہوتے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک حدیث کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ آپ نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری زندگی ایسی حالت میں ختم نہ ہو جائے کہ میں حضور انور کے ارشاد گرامی سے محروم رہوں۔ اس کے بعد عبد اللہ بن انیس نے وہ حدیث بیان کی۔ یہ حدیث آخرت میں قصاص سے متعلق ہے۔

ابو داؤد میں حضرت عبد اللہ بن بریدہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ :

ایک صحابی ایک حدیث کی خاطر سفر کر کے فضالہ بن عبیدہ کے پاس گئے
یہ اس وقت اپنی اونٹنی کو چارہ ڈال رہے تھے دیکھتے ہی بولے مرحبا!
مسافر صحابی نے کہا میں ملاقات کے لیے نہیں بلکہ ایک حدیث کی خاطر
آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے وہ حدیث سنی ہے۔ فضالہ
نے پوچھا وہ کون سی حدیث ہے؟ میں نے کہا کہ فلاں حدیث جس
میں یہ ہے۔

امام دارمی نے بسند صحیح بسیر بن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ میں صرف ایک حدیث کی خاطر
شہر شہر کا سفر کرتا تھا حضرت سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ میں ایک ایک حدیث کے لیے دن رات
چلتا تھا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اسلام میں علمی سفر کا مقام بہت بلند ہے اور اس کے فضائل بے شمار
ہیں اور قرآن حکیم کی اس ترغیب کی وجہ سے اس کا رواج صدر اقل میں ہو چکا تھا۔ امام شافعی کے
حدود سفر میں حافظ ابن حجر نے توالی التالیس میں حسب ذیل مقامات بتاتے ہیں۔ مدینہ، یمن،
عراق اور مصر، امام احمد نے طلب حدیث کے لیے کوفہ، بصرہ، شام اور جزیرہ کا سفر کیا ہے۔
امام ابو یوسف نے عراق، حجاز، شام اور دیگر ممالک کے بہت سے اساتذہ کے سامنے زانو سے
ازب تر کیا ہے۔ امام محمد نے کوفہ، بصرہ، مکہ، شام اور بلاد عراق میں جا کر حدیث سنی تھی۔
حافظ ذہبی نے مناقب میں خود امام محمد کی زبانی نقل کیا ہے کہ والد محترم نے تیس ہزار درہم چھوڑے
تھے ان میں سے میں نے پندرہ ہزار سخا اور شعر کی تحصیل پر خرچ کیے اور باقی پندرہ ہزار حدیث و
فقہ کی تکمیل پر۔

بہر حال علم حدیث کے لیے سفر کرنا اور اس کی دھن میں ملک ملک پھرنا سلف کا معمول تھا۔
اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے خلف بن ایوب سے ایک مسئلہ دریافت کیا وہ کہنے لگے،

۱۔ مناقب احمد ص ۲۲، ۲۔ حسن التقاضی ص ۵۴، ۳۔ نیل الامانی ص ۶، ۴۔ مناقب ذہبی ص ۵۴
۵۔ حضرت خلف بن ایوب اہل بلخ کے امام اور بہت بڑے فقیہ اور محدث تھے حافظ ذہبی نے آپ کا تذکرہ
ان الفاظ سے شروع کیا ہے احدثا الفقہاء الاعلام محدث حاکم نے ان کو فقیہ بلخ اور حافظ خلیلی نے
صدوق مشہور لکھا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ سلطان بلخ آپ کی زیارت کے لیے آئے تو آپ نے منہ
(باقی ص ۲۲۲ پر)

مجھے تو معلوم نہیں ہے نووارد نے کہا کہ پھر کسی ایسے شخص کا مجھے پتہ بتائیے جسے یہ مسئلہ معلوم ہو، فرمایا: ایسے تو حسن بن زیاد ہیں جو کوفہ میں ہیں۔ اس پر پوچھنے والے نے کہا کہ کوفہ تو بہت دور ہے۔ امام خلف بن ایوب نے فرمایا کہ مَنْ هُمُ الدِّينُ قَانُكُوسَتَهُ لَيْسَ قَرِيبَةً یعنی جسے دین کی فکر ہو اس کے لیے کوفہ نزدیک ہے اسی بنا پر اصول حدیث کی کتابوں میں اس علمی سفر کے لیے خاص خاص ہدایات آتی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

رحلت یہ ہے کہ اپنے شہر کی حدیثوں کو پہلے معلوم کرے اور ان کو یاد کرے پھر دوسرے شہروں کا سفر کرے سفر میں وہ کچھ حاصل کرے جو اس کے پاس نہ ہو۔

امام اعظم نے جب علم حدیث پر توجہ کی تو اسی قاعدے کے مطابق سب سے پہلے اپنے شہر کے

لے شرح الفکر ص ۴۰۔

ص ۲۴۱ کا بقیہ حاشیہ:- پھر لیا۔ امام حاکم نے لکھا ہے کہ آپ نے فقہ کی تعلیم قاضی ابویوسف اور ابن ابی لیلیٰ سے حاصل کی اور زہد و تصوف حضرت ابراہیم بن ادہم سے حاصل کیا امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں خلف بن ایوب کے حوالہ سے یہ حدیث لکھی ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى خَلْفَ إِمَامٍ فَإِنْ قَرَأْتَهُ لَكَ قِرَاءَةٌ۔

حافظ ابن حبان نے کتاب التقات میں ان کا ذکر کیا ہے اور حاکم نے تاریخ نیشاپور میں ان کا منفصل ترجمہ لکھا ہے۔ حدیث کا سماع آپ کو امام ابویوسف، امام محمد، امام زفر اور ابن ابی لیلیٰ کے علاوہ عوف اعرابی، قیس بن الربیع، اسرئیل بن یونس، اسد بن عمرو، جریر بن عبد الحمید اور دیگر علماء کی ایک جماعت سے حاصل ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل، ابوکریب اور بہت سے اکابر محدثین نے آپ کے سامنے زانوے ادب طے کیا ہے امام حاکم لکھتے ہیں کہ آپ تسلسلہ میں نیشاپور تشریف لائے تو ہمارے یہاں کے مشائخ نے آپ حدیثیں لکھیں۔ آپ کے شاگردوں میں امام احمد کے علاوہ ربیع المحدثین، یحییٰ بن معین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امام ترمذی نے بھی اپنی سنن میں ابوکریب محمد بن العلاء کے حوالہ ایک حدیث نقل کی ہے مگر افسوس کہ امام ترمذی کو حضرت خلف کے حالات کا علم نہ ہو سکا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے حافظ ابن حزم اپنی جلالۃ قدر کے باوجود امام ترمذی سے ناواقف ہیں فقط سخاوی نے الاعلان بالتوسیخ میں لکھا ہے کہ ابن حزم صرف ترمذی سے نہیں بلکہ مشہور امام ابوالقاسم بغوی، اسماعیل الصغیر، ابوالعباس اللصم سے بھی نا آشنا ہیں جیسا امام ترمذی کو ابن حزم کا نہ جاننا کوئی قیمت نہیں رکھتا ایسے ہی ترمذی کی خلف بن ایوب سے ناواقفیت بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔

ساتذہ فن کے سامنے زانوے ادب تہ کیا اور ایک عرصہ تک وطن عزیز ہی میں تحصیل علم میں مصروف رہے اور جن جن اساتذہ سے کوفہ میں استفادہ کیا اس کا ایک دھندلا سا خاکہ آپ کے سامنے اچکا ہے جب آپ کوفہ سے سیراب ہو چکے تو دوسرے مقامات کا رخ کیا۔

رحلتِ علمیہ کی تاریخ

امام عظیم کی رحلتِ علمیہ کی تاریخ تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ جامع بیان العلم و فضلہ میں حافظ ابن عبد البر نے خود امام صاحب کا جو بیان درج کیا ہے اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلا سفر اپنے والد محترم کی معیت میں مکہ کا کیا ہے اور اسی سفر میں آپ کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارث سے ملاقات ہوتی ہے اس میں تصریح ہے: میری عمر سولہ سال تھی کہ میں نے ۹۶ھ میں اپنے والد کی ہمراہی میں حج کا سفر کیا۔

حج اس زمانے میں افادہ و استفادہ کا سب سے بڑا ذریعہ تھا کیونکہ ممالک اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے بڑے بڑے اہل کمال حرمین میں اکٹرا کر جمع ہوتے تھے اور درس و افتاء کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ابوالحسن مرغینانی نے بسند متصل نقل کیا ہے کہ امام عظیم نے ایک بار نہیں بلکہ ۵۵ بار حج کیا، نیز آپ نے طلب علم کی خاطر بصرہ کا بیس مرتبہ سے زیادہ سفر کیا ہے اور اکثر پورا پورا سال وہاں قیام بھی کیا ہے۔

ان تاریخی روایات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طلب علم کی خاطر مکہ، مدینہ اور بصرہ کا سفر کیا ہے لیکن آغاز سفر کے بارے میں جامع بیان العلم کی روایت کے علاوہ کوئی مثبت تصریح نہیں ہے اس لیے قیاس یہی ہے کہ آغاز اگرچہ ۹۶ھ میں ہو چکا تھا مگر ان علمی سفروں میں باقاعدگی اور تسلسل ۱۰۱ھ کے بعد ہوا ہے۔ ایسا فغی کی تصریح کے مطابق امام شعبی کا سال وفات ۱۰۱ھ ہے۔ اسی کے بعد آپ نے سفر کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا ہے کیونکہ آپ یہ پہلے سن چکے ہیں کہ امام صاحب امام حماد کے پاس علم الشرائع کی خاطر اٹھارہ سال رہے ہیں امام حماد کی تاریخ وفات ۱۰۲ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام عظیم نے ۱۰۲ھ سے

مسلل علمی سفر کیے ہیں اور آخر عمر تک حج سے تو کوئی سال بھی خالی نہیں ہے کیونکہ اگر آپ نے ۵۵ حج کیے ہیں جیسا کہ امام ابو الحسن مرغینانی نے بیان کیا ہے تو پہلا حج ۹۳ھ میں ہی آتا ہے اور یہ وہی حج ہے جب آپ اپنے والد محترم کے ساتھ پہلی بار حج کو تشریف لے گئے ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارث کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں اس کے بعد آپ کی عمر کا کوئی سال بھی حج سے خالی نہیں ہے۔

اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے امام لیث بن سعد کی ملاقات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ :

امام لیث فرماتے ہیں کہ میں امام اعظم کی شہرت سنتا تھا ملنے کا بے حد مشتاق تھا۔ حسن اتفاق سے مکہ میں اس طرح ملاقات ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک شخص پر ٹوٹے پڑے جا رہے ہیں۔ مجمع میں میں نے ایک شخص کی زبان سے کلمہ سنا کہ اے ابو حنیفہ! میں نے جی میں کہا کہ لو تمنا برآئی یہی امام ابو حنیفہ ہیں۔

تذکرۃ الحفاظ میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ امام لیث بن سعد انیس سال کی عمر میں حج کو تشریف لے گئے اور یہ بھی بتایا ہے کہ امام لیث کی اکاسی سال عمر تھی۔ ۳۱ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ یہ ان کا ملاقاتی حج ہے ورنہ اس کے بعد بھی صرف امام اعظم کی ملاقات ہی کے لیے لیث بن سعد حج کو گئے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ حافظ ابو محمد الحارثی بسند متصل فقیہ مصر عبدالرحمن بن القاسم کی زبانی نقل کرتے ہیں :

میں نے لیث بن سعد سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ مجھے ایک بار امام اعظم کا برائے حج ارادے کا علم ہوا میں صرف امام اعظم سے ملاقات کی خاطر حج کو گیا۔ مکہ میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے آپ سے مختلف عنوانوں پر بہت سے مسائل دریافت کیے۔ میں نے آپ سے دیوانی و فوجداری مسائل میں قتل خطا اور شبہ عمد کے بارے میں پوچھا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ انیس سال کی عمر میں یعنی ۳۱ھ میں امام لیث نے پہلا حج کیا ہے جیسا کہ

امام ذہبی نے لکھا ہے ^۱ اور امام اعظم کو اس موقع پر اس طرح پایا کہ
النَّاسُ مُتَقَصِّفُونَ عَلَيْهِ، لوگ اُن پر لٹے پڑے ہیں۔

اور بعد کو نام لینے پر معلوم ہوا کہ یہی امام اعظم ہیں۔
۳۱۰ھ میں ہجوم کا یہ ٹوٹا پڑنا بتا رہا ہے کہ یہ امام اعظم کا پہلا سفر منہیں ہے بلکہ اس سے پہلے
متعدد بار اچکے ہیں اور ذات گرامی جانی پہچانی ہے ورنہ ایک اجنبی کے گرد یہ ہجوم کہاں ہوتا ہے
اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ آپ نے امام شعبی کی وفات کے بعد حجوں کا لگاتار سلسلہ شروع
کر دیا تھا اور امام لیث نے تو یہ بات جلوت کے متعلق بتائی ہے کہ:
سَأَيُّتُ النَّاسَ مُتَقَصِّفِينَ عَلَيْهِ۔

مگر امام ابو عاصم النبیل نے جو مکہ ہی کا واقعہ بتایا ہے اس میں تو بات یہاں تک کھول دی
ہے کہ لوگوں کی عقیدت امام اعظم کو مکہ میں صرف جلوت ہی میں منہیں بلکہ گھر کی خلوت میں بھی چین
سے منہیں بیٹھنے دیتی تھی اور صرف اصحاب حدیث منہیں بلکہ ارباب فقہ کا بھی آپ کے ارد گرد ہجوم
رہتا تھا چنانچہ امام ابو جعفر طحاوی نے بکاذ بن قتیبہ کے حوالہ سے امام ابو عاصم کی زبانی نقل کیا ہے کہ
ہم مکہ میں امام اعظم کے پاس رہتے تھے آپ کے پاس ارباب فقہ اور
اصحاب حدیث کا ہجوم ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا کوئی شخص منہیں
ہے جو صاحب خانہ کو کہہ کر ہم سے ان لوگوں کو ہٹواتے ہے

اس سے ایک طرف اگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ امام اعظم مستقل طور پر مکہ جاتے تھے اور وہاں آپ
نے بود و باش بھی اختیار کی تھی تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں امام اعظم سے دونوں
مدرسے یکساں فائدہ اٹھاتے تھے اور امام صاحب کی علم الفقہ اور علم الحدیث دونوں فنون میں
لوگوں کو جلال و قدر کا یکساں اقرار تھا اس مقصد کی خاطر لوگ دور دور سے چل کر آتے۔
ج کے عام سفروں کے علاوہ اموی حکومت کے آخری دور میں حکومت کے جو رستم اور ظلم و

تعدی سے تنگ آکر آپ نے حجاز کا رخ کیا۔ گردری رقمطراز ہیں،
فَهَرَبَ إِلَى مَكَّةَ وَاقَامَ بِهَا سَنَةً مِائَةً وَثَلَاثِينَ۔^۲
مکہ روانہ ہو گئے اور وہاں ۱۳۰ھ تک قیام فرمایا۔

^۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸، ^۲ مقدمہ اعلام السنن ص ۲۶، ^۳ مناقب ابی حنیفہ ابن ازار ص ۲۷

اسی زمانے میں اموی حکومت کے خلاف سازش ہوتی ہے عباسیوں کے اٹھانے سے ابو مسلم نے بغاوت کرائی جب تک عباسی تحریک اموی حکومت کا خاتمہ کر کے عباسیوں کو تخت حکومت دلانے میں کامیاب نہیں ہوتی، امام اعظم حجاز ہی میں ہے اور بالآخر

قَدِمَ أَبُو حَنِيفَةَ الْكَوْفَةَ فِي نَزْوٍ مِنْ أَبِي جَعْفَرٍ الْمَنْصُورِ

امام ابو حنیفہ ابو جعفر منصور کے زمانے میں کوفہ آئے۔

اس کا حاصل یہی ہے کہ سفلح کی حکومت کا پورا زمانہ چار سال نو ماہ امام اعظم نے کوفہ سے باہر حجاز میں گزارے۔

حجاز میں امام اعظم کے مشاغل

امام اعظم کو اس زمانے کے دستور کے مطابق حجاز کے علماء محدثین سے فائدہ اٹھانے کا یہ زیریں موقع ملا اور صرف استفادے کا نہیں بلکہ حجاز میں لوگوں نے امام کو افادے کی مجلسیں قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ وزیر بن عبد اللہ کا بیان ہے :

میں نے مکہ میں یاسین زیات کو دیکھا کہ سامنے ایک جماعت ہے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں لوگو! ابو حنیفہ کے پاس آیا جایا کرو اور ان کی مجلس کو غنیمت سمجھو، ان کے علم سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ ایسا آدمی پھر بیٹھنے کے لیے نہیں ملے گا اور حلال و حرام کے ایسے عالم کو پھر نہیں پاؤ گے اگر اس شخص کو تم نے کھو دیا تو علم کی بہت بڑی مقدار کھو دو گے یہ

اسلام کے اس سب سے بڑے مرکز میں ایک ممتاز عالم، محدث یاسین الزیات کی طرف سے اس قسم کے اعلان کا اس کے سوا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا کہ امام اعظم پر مکہ میں دنیا ٹوٹ پڑے۔ الموفق نے ان کی یہ روایت نقل کی ہے :

ابو حنیفہ حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان پر خلعت کا ہجوم تھا ہر علاقے کے لوگ ہوتے تھے سب کو جواب دیتے اور فتویٰ بتاتے۔

امام عبد اللہ بن المبارک نے امام اعظم کے اس علمی افادے کے تملثے کو مکہ میں اپنی آنکھوں سے

دیکھا ہے ان کا خود بیان ہے :

میں نے حرم کعبہ میں ابو حنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں اور مشرق و مغرب
کے باشندوں کو فتویٰ دے رہے ہیں۔
امام اعظم کی اس مجلس میں کس قسم کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ یہ عبداللہ بن المبارک ہی کی زبانی سنئے :
وَالنَّاسُ يُؤْمِنُونَ بِمَا نَقُولُ

صدرالائمہ نے عبداللہ بن المبارک کے اس جملے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ
يَعْنِي الْفُقَهَاءَ الْكِبَرَاءَ وَخِيَارَ النَّاسِ
عبداللہ کی مراد یہ ہے کہ بڑے بڑے فقہاء اور بہترین لوگوں کا مجمع تھا
الغرض حجاز میں امام اعظم کی ذات گرامی سے دونوں مدرسے محدثین اور فقہاء مستفید ہو رہے تھے۔ یہ
دونوں مدرسے الگ الگ ہیں دونوں میں بڑا جوہری فرق ہے۔

محدث اور فقیہ میں فرق

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث کی زبانی آپ فقہ اور حدیث کا باہمی فرق سن چکے ہیں لیجئے۔
میرا ہے محدث اور فقیہ کا فرق بھی شاہ صاحب ہی کی زبانی معلوم کر لیجئے۔

محدث اور فقیہ میں فرق ہے۔ محدث کا کام صرف حدیث کی روایت
ہونا ہے اور اس سلسلے میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف،
محرّف ہے یا غیر محرّف، عربی زبان میں الفاظ غریبہ کے معانی کیا ہیں؟
راویوں کی لڑھی عدالت کی ترازو میں پوزی اترتی ہے یا نہیں، حدیث
کے توابع و شواہد کیا ہیں۔ حدیث اپنے بیان کرنے والوں کے لحاظ
سے شہرت اور غرابت میں کیا مقام رکھتی ہے۔ جو محدث علم حدیث
میں یہ باتیں جانتا ہے وہ ضابطہ، حافظ اور متفق کہلاتا ہے۔

فقیہ کا کام مشتبه الفاظ کی تحدید اور حدیث میں رکن، شرط اور ادب
کی تبيين کرنا ہے۔ وہ امر کے صیغوں کو دیکھ کر استحباب اور وجوب

کافیصلہ کرتا ہے۔ اور نواہی میں مکروہ اور حرام کے درجات مقرر کرتا ہے۔ وہ پیش پا افتادہ مسائل کی علتیں اور دلائل جانتا ہے اور علتوں کے لحاظ سے کسی حکم کے مطلق اور مقید ہونے کی نشاندہی کرتا ہے وہ اپنی فقہانیت کے زور سے احترازی اور اتفاقی قیود واضح کرتا ہے اور اطلاق و تقیید کی روشنی میں وہ زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں ہر موضوع پر قوانین و ضوابط کلیہ بتاتا ہے اور پھر ان قوانین سے حالات و کوائف میں اُٹھے ہوئے سوالات کا جواب دیتا ہے دلائل میں تعارض ہو تو تطبیق دینا، باہم مفاہمت کرنا، منسوخ بنانا اور تعارض کے وقت ترجیح دینا فقیہ کا کام ہے۔

اس پر تفصیلی گفتگو آئندہ اوراق میں آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ مکہ میں آپ سے استفادہ کرنے والے دونوں فنون حدیث اور فقہ میں استفادہ کرتے تھے۔ یہی حال آپ کا کوفہ میں بھی تھا کہ آپ دونوں فنون میں ایک امام کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے تھے۔ صدر الامم نے اسی سلسلے میں مکی بن ابراہیم کے متعلق لکھا ہے کہ

أَنَّهُ دَخَلَ الْكُوفَةَ وَلَنِمَ أَبَا حَنِيفَةَ وَ سَمِعَ مِنْهُ الْحَدِيثَ وَالْفِقَةَ۔

کوفہ آئے اور امام ابو حنیفہ کے پاس رہ کر ان سے حدیث و فقہ کی سماعت کی۔ اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے الرد علی البکری میں امام اعظم کو امام المحدثین والفقہاء لکھا ہے۔ بہر حال امام اعظم کے اسفار علمیہ میں سب اویسچا مقام مکہ کا ہے اور آپ نے امام شعبی کی وفات کے بعد مکہ میں رخت سفر باندھا ہے۔

حدیث اور روایت حدیث

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ تدوین حدیث کے لیے امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے شیعہ میں باقاعدہ سرکلر جاری ہوا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ ابھی حدیث میں روایت و اسناد

کا عام چرچا نہ تھا کیونکہ صحابہ اور تابعین موجود تھے اور سنن عام شہری زندگی میں رائج تھیں۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں طبقہ خامسہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اسلام اور مسلمانوں میں عزت و شوکت اور علم اپنے اوج کمال پر تھا

دین کی خاطر جدوجہد اور محنت ہو رہی تھیں اور سنتیں برسر عام تھیں۔

بدعات سرنگوں تھیں اور اعلان حق کرنے والے کافی تھے۔

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیے "والسنن مشہورۃ"، کہ اس دور میں سنن شہری زندگی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ پھیلی ہوئی سنتوں کو سمیٹنا کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس کے لیے اسناد و روایت کا سلسلہ حیدر درکار نہ تھا۔ چنانچہ قاضی ابوبکر بن حزم نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم کی تعمیل میں ایک نہیں بلکہ متعدد کتابیں لکھیں۔ حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام زہری کو بھی خاص طور پر تدوین حدیث کے کام پر سرکاری طور پر مامور کیا گیا تھا۔ امام زہری کا خود اپنا بیان ہے:

أَمَرَ نَاعِمُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ بِجَمْعِ السُّنَنِ فَلَتَبْنَا هَذَا فُتْرًا وَذَلِكَ

ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے جمع سنن کا حکم دیا ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے

امام زہری کے ان دفاتر کا معمر نے بھی تذکرہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

ولید بن یزید قتل ہوا تو امام زہری کی لکھی ہوئی تصانیف کو ولید کے خزانہ

سے جانوروں پر لا دکر لایا گیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روایت و اسناد کا فن رونما ہونے سے پہلے علم حدیث یا السنن کا

اندازہ کیا تھا؟ کیونکہ حدیث تو دراصل نبوت کے اقوال، افعال اور احوال کا نام ہے اس کے سوا

روایت و اسناد پر حدیث کا اطلاق محدثین کی اپنی اصطلاح ہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں:

بجذا طلب حدیث، حدیث سے الگ ہے کیونکہ طلب حدیث تو چند

در چند امور زائدہ کے لیے ایک عرفی نام ہے اور یہ امور زائدہ ماہیت

حدیث سے الگ ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ اس موقع پر بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں:

لوگوں کو یہ پتہ نہیں ہے کہ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا

ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی روایت کی وجہ سے صحیح ہوئی ہے نہیں ہرگز نہیں بلکہ بخاری و مسلم کی احادیث کو روایت کرنے والے اور بھی بے شمار علماء محدثین ہوئے ہیں بخاری و مسلم سے پہلے اور بعد میں ان احادیث کو بیان کرنے والے روایت کرنے والے ان گنت لوگ ہوئے۔ اگر بخاری و مسلم پیدا نہ ہوتے تو نہ دین میں کوئی کمی آتی اور نہ احادیث کے وجود پر کوئی تحریف آتا جب ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے تو اس کی حیثیت اس سے کوئی مختلف نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ قرآن کو قرار سبعم نے روایت کیا ہے۔ قرآن بتواتر منقول ہے۔ قرآن کا قرآن ہونا قرار سبعم پر موقوف نہیں ہے۔ ایسے ہی احادیث کا صحیح ہونا اور ان کا حدیث ہونا بخاری و مسلم کی روایت پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ احادیث بخاری و مسلم کے وجود پذیر ہونے سے پہلے ہی صحیح اور امت میں مقبول تھیں۔

اسی بنا پر روایت و اسناد کے رد و رد ہونے سے پہلے زمانہ تابعین میں ایسی تمام روایات جنہیں تابعی حضور انور کے نام سے پیش کرے قابل قبول سمجھی جاتی تھیں۔ اور حافظ ابن جریر کا تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ تابعین کا ایسے ارشادات اپنانے پر اتفاق رہا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں۔

ابو عمر بن عبد البر نے تمہید کے آغاز میں تصریح کی ہے کہ امام ابن جریر کہتے ہیں کہ مرسل روایات کے قبول کرنے پر تابعین کا اجماع ہے۔
اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسناد و روایت کے وجود میں آنے سے پہلے بھی حدیث موجود تھی اصل تو حدیث ہی ہے روایت و اسناد تو حدیث کی حفاظت کی خاطر فتنوں کے زمانے کی پیداوار ہے۔ چنانچہ امام مسلم مقدمہ میں امام ابن سیرین کے حوالہ سے رقمطراز ہیں :
لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الْأَسْنَادِ فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ

قَالُوا سَمَوُ النَّارِ جَالِكُمْ فَيَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ
حَدِيثُهُمْ وَيَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدْعِ فَلَا يُؤْخَذُ مِنْهُمْ
لوگ اسناد کے بارے میں پوچھ گچھ ہی نہ کرتے تھے۔ جب فتنے رونما
ہوئے تو لوگوں نے کہا شروع کیا کہ اپنے آدمی بتاؤ۔ اگر راوی اہل
السنۃ ہوتا تو روایت لیتے اور اگر بدعتی ہوتا تو روایت اس سے نہ لیتے۔

جوں جوں زمانہ صحابہ و تابعین سے دوری ہوتی گئی اسناد و روایت کے فن میں وسعت آتی
گئی حتیٰ کہ جو حدیث زمانہ تابعین میں امام اعظم کو صرف ایک واسطہ اور دو واسطوں سے ملی تھی
وہی بخاری و مسلم کے زمانے میں اسناد و روایت کے بازار میں چھ واسطوں کی محتاج ہو گئی۔ مثلاً
امام اعظم فرماتے ہیں :

عَنْ عَطَاءٍ عَنْ جُمُرَانَ أَنَّ عُثْمَانَ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا وَقَالَ هَكَذَا
رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ
حمران کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے وضو میں ایک ایک عضو کو تین تین
بار دھویا اور فرمایا کہ میں نے ایسے ہی حضور انورؐ کو وضو کرتے دیکھا ہے۔

ایسے یہی حدیث امام بخاری کی زبانی بھی سن لیجئے :

حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الْأَوْسِيُّ قَالَ حَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ
بْنُ سَعْدٍ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَزِيدٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ
جُمُرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ رَأَى عُثْمَانَ
وَعَبَايَا نَامٍ فَافْرَغَ عَلَى كَفَيْهِ ثَلَاثَ مِرَارٍ فغَسَلَهَا شَمًّا
أَوْ حَلَّ يَمِينَهُ فِي الْإِنَاءِ فَمَضْمَضَ وَاسْتَشَقَّ شَمًّا غَسَلَ
وَجْهَهُ ثَلَاثًا وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلَاثًا ثُمَّ مَسَحَ ثُمَّ
غَسَلَ رِجْلَيْهِ ثَلَاثًا إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُولُ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ مَحْوًى وَضَوِي
هَذَا شَمًّا صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُجْدِي فِيهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ

عَاتَقَدَمَ مِنْ ذُنُبِهِ - لہ

جیسے آج تدوین کتب کے بعد ان کتابوں کے مصنفین پر حد درجہ اعتماد ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ

أَنَّ نِسْبَةَ الْكِتَابِ إِلَى مُصَنِّفِهِ مَعْلُومَةٌ فِي الْجُمْلَةِ بِالضَّرْفَةِ
فَإِنَّا نَعْلَمُ أَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيَّ أَلْفَ كِتَابًا فِي الْحَدِيثِ
وَأَنَّ هَذَا الْمَوْجُودُ فِي أَيِّدِي الْمُحَدِّثِينَ - لہ

کتاب کی نسبت مصنف کی طرف بدرجہ معلوم ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے
کہ امام بخاری نے حدیث میں ایک کتاب لکھی ہے اور وہی محدثین کے
ہاتھوں میں موجود ہے ۔

ایسے ہی دور اسناد و روایت سے پہلے صحابہ اور تابعین پر ان ائمہ دین کو اعتماد تھا۔ ہم بھی آج جو
حدیثیں ان کتابوں سے بیان کرتے ہیں اور برملا کہہ دیتے ہیں کہ امام بخاری و مسلم اور ابو داؤد وغیرہ
نے فرمایا ہے تو یہ اصول محدثین کے مطابق روایات مرسلہ ہیں کیونکہ نہ ہم نے بخاری سے سنا ہے
اور نہ مسلم سے بلکہ ہمارے اور امام بخاری کے درمیان ایک سے زیادہ وساطت ہیں جن کے نام
سے بھی ہم واقف نہیں سب کے سب مجاہیل ہیں جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے لکھا ہے :
إِنَّ أَقْصَى مَا فِي الْبَابِ أَنْ يَرْوَى الْحَدِيثُ عَنِ الْمَجَاهِيلِ
مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَالْمَجَاهِيلِ مِنَ الْعُلَمَاءِ - لہ
زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حدیث مجاہیل مسلمان اور مجاہیل علماء
سے روایت کی جا رہی ہے ۔

لیکن ہمیں اس پر کوئی قدح نہیں کیونکہ ہمیں ان بزرگوں کی دیانت، صداقت اور تعاہت و
عدالت پر پورا پورا اعتماد ہے ٹھیک ٹھیک ایسا ہی اعتماد روایت و اسناد کا سلسلہ پیدا ہونے
سے پہلے اس دور کے لوگوں کو تابعین کرام پر تھا۔ اس اعتماد کی وجہ سے آج ہم ان علماء کے مراسیل
کو قوی نہیں بلکہ قوی تر بتاتے ہیں :

لہ اس روایت کو امام مسلم اپنی صحیح میں نو طریقوں سے لائے ہیں ہر طریق میں سات افراد ہیں اور واقفین
نے سات طریقوں سے درج کیا ہے مگر کوئی طریق آٹھ افراد سے خالی نہیں ہے ۔

لہ ، لہ الروض الباسم ص ۱۸

إِنَّا أَقْوَى الْمَرْسِيلِ مَا أَرْسَلَهُ الْعُلَمَاءُ مِنْ أَحَادِيثِ هَذِهِ
الْكِتَابِ ۝

مراسیل میں قوی تر ان کتابوں کی حدیثوں میں علماء کے مراسیل ہیں۔

اور جیسے ان بزرگوں کی کتابوں کو آج ترجیح، دوسری کتابوں کے مقابلے میں شہرت اور قبول کی بنا پر ہے اور اس لیے یہ کتابیں بجائے خود ایک دلیل صحت بن گئی ہیں ایسے ہی دوسری صدی کے لوگ تابعین کو دوسروں کے مقابلے میں ان کی علمی شہرت اور قبول کی بنا پر ترجیح دیتے تھے اور اس لیے تابعین کی ہستی بجائے خود ان کے یہاں صحت کی ضمانت تھی۔ بہت بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم تو اپنے بزرگوں کی دیانت کے اتنے متوالے ہوں کہ ان کی راہ سے آتی ہوئی حدیثوں کو قطعی قرار دیں اور تابعین کے مقام پر ہم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں خانا للہ والی اللہ المشتکی۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث اور ہے اور روایت حدیث اور — امام اعظم کے زمانہ طالب علمی میں فن روایت و اسناد شاہراہ عام پر نہ آیا تھا اور نہ اس کے تیسری صدی کی طرح عام شہروں میں دفاتر کھلے تھے اور نہ ہی اس دور میں کبار تابعین کا دور ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں:

وَلَا يَكَادُ يُوجَدُ فِي الْقَرْنِ الْأَوَّلِ الَّذِي الْقَرْنُ فِي الصَّحَابَةِ
وَكِبَارِ التَّابِعِينَ ضَعِيفٌ ۝

وہ قرن اول جس میں صحابہ اور بڑے تابعین ہیں اس میں ضعیف کوئی نہیں ہے۔
۱۲۰۰ھ یحییٰ بن سعید القطان کی تاریخ ولادت ہے جن کے بارے میں حافظ ذہبی نے انکشاف کیا ہے کہ فن رجال میں سب سے پہلے مصنف یہی ہیں اور کوفہ میں امام شعبہ موجود تھے جن کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں:

كَانَ شُعْبَةُ أُمَّةً وَحْدَةً فِي هَذَا الشَّانِ ۝

اس فن میں حضرت شعبہ یگانہ امام ہیں۔

الغرض امام اعظم نے علم کی خاطر سفر کیا اور آپ کے اسفار علمیہ میں مرکزی حیثیت مکہ مکرمہ کو حاصل ہے۔

مکہ مکرمہ کی علمی حیثیت

وہ حرم پاک جہاں سے علم وحی و نبوت کا آغاز ہوا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول ہونے کے بعد تیرہ سال کا عرصہ گزارا۔ امام اعظم کے زمانہ میں یہ بھی کوفہ کی طرح دارالعلم تھا۔ حافظ ذہبی لایمہ دوات الآثار میں فرماتے ہیں :

عہد صحابہ میں یہاں علم کم تھا پھر صحابہ کے آخری دور میں علم کی کثرت ہوئی اور اسی طرح عہد تابعین میں مجاہد، عطاء، سعید بن جبیر اور ابن ابی ملیکہ اور پھر ان کے شاگردوں کے دور میں عبد اللہ بن ابی یسج، قاری ابن کثیر، منتظم بن ابی سفیان اور ابن جریر اور ہارون رشید کے وقت میں مسلم زنجی، فضیل بن عیسیٰ، ابو عبد الرحمن ازرقی، حمیدی اور سعید بن منصور جیسے علماء ہوئے ہیں۔

امام بخاری کو حرمین کے عمل پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے اپنی صحیح میں اس موضوع پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

باب ما ذکرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وحنی علی اتفاق
اہل العلم وما اجتمع علیہ الحرمان مکة والمدینۃ
علامہ کرمانی شارح صحیح بخاری لکھتے ہیں :
امام بخاری کا انداز بیان کہہ رہا ہے کہ اہل حرمین کا اتفاق و اجتماع
حجت ہے۔

مگر حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ
لَعَلَّہٗ اَرَادَ التَّوْجِیْہَ لَا الْاِجْمَاعَ۔
غالباً مراد ترجیح ہے اجماع نہیں۔

امام بخاری کی عبارت کا خواہ مطلب کچھ ہو مگر اتنا معلوم ہے کہ اختلافی مسائل میں ان کے نزدیک

وہی مسئلہ قابل ترجیح ہے جس پر علماء حرمین متفق ہوں۔
 بہر حال دوسری صدی کے آغاز میں اور پہلی صدی کے آخر میں مکہ مکرمہ علم کی منڈی تھا اور تمام
 بلاد اسلامیہ میں مکہ کے علمی جلال کا لوہا مانا جاتا تھا اتنا کہ علامہ سخون نے تصریح کی ہے کہ اگر ابن عباس
 اہل مدینہ سے کسی مسئلہ میں اختلاف کر جائیں تو مدینہ کی اجماعی طاقت علمی بھی بے جان ہو جاتی تھی۔
 إِذَا خَالَفَ ابْنُ عَبَّاسٍ أَهْلَ الْمَدِينَةِ لَمْ يَنْعَقِدْ لَهُمُ
 إِجْمَاعٌ ۖ ۱۷

جب اہل مدینہ کی ابن عباس مخالفت کریں تو اہل مدینہ کا اجماع منعقد
 نہیں ہوتا۔

مکہ میں امام اعظم نے جن حفاظ حدیث سے علمی استفادہ کیا ہے ان کی تفصیل بتانا تو دشوار ہے
 یہاں صرف چند گرامی قدرستیوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مکہ کے گلستان کی باغ و
 بہار کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

امام اعظم کا عطاء بن ابی رباح سے تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کے ترجمہ کا آغاز مفتی اہل مکہ، محدث مکہ، القدوة اور المعلم کے زیرِ نقاب
 سے کیا ہے اور ان کو علم حدیث میں امام اعظم کا استاد بتایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔
 عَنْهُ اَيُّوبُ وَحُسَيْنُ الْمَعْلَمُ وَابْنُ جُرَيْجٍ وَابْنُ اسْحَاقَ وَالْاَوْزَاعِيُّ
 وَابُو حَنِيفَةَ ۱۸

عطا کے تلامذہ میں ایوب، حسین ابن جریج، ابن اسحاق، اوزاعی اور ابو حنیفہ ہیں۔

۱۷ یہ مسئلہ بھی مہات مسائل میں سے ہے۔ اہل مکہ کا دوسرے اسلامی شہروں کے مقابلے میں اپنی قوت
 اجماع سے قابل ترجیح ہونا بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جس پائے کے علماء یہاں موجود تھے دوسرے
 مقامات پر بھی موجود تھے نیز مہاجرین جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم صحبت یافتہ تھے ان میں سے پھر کسی ایک
 نے بھی مکہ میں آکر دوبارہ قیام نہیں کیا ان کو اس کی شرعاً اجازت نہ تھی۔ مکہ کی جو علمی رونق تھی وہ عبداللہ
 بن عباس کے تلامذہ کے دم ختم سے تھی اور بس۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔
 ۱۸ عمدة القاری ج ۲۵ ص ۲۰۲۔ ۱۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲۔

بلکہ امام ذہبی نے اپنی مشہور تاریخ کے خلاصہ میں بالتصریح یہ بھی لکھا ہے کہ :

اَكْبَرُ شَيْئِهِمْ عَطَاءُ بْنُ أَبِي رِبَاحٍ يَهُودِيٌّ

ابو حنیفہ کے اساتذہ میں سب سے بڑے عطاء بن ابی رباح ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حیثیت امام مالک کی اسانید میں مالک عن نافع عن ابن عمر کی ہے جسے امام بخاری وغیرہ اجل الاسانید اور اصح الاسانید کہتے ہیں۔ یہی حیثیت امام اعظم کی اسانید میں ابو حنیفہ عن ابن عباس کی ہے۔ چنانچہ امام شعرائی نے اس کو اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے مناقب میں لکھا ہے۔

وَسَمِعَ الْحَدِيثَ مِنْ عَطَاءٍ بَلْغَةً يَهُودِيٍّ

حضرت عطاء بن ابی رباح کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ان اکابر کے یہ بیانات پڑھیے حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اے اہل مکہ تم میرے پاس بھیڑ رکھتے ہو حالانکہ تمہارے پاس تو عطاء موجود ہیں۔ بعینہ یہی الفاظ حافظ ذہبی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی نقل کیے ہیں۔ حضرت سعید فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ مکہ میں تشریف لائے۔ لوگوں نے ان سے مسائل دریافت کیے آپ نے فرمایا کہ مسائل کی خاطر تم میرے پاس جمع ہوتے ہو حالانکہ تم میں عطاء موجود ہیں یہ

ذرا غور فرمائیے کہ اس شخص کی جلالت علمی کا کیا حال ہو گا جس کی علمیت کا لوہا ابن عباس اور ابن عمر جیسے جلیل القدر اور اساطین حدیث صحابہ مانتے ہوں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ : عطاء بن ابی رباح نے سترچ کیے ہیں۔ اموی دور حکومت میں زمانہ حج آتا تو سرکاری طور پر منادی ہوتی۔

لَا يَفْتِي النَّاسَ فِي الْحَجِّ الْاَعْطَاءُ

حافظ ابن کثیر ہی نے سعید بن سلام البصری کے حوالہ سے ان سے امام اعظم کی پہلی ملاقات کا پورا حال لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ :

میں نے خود امام اعظم سے سنا ہے کہ جب امام موصوف سے ان کی ملاقات

ہوئی تو انہوں نے عطا سے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ دریافت کرتے ہی جواب دینے سے پہلے امام صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولے بتاؤ کہاں کے رہنے والے ہو۔ امام صاحب نے فرمایا کہ کوفہ کا شہری ہوں۔ فرمایا کہ اس بستی کے جہاں دینی فرقہ بندی کی بنیاد پڑی۔ امام صاحب نے جواباً فرمایا جی ہاں! فرمایا اچھا بتاؤ کہ کن لوگوں سے تعلق رکھتے ہو؟ یعنی کس مدرسہ خیال کے ہو۔ امام صاحب نے جواباً کہا کہ الحمد للہ ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں جو سلف کو برا نہیں کہتے یعنی نہ رافضی ہوں نہ خارجی اور نہ قدری۔ اور اہل قبلہ کی بر بنائے معصیت تکفیر نہیں کرتے یعنی نہ مرجئی ہوں نہ جہمی اور نہ مضربی، حضرت نے جواب باصواب سن کر فرمایا عَرَفْتُ خَالَنَکُمْ پہچان گیا ہوں رہو یہ۔

الغرض امام عطاء بن ابی رباح اپنے وقت میں جلال علمی کا سب سے بڑا نمونہ تھے۔ محدثین میں نہ حفاظ حدیث کو ان کی بارگاہ علمی میں زانوئے تلمذتہ کرنے کا شرف حاصل ہے مثلاً امام بکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری، قتادہ بن دعائم، یحییٰ بن کثیر، مالک بن دینار، سلیمان مہران اور امام ایوب السختیانی، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

كَانَ مِنْ سَادَاتِ الثَّابِعِينَ عِلْمًا وَفِقْهًا يَلُحُّ

صرف علم و فقہ ہی میں نہیں بلکہ زہد و تقویٰ، پاکبازی اور پارسائی میں بھی آپ کی زندگی ایک الی نمونہ تھی۔ اور ہر شخص کے لیے آپ کا یہی وعظ ہوتا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے یعلیٰ بن عبید کے بارے میں جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعلیٰ بن عبید کہتے ہیں کہ:

ہم محمد بن سوہ کے پاس گئے انہوں نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا اؤ میں تمہیں ایک مفید بات سناؤں مجھے عطاء بن ابی رباح نے بتایا ہے کہ عزیز من! بزرگان سلف لا یعنی اور فضول باتوں کو بہت ہی ناپسند کرتے تھے بلکہ فضول کو گناہ سمجھتے تھے۔ صرف اللہ کی کتاب

کی تلاوت، نیکی کا پرچار، بُرائی پر روک ٹوک یا پھر اپنی ضروریات
معیشت سے متعلق باتیں کہتے تھے کیا تم اللہ پاک کے اس ارشاد
گرامی کو نہیں مانتے **وَإِنَّا عَلَيْكُمْ لَحَافِظُونَ كَرِهَ أَمَّا كَاتِبِينَ**
اور **مَا يُلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ** - اگر
تمہارے سامنے تمہارا وہ اعمال نامہ آجاتے جس میں وہ باتیں درج
ہیں جو نہ دنیا سے متعلق ہیں اور نہ دین سے کیا تمہیں اس پر شرم
نہ آتے گی بلکہ

امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ اور امام نسائی نے اپنی کتابوں
میں ان سے روایات لی ہیں۔

قاضی ابویوسفؒ نے بحوالہ امام اعظم ان سے احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً
عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ عَطَاءٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ
لَيْسَ فِي الْقُبْلَةِ الْوُضُوءُ۔

بوسہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ عَطَاءٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ مِثْلَهُ

ایسے ہی امام موسیٰ بن زکریا الحنفی نے اپنے مسند میں، حافظ ابو محمد حارثی نے اپنے مسند میں
اور امام محمد نے موطا اور کتاب الآثار میں حضرت عطاء سے بحوالہ امام اعظم روایات کی تحریر
کی ہے۔

ایک ضروری تنبیہ

یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ امام عطاء بن ابی رباح کو حافظ ذہبی نے حفاظ حدیث کے طبقہ
ثالثہ میں شمار کیا ہے۔ اور یہ بات پہلے صاف ہو چکی ہے کہ موصوف مکہ میں حضرت امام اعظمؒ
کے علم الحدیث میں سب سے بڑے اور مہربان شفیع استاد ہیں۔ شفقت کا اور شفقت کے ساتھ
اکرام و اجلال کا اندازہ کرنا ہو تو وہ واقعہ پڑھیے جو حافظ ابن عبد البر نے بسند متصل بحوالہ حارث

ہم عطاء بن ابی رباح کے پاس ہوتے کچھ ہم میں سے کچھ کے پیچھے ہوتے
جب امام ابو حنیفہ مجلس میں آتے تو حضرت عطاء امام صاحب کے لیے
جگہ بناتے اور ان کو اپنے قریب کر لیتے ۔

عطاء بن ابی رباح نے کن صحابہ کے علوم سے خوشہ چینی کی ہے اس کی ایک معمولی سی جھلک حافظ
ابن حجر کی تہذیب التہذیب کے مطالعہ سے نظر آتی ہے ۔ حافظ صاحب موصوف نے پورے ایک
صفحہ پر ان کے اساتذہ میں اجلہ صحابہ کی ایک طویل فہرست دی ہے ۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں
اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں حضرت عطاء کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ :

أَدْرَكْتُ جَائِثِيَّ صَحَابِيَّ ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حرم پاک میں صحابہ کا پھیلا ہوا علم حضرت عطاء کے ذریعے امام ابو حنیفہ میں
منتقل ہوا ہے ۔ اسی بنا پر امام خلف بن ایوب کا امام اعظم کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ علم کی
دولت اللہ سبحانہ کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی ۔ حضور انورؐ سے یہ دولت صحابہ
کو وراثت میں ملی اور صحابہ سے تابعین کو اور تابعین سے امام ابو حنیفہ کو ملی ہے ۔ روافد و الحافظ
خسرو ۔

حافظ عمرو بن دینار سے امام اعظم کا تلامذہ

حافظ ذہبی نے ان کا تعارف لکھتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ الامام ، الحافظ ، عالم الحرم ،
افظ جلال الدین السیوطی نے حافظ جلال الدین المزنی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ عمرو بن دینار امام
اعظم کے علم حدیث میں شاگرد ہیں ۔ حافظ ذہبی ، حافظ کمر درسی اور صدر الائمہ نے بھی تصریح کی ہے
خزرجی نے ان کو خلاصہ میں احد الاعلام لکھا ہے ۔ مشہور محدث سفیان بن عیینہ متوفی ۲۵۵ھ
ان کے بارے میں رائے یہ تھی کہ ہمارے نزدیک عمرو بن دینار سے زیادہ فقیہ زیادہ عالم اور
ادہ حافظ کوئی نہیں ہے ۔

امام عمرو بن دینار ان لوگوں میں سے ہیں جو وقت کی ناپسندیدہ حکومت سے کسی دُرجے میں

تعاون نہ کرتے تھے یعنی ان کے نزدیک حکومت میں عدالت ضروری تھی۔ چنانچہ اموی حکومت کے سربراہ ہشام کا واقعہ حافظ کرمی نے لکھا ہے کہ سرکاری طور پر ان کو یہ پیش کش کی گئی کہ منصب افتابینہ سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملے گی۔ صاف اور کھلے طور پر انکار کر دیا۔ ۱۷

حکومت اور عدالت

یہ موضوع بہت طویل الذیل ہے مگر یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ الامام ابو بکر الجصاص نے احکام اللہ میں زیر آیت لَا يَنْتَهِى الظَّالِمِينَ، سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس آیت کے منطوق اور مدار سے اس مسئلہ کے دونوں مثبت و منفی پہلو واضح کیے ہیں۔ مثبت پہلو کے بارے میں فرماتے ہیں

أَفَادَتِ الْآيَةُ أَنَّ شَرْطَ تَجْمِيعِ مَنْ كَانَ فِي مَحَلِّ الْإِهْتِمَامِ بِهِ فِي أَمْرِ الْعَدَالَةِ وَالصَّلَاحِ ۱۸

آیت نے بتایا ہے کہ ایسے تمام عہدوں کی جن کا تعلق قیادت سے ہو بنیادی شرط امیدوار میں صلاحیت اور عدالت کا ہونا ہے۔

اور منفی پہلو کو اسی آیت کے مدلول سے ثابت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

فَتَبَيَّنَتْ بِدَلَالَةِ هَذِهِ الْآيَةِ بَطْلَانُ إِمَامَةِ الْفَاسِقِ وَ أَنَّهُ لَا يَكُونُ خَلِيفَةً ۱۹

اس آیت سے فاسق کی امامت کا غلط ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی کہ فاسق تخت خلافت کا اہل نہیں ہے۔

اسی سلسلے میں الجصاص نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے جو بعض متسزلہ کی جانب سے امام اعظم کے بارے میں پھیلائی گئی ہے اور بتایا ہے کہ

لَا فَرْقَ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ بَيْنَ الْقَاضِي وَ بَيْنَ الْخَلِيفَةِ فِي أَنَّ شَرْطَ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الْعَدَالَةُ ۲۰

ابو حنیفہ کے نزدیک خلیفہ اور قاضی کے درمیان بلحاظ عدالت شرط ہونے

۱۷ مناقب الکرمی ج ۲ ص ۹۷ - ۱۸ احکام القرآن ج ۱ ص ۷۰

۱۹ احکام القرآن ج ۱ ص ۷۰ - ۲۰ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۰

میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے بہر حال امام عمرو بن دینار نے سرکاری منصب افتاء قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ انکار افتاء سے نہیں افتاء کا کام تو وہ پہلے بھی کرتے تھے انکار تو حکومت کا رجحان سے ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں اجلہ صحابہ کو ان کا استاد بتایا ہے مثلاً ابن عباس، ابن الزبیر، ابن عمر، ابن عمرو بن العاص، ابو ہریرہ، جابر بن عبد اللہ، ابو الطفیل اور سائب بن یرید۔ اور تابعین کی ایک بڑی تعداد کا بھی اسی سلسلے میں تذکرہ کیا ہے۔ ان کے شاگردوں میں امام اعظم کے ساتھ امام شعبہ، امام ابن جریر، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، امام سفیان ثوری اور امام اوزاعی کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔

امام عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ مجھ سے خود امام شعبہ نے بتایا ہے کہ میں نے عمرو بن دینار جیسا کوئی نہیں دیکھا ہے۔
امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ میں کو فرمایا تو امام ابو حنیفہ نے میرے تعارف میں یہ جملہ بول کر مجھے معاشرے میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا کہ

هَذَا اَعْلَمُهُمْ بِحَدِيثِ عُمَرَ بْنِ دِينَارٍ

لوگوں نے میرے پاس آمد و رفت شروع کر دی۔ امام اعظم نے عمرو بن دینار سے دو حدیثیں بلا واسطہ روایت کی ہیں۔ امام علی بن المدینی کے حوالہ سے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس کی علمی وراثت چھ حضرات کو ملی ہے۔ سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، جابر، زید، طاؤس۔ اور ان چھ اکابر کا علم حضرت عمرو بن دینار کو وراثت میں ملا ہے یہ — ائمہ ستہ نے ان سے روایات لی ہیں۔

عمرو بن دینار مکی اور عمرو بن دینار بصری

مشہور محدث ملا علی قاری حدیث و رجال میں معلوماتی شخصیت ہونے کے باوجود ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں :

عمرو بن دینار کی کنیت ابو یحییٰ ہے۔ سالم بن عبد اللہ وغیرہ کے شاگرد ہیں
حماد بن زید، حماد بن سلمہ اور معمر نے ان کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا
ہے اور محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے۔

یہ غلط ہے اور بہت بڑا سہو ہے۔ غلط فہمی کا سرچشمہ یہ ہے کہ ملا علی قاری نے امام عمرو بن دینار
مکی کو عمرو بن دینار بصری سمجھ لیا ہے۔ اول الذکر صحاح کے راویوں میں سے ہیں۔ امام اعظم کے شیخ
اور کیا تابعین میں سے امام اور مجتہد ہیں۔ اور مؤخر الذکر طبقہ سادسہ میں سے ہیں اور ان کا شمار ضعیف
میں ہوتا ہے۔ الغرض امام کے شیوخ میں عمرو بن دینار مکی ہیں۔ عمرو بن دینار بصری نہیں ہیں۔ قاضی
ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ امام اعظم ان سے روایات لی ہیں۔

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ عُمَرَ بْنِ دِينَارٍ عَنْ جَابِرٍ عَنْ زَيْدِ أَنَسَ
قَالَ إِذَا أَهَيَّوْتَ الْمَرْءَ أَتَى نَفْسًا فَقَامَتْ مِنْ مَجْلِسِهَا قَبْلَ أَنْ
تُخْتَارَ فَلَيْسَ بِشَيْءٍ۔

حضرت زید فرماتے ہیں کہ جب عورت اپنے لیے اختیار کرے پھر وہ اپنی
جگہ سے اختیار ملنے سے پہلے کھڑی ہو جاتے تو کچھ نہیں ہے۔

حافظ ابو الزبیر محمد بن مسلم سے امام اعظم کا تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کو حافظ حدیث کے طبقہ رابعہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ جلال الدین نے اسعاف المبط
میں، صدر الاثر، علامہ حمزوی اور امام ذہبی نے مناقب میں ان کو امام اعظم کا علم حدیث میں اساتذہ قرار دیا ہے۔
یعنی بن عطاء فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن مسلم حدیث بیان کرتے تھے ہمارا اندازہ ان کے بارے
میں یہ تھا کہ سب سے زیادہ زیرک اور سب سے زیادہ قوت حافظہ کے مالک ہیں۔ عطاء بن ابی رباح یہ
کہہ کر ان کو خراج تحسین ادا کرتے تھے کہ ہم سب حضرت جابر بن عبد اللہ کے پاس جا کر حدیثیں سنتے،
سننے کے بعد باہم مذاکرہ کرتے تو حضرت ابو الزبیر کو سب سے زیادہ احادیث یاد ہوتی تھیں۔ امام ابو
السخنیانی جب ان کے حوالے سے کوئی ارشاد نبوت نقل کرتے تو فرماتے کہ ہم سے ابو الزبیر نے بیان
کیا اور ابو الزبیر تو ابو الزبیر ہی ہیں۔

سب ائمہ حدیث نے ان سے روایات لی ہیں۔ قاضی ابویوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ امام اعظم ان کی روایات کو پیش کیا ہے۔

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ أَبِي الثَّوْبَانِ جَابِرَ أَنَّ سَرَّاقَةَ بِنَ مَالِكٍ
قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ عَمْرُؤَنَا هَذِهِ لِعَامِنَا أَمْ لِلدَّيْرِ
قَالَ لِلدَّيْرِ

سراقہ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ یہ عمرہ ہمارا اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے فرمایا ہمیشہ کے لیے ہے۔

حافظ ابوالزبیر کے اساتذہ میں عبادہ اربعہ، حضرت عائشہ، حضرت جابر، ابوالطفیل صحابہ ہیں۔ ان کے علاوہ باقی جلیل القدر ائمہ تابعین ہیں۔ ان کے شاگردوں میں امام اعظم کے علاوہ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام زہری، امام عتیش، امام یحییٰ بن سعید الانصاری، امام ابراہیم بن طہمان، امام حماد بن سلمہ، امام ہشیم، امام سفیان ثوری، امام سفیان بن عیینہ شامل ہیں۔ امام مالک نے بھی ان سے روایات لی ہیں۔ امام اعظم نے ان سے جس قدر احادیث سنی ہیں ان سب کا مرکز حضرت جابر بن عبد اللہ ہے۔ سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ امام شعبہ نے حافظ محمد بن مسلم کو رکن و مقام کے درمیان اس بات پر قسم دی تھی کیا تم نے یہ احادیث حضرت جابر بن عبد اللہ سے سنی ہیں؟ فرمایا:

وَاللَّهِ إِنِّي سَمِعْتُهَا مِنْ جَابِرٍ

بخدا میں نے یہ احادیث حضرت جابر سے سنی ہیں۔ ایک بار نہیں بلکہ یہی جملہ آپ نے تین بار دہرایا۔^۳

مکتہ میں امام اعظم کے دوسرے شیوخ کو ان ہی پر قیاس کر لیجئے کچھ کے اسماء یہ ہیں۔ عبد اللہ بن ابی زیاد، ابوالحسن المکی ۱۵۱ھ، حمید بن قیس الاعرج البوصفوان القاری المکی ۱۳۱ھ، ابو عثمان عبد اللہ بن عثمان القاری المکی ۱۲۲ھ، عبد اللہ بن عبد الرحمن النوفلی المکی، ابراہیم بن طیسر الطائفی نزہیل مکہ ۱۳۲ھ، اسماعیل بن امیہ بن عمرو بن سعید الامری ۱۴۴ھ، اسماعیل بن مسلم البواسحاق المکی، ابو عبد اللہ عبد الغزنی بن رفیع الاسدی المکی ۱۳۳ھ، حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات

میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے حوالہ سے حافظ عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے۔

المدينة المکرمہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دارالہجرۃ اور آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔ علوم نبوت کا اصلی مخزن اور منبع ہونے کا اسی شہر کو فخر حاصل ہے۔ مکہ کے ساتھ اس کو بھی حرم کہا جاتا ہے وہ بنائے خلیل ہے یہ بنائے حبیب ہے۔ عہد نبوی سے لے کر حضرت علی مرتضیٰ کے ابتدائی زمانے تک ساری دُنیا نے اسلام کا علمی مرکز یہی تھا۔ ستارہ تک مدینے کی علمی بہار پر فقہاء سبعہ آفتاب و ماہتاب بن کرتا ہاں ہے ہیں۔ یہ سات شخصیتیں یعنی سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، قاسم بن محمد، خارج بن زید، عبید اللہ بن عبد اللہ، سلیمان بن یسار، ساتویں شخصیت کی تعیین میں علماء کا قدرے اختلاف ہے۔ حافظ عبد القادر قرشی اور علامہ نووی نے تین شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

سالم بن عبد اللہ، ابوبکر بن عبد الرحمن، ابوسلمۃ بن عبد الرحمن۔

مدینہ کے فقہاء سبعہ

امام ذہبی نے ابوبکر بن عبد الرحمن کو ہی احد الفقہاء السبعہ لکھا ہے لہٰذا حافظ ابن حجر عسقلانی بھی ان کے ہم زبان ہیں لہٰذا اسی رائے کے مطابق محمد بن یوسف شاعر نے ان ساتوں کو دو شعروں میں جمع کر دیا ہے۔

الا کل من لا یقتدی بائمہ ففستہ ضیضی عن الحق خارجہ

فخذہم عبید اللہ عروۃ قاسم سعید ابوبکر و سلیمان خارجہ

ابن العماد حنبلی نے ان کو ہی قابل اعتماد قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی نے ان ہی اکابر کو ابوبکر کے ساتھ فقہاء سبعہ بتایا ہے فرماتے ہیں:

ہلوا کلامہم الفقہاء السبعۃ المشہورون فی المدینۃ

حافظ ابن القیم الجوزی نے مدینہ کے مفتیوں کے تذکرے میں ان اکابر کا ذکر کرنے کے بعد

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۹۔ ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۱۲۔ ۳۔ الجواہر المصنیۃ ص ۴۲۳
۴۔ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۱۴۔ ۵۔ الاحکام فی اصول الاحکام ج ۵ ص ۲۶۸۔

لکھا ہے :

هُوَ لَا يَهْمُ الْفُقَهَاءُ - ۱

فقہاء سبعہ کے نام پر تو تاریخ میں شہرت کا شرف ان ہی اکابر کو حاصل ہے لیکن مؤرخین میں سے ابو الفداء نے فقہاء مدینہ کی تعداد دس بتائی ہے۔ جبرجی زیدان مؤرخ ابو الفداء کے حوالے سے رقمطراز ہے :-

وَبَعْضُ الْمُؤَرِّخِينَ يُحْسِبُهُمْ عَشْرَةً - ۲

لیکن یہ محض اختلاط ہے اور شاید اس اختلاط و التباس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ ابو حنیفہ دینوری نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے زمانہ گورنری میں مدینہ میں جن اکابر پر مشتمل مشاورتی کونسل بنائی تھی۔ اس کے اراکین کی تعداد دس تھی اور اس میں ان فقہاء میں سے چھ کو رکن بنایا گیا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے اس مشاورتی کونسل کے ارکان کے نام یہ بتائے ہیں :-

عروۃ بن الزبیر، عبید اللہ بن عبد اللہ، ابوبکر بن عبد الرحمن، ابوبکر بن سلیمان، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد، سالم بن عبد اللہ، عبید اللہ بن عمر، عبید اللہ بن عامر، خارجہ بن زید۔

ان کا کام پیش یا افتادہ معاملات میں مشورہ دینا اور شہریوں کی پیدا شدہ شکایات کو گورنر تک پہنچانا تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان سے کہا تھا کہ

إِنِّي لَا أَرِيدُ أَنْ أَقْطَعَ أَمْرًا إِلَّا بِرَأْيِكُمْ -

میں نہیں چاہتا کہ تمہارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کر دوں۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ مشاورتی کونسل کے افراد ہیں۔ تاریخ میں فقہاء مدینہ کے نام سے جو

مشہور ہوئے ہیں وہ صرف سات ہی ہیں -

ابن العماد حنبلی نے ان اکابر کو فقہاء سبعہ کہنے کی وجہ یہ لکھی ہے :

یہ فقہاء سبعہ ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی دور میں ہوئے ہیں۔ مدینہ میں ان کے ذریعے علم و فتویٰ کی بیش از بیش نشر و اشاعت ہوتی ہے حالانکہ

۱۔ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۹ - ۲۔ ابو الفداء ج ۱ ص ۲۰۹ بحوالہ تاریخ المغترب العربیہ ج ۱ ص ۹۰ -

۳۔ الاخبار الطوال ص ۳۳۶ - ۴۔ البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۷۱ -

ان کے سبب زمانے میں دوسرے فقہاء تابعین بھی موجود تھے۔ لیکن
 ان کا علم کی اشاعت میں وہ حصہ نہیں ہے جو فقہاء سبعمہ کا ہے بلکہ
 حافظ سخاوی نے ان ہی سات کے بارے میں عبداللہ بن المبارک کا یہ بیان نقل کیا ہے :
 جب کوئی مسئلہ درپیش آتا یہ سب ایک ساتھ مل کر اس پر غور
 کرتے اور جب تک وہ ان کے سامنے پیش ہو کر حل نہ ہو جاتا تھا
 اس کی بابت کوئی فیصلہ صادر نہ کرتی تھے

اس دور میں مدینہ کی علمی بہار ان ہی فقہاء کے دم قدم سے قائم تھی۔ علم حدیث کا سارا دار و مدار
 یہی فقہاء سبعمہ ہیں۔ ان میں خارجہ بن زید کو چھوڑ کر کہ ان کو امام ذہبی نے قلیل الحدیث لکھا ہے
 باقی چھ کا نام سرفہرست ہے۔ امام ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے مشہور استاد علامہ
 ابو منصور عبد القاہر بغدادی نے فقہاء سبعمہ کو ائمہ حدیث بتایا ہے فرماتے ہیں :
 وَالْفُقَهَاءُ السَّبْعَةُ مِنَ التَّابِعِينَ مِنْ هَذِهِ الْجُمْلَةِ فَإِنَّهُمْ
 كَانُوا مَعَ فُقَهَائِهِمْ أُمَّةً فِي الْحَدِيثِ۔

اس دور میں مختلف شہروں میں حدیث کے مدرسے کھل گئے تھے ان مدرسوں کا اجمالی خاکہ یہ ہے
 مدینہ میں مدرسہ حدیث کے مشہور امام سعید بن المسیبؒ،
 عروہ بن الزبیرؒ، ابو بکر بن عبد الرحمنؒ، عبید اللہ بن عبد اللہؒ،
 سلیمان بن یسارؒ، قاسم بن محمدؒ، نافع مولیٰ ابن
 عمرؒ، امام زہریؒ، ابو الزنادؒ، مکہ میں حدیث
 کے مشہور امام عکرمہؒ، عطاء بن ابی رباحؒ، ابو الزبیرؒ،
 کوفہ میں امام شعبیؒ، عامر بن شراحیلؒ، ابراہیم بن سفیانؒ، علمہؒ،
 بصرہ میں حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، شام
 میں عمر بن عبد العزیزؒ، کجولؒ، اور قبصہؒ۔

مدینے کے علم و عمل پر اعتماد

مدینے کے علم و عمل پر کتنا اعتماد ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حافظ ابن القیم نے لکھا ہے کہ
 عَمَلُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ الَّذِي يُحْتَجُّ بِهِ مَا كَانَ فِي نَرٍّ مِنَ الْخُلَفَاءِ
 الرَّاشِدِينَ ۱۷

زمانہ خلافت راشدہ میں اہل مدینہ کا عمل دین میں حجت ہے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اہل مدینہ کا کسی مسئلہ پر جمع ہونا یقیناً تمام مسلمانوں کے نزدیک
 اس مسئلہ کو بخاری بنا دیتا ہے لیکن بحث اس میں ہے کہ جب صحابہ کرام بڑی کثرت کے ساتھ دوسرے
 شہروں میں جا بسے اس وقت بھی کسی مسئلہ کے متعلق مدینے والوں کا عمل حجت ہے یا نہیں۔
 اس موضوع پر امام بخاری کی رائے پہلے بتائی جا چکی ہے کہ بقول حافظ ابن حجر امام بخاری کے نزدیک
 حریم کے اتفاق سے ترجیح ہو سکتی ہے حافظ صاحب فرماتے ہیں :
 وَفَضْلُ الْمَدِينَةِ ثَابِتٌ لَا يَحْتَاجُ إِلَى إِقَامَةِ دَلِيلٍ خَاصٍّ ۱۸
 مدینہ کی بزرگی اور فضیلت کے ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت

نہیں ہے۔

یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ :

اگر مقصد صرف یہ ہے کہ مدینہ والوں کی علمی برتری دوسروں پر ثابت
 ہو تو اگر کسی خاص زمانے میں ان کی فوقیت مقصود ہے تو اس میں کوئی
 شک نہیں کہ زمانہ نبوت اور صحابہ کے اس دور میں جب کہ صحابہ
 مدینہ سے دوسرے شہروں میں نہ گئے تھے مدینے کو یہ شرف حاصل
 ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہر زمانے میں علمی
 لحاظ سے فوقیت حاصل ہے تو یہ بات محل تامل ہے اور اس قسم کے
 جذباتی نعروں کی تحقیق کے بازار میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ۱۹
 حافظ ابن القیم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

جہور کی رائے میں مدینہ اور دوسرے شہروں کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جن کے پاس سنت ہے اس ہی مقام کا عمل بھی قابل اتباع ہے ورنہ اختلاف کے وقت ایک کا عمل دوسروں کے لیے حجت نہیں ہے۔ حجت تو صرف اتباع سنت ہے سنت کو صرف اس لیے نہیں چھوڑا جائے گا کہ کسی شہر کا عمل اس کے خلاف ہے اگر اسے مان لیا جائے تو بہت سی سنتیں متروک ہو جائیں گی اور سنت کی معیاری حیثیت ختم ہو جائے گی۔ کسی بھی شہر کو عظمت کا مقام حاصل نہیں ہے۔ دیواروں، مکانوں، اور زمینوں کا کسی بات کے رائج قرار دینے میں کوئی لقمہ نہیں ہے۔ مؤثر تو شہروں کے مکین ہیں اور معلوم ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہی دوسروں پر علم و عمل میں مقدم ہیں جیسا کہ وہ فضیلت اور دین میں مقدم ہیں۔ اور صحابہ کا عمل ہی ناقابل مخالفت ہے اور صحابہ کرام کی اکثریت مدینہ سے رخت سفر باندھ کر دوسرے شہروں میں چلی گئی بلکہ صحابہ کے اکثر علماء کوفہ، بصرہ اور شام چلے گئے مثلاً علی بن ابی طالب، ابی موسیٰ اشعری، عبداللہ بن مسعود، عبادة بن الصامت، ابی الدرداء، عمرو بن العاص، معاویہ بن ابی سفیان اور معاذ بن جبل۔ بلکہ کوفہ، بصرہ میں تقریباً تین سو سے زائد صحابہ آ گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اکابر جب تک مدینہ میں رہے ان کا عمل حجت تھا اور جب یہی لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے تو ان کا عمل حجت نہ رہا۔

بہر حال زمانہ نبوت سے لے کر خلافت راشدہ تک مدینہ کو علم میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت علی مرتضیٰ کے زمانے میں دار الخلافہ کے کوفہ اور پھر دمشق منتقل ہو جانے پر گو اس کی وہ علمی شان باقی نہ رہی تھی تاہم امام مالک کے زمانے تک مدینہ کی علمی رونق برقرار تھی۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: مدینہ طیبہ در زمان او بیشتر از زمان متاخر مرجع علماء و محط رجال علماء است۔ حافظ ذہبی کے حوالہ سے حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ:

مدینہ دارالہجرتہ میں عہدِ صحابہ میں قرآن و سنت کا علم بہت زیادہ تھا اور
زمانہ تابعین میں فقہاءِ سیدہ جیسے حضرات موجود تھے اور صفار تابعین کے
دور میں بھی قرآن و سنت کا علم تھا۔ عبداللہ بن عمر، ابن ابی ذئب، ابن
عجلان، جعفر صادق، مالک، امام نافع قاری، ابراہیم بن سعد، سلیمان بن
بلال اور اسماعیل بن جعفر سب کے سب مدنی ہیں۔

اس کے بعد امام ذہبی فرماتے ہیں کہ :
پھر ان کے بعد وہاں علم بہت کم ہو گیا اور بعد ازیں تو بالکل ہی ناپید ہو گیا۔
مدینہ طیبہ میں علم کب ناپید ہوا، یہ بھی امام ذہبی کی زبانی سن لیجئے :
خصوصاً اس وقت جبکہ روافض کی ایک جماعت نے مدینہ میں ڈیر الگا
لیا اور مدینہ پران کی حکومت ہو گئی۔

امام عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں :
أَسْنَةُ الْمُتَقَدِّمَةِ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ خَيْرٌ مِنَ الْحَدِيثِ
مدینہ کی علمی و سنتوں کی اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ امیر المومنین
عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ میں قاضی ابوبکر بن حزم کو جمع سنن کے کام پر مامور کیا۔ اس وقت مدینہ میں
علمی شخصیتیں موجود تھیں جن کے بارے میں امیر المومنین نے خصوصی ہدایات دی تھیں۔
حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں لکھا ہے کہ امیر المومنین نے لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمن،
اور قاسم بن محمد کے پاس جو علم ہے اسے قلم بند کر کے روانہ کیا جائے اور ابن سعد نے طبقات میں
لکھا ہے :

كَتَبَ عُمَرُ إِلَى ابْنِ حَزْمٍ أَنْ يَكْتُبَ لَهُ أَحَادِيثَ عُمَرَ
عمر نے ابوبکر بن حزم کو عمرہ کی احادیث قلم بند کرنے کے لیے لکھا۔

قاضی ابوبکر بن حزم مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ امام مالک فرماتے
ہیں کہ ہمارے یہاں قضا کے بارے میں جس قدر ان کو علم تھا اتنا کسی کو نہ تھا۔ بڑے عابد شہید
تھے۔ صرف قاضی ابوبکر نہیں بلکہ ان کے علاوہ مدینہ ہی کے دوسرے اکابر کو بھی عمر بن عبدالعزیز

نے یہ کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے یہاں تو میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مدینے میں علمی وسنتوں کی وجہ سے عمر نے یہ حکم روانہ کیا تھا۔ بہر حال امام اعظم کے زمانہ طلب علمی تک مدینہ کا علمی جلال مانا ہوا تھا اور امام اعظم کو فقہائے سبعہ کی علمی بہاروں سے متمتع ہونے کا موقع ملا ہے کیونکہ فقہائے سبعہ میں سے قاسم بن محمد کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی اور امام اعظم نے جوں کا سلسلہ ۹۶ھ سے شروع کیا ہے۔ واضح رہے کہ امیر المومنین عمر نے تدوین حدیث کے لیے ہر علم شاہ میں جاری کیا تھا اور امام اعظم نے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے اسفار علمی کا آغاز ۱۲۰ھ میں کیا تھا۔

امام مالک کو مدینے کے علم پر اس قدر اعتماد تھا کہ ان کے نزدیک عمل اہل مدینہ مستقل حجت ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مدینہ اسلامی آبادیوں کی روح اور شہروں کا دل تھا علماء یہاں آتے رہتے تھے اور اپنے علوم کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کر کے استصواب کرتے تھے کیونکہ اب تک مدینہ کے علوم بیرونی معلومات کی آمیزش سے بالکل صاف تھے یہ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اسناد و روایت میں اطمینان چاہتا ہے اسے مدینہ والوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

امام اعظم حج کے علمی سفروں میں مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے تھے۔ آپ نے اگر پیچپن حج کیے ہیں تو پیچپن ہی بار مدینہ طیبہ تشریف لے گئے ہیں۔ اولاً اس لیے کہ چونکہ امام صاحب کے یہ سفر علمی ہوتے تھے اور مدینہ اپنی علمی بزرگی میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ ایوب بن زید سے حافظ سخاوی نے نقل کیا ہے کہ علم کو مدینے میں رسوخ حاصل ہوا ہے اور یہیں سے اس کا ظہور ہوا ہے۔

خوابگاہ نبوت کی زیارت اور مسجد نبوی میں عبادت

مدینہ طیبہ میں خوابگاہ نبوت کی زیارت اور مسجد نبوی میں نماز کو اسلام میں بہت بڑی اہمیت ہے۔ وفاء الوفاء میں ہے کہ

عمر بن عبدالعزیز صرف سلام کی خاطر دمشق سے مدینہ قاصد روانہ کرتے

تھے علامہ السبکی فرماتے ہیں کہ یہ بات امیر المومنین سے روایتی لحاظ سے
درجہ شہرت کو پہنچی ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے۔
مَنْ جَاءَنِي نَزَائِرًا لَا يَهْمُهُ إِلَّا نِيَّائِي فَإِنِّي كَأَن كَانَ حَقًّا عَلَيَّ أَنْ
أَكُونَ لَهُ شَفِيعًا۔

جو شخص میری زیارت کو آیا اور میری زیارت اس کا مقصد ہو۔ مجھ پر حق
ہے کہ میں اس کی شفاعت کروں۔

یہ حدیث طبرانی میں ہے۔ علامہ عراقی نے حافظ ابوالسکن کے حوالہ سے اس کی تصحیح فرمائی ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمر سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد آیا ہے۔
مَنْ نَزَّاهُ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي۔

جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت کا وہ حقدار ہو گیا۔

علامہ شوکانی نے اس حدیث کی تصحیح حافظ عبدالحق، حافظ تقی الدین السبکی اور حافظ ابن السکن
سے نقل کی ہے۔

۱۔ وقفا الوفا۔ ص ۴۰۹۔ ۲۔ شرح الاحیاء، العلامة العراقي ج ۴ ص ۴۱۶۔

۳۔ نیل الاوطار ج ۴ ص ۳۲۵۔ اس حدیث کے راویوں میں موسیٰ بن بلال العبیدی کو دارقطنی نے مجہول قرار
دیا ہے مگر حافظ سنجادی نے دارقطنی کی طرف نسبت کر کے یہ لکھا ہے کہ من روٰی عنہ ثقتان فقد ارتفعت جماعتہ
(فتح المغیث ص ۱۳۷) الرفع والتکمیل میں ہے کہ موسیٰ سے صرف دو ثقہ ہی نے روایت نہیں کی بلکہ ان سے ایک سے
زیادہ ثقات نے روایت کی ہے حافظ تقی الدین السبکی نے یہاں ایک مفید بات لکھی ہے وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے۔ جہالت
دو طرح کی ہوتی ہے جہالت عین، جہالت وصف۔ اگر مجہول کہنے سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ میں جہالت عین ہے تو یہ
مستراسر غلط ہے کیونکہ موسیٰ سے روایت کرنے والے احمد بن حنبل، محمد بن جابر، المحارب، محمد بن اسماعیل الاحسی، ابو امیہ
محمد بن ابراہیم، عبید بن محمد وراق، الفضل بن سہل اور جعفر بن محمد بزدوی جیسے اکابر ثقہ ہیں۔ جہالت تو دو
کی روایت سے پامال ہو جاتی ہے اور یہ تو یکدم دو نہیں سات ہیں۔ اور اگر جہالت سے جہالت وصف مراد ہے
تو یہ بھی بے بنیاد ہے کیونکہ احمد بن حنبل جیسا فنکار اور ناقد رجال جس سے روایت کرے اس کی شان کے کیا کہنے
ہیں۔ (شفاء السقام فی زیارة خیر الانام) اس پر مبسوط بحث الرفع والتکمیل میں ہے۔

حافظ طلحہ بن محمد نے مسند ابی حنیفہ میں زیارت کا مسنون طریق بھی حضرت عبداللہ بن عمر سے بحوالہ امام اعظم روایت کیا ہے:

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ نَارِجٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مِنَ السُّنَنِ أَنْ
تَأْتِيَ قَبْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قِبَلِ الْقِبْلَةِ
وَتَجْعَلَ ظَهْرَكَ إِلَى الْقِبْلَةِ وَتَسْتَقْبِلَ الْقَبْرَ لِوَجْهِكَ
نَحْمُ تَقُولُ السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ
اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ -

زیارت کا مسنون طریق یہ ہے کہ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر
آؤ قبلہ کی جانب سے اور پشت قبلہ کی طرف کر کے چہرہ قبر کی طرف
کر دو اور یوں کہو سلام علیک... الخ
مشہور محدث ملا علی قاری لکھتے ہیں -

إِعْلَمُوا أَنَّ نَبِيَّكُمْ سَيِّدَ الْمُسْلِمِينَ بِاجْتِمَاعِ الْمُسْلِمِينَ
مِنْ أَكْثَرِ الْقُرْبَاتِ وَأَفْضَلِ الطَّاعَاتِ وَالْحُجَّ
السَّاعِي لِنَيْلِ الدَّرَجَاتِ قَرِيبَةً مِنْ دَرَجَةِ الْوَاجِبَاتِ
لِمَنْ لَهُ سَعَةٌ وَتَرَكَهُ غَفْلَةً وَجَفْوَةً كَبِيرَةً
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مسلمانوں کے متفقہ فیصد کے
مطابق بہت بڑی قربت بزرگترین طاعت حصول درجات کی بہترین
کوشش ہے بشرطیکہ اس کی گنجائش ہو اسے چھوڑنا غفلت ہے۔

بہر حال امام اعظم حج کے موقع پر مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے اور امام مالک سے بھی
ملاقات آپ کی ہوتی چنانچہ انتصار السالک الامام البکیر مالک میں ہے کہ جب امام اعظم سے
مدینہ کی علمی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اس بستی میں
علم پھیلایا اور بکھرا ہوا دیکھا ہے اگر اسے کوئی سمیٹے گا تو یہ سرخ و سپید رنگ کا لڑکا ہے
یعنی امام مالک علیہ السلام

اس بستی میں جس میں علم پھیلا ہوا ہے امام اعظم نے جن مشائخ حدیث کے سامنے زانوئے
ادب تکیا ہے ان کی تفصیل تو از بس دشوار ہے لیکن میں یہاں بطور کھلے از گلزار چند گرامی قد
ہستیوں کا تعارف ہدیہ ناظرین کرتا ہوں تاکہ اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکیں۔

الحافظ ابو عبد اللہ نافع العودی رحمہ اللہ

آپ علم حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ام سلمہ،
حضرت رافع بن خدیج اور حضرت ابولبابہ کے شاگرد ہیں اور آپ کے سامنے الشقات النبلا
اور الائمة الاجلہ مثلاً امام اعظم، امام مالک، امام لیث بن سعد، قاضی ابوبکر بن حزم اور
امام زہری نے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے آپ کے شاگردوں کی ایک
طویل فہرست دی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی پورے تیس سال خدمت کی ہے۔ حضرت
عبداللہ امام نافع کو اپنے لیے اللہ سبحانہ کا انعام فرماتے تھے کہ ان کی علم میں جلالت قدر کا
اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کو بھی امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ حکومت
میں سنن کی تعلیم کے لیے سرکاری طور پر مصر روانہ کیا تھا۔ سید الحفاظ امام سیحی بن معین سے
جب دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک نافع عن ابن عمر اور سالم عن ابن عمر میں کون سا طریق
دلربا ہے؟ تو آپ نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی راجح نہ بتایا۔ حافظ ابن الصلاح
اور حاکم کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے امام بخاری کے متعلق تو تفتیح الانظار میں
حتمائے دعویٰ کیا ہے کہ امام بخاری کی رائے ہے کہ جس قدر اسانید موجود ہیں ان میں سب سے
زیادہ صحیح صرف وہ سلسلہ سند ہے جو بحوالہ امام مالک از نافع از عبداللہ بن عمر آتا ہے بلکہ علامہ
محمد بن اسماعیل ایمانی نے توضیح الافکار میں حافظ ابن الصلاح کی بیان فرمودہ قید اصح الاسانید
کلمہ سے یہ بات پیدا کر لی ہے کہ ”کل سند فی الدنیا“ یعنی دنیا میں جس قدر روایتی اور
تاریخی سلاسل موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ معتبر نافع از ابن عمر ہے۔ حافظ ذہبی نے
یونس بن یزید کی زبانی نقل کیا ہے کہ امام نافع کو امام زہری سے یہ شکایت تھی کہ زہری بھی

۱۔ اسعاف المبطار ص ۲۹۔ ۲۔ تہذیب ج ۱۱ ص ۴۱۲۔ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۹۴۔ ۴۔ تہذیب
ج ۱۰ ص ۴۱۴۔ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۹۴۔ ۶۔ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۴۱۴۔

عجیب شخص ہیں میرے پاس آتے ہیں اور بحوالہ ابن عمر مجھ سے احادیث سنتے ہیں اور یہاں سے سالم ابن عمر کے پاس جاتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ نے اپنے والد سے یہ بات سنی ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہاں۔ ان سے تصدیق کے بعد میری بیان کردہ حدیثوں کو ان کے نام سے پیش کرتے ہیں اور مجھے درمیان سے حذف کر دیتے ہیں۔ امام خلیلی فرماتے ہیں نافع ائمہ تابعین میں سے ہیں علم میں ان کی امامت پر اتفاق ہے۔

ائمہ ستہ کے علاوہ امام مالک نے مؤطا میں امام محمد نے کتاب الآثار میں اور قاضی ابو یوسف نے ان سے روایات کی تخریج کی ہے۔

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ نَافِعٍ مِّنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ يَقْتُلُ الْمُحْرِمُ
الْفَأْرَةَ وَالْعَقْرَبَ وَالْحِدَاةَ وَالْكَلْبَ الْعَقُورَ وَالْحَيَاتِ
إِلَّا الْجَانَّ يَكْفِيهِ

ابن عمر کہتے ہیں کہ احرام والا چوہے، بچھو، چیل، ہڑکے کتے اور سانپوں کو علاوہ شگ کے مار سکتا ہے۔

امام محمد نے کتاب الآثار میں یہ روایت درج کر کے لکھا ہے کہ وہ ناخذ وھو قول ابی حنیفہ اور مؤطا میں بھی امام موصوف نے یہ روایت بحوالہ مالک عن نافع ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ لَيْسَ عَلَى الْمُحْرِمِ فِي قَتْلِهِنَّ جُنَاحٌ
الْفَأْرَةُ وَالْعَقْرَبُ وَالْحِدَاةُ وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ

یہی روایت بالکل ان ہی الفاظ کے ساتھ بروایت یحییٰ مؤطا امام مالک میں بھی موجود ہے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں اسی روایت کا بحوالہ مالک عن نافع صرف اس قدر حصہ پیش فرمایا ہے۔

خمس من الدواب ليس على المحرم في قتلهن جناح

اور بحوالہ یونس بن شہاب از سالم پوری روایت نقل کی ہے اور پھر اسی کی تائید میں

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴۔ ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰۔ ۳۔ کتاب الآثار ص ۸۲

۴۔ مؤطا امام محمد ص ۲۱۰۔

امام ابو بکر محمد بن شہاب الزہری از عائشہ سے بھی یہی حدیث اس طرح نقل کی ہے ۔
 خمس من العوالب كلهن فاسق يقتلن في الحرم

روایت میں راویوں کا تعبیری اختلاف

یہاں عموماً یہ خلش محسوس کی جاتی ہے کہ جن الفاظ میں محدثین کی معروف کتابوں میں روایات ہوتی ہیں امام اعظم کی روایات میں وہ الفاظ نہیں ہوتے۔ لوگ تعبیر کے اس اختلاف کو دیکھتے ہیں تو بدک جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بات نبوت کی ہے اور تعبیری جامہ بیان کرنے والوں کا اپنا اپنا ہے امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ :

ہیں دس شخصوں سے حدیث سنتا تھا بات ایک ہوتی تھی مگر الفاظ مختلف ہوتے تھے المعنی واحد واللفظ مختلف لہ

حافظ ذہبی نے سفیان ثوری جیسے امام المحدثین کا قول نقل کیا ہے کہ

ہم اس کا ارادہ کریں کہ جس طرح ہم نے حدیث سنی ہے بعینہ وہ
 ہی تم کو سنا دیں تو شاید ہم ایک حدیث بھی بیان نہ کر سکیں لہ

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سفیان ثوری کی حدیث میں روایت لفظی نہیں ہے بلکہ
 معنی شیخ کے ہیں اور الفاظ ان کے۔ ابو حاتم جیسا امام تصریح کرتا ہے میں نے کسی محدث کو نہیں
 دیکھا کہ وہ حدیث کو ایک لفظ میں ادا کرتا ہو سبجز قبضہ کے۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں ۔

وَذَا لِكَ نَادِرٌ جَدَّوْا نَسْمَا يُوجَدُ فِي الْأَحَادِيثِ الْقَصَا

عَلَى قَلَّةٍ أَيْضًا فَإِنَّ غَالِبَ الْأَحَادِيثِ رُوِيَ بِالْمَعْنَى لَه

روایت باللفظ سے بالکل نادر ہے چھوٹی چھوٹی حدیثوں میں بھی بہت

کم ہے احادیث کا زیادہ حصہ روایت بالمعنی پر مشتمل ہے ۔

شاید اسی بنا پر حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ البالغہ میں یہ فرما گئے :

كَانَ إِهْتِمَامُ مَجْهُورِ السُّوَرِ وَالْوَاقِعِ عِنْدَ الرَّوَايَةِ بِالْمَعْنَى بِرُؤُسِ

الْمَعَانِي دُونَ الْإِعْتِبَارِ بِاتِّلَافِهَا الْمُتَعَمِّقُونَ لَه

عام راوی روایت بالمعنی کے وقت میں صرف معافی کا اہتمام کرتے تھے۔
 ان حیثیات کو پیش نظر نہ رکھتے جن کو تعمق پسند ملحوظ رکھتے ہیں۔
 اور اسی لیے روایات سے استدلال کرتے وقت صرف مدلول کلام پر نظر ہوتی ہے اسلوب کلام
 سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:-
 فَاسْتَبْدُ لَدَلِّهِمْ بِخَوَالِفِ الْفَائِدِ وَالْوَادِ وَتَقْدِيمِ بَعْدِ دَوَاخِرِهَا وَ
 تَخَوُّ ذَالِكِ مِنَ التَّحْقِيقِ لِه
 اس لیے حدیث میں فاء، واو حرف کی تقدیم و تاخیر اور اس قسم کی چیزوں
 سے استدلال کرنا متراسر تعمق ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ محدثین جب روایت بالمعنی کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ بقول حافظ سیوطی احادیث
 کا زیادہ ذخیرہ روایت بالمعنی ہی کی حیثیت رکھتا ہے تو ایسی صورت میں الفاظ کے اختلاف
 سے بدک کر کسی حدیث کا انکار کرنا فن حدیث کی کوئی خدمت نہیں ہے بلکہ میں یہاں تک
 کہتا ہوں کہ محدثین کے یہاں جن روایات کو مرفوع کہا جاتا ہے وہ سب فقہاء کے یہاں سنن
 اور فتاویٰ کی شکل میں موجود تھیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے یہ بات لکھ کر سمجھنے والوں کے
 لیے کچھ اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ:

أَصْلُ مَذْهَبِهِمْ فَتَاوَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ وَقَضَايَا عَلِيٍّ
 وَفَتَاوَاكَ وَقَضَايَا شُرَيْحٍ لِه

ابو حنیفہ کے مذہب کی اساس عبد اللہ کے فتاویٰ اور حضرت علی کے فیصلے ہیں۔

احادیث فقہ اور روایات حدیث

اسی بنا پر محمد بن سمار کا کہنا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں بیان کی ہیں۔ یعنی
 فقہ کے وہ سارے مسائل جو امام صاحب کے شاگردوں نے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں ان
 سب کا مقام فتاویٰ صحابہ ہونے کی وجہ سے روایات حدیث کا ہے اور ان کا نام احادیث فقہ
 ہے۔ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں جس دفتر کا پتہ دیا ہے کہ اس میں فاروق اعظم، علی بن ابی طالب

ابن مسعود کی مرویات صحیحہ مدون ہیں وہ فقہ کے سوا اور کون سا ہے بلکہ قرۃ العینین میں شاہ صاحب جو یہ بات لکھ رہی ہے کہ :

قرآن حکیم کے بعد اصل دین اور سرِ مایہ یقین علمِ حدیث ہے جیسا کہ خود قرآن میں ہے وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ اور علمِ حدیث جو کچھ بھی امت کے پاس موجود ہے یہ ابو بکر و عمر کی محنتوں کا نتیجہ ہے کیونکہ جن جن بزرگوں نے ان دونوں سے حدیثیں روایت کی ہیں اور ان کے نام روایات بیان کی ہیں وہ صرف اسی قدر نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مکثرین کی بیشتر احادیث مرفوعہ ابو بکر و عمر کی حدیثیں ہیں۔ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ نے ان کی بیان کردہ روایات کو مرفوعاً پیش کیا ہے اور اہل مسانید نے ظاہرِ حال کے پیش نظر ان بزرگوں کے مسانید میں جمع کر دی ہیں۔ یہ بات فنِ حدیث کے ماہر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ احادیث دراصل ان بزرگوں کے فتاویٰ ہیں احادیث اور روایات حدیث کے فرق پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں ہے صرف یہ بتانا ہے کہ اگر آیاتِ فقہ اپنے مصنفین سے متواتر ہیں جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں لکھا ہے تو پھر

۵ قرۃ العینین ص ۵۵ - ۵۶ منہاج السنہ میں ہے قد نقل ذالک سائر اصحابہ و ہم خلق کثیر غلو مذہبہ بالتواتر (ج ۲ ص ۵۷) امام اعظم سے مسائل فقہ بتواتر منقول ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے غیۃ الاسلام ملک العلماء عز الدین بن عبدالسلام سے ایک سوال کا جواب کتبِ فقہ کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ کتب نہ پر اعتماد کرنا علماء میں متفق ہے اور اس بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں کہ روایاتِ فقہ بالکل صحیح ہیں۔ ریب الراوی ص ۵۸ استاد ابوالسحاق اسفرائینی فرماتے ہیں کہ معتد کتابوں سے نقل کرنا درست اور اس پر اجماع ہے اس کے لیے ان کے مصنفین تک اتصالِ سند شرط نہیں ہے خواہ یہ کتابیں حدیث کی ہوں یا فقہ کی (مذریب ۸۵) اسی بنا پر علماء کے مراسیل کو سب زیادہ قوی اور معتبر بتایا ہے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری فرماتے ہیں علم ان اقوی المراسیل ما ارسلہ العلماء من اہلیت هذا الکتاب اور یہ بھی لکھا ہے اجمعت الامۃ علی بواتر اسناد ما فی الکتاب الصحیحة الی اہلہا بعد سماعہا اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس معاملہ میں حدیث اور دوسری (باقی صفحہ پر)

احادیث فقہ قوت و وثاقت میں بہت زیادہ قوی اور قابل اطمینان ہیں کیونکہ فقہ کے نام پر جو کچھ ہے وہ امام اعظم کا خود ساختہ نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے جو کچھ علقمہ نے سنا اور علقمہ سے جو کچھ ابراہیم نخعی نے سنا اور ابراہیم سے جو کچھ حماد نے اور حماد سے جو کچھ امام اعظم نے سنا اسی کا نام فقہ ہے۔

بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ راویوں کی اصل نظر روایت میں مدلول کلام پر ہوتی ہے۔ اسی لیے کتاب الآثار میں جو بات حضرت ابن عمر کی جانب سے بصورت فتویٰ تھی وہ ہی چیز کتب روایت میں حدیث مرفوعہ بن کر آئی ہے اور بس ورنہ بات ایک ہے۔ خیر یہ تو درمیان میں ایک جملہ معترضہ تھا یہ اس کتاب کا موضوع نہیں اللہ نے توفیق دے دی اور انفس حیات باقی رہے تو انشاء اللہ اس کی تفصیلات امام اعظم اور علم الفقہ میں آئیں گی۔

الحافظ ابو بکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہریؒ

یہ بھی صحابہ کرام اور کبار تابعین کے شاگرد ہیں اور بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام ابو ذاعی، امام لیث، امام مالک وغیرہ ان کے شاگرد ہیں۔ حافظ جمال الدین السیوطی نے اسعاف المبطایین، حافظ جمال الدین ابوالحجاج المزہبی نے تہذیب الکمال میں اور حافظ ذہبی نے مناقب میں تصریح کی ہے کہ یہ امام اعظم کے استاد ہیں۔ حافظ عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ان کا تعارف ان لفظوں میں پیش کیا ہے :

احد الاعلام من امّة الاسلام تابعی جلیل۔

ص ۳۵ کا بقیہ حاشیہ :- کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے لا فرق فیما ذکرہ من علم الحدیث و بین سائر علوم الاسلام و مصنفات العلماء الاعلام (الروض الباسم ص ۱۶، ۱۷) اس لیے جیسے آج ائمہ حدیث کی کتابوں کو بے اصل بتانا جہل اور جحش ہے ایسے ہی فقہ کی کتابوں کو غیر معتبر کہنا علم کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ امام محمد کی چھ کتابوں جامع صغیر، جامع کبیر، زیادات، مبسوط، السیر الصغیر، السیر الکبیر اور قاضی ابویوسف کی کتابوں الروعی، سیر الاوزاعی، اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ، الامالی اور کتاب الخراج میں یہی مسائل ہیں بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن المبارک اور امام دکیع کی تصانیف میں بھی یہی مسائل ہیں اور امام سفیان ثوری کی جامع کا بھی یہی ماخذ ہے حافظ ابن عید البر نے الانتقاء میں لکھا ہے کہ قاضی ابویوسف فرماتے ہیں سفیان الثوری اکثر متابعی لابی حنیفہ منی (ص ۱۲۸) البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۳۴۰

اور امام ذہبی فرماتے ہیں :

اعلمہ الحفاظ المدنی الامام

توت حافظہ اللہ پاک کی جانب سے بے پایاں ارزانی ہوئی تھی۔ صرف اسی روز میں قرآن عزیز نوک زبان کر لیا تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ :

اموی خاندان کے مشہور سربراہ ہشام بن عبد الملک نے امام زہری سے درخواست کی کہ میرے لڑکوں کے لیے کچھ حدیثیں قلم بند کر دیجئے۔ امام زہری نے منشی کو چار سو حدیثیں املا کرائیں، باہر تشریف لائے، اور محدثین کو ان کا درس دیا۔ کچھ روز کے بعد ہشام نے امام زہری سے کہا کہ وہ آپ کی چار سو حدیثوں والی دستاویز تو ضائع ہو گئی ہے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں ہے پھر وہی تمام حدیثیں منشی کو بلا کر املا کرائیں۔ ہشام پہلی کتاب نکال کر لایا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ واقعہ نگار کہتا ہے کہ فاذا هولم یخاد حرقاً ایک حرف کا بھی دونوں میں فرق نہ تھا۔

ان کی علمی جلالت قدر کا یہ حال تھا کہ امیر المومنین عمر بن عبد الغزیز فرماتے تھے کہ امام زہری سے استفادہ کرو اور وجہ یہ بتاتے تھے کہ امام زہری سے زیادہ سنت کا عالم کوئی نہیں رہا۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ محدثین تین ہیں۔ زہری، سیحی بن سعید انصاری اور ابن جریر۔

سب سے صحیح سند

فن روایت و اسناد میں سب سے معتبر، سب سے مستند اور سب سے زیادہ صحیح اسناد کے متعلق آپ امام بخاری کی رائے سن چکے ہیں۔ لیجئے دوسرے علماء کے خیالات بھی سن لیجئے۔ امام عبد الرزاق جو امام بخاری کے استاذ الاساتذہ ہیں فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ صحیح طریق الزہری عن علی بن الحسین عن الحسین عن علی ہے۔ مشہور محدث محمد بن سلیمان نے امام اسحاق بن ابراہیم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اصح الاسانید الزہری عن سالم عن ابن عمر ہے۔ امام سیحی بن معین کہتے ہیں عن عبد الرحمن عن القاسم عن عائشہ کو سب سے زیادہ پایدار اور معیاری سند کہتے ہیں۔ فضیل بن عیاض منصور عن ابراہیم

عن علقمہ عن عبد اللہ بن مسعود مقرر کرتے ہیں اور امام بخاری کے مشہور استاد عبد اللہ بن المبارک سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبد اللہ کی سند کو اتنی پائیدار اور صحیح قرار دیتے ہیں کہ اس طریق سے روایت کا آنا گویا ذات نبوت سے سننے کے مترادف ہے۔ اور بھی علماء کے اس موضوع پر خیالات ہیں۔

ایک لطیف نکتہ

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ امیر المومنین عمر بن عبد العزیز نے تدوین سنن کے کام پر زہری کو بھی مقرر کیا تھا اس کی وجہ خود امام زہری کے بیان سے معلوم ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے ان کے حوالے سے لکھا ہے کہ مجھے قاسم بن محمد نے کہا کہ میں تم کو علم کا حویلیں دیکھتا ہوں کیا میں تم کو علم کا مرکز نہ بتا دوں زہری نے فرمایا کہ ہاں۔ فرمایا کہ پھر عمرہ بنت عبد الرحمن کے پاس جاؤ کیونکہ یہ حضرت عائشہ کی آغوش میں پرورش پائی ہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں ان سے ملا ہوں میں نے ان کو علم کا دریا سچا پیداکنار پایا ہے۔

عمرہ بنت عبد الرحمن اور قاسم بن محمد دونوں حضرت عائشہ کے شاگردوں میں سے تھے۔

قاسم بن محمد کی شان علمی

قاسم بن محمد تو حضرت عائشہ کے برادر زادے اور فقہا ربیعہ میں سے ہیں۔ امام بخاری نے ان کے متعلق تصریح کی ہے:

قتل ابوہ فرقی یتیمًا فی حجر عائشۃ فتفقہ بہا۔^۱
ان کے والد قتل ہو گئے۔ انہوں نے یتیمی کا عرصہ حضرت عائشہ کی آغوش میں گزارا اور ان سے علم حاصل کیا۔

قاسم بن محمد مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے بہترین عالم شمار کیے جاتے ہیں۔ امام سیحی بن سعید انصاری نے اپنا اور اس دور کے دوسرے علماء کا ان کے بارے میں یہ تاثر بتایا ہے کہ: ہم نے اپنے زمانے میں مدینہ میں علم و فضل میں قاسم سے بڑھ کر

^۱ الکفایہ فی علوم الروایۃ ص ۳۹۷، ^۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶، ^۳ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۲۴

کوئی نہیں دیکھا ہے

مشہور فقیہ حضرت ابوالزنادان کے متعلق فرماتے تھے :
میں نے کسی نوجوان کو فقہ و سنت کا اتنا بڑا عالم اور ذہنی طور پر نکمہ تر
نہیں پایا جتنا قاسم بن محمد کو ہے

خالد بن نزار اور ابن عیینہ کا مستفقہ بیان ہے کہ :
دنیا میں حدیث عائشہ کے سب سے بڑے عالم تین ہیں قاسم، عروہ،
اور عمرہ ہے

امام ابن عون بصرہ کے مشہور امام اور حفاظ میں سے ہیں اور جن کو حضرت قاسم سے شرف تلمذ
حاصل ہے اور جن کے ہاں میں عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں پورے عراق میں ابن عون سے زیادہ
وانائے سنت کوئی نہ تھا (تذکرۃ الحفاظ) وہ اپنے استاد کے ہاں میں فرماتے ہیں :
تین آدمی ایسے ہیں کہ مجھے ان جیسا کوئی نہیں ملا۔ میں تو یہ محسوس کرتا
ہوں کہ انہوں نے اکیٹھ ہو کر علم و فضل کو سمیٹا ہے عراق میں ابن سیرین
حجاز میں قاسم بن محمد اور شام میں رجاء بن حیوہ ہے

حافظ ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں تین اقرانہ علیہ السلام کا عنوان
قائم کر کے ان کی علمی حیثیت کے ہاں میں ان کے معاصرین کے جو اقوال نقل کیے ہیں ان
کو دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

علوم میں قاسم بن محمد کو صرف فضل و کمال ہی حاصل نہ تھا بلکہ اللہ سبحانہ نے ان کو خاص مجتہد
شان سے بھی نوازا تھا۔ الذہبی نے ابن عیینہ کی طرف نسبت کر کے ان کے متعلق جو بات لکھی ہے
کہ کان القاسم اعلما اهل زمانہ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنے دور کی بے مثال
علمی شخصیت تھے ان کی علمیت کا اندازہ خود ان کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ :
زمانہ ابوبکر و عمر ہی سے عائشہ مندا افتاء پر فائز تھیں میں ان
کے پاس ہی رہا۔ عبداللہ بن عباس سے میں نے استفادہ کیا

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۱ - ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۳۴

۳۔ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۵۵ - ۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۷

ابن عمر اور ابو ہریرہ کے علوم سے بہت زیادہ بہرہ یاب ہوا ہوں۔
الغرض ان کی علمی جلالت اور شانِ امامت پر سب یک زبان ہیں۔

عمرہ بنت عبد الرحمن کا علمی مقام

عمرہ بنت عبد الرحمن قاضی ابوبکر بن حزم کی والدہ کبشہ کی بہن تھیں اس لیے قاضی صاحب کی خالہ ہوتی ہیں یہ بھی فقہت میں بہت بڑی شانِ جلالت کی مالک تھیں۔ امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ مَا بَقِيَ أَحَدًا عِلْمًا بِحَدِيثِ عَائِشَةَ مِنْ عُمَرَةَ حضرت عائشہ کی حدیثوں کو عمرہ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ قاسم بن محمد نے امام زہری کو عمرہ سے استفادے کا مشورہ دیا تھا امام زہری کا ان سے ملاقات کے بعد ان کے بارے میں تاثر یہ تھا۔

فَوَجَدْتُهَا بَحْرًا لَا يَنْزِفُ ۚ

میں نے ان کو بحر بیکراں پایا ہے۔

چونکہ امام زہری کے پاس قاسم اور عروہ دونوں کا علم تھا اور حدیثِ عائشہ کا ان دونوں سے بڑھ کر عالم کوئی نہ تھا اس لیے عمر بن عبد العزیز نے امام زہری کو بھی قاضی ابوبکر کے ساتھ تدریس سنن کا حکم دیا تھا۔

امام زہری صرف احادیثِ مرفوعہ ہی نہیں بلکہ آثارِ صحابہ بھی قلم بند فرماتے تھے۔ چنانچہ معمر کہتے ہیں کہ مجھے صالح بن کیسان نے بتایا ہے کہ میں اور امام زہری طلبِ علم میں دونوں ہم سفر تھے۔ ہم دونوں مرفوع حدیثیں لکھتے تھے مجھے امام زہری نے کہا کہ آثارِ صحابہ بھی لکھیں کیونکہ وہ بھی سنت ہیں میں نے کہا کہ نہیں لیکن امام زہری نے آثارِ صحابہ بھی لکھے اور میں نے نہیں لکھے۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ :

ان کی روایات ۲۲۰۰ ہیں جو کچھ سنتے تھے قلم بند کرتے جاتے تھے۔

ارشاداتِ نبوت پر ان کا لکھا ہوا قلمی سرمایہ کس قدر تھا اس کا اندازہ امام معمر کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بحوالہ امام عبد الرزاق نقل کیا ہے کہ

ولید بن یزید کے قتل ہونے کے بعد امام زہری کا علمی سرمایہ جانوروں پر لا کر سرکاری کتب خانہ سے نکالا گیا۔ علمی توجہ اور طلب علم میں ذوق و لگن اور شوق کا حال یہ تھا کہ امام بیث بن سعد کہتے ہیں۔

ایک بار کھانے میں امام زہری کے سامنے پلیٹ رکھی گئی کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس اثنائیں کوئی حدیث یاد آگئی اس قدر محو ہوئے کہ آپ کا ہاتھ پلیٹ میں رہا اور صبح ہو گئی۔

ان کا بھی علمی سرمایہ ان کے شاگردوں کی وساطت سے آج ذخیرہ حدیث کی زینت ہے گویا علم حدیث کا زمانہ تابعین یعنی پہلی صدی کے آخر میں کتابی ذخیرہ ہے۔

قاضی ابویوسف نے کتاب الآثار میں حافظ طلحہ بن محمد اور حافظ موسیٰ بن زکریا نے اپنی مسند میں ان سے روایات لی ہیں۔

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنِ النَّهْهَرِيِّ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

لہ امام بیث بن سعد کو اکثر اہل علم نے علماء احناف میں شمار کیا ہے چنانچہ قاضی ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اور شیخ الاسلام زکریا انصاری نے شرح بخاری میں ان کے حنفی ہونے کی تصریح کی ہے امام بیث امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ اکثر حج کے موقع پر امام اعظم کی خدمت میں استفتاء کی غرض سے حاضر ہوتے اور فقہ کی تحصیل کرتے چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ امام ابو محمد عارفی نے فقیہ مصر عبد الرحمن بن القاسم کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے بیث بن سعد سے سفر فرماتے تھے کہ مجھے اطلاع ملی کہ امام اعظم کا حج کا ارادہ ہے میں بھی امام صاحب سے استفتاء کے خیال سے حج کے لیے چل پڑا۔ آخر مکہ مکرمہ میں میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے مختلف ابواب کے بہت سے مسائل دریافت کیے مفتی حجاز علامہ ابن حجر مکی نے الخیرات الحسان میں امام اعظم کے فضائل میں لکھا ہے کہ مشائخ ائمہ مجتہدین اور علماء راسخین میں سے بڑے بڑے لوگوں نے امام اعظم کے سامنے زانوے ادب ترکیا ہے جیسے امام عبد اللہ بن المبارک جن کی جلالت شان پر اتفاق ہے اور امام بیث بن سعد اور امام مالک بن انس امام اعظم کی جلالت قدر کو سمجھنے کے لیے بھی ائمہ کافی ہیں۔ امام بیث نے امام اعظم کی بعض حدیثوں کو امام ابویوسف کے حوالہ سے روایت کیا ہے چنانچہ امام طحاوی نے مشہور حدیث من کان لہ امام فقہاً لہ قرآن کو شرح معانی الآثار میں اسی طریق سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں بھی ذکر کیا ہے اس سند کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں چار ائمہ مجتہدین جمع ہیں۔ عبد اللہ بن وہب، بیث بن سعد، ابویوسف اور ابو حنیفہ۔ لے البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۴۴۴۔

وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْمُنْتَعَةِ -

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منتہ سے منع فرمایا ہے -

ایک دوسری حدیث ہے :

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنِ الزَّهْرِيِّ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَذَبَ عَلَى مُتَعِدٍّ فَلْيَتَّبِعُوهُ مُقْعَدًا مِنَ النَّارِ

جو شخص مجھ سے جھوٹ بولتا ہے جان کر اسے اپنا ٹھکانا دوزخ بنالینا چاہیے۔

یہ روایت امام اعظم نے یحییٰ بن سعید کے حوالہ سے بھی روایت کی ہے۔ اس حدیث کو عشرہ مبشرہ اور ستر صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے شیخین، امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بحوالہ حضرت انس، امام احمد، امام بخاری، امام ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بحوالہ زہیر، امام ترمذی نے بحوالہ حضرت علی مرتضیٰ اور دوسرے محدثین نے مختلف صحابہ سے یہ روایت کی ہے حتیٰ کہ امام نووی نے اس کے تواتر کا دعویٰ نقل کیا ہے ۱۷

ان کے علاوہ مدینے کے باقی شیوخ جن کے سامنے امام اعظم نے زانوئے تلمذہ کیا ہے یہ ہیں — ابو عبد اللہ محمد بن المنکدر رحمہ اللہ، الحافظ یحییٰ بن سعید الانصاری رحمہ اللہ، ہشام بن عروہ رحمہ اللہ، واصل بن داؤد، ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص، موسیٰ بن طلحہ بن عبید اللہ رحمہ اللہ، ابو عبد اللہ عکرمہ مولیٰ ابن عباس رحمہ اللہ، عبد اللہ بن دینار، عطاء بن یسار، عبد الرحمن بن ہرمز رحمہ اللہ، عطاء بن السائب رحمہ اللہ، عدی بن ثابت، عبد اللہ بن علی بن الحسین، سالم بن عبد اللہ رحمہ اللہ،

امام اعظم نے امام مالک سے روایت لی ہے

مدینہ طیبہ کے مشائخ میں بعض علماء نے امام مالک کے شاگردوں میں حضرت امام اعظم کو بھی شمار کیا ہے اور بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ بھی امام مالک کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس موضوع پر زیریں المک میں حافظ سیوطی کو بہت زیادہ اصرار معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں انہوں نے کچھ شہادتیں بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ :

امام مالک کے استاد ہونے کا ذکر دارقطنی نے کتاب المدرج میں ،

ابن خسرو بلخی نے مسند ابی حنیفہ میں اور خطیب بغدادی نے کتاب الروایت میں کیا ہے یہ

در اصل حافظ سیوطی نے دارقطنی اور خطیب بغدادی کی جن دو روایتوں کا حوالہ دیا ہے۔ یہ دونوں خود روایتی نقطہ نظر سے محدثین کے نزدیک محل نظر ہیں۔ دونوں روایتیں یہ ہیں:-

عن محمد بن مخزوم عن جده محمد بن ضحاک ثنا عمران بن عبد الرحیم
ثنا یحکار بن الحسن ثنا حماد بن ابی حنیفۃ عن ابی حنیفۃ عن
مالک بن انس عن عبد اللہ بن الفضل عن نافع بن جبیر عن
ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الایم احق
بنفسها من ولیها والیکر تسامر وصمتها اقراءها۔

اخرجہ ابن اثا ہیں والد دارقطنی۔ رائد عورت اپنی زیادہ مقدار ہے اپنے
ولی کی نسبت اور نوجوان سے دریافت کیا جائے اس کی خاموشی اقرار ہے۔
خطیب کی روایت یہ ہے :

عن محمد بن علی الصلی الواسطی ثنا ابو نضر رعة احمد بن الحسین
ثنا علی بن محمد بن مہر و یہ ثنا المجبر بن الصلت ثنا القاسم
بن الحكم العرفی ثنا ابو حنیفۃ عن مالک عن نافع عن
ابن عمر قال اتی کعب بن مالک النبی صلی اللہ علیہ وسلم
فسالہ عن راعیتہ کانت ترعى فی غنمہ فتخوفت علی شاة
الموت فذبحتها لحج فامر النبی باکلها۔

اقوم المساک میں ہے کہ تمام دفتر حدیث میں ان مذکورہ بالا دو روایتوں کے علاوہ کوئی حدیث
نہیں ہے جس سے امام اعظم کا امام مالک سے تلمذ ثابت ہو لیکن ان دونوں کی تاریخی حیثیت
محدثین کے یہاں ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان دونوں روایتوں کی روایتی
حیثیت کو محل کلام قرار دیتے ہوئے النکت علی ابن الصلاح میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ :
لَمْ تُثَبِّتْ رِوَايَةُ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ مَالِكٍ وَ إِنَّمَا

أَوْ رَدَّهَا الدَّارَ قُطْنِي ثُمَّ الْخَطِيبُ لِيهِ وَبَيْتَيْنِ وَقَعَتَا لَهُمَا
بِأَسْنَادَيْنِ فِيهِمَا مَقَالٌ -

امام اعظم کی امام مالک سے روایت ثابت نہیں ہے۔ دارقطنی اور
خطیب نے اس بات کا دعویٰ ان دو روایتوں کی وجہ سے کیا ہے جن
کی اسناد محل کلام سے لے

حافظ صاحب نے ان روایات کی جس اسنادی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل یہ
ہے کہ دارقطنی کی روایت میں عمران بن عبدالرحیم راوی ہے۔ یہی شخص اس من گھڑت کہانی کا ذمہ دار
ہے۔ حافظ ذہبی نے میزبان الاعتدال میں حافظ سلیمانی کے حوالہ سے اس کا نام لے کر یہ انکشاف کیا ہے

هُوَ الَّذِي وَضَعَ حَدِيثَ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ مَالِكٍ بِه
یہی شخص ہے جس نے ابو حنیفہ از مالک کی حدیث بنائی ہے۔

در اصل روایت صرف اس قدر تھی کہ حماد بن ابی حنیفہ نے امام مالک سے سنا مگر عمران نے درمیان میں ابو حنیفہ
کا اپنی جانب سے اضافہ کر دیا۔ چنانچہ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن مخلد نے اپنے رسالہ نامی 'مارواه الاکابر عن
مالک' میں اس کا سند اس طرح بیان کی ہے :

حدثنا ابو محمد القاسم بن هارون ثنا بكار بن الحسن الاصمغاني
ثنا حماد بن ابی حنیفہ ثنا مالک بن انس الحدیث ۳۷

یہ بھی اس کی تائید ہے کہ اصل سند میں حماد بن ابی حنیفہ عن مالک ہے۔ ابو حنیفہ عن مالک
نہیں ہے اور جامع المسانید میں بھی سند اس طرح ہے۔ حافظ سیوطی نے اسی سلسلے میں سند ابی
حنیفہ لابن الضیاء کا بھی حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ فراتے ہیں :-

ثُمَّ وَقَفْتُ عَلَى مُسْنَدِ أَبِي حَنِيفَةَ لِأَبِي الضَّيَاءِ الَّذِي
جُمِعَتْ مِنْ خَمْسَةِ عَشَرَ مُسْنَدًا وَفِيهِ مِنْ رِوَايَةِ
أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ مَالِكٍ ۳۸

مجھے مسند ابی حنیفہ ابن الضیاء کا نسخہ ملا ہے اسے مؤلف نے پندرہ

مسندوں سے جمع کیا ہے اور اس میں ابو حنیفہ از مالک کی روایت ہے۔
 یہ مسند ابی حنیفہ دراصل جامع المسانید کا خلاصہ ہے۔ جامع المسانید اب زیور طباعت سے آراستہ
 ہو چکا ہے۔ اس میں کتاب الآثار کے حوالہ سے یہ روایت ضرور ہے مگر اسے امام محمد بحوالہ امام اعظم
 عن نافع عن ابن عمر روایت کرتے ہیں۔ البتہ امام محمد نے اپنے مؤطا میں یہی روایت بحوالہ مالک عن
 نافع عن ابن عمر پیش فرماتی ہے۔

دوسری روایت خطیب کی ہے اس میں مجرب بن الصلت کو غلط فہمی ہوئی۔ اس نے عبد الملک کی
 جگہ مالک کہہ دیا کیونکہ اس روایت کی جن محدثین نے تخریج کی ہے اس کی تفصیل علامہ خوارزمی نے
 دی ہے ان تمام روایات میں کوئی طریق بھی ایسا نہیں ہے جس میں ابو حنیفہ از مالک آیا ہو۔ اس
 میں اول تو محمد بن المغیرہ بحوالہ قاسم از ابی حنیفہ ہے اور قاسم کے علاوہ دوسرے طرق میں بحوالہ
 امام محمد اور قاضی ابویوسف ابو حنیفہ از عبد الملک بن عمیر آیا ہے کسی بھی طریق میں ابو حنیفہ از مالک
 نہیں ہے۔

اشتبہ کی روایت سے غلط فہمی

زیادہ تر غلط فہمی اشتبہ کی اس روایت سے ہوئی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ
 کو امام مالک کے سامنے اس طرح دیکھا ہے جیسے بچہ باپ کے سامنے۔ اشتبہ کا یہ بیان بھی
 اصول روایت کے مطابق صحیح نہیں ہے کیونکہ اشتبہ کا سن ولادت حسب بیان ابن یونس
 ۱۵۵ھ ہے یعنی امام اعظم کی وفات والے سال ان کی عمر صرف پانچ سال کی ہے۔ اس عمر میں
 ان کا مصر سے مدینہ جانا اور امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سامنے دیکھنا انسانی عقل باور نہیں کرتی۔
 کوثری لکھتے ہیں :

امام ذہبی نے امام مالک کے ترجمہ میں جو واقعہ بیان کیا ہے صحیح نہیں
 ہے ہاں اگر امام ابو حنیفہ کے صاحبزادے حماد کے متعلق ہو تو شاید
 درست ہو کیونکہ اشتبہ کی تاریخ پیدائش ۱۵۵ھ ہے۔
 تعلیقات میں ہے :

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اشہب کی زبانی جو کہانی بیان کی ہے وہ تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے کیونکہ اشہب امام شافعی کی عمر کے لگ بھگ ہیں یا محتاط سے محتاط اندازے کے موافق امام ابو حنیفہ کی وفات کے وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ دس سالی ہوتی ہے ان کی ملاقات امام مالک سے اس دور میں ثابت نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے امام مالک معلم الاطفال نہ تھے کہ اس عمر کے بچے ان کے پاس ہوں۔ دراصل واقعہ کا تعلق ابو حنیفہ سے نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے حماد سے ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ کی امام مالک سے روایت حدیث محتاج ثبوت ہے اور جن راہوں سے اسے ثابت کرنے کی کوشش سیوطی اور دارقطنی نے کی ہے وہ محدثین کے یہاں ناقابل اعتبار ہیں۔ ورنہ امام اعظم کے لیے یہ خبر قطعاً قابل عار نہیں ہے کہ وہ امام مالک سے حدیثوں کا سماع کریں بلکہ محدثین کا کہنا ہے کہ ایک محدث اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ اعلیٰ، ہم سر اور کتر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے۔ امام مالک تو امام اعظم کے اقران میں سے ہیں۔ امام اعظم نے تو اپنے تلامذہ تک حدیثیں بیان کی ہیں چنانچہ امام خراسان ابراہیم بن طہمان کے متعلق امام ذہبی نے تصریح کی ہے کہ:

حَدَّثَنَا أَبُو حَنِيفَةَ

ابن ابی حاتم نے تقدیمۃ الجرح والتعديل میں ابراہیم کے حوالہ سے امام مالک سے روایات سننے کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

ابراہیم بن طہمان کہتے ہیں میں مدینہ آیا اور حدیثیں لکھی ہیں۔ وہاں سے کوفہ گیا اور امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا سلام کیا آپ نے پوچھا مدینہ میں کس سے استفادہ کیا؟ میں نے نام بتایا۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا مالک بن انس سے بھی کچھ لکھا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ دکھاؤ۔ بعد ازیں آپ نے قلم و دوا

منکا کر نقل کیا ہے۔

لیکن روایت اقران کے لیے حلقہ درس میں شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ مذاکرے کے ضمن میں بھی روایت ہو سکتی ہے۔ پھر یہاں خود امام ابو حنیفہ کی امام مالک سے روایت کرنا محققین سے ثابت نہیں ہے۔

حافظ مغلطائی کی تحقیق

اگر تاریخی طور پر یہ صحیح ثابت ہو جائے اور حافظ دارقطنی، خطیب بغدادی اور حافظ سیوطی کی بات ہی اپنالی جائے تو پھر حافظ علاء الدین مغلطائی کا یہ دعویٰ صحیح ہو جائے گا کہ اسانید روایت کی دنیا میں سب سے زیادہ جلیل القدر یہ سلسلہ سند ہے ابوحنیفۃ عن مالک عن نافع عن ابن عمر، آپ اصح الاسانید کے سلسلہ میں امام بخاری کی لائے پہلے پر ٹھہر چکے ہیں کہ مالک عن نافع عن ابن عمر کا طریق سلسلہ الذہب ہے۔ اسی پر قدم جمتے ہوئے حافظ ابو منصور عبد القاہر لمیثی نے شافعی از مالک از نافع از ابن عمر کو اجل الاسانید لکھا ہے اس پر حافظ مغلطائی نے حافظ عبد القاہر کا تعاقب کیا اور بتایا کہ اگر صحت روایت کا مدار جلالت شان اور عظمت قدر پر ہے تو پھر تاریخ کی دنیا میں اجل الاسانید

ابوحنیفۃ عن مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور اگر جلالت شان نہیں بلکہ اس کا مدار اتقان و ضبط ہے تو پھر ابن وہب عن مالک یا القعنبنی عن مالک کا طریق بزرگترین ہونا چاہیے۔ حافظ بلقینی نے محاسن الاصطلاح میں

۱۔ تقدیر الجرح والتعديل ص ۳۰ - ۲۔ نام عبد اللہ بن وہب بن مسلم اور کنیت ابو محمد ہے۔ ان کا مولد و مکن مصر ہے چار سو آئمہ حدیث کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ ابن عدی، ابن یونس ان کی جلالت علمی کا لوہا مانتے ہیں فقہ، حدیث اور عبادت کا ایک مثالی نمونہ تھے ۳۵ھ میں پیدا ہوئے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۹۰ھ میں وفات پائی ان کے حالات استخاف النبلاء میں ہیں۔

۳۔ نام عبد اللہ بن سلمہ بن قعنبن الحارثی ہے مشہور قعنبنی ہے اصلاً مدنی ہیں مگر بورد و باش بصرے میں تھے آخر عمر میں مکہ تشریف لے آئے بہت سے شیوخ وقت سے استفادہ کیا۔ موطا کے راویوں میں سے ایک ہیں۔ استخاف میں ہے کہ از جملہ اصحاب مالک و فضلاء وثقات و خيار ایشاں بود سیحی بن معین (باقی صفحہ ۲ پر)

حافظ مغلطائی کے اس فیصلہ کی صحت اور قوت کو مانتے ہوئے لکھا ہے کہ
 اما ابو حنیفۃ فہو وان روٰی عن مالک کما ذکرہ الدارقطنی
 لکن لم یشترکہ روایتہ عند کاشتہار روایت الشافعی
 یعنی اگر ابو حنیفہ عن مالک کو شافعی عن مالک جیسی شہرت ہوتی تو پھر امام بلیغینی کے
 خیال میں امام ابو حنیفہ کی جلالت قدر کی وجہ سے ابو حنیفہ عن مالک الخ ہی سب سے صحیح اور
 سب سے بزرگتر سلسلہ سند ہوتا اور دنیا سے روایت میں اسی کو سلسلۃ الذہب کہا جاتا۔
 حافظ عراقی نے حافظ مغلطائی اور حافظ بلیغینی دونوں کے بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے
 لکھا ہے۔

امام اعظم کی امام مالک سے روایت جو دارقطنی نے غرائب میں
 لکھی ہے اس کا سلسلہ سند نافع عن ابن عمر نہیں ہے۔
 یعنی اگر روایت کا سلسلہ فی الواقع یہ ہو کہ ابو حنیفہ عن مالک عن نافع عن ابن عمر اور
 روایتی نقطہ نظر سے اس کی صحت ثابت ہو جائے تو پھر حافظ عراقی کی رائے میں اسے ہی
 اصح الاسانید اور اجل الاسانید ہونا چاہیے۔ یہی بات حافظ عسقلانی نے فرمائی ہے۔

اما اعتراضہ بابی حنیفۃ فلا یحسن لان ابا حنیفۃ لم

تثبت روایتہ عن مالک

حافظ مغلطائی کا یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ امام اعظم کی امام مالک سے روایت
 ثابت نہیں ہے۔

اس کا مدلول بھی یہی ہے کہ اگر ابو حنیفہ کی امام مالک سے روایت ثابت ہو جائے تو پھر

۳۶۹ کا بقیہ حاشیہ: کہتے ہیں کہ حدیث میں تلہت میں نے صرف دو میں دیکھی ہے وکیع بن الجراح
 اور قعنی۔ ۳۷۰ تاریخ ولادت ہے اور ۲۲ھ میں وفات پائی۔

۱۷ قاضی القضاۃ علم الدین صالح بن سراج الدین البلیغینی پورا نام ہے اپنے زمانے میں مذہب
 شافعی کے زعم ہیں اصول میں عز الدین بن جامع کے شاگرد ہیں۔ حافظ سیوطی نے بھی ان سے
 اجازت حدیث لی ہے ان کا سن ولادت ۲۹۱ھ ہے اور وفات ۳۶۸ھ میں ہوئی ہے۔

۱۸ التعلیق المجدد ص ۱۶۔ ۱۹ مقدمہ فتح الملہم ص ۳۵

تاریخ و اسناد کی دنیا میں حافظ عسقلانی کے خیال میں اصح الاسانید یہی ہے۔ اس تمام تفصیل اور رد و کد سے ضمنی طور پر یہ بات بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے کہ بارگاہِ محدثین اور روایت و اسناد کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کی نظر میں امام اعظم کا مقام سب سے اونچا ہے۔ آنا و پنا کے محدثین کے یہاں آپ کی ذات کو اصح الاسانید کے موقع پر بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ اگر معاذ اللہ حضرت امام کی ذات گرامی کسی درجے میں بھی محدثین کے نزدیک مجرد و مقدوح ہوتی یا کوئی بات بھی آپ میں قابل گرفت ہوتی تو اصح الاسانید جیسے نازک ترین موقع پر نہ کوئی آپ کا نام لیتا اور نہ بلفقینی، عراقی اور عسقلانی جیسے اساطین حدیث ایسے مقام پر خاموش رہتے۔ دراصل یہ ان لوگوں کے لیے سُرْمَتِ چشم بصیرت ہے جو امام موصوف کی شان جلالت پر حرف گیری ہی کو پروانہ محدثیت قرار دیتے ہیں۔

امام مالک کی نظر میں امام اعظم کا مقام

اصل یہ ہے کہ امام مالک امام اعظم کا غایت درجہ اکرام کرتے تھے۔ چنانچہ محمد بن اسماعیل بن فاریک کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک اور امام اعظم دونوں کو مدینہ میں دیکھا ہے۔ دونوں باہم ہاتھ پکڑے جا رہے تھے جب دونوں مسجد نبوی کے دروازے پر پہنچے تو امام مالک نے اوبابا امام اعظم کو لگے کہ دیا۔ امام اعظم یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے بسم اللہ ہذا موضع الامان فامنی من عذابك ونجني من عذاب النار۔

حافظ ابن ابی العوام نے عبد العزیز بن محمد دروردی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ امام اعظم نے فرمایا ہے کہ میں نے مدینہ طیبہ میں علم پھیلا ہوا دیکھا ہے اگر کوئی سمیٹ سکتا ہے تو یہ سُرْمَتِ سفید لڑکا ہے یعنی امام مالکؒ۔

ظاہر ہے کہ یہ بات امام اعظم نے امام مالک کے بارے میں اس وقت کہی ہے جبکہ عمر چودہ پندرہ سال ہے۔ اس وقت لامحالہ امام اعظم کی عمر پچیس سال کی ہوتی ہے گویا یہ بات امام اعظم نے ۱۷ سالہ میں فرمائی ہے اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہی سال امام اعظم کے اسفار علمیہ کا پہلا سال ہے۔ خود امام مالک امام ابو حنیفہ کا بیحد اکرام کرتے تھے اور اکرام اس لیے نہیں کرتے تھے کہ عمر

میں بڑے تھے بلکہ اس لیے کہ امام مالک کو امام اعظم کی فقہیت اور مجتہدانہ شان کا اقرار تھا۔ اور اتنا اقرار تھا کہ اپنے اعمال میں امام اعظم کے کردار کی کاپی کو اپنے لیے فخر محسوس کرتے تھے چنانچہ امام لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ:

میں مدینہ میں امام مالک سے ملا۔ ان سے میں نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہیں فرمایا کہ امام ابو حنیفہ کے سامنے عرق آلود ہو جاتا ہوں کیونکہ وہ فقیہ ہیں۔ امام لیث کہتے ہیں کہ بعد ازیں میں امام ابو حنیفہ کے پاس گیا میں نے ان سے عرض کیا کہ امام مالک کی نظر میں آپ کا مقام بہت بلند ہے امام اعظم نے فرمایا کہ میں نے سچے اور کھرے جواب میں مالک سے زیادہ تیز اور کھرا کوئی نہیں دیکھا۔

الغرض امام مالک امام اعظم کے استاد نہیں چنانچہ جمال الدین المزی نے تہذیب الکمال میں اور امام ذہبی نے اپنی تصانیف میں امام اعظم کے مشائخ میں امام مالک کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المضية میں، علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں اور حافظ ابن حجر نے امام صاحب کے تلامذہ میں شمار کیا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ حضرت امام شافعی نے عبد العزیز بن محمد دراوردی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ

كَانَ مَالِكٌ يَنْظُرُ فِي كُتُبِ ابْنِ حَنِيفَةَ وَ يَنْتَفِعُ بِهَا

امام مالک امام اعظم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے استفادہ فرماتے۔

بصرہ

مشہور اسلامی شہر جو تیسری صدی تک علوم اسلامیہ کا گہوارہ رہا اور وسعت علم، کثرت حدیث اور دوسری خوبیوں کے لحاظ سے اس کا ایک امتیازی مقام تھا۔ امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں بصرہ کے اندر سکونت اختیار کرنے والے صحابہ کی ایک فہرست دی ہے اور ایسے ہی کتاب کی نوع ۴۹ میں جہاں امام حاکم نے مختلف شہروں کے ان ائمہ ثقات کا تذکرہ کیا ہے

جن کی احادیث پر حفظ و تذکرہ کی حدود میں اعتماد کیا جاسکتا ہے بصرہ کے ائمہ ثقات اور حفاظ حدیث کا بھی ایک طویل تذکرہ کیا ہے اور تقریباً نصف صد سے زیادہ حفاظ حدیث کے نام بتائے ہیں حافظ ذہبی فرماتے ہیں :

بصرے میں حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عمران بن حصین، حضرت ابن عباس اور متعدد صحابہ اکابر فروکش ہوتے ان میں سب سے آخری حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص، ان کے بعد حسن بصری، ابن سیرین، ابو العالیہ، پھر قتادہ، ایوب، ثابت البنانی، یونس بن عون، پھر حماد بن سلمہ، حماد بن زید اور ان کے تلامذہ ہو گئے۔ اس کے بعد امام ذہبی نے لکھا ہے :

ما ذال هذا الشأن واخر الى اس المائة الثالثة وتناقص جدا الى ان تلاشى له

بصرے میں حدیث کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ حافظ ذہبی نے حماد بن سلمہ بصری کے تذکرے میں حافظ ابن المدینی کے حوالے سے لکھا ہے :

كان عند يحيى بن خريس عن حماد عشرة آلاف حديث
بصرے میں محدثین کی اس قدر فراوانی تھی کہ مسند وقت حافظ مسلم بن ابراہیم بصری کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے حدیثیں قلم بند کیں اور وجہ کاپل جو بصرہ سے دس میل سے اتر کر نہیں گیا کہ ائمہ مجتہدین میں سے امام حسن بصرہ ہی کے رہنے والے ہیں جن کے متعلق امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے سنا ہے کہ عراق میں حسن بصری جیسا کوئی نہیں ہے۔ ائمہ اور الامام الربانی محمد بن سیرین جو علم الرویا کے امام ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے ہیں اور جن کے پاس امام اعظم نے اپنے ایک خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لیے ایک دوست کو روانہ فرمایا۔ چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں :

امام البريوسف فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے خواب میں دیکھا کہ

لے الاعلان بالتوزيع بحوالہ الامصار ذوات الآثار۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حماد بن سلمہ۔ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ مسلم

بن ابراہیم۔ ۴۔ کتاب الآثار ص ۲۰۹۔

آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھود رہے ہیں۔ کھود کر آپ کی ہڈیوں کو جمع کر رہے ہیں اور ان کو جوڑ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو آپ بہت گھبرائے۔ آپ نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بصرہ جاؤ تو امام ابن سیرین سے خواب کی تعبیر دریافت کرنا اور جا کر خواب کی تعبیر لو چھی آپ نے فرمایا کہ یہ خواب دیکھنے والا شخص احیائے سنت کا کام کرے گا۔

امام اعظم ابو حنیفہ طلب علم حدیث کے لیے بصرہ تشریف لے گئے ایک بار نہیں بلکہ بیس مرتبہ سے زیادہ آپ کو بصرہ جانے کا اتفاق ہوا ہے اور وہاں سال بھر قیام کیا ہے۔ چنانچہ حافظ عبد القادر قرشی نے بحوالہ یحییٰ بن شیبان خود امام صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے :-

میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا ہوں اور اکثر سال سے زیادہ وہاں قیام بھی کیا ہے۔

حضرت امام اعظم کے اسفار علمیہ میں بصرہ ابتدائی اور آخری منزل ہے جیسا کہ آپ پہلے حافظ ابن تیمیہ کی زبانی سن چکے ہیں کہ اسلامی مملکت میں علوم نبوت کے لیے پانچ شہروں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کوفہ میں عبد اللہ بن مسعود کے شاگرد، بصرہ میں عبد اللہ بن عباس کے شاگرد، مکہ و مدینہ میں فاروق اعظم کے تلامذہ علوم نبوت کے حامل تھے۔ بصرہ میں عبد اللہ بن عباس کے علوم کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خود ابو بکر بصری کا بیان ہے کہ :

ابن عباس بصرہ تشریف لائے تو تمام عرب میں جسم، علم، بیان، جمال اور کمال میں کوئی ان کی مثال نہ تھا۔

علامہ کمال الدین البیاضی نے امام اعظم کے علوم کی سند اور ان کے علمی سفر نامے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

فہو اخذ عن اصحاب عمر عن عمرو عن اصحاب ابن مسعود
عن ابن مسعود عن اصحاب ابن عباس عن ابن عباس فہم
یبلغ الحد المذكور بالكوفة والبصرة والحجاز فی حجة سنة
ست وتسعين و بعد

امام اعظم کے علوم کا ماخذ بواسطہ اصحاب عمر، حضرت فاروق اعظم اور
بواسطہ اصحاب ابن مسعود، خود حضرت عبداللہ بن مسعود اور بحوالہ
تلامذہ ابن عباس حضرت عبداللہ بن عباس ہیں ان ہی لوگوں کی
مذکورہ بالا تعداد سے امام اعظم نے کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ میں ۹۶ھ
اور اس کے بعد علوم حاصل کیے۔

بصرہ میں جن حفاظ حدیث سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں

الامام ابو بکر ایوب بن ابی تمیم السخیتی

علم حدیث کے مشہور امام ہیں۔ امیر المؤمنین فی الحدیث امام شعبہ نے ان کو سید العلماء کہا ہے۔ امام
مالک فرماتے ہیں کہ ہم ان کے پاس جاتے تھے جب ان کے سامنے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا
کوئی ارشاد گرامی بیان کیا جاتا تو بے اختیار رو پڑتے۔ امام ذہبی نے ان کو الحافظ، احد الاعلام
لکھا ہے۔ امام اشعث ان کو جہیز العلماء فرماتے ہیں۔ ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ میں نے بصرہ
میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ ہشام بن حسان کہتے ہیں کہ انہوں نے ۵۴ حج کیے ہیں۔ علم حدیث
میں جن اساتذہ کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب کیا ہے وہ بڑے بڑے جلیل القدر
ائمہ ہیں۔ مثلاً عمرو بن سلمہ، القاسم بن محمد، نافع، عطاء، عکرمہ، عمرو بن دینار، اور جن تلامذہ نے
ان سے علمی استفادہ کیا ہے ان میں سے حماد بن زید، حماد بن سلمہ، امام اعظم، امیر المؤمنین فی الحدیث
امام شعبہ، امام مالک اور حضرت امام اعظم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام شعبہ نے ایک بار ان کی طرف نسبت کر کے حدیث بیان کی تو فرمایا حدیثی ایوب دکان
سید الفقہاء۔ ابو بکر کہتے ہیں کہ ایک بار آپ حج کو تشریف لے گئے۔ راستہ میں رفقا سفر کو
پیاس کی سختیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت ایوب نے فرمایا کہ دوستو! کسی سے نہ کہنا، وعدہ کرو
سب نے ہاں کی۔ ہاتھ سے زمین پر گول دائرہ بنایا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے دیکھتی آنکھوں
پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔ خوب پیاس، جانوروں کو سیراب کیا۔ بعد ازیں حضرت ایوب نے اس پر ہاتھ پھر
دیازمین ہموار ہو گئی اور پانی ختم ہو گیا۔ ابو العریض کہتے ہیں کہ میں نے ابو بکر کی زبانی یہ واقعہ سنی

سنا تھا۔ بصرہ آیا تو حماد بن زید سے بیان کیا۔ حماد کہتے ہیں کہ میرے لیے عبد الواحد بن زیاد نے یہی
اس طرح بیان کیا۔^۱

حافظ ابن المدینی فرماتے ہیں کہ حدیث کے ذخیرے میں ان کی آٹھ سو حدیثیں ہیں۔ حافظ
عبد البر لکھتے ہیں کہ امام حماد بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے حج کا ارادہ کیا حج کی خاطر رخصت ہونے
لیے امام ایوب کے پاس گیا۔ آپ نے مجھے بتایا کہ معلوم ہوا ہے کہ امام اعظم بھی حج کو جا رہے
تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ان سے میرا سلام کہنا۔^۲

علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں لکھا ہے کہ امام ایوب کی علمی جلالت، امام
حافظ، ثقافت، علمی مہبت، فہم و فراست اور سیاحت پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ امام
نے ان سے جو حدیثیں سنی ہیں وہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الآثار میں اور اصحاب مسانید میں
حافظ طلحہ بن محمد اور حافظ ابو عبد اللہ الحسین نے درج کی ہیں۔ مثلاً

ابو حنیفۃ عن ابی بکر ایوب البصری ان امرأۃ ثابت بن
قیس بن شماس اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت
لا یجمعنی و ثابتاً سقفاً بدأ فقالت اختلفین منہ
بحدیقتہ التي اصعد قلک قالت اجل و زیادۃ قال
صلی اللہ علیہ وسلم اما لزیادۃ فلا و اشار الی ثابت
ففعل۔^۳

امام ایوب کا تذکرہ امام حاکم نے ان ائمہ حدیث میں کیا ہے جن پر حدیث کے معاملے
بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔^۴

مجھے تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی علمی طلبگاری
کے وقت ان شہروں کی رونق کا کیا حال تھا۔

امام ایوب کے علاوہ بصرہ کے جن محدثین سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے ان
نام یہ ہیں مبہر بن حکیم، ابوبکر بن عبد اللہ المزنی، عطاء بن عجلان، قتادہ بن دعامہ، مبارک بن قہ

^۱ الانتقاء۔ ^۲ الانتقاء ص ۱۲۵۔ ^۳ کتاب الآثار

^۴ معرفۃ علوم الحدیث ص ۹۲۔

یزید بن ابی یزید، محمد بن الزبیر، شداد بن عبد الرحمن، ابو سفیان طریف بن سفیان، نصر بن سعد، یزید بن ابی حبیب۔

حدیث میں امام اعظم کا نمایاں مقام

امام اعظم کی علمی رحلتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ امام موصوف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی شیفگی اور آپ کی حدیثوں کے فراہم کرنے میں محنت اور جانفشانی اس وقت کی جبکہ ابھی تدوین حدیث یعنی تاریخ سنت کی صبح صادق ہی ہوئی تھی اور اس کے لیے کوفہ، کوفہ سے باہر جو تک و دو کی ہے اس کا اندازہ امام صاحب کے اساتذہ سے ہو سکتا ہے۔ امام اعظم کوفہ سے باہر تلاش حدیث کے لیے اس وقت تشریف لے گئے جبکہ پہلے اپنے گھر کی تمام حدیثیں سمیٹ چکے تھے اور کوفہ میں پھیلا ہوا سارا علمی سرمایہ آپ کی ذات گرامی میں جمع ہو چکا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن القیم الجوزی نے مشہور محدث یحییٰ بن آدم کے حوالے سے لکھا ہے۔

کان نعمان قد جمع حدیث بلدہ کلہ

اور علمی سفروں سے فراغت کے بعد بھی بایں وسعت نظر ہمیشہ اس بات کے متلاشی رہتے تھے کہ کوفہ میں کوئی نامور محدث آئے تو اس کی محدثانہ معلومات سے اپنے علم میں اضافہ کریں۔ چنانچہ مشہور محدث امام النضر بن محمد مروزی جو امام عبد اللہ بن المبارک کے گھر سے دوست ہیں فرماتے ہیں :

لے ان کا پورا نام نصر بن محمد کنیت ابو عبد اللہ ہے مرد کے رہنے والے ہیں ابو اسحاق اشیبانی عبد العزیز بن رفیع العلّاب بن المسیب، محمد بن المنکدر، امام عمتش، امام مسعر بن کدام، ابو حنیفہ، یزید بن ابی زیاد، ابی جناب الکلبی کے شاگرد ہیں اور مشہور محدث امام اسحاق بن راہویہ، حسان بن موسیٰ اور علی بن الحسن کے استاد ہیں۔ محمد بن سعد کہتے ہیں کہ نصر بن محمد علم، فقہ، عقل اور فضل میں پیش پیش تھے۔ امام عبد اللہ بن المبارک کے گھر سے دوست تھے امام نسائی اور دارقطنی نے ان کی ثقاہت کو مانا ہے افسوس ہے کہ ایسے بلند پایہ حافظ حدیث اور امام وقت بھی اہل ظاہر کے حملوں سے نہ بچ سکے اور بعض محدثین نے محض اختلاف خیال کی بنا پر ان پر جرح کر ڈالی۔ ان کی تاریخ وفات ۱۸۳ھ ہے۔ تقریب، تہذیب اور الجواہر المفصیۃ میں ان کا ترجمہ ہے۔

لما درجہ الزم للاثر من ابی حنیفۃ قدم علینا یحییٰ
بن سعید و ہشام بن عروہ و سعید بن ابی عروہ
فقال لنا ابو حنیفۃ انظروا التجدون عند
ہؤلاء شیئا نسمن

میں نے امام ابو حنیفہ سے زیادہ حدیث سے وابستہ کوئی نہیں دیکھا
ہے۔ ایک بار کوفہ میں یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور سعید
بن عروہ تشریف لائے تو ہم سے امام صاحب نے فرمایا دیکھو
ان حضرات کے پاس کوئی حدیث ایسی ہے جو ہم نہیں لے

اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگرچہ مستقل طور پر آپ تکمیل حدیث بصرہ، مکہ
مدینہ، اور کوفہ کے اساتذہ سے کرچکے تھے اور تکمیل کے بعد مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے
تھے لیکن گاہ گاہ دوسرے شیوخ حدیث بھی سے استفادہ اس خیال سے کرتے تھے کہ
ممکن ہے ان کے علمی سرمایہ میں کوئی چیز ایسی ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ امام النضر بن محم
جو نام بتاتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی یہ تلاش و جستجو ان اساتذہ فن حدیث
تک ہوتی تھی جو فن روایت اور جمع حدیث میں ممالک اسلامیہ کے اندر شہرت علمی کے مد
طے کرچکے تھے۔ اس کا صحیح اندازہ حافظ عبدالعزیز بن ابی رزمہ کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے
جو حافظ حارثی نے داؤد بن ابی العوام کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

لہ الجواب المصنیۃ للحافظ عبدالقادر القرشی ج ۲ ص ۸۶۔ پورا نام ابو محمد عبداللہ حارثی بخاری ہے فقہ کی تحصیل
آپ نے امام ابو حفص صغیر سے کی تھی اور انہوں نے اپنے والد ماجد امام ابو حفص کبیر سے جو امام محمد کے شاگرد
علم حدیث کے لیے آپ نے خراسان، عراق اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا تھا اور بہت سے شیوخ سے آ
فن کی تحصیل کی تھی حافظ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ خراسان، عراق اور حجاز گئے اور اساتذہ
علم حاصل کیا۔ حافظ خلیلی فرماتے ہیں کہ استاد کے لقب سے مشہور ہیں اور علم حدیث میں معرفت کے مالک
ہیں۔ سمعانی نے مکثر من الحدیث لکھا ہے۔ حافظ ذہبی نے قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں ان کا ذکر کیا
لفظوں میں کیا ہے ماوراء النہر کے عالم، محدث، امام، علامہ ابو محمد عبداللہ جو استاد کے لقب سے مشہور ہیں
ان کی تاریخ وفات ۳۳۷ھ ہے۔

عبدالعزیز بن ابی رزمہ نے ایک بار امام ابوحنیفہ کے علم کا تذکرہ چھڑا
اور اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا کہ ایک بار کوفہ میں محدث آئے تو امام
ابوحنیفہ اپنے اصحاب سے فرمانے لگے دیکھو تو ان کے پاس حدیث
میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے عبدالعزیز فرماتے
ہیں دوبارہ ایک اور محدث ہمارے پاس آئے آپ نے پھر اپنے
اصحاب سے یہی فرمایا۔ ۱

حافظ ابن ابی العوام قاضی مصر نے امام ابو یوسف کے حوالہ سے امام اعظم کی دستوریہ کا ضابطہ
بتایا ہے کہ :

امام اعظم کے سامنے جب کوئی بھی مسئلہ درپیش آتا تو اپنے اصحاب سے
سب سے پہلے یہ فرماتے تھا اس موضوع پر احادیث و آثار کیا کہتی ہیں ؟
ان تصریحات سے ایک معمولی فہم کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ امام اعظم نہ صرف حدیث
کے وافر سرمایہ اور تاریخ السنۃ کے عظیم الشان ذخیرے کے مالک تھے بلکہ مقام اجتہاد پر فائز
ہونے اور باوجود تمام علمی پہنائیوں کے آپ ارشادات کے جو یاہتے تھے اور اپنے اصحاب
و ہر نووارد محدث کے علوم سے خوشہ چینی کی ہدایت فرماتے تھے اور اس دعوے کے
ساتھ فرماتے کہ دیکھو شاید ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ اس سے
اس طلب و جستجو کا اندازہ کہہ سکتے ہیں۔ جو قدرت کی بخشائشوں نے امام صاحب میں ولایت
زمانی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی کو اپنے زمانے میں ان تمام احادیث کے لیے
جن کا تعلق احکام و فقہ اور اجتہاد ہے مرکز حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ مشہور مؤرخ خطیب
بغدادی حافظ اسرائیل بن یونس کے حوالہ سے رقمطراز ہیں :

نعم الرجل لعمان ما كان احفظ لكل حديث
فيه فقه عليه

گویا وقت کے حفاظ حدیث اس معاملے میں امام اعظم کے علمی جلال کا لوہا مانتے تھے اور
صرف اسرائیل بن یونس ہی نہیں بلکہ یگانے اور بیگانے امام صاحب کے بارے میں یہی

۱۔ صدر اللامعہ مکی ج ۱ ص ۸۳۔ ۲۔ تازیب ص ۱۵۲۔ ۳۔ تاریخ بغداد ترجمہ امام اعظم

تاثر رکھتے تھے حافظ محمد بن یوسف الصالحی شافعی مؤلف السیرۃ الکبریٰ اپنی مشہور کتاب عقود الجمان میں رقمطراز ہیں :

امام ابو حنیفہ کبار حفاظ اور ناموروں میں سے تھے اگر آپ کی علمی توجہ کا مرکز حدیث نہ ہوتی تو مسائل فقہیہ کا استنباط ہی ممکن نہ تھا۔
یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ آئندہ ادراک میں یہ بات آپ کے سامنے کھل کر آئے گی۔

مجہول اور ضعیف راویوں سے روایت

شاید آپ پر خلش محسوس کریں کہ امام اعظم نے جن سے روایات لی ہیں ان میں کچھ مجہول ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کی بعد میں آنے والے محدثین نے تضعیف کی ہے، اسے بنیاد بنا کر کہنے والوں نے مختلف باتیں بنائی ہیں۔

آج سے بہت پہلے شعبی حلقوں کی جانب سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ چونکہ امام اعظم ضعیف راویوں سے روایت کرتے ہیں اس لیے ان کی ذات گرامی حدیث و روایت کے بازار میں کوئی معیاری حیثیت کی مالک نہیں ہے اور یہ امام موصوف کی قلت حدیث کی دلیل ہے۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں :

اما الحدیث فلا نکان یروی عن المضعفین وما ذالک الا
اقلۃ علمہ بالحدیث ۱

چونکہ یہ دعویٰ جس بنیاد پر کیا گیا ہے وہ بہت بڑا دھوکہ اور فریب ہے اس لیے میں پہلے اس فریب کا دامن چاک کر کے ناظرین کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔
اصل یہ ہے کہ راویوں کی تضعیف و توثیق ایک اجتہادی چیز ہے۔ ایک شخص ایک کی رائے میں ضعیف ہے اور وہی دوسرے کے خیال میں ثقہ ہے۔ اسی بنا پر حافظ سخاوی نے حافظ ذہبی کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے۔

اس فن کے علمائے میں دو کا کبھی کسی ایک ضعیف کے ثقہ ہونے پر
یا ایک ثقہ کے ضعیف ہونے پر اتفاق نہیں ہوا ہے ۲

بہاوی النظر یہ ایک مبالغہ آمیز دعویٰ ہے لیکن دو سے عدد مراد نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ
 ب کا اتفاق مشکل ہے اور یہ ایسا ہے جیسے ہم اردو میں بولتے ہیں کہ اس مسئلہ پر کبھی دو رائے
 میں ہوتی ہیں۔ یہاں دو سے عدد مراد نہیں اختلاف کی نفی ہے۔ تضعیف و توثیق کے اجتہادی
 نے کی وجہ سے حافظ ذہبی نے اس فن میں لب کشائی کرنے والوں کی ایک سے زیادہ
 میں قرار دی ہیں۔ فرماتے ہیں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو تخریج میں تشدد ہیں مگر توثیق
 معتدل ہیں۔ ایک دو غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں یہ لوگ جب کسی شخص کی توثیق کریں تو
 سے دانتوں سے دب لینا چاہیے اور اگر کسی کی تضعیف کریں تو دیکھنا چاہیے کہ اس معاملہ میں
 کا کوئی ہمنوا ہے اگر ہے اور اہل فن میں سے کسی نے اس کی توثیق نہ کی ہو تو یہ راوی بہر حال
 بے فائدہ ہے اور اگر کسی نے توثیق کی ہے تو پھر ایسے شخص کے بارے میں جرح مبہم ہرگز قبول
 لی جاتے ہیں اور اسی بنا پر حافظ سخاوی نے امام نسائی کا یہ زریں فیصلہ نقل کیا ہے۔

لا یتزرع حدیث الرجل حتی یجتمع الجميع علی ترکہ۔^{۱۵}

بتنا یہ چاہتا ہوں کہ تضعیف و توثیق اگر مخصوص نہیں بلکہ اجتہادی ہیں تو اس میں اختلاف
 کے کی گنجائش ہے اور جب امام اعظم کے متعلق محدثین نے تصریح کی ہے کہ آپ فن جرح و
 دلیل کے امام ہیں جیسا کہ آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے۔ تو یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا
 ہے کہ امام اعظم کا علم حدیث میں پایہ اس لیے کم ہے کہ ان کی روایت کردہ حدیثوں میں کچھ راوی
 بے فائدہ بھی ہیں۔ یہ تو فکر و نظر کا اختلاف ہے ایک شخص ایک محدث کی نظر میں اگر ضعیف
 تو ضروری نہیں ہے کہ وہ سب کی نظر میں ضعیف ہو۔ یہ رجال کا سارا دفتر موجود ہے۔ اسے
 لکھا لیے اور دیکھ لیجئے کہ راویوں کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کیسے کیسے مختلف خیال
 رکھتے ہیں۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری فرماتے ہیں کہ :

امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ روایت مجہول قابل پذیرائی ہے اور
 یہ صرف امام اعظم کا نہیں بلکہ اور بھی بہت سے اکابر کما بین مسلک
 ہے۔^{۱۶}

علم اسناد و روایت میں مجہول کا مسئلہ

مجہول کا مسئلہ علم اسناد و روایت کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے اس لیے ہم اس کے بارے میں اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کی خاطر ذرا سی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ مجہول کی تعریف خطیب بغدادی نے یہ کی ہے کہ :

محدثین کی زبان میں مجہول وہ شخص ہے جو علمی طلبگاریوں میں کوئی شہرت نہ رکھتا ہو، جس سے اہل علم و شناس نہ ہوں اور اس کی حدیث صرف ایک آدھ راوی کی وساطت سے آئی ہو۔ اگر ایک کی جگہ اس سے روایت کرنے والے دو ہوں تو جہالت تو ختم ہو جائے گی مگر عدالت ثابت نہ ہوگی۔

حافظ ابن الصلاح نے خطیب کی اس تعریف پر اعتراض کیا ہے کہ اگر مجہول وہی ہے جس سے روایت کرنے والا ایک آدھ راوی ہو تو پھر صحیح بخاری میں ایک سے زیادہ ایسی حدیثیں ہیں جن کا راوی ایک کے سوا کوئی نہیں ہے مثلاً مرد اس اسلمی کہ ان سے قیس بن حازم کے سوا کوئی اور راوی نہیں ہے۔ مسلم میں بھی ایسی بے شمار حدیثیں ہیں کہ ایک کے علاوہ ان کا راوی کوئی نہیں صحیحین کے مؤلفین کا یہ طرز عمل بتا رہا ہے کہ اگر ایک بھی روایت کنندہ ہو تو مجہول مجہول نہیں رہتا۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے خطیب کی تعریف پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محدثین نے راوی کی ذات اور اس کی عدالت کے بارے میں نہ علم کی شرط لگائی اور نہ وہ یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ عدالت کو بتانے والوں کی تعداد درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہو۔ اگر وہ ایسی کوئی شرط لگاتے تو دلائل ان کا قطعاً ساتھ نہ دیتے اور یہ شرط بے دلیل ہوتی۔ کیونکہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے اور طبقات میں علمی مقدمات کی شرطیں بے سود اور بے محل ہیں۔ قوتِ دلیل کی روح تو یہی ہے کہ اگر اس سے ایک بھی روایت کرے اور وہ اس کی توثیق کرے تو راوی سے جہالت کا دھبہ ہٹ جائے گا اور یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ خطیب نے مجہول کی تعریف میں دو چیزیں بلا دلیل اضافہ کر دی ہیں۔ ایک مجہول کی طلبِ علم میں شہرت اور دوسرے اہل علم میں سے دو کا اس سے روایت کرنا حافظ جلال الدین السیوطی نے خطیب اور ابن الصلاح کے اختلاف کا تذکرہ

کر کے خطیب کی ہم نوائی کی ہے اور ابن الصلاح کی بات کو یہ کہہ کر بے وقار کر دیا ہے کہ جن حضرات کو ابن الصلاح نے مثلاً پیش کیا ہے وہ صحابہ ہیں اور صحابہ کی عدالت اتفاقی ہے۔ علامہ نووی بھی سیوطی کے ہم زبان ہیں۔ حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ سیوطی اور نووی نے جس تار پر انگلی رکھی ہے یعنی یہ کہ یہ صحابہ ہیں اور صحابہ کی عدالت مسلم ہے۔ یہ خود ایک مستقل مسئلہ ہے کہ کیا صحبت کے ثبوت کے لیے صرف ایک کاروائیت کرنا کافی ہے یا اس کے لیے ضروری ہے کہ روایت کرنے والے دو ہوں۔ اس سے ہٹ کر پھر بھی بات اپنی جگہ رہتی ہے یعنی اگر غیر صحابی سے روایت کرنے والا ایک ہو تو پھر بھی راوی معروف ہے یا مجہول۔ صحیح بخاری میں خود غیر صحابہ کی ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن سے روایت کرنے والے ایک ہیں۔

اگر خطیب ہی کی بات صحیح ہو تو پھر بھی بخاری و مسلم جیسی شخصیتیں بھی اس سے محفوظ نہیں حافظ عسقلانی نے اصل اعتراض کی طرف توجہ نہیں فرمائی صرف عراقی کی مثالوں کی توجہ کر کے خاموش ہو گئے۔

مجہول کی دو قسمیں

در اصل مجہول کی دو قسمیں ہیں مجہول العین اور مجہول الوصف۔
مجہول الوصف دو طرح کا ہوتا ہے۔

ایک وہ جو ظاہر و باطن میں مجہول العدالتہ ہو۔ دوسرے وہ جو باطن میں مجہول اور ظاہر میں معروف ہو۔ ان میں ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔

حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں — مجہول محدثین کے یہاں چند قسموں پر منقسم ہے۔

مجہول العدالتہ ظاہر و باطناً۔ اس کی روایت جماہیر محدثین کے نزدیک ناقابل قبول ہے دوسرا وہ جو باطن میں مجہول العدالتہ ہو مگر ظاہر میں معروف ہو اسی کا نام محدثین کی زبان میں مستور ہے۔ اس کی روایت قابل قبول ہے۔ امام سلیم رازی کی بھی یہی رائے ہے اور حدیث کے مشہور مؤلفین کا راویوں کے بارے میں اسی رائے پر عمل بھی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ اگر راوی ظاہراً و باطناً مجہول العدالتہ ہو تو جمہور کے نزدیک اس کی روایت ناقابل قبول ہے مگر محدثین ہی کی ایک جماعت اسے قبول کر لیتی ہے۔ روایت مستور کچھ محدثین کے یہاں قابل قبول ہے۔ ابن الصلاح نے اسی کو اپنایا ہے اسے اور نووی نے شرح المہذب میں اسی کی تصحیح کی ہے۔

جمال الدین رسنوی فرماتے ہیں جب کسی شخص کے بارے میں بلوغ اور اسلام کا علم ہو جائے اور اس کی عدالت کا پتہ نہ ہو تو اس کی روایت قابل اعتماد نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی فرماتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کا فیصلہ ہے کہ ایسے شخص کی روایت قابل پذیرائی ہے لیکن ضروری ہے کہ وہ اپنے فسو میں معروف نہ ہو کیونکہ معروف الفسق بالاجماع مردود ہے۔

ابن السبکی نے جمع الجوامع میں لکھا ہے کہ مستور کی روایت امام ابو حنیفہ کے نزدیک قابل قبول ہے اور دوسرے محدثین کا خیال اس کے برعکس ہے۔

صاحب فوائج الرحموت فرماتے ہیں کہ مستور کی روایت جمہور کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے لیکن امام ابو حنیفہ نے غیر ظاہر روایت میں اس کو قبول کیا ہے یہی ابن خلدان کا مختار ہے۔

اختلاف عصر و زمان

اگرچہ ہماری رائے میں یہ مسئلہ اختلاف عصر و زمان سے تعلق رکھتا ہے جن کے زمانے میں ثبوت میں عدالت غالب ہے وہ مستور کی روایت کو قبول کرتے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے امام اعظم کے دور کے بارے میں لکھا ہے :

ولا شك ان الغالب على حملة العلم النبوي في ذلك الزمان

العدالة -

اسی لیے موصوف نے العوالم، الروض الباسم اور تنقيح الانظار میں اور امیر محمد بن اسماعیل بیانی نے توضیح الانكار میں اسے پوری وضاحت اور دلائل سے ثابت کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس مسئلہ کی اساس یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں عدل اصل ہے یا فسق؟ اور اگر عدل ہی اصل ہے تو پھر عدالت کیا ہے؟ حافظ ابن تیمیہ نے عدالت کو بھی اختلاف عصر و زمان کا مسئلہ قرار دیا ہے جیسا کہ الجزائری نے ان سے نقل کیا ہے ان کا پہلا فقرہ ہی یہ ہے۔

العدل في كل زمان ومكان وقوم بحسبه

الغرض یہ موضوع بڑا طویل الذیل ہے کچھ ہوائی بات اتفاقی ہے کہ راوی کے لیے عدالت شرط ہے اور کفر مانع روایت ہے۔ کلام صرف اس میں ہے کہ جن کی عدالت کا علم نہ ہو اس پر فیصلہ کن بات یہی ہے کہ اگر راوی اس دور سے تعلق رکھتا ہو جس میں عدالت غالب ہو تو اس

کی روایت قابل اعتماد ہوگی۔ فخر الاسلام لکھتے ہیں:

لأن العدالة اصل في ذلك الزمان

امام اعظم کا زمانہ عدالت کا زمانہ ہے حافظ محمد بن ابراہیم الخزرجی فرماتے ہیں:
یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ زمانہ امام اعظم میں راویوں پر عدالت
غالب تھی اور اس کی شہادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اس ارشاد سے ملتی ہے خیر القرون قر فی شہ الذین
یلونہم شہ الذین یلونہم

امام اعظم کی ضعف سے روایت ان کی تعدیل ہے

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام احمد کو اگر کسی مسئلہ پر حدیث صحیح نہ ملتی تھی تو ضعیف ہی پر عمل کرتے
تھے اور اپنے مسند میں بھی اس قسم کی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ امام موصوف کا یہ طرز عمل حدیث
سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ غایت احتیاط کی وجہ سے ہے۔ حافظ ابن مندہ فرماتے ہیں کہ
امام ابو داؤد کو جب کسی موضوع پر کوئی صحیح حدیث نہ ملتی تو ضعیف راویوں سے روایت لیتے ہیں
(الروض الباسم) ان محدثین کا یہ طرز عمل اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ ضعیف راویوں سے
روایت لینا علم حدیث سے ناواقف ہونے کی نہیں بلکہ فن کار ہونے کی علامت ہے۔ جس
حدیث کو یہ اکابر روایت کرتے ہیں اور جن کے راویوں کو ضعیف کہا جاتا ہے۔ یہ راوی کذاب
اور فاسق نہیں ہیں اور نہ ان کی روایات کا درجہ باطل، موضوع، ساقط اور متردک کا ہے۔
ضعیف وہ کہلاتی ہے جس کا راوی صادق تو ہو مگر حافظہ اور ضبط کی دولت سے مالا مال نہ ہو
یا روایت کے رفع میں یا اسناد میں اضطراب ہو۔ یہی وہ حدیث ہے جس کے بارے میں
علماء کے خیالات مختلف ہیں۔ اس میں ضعیف کا مدار راوی کا حافظہ ہے اس لیے امام اعظم کا
ضعف سے روایت لینا فن ناآشنائی نہیں بلکہ فن کار ہونے کی دلیل ہے۔

بات اُسندہ اور اقی میں تفصیل سے آئے گی کہ امام اعظم صرف فقہ و حدیث کے امام نہیں
بلکہ امام الجرح والتعدیل بھی ہیں اس لیے جن راویوں سے امام اعظم روایت کرتے ہیں۔ یہ ان

راویوں کی تعدیل ہے بعد میں آنے والے لوگوں نے اگر امام موصوف سے اپنے علم کی بنا پر ان راویوں کے بارے میں جرح کر کے اختلاف کیا ہے تو یہ ایسی کوئی وزنی بات نہیں ہے جس کو حدیث ناواقفیت کی بنیاد قرار دیا جائے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے اسے ذرا کھول کر سمجھایا ہے۔

جن راویوں سے امام اعظم نے روایات لی ہیں اور ان میں سے جن کی تضعیف کی گئی ہے ان کا ضعف اختلافی ہے اور ان کے بارے میں امام اعظم کا مسلک یہ ہے کہ یہ ضعیف نہیں ہیں اس لیے ان سے روایت میں کوئی قباحت نہیں اور اس معاملے میں امام اعظم متفرد نہیں ہیں دوسرے محدثین کا بھی طرز عمل کچھ ایسا ہی ہے اور تو اور امام بخاری اور مسلم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ امام احمد کی حدیث میں جلالت شان سے کون واقف نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ضعیف راویوں سے حدیثیں روایت کرتے ہیں لے

بلکہ خود امام بخاری بھی ایسے حضرات سے روایت کرتے ہیں جن کی توثیق و تضعیف خود ائمہ کے نزدیک اختلافی ہے۔ حسن بن عمارہ کے حوالہ سے صحیح بخاری کی کتاب المناقب میں حدیث موجود ہے حالانکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ :
اطبقوا علی ترکہ لے

ایک اور راوی اسید بن الجمال ہیں۔ ان سے امام بخاری نے کتاب الرقاق میں ایک حدیث روایت کی ہے مگر ان کا حال یہ ہے کہ نسائی متروک کہتے ہیں۔ یحییٰ بن معین نے ان پر جھوٹی بنانے کی تہمت لگائی ہے۔ حافظ ابن حبان کا دعویٰ ہے کہ یہ نہ صرف مناکیر لاتا ہے بلکہ احادیث کی چوری بھی کرتا ہے حتیٰ کہ مقدمہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے صاف لکھ دیا ہے کہ :
لہ احد توثیقاً لے

اور امام مسلم اپنی صحیح میں لیث بن سلیم جیسے ضعیف راویوں سے حدیث لاتے ہیں۔ بنیاد پر کیا کوئی عقل مند امام بخاری اور امام مسلم کو علم حدیث سے بے بہرہ اور نا آشنا فتنہ ہے؟ نہیں بہرگز نہیں، بہرگز نہیں۔ انصاف۔ انصاف۔

لے الروض الباسم ج ۱ ص ۱۲۲۔ لے مقدمۃ فتح الباری۔ لے مقدمۃ فتح الباری۔

فورا معاملے کے اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ امام اعظم کے یہاں قرآن کے بعد اصل چیز سنت ہے
سائل کے اثبات کے لیے وہ سنت ہی کو استعمال کرتے ہیں اور سنت ہی کو وہ احادیث کی
ت کا معیار قرار دیتے ہیں اور جو حدیث سنت کے خلاف ہو اسے وہ شاذ قرار دیتے ہیں۔
پہ امام ابو یوسف ایک مقام پر اس معیار کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں :

احادیث میں بہتات ہو رہی ہے اور ایسی روایات نمایاں ہو رہی
ہیں جو نہ معروف ہیں نہ ان کو فقہاء جانتے ہیں اور نہ وہ قرآن و
سنت کے موافق ہیں اس لیے ایسی شاذ روایات سے بچ کر رہو
اور ان حدیثوں کو اپنا و جن کی پشت پر جماعتی عمل کی تائید ہو جو فقہاء
کے یہاں معروف ہوں اور جو کتاب و سنت کے موافق ہوں لیے

روایات کا درجہ شواہد اور توابع کا ہے

اگر ایک مسئلہ امام اعظم کے یہاں سنت سے اس دور میں ثابت ہے جبکہ امام ذہبی کی تصریح کے
ت السنن مشہورۃ و البدع مکسوبۃ۔ سنتیں معاشرے میں عام ہیں تو پھر ان
یت کی حیثیت امام اعظم کے یہاں صرف توابع اور شواہد کی ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری
نے ہیں :

امام اعظم نے ضعیف سے جو روایات لی ہیں ان کا درجہ شواہد اور متابعت
کا ہے ورنہ نفس مسئلہ تو قرآنی عموم، سنت یا قیاس سے ثابت ہے
ثابت شدہ مسائل کے لیے ان روایات کو بطور شواہد پیش فرمایا
ہے۔ یہی طرز عمل امام مالک کا بھی ہے۔ چنانچہ امام موصوف نے
عبد الکرم بن ابی المنہار بن ابی البصری کی روایت سے استدلال کیا ہے۔
حافظ ابن عبد البر متہید میں رقمطراز ہیں کہ عبد الکرم کا مجروح ہونا اتفاقی
ہے۔ ایسے ہی امام شعبہ نے باوجود جہالت قدر کے ابان بن ابی
عباس سے روایت لی ہے حالانکہ موصوف نے خود ابان کی پوزیشن

یہ بیان کی ہے کہ ابان کی روایت کے مقابلے میں مجھے گدھے کا پیشاب
 پی لینا گوارا ہے۔ امام سفیان ثوری نے بعض لوگوں کے پاسے میں یہ
 فیصلہ کیا تھا کہ ان سے روایت نہ لی جائے اور جب ان سے پوچھا گیا
 کہ آپ تو ان سے روایت لیتے ہیں۔ فرمایا میں ان ہی احادیث کی
 ان سے روایت کرتا ہوں جن سے میں خود واقف ہوں۔ امام مسلم
 کی صحیح کو اٹھا کر دیکھتے وہ گاہ گاہ علو اسناد کی خاطر صحیح سند کو
 چھوڑ کر ضعیف سند سے روایت لیتے ہیں۔ یہ اس بات کا کھلا
 ثبوت ہے کہ علم حدیث کے فن کاروں کا ضعف اسے روایت لینا
 نا آشنا تے فن ہونے کی منہیں بلکہ امام فن ہونے کی علامت ہے یہ
 مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس بنیاد پر امام اعظم کو نا آشنا تے فن قرار دیتے ہیں۔ وہ خود علم حدیث
 کی گہرائیوں سے نا آشنا ہیں اگر ان کو فنی و اقصیت ہوتی تو ان کی زبان قلم پر ایسی غیر ذمہ دارانہ
 بات ہرگز نہ آتی۔ یہاں بھی حافظ محمد بن ابراہیم وزیر پتے کی بات فرما گئے ہیں :
 امام اعظم اس فن کے مشہور حفاظ میں سے تھے۔ صرف اتنی بات ہے
 کہ عمر رسیدہ ہونے کے بعد آپ کے حافظہ میں پہلے جیسی قوت نہ
 تھی اور آخر عمر میں حافظہ میں قوت نہ رہنا صرف امام اعظم کی خصوصیت
 نہیں ہے اس میں دوسرے ائمہ بھی امام اعظم کے شریک ہیں۔ یہ
 نہ کوئی عجیب ہے اور نہ ان کی شان اجتہاد اور محدثانہ مقام پر
 کوئی حرف ہے۔ امام الحسن البصری، ابو قلابہ، ابو العالیہ اور امام
 عطاء کے مقابلے میں سعید بن المسیب، محمد بن سیرین اور ابراہیم نخعی
 کی حدیثیں زیادہ صحیح ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے
 سوا اوروں کا علم منحوش ہے امام اعظم کی احادیث پر جن محدثین
 نے کلام کیا ہے اس کا نشانہ بھی قوت حفظ ہے۔ نادان سمجھتے ہیں
 کہ یہ ان کے علم حدیث اور اجتہاد پر حرف گیری ہے۔ زیادہ سے زیادہ

یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مقابلے میں فلاں کا حافظہ تیز ہے۔
لیکن صرف حافظہ کی قوت نہ سرمایہ فضیلت ہے اور نہ علمی تفوق و
برتری کی نشانی ہے آخر صحابہ میں ابو ہریرہ سے زیادہ حافظ، حدیث
کون ہو گا لیکن صحابہ میں علم، افتہ اور افضل حضرت ابو ہریرہ نہ تھے۔
حافظہ پر حافظ ابن القیم نے ابوالصیب میں ایک مفید اور کارآمد نصیحت لکھی ہے
فرماتے ہیں:

حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ کا باہم فتاویٰ میں کیا مقابلہ
— حضرت ابو ہریرہ بے شک حافظ حدیث ہیں اور تمام امت
میں علی الاطلاق حافظ ہیں حدیث کو جیسے سنا بیان کر دیا۔ ان کی
ساری تنگ و دو کامرکز صرف حفظ روایات تھا۔ برخلاف حضرت
ابن عباس کے کہ ان کی تمام تر ہمت تفقہ اور استنباط مسائل پر
مرکوز تھی۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس حبر الامۃ اور ترجمان ہیں مگر ان کی ساری ان
حدیثوں کی تعداد جن میں دید و شنید کی تصریح ہے شاید بیس سے زیادہ نہ ہو لیکن حدیث و
قرآن سے ان کے فقہ و استنباط کا حال یہ ہے کہ ان کے علم و فقہ سے دنیا بھر یور ہے۔ حافظ
ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے۔

لے واضح ہے کہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کے اس فکر کی بنیاد کہ عمر رسیدہ ہونے پر حافظہ میں پہلے جیسی
قوت نہ رہی تھی اس پر ہے کہ موصوف کی تحقیق میں امام اعظم نے نوے سال سے زیادہ عمر پائی ہے
چنانچہ لکھتے ہیں وقد جاوز السبعین فی العمر، شاید حافظ صاحب موصوف امام اعظم کی ولادت ابن زداد کی روایت
کے مطابق ۱۷۰ھ ملتے ہیں سمعان نے انساب میں ۱۷۰ھ لکھا ہے۔ ابن حبان کی کتاب الجرح والتعديل
اور ابوالقاسم سمعان کے روضۃ الصفاء میں بھی یہی تاریخ ولادت ہے بلاشبہ ولادت اگر ۱۷۰ھ اور
وفات ۱۷۰ھ ہے تو عمر نوے سال ہوتی ہے۔ بعض محدثین کے نزدیک راجح یہی ہے۔

۱۷۰ روضۃ الباسم ج ۱ ص ۱۶۹۔

۱۷۰ ابوالصیب ص ۲۸۔

جمعت فتاواہ فی سبعتہ اسفار کبار

حالانکہ جس طرح اور لوگوں نے حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا حضرت ابن عباس نے بھی سنا یہاں الجزائری نے جو امام ترمذی سے اسی موضوع پر نقل کیا ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے فرماتے ہیں :

کچھ محدثین نے اجتہاد اہل علم پر کلام کر دیا ہے اور صرف حافظہ کی بنا پر ان کی تصنیف کی ہے اگرچہ اوروں نے ان کی جلالت شان اور صداقت کے پیش نظر ان کی توثیق کی ہے۔

الجزائری نے یہ نقل کرنے کے بعد جو اسی کے متعلق آخری بات بتائی ہے وہ بھی سن لیجئے :

لَمْ يَسْلَمْ مِنَ الْخَطَايَا وَالْغُلَطِ أَحَدٌ مِنَ الْأُمَّةِ مَعَ حِفْظِهِمْ

خطا اور غلطی سے کوئی پاک نہیں

یہ واقعہ ہے کہ علم و تحقیق کے میدان میں غلطی اور خطا کے دھبے کچھ نہ کچھ سب کے دامنوں پر ہیں حافظ ذہبی نے سچ لکھا ہے :

أَنَا لَا نَدْعِي الْعِصْمَةَ مِنَ السُّهُوِ وَالْخَطَا فِي الْاجْتِهَادِ فِي غَيْرِ الْأَنْبِيَاءِ

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ امام البزرعہ اور امام ابو حاتم نے تاریخ و رجال کے سلسلے میں امام بخاری کی بہت سی غلطیاں نکالی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ابی حاتم نے امام بخاری کے تاریخی ادبام پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام کتاب خطا البخاری ہے۔ اس کتاب میں ابن ابی حاتم نے ان دونوں حضرات سے بیشتر استفادہ کیا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

جمع فيه ادھامہ فی التاریخ

علامہ سخاوی فرماتے ہیں :

لابن ابی حاتم جزر کبیر عندی انتقد فیہ علی البخاری

اے توجیہ النظر اے میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۔ ایسے ہی خطیب نے لکھا ہے لم یکنوا معصومین من الذل و

لأصین مفاہیج الخطا والخطا (موضع ادبام الجمع والتفريق ج ۱ ص ۱۶)

اے التقييد والايضاح لما اطلق واغلق من مقدمة ابن الصلاح ص ۱۴۷ اے الاعلان بالتوبيخ ص ۱۱۰۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں :

قد جمع عبدالرحمن بن ابی حاتم الرازی الاوهام التي اخذها

نهر عنة في كتاب مفرد

وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب بالکل نو عمری میں مرتب کی تھی جب کہ امام موصوف کی وفات اٹھارہ سال تھی اس لیے اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے امام موصوف کو ایسے نوشتوں سے نقل کرنے پڑے کہ جن پر نہ نقطے لگے ہوئے تھے۔ اور نہ ضبط کیا گیا تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے ابوعلی صالح بن محمد کے ہاں سے اس میں لکھا ہے کہ :

ایک بار ابوذر عمر رازی نے ان سے فرمایا کہ اے ابوعلی ! اسماء الرجال پر محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب میری نظر سے گزری اس میں تو بڑی غلطیاں ہیں میں نے ان سے عرض کیا مصیبت یہ ہے کہ ان کے پاس بخارا کا جب کوئی شخص عراق سے ہو کر آتا تھا یہ اس کی کتاب لے کر دیکھتے تھے۔ اہل بخارا کی عادت ہے کہ نہ تو وہ اسماء کو ضبط کرتے ہیں اور نہ ان پر نقطے لگاتے ہیں۔ لہذا جب ان کی نظر سے کوئی ایسا نام گزرتا کہ جس سے یہ پہلے واقف نہ ہوتے اور نہ وہ ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہوتا تو یہ اسے غلط طور پر اپنی کتاب میں نقل کر دیتے۔ ورنہ خراسانیوں میں ان سے زیادہ سمجھدار میں نے کسی کو نہیں پایا۔

خطیب بغدادی نے موضع اوہام الجمع والتفریق میں امام بخاری کے ان اوہام و اغلاط کا تفصیلی رہ کیا ہے۔ اور کتاب مذکور میں ۲۱۳ صفحات اسی تذکار پر مشتمل ہیں۔ مگر نہایت افسوس ہے امام بخاری کے بعض حامیوں نے بجائے اس کے کہ ان تنقیدات و تعصبات کا کوئی علمی اور تحقیقی جواب دیں۔ امام ابوذر عمر، امام ابو حاتم اور امام مسلم پر نہایت ہی گری ہوئی زبان میں حملے کیے اور الزامات اٹائے۔ چنانچہ کہنے والے یہاں تک کہہ گئے۔

تاریخ میں محمد بن اسماعیل کی کتاب ایسی ہے کہ اس پر کوئی کتاب سبقت نہ لے سکی اور ان کے بعد جس نے بھی تاریخ یا اسماء الرجال پر کچھ

لکھا ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں ہے کچھ لوگوں نے اس کتاب کو اپنی ہی بنالیا ہے جیسے ابو زرہ، ابو حاتم اور مسلم۔ اور کچھ نے ان کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

یہ حاکم کبیر کی رائے ہے جسے علامہ تاج الدین السبکی نے الطبقات الشافعیۃ البکری میں ان کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ حاکم کبیر کو زیادہ غصہ امام مسلم پر ہے وہ فرماتے ہیں :
جو شخص بھی امام مسلم کی کتاب الاسماء والکنی کا غور سے مطالعہ کرے گا۔ اسے پتہ لگ جائے گا کہ امام مسلم کی کتاب بالکل امام بخاری کی کتاب کی کاپی ہے۔

لیکن یہ حاکم کبیر کی غلطی اور محض بدگمانی ہے جو ستر تا ستر واقعہ کے خلاف ہے۔ تعجب ہے کہ کچھ بزرگوں نے خود امام بخاری پر بھی یہی الزام لگایا ہے چنانچہ ان ہی حاکم کبیر کے معاصر حافظ مسلمہ بن قاسم اندلسی کتاب الصلہ میں لکھتے ہیں کہ :

امام بخاری نے اپنے استاد علی بن المدینی کی کتاب العلل کو ان کی غیر حاضری میں ان کے صاحبزادے کو مال کی طمع سے کر حاصل کیا اور پھر اسی کتاب کی عبارتوں کو اپنی طرف سے علی بن المدینی کے سامنے پیش کرتے رہے اور آخر اسی کی وجہ سے درس سے بے نیاز ہو کر خراسان کی راہ لی۔

یہ واقعہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔

فن جرح و تعدیل اور اسماء الرجال میں امام ابو زرہ، ابو حاتم اور امام مسلم کا جو پایہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان بزرگوں کی نسبت اس قسم کی خیانت علمی اور سرقہ کا کون گمان کر سکتا ہے غور فرمائیے تاریخ و رجال میں راویوں کے نام ان کے شیوخ و تلامذہ، اوطان، سنین ولادت و وفات اور جرح و تعدیل کا بیان ہوتا ہے۔ اب راویوں کے نام وہی، شیوخ و تلامذہ وہی، وطن وہی، سنین ولادت و وفات وہی اور جرح و تعدیل میں اکثر و بیشتر اتفاق رائے۔ پھر اسی صورت میں جب کہ یہ سب امور یکساں اور متحد ہیں معاصرین ائمہ فن کی تصنیفات میں اکثر و بیشتر معلومات کا ایک جیسا ہو جانا کون سے تعجب کی بات ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ ان ائمہ نے اپنی تصانیف میں امام بخاری کی تاریخ کو اپنے سامنے رکھا ہے

ورنہ ظاہر ہے کہ اگر کتاب سامنے نہ ہوتی تو تنقید کس پر کرتے بلکہ ترتیب بھی وہی اختیار کی ہے اور اسی لیے حاکم کبیر کو شبہ ہو گیا کہ امام مسلم وغیرہ امام بخاری کی کتاب کو اپنے نام سے منسوب کر رہے ہیں چنانچہ خطیب بغدادی ان ہی حاکم کبیر سے ناقل ہیں :

مجھ سے حاکم کبیر ابو احمد محمد بن محمد نیشاپوری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے میں تھا کہ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ ابو محمد بن ابی حاتم کے پاس کتاب الجرح والتعديل پڑھ رہے ہیں پھر جب وہ پڑھنے سے فارغ ہوئے تو میں نے ابن عبد وہب وراق سے کہا کہ یہ کیا ہنسی کر رکھی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب التاریخ کو اس کتاب کی شکل میں اپنے استاد کے سامنے پڑھ رہے ہو حالانکہ تم اسے ابو زر عہ اور ابو حاتم کی بتاتے ہو اس پر وراق نے کہا کہ اے ابو احمد تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس وقت ابو زر عہ اور ابو حاتم کے پاس یہ کتاب لائی گئی تو ان بزرگوں نے کہا کہ یہ علم خوب ہے اس سے بے پروائی نہیں برقی جاسکتی اور ہم لوگوں کے لیے یہ زریعہ نہیں کہ ہم اسے دوسرے سے نقل کریں اس لیے ان دونوں حضرات نے ابو محمد عبد الرحمن رازی کو سٹھایا۔ وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک راوی کے متعلق ان سے پوچھتے گئے اور پھر یہ دونوں حضرات کہیں اس کتاب سے زیادہ اور کہیں اس سے کم بیان کرتے چلے گئے اور اسے عبد الرحمن نے ان دونوں کی طرف منسوب کر دیا۔

حاکم کبیر کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امام بخاری کی تاریخ امام ابو زر عہ اور امام ابو حاتم کے سامنے آئی ان بزرگوں کے علمی جلال نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے وطن کا علمی معاشرہ اس فن میں باہر کا دست نگر ہے۔ انہوں نے اسی دھنگ اور اسی اسلوب پر عبد الرحمن رازی کو ایک مستقل کتاب الملاء کرائی جو معلومات کے سرمایہ میں امام بخاری کی کتاب سے زیادہ ہے۔

اسی کتاب کا نام الجرح والتعديل ہے۔ امام ذہبی رقمطراز ہیں :
 کتابہ فی الجرح والتعديل یقضى له بالمرئۃ العلیا فی الحفظ۔
 بہر حال خطا اور غلطی سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے اور خطا اور غلطی سے فنِ اثباتی پر کوئی حرف
 نہیں آتا۔

خبر یہ بات تو ضمنی تھی۔ گفتگو تو امام اعظم کے اساتذہ کے متعلق ہو رہی تھی اور درمیان میں یہ
 بات اگلی تھی کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ :

۱۔ امام اعظم نے مجاہیل سے روایت کی ہے۔

۲۔ امام اعظم نے ضعیف سے روایت کی ہے۔

۳۔ امام اعظم کے حافظہ میں قوت نہ رہی تھی۔

اس لیے امام اعظم کا علم حدیث میں کوئی مقام نہیں ہے ان ہی وساوس اور ہوا جس کو دور
 کرنے کی میں نے ان صفحات میں کوشش کی ہے۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام اعظم کے مشائخ

آئیے اب امام اعظم کے مشائخ میں ان اکابر پر ایک نظر ڈال لیجئے جن کو حافظ ذہبی نے حفاظ حدیث
 میں شمار کیا ہے۔

۱۲۱ھ	طبقة رابعة	۱۔ ایوب بن ابی تمیمہ البکری السخیتی
۱۱۵ھ	"	۲۔ المحکم بن عتیبہ ابو محمد الکوفی
۱۳۶ھ	"	۳۔ ربیعہ بن عبد الرحمن
۱۲۵ھ	"	۴۔ زید بن ابی انیسہ
۱۰۶ھ	طبقة ثالثة	۵۔ سالم بن عبد اللہ
۱۶۴ھ	طبقة خامسة	۶۔ ثیبیان بن عبد الرحمن ابو معاویہ
۱۰۶ھ	طبقة ثالثة	۷۔ طاؤس بن کيسان ابو عبد الرحمن الیمانی
۱۱۰ھ	"	۸۔ عامر الشعبي ابو عمر الہمدانی

۱۲۷ھ	طبقة رابعة	۹- عبد اللہ بن دینار ابو عبد الرحمن
۱۱۷ھ	طبقة ثالثة	۱۰- عبد الرحمن بن ہریر
۱۳۶ھ	"	۱۱- عبد الملک بن عمیر
۱۱۴ھ	"	۱۲- عطارد بن ابی رباح
۱۱۳ھ	"	۱۳- عطارد بن یسار
۱۰۷ھ	"	۱۴- عکرمہ مولیٰ ابن عباس
۱۲۶ھ	طبقة رابعة	۱۵- عمرو بن دینار الحافظ ابو محمد
۱۲۷ھ	"	۱۶- عمرو بن عبد اللہ ابو اسحاق
۱۷۵ھ	طبقة خامسة	۱۷- القاسم بن معن بن عبد الرحمن
۱۱۷ھ	"	۱۸- قتادة بن دعامة
۱۶۴ھ	"	۱۹- مبارک بن فضالة القرشي
۱۳۰ھ	"	۲۰- محمد بن المنکدر ابو عبد اللہ القرشي
۱۲۸ھ	طبقة رابعة	۲۱- مسلم بن قدوس ابو الزبير المکی
۱۲۴ھ	"	۲۲- محمد بن مسلم بن شهاب الزہری
۱۳۲ھ	"	۲۳- منصور بن المعتمر ابو عتاب البکونی
۱۱۷ھ	طبقة ثالثة	۲۴- نافع مولیٰ ابن عمر ابو عبد اللہ
۱۲۶ھ	طبقة رابعة	۲۵- ہشام بن عروہ القرشي
۱۴۳ھ	"	۲۶- یحییٰ بن سعید الانصاری

یہ وہ حفاظ حدیث ہیں جن کے تراجم حافظ ذہبی نے تذکرة الحفاظ میں لکھے ہیں۔

تذکرة الحفاظ کا مقام

یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور واٹر المعارف حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔
یہ صحابہ سے لے کر امام ذہبی کے زمانے تک کے حفاظ حدیث کا تذکرہ ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

هذه تذکرة باسماؤ معدلی حملة العلم النبوی ومن يرجع الی

اجتهادهم فی التوثیق والتضعیف والتصحیح والتزییف۔

یہ ان حاملانِ علمِ نبوی کا تذکرہ ہے جن کی بارگاہِ علم سے راویانِ حدیث کو
ثقافت اور عدالت کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے اور جن کی رائے راویوں کے
ثقہ ہونے، ضعیف ہونے، کھرا ہونے اور کھوٹا ہونے میں فیصلہ کن
ہے۔

حافظ صاحب نے اس کتاب میں یہ اصول پیش نظر رکھا ہے اور اس کتاب میں کسی ایسے شخص
کا تذکرہ نہیں کیا جس میں ان کی بیان فرمودہ حیثیت موجود نہ ہو بلکہ کم از کم درجے میں کسی ایسے شخص
کا بھی ترجمہ نہیں لکھا جو عالمِ فقیہ ہونے کے باوجود حافظ نہیں ہے۔ چنانچہ خارجہ بن زید اگرچہ فقہاء
سبعہ میں سے ہیں مگر ان کے متعلق صاف لکھ دیا۔

إِنَّهُ قَلِيلُ الْحَدِيثِ فَلِهَذَا لَمْ أَذْكُرْهُ فِي الْحِفَافِ

یہ قلیل الحدیث ہیں اسی لیے میں نے ان کا حافظ میں تذکرہ نہیں کیا۔

اسی طرح امام ذہبی نے اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی تذکرہ نہیں کیا جو اگرچہ حافظِ حدیث
تھے مگر اربابِ حدیث کی بارگاہ میں متروک الروایت خیال کیے جاتے تھے چنانچہ ہشام بن محمد کلبی کے
بارے میں جو بہت بڑے محدث اور حافظ تھے لکھتے ہیں :

هشام بن محمد الكلبی الحافظ أحد المتروكين ليس بثقة فلهذا

لم ادخله بين حفاظ الحديث

یہ متروک ہیں، ثقہ نہیں ہیں اسی لیے میں نے ان کو حدیث کے حفاظ میں
داخل نہیں کیا۔

ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ نتائج خود بخود آجائیں گے۔

الف : امام اعظم کے تمام اساتذہ ان ائمہ حدیث میں سے ہیں جن کی حیثیت صرف محدث کی نہیں
بلکہ ان معدلین کی ہے جن کی گرامی قدر رائے راویانِ حدیث کی توثیق و تضعیف میں محدثین کے یہاں
میزان و معیار ہے۔

ب : یہ قلیل الحدیث نہیں بلکہ کثیر الحدیث ہیں۔ اگر یہ قلیل الحدیث ہوتے تو پھر امام ذہبی ان کا
ذکر نہ کرتے۔

جہاں یہ وہ حفاظ ہیں جن کا مقام علم حدیث میں اعتباری اور استدلالی ہے اگر وہ متروک ہوتے تو ہشام کی طرح تذکرۃ الحفاظ ان کے تراجم سے خالی ہوتا۔ اور اگر ایک طرف ان تصریحات سے امام اعظم کے اساتذہ کے متعلق یہ ثابت ہو رہا ہے تو دوسری طرف خود امام اعظم کے بارے میں بھی یہ حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔

امام اعظم کا حفاظ حدیث میں مقام

اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ یہی کیا ہے جبکہ امام اعظم کا ترجمۃ تذکرۃ الحفاظ میں موجود ہے تو پھر امام ذہبی کے اصول کے مطابق امام اعظم کی ذات گرامی ارباب حدیث کے نزدیک ان محدثین رواۃ کی ہے جن کی رائے پر راویوں کی ثقاہت، عدالت اور صداقت کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ عمل کی دنیا میں امام ذہبی نے اسے واقعہ بنا کر پیش کیا ہے چنانچہ فقیر مدینہ حضرت عبداللہ بن ذکوان مدنی کے متعلق تذکرہ میں جہاں سفیان ثوری نے امام احمد سے توثیق کے الفاظ نقل کیے ہیں وہاں سب سے پہلے امام اعظم کے الفاظ کو نمایاں طور پر پیش کر کے فقیر مدنی کی تعدیل کی ہے۔

قال ابو حنیفہ رأیت ربیعۃ وابالذناذوالزناذافقہ
الرجلین -

ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ میں نے ربیعہ اور ابو الزناؤ دونوں کو دیکھا ہے لیکن
ابو الزناؤ زیادہ فقیہ ہیں۔

امام جعفر الصادق کی ذات گرامی سے کون واقف نہیں ہے نامی گرامی شخصیت ہیں۔ امام مالک، سفیان ثوری جیسے اساطین حدیث کے استاد ہیں۔ امام ذہبی نے جہاں ان کی توثیق بعد کے محدثین سے نقل کی ہے تو وہاں پہلے امام اعظم کی جانب سے ان کو عدالت کا سرٹیفکیٹ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

عن ابی حنیفۃ قال مارأیت افقہ من جعفر بن محمد

بالفاظ دیگر امام ذہبی نے امام اعظم کی معدلانہ حیثیت کو خود اپنے عمل سے علی رؤس الاشہاد ثابت کر دیا اور بتا دیا کہ یہ صرف فکر و نظر کا تراشا ہوا پیمانہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ اور اگر حقیقت ہے کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں غیر ثقہ اور متروکین میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کیا جیسا کہ

خود آپ امام ذہبی سے سُن چکے ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ امام ذہبی کی میزان الاعتدال میں امام اعظمؒ
 "تذکرہ الحاتی ہے جیسا کہ پہلے آپ تفصیلاً پڑھ چکے ہیں۔ اور امام ذہبی کے تذکرہ الحافظ میر
 الترمذی نے کہ قلیل الحدیث کو تذکرے میں جگہ نہ دی جائے گی یہ بات بھی صاف کر دی اور اسے
 بنادیا کہ حافظ ذہبی کے نزدیک امام اعظمؒ کی ذات گرامی قلیل الحدیث نہیں بلکہ کثیر الحدیث ہے
 خارجہ کی طرح جو فقہاء و سہمہ میں سے ہیں۔ امام اعظمؒ بھی فقیہ ہونے کے ساتھ قلیل الحدیث ہو۔
 تو ذہبی ان کا تذکرہ الحافظ میں ذکر نہ کرتے۔ اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ذہبی کی نگاہ
 امام اعظمؒ کی ذات گرامی محدث، حافظ، امام الحدیث، کثیر الروایت، امام تبوع، الامام الناقذ معام
 ثبت، متقن، حجة، معتدل ہونے کے ساتھ مجتہد اور فقیہ تھے۔ اسی بنا پر حافظ محمد بن ابراہیم الو
 نے یہ کھلا اقرار کیا ہے۔

۱۰ خارجہ بن زید قلیل الحدیث ہیں یہ امام ذہبی کی رائے ہے ان کے الفاظ تذکرہ الحافظ میں یہ ہیں۔ ^{الفقہ}
 السبعة من كبار العلماء الالة قلیل الحدیث (تذکرہ الحافظ ج ۱ ص ۸۶) ابن سعد نے طبقات میں ذہبی سے
 اختلاف کیا ہے اور ابن سعد ذہبی سے مقدم ہیں وہ فرماتے ہیں کان کثیر الحدیث (طبقات ج ۵ ص ۲۶۲) انہ
 رقمطراز ہیں کان بارعاً فی العلم (تہذیب الاسماء ص ۱۴۲) امام ذہبی کے خارجہ کو قلیل الحدیث کہنے کی وجہ یہ معلوم
 ہے کہ خارجہ نے دوسرے تابعین کی طرح روایت کا زیادہ کام نہیں کیا اس لیے وہ قلیل الروایت ہیں اور قلت روا
 کی بنا پر ان کو ذہبی نے قلیل الحدیث کہہ دیا ہے ورنہ نفس حدیث کی حد تک وہ کثیر الحدیث ہیں جیسا کہ ابن سعد کی رائے
 ہے۔ حدیث نبوت کے علم اور حدیث نبوت کی روایت میں جو ہری فرق ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ جسے ارشادات
 کا علم ہو اس حدیث کی روایت بھی ہو صیبر میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ہیں جن سے روایت حدیث کم ہے وجہ آہ
 کی یہی ہے کہ ان کو اس کا موقع ہی نہیں ملا ہے جیسا کہ ابن سعد رقمطراز ہیں انما قلت الروایت عن الکابر من صحاب رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانہم لیکوا قبل ان یحتاج الیہم (ج ۲ ص ۳۷۹) اس لیے امام ذہبی کا یہ کہنا کہ خارجہ قلیل الحدیث
 ہیں بلحاظ روایت حدیث ہے اور ابن سعد کا یہ بتانا کان خارجہ کثیر الحدیث بلحاظ علم حدیث ہے۔ ان دونوں باتوں میں
 کوئی تعارض نہیں ہے حافظ البغیم نے ان کے قلیل الروایت ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ تفقہ لم یفردوا اثر العزلة
 ولم ینتشر عنہ من کلامہ کثیر شئی (حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۹۰) اس عزلت گزینی، انفراد اور خلوت پسندی کو
 خارجہ نے ان سیاسی حالات کی بنا پر اختیار کیا جو اس وقت پوری امت اسلامیہ کو درپیش تھے تفصیل کے لیے
 طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۶۴ دیکھو۔

قد تواتر علمہ و فضلہ واجمع علیہ

یعنی یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جس کے لیے روایت و اسناد کے کسی بھی سہارے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تواتر سے ثابت ہے اور اس موضوع پر اُمت کی پوری علمی طاقت میں کبھی دو رائے نہیں ہوتی ہیں اور علم سے مراد علم حدیث ہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

قد کان الحافظ المشہور بالحنایۃ فی هذا الشان

حافظ محمد بن یوسف الصالحی الشافعی مؤلف السیرۃ الشافعیۃ البکرمی عقیقہ و الجمان میں فرماتے ہیں:

کان ابو حنیفۃ من کبار حفاظ الحدیث و اعیانہم

اسی بنا پر امام حاکم نے مصنفۃ الحدیث کی نوع تاسع والاربعین میں امام اعظم ابو حنیفہ کا بھی دو مرتبہ محدثین کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس نوع کو شروع کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ۔ یہ نوع تابعین اور اتباع تابعین میں سے ان ائمہ حدیث کے تذکار پر مشتمل ہے جن کی حدیثوں کو حفظ، تذکرہ اور تبرک کی خاطر فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ ائمہ حدیث ثقات اور مشہور ہیں۔ اس کے بعد مختلف شہروں کے محدثین کا ذکر کیا ہے۔ مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، بصرہ، الجزیرہ اور کوفہ کے محدثین میں ابو حنیفہ النعمان بن ثابت التیمی کا کھلے اور واشگاف الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

امام اعظم اور اسنادِ عالی

آپ پر ٹھ چکے ہیں کہ امام اعظم کے اساتذہ حدیث میں صحابہ اور تابعین کی وہ عظیم المرتبت اور

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ واضح ہے کہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر محقق ہیں۔ اتحاف النبلاء میں نواب صاحب لکھتے ہیں کہ واصل مرتبہ اجتہاد مطلق گردید اور ان کے تعارف میں نواب صاحب نے تین سطروں پر مشتمل القاب لکھے ہیں اس لیے امام اعظم کی شان محدثانہ پر ان کی شہادت کسی عقیدت کے بوجھ سے دینی ہوئی نہیں بلکہ امر واقعہ اور حقیقت کا اظہار ہے۔ نواب صاحب نے جو القاب لکھے ہیں یہ ہیں۔ السید السند الامام العلامة، المحدث الاصولی، المشکلم، الفقیہ، البلیغ الرحلہ، الحجۃ، فرید العصر، نادرۃ الدہر، خاتمۃ النفاذ، حامل لواء الانسا، بقیۃ اہل الاجتہاد، کشاف اصناف الفرائد، خطاف ازہار الفوائد، فاتح اقبال اللطائف، مانع اقبال النظرائف، مصیب شواکل المشكلات، مطبق مفصل المعضلات، مضحک کاتم النکت، عز الدین، نوحی السنہ۔ (اتحاف ص ۳۷۴) ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

جلیل القدر ہستیاں ہیں جو اسلامی علوم میں مرکزی حیثیت کی مالک ہیں ان مشائخ کی جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر قرب امام اعظم کو حاصل ہے بعد کے محدثین اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کو نہیں ہے۔ بڑے بڑے محدثین آخر عمر تک سند عالی کی جستجو میں رہے اور اس کی تلاش میں بہتوں نے سفر کی بڑی بڑی محنتیں اور قربانیاں گوارا کیں۔ حافظ ابن حزم نے ایک قابل قدر تحقیق فرمائی ہے جس میں اقوام دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں کی اسنادی خصوصیت پر ایک جامع تبصرہ کر کے بتایا ہے :-

نقل و روایت کا یہ سلسلہ صرف مسلمانوں کی خصوصیت ہے اور زمانے کی ساری کروڑوں کے باوجود اللہ نے مسلمانوں میں یہ سلسلہ باقی رکھا ہے کتنے اللہ کے بندے اس کی خاطر کتنی مسافرتیں طے کرتے ہیں یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

جیسے روایت و تاریخ میں اسناد مسلمانوں کی خصوصیت ہے ایسے ہی اسناد میں اسناد عالی وہ ممتاز سنت ہے جس کی علماء ہمیشہ جستجو کرتے رہے ہیں کیونکہ سند جس قدر عالی ہوگی اسی قدر خطا اور علت کے شائبہ سے پاک ہوگی۔ امام ابو عبد اللہ الحاکم نے جو سب سے پہلی قسم بتائی ہے اس کا عنوان ہی معرفۃ عالی الاسناد ہے اور لکھا ہے کہ:

طلب الاسناد عالی سند صحیحۃ

علامہ نووی نے لکھا ہے کہ:

طلب العلوفیہ سند صالحۃ

لہ الفصل فی الملل والنحل ج ۲ ص ۸۲۔ ابو علی الجبالی کہتے ہیں کہ اللہ نے اس امت کو تین خصوصیتوں سے نوازا ہے ایک اسناد دوسرے انساب تیسرے اعراب اسناد بطاریب دینی ہے اور یہ سنت میں سنت مؤکدہ ہے عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اسناد متراکمہ دین ہے اگر اسناد نہ ہوتی تو اس کے منہ میں جو آنا کہہ دیتا سفیان ثوری کا کہنا ہے کہ اسناد مومن کا ہتھیار ہے سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ایک روز امام زہری نے ایک حدیث بیان کی میں نے کہا کہ یہ بغیر سند کے ہے فرمایا کیا تم کو بھٹے پر بغیر سیڑھی کے چڑھنا چاہتے ہو۔ تعلیقات علی توضیح الافکار

محمد نجی الدین عبد الحمید - ج ۱ ص ۲۹۶ - لہ تقریب ص ۱۸۲ -

حافظ سیوطی کہتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ
اسناد عالی کی تلاش سلف کی سنت ہے کیونکہ اصحاب ابن مسعود کو فہ سے
مدینہ جاتے تھے اور حضرت عبداللہ کی پیش فرمودہ احادیث کو حضرت عمر
سے سنتے تھے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ:
اسی بنا پر اس کے لیے سفر کرنا مستحب ہے۔
امام حاکم نے اس کے مستحب ہونے کا اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو صحیح مسلم میں بحوالہ حضرت
انس بن مالک اس طرح آئی ہے۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہمیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات
کی اجازت نہ تھی ہمیں یہ بات بھی بھلی معلوم ہوتی تھی کہ کوئی بیرونی
شخص آئے اور آپ سے پوچھے اور ہم سنیں۔ چنانچہ ایک روز ایک
شخص آیا اور یوں گویا ہوا۔

نو وارد: ہمارے پاس آپ کا قاصد آیا اس نے آپ کی جانب سے بتایا ہے کہ آپ کو اللہ سبحانہ
نے رسول بنایا ہے۔

حضور انور: ہاں یہ ٹھیک ہے واقعی میں اللہ کا رسول ہوں۔

نو وارد: آسمان کس نے بنایا ہے؟

حضور انور: اللہ سبحانہ نے۔

نو وارد: اور زمین کس نے بنائی؟

حضور انور: اللہ سبحانہ نے۔

نو وارد: آسمان و زمین اور پہاڑوں میں منافع کس نے رکھے؟

حضور انور: اللہ پاک نے۔

نو وارد: اچھا بتائیے آپ کو اس اللہ کی قسم جس نے آسمان و زمین اور پہاڑ بنائے کیا آپ
کو اس نے رسول بنایا ہے؟

حضور انور: ہاں۔

نوروارو: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں؟

حضور انور: میرے قاصد نے ٹھیک بتایا ہے۔

نوروارو: آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے کیا آپ کو اللہ نے اس کا حکم دیا ہے؟

حضور انور: ہاں۔

نوروارو: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ ہمارے مالوں میں صدقہ ضروری ہے؟

حضور انور: ٹھیک ہے۔

نوروارو: آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے کیا یہ حکم آپ کو اسی نے دیا ہے؟

حضور انور: ہاں اسی نے دیا ہے۔

نوروارو: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ ہم پر سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض ہیں؟

حضور انور: ہاں ٹھیک ہے۔

نوروارو: آپ کو آپ کے روانہ کرنے والے کی قسم کیا آپ کو روزہ کا اس نے حکم دیا ہے؟

حضور انور: ہاں مجھے روزے کا اسی نے حکم دیا ہے۔

نوروارو: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ بشرط استطاعت حج فرض ہے؟

حضور انور: ہاں ٹھیک ہے۔

نوروارو: آپ کو روانہ کرنے والے کی قسم کیا آپ کو اسی نے حج کا حکم دیا ہے؟

حضور انور: ہاں۔

نوروارو: قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر روانہ کیا میں اس میں کمی نہ کروں گا اور نہ زیادتی۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا حضور انور نے فرمایا کہ اگر سچا ہے تو ضرور

جنت میں جائے گا۔

امام ابو عبد اللہ الحاکم نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

فیس، دلیل علی طلب اجازۃ المرأ لعلو من الاسناد

اور استدلال کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دیہاتی کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی زبانی فرائض اور اسلامی زندگی کا علم ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود بدوی سفر کی تکلیف برداشت کر کے بالمشافہ دریافت کرنے کے لیے خدمت گرامی میں آیا۔ اگر بدوی کا یہ عمل ناپسندیدہ ہوتا تو حضور انور اس پر ضرور گرفت فرماتے۔

حافظ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ حضرت ابویوب انصاری مدینہ سے عقبہ بن عامر کے پاس صرف ایک حدیث کی خاطر مصر تشریف لے گئے چنانچہ جب وہ مصر پہنچے۔ لوگوں نے ان کی آمد سے عقبہ بن عامر کو مطلع کیا۔ اطلاع ملنے پر فوراً باہر تشریف لائے۔ طے حضرت ابویوب نے فرمایا وہ حدیث سنائیے جو مسلمان کی پردہ پوشی کے بارے میں حضور انور سے سنی ہے کیونکہ اس ارشاد کا حضور سے سننے والا میرے اور آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ حضرت عقبہ نے فرمایا ہاں میں نے حضور سے سنا ہے۔

من ستر مسلماً علی خزیۃ سترہ اللہ یوم القیامۃ

حضرت ابویوب انصاری حدیث سنتے ہی سواری پر سوار ہو گئے اور مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے اور واپسی میں اتنی جلدی کی کہ اونٹنی کا کجاوہ تک نہ کھولا۔

امام ابو عبد اللہ الحاکم بسند متصل بیان فرماتے ہیں کہ ایک خراسانی حضرت امام شعبی کے پاس آیا اور بولا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کے پاس کنیز ہو اس نے آزاد کی اور پھر اس نے نکاح کر لیا۔ امام شعبی نے فرمایا کہ ہم سے ابو بردہ نے اپنے والد کے حوالہ سے بتایا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے پاس کنیز ہو اس نے اس کو باادب اور باسیقہ بنایا ہو اور تعلیم دی اور خوب تعلیم دی ہو۔ پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کیا ہو اسے دگنا اجر ملے گا اور جس غلام نے اللہ سبحانہ اور اپنے آقا کا حق پورا کیا اسے دوہرا اجر ملے گا۔ امام شعبی نے یہ حدیث بیان فرمانے کے بعد نو وارد خراسانی سے کہا تمہیں حدیث مفت ہی بتادی ورنہ اس سے بھی کمتر کے لیے مدینہ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔

۱۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۔ ۲۔ اللہ سبحانہ اس شخص کی قیامت کے دن پردہ پوشی کرے گا جو کسی رسوائی پر مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا۔ ۳۔ جامع بیان العلم وفضلہ۔ ۴۔ معرفۃ علوم الحدیث۔

الغرض محدثین نے علو اسناد کو ہمیشہ ایک قابلِ فخر چیز سمجھا ہے کیونکہ روایت میں جس قدر وسائط کم ہوں گے اسی قدر اس شخص صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرب ہوگا عافظ ابن الصلاح رقمطراز ہیں:

لَا نَقْرُبُ إِلَّا سُنَادَ قُرْبٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَالْقُرْبُ إِلَيْهِ قُرْبٌ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ - ۱

یہی علو اسناد کی پانچ قسموں میں سے سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ چنانچہ حافظ جلال السیوطی فرماتے ہیں:

أَجَلُّهَا الْقُرْبُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ نَحْوِ
الْعَدَدِ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ نَخِيفٍ - ۲

اسی لیے اہل فن کے نزدیک صحت اور علو اسناد کا جس قدر اہتمام ہوتا ہے اور کسی چیز کا نہیں ہوتا بلکہ امام مسلم تو علو سند کی خاطر گاہ گاہ سند صحیح چھوڑ کر سند ضعیف سے حدیث لاتے ہیں چنانچہ حافظ محمد بن ابوالیم الزریہ فرماتے ہیں:

زَيْبًا أَخْرَجَ مُسْلِمٌ الْأُسْنَادَ الضَّعِيفَ وَاقْتَصَرَ عَلَيْهِ
بَعْلُوهُ وَتَرَكَ الْأُسْنَادَ الصَّحِيحَ لِغُرُوبِهِ - ۳

اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث کے تذکرے میں ان کے علو اسناد کا ذکر خصوصیت سے ملتا ہے بلکہ خاص خاص اسانید عالیہ کو علمائے مستقل اجزاء میں علیحدہ مدون کر دیا ہے۔

امام اعظم کی احادیث

ائمہ اربعہ میں چونکہ تابعی ہونے کا فخر امام اعظم کو حاصل ہے اور یہ وہ فخر ہے کہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی امام صاحب کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں ہے نہ امام اوزاعی کو شام میں، نہ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ کو بصرہ میں، نہ سفیان ثوری کو کوفہ میں، نہ امام مالک کو مدینہ میں، نہ امام مسلم بن خالد کو مکہ میں اور نہ امام لیث بن سعد کو مصر میں۔ لہٰذا اس کے نتیجے میں امام اعظم ابو حنیفہ ائمہ اربعہ میں اس شرفِ خاص میں ہی امتیازی مقام رکھتے ہیں کہ ان کو بارگاہِ رست

۱۔ مقدمۃ ابن الصلاح ص ۱۰۶۔ ۲۔ تدریب الراوی ص ۱۸۳۔ یعنی علو اسناد کی بزرگترین قسم یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلحاظ عدد بسند صحیح نزدیک کی حاصل ہو۔ ۳۔ الروض الباسم ص ۱۶۵۔
۴۔ المحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۲۲۔

سے براہ راست صرف بیک واسطہ تلمذ حاصل ہے۔ امام صاحب کی ان روایات کو جو آپ نے صحابہ سے سنی ہیں احادیات یا وحدان کہتے ہیں یعنی وہ روایات جو آنحضرت سے بیک واسطہ منقول ہیں۔ چنانچہ علامہ سخاوی فتح المنیث میں فرماتے ہیں :-

وَالشَّائِبَاتُ فِي الْمَوْطَأِ لِلْإِمَامِ مَالِكٍ وَالْمَوْحِدَانُ فِي حَدِيثِ
الْإِمَامِ أَبِي حَنِيفَةَ - ۱

امام اعظم کے یہ وحدان مندرجہ ذیل صحابہ سے آئے ہیں :
حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن الحارث بن جبر، حضرت
عبداللہ بن ابی اوفی، حضرت وائلہ بن الاسقع، حضرت عبداللہ بن انیس
حضرت عائشہ بنت عجرہ۔

اس لیے ان روایات کی تعداد چھ ہے :

- ۱۔ عن ابی حنیفہ عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۲۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن الحارث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۳۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن ابی اوفی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۴۔ عن ابی حنیفہ عن وائلہ بن الاسقع عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۵۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن انیس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۶۔ عن ابی حنیفہ عن عائشہ بنت عجرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

متقدمین میں سے بہت سے علماء نے امام صاحب کی ان احادیات پر رسالے لکھے ہیں۔
علامہ زاید کوثری نے اس موضوع پر مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ رسا کل تصنیف کرنے والوں
میں حافظ ابو حامد محمد بن ہارون الحضرمی جو فن حدیث میں حافظ دارقطنی کے استاد ہیں حافظ
ابو الحسین علی بن احمد بن عیسیٰ، النہیقی، حافظ ابو معشر عبد الکریم بن عبد الصمد الطبری الشافعی،
اور حافظ ابو بکر عبد الرحمن بن محمد السرخسی کے رسا کل خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور حفاظ کی روایات
میں داخل ہیں۔ چنانچہ حافظ حضرمی، حافظ النہیقی اور حافظ طبری کے رسالے حافظ ابن حجر
عسقلانی نے المعجم المفہرس میں اور حافظ ابن طولون نے الفہرست الاوسط میں پورے روایت

روایت کیے ہیں۔ اور حافظ ابو بکر السرخسی کا رسالہ مشہور محدث سبط بن الجوزی نے الانتصار والترجیح میں اپنی مرویات میں شمار کیا ہے یہ

حافظ ابو معشر طبری کے رسالہ کو حافظ جلال الدین السیوطی نے بھی تبیض الصحیفہ میں نقل کیا ہے

اسنادِ عالی کی دوسری قسمیں

اسنادِ عالی کی قسم اعلیٰ تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اصول حدیث کی کتابوں میں اس کی چار قسمیں اور بتائی گئی ہیں۔

الف: یہ کہ مشہور امام حدیث سے قرب حاصل ہو چاہے اس امام کے بعد راویوں کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

ب: حدیث کی معتد کتابوں میں سے کسی سے قرب حاصل ہو۔ حافظ عسقلانی نے اس کی چار صورتیں بتائی ہیں۔ موافقت، بدل، مساوات اور مصافحہ۔

ج: یہ کہ علو کا سبب کسی راوی کی وفات کا تقدم ہو خواہ دوسری سندوں اور راویوں کی تعداد برابر ہی کیوں نہ ہو۔

د: یہ کہ ایک راوی حدیث سننے میں دوسرے راوی سے پہلے ہو دونوں نے ایک حدیث ایک ہی استاد سے سنی ہو مگر ایک نے پہلے دوسرے نے بعد میں سنی ہو۔

در اصل علو تحقیقی تو پہلی ہی قسم ہے۔ ان قسموں میں اسنادی علو صرف نسبتی اور اضافی ہے۔ ان چار قسموں میں سے امام ابو عبد اللہ الحاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں پہلی قسم کو جس میں کسی مشہور امام حدیث سے قرب حاصل ہو راجح قرار دیا ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے ان مشہور ائمہ حدیث یعنی، اوزاعی، مالک، عیسیٰ، ابن جریر اور شعبہ کے نام بتائے ہیں۔ اور الحجازی نے امام حاکم کے حوالے سے یہ ضابطہ لکھا ہے کہ:

کل اسناد بقرب من الامام المذكور منه فاذا صحت الروایۃ

الی ذلک الامام بالعدد الیسیر فانہ عالی۔ ۳

ہر اسناد جس میں امام مذکور سے قرب ہو جائے جب عدد یسیر کے

ذریعے اس امام تک روایت صحیح ہو جائے تو بس یہی اسناد عالی ہے۔

اس کے بعد اسی ضابطہ کی مثال میں یہ روایت پیش کی ہے۔

حدثنا علي بن الفضل حدثنا الحسن بن عرفة حدثنا
هشيم عن يونس بن عبيد عن نافع عن ابن عمر قال
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مطلق الفتي ظلمه
یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

یہ ہم جیسوں کے لیے تمام اسانید میں عالی ہے۔ اس کی سند میں
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک سات راوی ہیں اور اس کے عالی
ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ہشیم بن بشیر امام حدیث سے
قریب تر ہے۔

مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جن کے قرب سے محدثین کے یہاں اسناد عالی ہوتی ہے
اور جس علو پر ان کو فخر ہے ان کا حال یہ ہے کہ ان میں بیشتر امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ دور کیوں
جاتے ہو یہی امام ہشیم بن بشیر جن کے قرب سے یہ اسناد عالی ہوتی ہے امام اعظم کے مشہور
تلامذہ ہیں چنانچہ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام اعظم کے ترجمہ میں جن ائمہ حدیث کے
بارے میں تصریح کی ہے کہ وہ حدیث میں امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ ان میں ان کا نام بھی ہے
یہ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ امام ذہبی نے ان کو الحافظ الکبیر، محدث العصر لکھا ہے
ہشیمؒ میں پیدا ہوتے انہوں نے تابعین سے علم حدیث حاصل کیا مثلاً امام ابو حنیفہ، امام
عمر بن دینار اور زہری، حضرت ابن عمر اور ابن عباس کے فتاویٰ پر ان کی نظر وسیع تھی۔ درس
میں تھلیل، تسبیح اور تہجد و روزبان ہوتی تھی جب وہ لالہ، لا اللہ کہتے تو فوراً ٹھٹھ سے ان کی
آواز بلند ہوتی۔ حافظ ہشیم بخاری کے رُسنے والے تھے ان کے والد واسط میں مقیم تھے۔ واسط
میں قاضی وقت حافظ ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کے درس میں پابندی سے حاضر ہوتے

۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳

اور فقر کی تحصیل و تکمیل کرتے تھے۔ ایک بار شمیم بیمار ہو گئے اور مجلس درس میں حاضر نہ ہوئے

ص ۳۰ کا یقینہ حاشیہ)۔ منشی تھے جبکہ وہ واسط میں محکمہ قصا میں مقرر تھے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ احادیثہ صالحہ (تہذیب ص ۲۴) یہ ابواسحاق اسلمی، ولید بن مسلم، زید بن الجباب، زید بن ہارون، علی بن الجعد اور اپنے ماموں حکم بن صہبہ کے شاگرد ہیں۔ لکن نقد و رجال نے ان کو خواہ کچھ کہا ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ ابن ماجہ اور ترمذی کے راویوں میں سے ہیں اسی بنا پر حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں ان کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ ان کا ذکر تہذیب التہذیب میں کیا ہے تہذیب میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ امامۃ موثقون و امامتات مقبولون و امام قوم ساد حفظہم و لم یطرحوا و اما قوم ترکوا و جرحوا۔ حافظ صاحب نے تقریب میں ان کو متروک الحدیث کہہ کر طبقہ سابقہ میں شمار کیا ہے اور معلوم ہے کہ متروک حافظ صاحب اسے کہتے ہیں من لہ یوثق البتہ و ضعف مع ذلک بقادح (ص ۳) اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم حافظ صاحب کے نزدیک اس لیے ضعیف نہیں کہ ان پر جھوٹکی تہمت ہے ان پر دوسرے ناقدین کی جانب سے اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ضعیف ہیں اور منکر الحدیث ہیں یہ ایک مبہم جرح ہے حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ کذب، شذیبتہ فی قصۃ۔ یہ قصہ کیا ہے حافظ ذہبی نے اسے بھی بے نقاب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نے بحوالہ حکم عن ابی لیلیٰ بتایا ہے کہ صفین کی جنگ میں ستر بدری شریک تھے۔ امام شعبہ کہتے ہیں کہ ابراہیم جھوٹ کہتے ہیں کیونکہ میں خود ابراہیم کے استاد حکم سے ملا ہوں انہوں نے مجھے بتایا کہ صفین میں بدر والوں میں سے صرف حضرت خزیمہ شریک تھے۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم کا یہ کہا غلط ہے کہ صفین میں ستر بدری شریک تھے تو امام شعبہ کا یہ بتانا بھی ستر تا ستر غلط ہے کہ صفین میں حضرت خزیمہ کے سوا کوئی بدری تھا کیا حضرت علی اور حضرت عمار بدری نہیں ہیں۔ اس لیے ابراہیم کے جھوٹا ہونے کی کہانی صرف ایک افسانہ ہے جس کی تاریخ کے بازار میں کوئی قیمت نہیں ہے اور صرف ضعیف ہونے کی بنا پر اگر ابراہیم کی روایت قابل قبول نہیں ہے تو پھر اسی روایت تو بخاری میں بھی موجود ہیں جن کے راویوں کے بارے میں بالاتفاق متروک ہونے کا اعلان ہے مثلاً بخاری کی کتاب المناقب میں حسن بن عمارہ کے حوالہ سے حدیث آئی ہے جن کے بارے میں لکھا ہے کہ اطبقتوا علی ترکہ۔ ایک اور راوی اسید بن الجمال ہے ان سے امام بخاری نے کتاب الرقاق میں حدیث روایت کی ہے حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ لہذا حدیثہ ضعیفہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اریاب فتن کے یہاں صرف راوی کا ضعیف ہونا ہی روایت کے ضعیف ہونے کا معیار نہیں ہے روایت ضعیف ہونے کے باوجود بھی مقبول ہوتی ہے۔ اگر بخاری کی یہ روایات ضعیف ہونے کے باوجود تعلق امت بالقبول کی وجہ سے صحیح ہیں تو ابراہیم کی ابن عباس والی وہ روایت جس میں تراویح کی تعداد میں بتائی ہے تعلق الخلفاء بالقبول، تعلق العلماء بالقبول، تعلق الامۃ بالقبول اور تعلق الامۃ بالقبول کی وجہ سے بھی صحیح ہے۔

ابوشیبہ کو فکرمندی انہوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بیمار ہو گئے ہیں اپنے شاگردوں سے کہا چلو مشیم کی عیادت کو چلیں۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہو گئے اور قاضی صاحب کے ساتھ مشیم کی عیادت کو ان کے والد بشر کے گھر پہنچے۔ جب قاضی صاحب فرض عیادت سے فارغ ہو کر اپنے شاگردوں کے ساتھ چلے تو بشر نے اپنے بیٹے سے کہا بیٹا! میں تمہیں طلب حدیث سے روکتا تھا لیکن آج سے اپنی ممانعت واپس لیتا ہوں۔ قاضی ابوشیبہ جیسا شخص اور میرے دروازے پر آئے ایسے واضح ہے کہ واسط میں امام اعظم کے تلامذہ میں سے صرف مشیم نہیں بلکہ کروری نے صرف واسط میں امام اعظم کے تلامذہ بتاتے ہیں ان کی تعداد تیس ہے ان میں سے ایک امام مشیم ہیں۔ امام احمد بن حنبل پانچ سال تک ان کے درس حدیث میں شریک رہے اور فن حدیث میں عبور حاصل کیا۔

امام اعظم کی شائیات

امام ابو حنیفہ اگرچہ خود تابعی ہیں مگر ان کو بڑے بڑے تابعین سے حدیث پڑھنے کا موقع ملا ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام شعبی کو الامام، علامۃ التابعین کہہ کر بتایا ہے کہ ابو اکبر شیخ الامام ابی حنیفہ امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ امام شعبی کے پاس رہا۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لوگ ان سے مسائل پوچھتے تھے اور اصحاب متوافرون حالانکہ صحابہ بہت تھے۔ خود امام شعبی فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ سو صحابہ کو پایا ہے۔ ایسے ہی امام ذہبی نے دول الاسلام میں مشہور تابعی عطاء بن ابی رباح کے متعلق تصریح کی ہے کہ اکبر شیوخہ عطاء بن ابی رباح۔ امام اعظم کے سب سے بڑے استاد ہیں۔ اس لیے احادیث کے بعد امام اعظم کی مرویات میں شائیات کا درجہ ہے یعنی وہ حدیثیں جو آپ نے تابعین سے سنی ہیں اور تابعین نے صحابہ کرام سے۔ امام مالک چونکہ تابعی نہیں ہیں اس لیے ان کی مرویات میں سب سے عالمی مرویات شائیات ہی ہیں۔

امام محمد کی کتاب الآثار میں شافعی روایات حسب ذیل اسانید سے آتی ہیں۔

- ۱۔ ابو حنیفہ عن ابی الزبیر عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
- ۲۔ ابو حنیفہ عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

- ۳۔ ابو حنیفہ عن عبد اللہ بن ابی جبیۃ قال سمعت ابا الدرداء قال قال رسول اللہ
 ۴۔ ابو حنیفہ عن عبد الرحمن عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۵۔ ابو حنیفہ عن عطیۃ عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۶۔ ابو حنیفہ عن شداد عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۷۔ ابو حنیفہ عن عطاء عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۸۔ ابو حنیفہ عن عاصم عن رجل من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۹۔ ابو حنیفہ عن عون عن رجل من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۱۰۔ ابو حنیفہ عن محمد بن عبد الرحمن عن ابی امامۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۱۱۔ ابو حنیفہ عن مسلم الاور عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۱۲۔ ابو حنیفہ عن محمد بن قیس عن ابی عامرۃ، کان یہدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

امام اعظم کی ثلاثیات

امام شافعی، امام احمد کی کسی تابعی سے ملاقات نہ ہو سکی اس لیے ان کی مرویات میں سب سے
 اونچا مقام ثلاثیات کا ہے یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جن کو ان بزرگوں
 نے اتباع تابعین سے۔ انہوں نے تابعین سے اور تابعین نے صحابہ کرام سے سنا ہے۔
 صحاح ستہ کے مؤلفین میں سے امام بخاری، امام ابن ماجہ، امام ابو داؤد، امام ترمذی نے
 بعض اتباع تابعین کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں اس لیے اسناد عالی کے
 بازار میں یہ اکابر بھی امام شافعی اور امام احمد کے ہم پلہ ہیں۔ حالانکہ امام شافعی کی وفات کے
 وقت امام بخاری کی عمر دس سال تھی اور امام ابو داؤد صرف دو سال کے تھے اور امام ابن ماجہ
 تو ابھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ امام بخاری کی ثلاثی روایات کی تعداد صرف اکیس ہے
 اور یہ ان کی مرویات میں سب سے اونچی روایات ہیں۔ امام بخاری کو جن ذرائع سے یہ روایات
 ملی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

گیارہ احادیث
 پانچ احادیث
 تین احادیث

۱۔ امام مکی بن ابراہیم
 ۲۔ ابو عاصم النبیل
 ۳۔ محمد بن عبد اللہ الانصاری

ایک حدیث

۴۔ خلد بن یحییٰ

ایک حدیث

۵۔ عصام بن خالد

ان میں سے دو اہل الذکر حضرت مکی بن ابراہیم اور امام ابو عاصم النبیل جن سے تلامذات کی تعداد بالترتیب گیارہ اور پانچ ہے اور جو امام بخاری کے مشائخ میں طبقہ اولیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں دونوں امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ ہم اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے یہاں ان کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں۔

امام مکی بن ابراہیم

مکی بن ابراہیم بلخ کے رہنے والے ہیں حافظ ذہبی سے علامہ سخاوی ناقل ہیں :
بلخ میں دوسری صدی کے اواخر میں علامہ پیدا ہوتے جیسے کہ عمر بن مارون، مکی بن ابراہیم، خلف بن ایوب، قتیبہ بن سعید، محمد بن ابان، عیسیٰ بن احمد، محمد بن علی بن طرخان۔ پھر وہاں علم حدیث گھٹ کر ناپید ہو گیا۔

موصوف امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں چنانچہ صدر الائمہ مکی رقمطراز ہیں کہ :
مکی بن ابراہیم بلخی بلخ کے امام ہیں ۲۷ھ میں کوفہ میں آئے اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں ملازمت اختیار کی اور آپ سے حدیث و فقہ کا سماع کیا اور بکثرت روایتیں کی ہیں۔

امام مکی فن حدیث کے بہت بڑے امام گزرے ہیں حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا کمر ان نقطوں میں کیا ہے۔

مکی بن ابراہیم الحافظ الامام شیخ خراسان ابو السکن التمیمی۔

بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے شاگرد تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام بیہقی اور امام بخاری نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ امام بخاری نے بیشتر تلامذہ اربعین ان ہی سے روایت کی ہیں۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے ساٹھ ج کیے دس سال حرم محترم میں ڈیرہ رکھا اور سترہ تابعین سے احادیث لکھیں۔ ان کا بیان ہے کہ اگر مجھے

علم ہوتا کہ لوگوں کو میری ضرورت پڑے گی تو سوائے تابعین کے اور کسی سے حدیثیں نہ لکھتا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں ۲۷ھ میں پیدا ہوا اور سترہ سال کی عمر میں حدیث کی تحصیل شروع کی۔
 مکی بن ابراہیم کو تحصیل علم کی طرف امام ابو حنیفہ نے ہی متوجہ کیا تھا چنانچہ امام حارثی عبد الصمد بن فضل کی زبانی ان سے ناقل ہیں کہ:

میں بخارا میں تجارت کرتا تھا ایک بار امام صاحب کی خدمت میں آنا ہوا تو فرمانے لگے، مکی! تم تجارت کرتے ہو لیکن تجارت میں جب تک علم نہ ہو بڑی خرابی رہتی ہے علم تم کیوں نہیں حاصل کرتے ہو اور احادیث قلم بند کیوں نہیں کرتے۔ امام ابو حنیفہ مجھے برابر اس طرف متوجہ کرتے رہے تا آنکہ میں تحصیل علم میں مشغول ہو گیا۔ آخر اللہ سبحانہ نے مجھے بہت کچھ عطا کیا۔ اسی لیے میں ہر نماز میں اور جب بھی ان کا ذکر آتا ہے ان کے حق میں دعا کرتا ہوں لان اللہ تعالیٰ جزلتم فتح لی باب العلم

مکی بن ابراہیم کو امام اعظم سے خاص عقیدت تھی ایک بار امام صاحب کا ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ کان اعلم من مانئ

اسماعیل بن بشیر ناقل ہیں کہ ایک بار ہم امام مکی کی مجلس درس میں حاضر تھے۔ انہوں نے روایت شروع کی حد ثنا ابو حنیفہ حاضرین میں سے ایک اجنبی شخص نے چلا کر کہا کہ حد ثنا عن ابن جریج ولا تحد ثنا عن ابی حنیفہ اس پر امام مکی کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا فرمانے لگے:

اما لا تحدث السفهاء من علیک ان تکتب عنی قم من مجلسی ہم بیوقوفوں سے حدیث نہ بیان کریں گے مجھ سے حدیثیں نہ لکھو میری مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔

چنانچہ جب تک اس شخص کو مجلس سے نہیں اٹھایا گیا آپ نے حدیث بیان نہیں کی اور جب اس کو نکال دیا گیا تو پھر وہی حد ثنا ابو حنیفہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

الضحاك بن محمد البوعاصم النبيل

مشہور ائمہ حدیث میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ علامہ صمیمی نے ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ عبد القادر قرشی نے الجواهر المضية میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ نام تو ان کا الضحاك ہے کنیت ابو عاصم اور نبیل ان کا لقب ہے۔ نبیل کے معنی معزز کے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کو اس لقب سے کیوں پکارا گیا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اس سلسلے میں بہت سی باتیں نقل کی ہیں۔ امام طحاوی اور حافظ دولابی نے خود ان کا بیان اس سلسلے میں جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ امام زفر کے یہاں اکثر ان کی حاضری ہوا کرتی۔ اتفاق سے امام موصوف کے یہاں اسی نام کے ایک شخص اور بھی آیا کرتے جن کی وضع قطع بالکل گری ہوئی تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انہوں نے حسب معمول امام زفر کے دروازے پر دستک دی۔ لوٹدی نے اگر پوچھا کون ہے جواب ملا ابو عاصم! لوٹدی نے اندر جا کر اطلاع دی کہ ابو عاصم دروازے پر ہیں۔ امام زفر نے دریافت کیا کہ کون ہے ابو عاصم؟ لڑکی نے بے ساختہ کہہ دیا کہ النبیل منہما۔ ابو عاصم اجازت لے کر اندر آئے تو امام زفر نے کہا کہ اس لوٹدی نے تمہیں وہ لقب دیا ہے جو میرے خیال میں تم سے کبھی بھی جدا نہ ہوگا۔ ابو عاصم کا بیان ہے کہ اس روز سے میرا یہ لقب پڑ گیا۔ حافظ ابن ابی العوام نے بھی اس واقعہ کو بسند متصل بیان کیا ہے ابو عاصم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر نوے سال تھی۔ امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ فقہاء میں بھی بڑے نامور تھے۔ ابن سعد رقمطراز ہیں کہ کان ثقتہ فقیہاً۔ امام عجل کہتے ہیں ثقتہ کثیر الحدیث وکان لہ فقه۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ ابو عاصم کو ایک ہزار حدیثیں نوک زبان تھیں۔

الغرض ان ہی دونوں مکی بن ابراہیم اور ابو عاصم النبیل کے حوالہ سے امام بخاری کو بالترتیب گیارہ اور پانچ ثلاثیات ملی ہیں۔

دوسرے محدثین میں ابو داؤد و ترمذی کی ثلاثیات میں صرف ایک ایک روایت ہے مگر ابن ماجہ کی ثلاثی روایات کی تعداد پانچ ہے۔

حضرت امام اعظم کی روایات میں ثلاثیات کا مقام تیسرے درجے پر ہے یعنی جو روایات امام

بخاری، امام ابن ماجہ، امام ابو داؤد اور امام ترمذی کی درجہ اول میں ہیں وہ امام اعظم کے یہاں بلحاظ مقام تیسرے درجہ پر ہیں۔ اس قسم کی روایات کا امام صاحب کے یہاں وافر ذخیرہ ہے مثلاً:-

عن ابی حنیفہ عن بلال عن وریب عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عن ابی حنیفہ عن موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبد اللہ عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عن ابی حنیفہ عن عبد اللہ عن ابی یحییٰ عن عبد اللہ بن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام اعظم کی رباعیات

امام مسلم اور امام نسائی کی کسی تبع تابعی سے بھی ملاقات نہ ہو سکی اور اس وجہ سے ان کو ان سے کوئی حدیث سننے کا موقعہ نہیں ملا اس لیے ان دونوں امان حدیث کی سب سے عالی روایات رباعیات ہیں جن کو ان کے اساتذہ نے اتباع تابعین سے اور انہوں نے تابعین سے اور انہوں نے صحابہ کرام سے سنا ہے مثلاً امام مسلم کی رباعیات میں ہے :

حدثنا سويد بن سعيد قال حدثنا مردان الفزاري عن ابی
مالك سعد بن طارق عن ابيه قال سمعت رسول الله
صلى الله عليه وسلم يقول من قال لا اله الا الله وكفر
بما كان يعبد من دون الله حرم ماله ودمه وحسابه على الله

اور امام نسائی کی رباعیات میں ہے :

اخبرنا حميد قال حدثنا عبد الوارث قال حدثنا شعيب عن
انس بن مالك -

امام اعظم کی مرویات میں رباعیات بالکل آخری درجہ پر ہیں جو روایات نبوت سے قرب میں امام مسلم اور امام نسائی کے یہاں درجہ اول پر ہیں ان کی امام اعظم کے یہاں آخری درجہ کی حیثیت ہے چنانچہ امام محمد نے کتاب الآثار میں ایسی روایات نقل کی ہیں مثلاً :

ابو حنیفہ عن حماد عن ابراہیم عن الاسود بن یزید عن عمر بن الخطاب
ابو حنیفہ عن حماد عن ابراہیم عن علقمہ عن عبد اللہ

اس ساری تفصیل کو پڑھ کر یہ بات پورے طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ ارشادات اور حدیث نبوت کے سلسلے میں ائمہ اسلام میں سے قرب کا جو شرف خاص بارگاہ رسالت سے امام اعظم کو حاصل ہے

ہ کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ وحدانیت میں ان کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ شنائیات میں امام
لک کو مستثنیٰ کرنے کے بعد ان کا ہمسر کوئی نہیں۔ ثلاثیات اور رباعیات تو ان کے یہاں ایک
ام درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک تدوینِ حدیث

آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں کہ حدیث تاریخِ سنت کا نام ہے تاریخِ سنت یا حدیث پر تین دور
زے ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اپنے استاد حدیث شیخ عبداللہ بن سالم کے تذکرے میں
لکھا ہے :

صحیح حدیث میں جس ضبط کا اعتبار ہے اُمتِ مرحومہ اس میں تین دوروں
سے گزر کر آئی ہے۔

صحابہ و تابعین کے زمانے میں ضبطِ حدیث کی صورت یہ تھی کہ زبانی یاد
کرتے تھے۔ اتباعِ تابعین اور اہلِ محدثین کے زمانے میں ضبطِ
حدیث کی یہ صورت تھی کہ لکھتے تھے۔ اس کے بعد حفاظِ حدیث نے
اسماء الرجال غریب احادیث اور ضبطِ الفاظ کے لیے تصانیف کیں
اور تشریحات کا دور شروع ہو گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے تک حدیثوں کو سن کر زبانی یاد رکھنے کا
واج تھا اور اہلِ علم میں یہی چیز باعثِ فخر سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ رواج ٹھیک اسی طرح تھا جیسا
ج کل ہماری سوسائٹی میں قرآنِ حکیم کے لیے ہے بلکہ ان علماء پر جو کتاب وغیرہ پاس رکھتے تھے
رکھی ہوئی حدیثیں بیان کرتے تھے ان پر ایک طرح کی راجل صحفی کی پھبتی کسی جاتی تھی۔
یہ اس معاشرے میں علمِ صحیح کا اصلی دار و مدار ہی حفظ اور زبانی یادداشت تھا۔ اساتذہ کی
انب سے تلامذہ کو ہدایت ہوتی تھی کہ لکھو مت بلکہ جیسے ہم نے احادیث زبانی یاد کی ہیں تم بھی
زبانی ہی یاد کرو۔ چنانچہ ایک بار حضرت ابو موسیٰ اشعری نے دریافت کیا کہ کیا تم لکھتے ہو؟ شاگردوں
نے کہا جی ہاں! فرمایا! حفظوا عنا! حفظنا زبانی یاد کرو جیسے ہم نے زبانی یاد کی ہیں۔ بہر حال یہ

واقعہ ہے کہ جیسے اس وقت تک قرآن کی ۶۲۳۶ آیتوں کو گھوٹنے اور نوک بیان کرنے کا رواج مسلمانوں میں باقی ہے۔ اتباع تابعین کے زمانے تک قرآن کے ساتھ احادیث کو بھی زبانی یاد کرنے کا ایسا ہی دستور رہا ہے۔

طرق واسانید حدیث کی تعداد

اگر یہ صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ امام احمد فرماتے ہیں کہ احادیث کی کل تعداد سات لاکھ سے کچھ زائد ہے تو یہ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نہیں ہیں بلکہ آپ کے افعال، اخلاق، احوال اور آپ کی موجودگی میں لوگوں کے کیے ہوئے وہ کام جن پر آپ نے گرفت نہیں فرمائی اور اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال، ان کے مفتیوں کے فتاویٰ، زمانہ خلافت میں ان کی عدالتوں کے فیصلے بلکہ تابعین کے فتاویٰ اور حج ہونے کی حیثیت میں ان کے فیصلے اور قرآنی آیات پر تشریحی نوٹس بھی ان سات لاکھ میں شمار کیے گئے ہیں۔ یہ خیال بالکل عامی ہے کہ صرف ارشادات نبوت ہی کا نام حدیث ہے۔ ۱۔ الجزائری لکھتے ہیں:

إِنْ كَثِيرًا مِّنَ الْمُتَقَدِّمِينَ كَالْوَأَيْطَلِقُونَ إِسْمَ الْحَدِيثِ عَلَى مَا
يُشْمَلُ أَثَرُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ وَتَابِعِيهِمْ وَفَتَاوَاهُمْ۔

متقدمین کی اکثریت آثار صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین اور ان کے فتاویٰ پر لفظ حدیث بولتی ہے۔

اور یہ تعداد بھی سات لاکھ متون حدیث کی نہیں بلکہ طرق کی ہے یعنی سات لاکھ ان اسانید کی تعداد ہے جن کے ذریعے احادیث کے یہ متون ہم تک پہنچے ہیں۔ ایک حدیث اگر چار سندوں سے آئے تو یہ محدثین کی اصطلاح میں چار حدیثیں ہیں چنانچہ علامہ طاہر الجزائری لکھتے ہیں:

وَيَحْدُثُ ذُنُ الْحَدِيثِ الْمَرْوِيُّ بِاسْنَادَيْنِ حَدِيثَيْنِ۔

علامہ ابن جوزی نے تمام ذخیرہ حدیث کے متعلق کھلے لفظوں میں لکھا ہے کہ

الْمَرْوِيُّ بِهَذَا الْعَدَدِ وَالطَّرِيقُ لَا الْمَتْنُ۔

نواب علامہ صدیق حسن خاں نے المخطہ میں میر سید شریف سے بھی یہی جملہ نقل کیا ہے۔

واضح رہے کہ محدثین کے متعلق جو اصول کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ الجامع الصحیح کی موجودہ احادیث چھ لاکھ حدیثوں کا انتخاب ہے یا امام مسلم فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کی حدیثوں کو میں نے تین لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں ان کا انتخاب سنن ابو داؤد میں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ مسند احمد سات لاکھ سچاس ہزار حدیثوں کا انتخاب ہے۔ اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ارشادات نبوت کی یہ تعداد ہے بلکہ یہ ارشادات جن طرق اور اسانید سے آتے ہیں ان کی تعداد ظاہر کرنی مقصود ہے اور تاریخ حدیث میں یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ جہاں تک طرق و اسانید کا معاملہ ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں یہ تو صرف وہ ہیں جو ان بزرگوں نے اپنی عرق ریزیوں اور دست پیمائیوں کے بعد فراہم کیے ہیں ان کے علاوہ اگر دوسرے محدثین کی محنتوں اور یادداشتوں کو یکجا کیا جائے تو یہ سلسلہ بے حدود بے حساب ہے۔ کیونکہ تابعین کے زمانے میں اگر طرق و اسانید کی تعداد صرف چالیس ہزار تھی تو اتباع تابعین کے دور میں یہی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی کیونکہ ایک شیخ نے کسی حدیث کو مثلاً دس شاگردوں سے بیان کیا اب وہ محدثین کی اصطلاح میں دس اسانید اور طرق ہو گئے۔

احادیث صحیحہ کی اصلی تعداد

شاید آپ بے چین ہوں اور ذہنوں میں یہ غلط محسوس کر رہے ہوں کہ اگر یہ طرق و اسانید کی تعداد ہے تو پھر احادیث صحیحہ کی تعداد کیا ہے؟ محدثین و حفاظ حدیث کی بدولت ہم کو طرق و اسانید کے ساتھ متون احادیث صحیحہ کی تعداد کا بھی علم ہو گیا ہے۔ امام ابو جعفر محمد بن الحسین بغدادی نے کتاب التمیز میں امام سفیان ثوری، امام شعبہ بن الحجاج، امام یحییٰ بن سعید القطان، امام عبد الرحمن بن مہدی اور امام احمد بن حنبل جیسے اکابر کا متفقہ بیان نقل کیا ہے:

ان جملة الاحادیث المسندة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی الصحیحة بلا تکریر اربعۃ الاف واربع مائة حدیث

لہ المخط فی ذکر الصحاح الستہ

حضرت نور علی اللہ علیہ وسلم کی مسند اور صحیح بلا تکرار ارشادات کی تعداد
صرف چار ہزار چار سو ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ارباب صحاح میں سے ہر ایک نے اپنی کتابوں میں اسی تعداد کے لگ بھگ احادیث
کی تخریج کی ہے۔ چنانچہ حافظ زین الدین عراقی نے مکرات کو نکال کر صحیح بخاری میں آتی ہوئی حدیثوں
کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر فرماتے ہیں:

عدد احادیث البخاری باسقاط المكر اربعة آلاف

اور امام نووی نے صحیح مسلم کی حدیثوں کی تعداد بھی صرف چار ہزار ہی بتائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

ومسلم باسقاط المكر نحو اربعة آلاف

امام زرکشی نے سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی تعداد چار ہزار آٹھ سو بتائی ہے امام محمد بن اسماعیل بیانی
فرماتے ہیں:

قال الزركشي ان عدة احاديث ابی داؤد اربعة آلاف وثمانمائة

خود امام ابو داؤد نے اس خط میں جو انہوں نے اہل مکہ کے نام لکھا ہے تصریح کی ہے کہ سنن
میں احادیث کی تعداد صرف چار ہزار آٹھ سو ہے اور ان میں چھ سو مراسل ہیں۔

ابن ماجہ کے متعلق علامہ بیانی نے ابوالحسن بن القطان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

عدته اربعة آلاف حدیث ہے

موطا امام مالک جو ذخیرہ حدیث میں قدیم ترین کتاب ہے ابوبکر الاہمری فرماتے ہیں کہ اس
میں حضرت نور علی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین کے تمام آثار صرف ایک ہزار سات سو بیس ہیں ان
میں ارشادات نبوت کی تعداد چھ سو ہے مرسل ۲۲۰ موقوف ۶۱۳ اور تابعین کے فتاویٰ ۲۸۵
ہیں یہی حال حدیث کی دوسری کتابوں کا ہے۔

قرآن کی ۶۲۳۶ آیتیں اور ۴۴۰۰ احادیث

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جو لوگ قرآن کی ۶۲۳۶ آیتوں کو زبانی یاد کر سکتے ہیں ان کو چار ہزار

۱۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲ - ۲۔ تنقیح الانظار ج ۱ ص ۵۶ - ۳۔ التقریب ص ۵۱

۴۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۱ - ۵۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲ - ۶۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲ -

چار سو حدیثوں کو یاد رکھنا کون سی مشکل بات ہے۔ آخر یہ کیوں نہیں یاد کیا جاتا؟ کیا صرف اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں قرآن کے ساتھ صحابہ اور تابعین کی طرح سنت کی تاریخ کو زبانی یاد کرنے کا رواج نہیں ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں:

اگلے لوگ لکھتے نہ تھے صرف زبانی یاد کرتے تھے اور اگر کوئی لکھتا تو یاد کرنے ہی کے لیے لکھتا تھا اور جب زبانی یاد کر لیتا تو اسے مٹا دیتا۔^۱
قرآن کی طرح حدیث کے یاد کرنے کے جس رواج کا میں نے ذکر کیا ہے یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ اکابر سے اس موضوع پر ایسی مثبت تصریحات منقول ہیں جن کی بنا پر میں نے یہ دعویٰ کیا ہے چنانچہ حافظ ابن عساکر نے اسماعیل بن عبیدہ محدث سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَحْفَظَ حَدِيثَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا نَحْفَظُ الْقُرْآنَ۔^۲

حافظ ابن عبد البر نے معتمر بن البریان کے حوالے سے لکھا ہے:

ابو نصرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید خدری سے حدیث لکھنے کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ ہم نہیں لکھائیں گے تم ہم سے ایسے ہی لو جیسے ہم نے نبی سے لی ہے یعنی زبانی یاد کرو۔^۳

ایک دوسری روایت میں صریح الفاظ ہیں کہ:

ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم یحذنا فحفظوا کما کنّا نحفظ۔^۴

سید بن بلال نے ابو بردہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

حضرت ابو موسیٰ اشعری ہم سے حدیثیں بیان کرتے ہم ان کو لکھنے کے لیے جاتے آپ نے فرمایا کہ کیا مجھ سے سن کر قلم بند کرتے ہو ہم نے کہا جی ہاں۔ فرمایا میرے پاس لاؤ آپ نے پانی سے سب کو دھو دیا اور فرمایا کہ زبانی یاد کرو جیسے ہم نے زبانی یاد کیا ہے۔^۵

۱ جامع بیان العلم و فضلہ - ۲ تذکرۃ الحفاظ -
۳ ۴ ۵ جامع بیان العلم و فضلہ -

امام ذہبی نے اسرائیل بن یونس کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے دادا ابو اسحاق کی روایات کے بارے میں کہتے تھے۔

كنت احفظ حديث ابي اسحاق كما احفظ المسورة من القرآن^۱
حافظ ابن جریر عسقلانی نے شہر بن حوشب کے حالات میں لکھا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ شہر بن حوشب کو عبد الحمید بن بہرام کے حوالہ سے ساری حدیثیں اس طرح زبانی یاد تھیں گویا کوئی قرآن کی سورت پڑھ رہا ہے^۲ اور امام ابو داؤد طیالسی کے متعلق مشہور محدث عمر بن قدامس کا مشاہدہ بتایا ہے کہ میں نے محدثین میں ابو داؤد سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا۔ خود ان کو کہتے سناتے کہ فخر نہیں مگر تیس ہزار حدیثیں نوک زبان ہیں^۳ مشہور تابعی قتادہ بن دعامة کے بارے میں امام معمر فرماتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن ابی عروبہ سے کہا کہ قرآن کھول کر بیٹھ جاؤ میں سورہ بقرہ سناتا ہوں۔ سعید کہتے ہیں کہ میں نے اول سے آخر تک سنا ایک حرف کی بھی غلطی نہ تھی۔ پھر قتادہ نے کہا کہ:

لانا لصيفة جابر احفظ من سورة البقرة^۴
یاد رہے کہ جابر کا صحیفہ وہ ہی ہے جس کا تذکرہ آپ آغاز کتاب میں پڑھ چکے ہیں حضرت قتادہ قرآن کے ساتھ اس کے بھی حافظ تھے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صدر اول میں قرآن کی طرح سنت کو بھی زبانی یاد کرنے کا رواج تھا۔ اور اس رواج کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو اپنی خداوندی قوت حافظہ پر ناز تھا۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر نے اس طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ
كانوا مطبوعين على الحفظ مخصوصين بذلك^۵

صرف یہی نہیں بلکہ ان کو قوت حافظہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ لکھنا تو بڑی بات ہے وہ سن کر دوبارہ نہ پوچھنے کو بڑے مطمئن اور ناز سے بیان کرتے تھے چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں خود امام زہری کا بیان ہے کہ:

ما استعدت علما قط

^۱ تذکرۃ الحفاظ۔ ۲ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۷۱۔ ۳ تہذیب ص ۱۸۳

^۴ تہذیب ج ۸ ص ۳۵۳۔ ۵ جامع بیان العلم و فضلہ۔

سنن دارمی میں ابن شبرمر کی زبانی منقول ہے کہ امام شعبی فرمایا کرتے تھے کہ اے شباک! میں تم سے حدیث دوبارہ بیان کر رہا ہوں حالانکہ میں نے کبھی کسی حدیث کے دوبارہ اعادے کی درخواست نہیں کی۔ تذکرے ہی میں امام شعبی کا یہ بھی بیان ہے کہ مالکیت سوادا فی بیاض میں نے کبھی لکھی نہیں ہے ولا استحدثت حدیثاً من الانسان اور نہ کبھی کسی شخص سے حدیث سن کر تکرار کی درخواست کی ہے۔ بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ حدیث نبوی پر قرآن ہی جیسا ایسا دور گزرا ہے جس میں سارا زور صرف زبانی یاد پر ہی تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس موضوع پر کراہیتہ کتابۃ العلم کے نام سے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور ساری بحث کا اس پر خاتمہ کیا ہے۔

جن حضرات نے کتابت کو ناپسند فرمایا ہے جیسے حضرت ابن عباس، امام شعبی، امام زہری، امام نخعی اور قتادہ وغیرہ یہ سب کے سب وہ ہیں جو طبعی طور پر قوت حافظہ رکھتے تھے ان میں سے ایک ایک شخص صرف ایک بار سننے پر اکتفا کرتا تھا۔ امام زہری سے منقول ہے کہ میں جب بقیع سے گزرتا ہوں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں کہ شاید کہیں کوئی بُری بات اس میں نہ پڑ جائے کیونکہ خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بات میرے کان میں پڑی ہو اور اس کو بھول گیا ہوں۔ امام شعبی سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ یہ سب لوگ عرب تھے اور یہ مشہور ہے کہ عربوں کو زبانی یاد رکھنے میں خاص خصوصیت حاصل ہے ان میں سے ایک ایک شخص اشعار کو ایک بار سن کر ہی یاد کر لیتا تھا۔ حضرت ابن عباس کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے عمر بن ربیعہ کے پورے قصیدے کو ایک ہی بار سن کر یاد کر لیا تھا اور آج کوئی شخص بھی اس قسم کا حافظہ نہیں رکھتا۔

تدوین حدیث اور عمر بن عبدالعزیز

خلافت راشدہ میں اگرچہ حضرت فاروق اعظم نے سنت کی تدوین کا کام حکومت کی جانب سے

لے جامع بیان العلم وفضلہ۔

کرنے کا ارادہ کیا صحابہ سے مشورہ لیا اور ان سب نے تدوین ہی کا مشورہ دیا لیکن آپ نے کچھ مصلحت کی بنا پر یہ کام یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ :

میں سنن لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مجھے اس قوم کا خیال آگیا جو ہم سے پہلے ہوئی ہے اور جس نے خود کتابیں لکھیں اور اس کی طرف ہم تن اس قدر متوجہ ہو گئے کہ اللہ کی کتاب ہی کو چھوڑ بیٹھے سجدہ میں اللہ کی کتاب میں کسی چیز کی آمیزش نہ کر دیں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے ارادہ ملتوی کر دیا۔^۱

یہاں بھی التباس اور اختلاط کا وہی اندیشہ بول رہا ہے جو حدیث ابی سعید خدری میں بیان ہوا اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

جمع قرآن اور صحابہ

دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوتے تو قرآن لوگوں کے سینوں میں عرب رواج کے مطابق محفوظ تھا آج کے رواج کے موافق کتابی شکل میں نہ تھا۔ امام خطابی رقمطراز ہیں:-

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں مرتب اس لیے نہ تھا کہ ہمہ وقت حضور انور کو نسخ کا انتظار رہتا تھا زمانہ

نزول ختم ہونے پر یہ کام خلافت راشدہ نے کیا۔^۲

حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ کتابی صورت میں نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن خاص کتابی شکل میں ایک جگہ بترتیب سورۃ مرتب نہ تھا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ :

قد كان القرآن كتب كلّه في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم لكن غير مجموع في موضع واحد ولا مرتب السور.^۳

دراصل قرآن کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر موجودہ شکل و صورت تک پہنچنے کے لیے تین کروٹیں آئی ہیں۔ اول زمانہ نبوت، دوم زمانہ صدیق و فاروق، سوم زمانہ عثمان غنی۔ زمانہ نبوت میں قرآن لکھا ہوا تھا مگر ایک جگہ نہ تھا اور نہ سورتوں میں ترتیب تھی۔ زمانہ صدیق میں

^۱ مقدمہ تنویر المواقف ص ۴۔ ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲،

فاروق اعظم کے کہنے پر قرآن کو یکجا کیا گیا اور اس کے لیے زید بن ثابت کو مقرر کیا حضرت زید کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ صرف زبانی یادداشت کے سہارے قرآن کو جمع نہ کیا جائے جب تک آیت سنانے والا لکھی ہوئی آیت نہ سناوے۔ علامہ ابو شامہ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے:

وكان عرضهم الا يكتب الا من ما كتب بين يدي النبي لا من مجرد اللفظ^۱۔

بلکہ حضرت ابوبکر نے زید اور عمر سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ:

من جاء بشاهدین علی کتاب اللہ فاکتبا^۲۔

علامہ ابو عبد اللہ الزنجانی نے تاریخ القرآن میں اس شہادت کا پس منظر بتایا ہے:

گواہ اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ قرآن کا جو حصہ پیش کر رہے ہیں اس کو انہوں نے حضور انور کے سامنے وفات والے سال پیش کیا ہے اور آپ کے سامنے لکھا گیا ہے۔

اس طرح قرآن عزیزی نے اوراق میں کتابی صورت اختیار کی۔ امام زہری سے حافظ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں نقل کیا ہے:

جمع علی عهد ابی بکر فی السورق

اور حضرت سالم بن عبد اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

جمع البوبکر فی قراطیس

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا جو مجموعہ زمانہ نبوت میں کاغذوں اور اوراق میں نہیں بلکہ عُسب یعنی کھجور کی ٹہنیوں، لحاف چھوٹے چھوٹے پتھروں یعنی ٹھیکروں، رقاہ کھال کے ٹکڑوں، اکتاف، اونٹ کی ہڈیوں اور آفتاب کجائے کی ٹکڑیوں میں لکھا ہوا تھا وہ زمانہ ابوبکر میں کاغذ کے اوراق میں اکٹھا ہو کر کتاب کی صورت میں سرکاری طور پر محفوظ کر دیا گیا۔ چونکہ قرآن کے نسخے عام شائع نہ ہوئے تھے ادھر اسلام دور دراز ممالک میں پھیلتا جا رہا تھا اور نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اس لیے الفاظ قرآن کے اعراب اور وجوہ قرأت میں کچھ اختلاف رونما ہوا اور یہ اختلاف بڑھنے لگا۔ حضرت حذیفہ نے اس معاملہ کی صورت حال

سے حضرت عثمان کو آگاہ کیا۔ حضرت ابو بکر کا مرتب کردہ قرآن حضرت حفصہ کے گھر میں موجود تھا حضرت عثمان نے منگایا۔ زید بن ثابت، عبداللہ بن الزبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث سے اس کی نقلیں کرائیں اور مختلف صوبوں میں یہ قرآن روانہ کیے گئے۔

جامع القرآن کا حضرت عثمان کے لیے لقب

یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عثمان کا لقب جامع القرآن مشہور ہو گیا حالانکہ ان کا جمع قرآن میں کوئی دخل نہیں ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ صدیق اکبر کے مرتب کردہ قرآن کی چند نقلیں کرائیں اور ملک کے مختلف حصوں میں روانہ کر دیں۔ الاتقان میں ہے :

المشہور عند الناس ان جامع القرآن عثمان و ليس كذا لك

انما حمل الناس عثمان على القراءة بسوجه واحد

لوگوں میں مشہور یہی ہے کہ عثمان جامع القرآن ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے عثمان نے تو صرف یہ کام کیا ہے کہ لوگوں کو ایک طرز پر پڑھنے کی راہ بتائی۔

بہر حال قرآن نہ صرف تواتر کتابت کے ذریعے آج امت میں حضرت زید بن ثابت کے صدقے موجود ہے بلکہ تواتر اسناد، تواتر حفظ، تواتر روایت، تواتر قرأت اور تواتر تعلیم کے ذریعے بھی محفوظ ہے۔

اس تمام تفصیل سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس اندیشے کی وجہ سے حضرت فاروق اعظم نے

۱۔ تاریخ الاسلام سیاسی ج ۲ ص ۳۸۷۔ ۲۔ یہ بات کہ اس کام کے لیے زید بن ثابت ہی کو کیوں منتخب کیا اس سوال کا جواب عثمان بن سعید دانی نے اپنی کتاب المقنع میں جو دیا ہے اور جسے ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے تاریخ الاسلام سیاسی ج ۱ ص ۳۸۸ پر نقل کیا ہے وہ ہی پیش کرتا ہوں۔ زید بن ثابت کو اس کام کے لیے چند وجوہ سے منتخب کیا گیا۔ اول یہ کہ زید حضور انور کے کاتب وحی تھے دوم یہ کہ آپ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن پڑھ کر سنایا تھا۔ سوم یہ کہ آپ نے ہی حضور انور کی زندگی میں آخری طور پر جامع قرآن کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ یہ تین خوبیاں زید بن ثابت کے سوا کسی دوسرے صحابی میں نہ تھیں اس لیے دونوں بار زمانہ صدیق اور زمانہ عثمان میں کام کے لیے زید ہی کے نام پر قرعہ فال نکلا۔

تدوین سنن کا کام ملتوی کر دیا تھا وہ اندیشہ حضرت عثمان کے قرآن کی متعدد نقلیں کرانے اور اطراف مملکت میں روانہ کرنے کے بعد بالکل ختم ہو گیا۔ اب قرآن کتابی شکل میں آنے کے بعد اس خطرے سے بالا ہو گیا کہ غیر قرآن کی قرآن سے آمیزش ہو جائے۔

۹۹۔ ہم تک سنت تین راہوں سے مسافت طے کرتی رہی۔ ایک سینہ دوسرے محدود اور خاص سفینہ اور تیسرے عمل کا محسوس پیمانہ۔

فرق صرف یہ ہے کہ حفظ و روایت اور عمل اس وقت معاشرے میں عام اور کتابت کا کام خاص خاص تک محدود تھا۔ ایک بار اس خاص کام پر جو زمانہ نبوت اور زمانہ خلافت راشدہ میں خدمت سنت کے نام پر ہوا ہے اس پر پہلے ایک مجموعی نظر ڈال لیجئے تاکہ اس سلسلے میں آئندہ اقدامات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

سہ سے ۹۸ تک موضوع حدیث پر علمی سرسیر

۱۔ کتاب عمرو بن حزم عمرو بن حزم نے اپنی دستاویز کے ساتھ حضور انور کے اکیس فرامین یکجا کیے ہیں۔

۲۔ کتاب الصدق یہ نوشتہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم کے پاس تھا۔

۳۔ صحیفہ صادق عبد اللہ بن عمرو نے زمانہ نبوت میں احادیث قلم بند کی ہیں۔

۴۔ صحیفہ جابر یہ حج کے موضوع پر جابر بن عبد اللہ کا لکھا ہوا رسالہ ہے۔

۵۔ صحیفہ علی قصاص حرم، زکوٰۃ، قیدیوں کی رہائی پر حضرت علی کا رسالہ ہے۔

۶۔ صحیفہ صدیق یہ صدیق اکبر کی لکھی ہوئی صدقات کی تفصیل ہے۔

۷۔ رسالہ سمرہ بن جندب کا ترتیب دادہ رسالہ ہے۔

۸۔ صحیفہ صحیحہ بروایت ہمام بن منبہ ابو ہریرہ کی تالیف ہے۔

نبوت اور خلافت کے زمانے میں انفرادی طور پر کچھ حضرات نے حدیث کا کتابی سرمایہ جو چھوڑا ہے اس کا خاکہ آپ کے سامنے ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ تدوین حدیث کے لیے خلافت راشدہ میں ان خاص وجوہ و اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل صفحات بالا میں دی گئی ہے وہ اہتمام نہیں کیا گیا جو قرآن عزیز کے لیے عمل میں آیا ہے۔ اور ان کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ شروع ہی سے دونوں میں فرق مراتب کو

محفوظ رکھا گیا ہے۔ اور سوچا گیا ہے کہ سنت کا سرمایہ لمبا طبع ثبوت قطعیت میں قرآن کے برابر نہ ہو تاکہ کلام الہی اور کلام رسول کا وہ جوہر ہی فرق قائم رہے جسے خود وحی الہی نے روزِ اول ہی سے قائم رکھا ہے۔ اسی بنا پر اصولیین نے سنت کا مرتبہ قرآن کے بعد رکھا ہے۔ شاطبی لکھتے ہیں:

مرتبۃ السنة التاخر عن الكتاب في الاعتبار

اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر بظاہر قرآن اور حدیث میں معارضہ ہو جائے تو قرآن کو مقدم اور حدیث کو مؤخر کیا جائے گا۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن سے ثابت شدہ احکام کا درجہ فرض کا اور سنت سے معلوم شدہ مسائل کی حیثیت وجوب، سنت، استحباب اور ندب سے زیادہ نہیں ہوتی۔

آپ ایک لمحہ کے لیے سوچتے کہ اگر سارا سرمایہ قرآن ہی کی طرح قطعیت رکھتا تو اسلام میں ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی حیثیت بھی فرض سے کم نہ ہوتی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ترک فرض کی عقوبت کا اندیشہ ہوتا۔ پوری زندگی اجیرن ہو جاتی اور اس کے نتیجے میں وہ اسلامی معاشرہ وجود میں نہ آسکتا جو آج اسلام کے نام پر موجود ہے اور وہ سہولت اور آسانی بیکسر ختم ہو جاتی جو قرآن نے قائم کی تھی۔

یرید اللہ بکمالہ یسر ولا یرید بکمالہ عسر

افراط و تفریط کے درمیان راہِ اعتدال یہی ہے کہ نہ تو سارے علمی سرمایہ کی قطعیت قائم کر کے ایک ایک چیز کو فرض قرار دیا جائے اور نہ سارے ہی کو بالکل ختم کر کے فکر و عمل کی ایسی آوارگی اور آزادی پیدا کی جائے کہ اسلامی زندگی ناپید ہو کر رہ جائے اس لیے ارادۂ حدیث کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ اس کا درجہ قرآن سے دوسرا ہو گیا۔ بہر حال حدیث نے اسی طرح سینہ اور سفینہ سے گزر کر قرنِ اول کو عبور کیا اور صفر ۹۹ھ میں خلیفہ صالح حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ سریرِ ازلے خلافت ہوئے۔ آپ نے اپنے ممالکِ محروسہ میں سرکلر جاری کیا کہ حدیث نبویؐ کو جمع کیا جائے جیسا کہ پیچھے پڑھا آئے ہو کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے صرف اہل مدینہ کو نہیں بلکہ تمام اطرافِ مملکت میں حکماء روانہ کیا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حافظ ابو نعیم اصفہانی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

کتب عمر بن عبدالعزیز الی الافاق انظر واحدیت رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوا

لہ المرافعات ج ۴ ص ۷، فتح الباری ج ۱ ص ۳۰۔

حضرت عمرؓ نے اطراف میں خطر روانہ کیا کہ حدیث کو تلاش کرو اور یکجا کرو۔
مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکر کو جو سرکاری حکم اس سلسلے میں ملا تھا اس کا اجمالی تذکرہ آپ پہلے
پڑھ چکے ہیں امام بخاری نے اگرچہ قاضی ابوبکر کے اس حکم کا صرف اتنا ہی حصہ درج کیا ہے کہ :
انظر ما كان من حديث رسول الله فاكثبه فاني خفت

درس العلم و ذهاب العلماء

لیکن ابن سعد نے طبقات میں یہ اضافہ بھی کیا ہے :

انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم

او سنة ماضية او حديث عمر فاكثبه فاني خفت

درس العلم و ذهاب العلماء

حدیث رسول اللہ، سنت ماضیہ، حدیث عمر کو لکھو کیونکہ مجھے علم کے

مٹنے اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔

امام محمدؓ نے موطا میں یہ خط اس طرح درج کیا ہے کہ

انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم

او سنة او حديث عمر او نحو هذا فاكثبه لي غاني

قد خفت درس العلم و ذهاب العلماء

بعض روایات میں عمرہ کے ساتھ قاسم بن محمد کا نام بھی آیا ہے۔ چنانچہ امام مالک فرماتے ہیں

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر کو یہ بھی لکھا ہے کہ عمرہ اور قاسم کے پاس جو علم ہے
اس کو لکھ کر بھیجیں۔

ان تمام بیانات کو پڑھ کر تاریخ کا طالب علم اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

الف : امیر المومنین نے صرف ایک ابوبکر کے نام ہی نہیں بلکہ تمام ممالک محروسہ میں

مختلف اطراف میں ایک سے زیادہ حضرات کے نام یہ پیام بھیجا۔ چنانچہ علامہ سیوطی امام زہری
سے ناقل ہیں کہ :

۱۔ بخاری شریف جلد اول - ۲۔ طبقات ابن سعد - ۳۔ موطا امام محمد ص ۳۹۱ -

۴۔ تہذیب التہذیب -

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سالم بن عبداللہ کو لکھا تھا کہ صدقات کے
بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو معمول رہا ہے وہ ان کو لکھ
کر بھیجیں چنانچہ سالم نے جو کچھ انہوں نے پوچھا تھا وہ ان کو لکھ بھیجا۔
اور امام زہری کو بھی خاص طور پر تدوین سنن کے کام پر مامور فرمایا۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر
نے امام زہری کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

ہم کو عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کے
دفتر لکھ ڈالے اور پھر انہوں نے ہر اس زمین پر کہ جہاں ان کی حکومت
تھی ایک دفتر بھیج دیا۔

ان کے علاوہ دمشق میں اس وقت شام کے مشہور امام اور فقیہ مکحول دمشقی موجود تھے۔
ابن النذیم نے الفہرست میں ان کی تصانیف کے سلسلے میں کتاب السنن کا ذکر کیا ہے۔ غالباً
یہ کارنامہ بھی امام مکحول نے امیر المومنین کے حکم ہی کی تعمیل میں انجام دیا ہے۔ نیز علامہ التاج
امام شعبی کے متعلق جو حافظ سیوطی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالے سے نقل کیا ہے :

امام شعبی حدیث الی مثله، فقد سبق الیہ الشعبی فاندہ روی

عندہ انتہ قال هذا باب من الطلاق جبراً

چونکہ امام شعبی بھی قاضی ابوبکر کی طرح کوفہ میں عمر بن عبدالعزیز ہی کے زمانے میں منصب
قضا پر تھے جیسا کہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یحییٰ بن معین کے حوالے سے تصریح کی ہے
اس لیے خیال ہے کہ امام شعبی نے کوفہ میں احادیث جمع کرنے کا کام سرکاری حکم کے تحت کیا ہوگا
امام موصوف چونکہ بالغ النظر بیکانہ روزگار فاضل تھے اس لیے آپ نے اس تالیفی کارنامہ
میں صرف احادیث جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کو ابواب پر بھی تقسیم کیا۔ امام زہری
امام سالم، امام مکحول اور امام شعبی کے علمی کارناموں کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ آئیے اب
قاضی ابوبکر کے کارنامے کا بھی کچھ حال سن لیجئے۔
اتنی بات تو آپ سن چکے ہیں کہ قاضی ہونے کی حیثیت میں آپ کے نام بھی سرکاری حکم آیا تھا۔
آپ نے اس حکم کی پابجائی کس حد تک کی؟

حافظ ابن عبد البر نے تمہید میں امام مالک کی زبانی یہ انکشاف کیا ہے کہ
فتو فی عمر و قد کتب ابن حزم کتبا قبل ان یبعث الیہ۔^۱
عمر بن عبد العزیز کی وفات کے وقت ابن حزم کتابیں لکھ چکے تھے لیکن
ابھی روانہ نہیں کی تھیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی صاحب موصوف نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل میں حدیث کی
ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں مگر قاضی صاحب کا یہ علمی کام پایہ تکمیل کو پہنچا تو عمر بن عبد العزیز اللہ
کو پیارے ہو چکے تھے۔

ب: دوسری بات اس خلافت کے فرمان میں یہ سمجھنے کی ہے کہ فرمان خلافت میں صرف نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کرنے کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ سنت ماضیہ اور فاروق
اعظم کے فیصلے بھی لکھنے کا حکم دیا تھا سنت سے مقصود اسلام کا وہ محسوس نظام عمل ہے جو
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں چھوڑا تھا اور جس پر امت عمل پیرا تھی۔
السنة هي الطريقة المملوكة لجماعة المسلمين المتوارثة عن
النبي صلى الله عليه وسلم۔

حدیث سے روایت سنت کا وہ سرمایہ مراد ہے جو لوگوں نے بڑی محنتوں اور عرق ریزیوں
کے بعد فراہم کیا۔ یاد رہے کہ اسناد و روایت کی باتیں اسلام کے علمی سرمایہ میں سنت کے لیے
منہیں بلکہ تاریخ سنت حدیث کے لیے ہیں۔ سنت تو تواتر اور توارث کے ذریعے ہمیشہ سے
موجود ہے۔ فخر الاسلام بزدومی نے دین کے اسی جھٹے یعنی سنت کے متعلق لکھا ہے،
اس کی ایسی حالت ہے جیسے خود کسی معائنہ اور براہ راست شنید کی
ہوتی ہے۔

انہوں نے اس راہ سے آنے والی چیزوں کو گناتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو ان الفاظ میں
پیش کیا ہے۔

مثل نقل القرآن والصلوات الخمس واعداد المكات ومقادير
الزكوة۔

تواتر کا علم الاسناد کے مباحث سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ملا محبت اللہ فرماتے ہیں:

ان التواتر ليس من مباحث علم الاسناد
بلکہ اس سے بھی آگے قدم بڑھا کر مولانا بحر العلوم نے یہ انکشاف کیا ہے:

التواتر كالمشاهدة في افادة العلم

حافظ ابن حزم نے اس موقع پر ایک تفصیلی بیان قلم بند فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں۔
اسلام کا علمی سرمایہ جو نبوت سے اُمت کو ملا ہے صرف یہ ہے۔

۱۔ قرآن، نمازیں، رمضان کے روزے، حج اور زکوٰۃ اور سارے اسلامی شرائع، یہ سب بطور تواتر منقول ہو کر اُمت کو ملا ہے۔ اس کو بیان کرنے والے اور پیش کرنے والے ہمیشہ زمانہ نبوت سے مشرق و مغرب میں اس قدر ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔

۲۔ نقل عام جیسے آیات و معجزات جو خندق اور تبوک میں نمایاں ہوئے۔ احکام حج اور مقادیر زکوٰۃ ان کو نبوت سے نقل کرنے والے اتنی تعداد میں ہوتے ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں کہ ہر دور کے علماء اور اہل تحقیق نے اسے قبول کیا ہے اسے مشہور کہتے ہیں۔

۳۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہ کے فیصلے اور تابعین کے فتاویٰ۔ یہ اُمت کو خبر واحد کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں ان کے نقل کرنے والے ذات نبوت تک ثقہ اور معتبر اشخاص ہیں۔ ان کا نام و نسب معلوم اور ہر ایک کا حال، زمان، مکان اور عدالت معروف ہے۔ اس طریق سے جو معلومات آتی ہیں ان میں بیان کرنے والے متعدد ہوتے ہیں گاہ واسطہ بواسطہ اور نام بنام بات ذات نبوت تک پہنچتی ہے کبھی صحابہ تک اور کبھی کسی ایسے تابعی تک جسے صحابی کی دید کا شرف حاصل ہوا ہو۔

اس ساری تفصیل کو ہم اپنے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا علمی سرمایہ جو اُمت کو نبوت سے وراثت میں تواتر، شہرت اور خبر واحد کے ذریعے ملا ہے یہ ہے۔ قرآن، سنت، حدیث، قرآن و سنت دونوں متواتر ہیں فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کا تواتر علمی اور سنت کا تواتر عملی ہے اور سنت کی تاریخ جس ذریعے سے ہم کو پہنچی ہے یعنی خبر واحد یا خبر خاصہ اس کا نام حدیث ہے۔ حافظ سیوطی نے حدیث کی یہ تعریف کی ہے۔

نقل السنة ونحوها واسناد ذلك الى من عزم اليه بتحديث
او اخبار او غير ذلك له

بان خلافت میں حدیث عمرؓ کا اضافہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان میں حدیث عمرؓ کا اضافہ یہ سمجھانے کے لیے کیا گیا ہے کہ پورے
سلام کی تاریخ نبوت اور خلافت کے مجموعہ کا نام ہے جیسا کہ اس کے متعلق کچھ اشارات پہلے ہو
چکے ہیں۔ حدیث عمرؓ کے ساتھ اس فرمان میں ادخو هذا کا اضافہ پورے نظام خلافت کی طرف
دہائی کر رہا ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے التعلیق المجدد میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ چنانچہ
ماتے ہیں کہ:

من احادیث بقية الخلفاء له

سلام میں خلفاء راشدین کی سنت

یہاں ذہنوں میں ایک خلش محسوس ہوتی ہے کہ خلفاء راشدین کی سنت دین میں حجت اور دلیل
ہیں ہے کیونکہ امام بخاری نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان میں یہ بات صراحتاً بتائی ہے
ناںچہ امام بخاری فرماتے ہیں۔

وكتب عمر بن عبدالعزيز الى ابى بكر بن حزم النظر ما كان من
حدیث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبته لي فاني
خشيت دروس العلم وذهاب العلماء ولا يقبل الا حديث
النبي صلى الله عليه وسلم وليفشوا وليجلسوا حتى يعلم من
لا يعلم فان العلم لا يهلك حتى يكون سراً^{۲۷}

یہ دوسرے اس لیے پیدا ہوا کہ اس پورے عبارت کو عمر بن عبدالعزیز کی عبارت تصور کر لیا گیا حالانکہ
مان کی عبارت صرف ذہاب العلماء تک ہے۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے مستخرج میں اس کی
تصریح کی ہے اور لا یقبل سے امام بخاری کی اپنی عبارت شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ عینی

۲۷ تدریب الراوی ص ۲۲۔ ۲۸ التعلیق المجدد ص ۳۹۲۔ ۲۹ صحیح بخاری۔

سے رقمطراز ہیں۔

فاذا كان كذلك يكون هذا من كلام البخاری اور ردہ عقیب کلام
عمر بن عبدالعزیز بعد انتہائے

اس کی وجہ یہ ہے کہ عبارت مذکورہ کے بعد جب اس فرمان کی سند پیش کی تو تصریح کر دی کہ یہ
تعلیق صرف ذہاب العلماء تک ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

حدثنا الحلام بن عبد الجبار حدثنا عبد العزيز بن مسلم عن
عبد الله بن دينار بذلك یعنی حدیث عمر بن عبدالعزیز الی
قولہ ذہاب العلماء

علامہ کرمانی فرماتے ہیں کہ :

والمقصود منه ان الحلام روى كلام عمر بن عبد العزيز الى قوله
ذهاب العلماء فقط

اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فرمان میں حدیث رسول کے سوا کچھ اور لکھنے سے منع کیا گیا تھا
ایک سنگین غلط فہمی ہے۔ اس موضوع پر جمہور اُمت کی ہمیشہ سے بہ طے شدہ پالیسی رہی ہے جیسا
کہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ خلافت راشدہ کی حیثیت دین میں معیار حق اور حجت و دلیل کی ہے
اور اسلام میں سنت کا اطلاق نبوت اور خلافت دونوں کے اعمال پر ہوا ہے۔ قرآن میں یہ بات
دلالت اور ارشادات نبوت میں صراحت آئی ہے۔ قرآنی آیات آپ پہلے سن چکے ہیں۔ آئیے خاص
اسی موضوع پر ارشادات نبوت بھی گوش گزار فرمایا جتے :

حضرت عراب بن ساریہ کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے
ارشاد فرمایا :

فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ
وایاکم ومحدثات الامور فان كل محدثة بدعة

تم میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم جانو اور اس کو دانتوں سے

۱۔ عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۳۰ - ۲۔ صحیح بخاری - ۳۔ عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۳۰

۴۔ مستدرک حاکم ج ۱ ص ۹۶ -

دبالو۔ نئی نئی باتوں سے پہنچ کر رہو۔ یاد رکھو کہ ہر نئی بات بدعت ہے۔
 ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں؛
 اس لیے کہ خلفاء راشدین نے دراصل آپ ہی کی سنت پر عمل کیا ہے اور
 ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو اس لیے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل
 کیا اور یا اس لیے کہ انہوں نے خود قیاس اور استنباط کر کے اس کو اختیار
 کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ خلفاء راشدین نے جو کام اپنے تفقہ و قیاس اور اجتہاد و استنباط سے سمجھ کر
 اختیار کیا ہے وہ بھی سنت ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے تحت امت
 کو اس کے تسلیم کرنے سے بھی چارہ نہیں ہے۔

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا ہے کہ خلفاء راشدین کی سنت صرف وہی ہو سکتی ہے جو بعینہ
 جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو اور جو چیز آپ سے مروی نہ ہو اور خلفاء راشدین
 میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہو یا اس کے متعلق حکم دیا ہو تو وہ سنت نہ کہلاتے گی چنانچہ مشہور
 عالم امیر یافعی محمد بن اسماعیل لکھتے ہیں؛

قواعد شرعیہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے
 کا حق نہیں ہے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عامل نہ تھے۔

لیکن یہ تحقیقی بات نہیں ہے کیونکہ

خلفاء کی سنت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے
 موہوموافق ہو اور اس سے ذرا بھی مخالف نہ ہو کیونکہ جو حکم انہوں نے اپنے قیاس و اجتہاد سے
 جاری کیا ہے وہ بھی سنت ہے حالانکہ یہ ایک یقین حقیقت ہے کہ ان کا اپنا ذاتی قیاس و استنباط
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ اگرچہ اصل مقیاس علیہ منقول ہو۔ مثلاً دیکھتے
 کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکر نے شرابی کو چالیس چالیس کوڑے سزا دی
 اس سے زیادہ ان سے ثابت نہیں ہے مگر حضرت عمر نے اسی کوڑے سزا دی ہے یہ بھی سنت
 ہے حضرت علی فرماتے ہیں کہ؛

جلد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعین و ابو بکر اور بعین و عمر
ثمانین و کل سنت ۱۶

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان کا بھی ذکر کیا ہے۔
واتمما عثمان ثمانین و کل سنت ۱۶

روایت صحیح مسلم کی ہے جس کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا اور
کہنے والے حضرت علی خلیفہ راشد ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس
میں حضرت عمر، حضرت عثمان کے اس فعل کو بھی وہ سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر حضور انور صلی اللہ
وسلم کے عمل کے خلاف ہے چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں :

هذا دليل ان علياً كان معظماً لا تار عمر وان حكمه وقوله سنة

وامرأه حق وكذلك ابو بكر ۱۶

اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ :

قول الشيخين حجة اذا اتفقا لا يجوز الحدود عنه وان اتفقا
الامة الاربعة ايضا حجة ۱۷

ابو بکر و عمر کا قول حجت ہے جب دونوں متفق ہو جائیں تو اس سے ہٹنا
جائز نہیں ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

عمل اهل المدينة الذي يحتج به ما كان في زمن الخلفاء الراشدين ۱۸

اہل مدینہ کا وہ عمل حجت ہے جو زمانہ خلفاء راشدین میں ہوا ہو۔

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ اسلام کا پورا نقشہ نبوت اور خلافت سے مل کر بنتا ہے۔ خیر یہ
بات تو حدیث و سنت میں فرق بتانے کے لیے ضمناً آگئی ہے بتایہ رہا تھا کہ امیر المومنین عمر
بن عبدالعزیز نے تدوین حدیث کا حکم تمام اطراف مملکت میں روانہ کیا ان میں مدینہ کے قاضی
ابوبکر، امام زہری، امام سالم اور کوفہ میں امام شعبی، دمشق میں امام مکحول کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگرچہ

۱۶ صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۲ - ۱۷ معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۸۱ - ۱۸ شرح مسلم ج ۲ ص ۷۲ -

۱۹ منہاج السنہ ج ۳ ص ۱۶۲ - ۲۰ زاد المعاد ج ۱ ص ۱۶۸ -

تاریخ میں امام نافع کے بارے میں کوئی مثبت تصریح نہیں ہے لیکن اگر ہم ان دو باتوں کو ملا لیں کہ آپ نے یہ حکم تمام اطراف مملکت میں روانہ کیا تھا۔

اور ساتھ ہی امام نافع کے بارے میں امام ذہبی کی یہ تصریح بھی پڑھیں کہ
 بحث عمر بن عبدالعزیز نافعاً الی اهل مصر ليعلمهم السنن
 عمر نے حضرت نافع کو مصر والوں کے لیے معلم سنن بنا کر روانہ فرمایا۔

تو پھر یہ یقین آجاتا ہے کہ امام نافع کو بھی مصر میں یہ حکم ضرور پہنچا ہوگا اور انہوں نے بھی اس حکم کی تعمیل میں ضرورتاً دین سنن کا کام کیا ہوگا بلکہ میں تو جزیرہ کے مشہور قاضی میمون بن مہران کو بھی اسی میں داخل کرتا ہوں۔

ان تمام تصریحات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ۹۰ھ سے ۱۰۰ھ تک حدیث کے نام پر امیر المومنین کے اس فرمان کے نتیجے میں یہ علمی سرمایہ منقذہ شہود پر آگیا۔
 ۱۔ کتب قاضی ابوبکر بن حزم۔

۲۔ دفاتر امام زہری

۳۔ ابواب امام شعبی

۴۔ کتاب السنن امام مکحول

۵۔ کتاب الصدقات امام سالم

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ۲۵ رجب ۱۰۰ھ کو رحلت فرمائی۔ آپ کی مدت خلافت کل دو سال پانچ ماہ ہے۔ یہ تصانیف اسی زمانہ کی یادگار ہیں صحابہ کی تصانیف کو بھی اگر ان کے ساتھ ملا لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰۰ھ تک خالص حدیث کے موضوع پر تیرہ کتابیں منقذہ صحت پر آچکی تھیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جن بزرگوں نے کتابیں تالیف کی ہیں۔ یہ سب کبار تابعین ہیں۔ ان میں امام نافع، امام سالم، امام زہری اور امام شعبی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے اساتذہ ہیں اور امام شعبی کے متعلق تو حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ یہ فن حدیث میں امام اعظم کے شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں چنانچہ امام ذہبی نے جہاں امام شعبی کے تلامذہ فن حدیث میں امام ابوحنیفہ کا نام لیا ہے ساتھ ہی یہ لکھ دیا ہے۔

وهو اکبر شیخ لابی حنیفة۔

۱۰۰ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ترجمہ امام شعبی

جمع قرآن - بیان قرآن پر ایک اہم نکتہ تفسیری

یہاں یہ سوچنے کی بات ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ کام کیوں کیا -
یہ بات تو آپ سُن چکے ہیں کہ دورِ خلافت میں جمع قرآن، قرأت قرآن کے ساتھ تدوین سنن
کا کام کیوں نہیں ہوا۔

در اصل جہاں تک میں سمجھا ہوں جمع قرآن، قرأت قرآن یا تدوین سنن تینوں کام اپنے اپنے
وقت میں نشا الہی کے مطابق منصہ شہود پر آتے ہیں۔

نشا الہی سے میری مراد یہ ہے کہ جو کچھ اور جیسا کچھ ہوا ہے۔ یہی قرآن کا وعدہ تھا۔ آپ
پڑھ آتے ہیں کہ سورہ قیامہ کی آیت

إِنَّا عَلَيْنَا جُمُعُهُ وَقرآنہ فَاذَا قُرَأْنَا فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ
خَبْرًا بَيَّانًا۔

میں ان علینا بیانہ سے قرآن کی دوسری آیت

أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ

کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان مراد ہے کیونکہ سورہ قیامہ کی مذکورہ بالا آیت
میں اللہ سبحانہ نے حضور انور کو نزول وحی کے وقت یہ حکم دیا ہے۔

لَا تَحْرِجْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُجْزَلَ بِهِ

اس کا منشا یہ ہے کہ آپ نزول وحی کے وقت سنا کہیں حضرت جبریل کے ساتھ پڑھانہ کریں
اور مستقبل میں قرآن کے بارے میں تین وعدے فرمائے ایک جمع قرآن دوم قرأت قرآن،

سوم بیان قرآن چنانچہ ارشاد ہے :
إِنَّا عَلَيْنَا جُمُعُهُ وَقرآنہ فَاذَا قُرَأْنَا فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ
عَلَيْنَا بَيَّانًا۔

اللہ سبحانہ نے اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ قرآن کے
بارے میں بالکل مطمئن رہیں اس کو جمع کرنا، پڑھوانا اور پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔ اس
آیت کی تفسیر میں اگرچہ حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ تشریح آئی ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے وقت بڑی مشقت سے

دو چار ہوتے اور آپ ہونٹوں کو ہلاتے تھے یعنی وحی سننے جاتے اور پڑھتے جاتے مگر باوازِ بلند نہیں بلکہ صرف ہونٹوں کو ہلاتے تھے اس پر اللہ پاک نے یہ حکم نازل کیا لا تحرک بہ... الخ جمع سے مراد سینہ میں جمع کرنا ہے اور قرآن سے مراد حضور کا پڑھنا ہے۔ فاتبع قرآنہ کا مطلب یہ ہے کہ چپ رہو اور کان لگا کر سنو شہد ان علینا بیانا میں بیان کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ہم تمہیں پڑھا دیں گے۔

اس روایت کے بارے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :
اس روایت میں مرفوع حدیث صرف اسی قدر ہے جس قدر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کے متعلق ہے باقی آیت کی تفسیر حضرت ابن عباس کی رائے ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر ابن عباس پر یہ تنقید کی ہے :
فقیر کہتا ہے کہ یہ تفسیر محل نظر ہے کیونکہ اس تفسیر پر تینوں الفاظ جمع، قرآن اور بیان کاغشا ایک ہے تینوں الفاظ کو ایک ہی معنی کا جائز پہنا نشانِ بلاغت نہیں ہے۔ پھر شہد ان علینا بیانا کا ایسا مطلب بتانا جو بغیر معقول تاخیر کے واقع ہوا ہو اور بھی نشانِ بلاغت کے منافی ہے کیونکہ لفظ ثم کلام عرب میں تراخی کے لیے آتا ہے یہ اس کے بعد شاہ صاحب نے اس آیت کی جو تشریح فرمائی ہے وہ بھی ان ہی کی زبان سے سن لیجئے :

زیادہ رچھی تفسیر یہ ہے کہ ان علینا جمعہ کا یہ مطلب لیا جاتے کہ قرآن کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کا وعدہ ہمارے ذمہ ہے۔ قرآنہ کا مطلب یہ ہے کہ اُمت کے قاریوں کو اور نیز رائے عامہ کو تلاوت کی توفیق دینا ہمارا کام ہے تاکہ سلسلہ تواتر قائم رہے بالفاظِ دیگر حق سبحانہ کا ارشاد ہے کہ اے پیغمبر تم فکر نہ کرو اور اس کے یاد کرنے کی مشقت نہ اٹھاؤ

دیکھو ہم نے قرآن کے لیے وہ بات اپنے ذمہ کر لی ہے جو تمہارے فرض منصبی سے بھی کئی درجہ پیچھے ہے یعنی قرآن کو مصاحف میں جمع کرا دینا اور اس کو اُمت سے پڑھا دینا۔ لہذا تم اپنا دل اس کے یاد کرنے میں نہ لگاؤ بلکہ جب ہم بزبان جبریل پڑھیں اسے سنو۔ پھر ہمارے ذمہ ہے قرآن کی توضیح۔ ہم ہر زمانے میں قرآن کی تشریح اور اس کے شان نزول کو بیان کرنے کی ایک جماعت کو توفیق دیں گے تاکہ وہ لوگ قرآن کا مصداق بتائیں۔

جمع قرآن اور قرأت قرآن دونوں ایک وقت میں ہوتے ہیں اور تاریخی لحاظ سے یہ شیخین زمانہ ہے کیونکہ قرآن میں ان دونوں کو واحد عطف کے ذریعے جمع کیا گیا ہے ان علینا جمعہ وقرآنہ جیسے جگہ کا کام فاروق اعظم کے مشورے سے صدیق اکبر کے زمانے میں ہوا ایسے پورے قرآن کے حفظ و قرأت کا سلسلہ بھی فاروق اعظم کے زمانے میں ہوا۔ چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

اول شروع حفظ آن از جانب ابی بن کعب و عبداللہ بن مسعود بودہ است
در زمان عمر۔

ادوں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جمع قرآن یعنی قرآن کو کتابی صورت میں کر کے بعد حفظ قرأت قرآن کی طرف فاروق اعظم نے رمضان میں قرآن کی سالگرہ مناکر اقدار فرمایا تھا بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ فاروق اعظم نے حفظ ہی کی خاطر سرکاری خزانے سے وظائف اور معلمین قرآن کی تنخواہیں مقرر کیں جیسا کہ ابن الجوزی نے سیرۃ العمرین میں لکھا ہے۔ خاں بدوش بدوؤں کے لیے قرآن حکیم کی جبری تعلیم کا قانون نافذ کیا۔ چنانچہ ایک شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا چند آدمیوں کے ساتھ اس کام پر لگایا کہ قبائل میں پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جسے قرآن حکیم کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اسے سزا دے۔

ظاہر ہے کہ امتحان کی منزل اسی وقت درپیش آتی ہے جبکہ پہلے اس مقصد کی خاطر پوری آبادی میں تعلیم قرآن کا ایک ہمہ گیر نظام قائم کر دیا گیا ہو۔ جن صحابہ کو پورا قرآن یاد ہو گیا تھا۔

فاروق اعظم نے ان کو بلا کر فرمایا۔ شام کے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت ابوالدرداء حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبادہ بن الصامت کو اس مشن پر روانہ کیا۔ حضرت عمر نے ان کو ہدایت کی کہ پہلے حمص جائیں وہاں کچھ روز قیام کر کے جب قرآن کی تعلیم عام ہو جائے تو ایک اسی جگہ قیام کر لے۔ باقی دو میں سے ایک دمشق اور ایک فلسطین جائے۔ حافظ ذہبی نے طبقات القراء میں لکھا ہے کہ حضرت ابوالدرداء کا دمشق میں معمول یہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد جامع مسجد میں تشریف فرما ہوتے ارد گرد قرآن پڑھنے والوں کا ہجوم ہوتا۔ حضرت ابوالدرداء دس دس آدمیوں کی الگ الگ جماعت بنادیتے اور ہر جماعت پر ایک قاری مقرر کر دیتے اور خود ٹہلتے رہتے جب طالب علم پورا قرآن یاد کر لیتا تو حضرت ابوالدرداء اسے اپنی شاگردی میں لے لیتے۔ ایک بار حضرت ابوالدرداء کی خاص کلاس کے طلبہ کا شمارہ کیا گیا تو ان کی تعداد سولہ سو حفاظ پر مشتمل تھی۔

حضرت عمر نے قرآن کے حفظ و قرأت کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے اور بہت سے وسائل اختیار کیے ضروری سورتوں مثلاً البقرہ، النسا، المائدہ، الحج اور النور کی نسبت حکم دیا کہ رائے عامہ کو اس قدر قرآن ضروری یاد ہونا چاہیے ہے

سرکلر جاری کر دیا کہ جو لوگ قرآن سیکھ لیں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں فوجیوں کو ہدایت تھی کہ قرآن شریف یاد کریں۔ گاہ گاہ دفاتر سے قرآن خواں حضرات کے رجسٹر منگاتے رہتے تھے ان تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان گنت لوگ قرآن پڑھ گئے اور حافظوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ایک بار فوجی افسروں کو خط لکھا کہ حفاظ قرآن کو میرے پاس روانہ کیا جائے تاکہ میں ان کو قرآن کی تعلیم کے لیے مختلف جگہ روانہ کروں تو حضرت سعد نے جواب دیا کہ صرف میری فوج میں تین سو حفاظ ہیں ہے

الغرض کتابی صورت میں جمع کے ساتھ فاروق اعظم نے حفظ و قرأت کا ایک بندھا ٹکان نظام قائم کر دیا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے صحیح فرمایا ہے۔

امروز ہر کہ قرآن می خواند از طوائف مسلمین منت فاروق در گردن اوست ہے

آج جو بھی قرآن پڑھتا ہے اس کی گردن پر فاروق اعظم کا احسان ہے۔

بتایہ چاہتا ہوں کہ جمع قرآن در مصاحف اور قرأت قرآن کا وعدہ الہی زمانہ خلافت راشدہ

میں پورا ہوا۔ اور ان علینا جمعہ و قرآنہ کی علمی تفسیر ہو گئی لیکن آخری وعدہ قرآن کے متعلق جو اسی آیت میں شہد ان علینا بیانہ کے ذریعے کیا گیا ہے وہ خلافت راشدہ میں نہیں بلکہ دیر کے بعد خلافت عمر بن عبدالعزیز میں پورا ہوا۔ کیونکہ یہ وعدہ ثَم کے ذریعے آیت میں آیا ہے اور آپ سُن ائے ہیں کہ عربی زبان میں شہد تراخی کے لیے ہی آتا ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے شہد ان علینا بیانہ کی تشریح یہ کی ہے :

ہم اسے ذمہ ہے قرآن کی توضیح یعنی ہر زمانے میں ہم ایک جماعت کو قرآن کی لغوی تشریحات اور اس کی شان نزول بیان کرنے کی توفیق دیں گے تاکہ وہ لوگ احکام قرآنی کا مسداق بیان کریں اور یہ بات یاد کر سنے اور تمہاری تبلیغ کے بعد ہوگی۔ کیونکہ قرآن کی آیات میں تشابہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن عزیز کے مبتنی ہیں۔ لے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مبتنی ہونے کی حیثیت کو قرآن نے بتایا ہے کہ :

أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ -

چونکہ حضور انور قرآن کے مبتنی ہیں اس لیے حضور کی سنت ہی قرآن کا بیان ہے۔ اس بیان کی تدوین کے لیے ضروری ہے کہ حفظ قرآن کے دیر بعد ہو۔ کیونکہ اللہ پاک نے اول تو جمع قرآن کے بعد بیان قرآن کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر اس کو ثَم کے ذریعے پیش کیا ہے جو عربی زبان میں قطعاً تراخی کے لیے آتا ہے۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ بیان قرآن سے مراد بیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور جمع قرآن کی طرح اس بیان کی بھی تدوین ہوئی ہے لیکن ایک عرصہ بعد اور یہ حضور انور کے دنیا سے روانہ ہونے کے پورے ستاسی سال بعد ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

در وعد بیان کلمہ ثَم کہ برائے تراخی است ذکر نمودن می نہاند کہ در وقت جمع قرآن در مصاحف اشتغال بتلاوت آن شائع شد و تفسیر آن من بعد بظہور آمد و در خارج ہم چنین متحقق شد۔ لے

لہذا تدوین سنن یعنی بیان قرآن کا کام زمانہ خلافت راشدہ میں نہیں بلکہ قانونی طور پر عمر بن عبدالعزیز کے ایام سے خلافت راشدہ کے بعد ہوا۔

عمر اول اور عمر ثانی کے عمل میں ہم آہنگی

الشراکبر! دونوں کے عمل میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ جنگ یمامہ میں صحابہ کی ایک جماعت جام شہادت نوش کر گئی۔ قرآن کے حافظوں کے اس قدر اچانک نقصان سے قرآن کی حفاظت میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہوا۔ فاروق اعظم نے اس خطرے کو محسوس کیا اور فرمایا۔

یمامہ کے دن قاری قرآن جام شہادت نوش کر گئے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر قرآن قرآن ایسے ہی جام شہادت نوش کرتے رہے تو قرآن کا زیادہ حصہ چلا جائے گا اس لیے جلد ہی قرآن کو یکجا کرنے کا حکم دیجئے۔

یہ تو یمامہ کے دن قاریوں کی شہادت سے حضرت عمر کو اندیشہ ہوا۔ ایسے اب دنیا سے وہ نصرت ہو رہے ہیں جنہوں نے قرآن کے بیان کو مدینے کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے اور جنہوں نے قرآن کی ہدایات پر اٹھی ہوئی کامل ترین، موثر ترین اور محبوب ترین زندگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے قرآن مجید سے اقامت صلاۃ کا حکم سنا تھا مگر انہوں نے اس کی عملی تصویر اور اس کی صحیح کیفیت اسی وقت معلوم کی جب آپ کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور آپ کے رکوع و سجود کی کیفیت دیکھی جس کو انہوں نے

سمع لہ ازیرا کا نیز المرجل

کے مفظوں سے تعبیر کیا ہے اور اب ان کی جگہ وہ اُسے ہیں جنہوں نے جمال جہاں اُرا کو نہیں دیکھا اس لیے عمر بن عبدالعزیز کو نبوت کی اداؤں اور اعمال کے حافظوں کو جتنا دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں محبوب عالم کی ادائیں ان کے رُخِ نور کے نظارہ کرنے والوں کے ختم ہونے سے داستانِ تائید بن کر نہ رہ جائیں اور اس اندیشے کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا۔

خشیت دروس العلم وذہاب العلماء

حضرت عمر کو قاریوں کے اور عمر ثانی کو علماء کے اٹھ جانے کا یکساں اندیشہ ہوا۔ دونوں کے تاثرات کو ایک ترازو میں رکھ کر تو لیے۔ آپ کو محسوس ہو گا کہ دونوں جگہ ایک ہی روح کام کر رہی ہے۔

تدوین حدیث کی اولیت کا شرف

امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جمع حدیث کا جو حکم دیا اور جن جن اکابر نے اس حکم کی تعمیل میں کام کیا اس کی داستان تو آپ پڑھ چکے ہیں۔

ان میں قاضی ابوبکر کے علاوہ زہری، شعبی اور مکحول بھی ہیں چونکہ یہ چاروں معاصر ہیں اس لیے یقین سے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہے کہ سب سے پہلے اس موضوع پر کس نے تدوین کا کام انجام دیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں عمر بن عبدالعزیز کے اس خط کی شرح کرتے ہوئے جو قاضی ابوبکر کے نام امام بخاری نے درج کیا ہے لکھا ہے۔

يستفاد منه ابتداء تدوين الحديث

علامہ قسطلانی نے بھی شرح بخاری میں اس کی تہنویٰ کی ہے۔ اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ابوبکر مدونِ اول ہیں لیکن چونکہ قاضی صاحب کا کارنامہ شاہراہِ عام پر نہیں آیا اس لیے ان کا نام مدونین میں زیر بحث نہیں آتا۔ تہذیب التہذیب میں امام مالک سے منقول ہے کہ میں نے ان کتابوں کے بارے میں قاضی صاحب کے صاحبزادے عبدالرحمن بن ابی بکر سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ضائع ہو گئیں۔ اس لیے حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں جلال الدین السیوطی نے الفیہ اور تہذیب میں اور امام مالک اور عبدالعزیز درادری نے مدونِ اول کی حیثیت سے امام زہری کا نام پیش کیا ہے۔ لیکن اولیت کا یہ شرف امام زہری کو صرف تدوین میں ہے ورنہ جہاں تک حدیث کی تبویب کا تعلق ہے اس کی اولیت کا شرف کو فہ میں امام شعبی کو حاصل ہے۔ بالفاظِ دیگر حدیث کی تدوین کا شرف اگر اہلِ مدینہ کو حاصل ہے تو اس کی تبویب پر کو فہ والوں کو فخر ہے۔

دوسری صدی ہجری میں علم حدیث

پہلی صدی کے آخر میں خلیفہ راشد کے حکم سے جمع و تدوین حدیث کی جو صبح صادق طلوع ہوئی اسے دوسری صدی میں اتنی ترقی ہوئی کہ تصنیف و تالیف کا آفتاب نکل آیا اور احادیثِ مرفوعہ کے

ساتھ صحابہ کے آثار اور تابعین کے فتاویٰ بھی اس دور کی تصانیف میں مرتب و مدون کر دیے گئے۔
 دوسری صدی میں جن اکابر نے موضوع حدیث پر تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے یہ تو ممکن
 نہیں ہے کہ ہم سب کا ذکر کریں لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ ہم بالکل ان کو نظر انداز کر دیں کیونکہ یہی وہ
 اکابر ہیں جو دو راویوں کے مصنفین کے جانشین اور ترکہ علم حدیث کے وارث ہوئے ہیں۔ تحریر و
 تالیف کے لحاظ سے بھی اور اپنی جلالت علمی کے اعتبار سے بھی۔
 اس لیے ہم یہاں چند گرامی قدر مستقیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ محدثین اور مؤرخین نے اس دور
 کے مصنفین میں ایک سے زیادہ اکابر کا نام لیا ہے ان کے متعلق تصریح ہے کہ ان اکابر نے اپنے
 اپنے وقت میں تصنیف کا کام کیا ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے اولیت کا شرف
 دوسری صدی میں کسے حاصل ہے؟

امام اعظم کے بارے میں حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے:
 انه اول من دون الشریعة ورتبہ ابواباً
 سعید بن ابی عروبہ کے متعلق حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ:
 هو اول من صنف الابواب بالبصرة

ربیع بن صبیح کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے رامہرمزی کی مشہور کتاب المحدث الفصل
 کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ:
 انه اول من صنف بالبصرة
 امام عبدالملک بن عبدالعزیز کو امام ذہبی نے صاحب التّصانیف لکھ کر بتایا ہے کہ امام احمد
 کا بیان ہے کہ:

اول من صنف الكتب
 امام معمر بن راشد کا حافظ ذہبی نے تعارف پیش کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے کہ:
 كان اول من صنف باليمن
 آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے نام کے ساتھ اولیت چسپاں ہے۔ ان تصریحات

۱۔ تبیین الضعیفہ ص ۳۶۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۷۔ ۳۔ تہذیب ج ۲ ص ۲۴۸

۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۹۔ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۹۔

کو دیکھ کر ایک ناواقف حیرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بہتوں نے یہ کہہ کر اس مشکل کا یہ حل تلاش کیا ہے کہ مدونین کے نام میں جن جن کا نام لیا جاتا ہے سب صحیح ہے اور اس کا تعلق مختلف ائمہ اور شہروں سے ہے۔ مگر شہر میں تالیف کا کام ابن جریر سے شام کے شہر یربوتہ میں امام اوزاعی نے کوفہ میں سفیان ثوری نے بصرہ میں حماد بن سلمہ نے، واسطہ میں یحییٰ بن یمن نے معمر نے خراسان میں عبد اللہ بن المبارک نے، رے میں جریر بن عبد الحمید نے انجام دیا ہے لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں :

یہ سب اکابر ایک ہی زمرے میں ہوئے ہیں اس لیے حتماً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع اولیت کا شرف کسے حاصل ہے بلکہ

در اصل بات یہ ہے کہ یہاں تدوین اور تصنیف میں کچھ اختلاط ہو گیا ہے۔ ان دونوں کو اگر الگ الگ رکھ کر عقدہ کو حل کیا جائے تو آسانی سے معاملہ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مدونین کی فہرست میں تو آپ امام زہری، امام شعبی، امام مکحول اور قاضی ابوبکر کے اسماء گرامی سن چکے ہیں۔ یہ دور دور تدوین ہے اور اس کا آغاز ۱۵۰ھ سے شروع ہو کر ۲۰۰ھ کے ختم پر ہے۔ اس کے بعد دور تصنیف شروع ہوا ہے۔ دور تصنیف میں پہل کا سہرا کس کے سر ہے اس سلسلے میں عبد الملک بن جریر ۱۵۰ھ، ابو حنیفہ ۱۵۰ھ، محمد بن اسحاق ۱۵۰ھ، سعید بن ابی عروبہ ۱۵۶ھ، الربیع بن صبیح ۱۶۰ھ، امام مالک ۱۶۹ھ، حماد بن سلمہ ۱۶۶ھ، سفیان ثوری ۱۷۰ھ، اوزاعی ۱۷۰ھ، یحییٰ بن عبد اللہ بن مبارک ۱۷۰ھ، معمر بن راشد ۱۷۰ھ، جریر بن عبد الحمید ۱۷۰ھ، سفیان بن عیینہ ۱۹۰ھ، یثرب بن سعد ۱۹۰ھ اور شعبہ بن الحجاج ۱۹۰ھ۔ یہ اکابر اگرچہ معاصر ہیں مگر ان کا تعلق مختلف ائمہ سے ہے اور یہ اسلامی مملکت میں متفرق شہروں مکہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ، دمشق، واسطہ، خراسان، یمن، رے اور مصر میں کام کر رہے ہیں اور ان کا یہ کام ایک منہج پر نہیں بلکہ مختلف منابہج پر ہوا ہے۔ جمع حدیث کی حد تک اس دور کے مصنفین میں اولیت بلاریب مکہ میں ابن جریر، بصرہ میں ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ کو حاصل ہے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ مختلف احادیث کو صرف کتاب کا لبادہ پہنا دیا جائے۔ ڈاکٹر السباعی نے درست لکھا ہے کہ :

ان کا کام حضور انور کے ارشادات، احوال صحابہ، فتاویٰ تابعین کو یکجا کرنا تھا۔
حافظ ابن حجر نے یہ بھی انکشاف کیا کہ
كانوا يصنفون كل باب على حدة ۱۷

امام اعظم شرائع کے مدونِ اول ہیں

لیکن ابھی تک کسی ترتیب اور بتویب کے ساتھ یہ کام نہیں ہوا۔ چونکہ تصنیف کی بالکل ابتدا تھی اس لیے کیف مالتفق حدیثوں کو سمیٹنا ہی ان بزرگوں کے پیش نظر تھا اور اس اولیت کا شرف حتماً ابن جریر، ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ کو حاصل ہے لیکن جہاں تک احکام کو پیش نظر رکھ کر بتویب اور ترتیب فقہی کا تعلق ہے اس میں اولیت کا شرف یقیناً امام اعظم کو حاصل ہے جیسا کہ حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے۔

انه اول من دون الشريعة درتبة ابواباً ۱۸
اور یہ بھی سیوطی نے بتایا ہے کہ ابو حنیفہ صرف مدونِ اول ہی نہیں بلکہ اس میں وہ یگانہ
بھی ہیں۔ لکھتے ہیں :

انفرد بهاد لم يسبق ابا حنيفة احده ۱۹
چونکہ دورِ اول میں بتویب کا سہرا بھی کوفہ میں امام شعبی کے سر ہے اس لیے اس دورِ ثانی
میں بھی بتویب و ترتیب احکام کا سہرا کوفہ ہی میں امام شعبی کے شاگرد ابو حنیفہ کے سر رہا۔
حافظ عسقلانی فرماتے ہیں :

اما جمع حديث الى مثله في باب واحد فقد سبق اليه الشعبي
فانه روى عنه انه قال هذا باب من الطلاق جسيم ۲۰
مدینہ میں اس کا آغاز امام مالک سے ہوا ہے چنانچہ سیوطی رقمطراز ہیں :
ثم تبعه مالك بن انس في ترتيب الموطأ ۲۱
یعنی تدوین شرائع اور ان کی ترتیب و بتویب میں امام اعظم مدونِ اول ہیں بلکہ وہ اس میں

۱۷ مقدمہ فتح الباری ص ۴ - ۱۸ تبیض الصحیفہ ص ۳۶ - ۱۹ تبیض الصحیفہ ص ۳۶

۲۰ السنہ ص ۱۲۴ - ۲۱ تبیض الصحیفہ ص ۳۶ -

یگانہ ہیں اور موٹا میں امام مالک ان کے مقتدی ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے۔

۱۔ حافظ ابن حزم نے تصریح کی ہے کہ امام مالک نے موٹا کی تالیف یقیناً یحییٰ بن سعید انصاری کی وفات کے بعد کی ہے اور یحییٰ کی وفات ۱۷۲ھ میں ہوئی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ان الموطا الفہ مالک بعد موت یحییٰ بن سعید الانصاری
بلا شک وکانت وفاتہ یحییٰ فی سنۃ ثلاث واربعمائے

۲۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن فرحون نے ابو مصعب احمد بن عوف الزہری سے جو امام مالک کے شاگرد ہیں اور امام مالک سے موٹا کے راوی ہیں نقل کیا ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے امام مالک سے فرمائش کی تھی کہ:

ضغ للناس کتاباً احملہ علیہ

امام مالک نے اس سلسلے میں کچھ کہا تو ابو جعفر منصور نے جواب دیا کہ

ضغ فما احد الیوم اعلم منک

آخر امام موصوف نے موٹا کی تصنیف شروع کی مگر ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ ابو جعفر سربراہ مملکت عباسی کا انتقال ہو گیا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ موٹا کی تصنیف منصور کی فرمائش پر خود اس کے زمانے میں شروع ہوئی اور اس کی وفات کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچی۔ منصور کی وفات ۲۰۱ھ میں ہوئی ہے اور اس کی جگہ اس کا فرزند محمد المہدی مسند خلافت پر متمکن ہوا اور اسی کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں موٹا کی تصنیف مکمل ہوئی۔

۳۔ امام اعظم کی تصانیف سے امام مالک کے استفادے کا ذکر کتب تاریخ میں صراحت سے مذکور ہے۔ قاضی ابوالعباس احمد بن محمد بن عبداللہ بن ابی العوام اخبار ابی حنیفہ میں بسند متصل عبدالعزیز بن محمد دروردی سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالک امام اعظم کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔

یہ شہادتیں کہہ رہی ہیں کہ موٹا بعد میں تصنیف ہوا ہے اور موٹا سے پہلے یعنی ۱۷۲ھ

اور شاہ کے درمیانی عرصہ میں امام اعظم کی تصانیف منقہ شہود پر ایسی تھیں اس لیے البواب احکام کے موضوع پر تصنیف کے میدان میں اولیت کا شرف امام اعظم ہی کو حاصل ہے۔

حدیث میں امام اعظم کی تصنیف

امام اعظمؒ میں جامع کوفہ کی اس مشہور علمی درسگاہ میں جلوہ افروز ہوتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعود کے زمانے سے باقاعدہ چلی آرہی تھی تو آپ نے جہاں فقہ کا عظیم الشان فن اجتماعیت سے مدون کیا وہیں فقہ کے البواب پر مشتمل حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی صحیح اور معمول بروایات انتخاب فرما کر مرتب کیا اور اس کو اپنے تلامذہ کے سامنے لیکچر کی صورت میں پیش کیا اسی کا نام کتاب الآثار ہے اور آج اُمت اسلامیہ کے علمی سرمایہ میں احادیث صحیحہ کی سب سے قدیم کتاب یہی ہے جو دوسری صدی کے ربیع ثانی کی تالیف ہے۔ امام اعظم سے پہلے حدیث نبوی کے جتنے مجموعے اور صحیفے تھے ان کی ترتیب فنی نہ تھی بلکہ ان کے جامعین نے کیفیات فقہی حدیثوں کے مجموعے تیار کیے تھے۔ گویا جس کام کی ابتدا بقول حافظ ابن حجر عسقلانی، امام شعبی نے کی تھی اسی کو امام اعظم نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مکمل فرمایا اور بعد کے آنے والوں کے لیے ترتیب و تبویب کی شاہراہ قائم کر دی۔

کتاب الآثار اس دور کی تمام تصانیف سے پہلے کی تصنیف ہے اس دور کے تمام مصنفین ابن جریر کو چھوڑ کر امام اعظم کے بعد ہیں۔ سب اگرچہ قرن ثانی کی پیداوار اور معاصر ہیں۔ مگر امام اعظم سے کسی نہ کسی درجے میں متاخر ہیں اور صرف متاخر نہیں بلکہ امام اعظم کی جلالت علمی کے قدردان ہیں۔

کتاب الآثار کا طریق تالیف

کتاب الآثار کا طریق تالیف، تعلیم کتب اور تعلیم روایات کا نہیں بلکہ تعلیم علوم و فنون کا ہے۔ یعنی بذریعہ درس و املا شیوخ سے علم حاصل کرنا، تمام علوم اور مہمات فنون عربیہ کے لیے صدرِ اقول میں یہی طریق رائج تھا۔ آغاز میں اس طرز تالیف کی بنیاد یوں پڑی کہ تلامذہ اپنے حفظ و یادداشت کے لیے اساتذہ کے تمام امالی یا ان کا خلاصہ لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ چیز اس قدر مقبول ہوئی کہ اقسام تصنیف میں ایک خاص قسم بن گئی اور

خود اساتذہ اور علمائے فن اپنی مرویات بطور تصنیف مرتب کرنے لگے اس طرح کہ حلقہ درس میں مطالب و مسائل املا کرتے اور ساتھ ساتھ خود بھی لکھتے جاتے یا پہلے مجموعہ مرتب کر لیتے اور پھر اسی کو املا کرتے۔ حدیث میں یہ طریق تمام علوم سے زیادہ رائج اور مقبول ہوا اور محدثین کے یہاں اسے ایک خصوصی مقام حاصل ہو گیا چنانچہ محدثین نے سماع من لفظ الشیخ کی دو مختلف صورتوں میں سے ایک قسم املا کو قرار دیا ہے اور یہ محدثین کی بیان کردہ ان تمام قسموں میں سے جو تحمل روایت کے لیے مشہور ہیں ایک اور اعلیٰ قسم ہے۔ چنانچہ علامہ میمانی نے توضیح الافکار میں حافظ زین الدین عراقی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

سواء احدث من کتابہ او من حفظہ باصلاح و بخیر

املاء و ہوارفع الاقسام لہ

محدثین نے اس انداز تالیف کی خاطر تلامذہ کے لیے جو تعبیری زبان مقرر کی ہے ان میں سب سے اعلیٰ و ارفع اگرچہ خطیب بغدادی کے خیال میں تو سماع ہی ہے لیکن ابن الصلاح حدثنا کو اور ابن کثیر حدثنی کو ارفع بتاتے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ عبد الملک بن عبد العزیز شاہ جو ابن جریر سے نام سے مشہور ہیں اور جن کے بارے میں حافظ عسقلانی نے انکشاف کیا ہے کہ حدیث کے پہلے مصنف یہی ہیں ان سے حجاج بن محمد مصعبی نے ان کی کتابیں اسی طرح روایت کی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

لا سیما من عرف انہ لا یروی الا ما سمعہ کحجاج بن محمد خرمی

کتب ابن جریر بلفظ قال ابن جریر فحملھا الناس عنہ

واجتوا بہا۔

علامہ محی الدین عبد الحمید نے اس طریق کو بے حد سراہا ہے اور اسے تالیف و تدریس میں سب سے اعلیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

حدیث حاصل کرنے کے طریقوں میں سب سے اوسنچا، ترقی یافتہ اور قوی ترین طریق یہ ہے کہ راوی شیخ کے الفاظ سے خواہ شیخ کسی دستاویز سے املا کر رہا ہو یا زبانی یادداشت سے، املا کرنا تحدیث من غیر املا

اونچا ہے۔

حافظ ابن الصلاح نے بھی نقل حدیث اور تھمل روایات میں اسے سب سے اونچی قسم قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

هذا القسم ارفع الاقسام عند الجاهلین

کتاب الآثار بھی اسی قسم کا املاتی مجموعہ ہے اور امام اعظم کا قائم کردہ یہ طریق تصنیف کچھ ایسا مقبول ہوا ہے کہ بعد کو امام کے تلامذہ نے بھی اپنی تصانیف میں اسے ہی اپنایا ہے۔ چنانچہ حافظ قاسم بن قطلوبغا منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں :

ان المتقدمین من علمائنا کالو یحسون المسائل الفقہیۃ و

ادلتها من الاحادیث النبویۃ باسانید ہم کاتبی یوسف فی

کتاب الخراج والامالی ومحمد فی کتاب الاصل والسیرو کذا

الطحاوی والمصنف والرائز والکشی۔

کتاب الآثار کے نسخے

جیسے مؤطا کو امام مالک سے ایک سے زیادہ اصحاب مالک نے روایت کیا ہے ایسے ہی کتاب الآثار کو بھی امام اعظم سے ان کے ایک سے زیادہ اصحاب نے روایت کیا ہے اور اس روایت کے ایک سے زیادہ ہونے کی وجہ سے جیسے مؤطا اور حدیث کی دوسری کتابوں کے نسخے متعدد ہو گئے ایسے ہی کتاب الآثار کے بھی راویوں کے متعدد ہونے کی وجہ سے نسخے ایک سے زیادہ ہو گئے ہیں۔

کتاب الآثار کو امام اعظم سے جن تلامذہ نے روایت کیا ہے ان کی تعداد تو زیادہ ہے لیکن ان میں مشہور چار ہیں :

بروایت امام محمد
بروایت امام ابو یوسف
بروایت امام زفر

۱۔ کتاب الآثار
۲۔ کتاب الآثار
۳۔ کتاب الآثار

۴۔ کتاب الآثار
بروایت امام حسن بن زیاد
یہ چاروں امام اعظم سے کتاب الآثار کے راوی ہیں ۔

کتاب الآثار بروایت امام محمدؒ

یہ امام محمدؒ کا روایت کردہ نسخہ ہے اور یہ نسخہ تمام نسخوں میں سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ہے۔ اسی کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے تعجیل المنفعة بزوائد رجال الاربعہ کے مقدمہ میں لکھا ہے ۔
والموجود من حدیث ابی حنیفہ مفرداً انما هو کتاب الآثار
القیرواھا محمد بن الحسن عندہ

اس نسخے میں جن راویوں سے حدیثیں مروی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے حالات پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی تصنیف جو مستقل طور پر رجال کتاب الآثار سے متعلق ہے اس کا نام الاثیر بمعرفۃ رواۃ الآثار ہے۔ اس کا ذکر نواب علامہ صدیق حسن خاں نے استخاف القبلا المتقین میں کیا ہے مگر نام غلط درج ہو گیا۔ الاثیر بمعرفۃ معانی الآثار نہیں بلکہ الاثیر بمعرفۃ رواۃ الآثار ہے۔ استخاف میں مصنف کا بھی ذکر نہیں ہے اس کے مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ اس کتاب کا ذکر خود حافظ عسقلانی نے تعجیل المنفعة کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں نے کتاب الآثار کے رجال پر علیحدہ مستقل کتاب لکھی ہے کیونکہ بعض حنفی ماہر بزرگوں میں سے ایک بزرگ نے میرے سے درخواست کی کہ میں کتاب الآثار کے رجال پر مستقل کتاب لکھوں۔ میں نے ان کی یہ درخواست قبول کی اور کتاب الآثار کے رجال پر کتاب لکھی اس میں جو اکابر تہذیب میں آچکے ہیں ان کا تو صرف نام ہی ذکر کر دیا اور تہذیب کا حوالہ دے دیا ہے اور ان کے علاوہ کے حالات لکھے ہیں۔ دوسری تصنیف کتاب تعجیل المنفعة بزوائد رجال الاربعہ ہے۔ یہ کتاب اب حیدرآباد میں چھپ چکی ہے۔ اس میں حافظ ابن حجر نے صرف ان راویوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے ائمہ اربعہ امام اعظم، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے اپنی اپنی تصانیف میں حدیثیں نقل کی ہیں مگر صحاح ستہ میں ان کے حوالے سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے دراصل حافظ ابو عبد اللہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے ایک کتاب التذکرہ

برجال العشرہ کے نام سے لکھی تھی اور اس میں حافظ ابو عبد اللہ نے ائمہ ستہ بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے ساتھ ائمہ اربعہ ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی تصانیف کے راویوں اور رجال کا تذکرہ لکھا اور اس کا نام التذکرہ برجال العشرہ رکھا اور ائمہ ستہ کے ساتھ ائمہ اربعہ کے رجال لکھنے کی وجہ خود ہی یہ بتاتی ہے کہ :

ذکرت رجال الأئمة الأربعة المقدمي بهم لان عمدتهم
في الاستدلال لهم لهذا هبهم في الغالب على ما روي في
مسانيدهم باسانيدهم فان المؤطا للمالك هو مذهب
الذي يدين الله به اتباعه ويقلدون مع انه لم يرو فيه
الا الصحيح عنده وكذلك مسند الشافعي موضوع لادلته على
ما صح عنده من مروياته وكذلك مسند ابی حنیفہ واما مسند
احمد فانه اعم من ذلك واشمل له

علامہ ابو جعفر الکتانی نے ائمہ ستہ فی الحدیث اور ائمہ اربعہ فی المذہب کی کتابوں کا تذکرہ کرنے
کے بعد لکھا ہے کہ :

فهذه هي كتب الأئمة الأربعة وباضافتها الى الستة الاولى
تكمل الكتب العشرة التي هي اصول الاسلام وعليها مدار
الدين

حافظ ابن حجر عسقلانی نے چونکہ تہذیب التہذیب اور تقریب کے نام سے ائمہ ستہ کی کتابوں
کے رجال پر دو کتابیں لکھی ہیں اس لیے حافظ عسقلانی نے ائمہ اربعہ کی تصانیف کے راویوں
کے لیے ایک مستقل کتاب تعجیل المنفعة کے نام سے اور اس میں جیسا کہ خود حافظ صاحب
نے تصریح کی ہے صرف ان اشخاص کے حالات لکھے ہیں جو ائمہ اربعہ کی کتابوں میں آئے ہیں
چنانچہ فرماتے ہیں :

فلذلك اقتصر على رجال الأربعة وسهلت تعجیل المنفعة
بذوات رجال الأئمة الأربعة

حیرت ہے کہ مشہور علامہ نواب صدیق حسن خاں نے استحف النبلاء المتقین میں علامہ شوکانی کے حوالہ سے کتاب کا نام تعجیل المنفعة برجال الاربعہ لکھ کر الاربعہ کو سنن الاربعہ کا مصداق قرار دیا ہے اور صاحب کشف الظنون کی اس بات میں تعلیظ کی ہے کہ الاربعہ سے ائمہ الاربعہ مجتہدین مراد ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔
کشف الظنون کفۃ بروایت رجال الائمۃ الاربعہ یعنی المذاہب وایں مسامحت
است از دے لے

حالانکہ خود حافظ صاحب کی تصریح سے یہ بات معلوم ہے کہ الاربعہ سے مراد ائمہ الاربعہ ہیں یعنی البوصیفہ، شافعی، مالک اور احمد نہ کہ ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ۔ علامہ ابو جعفر الکتانی نے مسند امام البوصیفہ پر تبصرہ کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:

والذی اعتبرہ الحافظ ابن حجر فی کتابہ تعجیل المنفعة بزوائد رجال
الاربعۃ هو ما اخرجہ الامام الذکی الحافظ ابو عبد اللہ الحسین بن
محمد بن خسر و لے

غالباً نواب صاحب نے خود تعجیل المنفعة کا مطالعہ نہیں فرمایا ورنہ زبان قلم پر یہ بات نہ آتی۔ العرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حافظ عسقلانی نے رجال ائمہ الاربعہ کے ذیل ہی میں کتاب الآثار کے بھی رجال لکھے ہیں۔ مشہور محدث حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوزیع میں کتاب الآثار کے رجال پر ایک اور کتاب کی بھی نشان دہی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

واللہین قاسم الحنفی رجال کل من الطحاوی والموطا لمحمد بن الحسن
والآثار و مسند ابی حنیفہ لابن المقرئ لے

حافظ زین الدین قاسم بن قطلوبغا کی اس کتاب کا علامہ الکتانی نے الرسالة المستطرفہ میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ ملا کاتب چلبی نے کشف الظنون میں کتاب الآثار امام محمد پر حافظ ابو جعفر طحاوی کی شرح کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ سخاوی نے السنۃ اللامعہ میں علامہ تفتی الدین احمد بن علی مقریزی کی کتاب العقود فی تاریخ العمود کے حوالہ سے حافظ قاسم کی تصانیف میں تعلیقات علی کتاب الآثار بھی لکھی ہے۔

امام محمد سے اس کتاب کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے مطبوعہ نسخہ امام ابو حفص کبیر اور ابوسلیمان جوزجانی کا روایت کردہ ہے۔

کتاب الآثار پر روایت امام ابو یوسفؒ

کتاب الآثار کا یہ نسخہ قاضی ابو یوسف سے ان کے صاحبزادے یوسف بن یعقوب نے روایت کیا ہے اس نسخہ کے راوی قاضی ابو یوسف کی جلالت قدر کا حدیث میں اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے جب تحصیل حدیث شروع کی تھی تو سب سے پہلے قاضی ابو یوسف ہی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے احادیث لکھیں، حافظ ابن الجوزی مناقب میں بسند متصل ناقل ہیں:

اخبرنا ابو منصور عبد الرحمن بن محمد القزاز قال اخبرنا ابو بکر احمد بن علی بن ثابت قال اخبرنا الازہری قال ثنا عبد الرحمن بن عمر قال ثنا محمد بن یعقوب قال حدثنی احمد بن حنبل یقول اول من کتبت عنہ المحدث ابو یوسفؒ۔^۱

اور حافظ ذہبی مناقب ابی حنیفہ میں حافظ عباس دوری سے نقل کرتے ہیں:

سمعت احمد بن حنبل یقول اول ما کتبت المحدث اخلفت بعد

لہ ان کا نام موسیٰ بن سلیمان اور کنیت ابوسلیمان ہے۔ حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں کہ مامون نے ان کے سامنے عہدہ قضا کی پیش کش کی فرمایا امیر المومنین عدالتی معاملہ میں حقوق الہی کی نگرانی کیجئے۔ اور اپنی امانت مجھ جیسے کو سپرد نہ فرمائیے۔ مجھے غصہ میں رہنے پر قابو نہیں رہتا۔ میں اپنے اللہ کے بندوں میں فیصلہ کرنے کے کام کو پسند نہیں کرتا۔ مامون نے یہ سن کر کہا کہ آپ درست کہتے ہیں۔ امام محمد اور قاضی ابو یوسف کے تلامذہ میں سے ہیں اور ان سے ان کی کتابوں کے راوی بھی ہیں۔ دینداری پارسائی، فقہ و حدیث میں معلیٰ بن منصور کے رفیق ہے۔ معلیٰ بن منصور امام مالک، لیث بن سعد، حماد اور ابن عیینہ کے شاگرد ہیں۔ ان کی تصانیف میں السیر الصغیر، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب الہرم جیسی کتابیں ہیں۔^۲ کے بعد ان کی وفات ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے حماد بن زید سے سنا ہے وہ فرماتے تھے میں ابو حنیفہ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ ایوب سختیانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یاد ہے کہ ایوب سختیانی امام اعظم کے اساتذہ میں سے ہیں۔^۳ مناقب ابن الجوزی ص ۲۲۔

الی الناس لہ

یہ واقعہ شہ کا ہے جب امام احمد کی عمر سولہ سال تھی لہ

امام احمد نے امام ابو یوسف اور امام محمد سے تین قسط درودہ صندوق جس میں کتابیں رکھی جاتی ہیں
بھر کر علم دین کی کتابت کی تھی۔ چنانچہ حافظ ابو الفتح بن سید الناس یحمری شافعی لکھتے ہیں:

قال ابراہیم بن جعفر حدثنی عبد اللہ بن احمد بن حنبل قال کتب

ابی عن ابی یوسف و محمد ثلاثہ قماطر قلت لہ کان ینظر فیہا

قال کان رہا نظر فیہا لہ

امام احمد بن حنبل کا خود قاضی صاحب موصوف کے متعلق حسب تصریح علامہ سمعانی یہ تاریخی
اقرار موجود ہے:

ابو یوسف الامام یقول فیہ احمد بن حنبل انہ ابصر الناس
بالآثار لہ

ان تصریحات کی موجودگی میں خدال کی اس رائے کی کوئی قیمت نہیں کہ

امام احمد نے پہلے پہل اہل الرائے کی کتابیں لکھیں اور پڑھیں اور ان کے
مسائل ازبر کیے لیکن پھر ان کی طرف کوئی التفات نہیں رہا۔

یہ ایسی بات ہے جسے باور کرنے کی ہمیں مذکورہ تصریحات اجازت نہیں دیتی ہیں۔ الغرض
کتاب الآثار کے امام اعظم سے دوسرے راوی قاضی ابو یوسف، امام احمد بن حنبل کے استاد ہیں
ان کے اس نسخہ کا تذکرہ حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المصنیۃ میں کیا ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسف
بن ابی یوسف کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

روی کتاب الآثار عن ابیہ عن ابی حنیفۃ

پروفیسر الشیخ محمد البزہرہ لکچرر فواد یونیورسٹی نے ابو حنیفہ نامی کتاب میں اس پر جو عالماتہ تبصرہ
کیا وہ بھی پڑھ لیجئے:

یہ کتاب علمی طور پر تین وجہ سے قیمتی ہے۔ اول یہ کہ امام ابو حنیفہ کی

مرویات کا ذخیرہ ہے اور اس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف نے استخراج مسائل میں احادیث کو کیسے دلائل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ دوم یہ کہ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ امام موصوف کے یہاں مواقع استدلال میں فتاویٰ صحابہ اور احادیث مرسلہ کا کیا مقام تھا۔ سوم یہ کہ اس کتاب کے ذریعے تابعین فقہاء کوفہ کے خصوصاً اور فقہاء عراق کے عموماً فتاویٰ تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔

کتاب الآثار بروایت امام زفر

پورا نام زفر بن الہذیل الغنیری ہے ان سے کتاب الآثار کی روایت ان کے تین شاگردوں نے کی ہے۔ ابو وہب محمد بن مزاحم، شداد بن حکیم، حکیم بن ایوب۔ محمد بن مزاحم اور شداد بن حکیم کے حوالہ سے جو کتاب الآثار مروی ہے اس کا مشہور محدث ابو عبد اللہ الحاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:-

نسخۃ لزفر بن الہذیل الجعفی تفرد بها عنہ شداد بن حکیم
البلخی و نسخۃ ایضا لزفر بن الہذیل الجعفی تفردا ابو وہب
محمد بن مزاحم المرزہی

ایک نسخہ زفر کا جسے ان سے شداد نے صرف روایت کیا ہے۔ ایک نسخہ زفر کا اور جسے ان سے صرف ابو وہب محمد بن مزاحم نے روایت کیا۔ حدیث کے مشہور امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی کتاب قیام لیل و قیام رمضان و کتاب الوتر میں امام اعظم کی جس کتاب کا

نزعہ الغمان فی کتابہ امام ابو حنیفہ کا اپنی کتاب میں خیال ہے۔

کے پیرائے میں تذکرہ کیا ہے وہ بھی ابو وہب محمد بن مزاحم والی کتاب الآثار ہے جو امام مروزی کو ان کے شاگرد ابو نصر محمد بن محمد کے حوالہ سے ملی ہے۔ یہ نیشاپور کے نامی گرامی قاضی ہیں ان سے حافظ ابو عبد اللہ الحاکم نے حدیث پڑھی ہے۔ امام حاکم نے تاریخ نیشاپور میں لکھا ہے

کہ ان کے لیے ۲۵۰ھ میں حرملین میں باقاعدہ مجلس درس لگتی تھی۔ ان کی وفات ۳۳۰ھ میں ہوئی ہے۔ حافظ سمعانی نے الانساب میں ابو وہب محمد بن مزاحم کو احمد بن بکر بن یوسف کا اُستاد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

یروى عن ابى وهب محمد بن مزاحم المروزي عن زفر عن ابى حنيفة
كتاب الآثار

كتاب الآثار احمد بن بکر اپنے اُستاد محمد بن مزاحم سے بحوالہ زفر از ابی حنیفہ روایت کرتے ہیں۔

حکیم ابن ایوب کی کتاب الآثار کا ذکر حافظ ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی کتاب طبقات المحدثین میں احمد بن رستہ کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

احمد بن رستہ بن بنت محمد بن المغيرة كان عنده السنن عن محمد
عن الحكم عن زفر عن ابى حنيفة

احمد بن رستہ کے پاس بحوالہ محمد از حکم از زفر از ابی حنیفہ کتاب السنن تھی۔
امام طبرانی نے معجم صغیر میں اس نسخہ کی ایک حدیث روایت کی ہے۔

حدثنا احمد بن رستہ بن عمر الاصفهاني ثنا المغيرة الحكم بن
اليوب عن زفر بن الهذيل عن ابى حنيفة

حافظ ابن ماکولانے بھی الکمال میں احمد بن بکر کے تذکرے میں لکھا ہے :-

احمد بن بکر بن سيف البكري الجصيني ثقة يميل ميل اهل النظر

عن ابى وهب عن زفر بن الهذيل عن ابى حنيفة كتاب الآثار

ان تصریحات کی موجودگی میں اشیخ محمد ابو زہرہ لیچر رفواہ یونیورسٹی قاہرہ کا ابو حنیفہ نامی کتاب میں یہ کہنا درست نہیں ہے :

زفر لم يوثق عنه كتب ولم تعرف له رواية لمذهب شيخه

امام زفر سے کتاب میں مروی نہیں ہیں اور ان کی اپنے اُستاد سے کوئی روایت

۱۔ لمحات النظر، الجواهر المضية ج ۱ ص ۶۲۔ ۲۔ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۴۳۔

۳۔ معجم صغیر طبرانی ص ۲۳۔ ۴۔ امام ابن ماجہ اور علم الحدیث ص ۱۴۲۔ ۵۔ ابو حنیفہ ص ۱۱۸۔

مشہور نہیں ہے۔

کتاب الآثار بروایت امام حسن بن زیاد

کتاب الآثار کے تمام نسخوں میں یہ نسخہ غالباً سب سے بڑا ہے کیونکہ امام حسن بن زیاد نے امام اعظم کی احادیث مرویہ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ چنانچہ امام حافظ ابویسحی زکریا بن یحییٰ نیشاپوری اپنی اسناد کے ساتھ امام حسن سے ناقل ہیں کہ:

کان ابو حنیفۃ یروی اربعۃ الاف حدیث الفین لحداد والفین
لسائر المشیختۃ لہ

قرین قیاس یہی ہے کہ امام نوٹوٹی نے امام اعظم کی ان تمام حدیثوں کو اپنے نسخہ میں روایت کیا ہوگا۔

اس نسخہ کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ محمد بن ابراہیم بن جیش لغوی کے ترجمہ میں رقمطراز ہیں۔

محمد بن ابراہیم جیش البغوی مروی عن محمد بن شجاع التلجی
عن الحسن بن زیاد عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار لہ

محدث علی بن عبدالحسن ووالیہی حنبلی نے اپنے مثبت میں اس نسخہ سے ساٹھ حدیثیں نقل کی ہیں جن کو محدث شیخ محمد زاید کوثری نے الامتاع میں نقل کیا ہے۔

محدث خوارزمی نے جامع مسانید میں اس نسخہ کو مسند ابی حنیفہ الحسن بن زیاد کے نام سے پیش کیا ہے۔ خوارزمی نے اس نسخہ کی اسناد میں امام حسن تک اپنے چاروں اساتذہ یعنی شیخ ابو محمد یوسف بن عبد الرحمن، شیخ ابو محمد ابراہیم بن محمود، شیخ ابو نصر الراغب بن ابی الفضائل اور شیخ ابو عبد اللہ محمد بن علی کے حوالہ سے اس طرح نقل کی ہے :-

اخبرنا المحافظ ابو المفرج عبد الرحمن بن علی الجوزی قال اخبرنا
ابو القاسم اسماعیل بن احمد السمرقندی قال اخبرنا ابو القاسم
عبد اللہ بن الحسن قال اخبرنا ابو الحسن عبد الرحمن بن عمر قال

اخبرنا ابو الحسن محمد بن ابراہیم بن حبیش البغوی قال حدثنا
ابو عبد اللہ محمد بن شجاع البلیخی قال حدثنا الحسن بن زیاد
اللولوی عن ابی حنیفۃ

خوارزمی کی طرح دیگر محدثین بھی اس کو مسند ابی حنیفہ کے نام سے روایت کرتے ہیں۔ خود حافظ
ابن حجر عسقلانی کی روایات میں بھی یہ نسخہ موجود تھا۔ اس نسخہ کی اساتید اجازت کو محدث علی بن عبد الرحمن
الدوالیبی حنبلی نے اپنے مثبت میں، محدث ایوب الخلوئی نے اپنے مثبت میں اور خاتمة الحفاظ
محمد عابد سندھی نے حصر الشارح فی اسانید الشیخ محمد عابد میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور
شیخ محمد زاہد کوثری نے ان کو الامتاع بسیرۃ الابائین الحسن بن زیاد و محمد بن شجاع میں نقل کر دیا ہے

ایک ضروری توضیح

جامع المسانید اور لسان المیزان میں اس روایت کے ناموں میں کچھ تصحیف ہو گئی اصل سند
تو اس طرح ہے کہ :

محمد بن ابراہیم بن حبیش البغوی روى عن محمد بن شجاع التلجی عن الحسن
بن زیاد عن ابی حنیفہ کتاب الآثار۔

لیکن جامع المسانید میں خوارزمی نے محمد بن ابراہیم بن حبیش اور لسان المیزان میں حافظ
ابن حجر نے محمد بن ابراہیم بن حسن لکھا ہے دونوں غلط ہیں۔ اسی طرح جامع المسانید میں محمد
بن شجاع البلیخی اور لسان المیزان میں محمد بن یسبح البلیخی طبع ہو گیا ہے یہ بھی غلط ہے۔
اور لسان المیزان میں عن الحسن بن زیاد عن محمد بن الحسن عن ابی حنیفہ میں محمد بن الحسن کا اضافہ
یقیناً غلط ہے۔ محمد بن ابراہیم بن حبیش بغوی اور امام محمد بن شجاع التلجی دونوں نہایت
معروف و مشہور عالم ہیں۔ دونوں کا بیسوط حال خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے
حافظ بدر الدین عینی نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے کہ محمد بن شجاع التلجی میں نسبت نسب کی
ہے اور محمد بن شجاع کو تلج بن عمرو بن مالک بن عبد مناف سے نسب تعلق کی وجہ سے تلجی کہتے
ہیں۔ امام ذہبی نے سیر النبلاء میں ان کے اساتذہ میں ابن علیہ، وکیع، یحییٰ بن آدم اور حسن

بن زیاد کا نام لیا ہے۔ اور حافظ عبد القادر قرشی نے بیچنی بن اکثم کو ان کا شاگرد لکھا ہے۔
حافظ ابن القیم جوزی نے اپنی مشہور کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین میں ایک موقع پر امام حسن بن زیاد کی اسی کتاب الآثار کی حدیث سے استدلال کیا ہے ان کا موقع استدلال
میں اس کا ذکر نہ صرف اس بات کی دلیل نہیں کہ کتاب الآثار کا نسخہ ان کے مطالعہ میں رہا
ہے بلکہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کتاب کا ابن القیم کے یہاں اعتبار ہی اور استدلالی
مقام ہے وہ فرماتے ہیں:

قال الحسن بن زیاد المؤمني ثنا ابو حنيفة قال كنا عند محارب
بن دينار فتقدم اليه رجلان فادعى احدهما على
الاخر ما لا نجد المدعى عليه فساله البينة فجادر جل
فشهد عليه فقال المشهود عليه لا والله الذي لا اله
الا هو ما شهد على بحق وما علمته الا رجلاً صالحاً غير
هذه الذلة فانه فعل هذا الحق كان في قلبه على و
كان محارب مثكناً فاستوى جالساً ثم قال يا ذالرجل
سمعت ابن عمر يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم
يقول ليا تين على الناس يوم تتيب فيه الولدان وتضع
العوامل ما في بطونها وتضرب الطير باذنا بها وتضع ما
في بطونها من شدة ذالك اليوم ولا ذنب عليها وان
شاهد الزور لا يقار قدماه على الارض حتى يقذف
به في النار فان كنت شهدت بحق فالتق الله اقم على
شهادتك وان كنت شهدت بباطل فالتق الله وعظ
راسه واخرج من ذالك الباب

ان چار بزرگوں کے حوالے اور وساطت سے امام اعظم کی کتاب الآثار آج امت کے ہاتھوں
میں ہے۔ ان کی شخصیتیں امت میں معروف و مشہور ہیں۔

کتاب الآثار کی روایتی صحت

امام ابو حنیفہ سے احادیث کو اگرچہ ہزاروں آدمیوں نے روایت کیا ہے لیکن امام موصوفی کے جن تلامذہ سے کتاب الآثار کی روایت کا سلسلہ چلا ہے وہ یہ مذکورہ بالا چار بزرگ ہیں۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں اپنا سلسلہ سند ان چاروں حضرات تک بیان کر دیا ہے۔ ایسے ہی علامہ مسند محمد سعید نے اوائل السنبلیہ میں یہی اپنا سلسلہ سند بتایا ہے۔ ہم ان بزرگوں کے علاوہ چند اور محدثین کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہ سے کتاب الآثار کا باقاعدہ سماع کیا ہے۔

امام عبداللہ بن المبارک کے بارے میں مشہور محدث خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں حمیدی شیخ بخاری کی زبانی نقل کیا ہے۔

سمعت عبداللہ بن المبارک یقول کتبت عن ابی حنیفۃ اربع مائۃ
حدیث ۱۰

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہ سے چار صد حدیثیں لکھی ہیں۔
امام حفص بن غیاث سے حافظ حارثی نے بسند متصل نقل کیا ہے :

سمعت من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً ۱۱

میں نے امام ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔
شیخ الاسلام عبداللہ بن یزید مرقی کے بارے میں علامہ کردری فرماتے ہیں :
سمع من الامام تسعمائۃ حدیث ۱۲

انہوں نے امام ابو حنیفہ سے نو سو حدیثیں سنی ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام وکیع بن الجراح کے متعلق سید الحفاظ یحییٰ بن معین کی زبانی انکشاف کیا ہے :

ما رأیت احداً قدمہ علی وکیع وکان یفتی برائی ابی حنیفۃ وکان
یحفظ حدیثہ کلمہ وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً ۱۳

میں دیکھ کر کسی کو مقدم نہیں کرتا وکیع امام ابو حنیفہ کی رائے پر فتویٰ دیتے تھے اور ان کو ابو حنیفہ کی ساری حدیثیں یاد تھیں وکیع نے ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔

حافظ موصوف ہی نے اپنی ایک دوسری کتاب میں امام حماد بن زید کے بارے میں لکھا ہے :

روى حماد بن زید عن ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً۔^{۱۷}

حماد بن زید نے امام ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔
حافظ ابن عبد البر نے خالد الواسطی محدث کے متعلق انکشاف کیا ہے کہ :

روى عنه خالد الواسطی احادیث کثیرة۔^{۱۸}

خالد نے ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔

یہ وہ اکابر محدثین ہیں کہ جن میں سے ہر ایک علم حدیث وفقہ کا آفتاب و ماہتاب ہے۔ یاد رہے کہ سبجز مؤطا امام مالک کے اور کسی کتاب کے راوی اس قدر جلال علمی کے مالک نہیں ہیں اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے امام اعظم سے کتاب الآثار کا سماع کیا ہے ورنہ امام اعظم سے احادیث روایت کرنے والے تو اس قدر زیادہ ہیں کہ بقول حافظ ذہبی :

روى عنه من المحدثین والفقہاء عدۃ لا یحصون۔^{۱۹}

امام ابو حنیفہ سے محدثین و فقہاء میں سے بے شمار نے روایت کی ہے۔

کتاب الآثار کی علمی حیثیت

علمی طور پر کتاب الآثار کا مقام اور اس کی مرویات کی فنی حیثیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابوالعباس محمد بن عبد اللہ بن ابی العوام اپنی کتاب اخبار ابی حنیفہ میں بند متصل لکھتے ہیں :

حدثنی یوسف بن احمد المکی ثنا محمد بن حازم الفقیہ ثنا محمد

بن علی الصائغ بمکۃ ثنا ابراہیم بن محمد عن الشافعی عن

عبد الصمد بن الدرداء وروى قال کان مالک ینظر فی کتب ابی

حنیفۃ و ینتفع بہا -

امام مالک امام ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے -

غور فرمائیے کہ جب امام مالک موٹا کی تالیف میں امام اعظم کی کتابوں سے استفادہ فرماتے ہیں تو پھر کتاب الآثار کی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکا - اگر یہ واقعہ ہے اور واقعہ نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ شاہ عبدالعزیز لکھ رہے ہیں کہ موٹا کا درجہ صحیحین کے لیے بمنزلہ ماں کے ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس لحاظ سے کتاب الآثار کا مقام بھی موٹا امام مالک کے لیے یہی ہے یعنی جو نسبت بخاری و مسلم کی کتابوں کو موٹا امام مالک سے ہے وہ ہی نسبت موٹا کو کتاب الآثار سے بھی ہے -

تنویر الحوالک میں ہے :

حافظ مغلطی فرماتے ہیں کہ پہلے جس نے صحیح تصنیف کی وہ مالک میں حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ مالک کی کتاب خود ان کے نزدیک اور ان کے مقلدین کے نزدیک صحیح ہے بلکہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ مغلطی کے نزدیک اس بارے میں اولیت کا شرف امام مالک کو حاصل ہے لیکن کتاب الآثار موٹا سے پہلے کی تصنیف ہے جس سے خود موٹا کی تالیف میں استفادہ کیا گیا ہے - چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں :

من مناقب ابی حنیفۃ التي انفراد بہا اقل من دون الشریعۃ
ورتبہ ابوابا ثم تبعہ مالک فی ترتیب الموطا و لہ
یسبق اباحنیفۃ احد ۲۱

ابو حنیفہ کی ان بزرگیوں میں سے جن میں وہ یگانہ روزگار ہیں یہ ہے کہ قانون اسلامی کے اولین مدون اور مرتب ہیں امام مالک ان کے تابع ہیں -

کتاب الآثار میں جو حدیثیں ہیں وہ موٹا کی روایات سے قوت و صحت میں کم نہیں ہیں -

جس طرح مؤطا کے مراسیل کے توابع و شواہد موجود ہیں اسی طرح اس کے مراسیل کا حال ہے اس لیے صحت کے جس معیار پر حافظ مغلطانی اور حافظ ابن حجر کے نزدیک مؤطا صحیح ہے ٹھیک اسی معیار پر کتاب الآثار صحیح اترتی ہے۔ مؤطا کو کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے۔

کتاب الآثار کا تاریخی مقام

اسناد و روایت کے لحاظ سے کتاب الآثار کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کتاب الآثار چالیس ہزار حدیثوں کے مجموعہ کا انتخاب ہے۔ امام بخاری کا زمانہ چونکہ اتباع تابعین کے بعد ہے زمانے کی دوری کی وجہ سے ایک ایک حدیث کے ہزاروں طرق رونما ہو چکے تھے اس لیے ان کی کتاب خود ان کے اقرار کے مطابق

آخر جتہ من نحو ست مائۃ الف ۱۰

چھ لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ انتخاب کیا ہے

لیکن امام ابو حنیفہ کا زمانہ صحابہ اور کبار تابعین کا زمانہ ہے اس لیے یہاں طرق میں اتنی وسعت اور پھیلاؤ نہیں ہے اس کے باوجود چالیس ہزار حدیثوں سے کتاب الآثار کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ چنانچہ امام ابو جعفر بن محمد زرنجری فرماتے ہیں۔

انتخب ابو حنیفۃ الآثار من اربعین الف حدیث ۱۰

امام ابو حنیفہ کی کتاب الآثار ۴۰ ہزار حدیثوں کا انتخاب ہے

امام حافظ ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری جو ارباب صحاح ستہ کے معاصر ہیں۔ امام اعظم سے بالسدنا نقل ہیں:-

میرے پاس حدیث کے صندوق بھرے ہوتے موجود ہیں مگر میں نے

ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے لوگ نفع اندوز ہوں گے

اور حافظ ابو نعیم اصفہانی نے مسند ابی حنیفہ میں بسند متصل یحییٰ بن نصر کی زبانی نقل کیا ہے کہ

میں امام ابو حنیفہ کے یہاں ایسے مکان میں داخل ہوا جو کتابوں سے اٹا

ہوا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے فرمایا کہ یہ سب احادیث ہیں

اور میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں بیان کی ہیں۔
 امام اعظم کی حدیث میں احتیاط کا بڑے بڑے محدثین نے اقرار کیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابو محمد عبد اللہ
 حارثی بسند متصل امام دیکھ سے جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں نقل کرتے ہیں،
 جیسی احتیاط امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے حدیث میں پائی گئی کسی دوسرے
 سے نہیں پائی گئی۔

اسی طرح علی بن جعد جو ہری سے جو حدیث کے بہت بڑے حافظ اور امام بخاری و ابوداؤد
 کے شیخ ہیں نقل کیا ہے :

قال علی بن الجعد البوحنیفة اذا جاد بالحدیث جاد بہ مثل الدرر
 ابو حنیفہ جب بھی حدیث پیش کرتے ہیں تو موتی کی طرح آبدار ہوتی ہے۔
 اور امام یحییٰ بن معین جن پر فن جرح و تعدیل کا دار و مدار ہے فرماتے ہیں :
 ابو حنیفہ ثقہ ہیں جو حدیث ان کو یاد ہوتی ہے وہی بیان کرتے ہیں اور جو
 حفظ نہیں ہوتی اس کو بیان نہیں کرتے۔

امام عبد اللہ بن المبارک جن کی جلالتِ شان پر محدثین کا اتفاق ہے انہوں نے امام اعظم کی
 شان میں جو مدحیہ اشعار کہے ہیں ان میں بھی کتاب الآثار کی نہایت شان کا ذکر ہے۔
 مروی آثارہ فاجاب فیہا کطیران الصقور من المنیفة
 انہوں نے آثار کو روایت کیا تو اتنی تیزی سے چلے جیسے بلندی سے پرندے
 شکاری اڑتے ہوں۔

فلم یبق بالعراق له نظیر ولا بالمشرقین ولا بکوفہ
 نہ تو عراق میں ان کی نظیر تھی نہ مشرق و مغرب میں اور نہ کوفہ میں۔
 اسی طرح مشہور امام ابویحییٰ غسان بن محمد نے اپنی ایک نظم میں بھی کتاب الآثار کا ذکر کیا ہے جو انہوں
 نے امام ابو حنیفہ کی شان میں لکھی ہے :

و بنی علی الآثار اس بناء فانت غوامضہ علی الاساس

۱۔ عقود الجواہر النیفة ج ۱ ص ۲۳۔ ۲۔ المناقب لموفق ج ۱ ص ۱۹۷۔ ۳۔ جامع المسانید ج ۲ ص ۳۰۔
 ۴۔ تاریخ بغداد، تہذیب التہذیب۔ ۵۔ المناقب ج ۲ ص ۱۹۰۔

والناس يتبعون قيسها قوله لما استبان ضياءه للناس

اسی طرح امام اہل سمرقند ابو مقاتل سمرقندی اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں:

سردی الآثار عن نبل ثقات غرام العلم مشيخة حليفة

کتاب الآثار کی امتیازی حیثیت

چونکہ کتاب الآثار کا موضوع صرف احادیث ہیں جن سے فقہی مسائل کا اشتنباط ہوتا ہے اور جن کی حیثیت سنن کی ہے اس لیے وہ سینکڑوں ابواب جو صحیحین اور جامع ترمذی جیسی حدیث کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں وہ کتاب الآثار میں نہیں ہیں کیونکہ ان ابواب کا تعلق فقہیات سے نہیں ہے اس لیے بعض محدثین نے کتاب الآثار کو کتاب السنن کے نام سے پکارا ہے۔ کتاب الآثار کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس کی روایات اس دور کی دیگر تصانیف کی طرح اپنے ہی شہر اور اقلیم کی روایات میں محدود نہیں بلکہ اس میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، غرض کہ حجاز، عراق دونوں جگہ کا علم تحریر و تدوین میں یکجا موجود ہے۔

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:-

دین وفقہ و علم کی اشاعت امت میں اصحاب عبداللہ بن مسعود، اصحاب زید بن ثابت، اصحاب عبداللہ بن عمر اور اصحاب عبداللہ بن عباس سے ہوتی ہے اور لوگوں کا عام علم ان چار ہی کے ساتھیوں سے لیا ہوا ہے چنانچہ مدینہ والوں کا علم زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر کے اصحاب سے اور مکہ والوں کا علم عبداللہ بن عباس کے اصحاب کا اور عراق والوں کا علم عبداللہ بن مسعود کے ساتھیوں اور شاگردوں کا ہے۔

امام مالک نے موطا کی تالیف مدینے میں کی ہے اور اس میں مدنی شیوخ کے علاوہ اور لوگوں سے برائے نام روایتیں ہیں لیکن کتاب الآثار کے راویوں میں حجازی یا عراقی کی کوئی تخصیص نہیں ہے

۱۔ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۵۔ امام اعظم نے اپنی عمارت کی بنیاد آثار پر رکھی تو آپ کے دقیق مسائل درست ہو گئے۔ لوگ ان مسائل میں آپ کی بات کی پیروی اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے آپ کے ارشادات کی تابانی آگئی ہے۔ ۲۔ المناقب ج ۲ ص ۱۹۰۔ ۳۔ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۔

بلکہ حجاز، عراق اور شام جملہ بلاد اسلامیہ کے علماء سے اس میں روایتیں موجود ہیں۔ آپ صرف امام محمد کے حوالہ سے آئی ہوئی کتاب الآثار کا مطالعہ کیجئے۔ اور امام اعظم کے تمام شیوخ کو پڑھ لیجئے تو آپ کو ایک سو پانچ میں سے تیس کے قریب ایسے مشائخ ملیں گے جن کا وطن کوثرِ نبویاں ہے یہاں یہ بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے کہ صحابہ میں جن بزرگوں میں سے مسائل منقول ہیں ان کی تعداد حافظ ابن القیم نے یہ بتائی ہے۔

والذین حفظت عنہم الفتویٰ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مائتہ و نیف و ثلاثون نفساً ما بین رجل وامرأة۔
اصحاب میں سے اربابِ فتویٰ مرد و زن تقریباً ایک سو تیس سے کچھ اوپر نفوسِ قدسی ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان میں فرقِ مراتب بھی تھا۔
ان میں کثیر الفتاویٰ، قلیل الفتاویٰ اور متوسط بھی تھے یہ سب زیادہ کثیر الفتاویٰ یہ حضرات ہیں :

كان الملكثرون منهم سبعة عمر بن الخطاب، علي بن ابي طالب، عبد الله بن مسعود، عائشة ام المؤمنين ونريد بن ثابت وعبد الله بن عمر، وعبد الله بن عباس۔
کثیر الفتاویٰ سات بزرگ ہیں عمر، علی، عبد اللہ، عائشہ، زید بن ثابت، عبد اللہ ابن عمر۔ عبد اللہ بن عباس۔

ان سات میں بھی چار بزرگ بہت زیادہ ممتاز کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :
واکابر هذا الوجه عمر و علی و ابن مسعود و ابن عباس۔
ان میں بزرگترین عمر، علی، ابن مسعود اور ابن عباس ہیں۔

حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک بزرگ کے فتاویٰ کو اگر جمع کیا جائے تو مستقل ایک ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے اور ابو بکر محمد بن موسیٰ کے بارے میں حافظ ابن القیم کی تصریح ہے کہ احدا مئة الاسلام في العلم والحديث۔ انہوں نے حضرت

ابن عباس کے فتاویٰ کو لکھا گیا تو

جمع فی عشرین کتاباً

موطا میں حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت ابن عباس سے بہت کم روایات ہیں۔ شاہ ولی اللہ مصطفیٰ کے مقدمہ میں رقم لگاتے ہیں۔

امام مالک نے حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت ابن عباس سے کم روایات لی ہیں۔ ہارون الرشید نے امام مالک سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ لم یکنوا ببلد دی ولہم الق رجالہما یعنی یہ دونوں بزرگ میرے شہر میں نہ تھے اور میری ان کے اصحاب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ لے

اس کے برعکس کتاب الآثار میں جس مقدار میں حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایات ہیں اسی کے قریب قریب حضرت عمر، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس کی بھی روایات ہیں۔

کتاب الآثار کی مقبولیت

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ
مسند ابی حنیفہ و آثار محمد بنائے فقہ حنفیہ است

اس کا مطلب یہ ہے کہ امت مرحومہ کا سوا و اعظم جس کی تعداد تمام عالم کے مسلمانوں میں دو تہائی ہے اس کے مذہب کا علمی سرمایہ امام ابو حنیفہ کی کتاب الآثار ہے اور اسے امت کی اکثریت کی تعلق بالقبول کا شرف حاصل رہا ہے صرف اور صرف احناف ہی کی نہیں بلکہ ہر دور میں مشرع ہی سے ائمہ نے بھی اس کتاب کی جلالت کو مانا ہے۔

امام مالک کے بارے میں آپ پہلے پڑھ آتے ہیں کہ عبدالعزیز در اوروی فرماتے ہیں کہ امام موصوف امام ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے امام شافعی نے تصریح کی ہے کہ:

من لم ينظر في كتب ابی حنیفۃ لم يتبحر فی الفقہ

خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ایک بار ابو مسلم مستملی نے شیخ الاسلام یزید بن ہارون جبکہ وہ بغداد میں منصور بن المہدی کے پاس فروکش تھے ہم بالا خانے میں پہنچ گئے۔ ابو مسلم نے دریافت کیا کہ

ما تقول یا ابا خالد فی ابی حنیفہ والنظر فی کتبہ
لے ابو خالد تمہاری ابو حنیفہ اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بارے میں
کیا کہتے ہیں۔

آپ نے فرمایا:

نظر فیہا ان کنتہ تردیدون ان تفقہوا فانی ما رأیت احدا من
الفقہاء یکمل النظر فی قولہ لے
اگر تم فقیہ بننا چاہتے ہو تو ان کا مطالعہ کرو میں نے کسی بھی فقیہ کو ان سے
بے نیاز نہیں دیکھا۔

ایک اور موقع پر جب یزید بن ہارون حدیث کا درس دے رہے تھے طلبہ کو خطاب کر کے
کہنے لگے:

تمہارا پیش نہاد تو بس حدیث سننا اور جمع کر لینا ہے اگر علم تم لوگوں کا
مقصد ہوتا تو حدیث کی تفسیر اور اس کے معانی کی تلاش کرتے اور
ابو حنیفہ کی تصانیف اور ان کے اقوال میں غور کرتے تب حدیث کی حقیقت
تم پر واضح ہوتی لے

اور حافظ عبد اللہ بن داؤد الخریسی فرماتے ہیں:

جو شخص چاہتا ہے کہ نابینائی اور جہالت کی ذلت سے نکلے اور فقہ کی لذت
سے آشنا ہو اس کو چاہیے کہ ابو حنیفہ کی کتابیں دیکھے لے

ان ہی حافظ عبد اللہ بن داؤد الخریسی کا بیان خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے:

عبد اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی نمازوں میں امام ابو حنیفہ
کے لیے دعا کیا کریں کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے فقہ اور سنن کو

محفوظ کر دیا ہے۔

حافظ ابو یعلیٰ خلیلی نے کتاب الارشاد میں امام مرنی کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ امام مرنی، امام شافعی کے بڑے تلامذہ میں سے ہیں اور امام طحاوی کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہیں۔ ایک بار ان سے محمد بن احمد شمرطی نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے ماموں کے خلاف ابو حنیفہ کا مذہب کیوں اختیار کیا۔ امام طحاوی نے فرمایا اس لیے کہ :

میں اپنے ماموں کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ ہمیشہ ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے ہیں لہذا میں نے بھی ان کے مذہب کو اختیار کر لیا۔

یہ ائمہ فقہ و حدیث کی تصریحات اور امام اعظم کی تصانیف کے بارے میں ان کے طرز عمل کی داستان ہے۔ اس سے آپ کتاب الآثار کی ان ائمہ میں جلالتِ قدر اور مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کتاب الآثار کا محدثین پر اثر

کتاب الآثار نے محدثین پر کیا اثر ڈالا اور امام اعظم کے بعد آنے والے محدثین امام اعظم سے اس فن کی تدوین میں کس قدر اثر پذیر ہوئے اس کا ایک معمولی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روایات کی ترتیب اور تبویب کے سلسلے میں امام اعظم نے کتاب الآثار میں جو طریقہ اختیار کیا تھا۔ بعد کے تمام مؤلفین نے اسی کو اپنایا۔ السیوطی کی تصریح کے مطابق مؤطا کی ترتیب اسی کو پیش نظر رکھ کر کی گئی۔ اسی طرح روایات کی صحت کے بارے میں امام اعظم نے جو معیار قائم کیا تھا بعد کے ارباب صحاح نے اختلاف مذاق کے باوجود اس کا پورا پورا خیال رکھا۔ حافظ ابن عدی نے بسند متصل امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ :

ما دخلت فی کتابی الا ما صح۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ میں نے صحیح میں وہ ہی حدیثیں درج کی ہیں جن کی صحت پر اور مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا۔ چنانچہ خود ان کا بیان ہے ۔

انما وضعت ہٰہنا ما اجمعوا علیہ۔

لے تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۴۴۔ لے وفیات الاعیان۔ لے مقدمہ فتح الباری ص ۵۔ لے صحیح مسلم۔

امام اعظم نے روایت سے احتجاج کے بارے میں ان بزرگوں سے پہلے یہ طرز عمل بنایا تھا کہ:
انی اخذ بكتاب الله اذا وجدته فما لم اجده اخذت بسنة
رسول الله صلى الله عليه وسلم والاثار الصحاح عنه
التي فشت في ايدي الثقات۔

میں مسئلہ کو جب کتاب اللہ میں پاتا ہوں تو وہاں سے لیتا ہوں اگر وہاں نہ
میلے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی صحیح حدیثوں سے
لیتا ہوں کہ جو ثقات کے ہاتھوں شائع ہو چکی ہیں۔

امام سفیان ثوری نے امام اعظم کے اس طرز عمل کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے۔

ياخذ بما صح عنده من الاحاديث التي كان يحملها الثقات و
بالآخر من فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور جن کو ثقہ روایت کرتے
ہیں اور جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے وہ ہی لیتے ہیں۔

کتاب الآثار میں ان ہی آثار صحیحہ کو جن کی اشاعت ثقات کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے
جمع کر دیا ہے۔ امام اعظم نے اس کتاب میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا بعینہ وہی طرز عمل امام اعظم
کی پیروی میں السیوطی کی تصریح کے مطابق امام مالک نے مؤطا میں اختیار فرمایا ہے جیسا کہ پیچھے
اشارہ پڑھ آئے ہو کہ مؤطا کو شاہ عبدالعزیز نے اصل وام صحیحین قرار دیا ہے۔ شاہ صاحب
نے عجلہ نافعہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ

صحیح بخاری و مسلم اگرچہ تفصیل کے لحاظ سے مؤطا سے دس گنی ہے
لیکن روایت احادیث کا طریقہ، رجال کی تمیز اور اعتبار و استنباط کا
ڈھنگ مؤطا ہی سے سیکھا ہے۔

اگر بخاری و مسلم نے مؤطا سے سیکھا ہے تو امام مالک نے مؤطا میں امام اعظم کی کتاب الآثار کی
پیروی کی ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ روایات کی ترتیب و تبویب اور صحت کے
بارے میں جو معیار امام اعظم نے قائم کر دیا تھا اس کی سب نے پیروی کی ہے۔ اس لحاظ سے کتاب الآثار

محدثین کی امامیہ ہوئی ہے۔

بتویب اور ترتیب تو بڑی بات ہے محدثین نے نام تک تجویز کرنے میں امام اعظم کی تقلید کی ہے۔ چنانچہ امام طبرسی نے اپنی کتاب کا نام تہذیب الآثار، حافظ ابو جعفر طحاوی نے معانی الآثار، کل الآثار، امام شلبی نے تصحیح الآثار رکھا۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ کتاب الآثار سے پہلے حدیث کی کوئی کتاب ابواب پر مرتب نہیں تھی۔ کتاب الآثار تصنیف ہوئی تو حدیث کی بتویب کا رواج شروع ہوا اور چونکہ اس میں بتویب کے ساتھ صحیح روایات درج کرنے کا التزام تھا اس لیے بعد میں ابواب پر تصنیف کے لیے بھی ضروری ہو گیا کہ صحیح روایات درج کتاب کی جائیں۔ چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں:

ان المصنف علی الابواب انما یورد اصح ما فیہ لیصلح الاحتجاج

ابواب پر تصنیف کرنے والا اس مضمون کی صحیح تر وہ روایات لاتا ہے

بحولائق استدلال ہوں گے

ان تصریحات سے آپ کو اتنی بات کا ضرور اندازہ ہو گیا ہو گا کہ حسن ترتیب، ہودت تالیف، محنت روایات اور ان کے انتخاب میں کتاب الآثار نے بعد میں آنے والے مصنفین کے لیے میا چھانقش قدم چھوڑا ہے۔

کتاب الآثار کی علمی خدمت

حدیث کی دوسری کتابوں کی طرح کتاب الآثار کی بھی علمی خدمت کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ امام اعظم کے اساتذہ میں سے ہر استاد کی مرویات کو یکجا کر کے اس کو مسند ابی حنیفہ کے نام سے موسوم کر دیا ہے اور علامہ خوارزمی نے ان سب مسانید کو یکجا کر کے جامع المسانید نام رکھا ہے ورنہ یہ مسانید امام اعظم کی تصنیف نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن علی بن مرہ الحسینی نے التذکرہ برجال العشرہ میں لکھا ہے کہ

مسند الشافعی موضوع للادلة علی ما صح عندہ من مرویاتہ و

کذا لک مسند ابی حنیفہ گے

مسند امام شافعی ان دلائل پر مشتمل ہے جو امام موصوف کی روایات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں اور یہی حال مسند ابی حنیفہ کا ہے۔

یعنی مسند شافعی کی طرح مسند ابی حنیفہ بھی ان دلائل پر مشتمل ہے جو امام ابو حنیفہ کی روایات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ یہ حسینی حنفی نہیں بلکہ مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں اور ان کا شمار محدثین میں نہیں بلکہ حفاظ وقت اور ناقدینِ قرن میں ہے۔ ان کا مبسوط ترجمہ حافظ ابن فہد نے لحظہ الالحاظ میں اور حافظ سیوطی نے ذیل طبقات الحفاظ میں لکھا ہے۔ حافظ ابن فہد نے لکھا ہے۔

كان رضى النفس حسن الاخلاق من الثقات الاثبات اماماً مؤرخاً
حافظاً له قدر كبير له

حافظ منطاطی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن رافع اور حافظ حسینی معاصر ہیں۔ حافظ حسینی کی کتاب التذکرہ برجال العشرہ بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ اس میں جن دس کتابوں کے رجال مذکور ہیں وہ ائمہ اربعہ فقہ مجتہدین اور ائمہ ستہ حدیث کی کتابیں ہیں۔ چنانچہ حافظ سیوطی فرماتے ہیں۔
الف التذکرۃ فی رجال العشرۃ الکتب الستۃ والموطا والمسند
ومسند الشافعی وابی حنیفہ۔

مشہور محدث محمد بن جعفر المکتفی رقمطراز ہیں:

فهذه كتب الائمة الاربعۃ وباضافتها الى الستۃ الادنی تکمل
الکتب العشرۃ التي هي اصول الاسلام وعليها مدار الدين۔

الغرض مسانید امام اعظم کی تالیف نہیں بلکہ ان کی حیثیت وہی ہے جو فی الواقع محدثین کے عرف میں مسند کی ہوتی ہے جیسے مسند ابی بکر، مسند فاروق اعظم۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ بستان المحدثین میں فرماتے ہیں۔

پس نسبت ایں مسند بحضرت امام اعظم ازیں باب است کہ مثلاً مسند ابی بکر
را از مسند احمد نسبت بحضرت ابی بکر نمایم۔

۱۔ لحظہ الالحاظ ص ۱۵۔ ۲۔ ذیل طبقات الحفاظ ص ۶۵۔ ۳۔ الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۸
۴۔ بستان المحدثین ص ۶۳۔

البواب اور مسانید میں فرق

البواب اور مسانید میں فرق یہ ہے کہ بتوسیع کی صورت میں احادیث کو مضامین کی رعایت سے بابوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نماز کی جداگانہ، روزہ کی علیحدہ، زکوٰۃ کی الگ حدیثیں الگ بابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ اور مسانید میں حدیث کا تعلق خواہ کسی موضوع سے ہو ہر صحابی کی ساری روایات کو بلا لحاظ مضمون ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابو بکر کی ساری حدیثیں مسند ابی بکر میں درج کی جاتی ہیں۔ چاہے ان حدیثوں کا کسی بھی موضوع سے تعلق ہو۔

البواب و مسانید میں ایک یہ بھی لطیف فرق ہے مصنفین البواب کے پیش نظر وہ روایات ہوتی ہیں جن کی حیثیت روایتی طور پر اعتباری اور استدلالی ہو یعنی عموماً ان روایات کا ذکر کرتے ہیں جو مسئلہ کے لیے احتجاج یا استشہاد کے قابل ہوں۔ اس کے برعکس ارباب مسانید کا کام صرف روایات کو جمع کرنا ہوتا ہے اس لیے وہ بہ نسبت مصنفین البواب کے میدان تصنیف میں ذرا آزاد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسانید میں صحیح اور غیر صحیح روایات کا انبار نظر آتا ہے۔ محدث حاکم نیشاپوری لکھتے ہیں:

البواب و مسانید میں فرق یہ ہے کہ مسانید کی صورت میں شرط یہ ہے کہ مصنف اس طرح عنوان قائم کرے۔ ذکر ماورد عن ابی بکر عن النبی۔ اس صورت میں مصنف کا فرض ہے کہ حضرت ابو بکر کی ساری حدیثوں کی تخریج کرے چاہے وہ صحیح ہوں یا ضعیف۔ اور البواب کا مصنف عنوان اس طرح لکھے گا۔ ذکر ماصح و ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الطہارۃ او الصلوٰۃ او غیر ذلک۔^۱

حافظ ابن حجر عسقلانی ارقام فرماتے ہیں:

البواب پر حدیث کی تصنیف کا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف ان روایات تک محدود رکھا جائے جن میں احتجاج و استشہاد کی صلاحیت ہو۔ برخلاف مسانید کے کہ ان میں پیش نہاد صرف احادیث کی فراہمی ہوتا ہے۔^۲

^۱ المدخل فی اصول الحدیث ص ۴، ۵۔ ^۲ تجلیل المنفعة ص ۲

بہر حال یہ شرف امام اعظم ہی کو حاصل ہے کہ صحابہ اور تابعین کے انداز پر ان کے مسانید ترتیب دیے گئے ہیں یوں تو محدثین اور حفاظ حدیث بہت گزرے ہیں مگر بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جن کی احادیث و روایات توجہ کا ایسا مرکز رہی ہوں اور اس کثرت سے ان کی مرویات پر قلم حرکت میں آئے ہوں۔ اسی حقیقت کی طرف جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اشارہ کیا ہے۔

ایں مسند در حقیقت تالیف او نیست بلکہ دیگران بعد ایشاں مرویات
ایشاں راجع منودہ اندلہ
در حقیقت یہ مسند ان کی تصنیف نہیں ہے بلکہ آپ کے بعد اوروں نے
ان کی مرویات کو یکجا کیا ہے۔

جن محدثین و حفاظ حدیث نے امام اعظم کی مرویات کو یکجا کیا اور ان کے نام سے مسانید ترتیب دیے ہیں وہ خود اپنی جگہ اتنا اوسچا مقام رکھتے تھے کہ ان کی سندیں لکھی جائیں مگر اس کے باوجود انہوں نے امام اعظم کی مرویات کو جمع کرنے کا کام سنبھالا۔
انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو مشہور عارف عید الوہاب کا مسانید امام کے بارے میں یہ بیان پڑھیے۔

مجھ پر اللہ سبحانہ کا بڑا ہی احسان ہے کہ مجھے امام اعظم کے مسانید کا ان کے صحیح نسخوں سے مطالعہ کرنے کی توفیق ملی۔ ان نسخوں پر حفاظ حدیث کے قلم سے تحریریں تھیں جن میں آخری شخص حافظ دمیاطی ہیں، مطالعہ میں میں نے محسوس کیا کہ امام ممدوح ان تابعین کبار سے حدیثیں روایت کرتے ہیں جو اپنے وقت کے بزرگترین عادل اور ثقہ تھے اور جو حدیث نبوی کی تصریح کے مطابق خیر القرون کے لوگ تھے مثلاً اسود، علقمہ، عطاء، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ، اس لیے وہ تمام حضرات جو امام ابو حنیفہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں سب کے سب عادل اور برگزیدہ ہیں ان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کذاب ہو

یا جس پر کذب کی تہمت ہو۔ اے پروردگار! ان کی عدالت کے لیے تو یہی کافی ہے کہ امام ممدوح نے باوجود بے حد ورع و احتیاط ان کے حضرات کو اس غرض کے لیے منتخب کیا ہے کہ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ :-

اذ کل حدیث وجدناہ فی مسانید الامام الثلاثۃ فهو صحیح۔
 امام اعظم کے مسانید سے گمانہ کی ہر حدیث ہمارے نزدیک صحیح ہے۔
 ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسانید امام کا متحدین و حفاظ کے یہاں کیا مقام ہے اور خود امام اعظم حدیث میں کس حیثیت کے مالک ہیں؟
 ایسے کچھ ان حفاظ حدیث کو بھی پڑھ لیجئے جنہوں نے امام اعظم کی مرویات کو مسند کی صورت میں مدون کیا ہے۔

۱۔ حافظ محمد بن محمد دوری

ان کی کنیت ابو عبد اللہ اور والد کا نام محمد ہے تذکرۃ الحفاظ میں محمد کی جگہ احمد غلط طبع ہو گیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں اور حافظ ذہبی نے دول الاسلام میں محمد ہی بتایا ہے۔ عطاء کی نسبت سے مشہور ہیں۔ حدیث میں ابو خذافہ السہمی، الحسن بن عرفہ، یعقوب دورقی، امام مسلم اور دوسرے محدثین کے سامنے زانوائے ادب تہ کیا ہے بہت زیادہ صاحب التصانیف ہیں۔ منجملہ دیگر تصانیف کے امام اعظم کی مرویات کو مستقل کتابی صورت میں علیحدہ جمع کیا ہے اور اس کا نام بھی ”جمع حدیث ابی حنیفہ“ رکھا ہے۔ اس تالیفی کارنامہ کا تذکرہ محدث خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

روی عنہ محمد بن محمد الدوری فی جمعه حدیث ابی حنیفہ۔^۱

ان سے محمد بن محمد نے اپنے مجموعہ میں حدیث ابی حنیفہ روایت کی ہے
 یہ مشہور محدث امام دارقطنی کے استاد حدیث ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کی شہرت

۱۔ لکھ المیزان البکری ج ۱ ص ۶۸۔ لکھ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۸۸۔

کا بار بار اعلان کیا ہے اور لکھا ہے کہ فی تاریخ بغداد لہ ترجمۃ ملیحۃ تاریخ بغداد میں ان کا
شناہد ترجمہ ہے لے حافظ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ صرف
کثیر التصانیف محدث ہی نہیں بلکہ تین چیزوں میں خاص شہرت رکھتے ہیں :

کان معروفاً بالثقة والصلاح والاجتهاد في الطلب -

ثقافت، صلاحیت اور تلاش و جستجو کے لیے محنت میں مشہور تھے لے

امام ابو داؤد کے بھی بلا واسطہ شاگرد ہیں سنن ابو داؤد کے بارے میں ان کا ایک بیان
حافظ عسقلانی نے تہذیب میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ :

امام ابو داؤد کی ایک لاکھ حدیثوں کا مذاکرہ کرنے کے لیے جب آپ نے
کتاب السنن تصنیف کی اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھا تو محدثین کے
لیے ان کی کتاب قرآن کی طرح قابل اتباع ہو گئی اور اس دور کے سب
ہی محدثین نے امام موصوف کو حافظ وقت مانا ہے لے

ان کی تاریخ وفات حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور دول الاسلام میں اور حافظ عسقلانی
نے لسان المیزان میں ۳۳۱ھ لکھی ہے۔ ستانوے سال کی عمر پائی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی
فرماتے ہیں کہ اسناد حدیث میں اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے لے

۲: حافظ ابو العباس احمد بن محمد بن سعید

حافظ ابن عقدہ کے نام سے مشہور ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا بسوط ترجمہ
لکھا ہے اور ان کے چہرے کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے -

اليہ المنتہی فی قوتہ الحفظ و کثرة الحدیث

قوت حافظہ اور حدیث کی بہتات میں بس ان پر حد ہے -

ان کے حافظ ہونے کے بارے میں حافظ دارقطنی کا تاثر یہ تھا کہ کوفہ کے تمام شہری
اس پر متفق ہیں کہ زمانہ ابن مسعود سے آج تک ابن عقدہ سے زیادہ حافظ کوئی نہیں ہوا ہے

لے تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن مخلد - لے تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۰ - لے تہذیب ج ۲ ص ۲۲

لے تہذیب ج ۲ ص ۲۴۷ - لے تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۵ -

حافظ ابن الجوزی رقمطراز ہیں کہ ابن عقدہ اکابر حفاظ میں سے تھے اور ان کے سامنے اکابر محدثین
حافظ ابو بکر الجعفی، حافظ عبد اللہ بن عدی، امام طبرانی، ابن المظفر، دارقطنی اور ابن شہابین
نے زانوئے ادب نہ کیا ہے بلکہ حافظ عسقلانی رقمطراز ہیں کہ امام ابو علی الحافظ فرماتے ہیں میں
نے ابو العباس سے زیادہ کوفیوں میں کوئی حافظ نہیں دیکھا ہے آپ سے دریافت کیا گیا کہ
پچھ لوگ تو ادھر ہی کچھ کہتے ہیں فرمایا ابن عقدہ اس سے کہیں بالا ہیں وہ امام ہیں۔ ان کا
تھام یہ ہے کہ ان سے تابعین اور اتباع تابعین کے بارے میں دریافت کیا جائے
ان کے متعلق کسی کو یا رائے سخن نہیں ہے بلکہ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ زعفرانی کا
یہاں ہے کہ ابن عقدہ کے زمانے میں بغداد میں ابن صاعد نے ایک حدیث غلط سند سے
بیش کردی۔ حافظ ابن عقدہ نے اس پر گرفت کی ابن صاعد کے ساتھیوں نے ہلٹر مچا دیا
ت حکومت تک پہنچ گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابن عقدہ نذرندان ہو گئے۔ لیکن علی بن عیسیٰ زیر
نے دونوں فریق کو اس پر راضی کر لیا کہ اس معاملہ میں کسی کو جج تسلیم کر لیا جائے فریقین کی
ضامنہ سے ابن ابی حاتم تجویز ہو گئے معاملہ کی پوری روداد لکھ کر ابن ابی حاتم کو بھیج
دی گئی وہاں سے جو فیصلہ آیا وہ وہی تھا جو حافظ ابن عقدہ فرماتے تھے۔ معاملہ رفع دفع
ہوا اور رہائی ہوئی بلکہ امام بخاری کی کتاب تاریخ کے اس قدر دلدادہ تھے فرماتے تھے کہ اگر
ایک شخص تیس ہزار احادیث بھی لکھ لے پھر بھی وہ محمد بن اسماعیل کی کتاب تاریخ سے
بے نیاز نہیں ہو سکتا بلکہ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ بخاری
در مسلم میں زیادہ حافظ کون ہے۔ فرمایا دونوں ہی عالم ہیں۔ پھر یہی بات بار بار دہرائی گئی
رہا کہ امام بخاری سے شام والوں کے بارے میں غلطیاں ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے ان کی
تالوں سے مدد لی ہے اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کنیت کے ساتھ ایک شخص کا
کر ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کا نام آتا ہے تو امام موصوف اس کو وہ شخص سمجھ لیتے
ہیں لیکن امام مسلم کے غلط میں غلطی بہت ہی کم ہے کیونکہ انہوں نے صرف مسند حدیثیں ہی لکھی ہیں
حافظ بدر الدین عینی نے تاریخ بکیر میں ان کے بارے میں یہ فقہی انکشاف کیا ہے۔

۱۔ المنتظم تاریخ الملوک والامم ج ۲ ص ۳۳۷۔ ۲۔ لسان المیزان ج ۱ ص ۱۶۵۔ ۳۔ تاریخ بغداد ترجمہ ابن عقدہ
۴۔ الاعلان بالتوہیح ص ۲۱۸۔ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۰۔

ان مسند ابی حنیفہ لا بن عقدہ یحتوی وحدہ علی مایزید علی
الف حدیث ۔

صرف ابن عقدہ والے مسند ابی حنیفہ کی احادیث ایک ہزار سے زیادہ ہیں۔
ان کی تاریخ وفات حافظ ذہبی نے دول الاسلام تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن الجوزی
المستظلم میں ۳۳۲ھ قرار دی ہے ۔

۳۔ حافظ عبد اللہ الحارثی

امام علامہ حافظ الحدیث حارثی بخاری جن کو دربارِ علم سے فنِ حدیث میں عبد اللہ الاستاذ کا ممتا
خطیب ملا تھا۔ علمِ حدیث کے لیے آپ نے خراسان، عراق اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا
اور بہت سے شیوخِ وقت سے علم حاصل کیا۔ حافظ سمعانی نے الانساب میں لکھا ہے کان شیخ
مکثراً من الحدیث بڑے کثیر الحدیث شیخ تھے اور حافظ خلیلی فرماتے ہیں یعرف بالاستاد
لہ معرفۃ بهذا الشان استاد سے مشہور ہیں اور علم الحدیث کی ان کو معرفت حاصل ہے۔ اور
حافظ ذہبی نے قاسم بن اصبح کے ترجمہ میں بضمن و قیات ۳۷۲ھ ان کا ذکر شاندار لفظوں میں
کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

فیہا مات عالم درء النہر ومحدث الامام العلامة ابو محمد
عبد اللہ بن محمد بن یعقوب الحارث الحارثی البخاری المقلب
بالاستاد جمع مسند ابی حنیفۃ الامام ۳۷۲ھ

یہ کس شان کی سند ہے؟ اس کے متعلق خوارزمی جامع المسانید میں لکھتے ہیں :
من طالع مسند الذی جمعہ للامام ابی حنیفۃ علم تبحرہ فی
علم الحدیث و احاطتہ بعرفۃ الطرق والمتون ۳۷۲ھ
جس شخص نے ان کی مسند ابی حنیفہ کا مطالعہ کیا ہے اسے ان کے علمی تبحر کا اندازہ
ہو جاتا ہے ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس مسند کا تذکرہ کیا ہے ۔

۱۔ تانیب الخطیب ص ۱۵۹۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ۲ ترجمہ قاسم بن اصبح۔ ۳۔ جامع المسانید خوارزمی

قد اعتنى الحافظ ابو محمد الحارثي وكان بعد الثلاثمائة بحديث ابى حنيفة فجمعه في مجلدات ورتبه على شيوخ ابى حنيفة له
حافظ ابو محمد حارثي۔ نے توجہ فرمائی اور سترہ کے بعد حدیث ابی حنیفہ
جمع کی ہے اور ان کو شیوخ ابی حنیفہ پر ترتیب دیا ہے۔

بڑے بڑے حفاظ جیسے حافظ ابن مندہ، حافظ ابن عقدہ، حافظ جعابی فن حدیث میں آپ کے شاگرد ہیں حافظ عبد القادر فرماتے ہیں کہ ان کی تصانیف میں مسند ابی حنیفہ کے ساتھ کشف الآثار فی مناقب ابی حنیفہ بھی ہے۔ اس دور کی علمی و لکھنویوں کے بارے میں یہ بات آج بڑی حیرت سے سنی جاتے گی کہ موصوف جب اپنی مشہور تصنیف کشف الآثار املا کرتے تھے تو آپ کی مجلس املا میں چار سو مستمل ہوتے تھے۔ خیال فرمائیے کہ جب امام اعظم کے مناقب کے املا میں یہ تعداد ہوتی تھی تو آپ کی مسند کے درس میں خدا جانے یہ تعداد کہاں سے کہاں جا پہنچی ہوگی۔

امام حارثی کی اس مسند کا شاہ عبدالعزیز نے بستان المحدثین میں ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے
اول مسند حافظ الحدیث عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی۔ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں اس
مسند کا تذکرہ کیا ہے کہ جمع مسند الابی حنیفۃ۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے مشہور رسالہ الانتباہ میں حافظ حارثی کو اصحاب الوجہ میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانے میں فقہاء و احناف کا مرجع تھے۔ اصحاب الوجہ کا
درجہ مجتہد فی المذہب اور مجتہد منتسب کے درمیان ہوتا ہے۔ فقہ کی تحصیل آپ نے امام ابو حفص
منیر سے کی تھی۔

علامہ خوارزمی ان کی مسند کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ۔
روایتی طور پر مجھے باقاعدہ وقت کے چار اماموں کی وساطت سے یہ مسند ملی ہے۔
اول: خطیب جمال الدین ابو الفضائل عبدالکریم بن عبدالصمد الانصاری۔
دوم: شیخ صفی الدین اسماعیل بن ابراہیم۔

سوم: شمس الدین یوسف بن عبداللہ۔
چہارم: شیخ ابوبکر بن محمد بن عمر فرغانی۔

۴۔ حافظ محمد بن ابراہیم الاصفہانی

محمد بن ابراہیم نام اور البکر کنیت ہے۔ ابن المقرئ کر کے مشہور ہیں حافظ ذہبی نے ان کو تذکرۃ الحفاظ میں محدث اصفہان الامام الرجال الحافظ الثقات کے القاب سے، ان کا ترجمہ شروع کیا ہے بڑے پائے کے محدث ہیں چار مرتبہ مشرق و مغرب کا صرف حدیث کی خاطر سفر کیا ہے۔ اصفہان، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تسع مکہ، قدس، دمشق، صیداء، بیروت، عکا، رملہ، واسط، حمص، مصر وغیرہ تمام ہی شہروں میں حافظ ذہبی نے ان کے اساتذہ کی نشاندہی کی ہے ان کے سامنے بڑے بڑے اجلہ محدثین نے زانوئے شاگردی نہ کیا ہے مثلاً ابوالشیخ اصفہانی، ابوبکر بن مردویہ، حمزہ السہمی، ابوالنعمان الاصفہانی وغیرہ وغیرہ۔ حافظ ابوالنعمان اصفہانی کی ان کے باپ سے میں رائے ہے۔

محدث کثیر ثقة صاحب مسانید سمع مالا یحصى کثرة

حافظ ذہبی نے ان کے طلب علم حدیث کی داستان کا خود ان کی زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ میں طبرانی اور ابوالشیخ مدینے میں قیام پذیر تھے۔ تنگ حالی کے ہاتھوں لاچار تھے۔ پورا دن گزر گیا کھانے کو کچھ نہ ملا میں عشا کے وقت حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! بھوک لگی ہوئی ہے۔ طبرانی نے میرے سے کہا کہ بیٹھ جاؤ اب کھانا آئے گا یا موت آئے گی۔ میں اور ابوالشیخ کھڑے تھے کہ دروازے پر شیخ علوی نے دستک دی ہم نے دروازہ کھولا۔ تو ان کے ساتھ کھانے کے دو ناشتہ دان دو لڑکے لیے ہوئے آئے تھے۔ فرماتے لگے تم نے میری حضور النور سے شکایت کی ہے۔ میں نے حضور النور کو ابھی ابھی خواب میں دیکھا ہے آپ نے مجھے کھانا پہنچانے کا حکم دیا ہے۔

حافظ ابن مقرئ صاحب بن عباد کے لا بریرین رہ چکے ہیں۔ کسی نے اصحاب دریافت کیا کہ آپ ادیب ہو کر ابن المقرئ جیسے محدث سے محبت رکھتے ہیں۔ فرمایا دو وجہ سے۔ اول اس لیے کہ ان کے میرے والد سے دوستانہ تعلقات تھے۔ دوسرے اس لیے کہ میں ایک روز سو رہا تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تو سو رہا ہے اور دروازے پر ایک اللہ کا ولی کھڑا ہے۔ میں بیدار ہوا اور ملازم کو آواز دے کر کہا کہ دیکھو

دروازے پر کون ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ابو بکر بن المقری ہیں۔ حافظ ذہبی نے ہی یہ بھی بتایا ہے۔
قد صنف مسند ابی حنیفۃ۔^۱

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ان کے مسند کا ذکر کیا ہے۔

و کذا اللک خرج المرفوع منه الحافظ ابو بکر بن المقری۔^۲

اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی یہ مسند حارثی کی مسند سے چھوٹی ہے۔ حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوزیع میں یہ بھی لکھا ہے کہ حافظ زین الدین قاسم بن فطویریؒ نے حافظ ابن مقری کی اس مسند کے رجال پر ایک کتاب لکھی ہے۔^۳ ماہ شوال ۳۸۱ھ میں بصرہ ۵۶ سال ان کا انتقال ہوا ہے۔^۴

۵۔ حافظ ابوالحسن محمد بن المنظر

عراق، جزیرہ، مصر اور شام کے اساتذہ مشائخ سے چودہ سال کی عمر ہی میں علم حدیث حاصل کرنا شروع کر دیا۔ حافظ ابن شاپین، حافظ دارقطنی، حافظ ابو نعیم، حافظ مالینی اور حافظ کبرقانی جیسے اساطین و ارکان علم حدیث نے ان کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں ایسا نمایاں حصہ لیا کہ حافظ ذہبی نے بھی ان کی فن کاری کا اعتراف کیا۔

جمع والف عن مطابق هذا الفن لم يتخلف۔^۵

خطیب بغدادی نے ان کی صداقت اور فہم و حفظ کو سراہا ہے۔ دارقطنی نے ان سے ہزار ہا حدیثیں لکھی ہیں۔ قاضی محمد بن عمر کا بیان ہے کہ حافظ دارقطنی حافظ ابن المنظر کا بیحد اکرام کرتے تھے ان کی موجودگی میں سہارے سے نہ بیٹھتے تھے۔^۶

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حدیث کے لیے رخت سفر باندھا تو اس سفر میں حافظ ابو جعفر طحاوی سے حدیث کا سماع کیا۔ ابن ابی الفوارس کہتے ہیں کہ ان کی ثقافت، امانت اور حسن حافظہ ہی قابلِ داد نہیں بلکہ لکھا ہے کہ انتھی الیہ الحدیث وحفظہ و علمہ حدیث حدیث کا علم، حدیث کا حفظ بس ان پر ختم ہے۔ حافظ کا عالم یہ تھا کہ حافظ ابن ابی الفوارس

^۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۲۔^۲ تعجیل المنفعتہ ص ۶۔^۳ الاعلان بالتوزیع ص ۱۱۷۔

^۴ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۳۔^۵ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۷۸۔^۶ تذکرۃ الحفاظ۔

^۷ لسان المیزان ج ۵ ص ۳۸۳۔^۸ تذکرۃ الحفاظ ص ۷۸۔

سے ایک بار ان سے ایک روایت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس روایت کا تعلق حدیث یا بخاری
از ابن زید از عمرو بن عاصم سے تھا فرمایا میرے پاس نہیں۔ سائل نے عرض کیا کہ دیکھ لیجئے شاید
ہو فرمایا اگر ہوتی تو مجھے یاد ہوتی۔ میرے پاس اس راوی کی صرف ایک لاکھ حدیثیں ہیں لیکن ان
میں یہ سلسلہ سند نہیں ہے۔

حافظ عسقلانی نے ان کی تصانیف میں مسند ابی حنیفہ کا بھی تذکرہ کیا ہے یہ ان کی تاریخ وفات
۳۷۹ھ ہے۔ علامہ خوارزمی رقمطراز ہیں کہ اس مسند کی مجھے ان مشائخ سے اجازت ملی ہے۔ اول
محمی الدین ابو محمد یوسف بن عبدالرحمن بن الجوزی، دوم شیخ ابوالمنظر یوسف بن علی بن حسین سوم
علی بن معالی، چہارم شیخ عبداللطیف، علم حدیث اور حفظ حدیث میں اپنے دور کی ایک
مثالی شخصیت تھے۔

۶۔ حافظ ابو عبد اللہ حسین بن محمد

پورا نام حسین بن محمد بن خضر بلخی ہے۔ حافظ ابن عساکر کے اساتذہ ہیں سے ہیں۔ حافظ ذہبی
نے ان کو محدث مکرر کہا ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حافظ سمعانی نے جو تاریخ بغداد کا
ذیل لکھا ہے۔ اس میں ایک بمسوط ترجمہ ہے اور بتایا ہے کہ امام موصوف مفید بغداد ہیں۔
بہت سے مشائخ وقت سے حدیث کا استفادہ کیا ہے پھر مشائخ کے نام گنائے ہیں اور تفصیل
کے بعد لکھا ہے:

و بالغ فی الطلب حتی سمع من طبقة دون هؤلاء و کتب اکثر
من الكتب لنفسه و لغيره و کان مفید اللغز با و جمع مسند
ابی حنیفة۔

طلب و تلاش میں بڑی محنت کی ہے تاکہ ان سے کمر طبقہ سے روایت
کیا اور بہت سی کتابیں اپنی اور دوسروں کی لکھیں اور غبار کے لیے
مفید تھا اور مسند ابی حنیفہ جمع کیا۔

حافظ عبد القادر قرشی نے ان کے بارے میں ابن النجار کے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اپنے وقت

کے بغداد میں اہل عراق کے فقیہ تھے اے حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ ان کی مسند امام حارثی اور حافظ ابن مقرئ کی مسند سے بڑی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :
وفی کتابہ زیادات علی ما فی کتابی الحارثی وابن المقرئ اے
اور ان کی کتاب میں حارثی اور ابن المقرئ کی کتابوں کے مقابلے میں
زیادتی ہے۔

حافظ شمس الدین ابوالحسن محمد بن علی حسینی نے صحاح ستہ، مسند ثنائی، مسند احمد، مسند ابی حنیفہ کے رجال پر جو کتاب لکھی ہے جس کا نام التذکرہ برجال العشرہ ہے اس سلسلے میں حافظ حسینی نے جس مسند کا انتخاب کیا ہے وہ بھی حافظ خسرو بلخی کی مسند ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں :

اما الذی اعتمدہ الحسینی علی تخریج رجالہ، فهو مسند ابن خشر و
جس مسند پر تخریج رجال پر اعتماد کیا ہے وہ مسند ابی حنیفہ ہے
ان کی تاریخ وفات ۵۲۲ھ ہے۔

۱۷۔ حافظ ابوالنعمان الاصفہانی

پورا نام احمد بن عبد اللہ بن احمد الاصفہانی اصفہانی ہے وقت کے مشائخ کے سامنے زانوئے
ادب تکیا ہے جن اساتذہ نے ان کو پروانہ تخریث مرحمت فرمایا ہے ان میں واسط، نیشاپور، شام
اور بغداد کے محدثین کرام ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جملہ
لکھا ہے کہ

اجازلہ مشائخ الدنیا اے

دنیا کے سارے اساتذہ نے ان کو اجازت دی ہے۔
اور اس پر لطف یہ ہے کہ ان کی تاریخ ولادت اگر ۳۲۶ھ ہے تو یہ اجازت نامے ان کو
۳۵۰ھ سے پہلے ہی چوبیس سال کی عمر میں مل گئے۔ جتنے اکابر سے ان کو ملاقات کا شرف
حاصل ہے کسی محدث کو نہیں ہے۔ ان کے سامنے حفاظ حدیث میں سے خطیب بغدادی،

ابوصالح المؤذن، ابوعلی الوحشی، ابو الفضل احمد حداد اور ان کے برادر ابوعلی الحسن الحداد المقری نے زانوئے شاگردی تکمیل کیا ہے۔ حافظ ابن مردودہ کہتے ہیں ہر سمت سے لوگ سمٹ سمٹ کر حدیث کی خاطر ان کے پاس آتے۔ ان کے وقت میں ان سے زیادہ حافظ دنیا کے کسی گوشہ میں نہ تھا۔ صاحب تصانیف ہیں۔ ان کی کتاب حلیۃ الاولیاء کے بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ لحد یصنف مثلاً اس جیسی پہلے کوئی تصنیف نہیں ہے۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں ان کے اس مسند کو جو انہوں نے مسند ابی حنیفہ کے نام سے تالیف کیا ہے۔ حافظ ابوعلی الحسن المقری الحداد کی وساطت سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابوعلی اور ان کے برادر حافظ ابو الفضل کا حافظ ذہبی نے تذکرے میں حافظ ابو نعیم کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابو نعیم کے اس مسند ابی حنیفہ کا مقدمہ میں علامہ زاید کوثری نے تذکرہ کیا ہے۔

۸۔ حافظ ابن ابی العوام

حافظ ابو القاسم عبد اللہ بن محمد بن ابی العوام السعدی ان کا پورا نام ہے۔ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی اور حافظ ابو جعفر طحاوی کے شاگرد ہیں۔ مصر میں عہدہ قضا پر فائز ہے امام ابو حنیفہ کے مناقب میں ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ مسند ابی حنیفہ اسی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ ان کی تاریخ وفات ۳۲۷ھ ہے۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں ان کے مسند کا تذکرہ کیا ہے اور دوسرے مسانید کے ساتھ اس کی بھی تحریر کی ہے۔

۹۔ حافظ ابن عدی

پورا نام ابو احمد عبد اللہ بن عدی الجرجانی المعروف بابن القطان ہے ۳۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۵ھ میں وفات پائی ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے چہرے کا آغاز الامام الحافظ ابی بکر کہہ کر کیا ہے۔ فن جرح و تعدیل میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ اس فن میں ان کی کتاب الکامل فی الجرح والتعدیل اس پایہ کی کتاب ہے کہ محدث حمزہ نے ایک بار امام دارقطنی سے درخواست کی کہ آپ ضعیفہ پر ایک کتاب لکھ دیجئے دارقطنی نے کہا کیا تمہارے پاس ابن عدی کی کامل نہیں ہے فرمایا کہ ہے جواب دیا کہ بس اس پر اضافہ نہیں ہو سکتا۔

جرح و قدح میں ان کے قلم کی بے باکی سے اکثر نالاں ہیں اور بہتوں کو ان کی اس باب میں بے انصافیوں کی شکایت بھی ہے۔ مولانا عبدالحی نے الرفع والتکمیل میں اس پر تفصیلی کلام کیا ہے احناف ان کے مذہبی تعصب کے نشتروں کا خاص طور پر نشانہ بنے ہیں چنانچہ امام اعظمؒ اور ان کے ساتھیوں پر بڑی دلیری سے جو کچھ مٹنے میں آیا ہے لکھ دیا ہے۔ اس کے باوجود امام اعظم کے مندر کے راوی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کا اولین حال یہی تھا لیکن حافظ ابو جعفر طحاوی سے شرف تلمذ کے بعد ان میں انقلاب آگیا۔ شاید اسی کے کفارہ میں مسند ابی حنیفہ تصنیف کی لیے حدیث میں امام نسائی اور امام یعلیٰ موصلی کے شاگرد ہیں اور ان سے بڑے بڑے اجلہ محدثین نے استفادہ کیا ہے مثلاً حافظ ابن عثمدہ اور حافظ حمزہ السہمی وغیرہ۔ مشہور ملک عیسیٰ بن ابی بکر البیہقی نے حافظ ابن عدی کی مسند کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

ذکر ابن عدی صاحب کتاب الجرح والتعديل فی مسند ابی حنیفہ
فی صدر الکتاب فی مناقب ابی حنیفہ باسنادہ ۲۵

۱۰۔ حافظ ابوالحسن اثنسانی

قاضی ابوالحسن عمر بن الحسن بن علی پور نام ہے حافظ اثنسانی سے شہرت رکھتے ہیں بڑے پایہ کے جلیل القدر محدث اور حافظ حدیث تھے۔ حافظ ابو علی جو دارقطنی کے شیخ تھے۔ ان کی ثقاہت کا لوہا مانتے تھے۔ انہوں نے امام اعظم کی جو مسند لکھی ہے محدث خوارزمی نے اس سے جامع المسانید میں حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان کی تاریخ وفات ۳۹۰ھ ہے۔

۱۱۔ حافظ ابوبکر بن عبدالباقی

قاضی ابوبکر محمد بن عبدالباقی بن محمد الانصاری الحلبی ابن رازا المعروف بقاضی المرتسان حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں شیخ الاسلام ابوالقاسم اسماعیل اصفہانی کے تذکرے میں ۵۳۵ھ کی وفیات کے سلسلے میں ان کا ذکر مذکورہ بالا الفاظ میں کیا ہے۔ طبقات الخما بلہ میں ان کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ حافظ ابن النجار نے تاریخ بغداد کے ذیل میں ان کے حالات لکھے ہیں اور ان کے

اساتذہ کے تذکرے میں بتایا ہے کہ طلب علم کی خاطر مکہ اور مصر بھی تشریف لے گئے اور مکہ میں مشہور محدث ابو معشر عبد الکرم بن عبد الصمد المقرئ الشافعی سے بھی حدیث کا سماع کیا ہے۔ یاد رہے کہ ابو معشر عبد الکرم ان محدثین میں سے ہیں جنہوں نے امام اعظم کی احادیات پر مستقل تصنیف چھوڑی ہے چنانچہ المکتافی رقمطراز ہیں:

جزء الاستاذ ابی معشر عبد الکرم بن عبد الصمد المقرئ الشافعی صاحب
القضايف المجاور بکمة المتوفى ۳۸۸ھ ذکر فیہ ما رواه ابو حنیفة
من الصحابة ۱ھ

اور یہ رسالہ المعجم المفہرس میں حافظ عسقلانی کی مرویات میں سے ہے۔ محدث خوارزمی نے جامع المسانید میں لکھا ہے کہ:

ھو جمع مسند الابی حنیفة ۲ھ

اگرچہ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں حافظ ابن خسر کے ترجمہ میں اس کے ماننے سے انکار کیا ہے لیکن ان کے نامور شاگرد حافظ شمس الدین السخاوی ان کی مسند کو بسند ذیل روایت کرتے ہیں:

عن التدمری عن المیدونی عن النجیب عن ابن الجوزی عن جامع
المسند قاضی المرستان ۳ھ

اور حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المضیة میں نصر بن سبار کے تذکرے میں حافظ سمعانی سے نقل کیا ہے:

کتاب الاحادیث التي رواها ابو حنیفة جمع عبد اللہ بن محمد
النصارى لجدہ القاضی صاعدیروایتہ عنہ ۴ھ

ان کا تاریخ ولادت ۳۴۲ھ اور تاریخ وفات رجب ۵۲۵ھ ہے یعنی آپ دنیا سے ۹۴ سال کی عمر میں رحلت فرماتے دار بقا ہو گئے۔

۱۰ الرسالۃ المستطرفة ص ۴۴ - ۱۱ جامع المسانید ج ۲ ص ۲۹۳ -

۱۲ تقدیم نصب الراویہ

۱۳ الجواہر المضیة ج ۲ ص ۱۹۱ -

۱۔ حافظ طلحہ بن محمد

پورا نام طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد ابو جعفر ہے۔ مشہور محدث ہیں۔ محدث خطیب بغدادی نے
 تاریخ میں ان کے حالات قلم بند کیے اور ان کے اساتذہ کی لمبی فہرست دی ہے۔ حافظ عسقلانی
 لسان المیزان میں لکھا ہے مشہور فی زمن الدارقطنی صحیح السماع ہے ابن ابی الفوارس نے
 ان کی تاریخ وفات ۳۲۶ھ بتائی ہے۔ لسان المیزان میں ان کی تاریخ وفات مطبع کی غلطی سے
 طبع ہو گئی ہے۔ جامع المسانید میں ۳۲۶ھ ہے اور زمانہ دارقطنی از ۳۲۶ھ تا ۳۲۸ھ ہے
 زٹ خوارزمی فرماتے ہیں:

کان مقدم العدول والثقات الاثبات فی زمانہ صنف
 المسند لابن حنیفةؒ

حافظ تقی الدین السبکی نے ان کی سند سے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:
 فی مسند الامام ابی حنیفة تصنیف ابی القاسم طلحہ بن محمد
 بن جعفر الشاہد۔ ۳

۱۔ حافظ ابن عساکر دمشقی محدث

ابو القاسم علی بن الحسن بن ہبیشہ الشہ نامور محدث اور مؤرخ ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو الامام الحافظ
 غیر محدث الشام، فخر الامم کے القاب سے نوازا ہے۔ تیرہ سو سے زائد اساتذہ سے علم حدیث
 حاصل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ محدث
 رزمی نے حافظ ابن النجار کے حوالہ سے ان کی علمی رحلتوں کے تذکرے میں عراق، مکہ، مدینہ،
 دمشق، خراسان، آذربائیجان، نیشاپور، سرخس، طوس، مرو، اصفہان، ہمدان، بسطام،
 مغان، سمنان، رے، زسجان شمار کرائے ہیں۔ علمی سفروں کا آغاز ۵۲۰ھ میں اور اختتام
 ۵۳۰ھ میں بتایا ہے ان کی تصانیف میں تاریخ دمشق، الاشراف اور المعجم قیمتی تصانیف ہیں۔
 اعظم کے مسند کا ذکر ڈاکٹر کر دعلی نے تاریخ دمشق کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ نیز علامہ زاہد

کوثری نے تبیض کذب المقری فیما نسب الامام الاشعری لابن عساکر کے مقدمہ میں کیا ہے۔ ان کا تاریخ وفات ۱۱۰۷ھ ہے۔

۱۴۔ محدث امام عیسیٰ جعفری مغربی

یہ عیسیٰ مغربی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے استاد الاساتذہ ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی وفات ہوئی شاہ صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ وہ استاد جمہور اہل بحرین است۔ متعالید الاسانید کے نام سے ایک معجم تصنیف کیا ہے اور ساتھ ہی امام اعظم کی ایک مسند تالیف کی۔ یہ مسند جس شان ہے اور اس میں جن شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس کا اندازہ شاہ صاحب کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔

مسند برائے امام ابو حنیفہ تالیف کردہ درالجامعۃ متضمنہ ذکر کردہ در حدیث انہوں نے امام ابو حنیفہ کی ایسی مسند تالیف کی ہے جس میں اپنے سے لے کر امام صاحب تک عنعنہ ذکر کیا ہے۔

ذرا غور فرمائیے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جب دیگر محدثین کی حدیثوں کے لیے کتابوں میں آجانے کے بعد سند ہی اتصال باقی نہیں رہ سکا اور سب کی احادیث سے روایات مرسلہ کی حیثیت اختیار کر لی اور خود محدثین نے اسے ارسال العلماء کہہ کر شرف پذیر بھی دے دیا۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے یہ مان کر کہ فی الواقع حدیث کی کتابوں کا روایتی اتصال نہیں ہے بلکہ ارسال ہے لکھا ہے کہ :

امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کتابوں میں آتی ہوئی ان کے مصنفین کی طرف نسبت درست ہے کیونکہ علماء کی عادت یہی ہے کہ کتاب کا حوالہ دے دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ انخرجه البخاری۔ اپنا بخاری تک سلسلہ سند بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :

مرا سیل میں قوی تر وہ مرا سیل علماء ہیں جو ان کتابوں کے سلسلے میں علماء

کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ صرف امام اعظم ہی کی خصوصیت ہوتی کہ ان کی روایات میں آج تک عنقہ متصلہ قائم ہے۔ اس طرح شاہ صاحب ہی کے لفظوں میں ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو گئی جو کہتے ہیں کہ حدیث کے سلسلہ سند میں آج کل اتصال نہیں۔ فرماتے ہیں:

آزا سجا بطلان زعم کسانیکہ گویند کہ سلسلہ حدیث امروز متصل نمائندہ واضح تر سے شود۔

یہاں سے ان لوگوں کا دعویٰ بھی غلط ہونا ثابت ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا سلسلہ آج کل متصل نہیں رہا ہے بلکہ سوچتے کہ اگر امام اعظم سے حدیث کا سلسلہ جاری نہ ہوتا تو یہ حدیث کا سماع متصل امام صاحب سے لے کر شاہ صاحب تک کیسے وجود میں آ گیا ہے۔

یہ وہ مشاہیر حفاظ اور محدثین ہیں جنہوں نے امام اعظم کی احادیث کو مستقل تصانیف میں اپنی اسانید کے ساتھ کتابی صورت میں جمع کیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی حفاظ ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بھی امام اعظم کے مسند پر قلم اٹھایا ہے۔ مشہور محقق زاہد کوثری نے مقدمہ نصب الراية میں اسی سلسلے میں امام دارقطنی اور حافظ ابن شاہین کا بھی نام لیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

وكان مع الخطيب عند ما حل دمشق مسند ابی حنیفة للدارقطنی و مسند ابی حنیفة لابن شاہین

یہ دونوں مسندیں ان مسانید کے علاوہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ محدث خوارزمی نے جن نامور محدثین کے مسانید کو جامع المسانید میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کی تصریح کے مطابق حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مسند امام حافظ ابو محمد عبد اللہ الحارثی المدنی۔

۲۔ مسند حافظ ابو القاسم طلحہ بن محمد

۳۔ مسند امام حافظ ابو الحسین محمد بن المنظر

- ۴۔ مسند حافظ ابو نعیم الاصفہانی
 ۵۔ مسند امام ابو بکر محمد بن عبد الباقی
 ۶۔ مسند حافظ عمر بن الحسن الاشثانی
 ۷۔ مسند امام ابو احمد عبد اللہ بن عدی
 ۸۔ مسند امام ابو عبد اللہ حسین بن محمد خسر
 ۹۔ مسند امام ابو القاسم عبد اللہ بن ابی العوام
 اصل میں مسانید تو صرف یہی ہیں ان کے علاوہ جو دوسرے مسانید کا اس مجموعے میں تذکرہ
 ہے مثلاً

- ۱۔ مسند امام حافظ محمد بن الحسن
 ۲۔ مسند امام حافظ قاضی ابو یوسف
 ۳۔ مسند امام حسن بن زیاد
 ۴۔ مسند امام حماد بن ابی حنیفہ
 دراصل یہ مسانید نہیں بلکہ کتاب الآثار کے نسخے ہیں جس کی تفصیلات آپ پڑھ چکے ہیں
 ایسے ہی حافظ ابو بکر کلاعی کی مسند بھی جامع المسانید میں مسند ہی بنا کر داخل کر دی گئی ہے حالانکہ
 یہ کوئی مستقل مسند نہیں بلکہ کتاب الآثار ہی کا ایک نسخہ ہے جس کو وہ اپنے حید امجد محمد بن خالد سے
 روایت کرتے ہیں۔

اطراف حافظ ابن القیسرانی

محدثین میں اطراف پر کتابیں لکھنے کا پرانا رواج ہے ان کے عرف میں اطراف یہ ہیں کہ متن
 حدیث کے ابتدائی ٹکڑے لکھ کر اس کی ساری اسانید کو یکجا کر دیا جائے۔ اسکا فی رقمطراز ہیں،
 ھی التی یقتصر فیہا علی ذکر طرف الحدیث الدال علی بقیہ مع
 الجمع لاسانیدہ لے

جیسے حدیث کی دوسری کتابوں کے محدثین نے اطراف لکھے ہیں مثلاً اطراف صحیحین حافظ ابو مسعود

لے الرسالہ المستطرفہ ص ۳۷ یعنی اطراف یہ کہ حدیث کا ایک ٹکڑا لکھ کر اس کی ساری سندوں کو یکجا کر دیا جائے۔

اور حافظ ابو محمد خلف بن محمد، حافظ ابو نعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجر عسقلانی۔ ایسے ہی امام اعظم کی روایات پر حافظ ابن القیسرانی نے اطراف لکھے ہیں یعنی امام اعظم کے مختلف مسانید سے ان کی حدیثوں کو لے کر جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب الجمع بین رجال الصحیحین جو حافظ قیسرانی کی تصنیف ہے اور حیدرآباد سے طبع ہوئی ہے اس کے آخر میں حافظ ابن القیسرانی کی تصانیف میں اطراف احادیث ابی حنیفہ کا ذکر ہے۔ موصوف بہت بڑے حافظ حدیث ہیں۔ ابن الجوزی نے المنظم میں ان پر بہت لے دے کی ہے لیکن سمعانی نے ان کی صفاتی بھی پیش کی۔ ابن کثیر نے البدایہ میں، ابن الجوزی نے المنظم میں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے۔ حافظ صاحب نے لکھا ہے دھو فی نفس صدوق لہ یتھمد وہ ذاقی طور پر غیر متہم راست گو ہیں۔ حافظ ابن عساکر کہتے ہیں کہ اسماعیل تیمی کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ میں نے سب سے بڑا حافظ ابن طاہر کو پایا ہے سبھی بن مندہ کہتے ہیں کہ:

حفاظ میں یگانہ، اچھے کردار والے راست گو، صحیح اور غلط سے واقف

اور صاحب تصانیف عالم تھے۔

ان کی تاریخ وفات ۵۰۷ھ ہے۔

مسانید امام اعظم کی شرحیں

چونکہ جامع المسانید میں امام ابو حنیفہ کی متعدد مسانید کی روایتیں موجود ہیں اس لیے متاخرین میں اس کتاب کی بڑی شہرت ہو گئی بڑے بڑے اجلہ محدثین نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں سے مشہور حافظ زین الدین قاسم المتوفی ۹۷۹ھ ہیں۔ موصوف نے ایک نہایت ضخیم شرح لکھی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے بھی اس کی شرح لکھی ہے۔ اس کا نام التعلیق الملیفۃ علی مسند ابی حنیفہ ہے۔ متعدد محدثین نے جامع المسانید کا اختصار بھی کیا ہے۔

امام شرف الدین اسماعیل بن عیسیٰ بن دولہ الملکی کے اختصار کا نام اختیار اعتماد المسانید فی اختصار اسماء بعض رجال الاسانید ہے۔

امام ابوالبتحا احمد بن ابی الضیاء محمد القرشی نے اس کا جو مختصر لکھا ہے اس کا نام المستند فی

قیصر المسند ہے۔ ایک اور مسند کا مختصر شیخ ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل نے بھی لکھا ہے۔

علامہ حافظ الدین محمد بن محمد الکروری نے زوائد مسند ابی حنیفہ کے نام سے ان روایات کو جو مسند ابی حنیفہ میں صحاح ستہ سے زائد ہیں جمع کیا ہے۔

امام ابو حفص زین الدین عمر بن احمد الشجاع نے بھی ایک اختصار لفظ المرجان من مسند ابی حنیفہ النعمان کے نام سے کیا ہے۔

متاخرین میں علامہ السید مرتضیٰ زبیدی محدث نے جامع المسانید سے امام اعظم کی ان احادیث احکام کا انتخاب کیا کہ جن کی روایت میں مصنفین صحاح بھی امام صاحب کے شریک ہیں اس کتاب کا نام عقود الجواهر المصنیۃ فی اولئہ مذہب الامام ابی حنیفہ ہے۔ اس کی ترتیب ابواب فقرہ پر ہے۔

بہر حال احادیث ابی حنیفہ کی جو خدمت کی گئی ہے یہ اس کی ایک جھلک ہے جو ناظرین کے سامنے بطور ہدیہ پیش کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سارا ذخیرہ آج آثار قدیمہ کی نظر ہے۔ اللہ کرے کہ کوئی صاحب علم بزرگ اس علمی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائیں و ما ذالک علی اللہ بعزیز۔

حدیث کا دوسرا مجموعہ موطا امام مالک

کتاب الآثار کے بعد حدیث کا دوسرا مجموعہ جو اس وقت امت کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ امام دارالہجرۃ مالک بن انس کی مشہور تصنیف موطا ہے۔ یہ اہل مدینہ کی روایات اور فتاویٰ کا بہترین مجموعہ ہے۔ موطا میں بھی کتاب الآثار کی طرح مسائل و احکام کے لیے احادیث صحیحہ کو نقش اول اور آثار صحابہ و تابعین کو نقش ثانی قرار دیا ہے حکیم الامت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

جاننا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے چاہے وہ مسند ہو یا

لے حافظ شمس الدین سخاوی کے بارے میں ازہر کے کلیہ شریعی کے استاد عبد الوہاب نے المقاصد الحسنہ کے مقدمہ میں بتایا ہے کہ انہوں نے بھی امام اعظم کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ اس مجموعہ کا نام "التحفۃ المنیضۃ فیما وقع لہ من حدیث ابی حنیفۃ" ہے۔ حافظ سخاوی ان مشہور اکابر علماء میں سے ہیں جن کے علم عمل پر خود اہل علم کو اس قدر اعتماد ہے کہ علامہ شوکانی نے قسم کھا کر کہا ہے ولقد والله العظیم لہ من الحفاظ المتاخرین مثلی۔ (البدر الطالع ج ۲ ص ۱۸۵)۔

مرسل۔ نیز حضرت عمر کے اثر اور عبداللہ بن عمر کے عمل سے استدلال کرنا اور صحابہ و تابعین مدینہ کے فتاویٰ سے اخذ کرنا خصوصاً جبکہ ان تابعین کی ایک جماعت کسی مسئلہ پر متفق ہو امام مالک کے مذہب کا اصول ہے لے
فتح الباری کے مقدمہ میں، حافظ عسقلانی لکھتے ہیں :
پھر امام مالک نے مؤطا تصنیف کیا اور اہل حجاز کی حدیثوں میں سے قوی اور صحیح روایتوں کو تلاش کر کے اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور تابعین اور ان کے بعد والے علماء کے فتاویٰ کو بھی اس میں مدغم کر دیا ہے
مؤطا کے بارے میں امام شافعی کی رائے یہ ہے :

ما علی ظہر، الارض کتاب بعد کتاب اللہ، اصح من کتاب مالک
روئے زمین پر قرآن حکیم کے بعد مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب
نہیں ہے لے

حافظ سیوطی نے تنویر الحواکک کے مقدمہ میں امام شافعی کے اس ارشاد کو مختلف الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ بعد کو شافعی مدرسہ فکر کے کچھ علماء نے امام شافعی کے اس ارشاد کی یہ توجیہ کی ہے :
اما قول الشافعی فذلك قبل وجود الكتابين لے

در اصل اس توجیہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیال میں چونکہ مؤطا میں مرسل، منقطع اور بلاغات ہیں اس لیے مؤطا کا درجہ اب بخاری و مسلم کے بعد ہے لیکن حافظ مغلطی فرماتے ہیں :
لا فرق بین المؤطا والبخاری فی ذلک لوجودہ ایضاً فی البخاری
من التعالیق ونحوها۔

اس معاملے میں مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ بخاری میں بھی تعلیقات موجود ہیں لے

حافظ جلال الدین سیوطی نے حافظ ابن حجر کی زبانی حافظ مغلطی کے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ :

لے مصنفی ج ۱ ص ۱۷۔ لے ہدی الساری ص ۴۔ لے تزیین الممالک ص ۴۳۔

لے تنقیح الانظار ج ۱ ص ۴۰۔ لے تزیین الممالک ص ۴۴۔

موطا اور بخاری دونوں کی منقطع روایات میں فرق یہ ہے کہ موطا میں اس قسم کی جو روایتیں ہیں ان میں سے اکثر کا سماع امام مالک نے ایسا ہی کیا ہے اور یہ ان کے خیال میں حجت ہے۔ لیکن بخاری میں اس قسم کی جو روایات ہیں ان کی سندیں ان وجوہ کی بنا پر عمدہ اُحذف کی گئی ہیں جن کی تعلیقات کے سلسلے میں تشریح کر دی گئی ہے۔

اور اس موضوع پر خود حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں یہ توضیح فرمائی۔
 کچھ ائمہ نے موطا کے مقابلے میں صحیح بخاری کی اصحیت ثابت کرنے میں گنجملک ڈال دی ہے ان کا کہنا ہے کہ صحت اور احتیاط اور وثوق سے کام لینے میں بخاری اور مالک دونوں برابر ہیں۔ باقی بخاری میں حدیثوں کا زیادہ ہونا تو اس کا نہ صحت سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ یہ صحت کا لازمہ ہے۔ دراصل اس مشکل کا حل یہ ہے کہ بخاری کی اصحیت صرف شرائط صحت کی وجہ سے ہے۔ امام مالک کے خیال میں چونکہ انقطاع اسناد و منافی صحت نہیں ہے اس لیے ان کی کتاب میں مراسیل، منقطعات اور بلاغات اُجالتے ہیں۔
 اور امام بخاری انقطاع کو چونکہ ایک علت خارجہ قرار دیتے ہیں اس لیے وہ ایسی روایات کو موضوع کتاب سے الگ ہو کر دوسرے سلسلے میں لاتے ہیں مثلاً تراجم میں۔ اور اس میں شک نہیں کہ منقطع روایات اگرچہ کچھ کے نزدیک قابل احتجاج ہیں لیکن پھر بھی روایات متصلہ زیادہ قوی ہیں بشرطیکہ دونوں کے بیان کرنے والے حفظ اور عدالت میں یکساں ہوں۔
 بس یہی بخاری کی اصحیت کی وجہ ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ امام شافعی نے موطا کی اصحیت کا دعویٰ اپنے زمانہ میں موجود تالیفات کے مقابلے میں کیا ہے۔ ان کے سامنے جامع سفیان ثوری اور مصنف حماد بن سلمہ جیسی کتابیں تھیں اور ان پر موطا کی فضیلت میں کبھی دو رائے نہیں ہوئی ہیں۔

علامہ محمد بن جعفر الحکافی نے علامۃ الشیخ صالح کے حوالہ سے حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس تقریر کا یہ جواب دیا ہے :

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بلاغاتِ مؤطا اور تعلیقاتِ بخاری میں جو فرق بیان کیا ہے وہ محلِ نظر ہے۔ اگر حافظ صاحب مؤطا کا بھی اسی طرح بنظرِ عامر مطالعہ کرتے جیسے انہوں نے صحیح بخاری کا کیا ہے تو ان کو پتہ لگ جاتا کہ واقعی ان دونوں کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ جو وہ فرماتے ہیں کہ امام مالک نے ان روایات کا اسی صورت میں سماع کیا ہے تو یہ ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ مؤطا کی ایک حدیث مثلاً یحییٰ کی روایت اگر بلاغاً ہے تو دوسرے لوگ اسی حدیث کو امام مالک سے مسنداً بھی روایت کرتے ہیں اور حافظ صاحب کی یہ بات بھی قابلِ پذیرائی نہیں ہے کہ مر اسیل امام مالک اور ان کے پیروکاروں کے نزدیک حجت ہیں اس لیے خود امام شافعی اور محدثین کے یہاں بھی مرسل حجت ہے بشرطیکہ اس کی پشت پر کسی مسند کی تائید ہو جیسا کہ ابن عبد البر اور سیوطی وغیرہ نے بتایا ہے اور عراقی کا یہ کہنا کہ بلاغاتِ مالک غیر معروف ہیں درست نہیں کیونکہ ابن عبد البر نے مؤطا کے تمام بلاغات، مر اسیل اور منقطعاً میں صرف چار کو چھوڑ کر وصل ثابت کر دیا ہے اور ان چار کو بھی موصول ثابت کرنے کے لیے ابن الصلاح نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں ہے۔

شاہ صاحب محدث دہلوی مؤطا کو حدیث کی تمام کتابوں میں مقدم اور افضل سمجھتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں اس کے دلائل لکھے ہیں۔ حجتہ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ :

امام شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب مؤطا ہے محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مؤطا کا سارا علمی ذخیرہ مالک اور ان کے ہمنواؤں کے خیال میں صحیح ہے اس کا ہر مرسل اور منقطع دوسرے طرق سے متصل السند ہے اس لیے اس حیثیت سے مؤطا بالکل صحیح ہے خود امام مالک کے زمانے ہی میں مؤطا کی روایات کی تخریج کے لیے ان گنت

موطا لکھے گئے مثلاً ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، سفیان ثوری اور معمر وغیرہ نے ان لوگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں جو امام مالک کے شیوخ ہیں۔ پھر موطا سب لوگوں کی علمی و تعلیمی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ فقہاء میں سے امام شافعی، امام محمد بن الحسن، ابن وہب اور ابن القاسم۔ محدثین میں سے یحییٰ بن سعید القطان، عبد الرحمن بن مہدی اور عبد الرزاق، خلفاء و امراء میں سے ہارون رشید، امین، مامون، حتیٰ کہ موطا اہم مالک ہی کے زمانے میں درجہ شہرت حاصل کر چکا ہے اور پھر ہر دور میں اس کی شہرت میں اضافہ ہی رہا۔ اسی پر فقہاء امصار نے اپنے مذاہب کو قائم کیا ہے حتیٰ کہ کچھ عراقیوں میں کچھ مسائل میں اسی کو پیش نظر رکھا۔ ہمیشہ سے ہر زمانے میں علماء موطا کی حدیثوں کی تخریج کرتے رہے اس کے توابع اور شواہد بتاتے رہے یہ

اس کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنی شہرۃ آفاق مصفی شرح موطا کے مقدمہ میں موطا کی ترجیح کے دلائل اور وجوہ کے ساتھ نہایت تفصیل سے بیان فرماتے ہیں۔
واقعہ یہ ہے کہ صحت کے لحاظ سے صحیحین اور موطا میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ بعض اور وجوہ سے بھی موطا کو صحیحین پر ترجیح ہے۔

الف :- امام مالک کی زیادہ روایات کا مرکز و منبع اہل مدینہ ہیں۔ علم الفقہ و فتاویٰ کے لیے زمانہ خلافت راشدہ میں مرکزی شخصیت حضرت فاروق اعظم کی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس، اور حضرت جابر مدنی علمی دائرے کی اہم شخصیتیں ہیں۔ ان کے علوم کی وراثت مدینہ میں فقہاء سبعہ کو ملی ہے۔ امام مالک کو براہ راست ان فقہاء سبعہ کے تلامذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ امام مالک کے ان اساتذہ میں امام زہری، امام یحییٰ بن سعید انصاری، زید بن اسلم، ابو الزناد اور نافع۔ یہ کبار تابعین ہیں جن سے استفادے کا امام مالک کو موقع ملا ہے۔ امام مسلم اور امام بخاری کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔

ب :- آپ اساتذہ اوراق میں پڑھیں گے کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ

کسی رافضی سے خواہ وہ کیسا ہی پاکباز کیوں نہ ہو حدیث کی روایت کے روادار نہ تھے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

سئل مالك عن الرافضة فقال لا تكلمهم ولا ترو عنهم

فانهم يكذبون۔

رافضیوں سے کوئی علمی گفتگو نہ کرو اور نہ ان سے روایت لو کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

پر خلاف اس کے مسلم و بخاری میں ان سے روایات موجود ہیں۔ چنانچہ السیوطی نے صراحت لکھا ہے جیسا اس پر آپ آئندہ اوراق میں تفصیلی بحث انشاء اللہ پڑھیں گے۔ یہاں خلاصہ کلام کے طور پر صاحب تعلیقات کے حوالہ سے صرف امام حاکم کا ایک بیان بدیہ ناظرین کو رہنما ہوں۔

مبتدعین اور اہل اہواء کی روایات اکثر محدثین کے یہاں مقبول ہیں بشرطیکہ

یہ لوگ راستباز ہوں۔ امام بخاری نے عباد بن یعقوب سے حدیث روایت

کی ہے حالانکہ اس کے بارے میں ابو بکر محمد بن اسحاق کی تصریح ہے کہ

دین میں متہم ہے اور محمد بن زیاد اور جریر بن عثمان سے بخاری میں روایتیں

آتی ہیں۔ حالانکہ دونوں نا صبی ہیں۔ بخاری اور مسلم دونوں نے محمد بن حازم

اور عبید اللہ بن موسیٰ سے حدیث لی ہے حالانکہ دونوں غالی شیعہ تھے۔

ج ۱۔ موطا کے نسخے تیس سے زائد ہیں لیکن ان میں سے قوی تر اور مشہور ترین جن کی روایت

کا سلسلہ امام مالک سے پھیلا ہے بارہ ہیں۔

السند الغافی کتاب الموطا بروایت نحو انتی عشر من اصحاب مالک

حافظ ابن عبد البر نے اس تذکار اور تمہید میں ان ہی بارہ نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے جبکہ بخاری

کے تلامذہ ہیں سے جن بزرگوں سے سلسلہ روایت چلا وہ صرف چار ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے

بستان المحدثین میں ان کی تعداد سولہ بتائی ہے۔

جن بزرگوں سے موطا کا روایتی سلسلہ دنیا میں پھیلا ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ یحییٰ بن یحییٰ المسعودی الاندلسیؒ - ۲۔ ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن سلمہؒ

۳۔ ابو عبد اللہ عبد الرحمن بن القاسمؒ - ۴۔ معن بن عیسیٰ بن دینار البوسجی المدنیؒ

- ۵۔ ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن مسلم بن قنبل ۲۲ھ۔ ۶۔ ابو محمد عبد اللہ بن یوسف الدمشقی ۲۱۸ھ۔
 ۷۔ یحییٰ بن عبد اللہ بن بکر القرشی البزکری ۲۳۱ھ۔ ۸۔ سعید بن کثیر بن عقیق بن مسلم الانصاری ۲۲۶ھ۔
 ۹۔ احمد بن ابی بکر القاسم بن الحارث ۲۴۲ھ۔ ۱۰۔ مصعب بن عبد اللہ الزبیری ۲۳۶ھ۔
 ۱۱۔ محمد بن الحسن الشیبانی الامام ۱۸۹ھ۔ ۱۲۔ سوید بن سعید بن سہل الہمدانی ۲۴۰ھ۔
 ۱۳۔ یحییٰ بن یحییٰ بن بکر بن عبد الرحمن ۲۴۶ھ۔ ۱۴۔ احمد بن اسماعیل بن محمد ابو حذافہ ۲۵۹ھ۔
 ۱۵۔ محمد بن المبارک بن یعلیٰ القرشی ۲۲۵ھ۔ ۱۶۔ سلیمان بن برد ۲۴۶ھ۔
- الغرض موطا کتاب الآثار کے بعد احادیث صحیحہ کا مجموعہ ہے۔

جامع معمر بن راشد

اسناد و روایت کے بہت بڑے امام ہیں۔ علی بن المدینی اور ابو حاتم نے ان کو اپنے دور میں علم روایت کا مرکز قرار دیا ہے۔ ابھی سبزہ کا آغاز نہیں ہوا کہ علم حدیث کے لیے تنگ و دو شروع کر دی تھی خود ان کا اپنا بیان ہے کہ :

مجھے قنادہ سے چودہ سال کی عمر میں استفادے کا موقع ملا ہے جو کچھ
 بھی سنتا سینہ میں نقش ہو جاتا تھا۔

امام احمد کا بیان ہے کہ جب بھی ہم نے معمر سے کسی کا مقابلہ کیا تو معمر کو طلب علم حدیث میں پیشرو پایا۔ معمر اپنے زمانے میں علم کے بڑے جویا تھے۔ ابن جریر کہتے تھے معمر سے استفادہ کرو کیونکہ اپنے زمانے میں ان سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے۔ معمر بن راشد بھی امام مالک کے معاصر ہیں اور دوسری صدی کے بڑے پائے کے متوفین میں سے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے اس دور کے مصنفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

سفیان بن عیینہ، مالک بن انس نے مدینہ منورہ میں، عبد اللہ بن
 وہب نے مصر میں اور معمر و عبد الرزاق یمن میں تصنیف کا کام کیا۔
 حافظ جمال الدین السیوطی لکھتے ہیں :

اسی عہد میں علماء اسلام نے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کی

چنانچہ مکہ میں ابن جریج نے مدینہ میں مالک نے شام میں اوزاعی نے
بصرہ میں ابی عروبہ نے یمن میں معمر نے کوفہ میں سفیان ثوری نے
تصانیف کیں۔

امام ذہبی سے حافظ سخاوی نقل کرتے ہیں کہ :

یمن میں حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰ اشعری فروکش ہوئے
یمن سے بہت سے تابعین ائمہ ہوئے۔ اس میں تابعین میں علماء کی
ایک جماعت ہوتی ہے۔ امام منبہ کے دونوں صاحبزادے وہب بن منبہ
اور ہمام بن منبہ ہوئے امام طاؤس اور ان کے صاحبزادے ہوئے
بعد ازیں معمر بن راشد اور ان کے اصحاب ہوئے پھر عبدالرزاق اور
ان کے ساتھی ہوئے۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں :

مکہ میں تصنیف کا کام ابن جریج نے مدینہ میں مالک اور محمد بن اسحاق
نے بصرہ میں ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے کوفہ میں سفیان ثوری
نے شام میں اوزاعی نے واسط میں ہشیم نے اور یمن میں معمر بن راشد
نے کیا ہے۔

حافظ ابن الجوزی نے تلخیص فہوم اہل الاثر میں جہاں مصنفین متقدمین کا تذکرہ کیا ہے
وہاں دوسرے مصنفین کے ساتھ معمر بن راشد کا نام بھی لیا ہے۔

معمر بن راشد نے ۵۸ سال کی عمر میں ۳۵ھ میں وفات پائی ہے ان کے شیوخ و اساتذہ
میں ثابت البنانی، قتادہ، زہری، عاصم الاحول، ایوب السختیانی، الجعد، زید بن اسلم، صالح بن
کیسان، عبداللہ بن طاؤس، جعفر بن بہرقان، الحکم بن ابان، اشعث بن عبداللہ، اسماعیل
بن امیہ، ہمام بن منبہ، ہشام بن عروہ، محمد بن المنکدر اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ تابعین کے
نام ملتے ہیں۔

معمر بن راشد نے علمی استفادہ یمن میں ہمام بن منبہ سے کیا ہے۔ ہمام کو حضرت ابو ہریرہ

کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان سے حدیثیں سُنی ہیں جو تقریباً ایک سو چالیس ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

معمر کو ان سے استفادے کا موقع ہمام کی کبر سنی کے زمانے میں ملا ہے۔
حضرت ابو ہریرہ کی مرویات ان کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے
معمر کو سنی شروع کیں تو تھک گئے معمر نے ان سے رسالہ لے لیا
اور باقی خود پڑھ کر سنایا۔

یہ لکھی ہوئی مرویات ابو ہریرہ حدیث کا وہ ہی رسالہ ہے جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے
مشہور ہے ہمام سے اس رسالہ کے راوی معمر بن راشد ہیں۔ الذہبی لکھتے ہیں۔

ہمام عن ابی ہریرہ نسخة مشہورة رواها عند معمرو
معمر نے نہ صرف یہ کہ ہمام کی ان حدیثوں کو بعینہ محفوظ رکھا بلکہ الجامع نامی ایک کتاب خود
بھی تصنیف کی ہے :

ابوطالب مہی نے قوت القلوب میں لکھا ہے :

شہ کتاب معمربن راشد باليمن فی سنن
دوسرے مقام پر الکتانی لکھتے ہیں :

جامع معمربن راشد الازدی مولدہم البصری نزلی الیمن
المستوفی ۳۵۲ھ

جیسا کہ نام بتا رہا ہے اس میں آپ نے وہ تمام احادیث یکجا کی ہیں جو آپ نے مختلف اساتذہ
سے سُنی ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا اہل علم کو شکہ گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے جامع معمر کا نسخہ ترکی
سے بڑی تگ و دو اور تحقیق و جستجو کے بعد نکالا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :
علم کی خوش قسمتی ہے کہ یہ کتاب اب تک محفوظ ہے اور حال ہی میں ترکی
دستیاب ہو گئی ہے اس کا ایک نسخہ جامعہ انقرہ کے شعبہ تاریخ کے
کتب خانے میں محفوظ ہے اور ناقص و دریدہ لیکن بہت قدیم ہے

یعنی ۳۶۲ھ میں اندلس کے شہر طلیطلہ میں لکھا گیا ہے دوسرا نسخہ کمال ہے اور استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ افندی میں ہے اور تیسرا لکھا ہوا ہے اس کتاب پر استنبول یونیورسٹی کے نوجوان فاضل استاد ڈاکٹر فواد نے ”ترکیات مجموعہ سی“ نامی رسالے کی بارہویں جلد میں ص ۱۱۵ تا ص ۱۳۴ پر ایک دلچسپ مقالہ بھی لکھا ہے لیکن ترکی زبان میں ہے اس کا عنوان یہ ہے ”حدیث مصنفات تک مبدئی و معمر بن راشد ک جامع“ یہ کتاب راوی دار نہیں بلکہ موضوع وار مرتب ہوتی ہے سرسری مطالعہ پر اس میں ہمام بن منبہ کا بھی آٹھ دس بار ذکر آیا ہے لیکن معمر کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ تکرار نہ ہو چنانچہ صحیفہ ہمام کی روایت کو بھی خود ہی سے متعلق ہونے کی وجہ سے کتاب الجامع میں مکرر نقل نہیں کیا۔ البتہ ہمام کے رسالہ کی حدیثیں ہمام کے علاوہ کسی اور راوی سے ملیں تو اس جدید سند کے ساتھ ان کو الجامع میں ضرور ذکر کیا ہے اس طرح ایک ہی حدیث چند در چند ماخذوں سے معلوم ہونے کی وجہ سے معتبر سے معتبر ہو جاتی ہے جامع معمر دو صفحات سے کچھ زائد پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کی اشاعت کی جلدی ہی نوبت آجاتے رہے

مشہور امام یحییٰ بن معین زہریات میں ابن عیینہ، صالح بن کیسان کے مقابلے میں معمر کو بہت زیادہ مراعات تھے یہ
امام معمر کو امام اعظم ابو حنیفہ سے خاص عقیدت تھی اور آپ امام اعظم کی جلالت علمی کے بہت گن گاتے تھے چنانچہ حافظ عبد القادر لکھتے ہیں :-

امام اسفرائینی نے امام علی بن المدینی حافظ ابوالحسن کے حوالہ سے جو امام بخاری کے استاد ہیں اور حدیث قلین کے ناقد ہیں لکھا ہے کہ ابن المدینی کہتے ہیں کہ امام عبد الرزاق فرماتے تھے کہ امام معمر کہا کرتے

تھے کہ حسن بصری کے بعد فقہ میں حسن معرفت ابو حنیفہ جیسی میرے علم میں کسی کو حاصل نہیں ہے بلکہ

جامع سفیان الثوری

امام سفیان ثوری کو فقہ کے رہنے والے ہیں۔ فقہ میں ان کا اور امام اعظم کا عموماً ایک مذہب ہے امام ترمذی اپنی سنن میں اکثر امام سفیان ثوری کا مذہب نقل کرتے ہیں جو اکثر امام ابو حنیفہ کے موافق ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں:-

سفیان الثوری اکثر متابع لابی حنیفۃ منی بلکہ

امام زفر جب بصرہ تشریف لائے اور ان کے سامنے جامع سفیان لائی گئی تو اسے مطالعہ کے بعد امام زفر کا تاثیر یہ تھا:-

هَذَا كَلَامُنَا يَنْسِبُ إِلَيْنَا غَيْرُنَا

یہ بات تو ہماری ہے لیکن منسوب اوروں سے ہے

امام زفر نے جامع سفیان کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس کے فقہی مسائل سے متعلق ہے۔ بعض ان فقہی مسائل کو جو ائمہ کے مابین اختلافی ہیں اور جن میں اختلاف محض افضلیت اور اہلیت کا ہے ان کو اہمیت دیتے تھے اور اتنی اہمیت کہ ان کو اہل سنت ہونے کا معیار قرار دیتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو حافظ ذہبی نے لایکائی کی سنت کے حوالے سے لکھا ہے:-

شعیب بن جبریر کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے عرض کیا کہ سنت کے موضوع پر کوئی بات ایسی بتائیے جو میرے لیے نفع بخش ہو اور ایسی پرستہ ہو کہ جناب الہی میں اگر آپ کے حوالہ سے کہوں تو پرچ جاول اور آپ کی گرفت ہو جائے فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے اللہ ہی اس کا مبداء اور معاد ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کہے وہ کافر ہے اور ایمان قول و عمل اور نیت کا نام ہے بڑھتا اور گھٹتا ہے اور شیخین کو مقدم رکھو۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ شعیب! صرف اتنی

بات سے فائدہ نہ ہو گا جب تک تم مسح علی الخنین کو نہ مانو گے اور جب تک نمازیں بسم اللہ کے آہستہ پڑھنے کو بلند آواز سے پڑھنے کے مقابلے میں افضل نہ مانو گے اور جب تک تقدیر پر ایمان نہ لاؤ گے اور جب تک ہر نیک و بد کے پیچھے نماز نہ پڑھو گے اور جب تک جہاد کو قیامت تک ضروری اور ہر ظالم و عادل حکومت کے تحت نہ رہو گے۔ شعیب نے دریافت کیا کہ سب نمازیں ان لوگوں کی امامت میں پڑھنی ضروری ہیں فرمایا جمعہ اور عیدین تو ہر ایک کی امامت میں پڑھ لو ان کے علاوہ میں تمہیں اختیار ہے صرف اس کے پیچھے پڑھو جسے تم جانتے ہو کہ اہل سنت سے ہے۔ جب تم خدا کی جناب میں جاؤ اور تم سے دریافت کیا جائے تو کہہ دینا خداوند مجھ سے یہ بات سفیان ثوری نے کہی ہے یہ

امام سفیان ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظم کی مجلس درس میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے حدیث روایت کی ہیں مگر امام صاحب کی فقہ کو انہوں نے علی بن مسہر سے حاصل کیا ہے جو امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ امام سفیان ثوری نے اپنی جامع کی تصنیف میں زیادہ تر ان ہی سے مدد لی ہے خود علی بن مسہر کا بیان ہے کہ:

امام سفیان میرے پاس عشاء کی نماز کے بعد آئے اور میرے سے امام اعظم کی کتابیں عاریتہ لے گئے۔

امام سفیان کی جامع ایک زمانے میں محدثین کے یہاں بڑی مقبول اور متداول رہی ہے امام بخاری نے جب علم حدیث کی تحصیل شروع کی تو سب سے پہلے جن کتابوں کی طرف توجہ کی وہ سفیان ثوری کی جامع اور عبد اللہ بن المبارک اور وکیع بن الجراح کی تصانیف تھیں۔ امام بخاری نے جامع ثوری کا سماع اپنے وطن ہی میں امام ابو حفص کبیر سے کیا تھا خطیب بغدادی رقمطراز ہیں:

محمد بن اسماعیل البخاری فرماتے ہیں کہ میں امام ابو حفص کبیر کے پاس جامع سفیان کا سماع کر رہا تھا کہ ایک حرف کتاب میں جو میرے یہاں نہ تھا میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے وہی بتایا میں نے ان سے

پھر پوچھا انہوں نے پھر وہی بتایا آخر میں نے تیسری بار مراجعت کی تو ذرا
چپ ہوئے اور دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اسماعیل
کالٹر کا محمد ہے فرمایا اس نے صحیح بتایا ہے یاد رکھو یہ لٹر کا ایک روز مرد
میدان ہو گا۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جامع سفیان اور موطا
میں کون سی کتاب زیادہ اچھی ہے فرمایا کہ کتاب مالکؒ۔ لیکن امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ لوگوں نے
اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں جامع سفیان سب سے اچھی ہے۔

اس دور کی اور کتابیں

اس دور میں ان کے علاوہ دوسرے ارباب علم نے میدان علم میں دائر تحقیق دی ہے۔ مؤرخین
نے اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ مختلف علوم و فنون میں اتنا علمی سرمایہ امت کے لیے
وراثت میں چھوڑا ہے کہ امت ان کے اس احسان عظیم سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ حافظ ذہبی
فرماتے ہیں :-

علماء کبار نے سنن کی تدوین، فقہ کی تالیف اور زبان و ادب پر کتابیں لکھی
ہیں۔ ہارون رشید کے زمانے میں اس کی مہمات ہوئی اور بکثرت تصانیف
مدون ہو گئیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ
امام مالک نے حدیث اہل حجاز اقوال صحابہ و فتاویٰ تابعین پر مشتمل موطا، ابن
جریر نے مکہ میں امام اوزاعی نے شام میں، امام سفیان ثوری نے کوفہ میں
حماد بن سلمہ نے بصرہ میں کتابیں لکھی ہیں۔

حافظ سیوطی تاریخ الخلفاء میں شہداء کے حوادث میں حافظ ذہبی کی اعلام سے نقل کرتے ہیں
قال الذہبی شرع علماء الاسلام فی هذا العصر فی تدوین الحدیث

۱۔ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۱۔ ۲۔ ترمذی الممالک ص ۴۴۔ ۳۔ رسالہ ابی داؤد ص ۷۔

۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۱۔ ۵۔ الہدی الساری ص ۵۔

والفقه والتفسير فصف ابن جرير بركة ومالك الموطا بالمدينة
والادزاعي بالشام وابن ابی عمر وبہ وحماد بن سلمہ وغيرہا بالبصرة
ومعمر باليمن وسفيان الثوري بالكوفة وصنف ابن اسحاق
المغازي وصنف ابو حنيفة الفقه والراي ثم بعد يسير
صنف هيثم والليث وابن لهيعة ثم ابن المبارك والوليد^{سيف}
وابن وهب وكثر تدوين العلم وتبويبها ودونت كتب
العربية واللغة والتاريخ امام الناس .

علماء اسلام نے اس زمانے میں حدیث، تفسیر، فقہ، معازمی، آداب عربیہ، لغت اور تاریخ کی
تدوین شروع کی ہے۔
مؤرخین نے اس اجمال کی کچھ شرح فرمائی ہے۔

کتاب السنن ابن جریر

یہ کتاب محدثین کے یہاں سنن ابی الولید کے نام سے مشہور ہے۔ الکتانی نے اس نام سے
اس کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

نیز سنن کی کتابوں میں سے سنن ابی الولید ہے۔ لوگ ان کو ابو خالد بھی
کہتے ہیں ان کا نام عبد الملک بن عبد العزیز بن جریر ہے کہا جاتا ہے کہ
اولین مصنف ہیں ان کی وفات ۱۵۸ھ یا ۱۵۹ھ میں ہوئی ہے

حافظہ بھی نے ان کا چہرہ لکھتے ہوئے تذکرۃ الحفاظ میں بتایا ہے کہ صاحب التصانیف ،
احد الاعلام اور علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ ان کے پاس ایک کتاب تھی خالد بن نزار کہتے ہیں کہ ۱۵۸ھ
میں میں ابن جریر کی کتابیں لے کر ان کی خدمت میں بالمشافہ قرأت کے لیے حاضر ہوا مگر افسوس
کہ ان کی وفات ہو چکی تھی یہ ابن النذیم نے ان کی کتاب السنن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے
لہ من الكتب كتاب السنن ويحتوي مثل ما يحتوي عليه كتب السنن

۱۔ تاریخ الخلفاء ص ۲۶۳ - ۲۔ الرسالة المستطرفة ص ۳۰ -

۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۰ -

ان کی کتابوں میں کتاب السنن ہے اس کے مضامین بھی سنن جیسے ہیں۔

امام حسن بن زیاد کو بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حافظ ذہبی نے تاریخ کبیرہ میں خود امام حسن کی زبانی نقل کیا ہے۔

میں نے ابن جریر سے بارہ ہزار حدیثیں وہ لکھی ہیں جن کی فقہاء کو ضرورت ہوتی ہے۔

ابن جریر کے اس بیان سے جو حافظ ذہبی نے روح بن عبادہ سے نقل کیا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے امام اعظم سے کس قدر استفادہ کیا ہے حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ :
روح بن عبادہ کہتے ہیں کہ جب ان کو امام اعظم کی وفات کی خبر ملی تو ان کے تعزیتی کلمات یہ تھے واللہ لقد ذهب علم کثیر بخدا و دنیا سے
بہت بڑا علم کوچ کر گیا۔

کتاب الفرائض لابن مقسمؒ

میغرہ بن مقسم کوفہ کے نامور محدثین سے ہیں۔ امام شعبہ جیسے رئیس المحدثین کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ حماد سے زیادہ حافظ ہیں۔ امام احمد ان کو ذکی، حافظ اور صاحب سنت فرماتے تھے۔
رواۃ صحاح ستہ میں سے مشہور امام حدیث و فقہ ہیں۔ ابویجر بن عیاش کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ افقہ کسی کو نہیں دیکھا اس لیے ان ہی کی خدمت میں رہ پڑا۔ خود فرماتے تھے کہ جو چیز میرے کان نے سن لی کبھی بھولا نہیں ہوں۔ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام ذہبی نے ان کو امام اعظم کا شاگرد بتایا ہے۔ جریر بن عبد الحمید کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا مقسم مسائل میں گفتگو کرتے تھے اور جب کسی مسئلہ پر ان سے کوئی اختلاف کرتا تو فرمادیتے کہ امام ابو حنیفہ یہی فرماتے ہیں۔

الذکر اعلم ابی حنیفہ! کتنی جلالتِ قدر ہے کہ اختلاف کے وقت ان کو بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ ابن النذیم نے لکھا ہے کہ

لہ من المکتب کتاب الفرائض

کتاب السنن لزائدہ بن قدامہ

زائدہ بن قدامہ کوفہ کے مشہور محدث ہیں۔ امام ذہبی نے ان کو امام شعبہ کا ہمسر بتایا ہے۔ ان کی علمی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ترمذی میں امام احمد کا یہ بیان پڑھیے۔

ابو اسحاق کی حدیث کے سوا جب تم زائدہ اور زبیر سے کوئی حدیث سن لو تو اسے دوسرے سے سننے کی فکر ہی نہ کرو۔

علامہ ابن النذیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن، کتاب القراءات، کتاب التفسیر، کتاب الزہد اور کتاب المناقب کا پتہ دیا ہے۔

حافظ ذہبی نے زائدہ بن قدامہ کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ عبد القادر نے الجواهر المضية میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔

کتاب السنن یحییٰ بن زکریا

ان کو بھی حافظ ذہبی نے کان اماما صاحب التصانیف لکھا ہے اور ابن النذیم نے ان کی لیفات میں کتاب السنن کا تذکرہ کیا ہے۔

ان کی کنیت ابو سعید اور نام یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہمدانی ہے۔ حافظ حدیث، ثقہ، فقیہ، مذہب، متورع اور ان اکابر اہل علم و فضل میں سے تھے جنہوں نے فقہ و حدیث پر نمایاں کام کیا ہے۔ فط ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں امام ابو الحسن علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ سفیان ثوری کے بعد کوفہ میں آپ سے زیادہ ثبت کوئی نہ تھا۔ خطیب بغدادی رقمطراز ہیں کہ آپ پورے سال تک روزانہ ایک قرآن حکیم ختم کیا۔ بغداد میں ایک مدت دراز تک درس حدیث دیتے رہے۔ آپ کے تلامذہ میں امام احمد، ابن معین، قتیبہ اور ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں۔ امام ابن المدینی کہتے ہیں کہ علم یحییٰ پر ان کے زمانے میں ختم تھا۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ کوفہ میں ابن زکریا سے

۵ فہرست لابن النذیم ص ۳۳۰۔ ۶ تذکرۃ الحفاظ۔ ۷ فہرست ص ۳۳۰۔

۸ فہرست ص ۳۳۰۔ ۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۶۔

زیادہ کسی کی مخالفت مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ یحییٰ بن زکریا امام اعظم کے صرف ان تلامذہ میں سے نہیں جنہوں نے امام اعظم کی نگرانی میں تدوین کتب کا کام کیا ہے بلکہ ان دس اشخاص میں سے ہیں جن کا شمار تلامذہ متقدمین میں ہوتا تھا۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر طحاوی نے بسند متصل اسد بن الفرات سے روایت کی ہے۔

كان اصحاب ابی حنیفة الذین دونوا الکتب اربعین رجلاً وکان فی الغرة المتقدمین البریوسف ورفروداؤد الطائی واسد بن عمرو یوسف بن خالد السمعی ویحییٰ بن زکریا بن ابی زائدة۔

امام اعظم کے وہ اصحاب جنہوں نے تدوین کتب کا کام کیا وہ چالیس تھے اور ان میں جو درجہ قیادت رکھتے تھے وہ دس تھے۔

بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یحییٰ بن زکریا ہی اس مجلس تدوین میں پورے تیس سال تک کتابت کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں چنانچہ اسد بن فرات ہی فرماتے ہیں:-
وهو الذی کان یکتبہا لہم ثلاثین سنة۔

کتاب السنن وکیع بن الجراح رحمہ اللہ

ابن النذیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن کا ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ اس سنن کے مصنف کا وکیع کے نام سے تعارف کرایا ہے لہذا حافظ ذہبی نے ان کی تصانیف کے بارے میں امام احمد کا یہ اعتباری ارشاد نقل کیا ہے کہ:
علیکم بمصنفات وکیع رحمہ

اور ان کا چہرہ امام ذہبی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ الامام الحافظ، الثبت، محدث العراق، احد الائمة الاعلام۔ وکیع بن الجراح اصحاب صحاح ستہ کے شیوخ ورواة ہیں۔ فقہ و حدیث کے امام، عابد، زاہد، اکابر اتباع تابعین، امام شافعی و امام احمد کے شیخ۔ ابوسفیان کمیت تھی۔ امام اعظم سے فقہ میں درجہ تخصیص حاصل کیا اور حدیث میں امام اعظم، امام

۱۔ الجواہر المضیة ج ۲ ص ۲۱۱۔ ۲۔ الفہرست ص ۳۳۰۔ ۳۔ الرسالة المستطرفة ص ۳۲۔
۴۔ تذکرة الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۶۔

ابو یوسف، امام زفر، ابن جریج، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اوزاعی، اعمش وغیرہ ان کے اساتذہ ہیں اور عبداللہ بن المبارک، امام احمد، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، اسحاق بن راہویہ، احمد بن منیع اور یحییٰ بن اکثم جیسے کبار محدثین آپ کے تلامذہ ہیں۔ یحییٰ بن اکثم فرماتے ہیں کہ میں سفرو حضر میں آپ کی رفاقت میں رہا آپ ہمیشہ روزہ رکھتے ہر رات قرآن حکیم ختم کرتے تھے۔ ابن معین کہتے ہیں کہ میں نے ان سے افضل کوئی نہیں دیکھا ہے امام اعظم کی خدمت میں کافی عرصہ رہے ہیں اور علم کا بہت بڑا حصہ ان سے حاصل کیا ہے امام اعظم کی مجلس تدوین فقہ کے رکن بھی ہیں۔ الصیرفی نے لکھا ہے کہ فتویٰ میں امام ابو حنیفہ ہی کی رائے کو اپناتے تھے یہ عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے کہ امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیتے اور امام اعظم سے بہت زیادہ حدیثوں کا سماع کیا ہے یہ

کتاب السنن سعید بن ابی عروبہؒ

امام ذہبی نے ان کو بصرہ میں اولین مصنف بتایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :

اول من صنف الابواب بالبصرة یؒ

علامہ ابن الندیم نے ان ہی ابواب کو ان کی تصانیف میں کتاب السنن لکھا ہے صحافظ ابن عبدالبر نے بسند متصل ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سعید بن ابی عروبہ کے یہاں امام اعظم کا کیا علمی مقام تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

سعید بن ابی عروبہ سے ایک بار ایک مسئلہ دریافت کیا گیا۔ مسئلہ کا تعلق طلاق سے تھا جواب دیا اور فرمایا بکذا قال ابو حنیفہ امام ابو حنیفہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ بعد ازیں ارشاد فرمایا کہ امام ابو حنیفہ تمام عراق کے عالم ہیں یہ

اس سے معلوم ہوا کہ سعید امام اعظم کے علوم سے کیسے استفادہ کرتے تھے اور یہ کہ امام اعظم کی شخصیت صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر ہی نے بسند متصل سعید بن ابی عروبہ کی زبانی جو دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ سعید بن ابی عروبہ امام اعظم کے درس میں شریک ہو کر ان

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲۔ ۲۔ الجواہر المصنیعہ ج ۲ ص ۲۰۸۔ ۳۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹
 ۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۷۔ ۵۔ فہرست ص ۳۳۱۔ ۶۔ الانتقاء ص ۱۴۰۔

کے سامنے زانوئے ادب نہ کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

میں کو فہ آباؤ امام اعظم کے درس میں حاضری دیتا تھا ایک روز امام اعظم نے حضرت عثمان کے ذکر پر رحمہ اللہ فرمایا۔ میں چونک گیا عرض کیا کہ آپ پر بھی اللہ رحم کرے میں نے تو اس بستی میں آپ کے سوا حضرت عثمان کے لیے دُعائے رحمت کرتے والا نہیں دیکھا یہاں سے مجھے امام اعظم کا مقام فضل معلوم ہو گیا۔

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ سعید بن ابی عروبہ نے امام اعظم سے کس قدر علمی استفادہ کیا ہے حافظ ذہبی نے حماد بن سلمہ کو بھی ان کا رفیق تصنیف بنا کر پیش کیا ہے :

هو اقل من صنف مع سعيد۔

ابن النذیم نے بھی حماد کے موافقات میں کتاب السنن کا نام لیا ہے غالباً یہ ایک ہی کتاب ہے چونکہ کام دونوں نے ایک جگہ کیا ہے اس لیے ایک ہی کتاب دونوں کی طرف منسوب ہے۔

کتاب التفسیر للہشتم بن بشیرؒ

امام بخاری نے ان کو بھی امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

روى عنه عباد بن العوام وابن المبارك و هشتم

ان کی تصانیف میں علامہ ابن النذیم نے مندرجہ ذیل تین کتابیں بتائی ہیں۔ کتاب السنن، کتاب التفسیر اور کتاب القراءات۔

امام حماد بن زید نے فرمایا کہ میں نے محدثین میں ان سے زیادہ بلند مرتبہ نہیں دیکھا۔ محدث خوارزمی فرماتے ہیں کہ ہشتم امام اعظم کے تلامذہ حدیث میں ہیں۔ عبد الرحمن بن مہدی فرماتے تھے کہ ہشتم سفیان ثوری سے بھی زیادہ حافظ تھے۔ ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے جلیل القدر محدثین ہیں۔

کتاب الزہد لعبد اللہ بن المبارک

حافظ ذہبی نے ان کے ترجمہ میں ان کو صاحب التصانیف النافع لکھا ہے۔ علامہ ابن النذیم نے

ان کی تصانیف میں متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے مثلاً کتاب الزہد، کتاب السنن، کتاب التفسیر، کتاب تاریخ
کتاب البر والصلہ

مشہور محدث امام بیہقی بن آدم کہتے ہیں کہ جب مجھے یقین اور مشکل مسائل سے سابقہ پڑتا ہے تو ملاش
تجو میں اگر ابن المبارک کی کتابوں میں یہ نہ ملیں تو مجھ پر مالوسی چھا جاتی ہے۔ بیہقی بن معین نے
ان کی کتابوں میں مندرج احادیث کی تعداد بھی بتائی ہے فرماتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں مندرج
بیہقوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔

یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہو گا کہ ابن الندیم نے عبد اللہ بن المبارک کا ذکر کرتے ہوئے ان کے وہ
نثار بھی درج کیے جو انہوں نے امام اعظم کی مدح میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

لقد ران البلاد ومن عليها	امام المسلمین ابا حنیفہ
بأثار وفقه في حديث	کامات الزبور علی الصغیر
فما فی المشرقین له نظیر	ولا بالمغربین ولا بکوفہ
سایت العائین له سفاها	خلاف الحق مع حج ضعیفہ

حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں کہ ایک بار عبد اللہ بن المبارک کے کچھ تلامذہ ایک مجلس میں
جہتے باہم گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آؤ۔ ابن المبارک کی خوبیاں شمار کریں۔ سب کا فیصلہ یہ تھا
عبد اللہ بن علم، فقہ، ادب، نحو، لغت، زہد، شعر، فصاحت، پارسائی، انصاف، شب بیداری،
لامت رائے، تقلیل کلام اور ساتھیوں سے قلت اختلاف جیسی ساری خوبیاں جمع تھیں۔
طیب بغدادی نے عبّاس بن مصعب کا بھی ایسا ہی تاثر لکھا ہے۔

باوجود ان مناقب و آثار کے عبد اللہ بن المبارک امام اعظم کے اصحاب اور تلامذہ میں سے
نہ۔ فرماتے ہیں اگر اللہ سبحانہ میری ابو حنیفہ اور سفیان ثوری سے مدونہ فرماتے تو میں بھی عام لوگوں
طرح ہوتا اور ان کا اقرار ہے۔

تعلمت الفقه الذی عندي من ابي حنیفہ

امام اعظم کے تلمذ پر فخر کرتے ان کی مدح فرماتے تھے۔

سیرت و منازمی

ان کے علاوہ بھی دوسرے محدثین نے حدیث کے موضوع پر کتابیں مدون کی ہیں اور ساتھ ہی دوسرے موضوعات پر بھی علمی سرمایہ منصفہ شہود پر آیا مثلاً سیرت و تاریخ، فقہ و شریعت، ادب و شعر پر اس دور میں کتابیں لکھی ہیں۔
ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن لکھتے ہیں کہ:

سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے عروہ بن الزبیر نے قلم اٹھایا۔ بعد ازیں ابان بن عثمان شامی نے کام کیا۔ ابان کی علمی تحقیقات کو ان کے شاگرد عبد الرحمن بن المغیرہ نے سیرۃ الرسول کے نام سے یکجا کیا اور محمد بن شہاب الزہری، موسیٰ بن عقبہ نے ان کے بعد منازمی لکھے ہیں۔ بالآخر محمد بن اسحاق نے ان سب کو سیرۃ الرسول کا نام رکھ کر یکجا کیا ہے۔

الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور ابن النذیم نے الفہرست میں ان کا جستہ جستہ ذکر کیا ہے

فقہ و شریعت

اس موضوع کی تفصیلات ہم یہاں نہیں پیش کر سکتے۔ اس پر سیر حاصل مباحث کے لیے آپ کو ہماری دوسری کتاب "امام اعظم اور علم الشریعہ" کا انتظار کرنا چاہیے لیکن ہم یہاں تاریخی ربط قائم رکھنے کے لیے چند اشارات کریں گے۔

علمی حیثیت سے کتاب و سنت اگر دلائل ہیں تو فقہ ان دلائل سے پیدا شدہ نتائج کا نام ہے یا جیسا کہ الخطابی نے معالم السنن میں لکھا ہے کہ قرآن و سنت اگر اساس اور بنیاد ہیں تو فقہ ان بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے یا جیسا حکیم الامت نے بتایا ہے کہ قرآن و سنت اگر سہیسی ہیں تو فقہ کی حیثیت اس سہیسی کے اندر موقی کی ہے۔

زمانہ نبوت میں خود ذات نبوت فقہ و فتاویٰ کا مرکز تھی آپ کے بعد اکابر صحابہ جو شریعت کے رازدار اور احکام اسلامی کے محرم تھے فقہ و فتاویٰ میں آپ کے جانشین تھے حافظ ابن عبد البر

اور حافظ ابن القیم نے امام مرنی سے نقل کیا ہے۔
فقہاء زمانہ نبوت سے آج تک فقہ میں اور تمام احکام میں قیاس سے کام لیتے
ہے ہیں یہ

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں، حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن حزم
نے احکام الاحکام میں فقہ کی تاریخ پر جامع تبصرہ کیا ہے۔
مشہور جو من مؤرخ بروکلیمان نے اقرار کیا ہے:

اسلام کا دامن جزیرہ عرب سے باہر پھیلا۔ نو علمائے زندگی کے اس مرحلے پر
ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے اجتہاد شروع کیا۔ اس طرح اسلام میں فقہ کا
ظہور ہوا۔ یعنی اس عقلی تصرف و عمل نے جو معاشرے میں مختلف فیصلے معلوم
کیے ان کا نام فقہ و تشریع ہو گیا۔
گو لٹریچر کی رائے ہے۔

فقہ و اجتہاد پر اسلام کے شروع ہی سے کام شروع ہو گیا تھا لیکن اس دور کی
علمی حیثیت کچھ نمایاں نہ تھی۔

ان تصریحات سے مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ فقہ و شرائع کا تاریخی رشتہ ذات نبوت اور صحابہ سے
وابستہ ہے بلکہ جیسا کہ ڈاکٹر فیلیپ حتی نے کہا ہے کہ فقہ اسلامی کا دستور ضابطہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم نے حضرت معاذ کو یہ کہہ کر بتایا تھا کہ

اے معاذ! پیش پا افتادہ معاملات کو حل کیسے کرو گے؟ بولے کہ قرآن سے،
حضور نے دریافت فرمایا اگر قرآن میں تمہیں معاملہ کا حل نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟
بولے کہ حضور آپ کی سنت سے، حضور نے پھر پوچھا کہ اگر سنت میں بھی
نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ بولے کہ اجتہاد کروں گا۔ حضور نے یہ سن کر فرمایا
الحمد للہ الذی وفق رسولہ رسول اللہ لما یرضاه۔

یہ درست ہے کہ جیسے سارے صحابہ حفاظ حدیث نہ تھے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ میں سے

حدیث نبوت کو نقل کرنے والے صحابہ مرد و زن کی تعداد کے بارے میں امام حاکم نے المدخل میں لکھا ہے کہ:

قد روي عنه صلى الله عليه وسلم من الصحابة اربعة الاف

رجل وامرأة له

یعنی صرف چار ہزار مرد و زن صحابہ نے احادیث روایت کی ہیں ایسے ہی سارے صحابہ فقہاء بھی تھے بلکہ ان کی تعداد جیسا کہ حافظ ابن القیم نے اعلام میں بتائی ہے۔

والذي حفظت عنهم الفتوى من اصحاب رسول الله صلى الله عليه

وسلم مائة ونيّف وثلاثون نفساً ما بين رجل وامرأة له

یعنی صرف ایک سو تیس مرد و زن سے کچھ زائد ہے اور یہ تعداد بھی ایک جگہ نہیں بلکہ حضرت عمر کے زمانے میں حضرت عمر کی کوششوں کے صدقے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی بنا پر زمانہ صحابہ ہی میں مختلف شہروں میں فقہ کے ایک سے زیادہ علمی ادارے قائم ہو گئے تھے۔ ان شہروں میں مشہور ترین شہر یہ ہیں۔ مدینہ، کوفہ، دمشق، مکہ — مدینہ کے فقہاء کا حافظ ابن خرم نے تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

مدینہ میں صحابہ کے بعد فقہاء میں سعید بن المسیب ہیں۔ ان کا ازواجی تعلق ابو ہریرہ کی صاحبزادی سے ہوا۔ انہوں نے ابو ہریرہ اور سعد بن ابی وقاص سے علمی استفادہ کیا۔ دوسرے عروۃ بن الزبیر بن العوام میرے القاسم بن محمد۔ یہ دونوں حضرت عائشہ کے تلامذہ خاص ہیں سے ہیں چوتھے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود۔ یہ ابن مسعود کے خاص شاگرد ہیں پانچویں خارجہ بن زید۔ انہوں نے اپنے والد زید بن ثابت سے علمی استفادہ کیا۔ چھٹے ابو بکر بن عبد الرحمن۔ ساتویں سلیمان بن یسار۔ یہ حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ کے خاص شاگرد ہیں۔ یہی لوگ فقہاء سبعہ کے نام سے مدینہ میں مشہور ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے فقہ کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے مدینہ کی فقہی اکادمی کا اس طرح تعارف کرایا ہے۔

علم الفقہ اور فتاویٰ کا دار و مدار خلفاء راشدین کے زمانے میں حضرت فاروق اعظم کی ذات گرامی تھی۔ پھر فقہاء صحابہ حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر وغیرہ اس دائرہ علمیہ کے مرکز بن گئے۔ صحابہ کے بعد اس عمل جلیل کی ذمہ داری کا بار فقہاء تبعہ کے کاندھوں پر تھا۔ ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس دائرہ علمیہ میں کام کیا جیسے امام زہری، یحییٰ بن سعید الانصاری، زید بن اسلم وغیرہ۔ ان سب کی علمی وراثت امام مالک کو ملی انہوں نے ان کی حدیثوں اور فتاویٰ کو سینوں سے نکال کر صحیفوں میں جمع و مدون کر دیا ہے۔

مدینہ کی طرح کوفہ میں بھی فقہ کا دائرہ علمیہ زمانہ صحابہ ہی سے کام کر رہا تھا۔ عہدِ مرتضیٰ سے لے کر بغداد کی تعمیر تک وسعت اور کثرت فقر و حدیث میں تمام بلادِ اسلامیہ میں کوفہ ممتاز تھا۔ علامہ نووی نے اسے دار الفضل والفضل، مجد الدین فیروز آبادی نے قبۃ الاسلام لکھا ہے حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

اہل کوفہ نے حضرت علی کے آنے سے پہلے سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر اور ابو موسیٰ اشعرمی سے علم حاصل کیا تھا نیز کوفہ والوں نے قرآن کا عبداللہ بن مسعود سے استفادہ کیا ہے۔ یہ لوگ مدینہ جا کر حضرت عائشہ اور حضرت عمر سے بھی علم حاصل کرتے تھے۔

کوفہ کا یہ دائرہ علمیہ صحابہ کے بعد جن حضرات پر مشتمل تھا حافظ ابن القیم اور حافظ ابن حزم نے ان کے نام لکھے ہیں :

علقمہ بن قیس النخعی، اسود بن یزید النخعی، عمرو بن شراحیل الہمدانی، مسروق بن الابدع الہمدانی، عبیدۃ السلمانی، شریح بن الحارث القاضی، سلیمان بن ربیعہ الباہلی، زید بن صوحان، سوید بن غفلہ، الحارث بن قیس الجعفی، عبدالرحمن بن یزید النخعی، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود القاضی، خثیمہ بن عبد الرحمن سلمہ بن صہیب، مالک بن عامر، عبداللہ بن سنجہ زہری، حبش، خلاس

بن عمرو، عمرو بن مہیون الاودی، ہمام بن الحارث، الحارث بن سوبید، یزید بن معاویہ النخعی، الربیع بن خثیم، عتبہ بن فرقہ، صلتہ بن زفر، شریک بن خبیل، ابو داؤد الشقیق بن سلمہ، علی بن فضلہ۔

یہ نام مکھنہ کے بعد حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے ان سب کے بارے میں لکھا ہے کہ
ہو لا مد اصحاب علی و ابن مسعود

اور ان میں اکثر کے بارے میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ:
اکثرہم اخذ عن عمرو وعائشہ و علی

ان کے بعد کوفہ ہی کے فقہاء میں ابراہیم نخعی، امام شعبی، سعید بن جبیر، القاسم بن عبد الرحمن، ابو بکر بن ابی موسیٰ، محارب بن دثار، حکم بن عتبہ اور جبکہ بن سجم کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ کوفہ میں فقہ و افتاء میں ان کی جانشینی کا شرف

حماد بن ابی سلیمان، سلیمان بن المعتمر، سلیمان بن الاعمش، مسعر بن کدام کو حاصل ہے اور پھر حماد و سلیمان کی وراثت علمی اس شہر میں ابن ابی لیلیٰ، عبد اللہ بن شبرمرہ، سعید بن اشوع، قاضی شریک، القاسم بن معن، سفیان ثوری اور ابو حنیفہ اور الحسن بن صالح کو ملی ہے اور امام ابو حنیفہ کے بعد ان کے اور سفیان ثوری کے جانشین یہ ہیں:

حفص بن غیاث، وکیع بن الجراح، قاضی ابو یوسف، زفر بن الہذیل، حماد بن ابی حنیفہ، الحسن بن زیاد، محمد بن الحسن عافیہ، اسد بن عمرو، نوح بن دراج اور امام ثوری کے ساتھی اسجعی معافی بن عمران، سیحی بن آدم لے

یہ گویا کوفہ میں علماء کوفہ کا وہ فقہی نسب نامہ ہے جو حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے درج کیا ہے۔ شاید اسی نسب جلالہ قدر کی وجہ سے امام اعظم نے ہر سر دربار عباسی حکومت کے سربراہ ابو جعفر منصور کے اس پوچھنے پر کہ اے ابو حنیفہ تم نے کتنے لوگوں سے علم حاصل کیا ہے؟ امام اعظم نے سربراہ مملکت کو جواب دیا تھا کہ میرا علمی نسب نامہ یہ ہے کہ بحوالہ حماد و ابراہیم میں فاروق اعظم، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس کے علمی چشموں سے میرا بھرا ہوں۔ امام اعظم کا یہ جواب سن کر ابو جعفر نے کیا کہا۔ یہی سننا ناچاہتا ہوں۔ ہولا واہ!

تم نے تو ابو خنیفہ اپنا علمی رشتہ الطیبیہیں، الطاہر بن اور المبارک بن صلوات اللہ علیہم اجمعین سے مضبوط
قام کیا ہوا ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے دوسرے شہروں کے مدارس فقہ کا بھی
تذکرہ کیا ہے لیکن ہم نے مدینہ اور کوفہ کو خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان دونوں شہروں
کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں بسند متصل امام
ابن وہب کی زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار امام مالک سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا آپ نے
اس کا جواب دیا اس پر پوچھنے والے کی زبان سے نکل گیا کہ شام والے تو آپ سے اس مسئلہ میں
اختلاف کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ

متی کان هذا الشان بالشام؟ انما هذا الشان وقف علی اهل
المدينة والكوفة۔

یہ نشان شام والوں کی کب سے ہوئی؟ یہ نشان تو صرف مدینہ اور کوفہ
والوں کی ہے۔

ان دونوں شہروں کے فقہاء سب سے مدینہ اور فقہاء کوفہ اصحاب ابن مسعود کے دور کا کوئی
قلمی سرمایہ ہماری معلومات میں نہیں ہے اور بروکھمان کی یہ بات درست ہے :-
ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جس کی مدد سے ہم اس دور

میں فقہ کی کتابی خدمت کا پتہ لگاسکیں۔
لیکن موصوف نے ابن سعد کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے کہ :-
فقہاء سب سے عروہ نے فقہ و تشریع کے موضوع پر قلمی کام کیا،
عروہ کے صاحبزادے ہشام کا بیان ہے کہ :-

میرے والد کی حجرہ والے دن فقہ کی کتابیں نذر آتش ہو گئیں۔ ہشام
افسوس سے کہتے ہیں کہ اگر میرے پاس یہ کتابیں ہوتیں تو مجھے اپنے
مال اور اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہوتیں۔

۱۔ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۲۔ ۲۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۸
۳۔ ۴۔ تاریخ الادب العربی ج ۲ ص ۲۳۲۔ ۵۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۹، جامع بیان العلم ج ۱ ص ۴۵
واضح رہے کہ ہم نے کتاب میں جامع کی روایت لی ہے۔ یہ زیادہ واضح اور صاف ہے۔

علامہ ابن الندیم نے عبد الرحمن بن ابی الزنادیؒ کے بارے میں پتہ دیا ہے کہ انہوں نے۔
 راسی الفقہاء السبعہ کے نام سے کتاب لکھی ہے لیکن یہ دور تصنیف ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ
 اور حافظ عسقلانی نے تہذیب میں اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ یہ کتاب
 ان پر امام مالک کی گرفت کا باعث بنی ہے لیکن عبد الرحمن کے اس کارنامے کی حیثیت اس سے
 زیادہ کچھ مختلف نہیں ہے جو ابوبکر محمد بن موسیٰ نے عبد اللہ بن عباس کے فتاویٰ کتابی صورت میں
 جمع کر کے انجام دی ہے یہ اس دور کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ بعد کا ہے۔

فقہ و شریع میں امام اعظم کی تصانیف

دور تابعین میں فقہ و شریع پر جیسا کہ آپ پہلے سن چکے ہیں سب سے پہلے کام امام اعظم نے کیا ہے
 ڈاکٹر فلیپ حتی نے علم حدیث میں امام اعظم کے بارے میں یہ بتانے کے بعد کہ
 کان من ابرز الذین تخرجوا علی الشیعی الامام ابو حنیفۃ المشہور۔

امام شعبی کے تلامذہ میں سے مشہور امام ابو حنیفہ ہیں۔
 یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں تک فقہ و شریع کی تاریخ کا تعلق ہے اس کی اساس و بنیاد قائم کرنے کا
 سہرا امام اعظم ابو حنیفہ کے سر ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

الامام ابو حنیفۃ المتوفی ۱۵۰ھ الذی وضع الاساس لاول مدارس
 الشرع الاربع فی الاسلام۔

ابو حنیفہ ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے فقہ و شریعت کی اسلام میں اولین
 اساس رکھی ہے۔

فقہ کے موضوع پر ابو حنیفہ کے نام سے اگرچہ کوئی تالیف نہیں ہے اور اس سے کچھ کو یہ غلط فہمی
 ہو گئی ہے کہ فی الواقع اس موضوع پر امام اعظم کا کوئی سرمایہ علمی نہیں ہے لیکن دراصل امام اعظم کے
 مذاق تالیف پر غور نہ کرنے کی وجہ سے دو ستوں کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ تالیف میں
 امام اعظم کا مذاق کیا تھا تو وہ یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ ان کا طریقہ الملاتی تھا۔ زبانی بولتے تلامذہ لکھتے۔
 امام محمد کے نام سے جو کتابیں ہیں ان کی اصل امام اعظم ہی کا سرمایہ علمی ہے۔

فقہ کے موضوع پر امام اعظم کی قدیم ترین کتاب کتاب السیر ہے۔ آپ نے اسے اپنے تلامذہ الحسن بن زیاد، محمد بن الحسن، ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو، حفص بن غیاث، عافیہ بن یزید وغیرہ کو املا کرائی۔ امام اعظم کی یہ کتاب جب امام عبدالرحمن الاوزاعی کے مطالعہ میں آئی تو امام اوزاعی نے اس کا جواب لکھا۔ قاضی ابو یوسف نے امام اوزاعی کی کتاب کا رد لکھا جو الرد علی سیر الاوزاعی کے نام سے مشہور ہے اور طبع ہو چکی ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام میں قاضی ابو یوسف کی کتاب الرد علی سیر الاوزاعی کو روایت کیا ہے۔

امام اعظم نے فقہ میں اختلاف اصحابہ کے نام سے بھی کتاب تالیف کی ہے۔ امام اعظم کی اتنا بیس کے بعد ان کے شاگردوں نے اس میدان میں جو علمی خدمت انجام دی ہے وہ سب کے سامنے عیاں ہے۔ ان میں قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج، کتاب الامالی، الرد علی سیر الاوزاعی مشہور ہیں۔ امام محمد کی تصانیف میں السیر الصغیر، السیر الکبیر، الجامع البکیر، کتاب الرد علی اہل المدینہ، الجامع الصغیر، زیادات، بسوط مشہور ہیں۔

امام حسن بن زیاد کے بارے میں علامہ ابن الندیم نے طحاوی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک سے زیادہ کتابیں تالیف کی ہیں مثلاً کتاب آداب القاضی، کتاب الخصال، کتاب معانی الایمان، کتاب النفقات، کتاب الفرائض، کتاب الخراج۔ ابن ابی لیلیٰ کے بارے میں ابن الندیم نے انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے کتاب الفرائض لکھی ہے نیز محمد بن عبدالرحمن جو ابن ابی ذئب کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی فقہی تالیفات میں بھی کتاب السنن کا ذکر آیا ہے۔

الغرض اس دور میں تصنیف و تالیف کے کام میں کافی ترقی ہوئی اور بہت سے علماء نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں مدون کیں۔

دور صحابہؓ سے ۲۰۰ھ تک حدیث

یہ تو آپ پہلے سن آئے ہیں کہ علم حدیث کے نام سے جو علمی ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے وہ حسب تصریح امام حاکم۔

قد روى عنه صلى الله عليه وسلم من الصحابة اربعة آلاف
رجل وامرأة - ۱

یعنی صرف چار ہزار مرد و زن صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ جن تابعین نے صحابہ کرام سے یہ علم حاصل کیا اور بعد کی نسلوں کی طرف منتقل کیا ہے ان کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف طبقات ابن سعد میں چند مرکز می شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

مدینہ	۴۸۴	کوفہ	۴۱۳
مکہ	۱۳۱	بصرہ	۱۶۴

شاید کوفہ اور مدینہ میں ائمہ تابعین کی اس کثرت تعداد پر آپ حیران ہوں لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں ان دو شہروں کو ہی فقہ و حدیث میں مرکزیت حاصل تھی۔ آپ پیچھے امام مالک کا بیان پڑھ چکے ہیں کہ علم کی دنیا میں صرف ان ہی دو شہروں کو یہ حق حاصل ہے کہ علمی مباحث میں ان کا ذکر کیا جائے۔ علامہ یاقوت حموی نے سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ:

خذوا القرأۃ عن اهل المدينة وخذوا الحلال والحرام عن

اهل الکوفۃ - ۲

قرأت مدینہ والوں سے اور حلال و حرام کی باتیں کوفہ والوں سے لو۔
یہی دو شہر ہیں جہاں کے اتفاق کو کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے جیسے اہل مدینہ کے اتفاق مسان کا تذکرہ امام مالک موطا میں اس طرح کرتے ہیں السنة التي لا اختلاف فيها عندنا ایسے ہو اہل کوفہ کے اجماعی مسائل کو بتانے کے لیے ایسے مواقع پر امام محمد یہ فرماتے ہیں ھو قول ابی حنیفۃ والعامۃ من فقہائنا۔ اور اگر مدینہ والوں کو کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو امام مالک فرماتے ہیں ھذا احسن ما سمعت۔ اور امام محمد اہل کوفہ کے اختلاف کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرماتے ہیں ھو احب الینا۔ الغرض مدینہ اور کوفہ میں ائمہ تابعین کی یہ کثرت کوئی چیز والی بات نہیں ہے۔ ان ائمہ تابعین کے حالات کتابوں میں پڑھیں آپ کو پتہ لگ جائے گا ان لوگوں نے صحابہ کے زمانے کا بہت بڑا حصہ پایا ہے ان میں سے بیشتر وہ ہیں جنہوں نے صحابہ کے گھروں اور صحابیات کی گود میں پرورش پائی ہے۔

مدینہ میں تابعین میں حدیث و آثار کا سرچشمہ اگر سعید بن المسیب، عروہ بن الزہر اور قاسم بن محمد ہیں تو کوفہ میں مسروق، علقمہ اور اسود بن یزید نخعی ہیں۔

سعید کو حضرت ابو ہریرہ جیسے راوی کبیر کے داماد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ عروہ حضرت عائشہ کے بھانجے اور قاسم ان کے بھتیجے ہیں اور ان دونوں کی حضرت عائشہ نے ہی پرورش کی ہے کوفہ کے مسروق بن الاعدع حضرت عائشہ کے متبنی اور لے پاک ہیں۔ علقمہ کی حضرت عبداللہ بن مسعود نے علمی تربیت فرمائی ہے اور ان کو براہ راست فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، ابوالدرداء اور عثمان غنی سے استفادے کا موقع ملا ہے۔ اسود بھی علقمہ کے بھائی اور ابراہیم نخعی کے ماموں ہیں۔ یہ ایک نمونہ ہے، ورنہ سارا گلستان ہی سدا بہار ہے۔ ان تابعین کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے صحابہ سے مل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپ کے ارشادات، خلفاء راشدین کے عدالتی فیصلوں اور فتاویٰ کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ احادیث کا اکثر و بیشتر ذخیرہ ان ہی تابعین کی وساطت سے ان کے تلامذہ کے ذریعے امت کو وراثت میں ملا ہے یہ ان ہی کے تلامذہ ہیں جنہوں نے اپنے ان اساتذہ کے علوم کو سینوں سے صحیفوں میں منتقل کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ جن کی تفصیل ہم اوپر دے چکے ہیں ذرا ایک نظر اس نقشہ پر بھی ڈال لیجئے تاکہ اس دور کی تالیفات کا پورا اندازہ ہو سکے۔ یہ نقشہ ہم نے اکٹائی کی کتاب الرسالۃ المستطرفہ سے تیار کیا ہے ہم یہاں صرف مصنفین کے اسماء گرامی پیش کرتے ہیں۔

۱۵۰ھ	امام اعظم ابو حنیفہ	کتاب الآثار
۱۴۹ھ	امام مالک بن انس	موطأ
۱۵۱ھ	عبدالملک بن عبدالعزیز	کتاب السنن
۱۹۶ھ	دکین بن الجراح	کتاب السنن
۱۶۵ھ	حماد بن سلمہ	کتاب السنن
۱۶۱ھ	سفیان الثوری	جامع
۱۹۸ھ	سفیان بن عیینہ	جامع
۱۵۳ھ	معمر بن راشد	جامع
۱۸۹ھ	محمد بن الحسن الشیبانی	کتاب الآثار

کتاب الجہاد	عبداللہ بن المبارک	۱۸۲ھ
کتاب الذکر والدعاء	قاضی ابویوسف	۱۸۲ھ
کتاب السیرت	محمد بن اسحاق	۱۵۳ھ
المغازی	موسیٰ بن عقبہ	۱۸۱ھ
المغازی	المعتمر بن سلیمان	۱۸۵ھ
ان کے علاوہ علامہ ابن الندیم نے جن مؤلفین کی نشاندہی کی ہے ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے		
کتاب السنن	محمد بن عبدالرحمن ابن ابی ذئب	۱۵۹ھ
کتاب النسخ والمسنوخ	عبدالرحمن بن زید بن اسلم	۱۸۶ھ
کتاب المغازی	عبدالملک بن محمد بن ابی بکر الانصاری	۱۸۶ھ
کتاب السنن	محمد بن الفضل بن غزوان	۱۹۵ھ
کتاب التفسیر	اسماعیل بن علیہ	۱۱۶ھ
کتاب السنن	عبدالرحمن الاوزاعی	۱۵۹ھ
کتاب السنن	الولید بن مسلم القرشی	۱۹۴ھ
کتاب القرآت	اسحاق الازرق	۱۹۵ھ
کتاب السنن، کتاب التفسیر	ابراہیم بن طہمان	۱۶۳ھ

الغرض اس دوسری صدی میں علم حدیث میں بکثرت تصانیف بدون ہو کر عالم اسلامی میں پھیل چکی تھیں اور امام اعظم، امام مالک کے تلامذہ نے تمام عالم اسلامی کو فقہ و حدیث سے معمور کر دیا تھا۔ اسی صدی میں فقہ حنفی اور مالکی کی تدوین ان احادیث و آثار کی روشنی میں مکمل ہوئی کہ جن پر فقہاء صحابہ و تابعین اور ارباب فتویٰ کا عمل درآمد چلا آ رہا تھا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

اور جو شخص کہ ان مذاہب کے اصول پر مطلع ہے وہ اس بارے میں کوئی شک نہیں کرے گا کہ ان مذاہب کی اصل فاروق اعظم کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان مذاہب میں ایک امر مشترک ہے۔ اس کے بعد اہل مدینہ میں سے فقہاء صحابہ جیسے کہ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ ہیں اور کبار تابعین فقہاء سبعہ اور صفار تابعین مدینہ میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالک کے مذاہب کی بنیاد ہے اور اسی طرح حضرت

عبداللہ بن مسعود کے اکثر حالات میں اعتماد اور حضرت علی کے فیصلوں پر بعض حالات میں بشرطیکہ ان فیصلوں کو حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب و اہل بیت کرتے اور مانتے ہوں اور اس کے بعد ابراہیم نخعی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریجات پر اعتماد امام ابو حنیفہ کے مذہب کی بنیاد ہے۔

مصنفین اور تلامذہ امام اعظمؒ

آپ اس صدی میں علم حدیث پر مصنفین کے حالات رجال کی کتابوں میں پڑھیں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں بیشتر امام اعظم کے تلامذہ ہیں یا پھر وہ ہیں جو امام اعظم کے علمی جلال سے بے حد متاثر ہیں کیونکہ اس زمانے میں امام اعظم کے تلامذہ اسلامی دنیا کے چہرہ چہرہ پر پھیلے ہوئے تھے اور ہر جگہ علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کر رہے تھے۔

حافظ عبدالقادر قرشی نے کتاب التعلیم کے حوالہ سے امام اعظم کے تلامذہ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے اور امام حافظ الدین محمد بن محمد الحکمر درمی نے امام اعظم کے خاص تلامذہ کا ذکر کرنے کے بعد من ردی عنہ الحدیث والفقہ کا عنوان قائم کر کے ان کا شمار وار تذکرہ کیا ہے۔ ان شہروں کو آپ دیے ہوئے نقشہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔

امام طحاوی نے ان چار ہزار میں سے چالیس کو مدونین اور مصنفین کتب میں شمار کیا ہے حافظ عبدالقادر نے اسد بن عمرو کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

کان من اصحاب ابی حنیفۃ الذین دونوا الکتب اربعین رجلاً^۱

اصحاب ابو حنیفہ میں جو ارباب تصنیف ہیں ان کی تعداد چالیس ہے۔

اسد بن عمرو کا بھی شمار ان چالیس میں ہے ان کے بارے میں حافظ ابونعیم کی تصریح ہے کہ — اول من کتب کتب ابی حنیفۃ اسد بن عمرو^۲ — حافظ ابو جعفر طحاوی نے چالیس کی جو تعداد بسند متصل اسد بن الفرات^۳ کے حوالہ سے بتائی ہے ان میں سے قاضی ابو یوسف، امام

^۱ قرۃ العینین ص ۱۷۱۔ ^۲ الجواہر المنیۃ ج ۱ ص ۱۴۰۔ ^۳ البزازی ج ۲ ص ۲۴۰۔

^۴ یہ بزرگ قردان کے مشہور قاضی ہیں امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے دوران درس پوچھتے بہت زیادہ تھے امام مالک نے ان کو کوفہ جانے کا مشورہ دیا۔ کوفہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد سے استفادہ کیا۔ علامہ (باقی ص ۴۲۴ پر)

محمد، امام زفر، وکیح بن الجراح، یحییٰ بن زکریا، اور عبداللہ بن المبارک کے بارے میں تو آپ پر چھ چکے ہیں کہ یہ ارباب تصنیف ہیں۔ باقی کے حالات پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ آپ کو امام اعظم اور علم الشرائع میں ملے گا۔ یہ اوراق اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے صرف ان کے اسماء گرامی پیش کرتا ہوں۔

امام داؤد و نصیر الطائی ^{۱۶۰}، امام حفص بن غیاث ^{۱۹۲}، امام یوسف بن خالد القشیری ^{۱۸۹}، امام غافیہ بن یزید ^{۱۸۱}، امام حبان بن علی ^{۱۸۲}، امام مندل بن علی ^{۱۶۸}، امام علی بن مسہر ^{۱۸۹}، امام القاسم بن معن ^{۱۸۵}، امام اسد بن عمرو ^{۱۸۷}، امام فضل بن موسیٰ السنیانی ^{۱۹۲}، امام علی بن نجیان ^{۱۹۲}، امام ہشام بن یوسف ^{۱۹۷}، امام یحییٰ بن سعید القطان ^{۱۹۸}، امام شعیب بن اسحاق و مشقی ^{۱۹۸}، امام حفص بن عبد الرحمن بلخی ^{۱۹۹}، امام حکم بن عبداللہ بلخی ^{۱۹۹}، امام خالد بن سلیمان بلخی ^{۱۹۹}، امام عبد الحمید بن عبد الرحمن ^{۲۰۲}، امام ابو عامر ضحاک ^{۲۰۲}، امام محمد ^{۲۱۲}، امام مکی بن ابراہیم ^{۲۱۵}، امام حماد بن ذلیل ^{۲۱۵}، امام عبداللہ بن ادریس ^{۲۱۵}، امام فضیل بن عیاض ^{۲۱۵}، امام ہشیم بن بشیر ^{۲۱۵}، امام نوح بن دراج الجامع ^{۲۱۵}، امام زبیر بن معاویہ ^{۲۱۵}، امام شریک بن عبداللہ قاضی ^{۲۱۵}، امام نصر بن عبدالکریم ^{۲۱۹}، امام مالک بن مقول ^{۲۱۹}، امام جریر بن حازم ^{۲۱۹}، امام جریر بن عبد الحمید ^{۲۱۹}، امام الحسن بن زیاد ^{۲۱۹}، امام حماد بن ابی حنیفہ ^{۲۱۹}، امام ابو عصمہ نوح بن مریم ^{۲۱۹}۔

بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں علم حدیث کی کتابی خدمت کی گئی ہے اور اس خدمت کا فرض امام اعظم اور امام مالک کے تلامذہ نے انجام دیا ہے۔ تیسری صدی میں آنے والے محدثین بخاری و دیگر ارباب سنن اور مسانید نے ان ہی سے علم حدیث حاصل کیا ہے۔

ص ۲۳ کا بقیہ حاشیہ، ابوالسحاق الشیرازی نے طبقات الفقہاء میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ موصوف مصر تشریف لے گئے اور مالکی مذہب کے ترجمان عبداللہ بن وہب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہذا کتب ابی حنیفہ یہ امام اعظم کی کتابیں ہیں مجھے کچھ سوالات کے جوابات مذہب مالک کے مطابق درکار ہیں۔ ابن وہب طرح دے گئے وہاں سے ابن القاسم کے پاس آئے اور پھر قیردان واپس آ گئے۔ لکھا ہے کہ قیردان میں ابو حنیفہ کی کتابوں کے صدقے ہی ان کو علمی جلال ملا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کتابوں کی ایک نقل ابن القاسم کی درخواست پر موصوف نے ابن القاسم کو بھی دی (الانتقام ص ۵۰)

تیسری صدی میں علم حدیث

کتاب الآثار سے پہلے پہلی صدی میں جس قدر صحیفے اور مجموعے تیار ہوئے ان کی ترتیب فنی نہ تھی بلکہ ان کے جامعین نے تفسیر، سیرت، مناقب، احکام، مغازی سب قسم کی حدیثوں کو یکجا کرنے اور یکٹنے کی کوشش کی اور اس کوشش کا اولین سہرا یقیناً ان کے سر ہے۔ امام شعبی نے بے شک حسب تصریح حافظ سیوطی بعض مضامین کی حدیثوں کو ایک ہی باب کے تحت لکھا تھا لیکن یہ کوشش بالکل ابتدائی تھی اس لیے احادیث کو کتابوں اور بابوں پر پوری طرح مرتب کرنے کا کام ابھی باقی تھا جسے امام اعظم نے کتاب الآثار تصنیف کر کے نہایت خوش اسلوبی سے مکمل فرمایا اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے ترتیب و تبویب کی ایک عمدہ مثال قائم کر دی۔ نیز دوسری صدی تک حدیث وفقہ یکجا تھے اور احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور فتاویٰ سے بھی استدلال کیا جاتا تھا۔ مسند و مرسل اور صحیح و حسن کی کوئی تقسیم نہ تھی۔ چنانچہ اسی اساس پر دوسری صدی میں ساری کتابیں مرتب ہو کر منصفہ صحافت پر آئیں۔

علم حدیث میں کثرت طرق

تیسری صدی میں علم حدیث کو فنی ترقی ہوئی اور اس فن کے ایک سے زیادہ شعبے رونما ہو گئے محدثین نے طلب حدیث میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ ایک ایک شہر ایک ایک گاؤں میں پہنچ کر تاریخ سنت کو اس قدر مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا ایک ایک حدیث کے لیے ایک سے زیادہ سندیں تلاش کیں تاکہ ان کے فن کے لحاظ سے وہ حافظ حدیث فن حدیث میں یتیم شمار ہونے لگا جسے ایک حدیث کم از کم سو سندوں سے معلوم نہ ہو۔ چنانچہ ابو اسحاق جوہری جو امام مسلم اور دوسرے محدثین صحاح کے استاد ہیں فرماتے ہیں :

کل حدیث لا یکون عندی من مائتہ طرق فانافیہ یتیم

حدیث اگر میرے پاس سو طریقوں سے نہ ہو تو میں حدیث میں یتیم ہوں

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے الروض الباسم میں بعض حفاظ حدیث کی طرف نسبت کر کے

لکھا ہے کہ واقع میں ابو بکر الصدیقؓ کی حدیثیں تو پچاس سے زیادہ نہیں ہیں مگر حفاظ حدیث کے پاس ابو بکرؓ کی حدیثوں پر مشتمل ضخیم کتاب دیکھ کر ان سے دریافت کیا گیا کہ ابو بکرؓ کی حدیثیں تو زیادہ سے زیادہ پچاس ہیں مگر یہ کتاب مسند ابی بکر کے نام سے کیسی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک حدیث مجھے کم از کم سو طریقوں سے دستیاب نہ ہو تو اپنے آپ کو حدیث میں یتیم سمجھتا ہوں۔ دوسری صدی کے مؤلفین براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تبع تابعین کے شاگرد دیکھتے۔ بدین وجہ ان کے یہاں کثرت طرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور امام اعظم نے زمانہ صحابہ یا تابعین سے اس لیے ان کی ذات کے بارے میں طرق و اسانید کی بہتات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس کثرت طرق کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیسری صدی میں ایک ایک شخص حفظ حدیث میں ترقی کے آخری مقام پر پہنچ گیا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں نے مسند کو سات لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے امام ابو زرہ عمر رازی کہتے ہیں کہ امام احمد کو ایک کروڑ حدیثیں نوک زبان تھیں۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ میں نے ایک کروڑ حدیثیں اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث زبانی یاد ہیں۔ امام مسلم کہتے ہیں کہ میں نے صحیح تین لاکھ حدیثوں سے لکھی ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ میں نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں اور سنن اسی کا انتخاب ہے۔ امام حاکم نے مدخل میں لکھا ہے کہ ایک ایک حافظ پانچ لاکھ حدیثیں یاد رکھتا تھا۔ ابو بکر محمد بن عمر رازی کہتے ہیں کہ حافظ ابو زرہ عمر رازی کو سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔

محدثین و حفاظ کے مراتب

کثرت طرق کی وجہ سے علم حدیث میں حدیث کے فن کاروں کے مراتب قائم ہوئے، مسند، شیخ، حافظ، محدث، حجتہ اور حاکم کی اصطلاحیں رونما ہو گئیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے منظومہ علم الاثر میں، حافظ زین الدین عراقی نے الفیہ میں اس پر بحث فرمائی ہے لیکن دوسری صدی کے مؤلفین میں یہ مراتب نہ تھے ان کے یہاں محدث اور حافظ کو ایک ہی معنی میں بولتے ہیں چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں :-

قد كان السلف يطلعون المحدث والمافظ لمعنى له
سلف کے نزدیک محدث اور حافظ کے ایک ہی معنی تھے۔

تیسری صدی میں اہل حدیث، صاحب حدیث یا محدث اس وقت تک کسی کو نہ کہا جاتا جب
تک بیس ہزار حدیثیں قلم بند نہ کرے چنانچہ حافظ ابو سعد اسحاقی نے حافظ ابو زرہ الرازی کے
حوالہ سے بتایا ہے کہ:

جو شخص بیس ہزار احادیث نہیں لکھتا اس کا شمار اہل حدیث میں نہیں
ہو سکتا۔

جب کہ تیسری صدی میں محدث ہونے کے لیے صرف حفظ حدیث ہی کافی تھا چنانچہ بیہیم
بن بشیر امام احمد کے استاد فرماتے ہیں:

جو شخص حفظ حدیث نہیں کرتا وہ ہرگز محدث نہیں ہے یہ

بالآخر ترقی کر کے تیسری صدی میں محدث ہونے کے لیے اہل حق سے ہونے کی گرفت
بھی ڈھیلی کر دی گئی اور اہل حدیث صرف فن کاروں کے لیے استعمال ہونے لگا حتیٰ کہ حافظ
محمد بن ابراہیم الوزیری نے اعلان کر دیا کہ:

هؤلاء هم اهل الحديث من اى مذهب كانوا كذا لك

اهل العربية واهل اللغة فان اهل كل فن هم اهل

المعرفة فيه۔

خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوں اہل حدیث ہیں جیسے اہل لغت

اور اہل عربیت، اہل فن وہ ہی کہلاتے ہیں جو اس میں فنکار ہوں یہ

جب کہ دوسری صدی کے مؤلفین احادیث لینے میں تدبیر کو پیش نظر رکھتے تھے۔ امام مسلم نے
مقدمہ میں سیدنا تابعین امام ابن سیرین کے بارے میں بتایا ہے کہ:

یہ علم دین ہے یہ دیکھو کہ تے کس سے ہے ہوا پنا دین۔

امام بیہقی نے ابراہیم نخعی کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

ہم اے یہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی سے حدیث لینا ہوتی تو اس

کے اخلاق دیکھتے، اس کی نماز دیکھتے، اس کے احوال کی چھان بین کرتے
پھر اس سے حدیث لیتے رہے

حدیث میں مولفات کا توسع

علم حدیث کی اسی پہنائی اور وسعت کا تصنیف و تالیف پر بھی تیسری صدی میں اثر پڑا اور اس کے نتیجے میں جو ارمح اور سنن کے ساتھ تصنیف و تالیف کی بے شمار انواع و اقسام منقذہ صحافت پر آگئیں مثلاً۔

مسانید، مصنفات، صحاح، مستخرجات، اجزاء، معاجم، طبقات، موضوعات،
مشینات، العلل، العوالی، الاطراف، الزوائد، تخریجات، الافراد، الغرائب
وغیرہ وغیرہ۔

دوسری صدی کے مؤلفین چونکہ براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تابعین کے فیض یافتہ تھے۔
اس لیے ان کو اسناد کے بائے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت پیش آتی تھی لیکن تیسری صدی میں
اسنادی وسائل پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے اس لیے تیسری صدی میں محدثین کو اس سلسلے میں ایک
سے زیادہ فنون سے دوچار ہونا پڑا۔ اور جمع روایات، تنقید احادیث اور اصول روایت کے سلسلے
میں بہت سی ایسی نئی چیزیں پیدا ہو گئیں جن کی بنا پر اس دور کے مصنفین کو حدیث کی تدوین
اپنے اپنے مذاق کے مطابق کرنی پڑی اور تصنیف و تالیف میں یہ گونا گویا انواع و اقسام رونما ہو گئے۔

علم حدیث میں مسانید کی تالیف

سب سے پہلے تیسری صدی کے مؤلفین نے حدیث کو آثار صحابہ سے علیحدہ کر کے مسند حدیثیں جمع
کیں۔ ہر راوی کی تمام پریشان اور غیر مرتب روایات کو یکجا کیا اور اس طرح مسانید کی تصنیف کا آغاز
ہوا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تیسری صدی کے مشاہیر محدثین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:
”تا آنکہ کچھ ائمہ کی یہ رائے ہوئی کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مستقل
طور پر علیحدہ کیا جائے اور یہ تیسری صدی کے آغاز میں ہوا چنانچہ عبید اللہ

بن موسیٰ کوفی، مسدد بن مسرہ بصری، اسد بن موسیٰ اموی اور نعیم بن حماد خزاعی نے ایک ایک مسند تصنیف کی۔ دوسرے ائمہ بھی ان کے نقش قدم پر چلے اور حفاظ حدیث میں مشکل ہی سے کوئی امام ہو گا کہ جس نے اپنی احادیث کو مسانید پر مرتب نہ کیا ہو چنانچہ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ اور ان جیسے دیگر اکابر نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور بعض محدثین نے جیسے ابوبکر بن ابی شیبہ ابواب و مسانید دونوں عنوانوں پر کتابیں لکھیں۔

امام حاکم المدخل میں رقمطراز ہیں :

یہ مسانید جو اسلام میں تصنیف ہوئے ہیں صحابہ کی مرویات ہیں ان کا سلسلہ سند معتبر اور مجروح ہر قسم کے راویوں پر مشتمل ہے مثلاً مسند عبید اللہ بن موسیٰ اور مسند ابی داؤد و طیالسی۔ یہ دونوں پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسانید لکھی ہیں ان دونوں کے بعد احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، زہیر بن ہرب اور عبید اللہ بن عمر قوامی نے مسانید ترتیب دیے۔ بعد ازیں کثرت سے تراجم رجال پر مسانید مرتب ہوئے اور ان سب کے جمع کرنے میں صحیح و سقیم کے امتیاز کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔

علامہ محمد بن اسماعیل یمانی نے مسند کی یہ تعریف کی ہے کہ :

ان يذكر فيه ما ورد عن ذلك الصحابي جميعه فيجمع الضعيف و غيره .

المکتابی نے جو مسند کی تعریف فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمائیے :
وہ کتابیں جن کا موضوع صرف یہ ہے کہ ہر صحابی کی حدیثوں کو الگ الگ بیان کیا جائے چاہے یہ صحیح ہوں یا ضعیف، ان کی ترتیب اسماء صحابہ میں حروف ہجاء کے مطابق ہوتی ہے۔

گو یا مصنفین مسانید کا پیش نہاد صرف یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے تمام منتشر ذخیرے کو یکجا کر دیا جلتے اور ایک صحابی کی جس قدر روایتیں مل سکتی ہیں ان کو سمیٹ دیا جائے اور چونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر راوی کی ہر روایت صحیح سند ہی سے منقول ہو اس لیے جس سند سے اور جس طریقے سے بھی وہ روایت مصنف کو پہنچی وہ اسے بالسند درج کر دیتا ہے۔ بدین وجہ صرف صحیح روایات کی یکجائی ان کے موضوع سے خارج اور ان کی شرط تصنیف کے منافی ہے کیونکہ ان کی شرط تو صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک صحابی کے نام سے تمام کچا پکا، صحیح اور غیر صحیح، قوی و غیر قوی، قابل قبول اور ناقابل قبول سرمایہ ہر طرف سے تلاش اور جستجو کے بعد فراہم کر دیا جائے تاکہ کوئی روایت مدون ہونے سے مزہ جلتے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری فرماتے ہیں :

و شرط اھلہا ان یفردوا حدیث کل صحابی علیحدۃ من غیر نظر

الی الابواب ویستقصون جمیع حدیث ذالک الصحابی کلمہ سواد

روایہ من یحتج بہام لا فقصہم حصہ جمیع ما روی عنہ

اس کا مطلب یہی ہے کہ اہل مسانید کے پیش نظر ہر قسم کے سرمایہ کی فراہمی ہوتی ہے۔ شاید آپ خلش محسوس کریں کہ اس فراہمی سے ان بزرگوں کا مقصد کیا تھا وہ ایسا کیوں کر ہے؟ دراصل ان بزرگوں کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ سارا ذخیرہ یکجا ہو کر آجائے گا تو اہل فن اصول تنقید اور قواعد روایت کے مطابق ان تمام روایات کی جانچ پڑتال کر کے ہر روایت کے بارے میں رائے قائم کر سکیں اور ساتھ ہی ایک ایک حدیث کے لیے طرق و اسانید کا بیش بہا ذخیرہ جمع ہو کر حدیث کے روایتی اسنادی استحکام کا ذریعہ ہو جائے۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری فرماتے ہیں :

ھذک المسانید الکبار التی یذکر فیہا طرق الاحادیث

ان مسانید سے حدیث کے طرق اور اسانید کا علم ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث اگر متعدد صحیح طرق سے آئی ہے تو وہ روایتی نقطہ نظر سے قوی سے قوی تر ہو جاتی ہے اور اگر ضعیف طرق و اسانید سے بھی آئے تو یہ ضعیف طرق صحیح حدیث کے لیے توابع اور شواہد کا کام دیتے ہیں۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں :

مالها من المتابعات والشواهد

اس دور میں اگرچہ مسانید بہت لکھے گئے ہیں مگر ہم اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند مؤلفین کا ذکر کرتے ہیں۔

مسند امام ابی داؤد طیالسی	۲۲۴ھ	مسند مسدد بن مسرید
مسند عبید اللہ بن موسیٰ کوفی	۲۲۶ھ	مسند ابی جعفر عبد اللہ بن محمد
مسند یحییٰ بن عبد الحمید حماتی کوفی	۲۲۶ھ	مسند ابی جعفر محمد بن عبد اللہ کوفی
مسند ابی اسحاق ابراہیم بن سعید	۲۵۲ھ	مسند ابی یعقوب التمشخی
مسند ابی الحسن علی بن الحسن	۲۴۲ھ	مسند ابی الحسن محمد بن مسلم
مسند ابی زرہ رازی	۲۶۶ھ	مسند ابی یاسر عمار بن رجاہ
مسند ابی بکر احمد بن منصور	۲۸۰ھ	مسند ابی سعید عثمان بن سعید
مسند ابی الحسن علی بن عبد الغفری	۲۹۰ھ	مسند ابی عبد الرحمن نعیم بن الطوسی
مسند ابی یعقوب اسحاق بن ابراہیم	۲۴۲ھ	مسند ابی جعفر احمد بن منیع
مسند ابی الحارث بن محمد	۲۳۹ھ	مسند ابی الحسن عثمان بن محمد
مسند ابی عبد اللہ محمد بن یحییٰ	۲۴۹ھ	مسند عبد بن حمید
مسند ابی بکر عبد اللہ بن الزبیر	۲۱۳ھ	مسند محمد بن یوسف الغریابی
مسند احمد بن سنان	۲۲۶ھ	مسند الحسین بن داؤد المصیصی
مسند ابی بکر احمد بن عمرو البصری	۲۶۶ھ	مسند احمد بن حازم
مسند احمد بن مہدی الاصفہانی	۲۵۱ھ	مسند اسحاق بن منصور نیشاپوری
مسند محمد بن ابراہیم بن مسلم	۲۵۲ھ	مسند یعقوب بن ابراہیم الاوائی
مسند محمد بن الحسن ابی عبد اللہ	۲۶۲ھ	مسند یعقوب بن شیبہ بصری
مسند ابراہیم بن اسماعیل	۲۸۹ھ	مسند الحسین بن محمد نیشاپوری
مسند احمد بن علی المروزی	۲۹۵ھ	مسند ابراہیم بن معقل نسفی
مسند احمد بن حنبل	۲۴۱ھ	مسند یحییٰ بن مخلد

مسانید میں اولیت

ان تمام مسانید میں تاریخی طور پر اگرچہ اولیت کا مرتبہ جیسا کہ الحاکم نے لکھا ہے کہ :

ادل من صنف المسانید علی تراجم الرجال فی الاسلام عبید اللہ بن موسیٰ
العسّی والبوداد و الطیالسیؑ

عبید اللہ بن موسیٰ کوئی کے مسند کو اولیت حاصل ہے کیونکہ مسند طیالسی در حقیقت البوداد و طیالسی کی تصنیف
منہیں بلکہ اس کے جامع خراسان کے کچھ محدثین ہیں۔ امیر میانی فرماتے ہیں کہ اس کی حیثیت مسند شافعی سے کچھ
زیادہ مختلف نہیں ہے علامہ بقاعی کہتے ہیں کہ مسند طیالسی کو جن بزرگوں نے اولین مسند قرار دیا ہے ان کے
پیش نظر صرف یہ ہے کہ مصنفین مسانید میں زمانی لحاظ سے البوداد کا زمانہ سب سے پہلے ہے اور یہ مسند البوداد
کی تصنیف ہے مگر یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ

انہ لیس من تصنیف ابی داؤد انما جمعه بعض الحفاظ الخراسانیینؑ

یعنی یہ امام البوداد کی تصنیف نہیں بلکہ بعض خراسانی محدثین نے بعد میں یہ کام انجام دیا ہے۔ اور
عبید اللہ بن موسیٰ کے بارے میں محدثین کی تصریح کہ مسند خود ان کا تصنیف کردہ ہے۔ عبید اللہ پر تشیع کی تہمت
ہے۔ البوداد نے ان کو شیعہ لکھا ہے۔ الذہبی نے العابد من کبار علماء الشیعہ سے ان کا چہرہ شروع کیا ہے
مگر یاد ہے کہ اس دور میں شیعہ ہونے کا مفہوم آج کے مطابق نہ تھا۔ اس دور میں شیعہ ہونے کا صرف مطلب
ہوتا ہے کہ حضرت علی کو باقی صحابہ پر مقدم کیا جائے چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ:
التشیع دھو تقدیم علی علی الصحابۃ رضی اللہ عنہم اجمعینؑ

اور شیعہ محرق یا غالی ہونے کا مطلب دوسری صدی میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ بتایا ہے کہ:

الغیبی الغالی فی زمان السلف و عرفہم ہو من تکلم فی عثمان و الزبیر و طلحہ
و طائفة ممن حارب علیاً و تعرض بہمؑ

اس لیے عبید اللہ بن موسیٰ کا تشیع بھی اس دور میں اس نوع کا تھا۔ ان کو امام اعظم سے استفادے
کا بھی موقع ملا ہے۔ چنانچہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو دوسرے محدثین کے ساتھ امام اعظم
کے تلامذہ میں شمار کیا ہےؑ

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر نبوی حدیث اور تدوین شرائع میں اولیت کا سہرا
امام اعظم کے سر ہے ایسے ہی مسانید کی اولیت کا شرف بھی بواسطہ عبید اللہ بن موسیٰ امام اعظم کو ہی حاصل

۱۔ الرسالہ المستطرفہ ص ۵۲۔ ۲۔ توضیح الافکار ص ۲۲۹۔ ۳۔ تدریب الراوی ص ۲۱۹۔

۴۔ لسان المیزان ج ۱ ص ۱۴۔ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۹۔

ہے۔ عبید اللہ بن موسیٰ ایک طرف اگر امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں تو دوسری طرف امام بخاری رحمہ اللہ کے
 اساتذہ میں سے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں عبید اللہ بن موسیٰ کو
 امام بخاری کے اساتذہ کے پانچ طبقوں میں سے اولین طبقہ میں شمار کیا ہے۔ اس طبقے میں امام بخاری
 کے اساتذہ یہ ہیں۔ محمد بن عبد اللہ انصاری، مکی بن ابراہیم، ابو عاصم النبیل، عبید اللہ بن موسیٰ، ابو نعیم،
 خلاو بن یحییٰ، علی بن عیاش اور عصام بن خالد۔ اور لکھا ہے شیوخ هؤلاء کلہم من التابعین
 ان کے اساتذہ تابعین ہیں لہ

مسند امام احمد بن حنبل کی عظمت

اگرچہ تاریخی لحاظ سے اقدیمیت عبید اللہ بن موسیٰ کو حاصل ہے لیکن اس صدی کے تمام مسانید میں جو ثمر
 اور بلندی مسند امام احمد کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں امام موصوف نے جمع و ترتیب کا کام
 میں شروع کیا تھا چنانچہ المنہج میں ہے۔

مسند میں مسند کا کام شروع ہوا تھا۔ (ص ۲۱)

اس کی تالیف کا پس منظر خود امام نے یہ بتایا ہے کہ اگر علماء میں کبھی کسی حدیث میں اختلاف ہو تو یہ
 کتاب یعنی مسند احمد اس روایت کے استناد و عدم استناد میں دستاویز کا کام دے سکے چنانچہ امام
 ممدوح کے صاحبزادے عبید اللہ بن احمد کا بیان ہے۔

میں نے اپنے والد احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ آپ کتابیں مرتب کرنے سے
 کیوں منع کرتے ہیں؟ حالانکہ آپ نے خود بھی مسند لکھی ہے آپ نے جواب
 میں فرمایا۔ یہ کتاب میں نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے لکھی ہے جب سنت
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں لوگوں میں کوئی اختلاف رونما ہوگا
 وہ اس کی طرف رجوع کریں گے لہ

اور آپ کے برادرزادے حنبل بن اسحاق کہتے ہیں کہ

ہم سے امام احمد نے فرمایا کہ اس کتاب کو میں نے ساڑھے سات لاکھ
 روایتوں سے انتخاب کر کے جمع کیا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی جس حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو تم اس کتاب کی طرف رجوع کرو اگر

اس میں وہ روایت مل جاتے تو قبہا ورنہ وہ حجت نہیں ہے

اگرچہ مسند کی تالیف کا کام سلسلہ میں شروع ہوا ہے لیکن امام موصوف اس کی جمع و ترتیب کا کام ساری زندگی کرتے رہے اور یہ کام کچھ اس قدر اٹھانے کے ساتھ کیا کہ اس کی تیسری تنظیم اور ترتیب کی طرف متوجہ نہ ہو سکے ان کے پیش نظر صرف جمع و تدوین تھی اس کی خاطر انہوں نے پورے زندگی کے شب و روز صرف کر دیے۔ مسودات کی صورت میں اوراق متفرقہ کا یہ مجموعہ ان کے پاس موجود تھا اور ابھی تشنہ تکمیل تھا کہ امام مدوح کو سفر آخرت پیش آگیا۔ حافظ ابوالخیر شمس الدین جوزی المصعد الاحمد فی ختم مسند الامام احمد میں فرماتے ہیں :

امام احمد نے مسند کی جمع و تدوین کا کام شروع کیا اسے ورقوں میں الگ الگ لکھا پھر اسے جدا جدا اجزائے تقسیم کیا تا آنکہ اس نے ایک سو سے کی صورت اختیار کر لی۔ بعد ازیں تکمیل سے پہلے ہی پیام موت آگیا۔ انہوں نے اپنی اولاد اور اہل بیت کو اسے پہلی فرصت میں سنا ڈالا اور قبل اس کے کہ اس کی تیقح و تہذیب پوری ہوتی، آپ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور مسودہ جوں کا توں رہا۔ پھر ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد نے ان روایات کے مشابہ اور مماثل مسموعات بھی اس میں شامل کر دیے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند احمد صرف امام کی محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کے اضافے بھی ہیں۔ اگرچہ جو کچھ اضافہ ہے اس کا اکثر حصہ عبداللہ بن احمد نے امام احمد ہی سے سنا ہے لیکن یہ وہ حصہ ہے جسے مسند کا املا کرتے وقت امام احمد انہیں نہیں کرا سکے۔ امام عبداللہ بن احمد کی جلالت شان کا اندازہ کرنا ہو تو طبقات میں ابن یعلیٰ کی شہادت پڑھیے۔

صالح اپنے والد امام احمد سے بہت کم لکھتے ہیں لیکن عبداللہ نے اپنے والد سے اتنی زیادہ روایت کی ہے کہ دنیا میں کوئی ان کا حریف نہیں بن سکتا انہوں نے مسند، تفسیر، ناسخ و منسوخ، تاریخ حدیث، آیات

کتاب اللہ کی تقدیم و تاخیر، جوابات قرآن اور مناسک کبیر و صغیر کا علم حاصل کیا اس کے علاوہ دوسری مصنفات اور احادیث شیوخ کا مطالعہ کیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکابر شیوخ عبد اللہ کی معرفت رجال اور معرفت عمل کو مانتے ہیں عبد اللہ طلب حدیث ہیں ہمیشہ سرگرم رہے غرض سلف سے خلف تک عبد اللہ کے علم و فضل اور جلالت شان کا سب کو یکساں اقرار ہے یہ

مسند کا موجودہ نسخہ امام موصوف کے صاحبزادے عبد اللہ ہی کا ترتیب دادہ ہے اس میں انہوں نے اپنے والد کی جمع کی ہوئی حدیثوں کو ایک خاص طریق پر یکجا کیا ہے۔ عبد اللہ کے بعد کچھ محدثین نے اس ترتیب کو بدلنے کی خواہش کی ہے عبد اللہ کی ترتیب پر حافض، بیہی تنقید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اگر امام عبد اللہ مسند کو صحیح مرتب کر دیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ شاید اللہ سبحانہ اپنے کسی بندے کو توفیق دے کہ وہ اس کی خدمت کرے اس پر عنوان قائم کرے اور اس کے رجال پر بحث کرے اس کی وضع و ہیئت بدل دے اس مجموعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا کثیر حصہ موجود ہے اور بہت کم ایسا ہے کہ صحیح حدیث تو ہو لیکن اس مجموعہ میں نہ ہو۔ البتہ حسان کا استیعاب اس میں نہیں ہے گو اکثر یہ بھی موجود ہیں باقی غریب اور ضعیف روایات تو ان کی مشہور روایتیں اس میں موجود ہیں۔ ہاں ان حدیثوں کا بڑا حصہ چھوڑ دیا ہے جو سنن اربعہ اور معجم طبرانی وغیرہ میں موجود ہے یہ

باوجودیکہ اس میں جیسا کہ حافظ شمس الدین الحسینی نے التذکرہ برجال العشرہ میں تصریح کی ہے چالیس ہزار حدیثیں آگئی ہیں پھر بھی احادیث صحیحہ کی بہت بڑی تعداد اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

امام احمد سے اس کتاب میں بہت سی صحیح حدیثیں چھوٹ گئی ہیں،

باوجودیکہ کہ کوئی اور مسند کثرتِ احادیث اور حسنِ ادائیگی اس کے ہم پلہ نہیں ہے بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جماعتِ صحابہ میں دوسو کے قریب ایسے حضرات کی روایتیں اس میں موجود نہیں کہ جن سے صحیحین میں احادیث آئی ہیں یہ کیا مسند میں موضوعِ احادیث بھی ہیں؟

یہ سوال بھی اربابِ تحقیق کے یہاں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر محدثین اور محققین نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حافظِ عراقی کو اس پر اصرار ہے کہ مسند میں بہت سی حدیثیں ضعیف ہیں اور موضوع بھی ہیں لیکن موضوع کم ہیں۔ حافظِ عراقی نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں ان حدیثوں کی نشاندہی کی ہے جن کے بارے میں اہل فن کہتے ہیں کہ یہ حدیثیں موضوع ہیں۔ چنانچہ حافظ ابو موسیٰ المدینی نے ان میں سے بعض روایات کا خلاصہ المسند میں تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدوفی الذب عن مسند احمد میں ان احادیث پر پیدائندہ اعتراضات کا جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مسند میں کوئی حدیث موضوع نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اے تو تسلیم کرتے ہیں کہ مسند میں کچھ حدیثیں ضعیف ہیں لیکن یہ نہیں ماننے کہ امام احمد کی روایت کردہ کوئی حدیث مسند میں موضوع بھی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

مسند میں روایت کی شرط انہوں نے یہ رکھی ہے کہ کسی ایسے راوی سے روایت نہیں لیں گے جو دروغ گوئی میں ان کے یہاں معروف ہو یا ان کے صاحبِ خبر کے عبداللہ نے مسند میں کچھ اضافے کیے ہیں بعد ازیں عبداللہ کے شاگرد ابو بکر قطعی نے بہت سی موضوع حدیثیں زیادہ کر دی ہیں بحقیقت حال سے ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ موضوع حدیثیں بھی امام احمد ہی کی روایت کردہ ہیں حالانکہ یہ خیال سراپا غلط ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی بھی حافظ ابن تیمیہ کے اس میں ہم زبان ہیں مگر تین یا چار حدیثوں کے بارے میں ان کو خود تامل ہے۔ چنانچہ تعجیل المنفعة میں فرماتے ہیں کہ:

مسند میں تین یا چار حدیثوں کے سوا کوئی بے اصل یا موضوع نہیں ہے۔

علامہ ابن الجوزی نے ان لوگوں کی بڑی شد و مد سے تردید کی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ

مسند میں کوئی حدیث ضعیف نہیں ہے۔ پروفیسر محمد ابو زہرہ نے اپنی مشہور کتاب "احمد بن حنبل" میں ابن الجوزی کی کتاب صند الخاطر سے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں فرماتے ہیں :-

مجھ سے بعض اصحاب حدیث نے دریافت کیا کہ مسند میں کچھ حدیثیں ایسی ہیں جو صحیح نہیں ہیں میں نے کہا کہ ہاں۔ میری یہ بات ان لوگوں پر گراں گزری جو مذہب حنبلی سے تعلق رکھتے ہیں میں نے ان لوگوں کی حرکت کو اس پر محمول کیا کہ یہ گروہ عوام ہے اور ان کی بات ناقابل التفات ہے۔ اسی دوران ان لوگوں نے فتوے لکھے ہیں ان کی اس حرکت پر بے حد حیران ہوا اور دل میں کہا کہ کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اہل علم بھی عوام جیسی باتیں کرتے ہیں اور یہ بات صرف اس لیے ہے کہ انہوں نے حدیث کا نام تو سن لیا مگر ان کو صحیح اور سقیم کی پرکھ نہیں ہے

بہر حال اس موضوع پر علماء کی آراء مختلف ہیں اور یہ بات ہمیشہ سے بحث و نظر کا مرکز رہی ہے کہ مسند میں کوئی روایت موضوع موجود ہے یا نہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں حافظ ابن تیمیہ کا وہ فیصلہ پسند ہے جو انہوں نے اسی سے متعلق اپنی کتاب "التوسل والوسیلہ" میں درج کیا ہے۔

اگر موضوع سے مراد یہ ہے کہ کسی کذاب راوی کی حدیث مسند میں ہے تو یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور اگر مقصود یہ ہے کہ حضور کی کوئی بات کسی ایسے راوی کی راہ سے آئی ہے جو غلط گو یا حافظ کی کمی کا شکار ہے تو یہ بالکل درست ہے مسند اور سنن میں ایسی حدیثیں موجود ہیں۔

کچھ ہو لیکن مسند احمد کی اس خصوصیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسند احمد دوسرے تمام مسانید سے زیادہ صحیح ہے جیسا کہ حافظ نور الدین ہتیمی نے نمائندہ المقصد فی زوائد المسند میں تصریح کی ہے :

مسند احمد اصح صحیحاً من غیرہ

مسند احمد دوسرے مسندوں سے زیادہ صحیح ہے۔

اگرچہ مسند بقی بن مخلد مسند احمد سے زیادہ وسعت رکھتا ہے جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کی

راتے ہے کہ :

و من ادسعا مسند بقی بن مخلد^۱

مسانید میں سب سے وسیع مسند بقی بن مخلد ہے

اور اس کی دستوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس میں تیس سو صحابہ سے زیادہ اکابر کی روایات کا ذخیرہ ہے۔ اور اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ بیک وقت مسند بھی ہے اور مصنف بھی۔ اولاً کتاب کو صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے اور پھر صحابی کی روایات کو بترتیب فقہی یکجا کیا ہے اس لحاظ سے یہ کتاب مسند اور مصنف دونوں کا کام دیتی ہے لیکن اس کے باوجود مسند احمد جیسی اسے مقبولیت نہیں ہے بہر حال مسند احمد اس دور کے تمام مسانید میں اعلیٰ، اشرف اور احادیث کا بہت بڑا مجموعہ ہے۔ — خیر یہ بات تو ایک ضمنی بات کہ تیسری صدی میں سنن اور جوامع کے ساتھ مسانید بھی منصفہ صحافت پر آ گئے۔

آپ ان تمام مسانید کے مصنفین، ان کی تاریخ وفات، ان کے اوطان کو دیکھتے آپ خود محسوس کریں گے کہ اس وقت کے تمام عالم اسلامی کے سارے شہروں میں حدیث کا چرچا عام ہو چکا ہے اور کوئی شے بھی ایسا نہیں ہے جہاں حدیث نبوی نہ پہنچی ہو۔ ۱۹۵ھ میں اس صدی کا آخری مسند ہے۔ اور وقت کی اسلامی فتوحات کے نقشہ کو سامنے رکھ کر بتائیے کون سی جگہ ہے جہاں ارشادات نبویہ کو اپنایا نہ گیا ہو۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب امام اعظم کے تلامذہ ہر جگہ پہنچ گئے تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ :

روی عنہ من المحدثین والفقہاء عدة لا یحصون

اگر آپ تاریخ میں ان اکابر و باب مسانید کے علمی نسب ناموں کو تلاش کریں گے تو آپ کو ان کے علمی رشتے امام اعظم سے ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ عبید اللہ بن موسیٰ کے بارے میں آپ سن چکے ہیں امام احمد بن حنبل جو رئیس المحدثین ہیں ان کے بارے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں ان کے اساتذہ کی ایک طویل فہرست دی ہے اور ان میں امام ہشیم بن بشیر، امام جریر بن عبد الحمید، امام عباد بن العوام، یحییٰ بن ابی زائدہ، قاضی ابو یوسف، وکیع بن الجراح، یزید بن ہارون اور عبد الرزاق کا نام نمایاں طور پر لیا ہے اور ان سب کے متعلق امام بخاری نے تاریخ کو

۱۔ توضیح الافکار ص ۲۲۹۔ ۲۔ التعلیقات الاحمد محمد شاکر علی اختصار علوم الحدیث ص ۱۸۶۔

میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں شہادت دی ہے کہ یہ سب کے سب امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ امام ربیع بن الجراح کہتے ہیں کہ کوفہ میں اس جیسے لو جو ان کوئی نہیں آیا۔ یہی بات امام اعظم کے دوسرے شاگرد حفص بن غیاث نے بھی کہی ہے۔ امام اعظم کی مجلس تدریس کے رکن رکیبن اور تلمیذ یحییٰ القطان بھی امام احمد کے اہل تلامذہ میں سے ہیں۔ امام ذہبی نے ان کا اقرار بھی اس قسم کا نقل کیا ہے۔ الغرض ان ارباب مسانید میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ہر ایک کا شجرہ علمی امام اعظم سے ملتا ہے۔

علم حدیث میں مصنفات

اس صدی میں مسانید کے ساتھ مصنفات بھی منصہ صحافت پر آ گئے۔ مصنف سے مراد مطلق محدثین میں وہ کتابیں ہیں جن میں احکام اور ان سے متعلق باتیں ترتیب فقہی یکجا ہوں۔ مصنف اور جامع میں تھوڑا سا فرق ہے۔ جو جامع وہ کتابیں ہیں جن میں عقائد، احکام، رقائق، کھانے پینے، سفر، مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب، تفسیر، تاریخ کی فتن اور مناقب کی روایات ہوں۔ لیکن مصنف میں صرف وہ احادیث فقہ و احکام ہوتی ہیں جن کا تعلق شہری زندگی میں فقہ اور قانون سے ہے۔ دوسری صدی میں سنن سے مصنف کا کام لیا جاتا تھا مگر تیسری صدی میں سنن کے ہی لیے مصنف کا نام وجود میں آ گیا۔ اگرچہ بعد کو سنن میں خصوصاً در مصنف میں کچھ عموم سا آ گیا۔

تیسری صدی میں مصنف کے نام سے جو کتابیں وجود میں آئی ہیں وہ اگرچہ ہیں تو بہت مگر امکانی نے الرسالة المستطرفة میں دو کا ذکر کیا ہے۔

مصنف عبد الرزاق رحمہ اللہ

یہ المصنف نامی ایک ضخیم تالیف دو جلدوں میں ہے اس کی ترتیب فقہی ہے اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ یہ دور تابعین میں بھی ہے اور باتفاق محدثین اس کے مصنف کو تابعین سے شرف تلمذ حاصل ہے اس لیے اس میں اکثر احادیث ثلاثی ہیں یعنی ایسے نبوی ارشادات جو ان کو صرف تین ہی واسطوں سے معلوم ہوئے ہیں چنانچہ استخاف النبلاء المتعین میں ہے ، اکثرش ثلاثی است لے

کتاب کے آخر میں شمائل نبوی ہیں اور شمائل کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں پر ختم کیا گیا ہے اور آخری حدیث یہ ہے:

حدثنا معمر عن ثابت عن انس قال كان شعر رسول الله صلى الله عليه وسلم الى النصف اذ نيسر (التخاف ص ۱۵۳)

اس کتاب کا شمار حدیث کی ان کتابوں میں ہے جو اسلام کے علمی سرمایہ میں بہترین شمار کی جاتی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف عبد الرزاق بن ہمام الیمانی ہیں اور اس دور کی پیداوار ہیں۔ جس کے بارے میں تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ اس دور والوں میں اتباع تابعین کو شرف قبول حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی نے تصریح کی ہے:

ثم اتفقوا ان اخر من كان من اتباع التابعين ممن يقبل قوله عاش الى حدود سنة ۲۲۰ ثم ظهرت البدع

اس پر اتفاق ہے کہ اتباع تابعین سے آخری شخص جس کی بات قبول کی جاتی ہے ۲۲۰ تک زندہ رہا ہے بعد ازیں بدعتوں کا ظہور ہو گیا۔

امام عبد الرزاق ہی صحیفہ ہمام بن نمیر کے اپنے استاد معمر بن راشد سے راوی ہیں۔ امام عبد الرزاق کے تلامذہ میں رئیس المحدثین امام احمد بن حنبل ہیں۔ ہمام کا یہ صحیفہ بجنسہ آج بھی امام احمد کے مسند میں موجود ہے۔ یاد ہے کہ ہمام اس صحیفے کے مصنف نہیں بلکہ اپنے استاد حضرت ابو ہریرہ سے راوی ہیں اور ہمام سے اس کے راوی معمر اور معمر سے اس کے راوی ان کے شاگرد امام عبد الرزاق ہیں۔

امام عبد الرزاق نے صرف معمر بن راشد ہی سے کسب فیض نہیں کیا بلکہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ عبد الرزاق نے حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے امام اعظم کے سامنے بھی زانوئے ادب نہ کیا ہے۔ عقود الجمان میں ہے کہ امام اعظم کی خدمت میں زیادہ ہے ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے بسند متصل احمد بن منصور مادی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ: میں نے امام عبد الرزاق سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میں نے امام ابو حنیفہ سے زیادہ بار بار کوئی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو مسجد حرام میں ایسی حالت میں

دیجھا ہے کہ لوگوں کا ان کے ارد گرد حلقہ ہوتا تھا سوالات کی بوچھاڑ ہوتی تھی ایک شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا آپ اس کو جواب دیتے آگے سے کوئی اعتراض کرتا کہ اس مسئلہ میں حسن بصری یوں فرماتے ہیں۔ ابو حنیفہ کہتے کہ حسن بصری سے غلطی ہوتی ہے۔ عبداللہ بن مسعود یہی فرماتے ہیں۔ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں نے اصل مسئلہ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعود اور ابو حنیفہ میں ہم آہنگی ہے۔ بلکہ اصحاب عبداللہ کی بھی ان کو تائید حاصل ہوتی ہے۔

ان کے مصنف کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنا ہو تو امام بخاری کی تاریخ کبیر میں یہ سہ پڑھئے کہ ان کی کتابی حدیثیں سب زیادہ صحیح ہیں۔ امام بخاری نے صحیح میں ان سے بکثرت حدیثیں لی ہیں اور ظاہر ہے کہ سب زیادہ صحیح ہونے کی وجہ سے یہ ان کے مصنف ہی سے امام بخاری کا استفادہ ہے۔
ڈاکٹر حمید اللہ کی علمی کاوشوں سے معلوم ہوا ہے کہ مصنف عبدالرزاق کے مخطوطے استنبول اور صنعاء میں کامل اور حیدرآباد دکن، ٹونک، حیدرآباد سندھ اور مدینہ منورہ میں ناقص ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اہل علم کو یہ خوشخبری بھی دی تھی کہ

عثمانیہ کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف اے آج کل ایڈٹ کر رہے ہیں اور جنوبی افریقہ کے عالم اور علم دوست تاجر مولانا محمد موسیٰ اس کی اشاعت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

مصنف ابن ابی شیبہ رحمہ

اس کتاب کا شمار حدیث کی ان چند بے مثال کتابوں میں ہے جو اسلام کا کارنامہ فخر خیال کی جاتی ہیں۔ حافظ ابن کثیر دمشقی ابن ابی شیبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
صاحب المصنف الذی لم یصنف احدا مثله قط لا قبلہ ولا
بعده۔

اس مصنف کے مصنف ہیں کہ اس جیسی کتاب نہ پہلے اور نہ بعد میں لکھی گئی ہے۔
حافظ ابن حزم نے اس کتاب کو عظمت کے لحاظ سے موطا امام مالک سے بھی مقدم رکھا ہے چنانچہ

ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ میں ان کی جانب منسوب کر کے حدیث کی کتابوں کے جو ترمیمی مدارج لکھے ہیں اس میں انہوں نے موطا کو حدیث کی تیسرے درجہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ کو درجہ ثانیہ کی کتابوں میں ظاہر کیا ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق کو بھی اس کا ہم پلہ بتایا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں درجات کی اس تعین میں ان کے پیش نظر صحت نہیں ہے بلکہ احادیث مرفوعہ کی زیادتی ہے چنانچہ درجہ اولیٰ کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ خود فرماتے ہیں:

هذه الكتب التي افردت لكلام رسول الله صلى الله عليه وسلم

درجہ ظاہر ہے کہ از روئے صحت صحیحین، مسند طیبی اور مسند ابن حنبل کو ایک صف میں کون لاسکتا ہے اور معلوم ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں حدیث نبوی کے پہلو بہ پہلو صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاویٰ کا ذخیرہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر حدیث کے متعلق یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو سلف امت میں تعلق بالقبول کا درجہ ملا یا نہیں اور در صحابہ و تابعین میں اس پر عمل تھا کہ نہیں اور یہ اس کتاب کی وہ خاص افادہ حیثیت ہے کہ جس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب فقہاء و محدثین میں برابر متداول چلی آئی ہے۔ صاحب کشف الظنون نے اس کا تعارف ہی اس حیثیت سے کرایا ہے وہ فرماتے ہیں:

هو كتاب كبير جدا جمع فيه فتاوى التابعين واقوال الصحابة
واحاديث الرسول صلى الله عليه وسلم على طريقة المحدثين
بالاسانيد مرتباً على الكتب والابواب -

یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جس میں فتاویٰ تابعین، اقوال صحابہ اور احادیث نبوت کو بطرز محدثین بالاسانید جمع کر دیا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے تمام ابواب سے نظر ہٹا کر مصنف نے اس میں صرف احادیث احکام کو لیا ہے یعنی جس سے فقہ کا کوئی مسئلہ نکلتا ہے اور اس کتاب کا خاص امتیاز یہ ہے کہ اس میں فقہی مذہب کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہیں کیا گیا بلکہ اہل حجاز، اہل عراق و دونوں مدرسوں کی جس قدر روایات مصنف کو ملی ہیں ان سب کو نہایت غیر جانبداری

۔ سائنہ بیجا کر دیا ہے اس لیے قدما کی کتابوں میں یہ کتاب احادیث احکام پر جامع ترین ہے
 مورخان و زائد کو شرمی نے لفظ الالحاظ کی تعلیق میں مصنف کے بارے میں یہ بات بڑی ہی قیمتی
 پائی ہے۔

المصنف اھوج ما یكون الفقیہ البیہ من الکتب الجامعۃ للمسا
 والمراسیل و فتاوی الصحابة والتابعین و تبس علی الایوب
 یقف المطالع علی سواطن الاقفاق والافصلاف بسہولۃ
 مسانید، مراسیل اور فتاوی صحابہ و تابعین پر مشتمل جو کتابیں ہیں ان کتابوں
 میں ایک فقیہ کو سب سے زیادہ ضرورت جس کتاب کی ہے وہ صرف مصنف
 ابن ابی شیبہ ہے۔

اور صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ چونکہ کوفہ میں لکھی گئی ہے اس لیے اس میں فقہاء اہل کوفہ
 کی سب کو سمجھ کر بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے تا آنکہ مصنف نے اس کتاب میں اپنے خیال کے مطابق
 بے منتقل باب امام ابو حنیفہ کے رو میں بھی لکھا ہے اس کا عنوان یہ ہے
 هذا ما خالف به ابي حنيفة الا ان الذي جاء عن رسول الله
 صلی اللہ علیہ وسلم

اس میں ایک سو پچیس مسائل لکھے ہیں اور اس پر حیران نہ ہونا چاہیے کیونکہ اجتہادی مسائل
 اختلاف ناگزیر ہے اور ہر فرقہ کو دوسرے کے مسائل پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ اگر فن میں
 ادائے تنقید کے حق پر قدر غن قائم کر دیا جائے تو فن کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ زمانہ سلف میں
 رائے ایک دوسرے کے مسائل پر اپنے علم کے مطابق تنقید کی ہے۔ تنقید تلمذ اور ثواب
 نہ مافی نہیں ہے۔ امام لیث بن سعد نے امام مالک کے ستر مسئلے ایسے شمار کیے ہیں جو سب
 بے سبب ماہر عن رسول اللہ کے خلاف تھے۔ انہوں نے اس کے منطلق امام مالک کو یاد دلا
 کہ ان کی پہچان نہ حافظ ابن عبد البر نے ان سے بسند متصل نقل کیا ہے کہ

احصیت علی مالک بن انس سبعین مسئلة كلھا مخالفة
 لسنة النبي صلی اللہ علیہ وسلم مما قال مالک فیہا براہیہ

میں نے مالک کے ستر مسئلے شمار کیے ہیں جو حضور کی سنت کے خلاف

ہیں اور جو امام مالک نے محض رائے سے لکھے ہیں۔

امام مالک کے نام لیث بن سعد کا وہ خط پڑھیے جو حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین کی تیسری جلد میں پورا نقل کر دیا ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ سلف میں تنقید کا معیار کتنا بلند تھا لیکن بات کو پورے واشگاف انداز میں پیش کرتے اور دامن ادب و احترام کو ہاتھ نہ لگاتے۔ میں یہاں اس خط کے چند اقتباسات ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

اس موضوع پر کہ عمل اہل مدینہ حجت ہے آپ نے جو قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے والسا بقون الاولون من المهاجرین... الخ تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ ان سابقین اولین کی اکثریت جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر مدینہ چھوڑ کر دوسرے مقامات پر گئی۔ فوج میں داخل ہو کر یہ لوگ مختلف شہروں میں پہنچے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ انہوں نے لوگوں کے روبرو کتاب و سنت کو بلام و کاست پیش کیا اور اس میں کوئی بات راز بنا کر نہیں رکھی ہے ہر فوج اور لشکر میں ایسا طبقہ ان لوگوں کا ہوتا تھا جو دانتے کتاب و سنت تھا اور ضرورت پڑنے پر ان مسائل میں اجتہاد کرتا تھا جو قرآن و سنت میں منصوص نہیں ہیں ان کے سامنے ابو بکر، عمر، عثمان تھے جن کو مسلمانوں نے مقامِ قیادت دیا تھا یہ ہر سہ بزرگ مسلمان فوجیوں سے بے خبر نہ تھے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے میں بھی دین قائم کرنے کی خاطر اور کتاب و سنت میں اختلاف سے بچانے کے لیے فوجیوں سے لگاتار خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھتے تھے ہر ایسی بات جس کا قرآن کی تفسیر سے سنت کی تشریح اور ان کے فیصلوں سے تعلق ہوتا وہ ان فوجیوں کو بتاتے اور سکھاتے لہذا اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش آجاتے جس پر حضور اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے مصر، شام اور عراق میں زمانہ ابو بکر، عمر اور عثمان میں عمل کیا ہو اور اس پر عمل کرتے ہوئے وہ دنیا سے رحلت فرمائے واریقا

ہو گئے ہوں تو بعد میں آج کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ عمل کا کوئی ایسا پیمانہ بنائے جس کی دین کی زندگی میں ان بزرگوں سے عملی تائید نہ ہو۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

آپ کو بارش والی رات میں دو نمازوں کے جمع کرنے پر میری گرفت معلوم ہوئی ہے یقیناً میں نے اس پر گرفت کی ہے۔ شام میں نسبت مدینہ کے بارش زیادہ ہوتی ہے مگر یہاں آنے والے صحابہ میں کبھی کسی نے یہ کام نہیں کیا درآں حالیکہ ان میں ابو عبیدہ، خالد بن الولید، بزرگ بن ابی سفیان، عمرو بن العاص اور معاذ بن جبل جیسے اجلہ صحابہ تھے۔ مصر میں ابو ذر، الزبیر بن العوام اور سعد بن وقاص فروکش تھے۔ حمص میں شہر بدری تھے۔ عراق میں عبداللہ بن مسعود، حذیفہ بن الیمان، عمران بن الحصین، علی مرتضیٰ اور ان کے بے شمار رفقاء تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے مغرب اور عشاء کو جمع نہیں کیا ہے۔

یہ نمونہ ہے اس دور میں ان بزرگوں کی آزادانہ تنقید کا جس سے استنباط و اجتہاد کے فن میں باغ و بہار آئی ہے اور اس درجہ اوج کمال پر پہنچ گیا کہ زندگی کے ہر مسئلہ کا حل وہ شریعت کی روشنی میں تلاش کر لیتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یگانے تو یگانے بیگانے بھی بول پڑے کہ :

دور تابعین میں فقہاء اس کے جو یاہتے تھے کہ دنیوی مسائل ہوں یا دینی اعمال و اقوال نبوت میں نبوت کا منشاء معلوم ہو اور منشاء نبوت معلوم کرنے کا ان کے پاس صحابہ کی زندگی کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ صحابہ سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو حضور انور کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے آپ کے اعمال دیکھے اور کانوں سے ارشادات سنے اس دور میں جو شخص اس روشنی سے جتنا زیادہ قریب تھا اتنا ہی اس کے فقہی نتائج زیادہ وسیع تھے۔

یہ تو خیر ایک معاصر کی معاصر پر تنقید تھی خود امام شافعی جن کو امام مالک سے شرف تلمذ بھی

ہے انہوں نے بھی امام مالک کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ ان کے بہت سے مسائل احادیث کے خلاف ہیں یہ کتاب آج بھی کتاب الام میں اختلاف مالک شافعی کے نام سے موجود ہے۔ حافظ ابن خنیم اندلسی اپنی کتاب مراتب الدیانۃ میں لکھتے ہیں کہ موطا میں ستر سے اوپر ایسی حدیثیں ہیں کہ جن پر خود امام مالک نے عمل نہیں کیا۔ اور بعض مغاربہ نے ایک مستقل کتاب میں ان مسائل کو جمع بھی کر دیا ہے کہ جن میں امام مالک کا عمل موطا کی احادیث کے صریحاً خلاف ہے چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

قد جمع بعض المغاربة کتاباً فیما خالف فیہ المالکۃ نصوص الموطا^۱

محمد بن عبد اللہ بن المحکم مالکی نے جو مصر کے مشہور فقیہ اور محدث تھے اور امام شافعی کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ امام شافعی کے رد میں کتاب لکھی ہے جس کا نام الرد علی الشافعی وما خالف فیہ الکتاب والسنۃ ہے۔^۲

امام ابو حنیفہ کی کتاب السیر پر امام اوزاعی نے تنقید کی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد قاضی ابویوسف نے امام اوزاعی کی کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اس کا نام الرد علی السیر الاوزاعی ہے۔ امام شافعی کتاب الام میں اس کتاب کے راوی ہیں۔

ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں جو امام ابو حنیفہ پر ایک خاص باب میں تنقید کی تھی۔ علمائے اس پر بھی بھرپور تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان مسائل میں ابو حنیفہ کا مذہب حدیث کے موافق ہے۔ جن علمائے ابن ابی شیبہ پر اس موضوع میں تنقید کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ حافظ عبد القادر قرشی۔ ان کی کتاب کا نام الدر المنیۃ فی الرد علی ابن ابی شیبہ فیما اوردہ علی ابی حنیفہ ہے۔

۲۔ حافظ زین الدین قاسم۔ ان کی کتاب کا نام الاجوبۃ الملیفۃ عن اعتراضات ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ ہے۔^۳

۳۔ علامہ زاہد کوثری۔ ان کی کتاب کا نام التکت الطریفۃ فی التحدیث عن رواہ ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ ہے۔

^۱ تدریب الراوی ص ۲۲۔ ^۲ تبجیل المنقۃ ص ۱۴۔ ^۳ طبقات الشافعیۃ البکری ج ۱ ص ۲۴۴

^۴ تعلیق لحظ الالنی ط ص ۱۵۸۔

صاحب کشف الظنون ملا کا تب چلیپی نے ایک اور کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام الرود علی من رو علی ابی حنیفہ ہے۔

حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی عقود الجمان میں رقمطراز ہیں کہ خود انہوں نے بھی ابن ابی شیبہ کے رو میں ایک مستقل کتاب لکھنی شروع کی تھی اور دس حدیثوں تک جواب بھی لکھ لیا تھا مگر بعد کو قلم روک لیا۔

لیکن اس تنقید و تبصرہ سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ

۱۔ ان ائمہ میں باہم کرام نہیں ہے اور ان کی ناقذانہ تخریروں کا نشان ان کی باہم رجحان ہے۔

۲۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یہ ائمہ حدیث کی مخالفت کرتے تھے۔

اگر ان باتوں میں سے ایک بات بھی ہوتی تو ان کی اُمت میں امامت کون مانتا؟ بات یہ ہے کہ یہ اجتہادی مسائل ہیں اور ان میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو روایت ایک کے نزدیک قابل قبول ہو وہ حتماً سب کے نزدیک قابل پذیرائی ہو کیونکہ حدیث کی صحت کا مسئلہ منصوص نہیں بلکہ خود اجتہادی ہے ہو سکتا ہے کہ ایک کے علم کے مطابق اس کی سند میں کوئی کمزوری ہو یا پھر اس کے ذہن میں اس کا محمل اور مصداق اور ہو۔ اس موقع پر حافظ ابن عبد البر کیسی پتے کی بات فرماتے ہیں۔

علمائے اُمت میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ ایک حدیث کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت مانتے ہوئے بلا وجہ رو کر دے۔ یا تو وہ اس حدیث کے نسخ کا دعویٰ کرتا ہے یا اجماع کی تائید کا اعلان کرتا یا اس کا کوئی ایسا محمل تجویز کرتا ہے جس کا اس کے اصول پر ماننا ضروری ہے یا پھر حدیث کی روایتی حیثیت کو وہ مشکوک سمجھتا ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے اور پھر وہ حدیث کو رد کرتا ہے تو اس کا امام ہونا تو درکنار اس کی توعدا لت بھی متحد و ش ہو جاتی ہے۔

بہر حال مصنف بہت اونچے درجے کی کتاب ہے اس کے مصنف امام ابو بکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ کو فہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے اساتذہ ہیں حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق شریک القاضی، سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن المبارک اور جریر بن عبد الحمید ہیں۔ اور حافظ ابن حجر نے ان کے ساتھ ہشیم بن بشیر اور ابو بکر بن عیاش، ابو اسامہ، ابو معاویہ، وکیع بن الجراح، محمد بن فضیل اور زبید بن ہارون کا اضافہ فرمایا ہے۔ حافظ ذہبی نے سفیان بن عیینہ کو چھوڑ کر سب ہی کو امام اعظم کے

تلاذہ حدیث میں شمار کیا ہے۔ امام بخاری نے ابن ابی شیبہ سے تیس حدیثیں اور امام مسلم نے ان سے ایک ہزار پانچ سو چالیس حدیثیں روایت کی ہیں۔

آپ اس سے امام اعظم کی جلالتِ قدر کا اندازہ لگائیے یہ ادنیٰ سے ادنیٰ مثال ہے کہ تمام دونوں علم حدیث اسی گھر کے خوشہ چین ہیں۔

تیسری صدی میں صحاح کی تدوین

صحاح سے مراد وہ کتابیں ہیں جن کے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام کیا ہے
امکانی لکھتے ہیں:

كتب التزم اهلها الصحة فيما

تیسری صدی میں صحاح کے نام سے جو کتابیں منصہ شہود پر آتی ہیں وہ چھ ہیں:

صحیح امام بخاری ^{۲۵۶ھ}، صحیح امام مسلم ^{۲۶۱ھ}، جامع ترمذی ^{۲۶۵ھ}، سنن ابی داؤد ^{۲۷۱ھ}،
سنن ابی ماجہ ^{۲۷۱ھ}، سنن نسائی ^{۲۸۴ھ}۔ چونکہ صحاح کے نام سے یہ چھ کتابیں مشہور ہیں اس
لیے ہم نے ان ہی کو صحاح ستہ لکھا ہے ورنہ حافظ ابن مندہ نے مخرجین صحاح میں صرف امام
بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد اور امام نسائی کو شمار کیا ہے اور بجائے ستہ کے صحاح اربعہ کہا
ہے۔ بعد کو حافظ ابوطاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چار کتابوں کے ساتھ شمار کر کے
تصریح کی ہے کہ ان پانچ کی صحت پر مشرق اور مغرب کے علماء کا اتفاق ہے لیکن حافظ عراقی
نے ان لوگوں پر بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے جو ترمذی، ابو داؤد جیسی کتابوں پر صحیح بولتے ہیں
فرماتے ہیں:

ومن عليها اطلق الصيحا فتداني تسا هلا صريحا له

حافظ ابن الصلاح اور علامہ نووی نے قابلِ اعتماد کتابوں کے سلسلے میں صرف پانچ کتابوں
کے مصنفین کی وفیات کا ذکر کیا ہے اور امام ابن ماجہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حافظ سخاوی نے
اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

ابن ماجہ ان مقاصد سے خالی ہے جن پر مصنفین کتب خمسہ نے توجہ دی ہے

اور جن پر تدبر و غور سے محدث کو مشق ہوتی ہے خاص طور پر جبکہ اس میں نہایت ضعیف بلکہ منکر حدیثیں بھی موجود ہیں۔^۱

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابن ماجہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :
ابو عبد اللہ بن ماجہ کی کتاب بہترین ہے کاش اس میں تھوڑی احادیث
و ایسی نہ ہوتیں۔^۲

اور خود امام ابن ماجہ کی زبانی حافظ ابو زرہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے :-
میں نے اس کتاب کو حافظ ابو زرہ کی خدمت میں لیجا کر پیش کیا تو فرمایا کہ
میرے خیال میں اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو یہ جوامع یا
ان میں سے اکثر بیکار ہو جائیں گے پھر فرمایا شاید اس میں تیس حدیثیں بھی
ایسی نہ ہوں جن کی اسناد میں ضعف ہو۔^۳

حافظ ذہبی نے حافظ ابو زرہ کی رائے کو تذکرہ میں اگرچہ بلا تبصرہ نقل کیا ہے لیکن سیر اعلام النبلاء
کے حوالہ سے علامہ بیانی لکھتے ہیں کہ :

ابو زرہ کا یہ بیان کہ شاید اس میں تیس حدیثیں بھی ایسی نہ ہوں جن کی سند
ضعیف ہو اگر صحیح ہے تو ان کی مراد ان تیس حدیثوں سے نہایت گرمی ہوتی
اور ساقط قسم کی روایتیں ہیں ورنہ ناقابل احتجاج روایات کا تو اس میں
ایک ذخیرہ ہے۔ شاید ان کی تعداد ہزار کے قریب ہو۔^۴

غالباً ان ہی تیس کو حافظ ذہبی نے تاریخ میں سنن ابن ماجہ کے ذکر میں قلیل سے تعبیر کیا ہے
فرماتے ہیں :

انما غرض من رتبہ سنتہ ما فیہا من المناکیر و قلیل من الموضوعات
سنن ابن ماجہ کو اپنے مرتبہ میں کمتر بنانے والی منکر روایات اور تھوڑی سی
احادیث موضوعہ ہیں۔^۵

اور یہی وہ تیس حدیثیں ہیں جن کو مشہور محدث ابن الجوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے

^۱ فتح المغیث ص ۴۷ - ^۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸۹ - ^۳ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸۹
^۴ ۱، ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱

یادیکر محدثین نے ان میں سے بعض کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے۔

یہ سب گفتگو اس مفروضہ پر ہے جب کہ روایتی طور پر حافظ ابو زرعہ کا یہ بیان ثابت ہو جاوے
حافظ سیوطی حافظ ابو زرعہ کے اس بیان کو تاریخی طور پر صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔
ابن طاہر نے ابو زرعہ سے جو یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے اس کتاب
کو دیکھ کر فرمایا کہ شاید اس میں پوری تیس حدیثیں بھی ایسی منہیں جن میں
ضعف ہو۔ یہ حکایت درست نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں انقطاع ہے
اور اگر یہ روایت محفوظ ہے تو شاید انہوں نے انتہائی ساقط روایات کو
مراد لیا ہے یا پھر کتاب کا صرف ایک ہی حصہ دیکھا ہے جس میں ان کو
اسی قدر مل سکا اور یہ واقعہ ہے کہ ابو زرعہ نے اس کی بہت سی حدیثوں
کے متعلق باطل یا ساقط یا منکر ہونے کا فیصلہ کیا ہے جو ابن ابی حاتم
کی علل میں ہیں۔

لیکن اس کے باوجود متاخرین نے سنن ابن ماجہ کو صحیح ستہ میں شمار کر لیا اور بقول شاہ عبدالحق
اس کتاب کو شامل کر کے ان کتابوں کو اصول ستہ، کتب ستہ، صحاح ستہ بولا جانے لگا۔

ابن ماجہ سنن دارمی یا موطا صحیح ستہ میں شمار

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے سنن ابن ماجہ کو کتب خمسہ کے بالمقابل
جگہ دی وہ حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی ^{۲۵۷} ہیں جنہوں نے شروط الامم الستہ کے نام
سے کتاب تصنیف کی اور اس میں ائمہ خمسہ کے ساتھ ابن ماجہ کی شرط پر بحث کی ہے اور ایک مرتبہ
کتاب میں ان کتب ستہ کے اطراف کو جمع کیا۔ بعد کو تمام مصنفین نے ان کی رائے سے اتفاق
کیا حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

فتاویٰ اصحاب الاطراف والرحمہما ^{۲۵۸}

حافظ ابن طاہر کے معاصر محدث زبیر بن معاویہ عہد ری مالکی ^{۲۵۹} نے اپنی کتاب التجرید
للصحاح والسنن میں کتب خمسہ کے ساتھ سنن ابن ماجہ کی جگہ موطا امام مالک کو رکھا ہے حافظ عبدالحق

مقدسی سنن نے الاکمال فی اسماء الرجال میں کتب خمسہ کے ساتھ ابن ماجہ کے رجال کو یک جا مرتب کیا ہے۔

اس بنا پر بعد کے علماء میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ صحاح میں کتب خمسہ کے سوا چھٹی کتاب موطا ہے یا ابن ماجہ؟

علامہ ابن الاثیر نے اپنی مشہور کتاب جامع الاصول میں محدث رزین ہی کی رائے کو ترجیح دی ہے اور اسی لیے اس کتاب میں ابن ماجہ کے حوالہ سے کوئی روایت درج نہیں ہے، اسی طرح حافظ ابو جعفر بن زبیر غزالی کی تصریح ہے کہ:

جو کچھ بتایا گیا ہے ان سب میں اول وہ کتابیں ہیں کہ جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ وہی کتب خمسہ اور موطا ہے جو تصنیف میں اور مرتبہ میں ان سے کم نہیں ہے۔

اور علامہ عبد الغنی نابلسی اپنی مشہور کتاب ذخائر الموارث فی الدلالة علی مواضع الحدیث کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

صحاح میں چھٹی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے اہل مشرق کے

نزدیک تو ابن ماجہ ہے اور اہل مغرب کے نزدیک موطا ہے۔

لیکن عام متاخرین کا فیصلہ ابن ماجہ کے حق میں ہے محدث ابوالحسن سندھی لکھتے ہیں:

غالب المتأخرین علی أنه سادس السنن

حافظ سخاوی نے ابن ماجہ کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس میں بہت سی زائد حدیثوں کی وجہ سے افادیت پیدا ہو گئی ہے ورنہ صحت اور قوت روایات کے لحاظ سے سنن ابن ماجہ تو کیا صحاح سے کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ کچھ علماء کی رائے میں ابن ماجہ کی جگہ سنن دارمی کو صحاح میں چھٹی کتاب ہونے کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ سخاوی نے کچھ لوگوں کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ:

بجائے سنن ابن ماجہ کے مناسب یہ ہے کہ دارمی کی کتاب کو چھٹی قرار دیا

جائے کیونکہ اس میں ضعیف راوی کم اور منکر و شاذ حدیثیں نادر ہیں۔

اور اگرچہ اس میں احادیثِ مرسلہ و موقوفہ موجود ہیں تاہم وہ سنن ابن ماجہ سے زیادہ بہتر ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس کی ہمنوائی کی ہے چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں :

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ دارمی کی کتاب رتبہ میں سنن اربعہ سے کم نہیں ہے بلکہ اس کو اگر کتبِ خمسہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو ابن ماجہ کی بنسبت یہ زیادہ اچھا ہے کیونکہ وہ سنن ابن ماجہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔

لیکن اس تصریح کے باوجود حافظ ابن حجر کا عمل اس کے خلاف ہے چنانچہ محدث محمد بن اسماعیل ایمانی لکھتے ہیں :-

صحاحِ خمسہ کے ساتھ مؤطا بھی ہے جیسا کہ جامع الاصول میں ابن الاثیر نے کہا اور کچھ لوگوں نے اس کی جگہ ابن ماجہ کو لکھا ہے اسی کے پیشِ نظر حافظ ابو الحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں رجال کی ترتیب قائم کی ہے اور اسی راہ کو اس کتاب کے اختصار میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اور علامہ خمرزجی نے خلاصہ میں اختیار کیا ہے۔

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تیسری صدی میں یہ چھ کتابیں صحاح کے نام سے منصفہ شہود پر آتی ہیں۔ آئیے سرسے خالص محدثانہ نقطہ نظر سے ان کتابوں کے بارے میں محدثین کی کچھ آرا بھی پڑھ لیجئے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم

مسند کے ذریعے جب حدیث کا تمام ذخیرہ یکجا ہو گیا اور احادیث کے سمیٹنے کا کام پورا ہو گیا تو اس دور کے محدثین نے اس ذخیرے سے انتخاب و اختصار کے لیے قدم اٹھایا اور صحاح کی تدوین عمل میں آئی۔ حافظ ابو بکر محمد بن موسیٰ الحارمی نے ابراہیم بن مسعل بن سفی کے حوالہ سے خود امام بخاری کی زبانی بتایا ہے کہ :

میں ایک روز اسحاق بن راہویہ کے پاس تھا وہاں ہمارے احباب ہیں سے کسی نے کہا کہ کاش تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن پر مشتمل کوئی مختصر

تیار کرتے یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں نے حدیث کا ایک مختصر جمع کرنا شروع کر دیا۔^۱

صرف اختصار ہی نہیں بلکہ اس میں صحیح احادیث کے انتخاب کا بھی پورا اہتمام فرمایا چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ :

امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب الجامع میں صرف وہی حدیثیں درج کی ہیں جو صحیح ہیں اور بہت سی صحیح حدیثوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔^۲ امام مسلم نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور احادیث کی صحت کے بارے میں صرف اپنی ذاتی تحقیق پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں جمع کیں کہ جن کی صحت پر مشائخ وقت کا بھی اجماع تھا چنانچہ ان کا بیان ہے :

یس کل شیء عندی صحیح وضعہ ہہنا انما وضعت ہہنا ما اجمعوا علیہ^۳

۱۔ شروط الائمة الخمسة ص ۵۱۔ ۲۔ مقدمہ فتح الباری ص ۵۔ ۳۔ صحیح مسلم میں جس موقع پر امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ بات فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمایا جئے۔ امام مسلم نے باب النشید میں اپنے مشائخ سعید بن منصور، قتیبہ بن سعید، ابو کامل محمد بن عبد الملک کے حوالے سے یہ سند ابو عوانہ از یونس بن جبیر از سلطان بن عبد اللہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی ایک طویل حدیث پیش فرمائی ہے اور پھر اسی حدیث کے بارے میں بتایا ہے کہ مجھے یہ حدیث ان تین طریقوں سے بھی ملی ہے۔ اول ابو بکر از ابو اسامہ از سعید بن ابی عروبہ۔ دوم ابو غسان السبعی از معاذ بن ہشام از ہشام۔ سوم اسحاق بن ابراہیم از جریر از سلیمان۔ ان تینوں طریقوں کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ کل ہؤا کاد عن قتادہ یعنی یہ سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ ہم سے قتادہ نے بیان کیا ہے لیکن ان تینوں طریقوں میں سلیمان نے قتادہ کے حوالے سے اس حدیث میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اذا قرأ فانصتوا اور پوری روایت اسی طرح ہے کہ امام مسلم فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق بن ابراہیم نے بیان کیا ہے کہ ہم سے جریر نے بتایا وہ سلیمان تیمی سے روایت کرتے ہیں، وہ قتادہ سے قتادہ یونس بن جبیر سے اور وہ سلطان بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا اور کہ نماز سے پہلے صفوں کو سیدھا کر لو پھر تم میں سے ایک تمہارا امام بنے جب وہ تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم چپ رہو اور جب وہ غیر المفضوب علیہم وہ الضالین کہے تو تم

۱۔ بقیہ ص ۵۲۔

حافظ ابن الصلاح، حافظ جلال الدین السیوطی اور علامہ الجزائری نے تصریح کی ہے کہ امام مسلم کی مراد ما اجمعوا علیہ سے یہ ائمہ حدیث ہیں۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام عثمان بن ابی شیبہ اور امام سعید بن منصور خراسانی یہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے ساتھ امام علی بن المدینی کا بھی اضافہ فرمایا ہے۔ اور حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلم صحیح کہہ دیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر اور حقیقت میں بالکل یقینی ہے۔

امام مسلم نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ جب کتاب مکمل ہو گئی تو حافظ ابو زرعہ رازی کی خدمت میں لے جا کر پیش کی جو اس دور میں علل احادیث اور فن جرح و تعدیل کے مسلم امام تھے اور جس روایت کے بارے میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا اسے کتاب سے خارج کر دیا۔ بالآخر پوری پندرہ سالہ محنتوں اور تقریر یوں کے بعد احادیث صحیحہ کا یہ مجموعہ عوام کے سامنے آیا۔ اس کے بارے میں خود امام مسلم کا یہ دعویٰ ہے :

ہیں نے تین لاکھ احادیث سے یہ کتاب تالیف کی ہے اگر تمام روئے زمین

۲۵۳ کا بقیہ خاشیہ) آئین کہو صحیح مسلم جلد اول ص ۱۱۴، اس موقع پر امام مسلم سے ان کے ایک شاگرد ابو بکر نامی نے دریافت کیا کہ سلیمان کی روایت میں یہ اضافہ ہے۔ امام مسلم نے جواب دیا کہ سلیمان حفظ و ضبط میں کامل ہیں پھر ابو بکر نے پوچھا کہ اچھا یہ تو ابو موسیٰ اشعری کی حدیث ہے لیکن آپ کا حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں اذا اقرء فانصتوا آیا ہے۔ امام مسلم نے جواب میں فرمایا کہ ہو عندی صحیح وہ بھی میرے نزدیک صحیح ہے پھر سوال کیا گیا کہ اگر وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو اسے آپ نے اپنی کتاب میں یہاں کیوں درج نہیں فرمایا جواب میں وہ بات ارشاد فرمائی جو ہم نے کتاب میں درج کی ہے یس کل شیء عندی ... الخ یعنی میں نے ہر اس حدیث کو جو میرے نزدیک صحیح ہے اپنی صحیح میں درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ میں نے صرف وہ روایات درج کی ہیں جن پر محدثین کا اجماع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی وہ حدیث جو صحیح مسلم میں بالسند موجود ہے امام مسلم کے نزدیک ہی نہیں بلکہ ان سب محدثین کے نزدیک صحیح ہے جن کے اتفاق کو امام مسلم اپنی صحیح میں اپناتے ہیں۔

لے مقدمہ ابن الصلاح ص ۸، تدریب الراوی ص ۲۸، توجیہ النظر ص ۲۴۰۔ ۲۔ مقدمہ فتح الباری ص ۲۰۳۔
کے غایتہ المامول ص ۶۔ اس لحاظ سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اس زیادتی والی حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔
۳۔ الخطہ میں مکی بن عبدان کے حوالہ سے امام مسلم کا یہ بیان سچا خطیب بغدادی نقل کیا ہے دیکھو ص ۹۸۔

کے باشندے دو سو سال تک بھی حدیث کی کتابت کا کام کریں گے پھر بھی ان کا مدار اور سہارا یہی کتاب رہے گی۔ میں نے جو کچھ درج کیا ہے وہ دلیل کی بنی تلی ترازو پر رکھ کر کیا ہے اور جو درج نہیں کیا ہے وہ بھی کسی دلیل ہی کے سہارے نہیں کیا ہے۔

حافظ مسلم بن قاسم قرطبی نے اپنی تاریخ میں صحیح مسلم کے بارے میں لکھا ہے کہ
لحم یضیع فی الاسلام احد مثله

اسلام میں اس جیسی تصنیف کوئی نہیں ہے
اہل علم ان دونوں کو صحیحین اور ان کے مصنفوں کو شیخین کہتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک صحیحین کا مقام

امام بخاری کی صحیح اور امام مسلم کی صحیح کی صحت میں تو اہل علم میں کبھی دو رائیں نہیں ہوتیں لیکن یہ بات ہمیشہ سے علماء میں بحث و نظر کا موضوع رہی ہے کہ ان بزرگوں کے یہاں صحت کا معیار کیا ہے
امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ صحیح صرف یہ دونوں کتابیں ہیں اور ائمہ نے ان کو شرف قبول سے نوازا ہے اور امام بخاری کی صحیح بمقابلہ امام مسلم کی صحیح کے زیادہ صحیح ہے اور اس میں زیادہ فائدے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

وہ صفات جن پر صحت کا مدار ہے بخاری میں مسلم سے زیادہ ہیں اور بخاری کی شرطیں مسلم کی شرطوں سے زیادہ قوت والی اور زیادہ سخت ہیں۔

اس پر تفصیلی گفتگو آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے کہ ان دونوں میں زیادہ صحیح کون سی ہے اور اس موضوع پر مختلف علماء کے کیا خیالات ہیں۔

الغرض اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں کتابیں صحت کے لحاظ سے تمام کتابوں سے

اونچی ہیں چنانچہ امیر یافانی فرماتے ہیں:

قد اتفق الكل على انهما اصح الكتب
ان دونوں کے اصح الكتب ہونے پر اتفاق ہے۔

صحیحین میں صحت کا معیار

یہاں پہنچ کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دعویٰ اتفاقی کی کہ یہ دونوں کتابیں تمام حدیث کی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہیں بنیاد کیا ہے؟ آخر وہ معیار کیا ہے جس کی وجہ سے از روئے صحت ان کو دوسری تمام کتابوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق اب تک اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تین باتیں ہیں:

ایک یہ کہ ان کتابوں کی سب سے زیادہ برتری ہونے کی وجہ خود ان بزرگوں کا التزام صحت ہے

دوم یہ کہ ان کتابوں کے اصح ہونے کی وجہ ان بزرگوں کی قائم کردہ شرطیں ہیں

سوم یہ کہ ان کتابوں کے اصح ہونے کا دار و مدار دراصل اس پر ہے کہ ان دونوں کتابوں کو پوری امت کی جانب سے شرف قبول حاصل ہے۔

بات اگرچہ طویل ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے اس سلسلے میں کچھ مفید باتیں پیش کریں۔

التزام صحت اور اس کا مطلب

التزام صحت کا اگر یہ مطلب ہے کہ ان دونوں کتابوں کے مؤلفین کا اعلان ہے کہ ان کی حدیثیں صحیح ہیں۔ ہم نے اپنی کتابوں میں صحیح حدیثیں درج کی ہیں۔ تو یہ اپنی جگہ درست ہے کیونکہ ان دونوں بزرگوں کی اس قسم کی تصریحات موجود ہیں اور یقیناً مدعیان صحت کا یہی مقصود ہے چنانچہ امام یافانی لکھتے ہیں:

فالاولى عندى فى الاستدلال على تقدم الصحيحين اخبار مؤلفيهما

بان احاديثهما صحيحة

میرے نزدیک صحیحین کے مقدم ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کے مؤلفین

نے پتہ دیا ہے کہ ان کی احادیث صحیح ہیں۔

اور احادیث کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ

سرواۃ ہذہ الاحادیث عدول ضابطون ولا شذوذ فیہا ولا علت^۱
بلاشبہ اگر ان کتابوں کے مؤلفین کے اس دعوے پر ان کتابوں کی اصحیت کا مدار ہے۔ تو یہ
شرف یقیناً ان کتابوں کو حاصل ہے۔

بخاری و مسلم کی شرطیں

اگر ان کتابوں کی اصحیت کی علت ان کتابوں کے مؤلفین کی پیش کردہ شرائط ہیں تو ہمیں افسوس
سے کہنا پڑتا ہے کہ ان ہزرگوں نے اپنی شرائط کو نہ تو کہیں بیان کیا ہے اور نہ ہی اس موضوع پر
ان سے کوئی علمی سرمایہ منقول ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ متاخرین نے خود ہی چند شرطیں ان کی
کتابوں کو دیکھ کر مقرر کر لی ہیں۔ بعد ازیں دوسری کتابوں میں آمدہ حدیثوں کو اپنی بنائی ہوئی ان
شرطوں پر تول تول دیکھنے لگے۔ چنانچہ علامہ طاہر الخیر ائرمی لکھتے ہیں۔

اعلم ان البخاری لم یوجد عنده تصریح بشرط معین وانما

اخذ ذلک من تسمیۃ الکتاب والاستقرار من تصرف^۲

علامہ امیر محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں امام بخاری اور امام مسلم دونوں کا تذکرہ
کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اعلم انه لم یقل عن الشیخین شرط شرطاً وعیناً انما

تبع العلماء الباحثون عن اسالیبہما طریقتهما حتی تحصل

لہم ما ظنوا شروطاً لہما۔

شیخین سے ایسی کوئی شرط منقول نہیں ہے صرف علماء نے ان کے

اسلوب و طریق سے تلاش کر کے اپنے خیال کے مطابق شرطیں

بنالی ہیں۔

حتیٰ کہ امام نووی نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

علی شرط الشیخین کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے جال سندان شیخین کی کتابوں

^۱ توضیح الافکار ج ۱ ص ۹۵۔ ^۲ توجیہ النظر ص ۸۸۔ ^۳ توضیح الافکار ج ۱ ص ۱۰۰۔

میں آئے ہوئے رجال پر مشتمل ہوں کیونکہ ان کی اپنی کتابوں میں اور کوئی شرط نہیں ہے۔

اور چونکہ مسئلہ شرائط پر ان بزرگوں سے خود کوئی تصریحی بیان منقول نہیں ہے بلکہ بعد میں آنے والوں کی تلاش و جستجو کی رہنمائی منت ہیں اس لیے ان شرائط کی تعیین و تقدیر میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے :

اختلفوا فی الاختلاف افہامہم
آئیے اس موضوع پر مختلف علماء کی قیمتی آراء معلوم کر لیجئے۔ محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں
شرط البخاری و مسلم ان یخرجوا الحدیث المتجمع علی ثقہ نقلتہ
الی الصحابی -

بخاری اور مسلم کی شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ان راویوں سے روایت کرنے
میں جن کی ثقاہت اتفاقاً ہو۔

لیکن راویوں کی ثقاہت پر اتفاق کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ حافظ زین الدین کو ابن
طاہر کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابن طاہر کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیونکہ امام
نسائی نے ایسے بہت راویوں کی تصنیف کی ہے جن سے شیخین نے روایت کی ہے بلکہ حافظ محمد بن
ابراہیم الزہیری نے ایک قدم اور بڑھا کر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ :

صرف نسائی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں ایک سے زیادہ
دوسرے ائمہ جرح و تعدیل امام نسائی کے ہم زبان ہیں -

اگرچہ علامہ ذہبی نے یہ کہہ کر کہ

لکن تصنیف مطلق غیر مبین السبب

حافظ عراقی کی بات کو بے وزن بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مشہور محدث امیر میانی نے بات
کو واضح کر کے پیش کیا اور حافظ ابراہیم کی تردید کر دی۔ چنانچہ امیر موصوف فرماتے ہیں ،
صحیحین کے راویوں میں سے جن پر جرح ہوئی ہے ان میں ہر ایک پر جرح
مطلق ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جن پر

بھر پور اور مکمل جرح کی گئی ہے کچھ ایسے ہیں جن کو مرحۃ کہا گیا ہے مثلاً ایوب بن عائد بخاری و مسلم کے راویوں میں ہیں ابو داؤد اور نسائی نے ان کو مرحۃ قرار دیا ہے۔ کچھ کو نا صبی بتایا گیا ہے جیسے نور بن یزید بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔ جریر بن عثمان بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔ فلاس مشہور ناقد رجال نے بتایا ہے کہ یہ حضرت علی سے بغض رکھتے تھے۔ خالد قسوطانی بھی بخاری کے راویوں میں ہیں مگر ابن سعد کی رائے میں غالی شیعہ تھے۔ یہ علامہ حازمی نے اس موضوع پر شروط الائمۃ الخمسہ کے نام سے کتاب لکھی ہے اور اس میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی اور امام نسائی کی شرائط پر تبصرہ کیا ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے اس کا خلاصہ یہ لکھا ہے کہ:

شرط بخاری یہ ہے کہ ایسی حدیث روایت کی جاتے جس کی سند متصل ہو جس کے راویوں میں صرف ثقاہت اور اتقان ہی نہیں بلکہ انہوں نے جن سے وہ حدیث لی ہے ان کے ملازم صحبت بھی ہوں اور صحبت بھی طویل ہو لیکن امام بخاری کبھی ان لوگوں کی روایت بھی لے آئے ہیں جو ملازم صحبت نہ ہوں اور امام مسلم کی شرط یہ ہے کہ روایت طبقہ ثانیہ کی ہو اور کبھی کبھار ان سے بھی روایت لیتے ہیں جو ملازم نہ ہوں لیکن ان پر قدرے جرح بھی ہو گئی ہو۔

لیکن علامہ بیہقی نے امام بخاری کے متعلق یہ کہہ کر حازمی کی بیان کردہ داستان کو مخدوش کر دیا ہے کہ:

هذا لا يوافق ما نقل عن البخاري من انه يشترط اللقاء ولو مرة -

حازمی کی بات کا امام بخاری کی یہ تصریح ساتھ نہیں دیتی ہے کہ روایت میں راوی کے لیے ملاقات شرط ہے چاہے ایک ہی بار ہو۔ اور ایسے ہی امام مسلم کی طرف منسوب شرط کو بھی انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ

ان مسلمانوں کے لئے شرط اللقار اصلاً كما صرح به في مقدمة صحيحه

امام مسلم ملاقات کو قطعاً شرط قرار نہیں دیتے ہیں

امام حاکم نے مدخل میں بخاری و مسلم کی یہ شرط بتائی ہے کہ

ایسی حدیث جسے حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور صحابی روایت کرے

اور اس صحابی سے دو تابعی ثقہ روایت کریں۔ پھر ان سے ایسا کوئی شخص

جو حفظ و الثبات میں مشہور ہو اور اس کے طبقہ رابعہ میں روایت کرنے والے

ایک سے زیادہ راوی ہوں بعد ازیں بخاری و مسلم کے وہ شیوخ جو حفظ و

عدالت میں مشہور ہوں روایت کریں۔ یہ درجہ اول کی روایات ہیں۔

یہ شرط اگرچہ بے حد وزنی اور پر شکوت ہے لیکن علامہ ابن طاہر مقدسی نے اسے یہ کہہ کر بے جان

بنا دیا ہے کہ:

ان الشيخين لم يشترطوا هذا الشرط ولا نقل عن واحد انه

قال ذلك والمحاكم قد رد هذا التقدير وشرط لهما هذا

الشرط على ما ظن

شیخین نے نہ یہ شرط لگائی اور نہ ان میں سے کسی سے یہ منقول ہے حاکم

نے خود ہی اپنے گمان سے عمارت سازی کر لی ہے۔

اور امام حارمی نے حافظ ابو حاتم محمد بن حبان البستی سے اس پر جو تنقید نقل کی ہے وہ کافی

سخت اور سنگین ہے۔ فرماتے ہیں:

احادیث سب اخبار آحاد ہیں۔ ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جو دو عادل

کی روایت کی قید سے آتی ہو اور پھر ہر ایک دوہی سے روایت کر کے

حضور النور تک پہنچا ہو جب یہ صورت ناممکن اور غلط ہے تو ثابت ہو

کیا کہ احادیث اخبار آحاد ہیں اور جو شخص اس قسم کی شرطیں عائد کرتا

ہے وہ تو دراصل اس راہ سے لوگوں کو ترک سنن کی دعوت دے رہا ہے

کیونکہ سنن تو ساری ہی اخبار آحاد ہیں۔

امام حارمی نے ابو حاتم کی اس تنقید کو اقرب الی الصواب قرار دیا ہے اور پھر خود بھی امام حاکم کے اس خیال کی اپنے انداز پر بھرپور تردید کی ہے۔ — بہر حال یہ شرائط چاہے ابن طاہر نے بتائی ہوں یا حاکم اور حارمی نے متاخرین کی بتائی ہوئی ہیں ورنہ شیخین سے اس سلسلہ میں کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

انما هو تظن وتخمين من العلماء

بنانا یہ چاہتا ہوں کہ بخاری و مسلم کی کتابوں کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اصحبت کا دار و مدار شرط پر نہیں ہے۔

تلقی امت بالقبول اور صحیحین

حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں صحیحین کی اصحبت کو ثابت کرنے کے وجوہ و دلائل جو بتائے جاتے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحیحین کو تلقی امت بالقبول کا شرف حاصل ہے صحیحین کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی حافظ ابن الصلاح کی قائم کردہ ہے انہوں نے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

الاتفاق الامت علی تلقی ما اتفقنا علیہ بالقبول۔^۱

صحیحین کے بارے میں یہ موقف ایسا ہے کہ اسے وجہ ترجیح ہونا چاہیے چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری رقمطراز ہیں:

والوجه فی هذا عند اهل الحديث هو تلقی الامت بالقبول ولا شك انه وجه ترجیح۔

محدثین کے نزدیک اس کی علت تلقی امت بالقبول ہے اور یہ واقعی وجہ ترجیح ہے۔^۲

اگرچہ امام نووی نے اس مسئلہ پر حافظ ابن الصلاح کے خلاف بہت بڑا محاذ قائم کر لیا اور بتایا کہ تلقی امت بالقبول کسی چیز کی صحت میں برتر ہونے کی نہیں بلکہ وجوب عمل کی دلیل ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ:

تلقى امت بالقبول کا فائدہ وجوب عمل ہے اور اس میں کوئی اختلاف

^۱ مقدمہ ابن الصلاح ص ۴۲۔ ^۲ تنقیح الأنظار ج ۱ ص ۹۴۔

نہیں ہے کیونکہ وہ حدیثیں جو بخاری و مسلم سے باہر ہیں اگر ان کی اسناد صحیح ہوں تو ان پر ہی عمل واجب ہے اور مفید ظن ہیں یہی صحیحین کی پوزیشن ہے۔

امیر میانی نے حافظ ابن الصلاح کے موقف پر دو سوال قائم کر کے صورت حال کو اور بھی سنگین بنا دیا۔

۱۔ تملقی اُمت بالقبول میں کیا اُمت کا ایک ایک فرد خاص و عام مراد ہے؟

۲۔ کیا تملقی اُمت سے یہ مراد ہے کہ پوری اُمت جانتی ہے کہ یہ کتابیں ان بزرگوں کی تصنیف ہیں یا یہ مراد ہے کہ اُمت کے ایک ایک فرد نے صحیحین کی ایک ایک حدیث کو اپنا لیا ہے لیکن پوری بات ان کی زبانی سن لیجئے :

جو شخص یہ کہتا ہے کہ صحیحین کو تملقی اُمت بالقبول حاصل ہے اسے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ اس دعویٰ پر دو سوال ہوتے ہیں ایک یہ کہ اُمت سے کیا مراد ہے سب کے سب ہر خاص و عام یا صرف مجتہدین۔ ظاہر ہے کہ سب تو مراد نہیں ہیں یقیناً مجتہدین ہی مراد ہوں گے۔ اگر دعویٰ یہ ہے کہ اُمت کے تمام مجتہدین میں سے ایک ایک فرد نے عمل کی دنیا میں اپنا لیا ہے تو یہ خود محتاج دلیل ہے اور معلوم ہے کہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں۔ اس پر دلیل لانا ایسا ہی ہے جیسا کہ اجماع کے دعویٰ پر۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اجماع مدعی کا ذب ہے اور اگر زمانہ احمد میں صحیحین کے وجود پذیر ہونے سے پہلے یہ جھوٹ ہے تو پھر صحیحین کے لیے ان کی تالیف اور نشر و پیر کے بعد اس قسم کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ علماء میں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کو صحیحین کا پتہ بھی نہ ہو گا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ خود تملقی بالقبول سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کہ لوگ مانتے ہیں کہ یہ دونوں کتابیں ان دونوں بزرگوں کا تالیفی کارنامہ ہیں۔ صرف اتنی بات تو کسی کتاب کی صحت کی

ضمانت کے لیے کافی نہیں ہے یا یہ تمام اُمت نے ان کتابوں کی تمام حدیثوں
میں سے ایک ایک حدیث کے بارے میں یہ مان لیا ہے کہ یہ حضور النور
صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس دعویٰ کی صداقت سب احادیث
کے بارے میں ناقابل تسلیم ہے لے

صرف یہی نہیں بلکہ امام نووی کی پہنچائی اور حافظ ابن الصلاح کی مخالفت میں اور بھی بہت کچھ
کہا گیا ہے چنانچہ علامہ الجزائری فرماتے ہیں کہ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے :
صحیحین کے بارے میں تلمیذی الامت بالقبول درست ہے لیکن یہ صحیحین کی
خصوصیت نہیں ہے بلکہ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کو بھی یہ مقام حاصل
ہے مگر اس کے باوجود ان کتابوں کی اصحیت کا کوئی بھی قائل نہیں ہے
اگر اُمت سے پوری اُمت مراد ہے تو اس سے زیادہ کوئی غلط بات نہیں
ہے کیونکہ ان کتابوں کی تحسین بخاری اور ائمہ مذاہب کے بعد منصفہ شہود
پر آئی ہے اور اگر اُمت سے ساری اُمت نہیں بلکہ وہ حضرات مراد ہیں
جو ان کتابوں کے مؤلفین کے بعد ہوتے ہیں تو یہ ساری اُمت نہیں
ہے اور کچھ لوگوں کی تلمیذی مفید مدعا نہیں ہے لے

غالباً محمد بن اسماعیل بیانی کے اعتراض سے گلو خلاصی کے لیے متاخرین میں نواب صدیق حسن
خاں مرحوم نے تلمیذی الامت بالقبول میں تھوڑی سی ترمیم کر کے تلمیذی الامت بالقبول کا عنوان اختیار کیا
ہے چنانچہ وہ الحظ فی ذکر الصحاح الستہ میں فرماتے ہیں :
و تلقاھما الامتہ بالقبول لے

اور اشخاص النبلاء المتقین میں لکھتے ہیں :

ائمہ دین تلمیذی کردہ انداز میں ہر دو را قبول لے

اور مولانا آزاد نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں ان سے بے پروا ہو کر لکھ دیا ہے کہ :
صحیحین کو ترجیح محض ان کی شروط کی بنا پر نہیں ہے بلکہ شہرت اور

قبول کی بنا پر ہے اور اس پر تمام امت کا اتفاق ہو گیا ہے۔

لیکن یہ دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ مولانا نے اس دعویٰ پر کسی دلیل سے بحث نہیں فرمائی ہے اور محققین کو سب مدعیان تعلق سے یہی شکایت ہے کہ وہ نہ تو دعویٰ کی وضاحت کرتے ہیں اور نہ ان کے پاس دلائل کا سرمایہ ہے۔ عقیدت کیشتی کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے مگر سوال عقیدہ کا نہیں ہے بلکہ علم و نظر اور تحقیق کا ہے۔

بہر حال یہ بحث متاخرین محدثین کے یہاں طویل الذیل ہے اصلی بات وہی ہے جو اس میں امیر میانی نے توضیح الافکار میں فرمادی ہے کہ :

قالا دلی عندی فی الاستدلال علی تقدم الصیغین هو اخبار

مؤلفیہما بان احادیثہما صحیحۃ لہ

صحیح یہی ہے کہ صحیحین کے مقدم ہونے کی وجہ ان کے مؤلفین کا یہ کہنا ہے کہ ان کتابوں کی احادیث صحیح ہیں۔

اور اس بات کا مطلب کہ ان دونوں کتابوں کی احادیث صحیح ہیں یہ بھی علامہ میانی کی زبانی ہی سن لیجئے :-

امام بخاری کا یہ کہنا کہ یہ احادیث صحیح ہیں اس کہنے کے مترادف ہے کہ ان حدیثوں کے راوی عادل اور ضابط ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی شذوذ اور کوئی علت نہیں ہے۔

اگر واقعہ یہی ہے کہ ان کتابوں کی صحت میں بالا ہونے کی وجہ صرف اتنی بات ہے کہ ان حدیثوں کے راوی عدالت و ضبط کی صفات سے موصوف اور ان کی بیان کردہ روایات شذوذ اور علت کے داغ سے پاک ہیں اور اس کے علاوہ ان بزرگوں کی نہ قائم کردہ کوئی شرط ہے اور نہ اس کی وجہ تعلق بالقبول ہے تو پھر صحیحیت کو ان کتابوں میں محدود کرنا اپنے اندر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے کیونکہ اس بنا پر کسی کتاب کو اصح کہنا کہ اس کے لکھنے والے بڑے بزرگ ہیں کوئی علمی اور تحقیقی بات نہیں ہے اس لیے حافظ ابن الہمام کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ :

یہ خواہ مخواہ کی آپس اور تقلید محض ہے کیونکہ اصحیت کا دار و مدار تو صرف

اس پر ہے کہ صحیحین کے راوی ان شرائط کے تحت ہیں جو ان کے مؤلفین کے پیش نظر ہیں۔ بالفرض اگر یہی شرطیں ان کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہوں اور اس کے راوی اسی معیار پر پورے اترتے ہوں تو پھر صحیحین کی حدیثوں کو اصح کہنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اور صرف یہ حافظ ابن الہمام کا ہی خیال نہیں ہے بلکہ اس میں اور بھی حافظ ابن الہمام کے ہم نوا ہیں۔ حافظ ابن الہمام کے شاگرد علامہ ابن امیر الحاج نے یہاں عجیب نکتہ لکھ دیا کہ: بخاری اور مسلم کا اصحیت میں مقابلہ بخاری اور مسلم کے بعد آنے والوں سے ہے۔ ان مجتہدین کی کتابوں سے ہرگز نہیں ہے جو امام بخاری اور امام مسلم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

یہ بھی یہ انصاف کی بات درنہ بڑی ہی بے انصافی ہوگی کہ سلف مجتہدین کا مقابلہ بعد کے ان محدثین سے کیا جائے جو فضل و کمال، علم و اجتہاد اور تحقیق و تنقید میں ان کے برابر نہ تھے شاید یہی چیز ہے جس نے حکیم الامت شاہ ولی اللہ کو کتب حدیث میں موطا کی اصحیت کے اعلان پر مجبور کر دیا۔ نواب علامہ صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

نزد شاه ولی اللہ محدث دہلوی ومن قال بقولہ اصح کتب در حدیث وفقہ
موطا است پستر بخاری پستر مسلم۔

شاہ صاحب نے اس کے نزدیک دلائل اور وجوہ نہایت شرح و بسط سے اپنی مشہور کتاب مصفیٰ میں بیان فرمائے ہیں۔ اسی ضمن میں علامہ زاہد کوثری کا ایک بیان بڑا ہی معنی خیز ہے۔ جو انہوں نے شروط الامۃ الخمسہ کی تعلیقات میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

شیخین ہوں یا اصحاب سنن سب کے سب حفاظ حدیث باہم معاصر ہیں اور تدوین فقہ اسلامی کے بعد منصفہ شہود پر آئے ہیں اور حدیث کے ایک خاص حصہ پر اپنی توجہات کو مرکوز کیا ہے ان سے پہلے ائمہ مجتہدین کے سامنے حدیث کی ساری انواع، مرفوع، موقوف، مرسل اور صحابہ و

تابعین کا وافر ذخیرہ تھا۔ کیونکہ نظر اجتہاد میں حدیث کی تمام انواع ہوتی ہیں چنانچہ اس دور کی جوامع اور مصنفات اس کی شاہد ہیں ان کی حدیث کی ساری قسمیں مذکور ہیں جن کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے اور ان جوامع کے مؤلفین ارباب صحاح ستہ سے پہلے المہ مجتہدین کے تلامذہ ہیں یا تلامذہ کے تلامذہ ہیں۔

بہر حال امام بخاری کی کتاب جس کا پورا نام خود امام بخاری کا تجویز کردہ ”المجامع الصحیح الممسند“ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنتہ و ایامہ“ ہے اپنے دور کی ایک بہترین جامع تصنیف ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امام موصوف نے جہاں احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے اس ساتھ اور بھی بہت سے فوائد اور نوادر کی طرف اشارات فرمائے ہیں۔ انہوں نے فقہ کا بے شمار ذخیرہ تراجم میں پھیلایا ہے پھر اس کے مناسب آثار صحابہ اور احادیث مرفوعہ پیش کی ہیں تاکہ حدیث اور فقہ کا ربط ظاہر ہو جائے پھر ہر باب میں ان احکام کے مناسب قرآنی آیات تلاوت کی ہیں تاکہ فقہ کے تمام ابواب قرآن کریم میں اجمالاً نظر آجائیں اور ان کے مناسب احادیث دیکھ کر قرآن کی جامعیت کا پورا مشاہدہ ہو جائے اسی کے ساتھ قرآن اور حدیث کا ربط بھی معلوم ہو جائے اور اس طرح ایک ہی تصنیف منکرین فقہ اور منکرین حدیث دونوں کا جواب بن جائے۔ فقہ کو برا کہنے والے احادیث سے مسائل کے اشتباہ کا طریقہ سیکھ لیں اور حدیث کو قرآن کے خلاف کہنے والے قرآن میں احادیث کا ماخذ معلوم کر لیں۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں :

کل البواب الفقہ لیس منها الاول اصل فی القرآن تعلیم
والحمد للہ حاشا القراض

فقہ کے تمام موضوعات کی قرص کے علاوہ قرآن میں اصل موجود ہے اس لحاظ سے گویا امام بخاری کی صحیح ان تمام علوم و فنون کا مجموعہ بن کر آئی جو اس دور تک اسلام کی محنتوں سے منصہ وجود پر آ گئے تھے چنانچہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث فرماتے ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ امام بخاری دو سو سال بعد رونما ہوئے اور ان سے

پیشتر علماء علوم و دینیہ میں مختلف فنون کی کتابیں تصنیف کر چکے تھے چنانچہ
امام مالک، سفیان ثوری نے فقہ میں اور ابن جریر نے تفسیر میں، ابو حنیفہ
نے عرب قرآن میں اور محمد بن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ نے سیرت میں،
عبد اللہ بن المبارک نے زہد و مواعظ میں، کسائی نے ہدایہ الخلق میں اور
یحییٰ بن معین نے صحابہ و تابعین کے حالات میں نیز متعدد علماء نے
فن رویا، ادب، طب، شمائل، اصول حدیث، اصول فقہ اور رد مبتدعین
پر کتابیں تصنیف کی تھیں۔ امام بخاری نے ان تمام مدونہ و مردوجہ علوم کا
ایک حصہ کر جس کو انہوں نے بصراحت یا بدلالہ ان حدیثوں میں پایا جو
امام بخاری کی شرط پر تھیں اپنی کتاب میں درج کر دیا۔

حافظ ابوبکر بن موسیٰ حازمی فرماتے ہیں کہ :

امام بخاری کا پیش ہمارے صرف یہ تھا کہ حدیث کا ایک مختصر مجموعہ لوگوں کے
ہاتھ میں آجائے۔ تمام احادیث کا استیعاب ان کا مقصود نہ تھا ان کی شرط
صرف یہ تھی کہ جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہیں ان کو درج کریں کیونکہ
وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں صرف حدیثیں روایت کی ہیں۔

امام بخاری سے اس کتاب کو اگرچہ نو ہزار لوگوں نے سنا تھا لیکن امام موسوف کے جن تلامذہ
سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا وہ چار بزرگ ہیں۔

۱۔ ابراہیم بن معقل، ۲۔ حماد بن شاہر، ۳۔ محمد بن یوسف الفریری، ۴۔ ابوطیہ منصور بن محمد البرزوی۔
ان چار میں پہلے دو بزرگ ابراہیم اور حماد مشہور حنفی عالم ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے
شروع میں اپنا سلسلہ سند ان حضرات تک بیان کر دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :
ومن طریق ابراہیم بن معقل بن الحجاج النسفی وكان من الحفاظ
وله تصانیف - ومن طریق حماد بن شاہر النسوی

ان چاروں میں ابراہیم اور حماد کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ ان کو امام بخاری سے جامع کی
روایت کا سب سے پہلے موقع ملا ہے کیونکہ ابراہیم اور حماد کی وفات بالترتیب ۲۹۴ھ اور ۳۱۱ھ

میں ہوئی جب فریری اور ابوطحہ کی وفات ۳۲۰ھ اور ۳۲۹ھ میں ہوئی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ دونوں حنفی بزرگ امام بخاری کی کتاب کو ان سے روایت نہ کرتے تو جامع کی روایت کی ضمانت تنہا فریری پر رہ جاتی اور اس طرح روایتی نقطہ نظر سے صورت حال بڑی نازک ہو جاتی۔ علامہ کوثری نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

هذا البخاري لو لا ابراهيم بن معقل النسفي وحماد بن شاكر الخنصيان

لكاد ينفرد الفري عنه في جميع الصحيح سماعاً

بالفاظ دیگر ۳۲۰ھ تک امام بخاری کی صحیح کا روایتی مرکز صرف احناف ہی تھے۔ بہر حال امام بخاری کی کتاب جیسا کہ امام ذہبی نے تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ کتب الاسلام میں افضل اور اسنادی نقطہ نظر سے لوگوں کے لیے علم کا بہترین سرمایہ ہے۔

صحیح مسلم و صحیح بخاری میں موازنہ

اس پر تو جیسا کہ آپ سن آئے ہیں سب ہی کا اتفاق ہے کہ صحیحین اپنے زمانے اور اپنے بعد کی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہیں چنانچہ نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں :

لا ريب في تقديم الشيخين على المتأخرهما ومن بعدهما

في معرفة الصحيح والعلل

اگر کچھ اختلاف ہے تو اس تقدیم کی علت اور بنیاد میں ہے کچھ کی بات ہے میں ان بزرگوں کا ان کتابوں میں التزام صحت ہے اور کچھ کے خیال میں اس کی علت ان بزرگوں کی قائم کردہ شرطیں ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ اس کی علت تلفی الامت بالقبول ہے۔ ان پر علماء کے مختلف خیالات آپ سن چکے ہیں۔ اصل بات سب کے یہاں تقریباً متفق علیہ ہے کہ صحیحین کا پایہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں بلند ہے۔ اس پر اتفاق کے بعد البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان دونوں میں سے از روئے صحت خالص محدثانہ نقطہ نظر سے کس کا مقام اونچا ہے ؟

حافظ ابن حجر عسقلانی اور عام علماء صحیح بخاری کو اصح قرار دیتے ہیں اور امام نووی نے صحت کے پہلو کو سامنے رکھ کر اس کی تصویب کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحت کی عمارت جن دو ٹہنت اور

دو منفی ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے وہ تمام بخاری میں موجود ہیں۔ یعنی راویوں کی عدالت، اتصال سند کے ساتھ عدم تشدد و ذور عدم علت قاضی، عدالت و ضبط کے لحاظ سے بخاری کا مقام مسلم سے اونچا ہے۔ اتصال کے پیش نظر بھی بخاری کو برتری حاصل ہے کیونکہ بخاری کے نزدیک صرف معاصرت کافی نہیں ہے بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے چاہے ایک ہی بار ہو۔ شاذ نہ ہونے اور علت نہ ہونے کی بنیاد پر بھی بخاری کا پڑا بھاری ہے کیونکہ نقد و جرح میں بخاری کی روایات بہ نسبت روایات مسلم کے کم ہیں۔ حافظ سیوطی نے بھی اس کی ہمنوائی کی ہے اور اس کو متعدد وجوہ سے ثابت کیا ہے لیکن اس کے برعکس مغاربہ کی رائے بجاتے بخاری کے مسلم کے حق میں ہے اور ان مغاربہ میں حافظ ابن حزم، حافظ ابو علی الحسین بن علی نیشاپوری وغیرہ داخل ہیں چنانچہ شیخ ابو محمد القاسم بن القاسم تجلیبی نے اپنی فہرست میں امام ابن حزم ظاہری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صحیح مسلم کو امام بخاری کی کتاب پر ترجیح دیتے ہیں اور مشہور مالکی محدث قاضی عیاض نے اللامع میں ابو مردان طہینی سے نقل کیا ہے کہ میرے کچھ شیوخ صحیح مسلم کو ترجیح دیتے تھے۔ علامہ زرکشی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صرف کچھ کا نہیں بلکہ اکثر مغاربہ کا ہے چنانچہ امیر میانی فرماتے ہیں :

لا یخفی ان ما قالہ الزرکشی ان دائرة الخلاف اوسع والذاهبون
الی ترجیح مسلم اکثر ممن ذکر

بعض علمائے مغاربہ کے اس میلان کی وجوہ بھی قلم بند کی ہیں۔ چنانچہ علامہ الجزائری فرماتے ہیں کہ امام ابو علی نیشاپوری نے صحیح مسلم کو بخاری پر جو فوقیت دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب خاص اپنے شہر میں اپنے اساتذہ کی موجودگی میں لکھی وہ بیان و تحریر اور الفاظ میں بے حد محتاط تھے۔ بخلاف امام بخاری کے کہ وہ اکثر احادیث کو صرف حافظ کی مدد سے لکھتے اور راویوں کے الفاظ میں امتیاز نہ کرتے اسی وجہ سے آپ کو شک ہو جاتا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے کئی حدیثیں بصرہ میں سنی ہیں مگر ان کو شام میں پہنچ کر قلم بند کیا ہے۔

حافظ عسقلانی نے مغاربہ کے اس تاثر کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :
 میری رائے میں اس کا تعلق صحیح مسلم کی اصحیت سے نہیں بلکہ اس کی وجہ
 کچھ اور ہیں ایک وجہ وہ ہے جو حافظ ابن حزم نے بتائی ہے کہ اس میں
 خطبہ کے بعد حدیث کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ
 امام بخاری روایت بالمعنی کے قائل ہیں۔ نیز وہ ایک حدیث کو ٹکڑے
 کر کے پیش کرنے کو درست سمجھتے ہیں۔ برخلاف امام مسلم کے کہ وہ
 اس کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے یہ کتاب
 ایک جگہ قیام کی حالت میں نہیں بلکہ سفر میں لکھی ہے چنانچہ وہ خود فرماتے
 ہیں کہ میں نے کئی حدیثیں بصرہ میں سنی ہیں مگر لکھنے کی نوبت خراسان
 میں آتی ہے اس وجہ سے بسا اوقات حدیثیں صرف حافظہ کے بھروسہ
 پر قلم بند کرتے اس لیے روایت باللفظ نہ ہوتی تھی بلکہ روایت میں
 تصرف کر کے اس کے مدلول و مدعا کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے
 تھے لیکن امام مسلم نے اپنی کتاب قیام کی حالت میں اپنے اساتذہ کے
 سامنے لکھی ہے وہ الفاظ میں بے حد محتاط اور روایت باللفظ کے
 پابند تھے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امام بخاری کی حمایت میں امام بخاری کے حامیوں کا لب و لہجہ ناگوار
 حد تک پہنچ گیا۔ چاہے تو یہ تھا کہ ان مغاربہ کی تنقیدات کا علمی اور تحقیقی جواب دیا جاتا لیکن ہوا
 یہ کہ امام مسلم اور امام ابوعلی نیشاپوری تک پر نہایت رکیک الزام لگائے اور ایسی زبان استعمال
 کی جو علمی زبان نہیں ہے اور نہ میدان تحقیق میں محققین کے نمایان نشان ہے چنانچہ حافظ ابو سعید
 العلانی کو جب امام مسلم کی برتری کے بارے میں امام ابوعلی کے تاثرات معلوم ہوئے تو فرمایا کہ
 امام ابوعلی نیشاپوری کو صحیح کا پتہ ہی نہیں ہے۔

اور مشہور حاکم کبیر ابو احمد نے اس معاملہ میں حد کروی۔ حافظ ابن حجر ان سے ناقل ہیں :
 اللہ محمد بن اسماعیل پر رحمتیں برسانے انہوں نے اصول پر کتاب تالیف کی

اور لوگوں کے لیے بیان کیا ہے اور جس نے بھی آپ کے بعد کوئی کام کیا ہے وہ آپ ہی کی کتاب کے ذریعے کیا ہے جیسے امام مسلم انہوں نے امام بخاری کی کتاب کے زیادہ حصے کو اپنی کتاب میں بکھیر دیا اور اس میں ایسی ٹھٹھانی سما مظاہرہ کیا کہ امام بخاری کا نام تک نہیں لیا۔ حافظ ابن حجر نے صرف حاکم کبیر کی بات کو نقل کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس سے آگے قدم بڑھا کر حافظ دارقطنی کا وہ جبار خانہ بیان بھی نقل کیا ہے جو امام مسلم کی جلالتِ شان کے سراسر خلاف ہے۔ لکھتے ہیں:

دارقطنی کہتے ہیں کہ اگر امام بخاری نہ ہوتے تو امام مسلم کا نام تک نہ ہوتا۔

اس پر بس نہیں بلکہ فرمایا کہ:

امام مسلم نے امام بخاری کی کتاب لی ہے اور اسی کا مستخرج بنا کر اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ کر دیا ہے۔

انا للہ فاللہ الشکلی۔ امام مسلم کا حدیث میں جو پایہ ہے اس کو دیکھتے ہوتے یہ دارقطنی کی محض بدگمانی ہے جو سراسر واقعات کے خلاف ہے۔ اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ امام بخاری کو حدیث کی معلومات جن اساتذہ سے حاصل ہوئی تھیں وہ ہی اساتذہ قریب قریب امام مسلم کے بھی تھے اور حدیث و روایت کا جو مجموعہ امام بخاری کے پیشِ نظر تھا وہی کم و بیش امام مسلم کے بھی سامنے تھا۔ امام یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، امام علی بن المدینی، امام عبداللہ بن المبارک، امام اعظم، امام محمد، امام ابو یوسف کی جس قدر تصانیف امام بخاری کی نظر سے گزری ہیں۔ امام مسلم کی نظر سے بھی گزری تھیں۔ پھر یہ کہنا کس قدر بے انصافی ہے کہ امام مسلم جیسے امام کبیر نے جو کچھ اس فن میں لکھا وہ امام بخاری سے لے کر نقل کر ڈالا اور اس پر معاذ اللہ ان کی بددیانتی کا عالم یہ تھا کہ امام بخاری کا نام بھی نہیں لیا۔

حدیث میں امام مسلم کا مقام

امام مسلم کا حدیث میں جو درجہ ہے اس کا اندازہ حافظ عصر البوالعباس بن عقدہ کے

اس بیان سے ہو سکتا ہے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ بخاری و مسلم میں حدیث میں مقام کس کا اونچا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ دونوں عالم ہیں سائل کہتا ہے کہ میں نے بار بار ان سے یہی سوال کیا تو فرمایا کہ :

امام بخاری سے اہل شام کے بارے میں غلطیاں ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے ان کی کتابیں لے کر مطالعہ کیا تھا اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کنیت کے ساتھ ایک شخص مذکور ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کا نام آتا ہے تو یہ اس کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں لیکن امام مسلم کو عقل میں غلطی بہت ہی کم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے صرف مسند حدیثیں لکھی تھیں اور مقطوع و مرسل روایات نہیں لکھی ہیں۔

یہی بات متاخرین محدثین میں سے جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے ذرا اور وضاحت سے پیش فرمائی ہے :

امام مسلم نے اپنی صحیح میں علم حدیث کے عجائبات کا خزانہ فراہم کیا ہے خصوصاً احادیث کی سندوں اور متون میں ایک بے مثال علمی نمونہ ہے اسی بنا پر صحیح حدیث کو ضعیف حدیث سے ممتاز کرنے میں امام بخاری کی کتاب کے مقابلے میں امام مسلم کی کتاب کو شرف تقدم ہے۔ امام بخاری اہل شام کے بارے میں غلطیاں کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک شخص کو ایک جگہ کنیت سے اور دوسری جگہ نام سے ذکر کرتے ہیں اور اس طرح ایک ہی شخص کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی روایات اکثر اہل شام سے بطور مناولہ ہوتی ہیں۔ برخلاف امام مسلم کے کہ وہ کسی مقام پر ایسی غلطی کا شکار نہیں ہوتے۔ صحیح بخاری کی حدیثوں میں تقدم و تاخير، حذف و اسقاط کی وجہ سے متون احادیث میں پیچیدگی آجاتی ہے لیکن یہ بات صحیح مسلم میں نہیں ہے کیونکہ امام مسلم الفاظ حدیث کو بغیر کسی ترمیم کے اور رجال حدیث کو اس طرح لاتے ہیں کہ

کبھی کوئی تخریف نہیں ہوتی ہے بلکہ
صحیح مسلم کی شہرت اگرچہ مصنف سے تو اتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے لیکن اس کی روایت کا سلسلہ
جس بزرگ کے دم سے قائم رہا ہے وہ مشہور فقیہ حنفی شیخ ابواسحاق ابراہیم بن محمد نیشاپوریؒ ہیں
پس چنانچہ امام نووی مقدمہ شرح مسلم میں رقمطراز ہیں :
اسناد متصل کے ساتھ امام مسلم سے اس کی مسلسل روایات کا سلسلہ ان شہروں
اور اس زمانے میں صرف ابواسحاق ابراہیم بن محمد کی ذات سے وابستہ ہے۔

سنن نسائی اور صحاح میں اس کا مقام

امام نسائی نے اپنی سنن میں امام بخاری اور امام مسلم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے اور
صرف صحیح روایات ہی کو اپنی کتاب میں روایت کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب بخاری اور مسلم دونوں کے
طریقوں کی جامع ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر مستند ہے اور اس کے ساتھ حسن ترتیب
اور جودت تالیف کا بہترین نمونہ ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے زہر الربیٰ میں حافظ ابو عبد اللہ
بن رشد سے نقل کیا ہے کہ :

علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئی ہیں یہ کتاب ان سب میں بلحاظ
تالیف انوکھی اور باعتبار ترتیب بہترین اور مثالی ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں
کے طریقوں کی جامع ہے نیز علل احادیث کا بھی ایک معتد بہ حصہ اس میں
آگیا ہے بلکہ

حافظ ابو علی النیشاپوریؒ، حافظ ابن عدیؒ، حافظ دارقطنیؒ، حافظ عبد الغنی اور امام حاکم نے اس
کتاب کی صحت کو سراہا ہے بلکہ حافظ ابن مندہ نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ :
الذین خرجوا الصحيح اربعة البخاری و مسلم و ابو داؤد و النسائی

یعنی جن چار نے صحیح احادیث کو روایت کیا ہے ان میں ایک امام نسائی بھی ہیں اور حافظ
ذہبی نے مذکورہ الحفاظ میں لکھا ہے کہ :

ابن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے سعد بن علی الزنجانی سے ایک شخص کے بارے

میں دریافت کیا انہوں نے فرمایا کہ ثقہ ہے عرض کیا کہ امام نسائی نے اس کی
تضعیف کی ہے بولے کہ پر خوردار رجال کے بارے میں امام نسائی کی امام
بخاری اور امام مسلم سے زیادہ کڑی شرطیں ہیں۔

لیکن حافظ محمد بن ابوالہیثم الوزیری کو اس دعویٰ کی صحت میں تامل ہے وجہ یہ ہے کہ حافظ ابن مندہ نے
لکھا ہے کہ امام نسائی کی شرط یہ ہے کہ اس شخص سے حدیث روایت کریں گے جس کے ترک پر اجماع
نہ ہوا ہو۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اجماع سے اجماع عام مراد نہیں ہے بلکہ طبقات ناقدین میں
سے ایک خاص طبقہ کا اجماع مراد ہے۔ حافظ سخاوی کے اس بیان سے جو انہوں نے اس موضوع
پر الاعلان بالتوزیع میں لکھا ہے۔ اس پر مزید روشنی پڑتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ :

امام نسائی کا مذہب یہ ہے کہ کسی راوی کی حدیث اس وقت تک نہ چھوڑی
جائے گی جب تک اس راوی کے ترک پر سب کا ایک نہ ہو جائے۔ امام نسائی
کا مقصود یہ ہے کہ ناقدین میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ متشددین اور متوسطین
متشددین میں امام شعبہ اور سفیان ثوری ہیں۔ متدلیلین میں یحییٰ القطان اور
عبدالرحمن بن مہدی ہیں۔ قیسرے طبقے میں یحییٰ بن معین اور امام احمد ہیں
چوتھے طبقے میں ابو حاتم اور بخاری ہیں۔ امام نسائی کا مذہب یہ ہے کہ
کسی راوی کو اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک سب کا اس کے
چھوڑنے پر اتفاق نہ ہو جائے یعنی اگر ایک راوی کو عبدالرحمن بن مہدی
ثقہ بتاتے ہیں مگر یحییٰ القطان اس کی تضعیف کرتے ہیں تو اسے نہ چھوڑا
جائے گا کیونکہ راویوں کے بارے میں یحییٰ کا تشدد معلوم ہے یہ

اگرچہ صاحب التتبع الانظار نے امام ابوالقاسم سعد بن علی الزنجانی کی اس بات
یا بنی ان لا بی عبدالرحمن فی الرجال شرطاً اشد من شرط
البخاری و مسلم۔

کی صحت سے انکار کیا ہے اور اس کی ایک وجہ تو حافظ ابن مندہ کی بالا روایت کو قرار دیا ہے
اور دوسری وجہ یہ بتاتی ہے کہ چونکہ اس روایت کو حافظ ابن الصلاح اور حافظ زین الدین عراقی

نے ذکر نہیں کیا ہے اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہے لیکن حافظ ذہبی نے تاریخ میں تصریح کی ہے کہ امام ابو القاسم سعد بن علی النسجانی نے جو کچھ کہا ہے صحیح ہے اور حافظ ذہبی کے علاوہ خود حافظ ابو الفضل بن طاہر مقدسی نے شروط الائمہ میں بھی یہ واقعہ لکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ناقدین فن کے نزدیک جلال علمی کے لحاظ سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم سے بھی اونچا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رقمطراز ہیں :

فن رجال میں ماہرین فن کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم پر بھی فوقیت دی ہے اور دارقطنی وغیرہ نے ان کو اس فن میں اور دیگر علوم حدیث میں امام الائمہ ابو بکر بن خزمیہ پر مقدم کیا ہے۔

اور حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں امام نسائی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ :

یہ مسلم، ترمذی اور ابو داؤد سے حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں

زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری اور امام ابو زرعمہ کے ہم عصر ہیں۔

بہر حال امام نسائی بڑی جلال قدر کے مالک ہیں ان کی کتاب سنن نسائی کے نام سے مشہور ہے یہ کتاب دراصل امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی بن بحر النسائی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب کا اختصار ہے حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ ان کے شاگرد حافظ ابو بکر بن اسنی کے قلم کار ہیں منت ہے اس کا نام المجتبى ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

اختصر السنن و سماها المجتبى۔

کچھ کا خیال ہے کہ مجتبى خود امام نسائی ہی کی تصنیف ہے اس خیال کی تائید میں اس واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ امام نسائی نے جب سنن تصنیف فرمائی تو اس کو امیر رملہ کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا۔ امیر موصوف نے امام ممدوح سے دریافت کیا کہ کیا اس میں جو کچھ ہے سب کچھ صحیح ہے امام نسائی نے جواب دیا نہیں اس پر امیر نے فرمائش کی کہ میرے لیے صرف صحیح روایات کو جمع کر دیجئے تب امام نسائی نے اس کے لیے سنن صغریٰ تصنیف فرمائی۔ اس واقعہ کا ذکر علامہ ابن الاثیر نے جامع الاصول میں کیا ہے لیکن یہ کہانی محققین کے خیال میں صحیح نہیں ہے امیر میانی نے حافظ ذہبی کی سیر اعلام النبلاء کے حوالہ سے بتایا ہے کہ :

ان هذه الرواية لم تصح بل المجتبى اختصار ابن السني تلميذ
النسائي - ۱

امام نسائی کے اسامذہ میں بزرگ ترین ہستی مشہور محدث امام اسحاق بن راہویہ کی ہے۔ امام اسحاق
نے حدیث میں امام عبداللہ بن المبارک، بحریر بن عبد الحمید، فضل بن عیاض کے سامنے زائونے ادب
تہ کیا ہے اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق یہ تینوں امام اعظم کے
تلامذہ ہیں سے ہیں اور امام نسائی سے جن لوگوں کو شرف تلمذ حاصل ہے ان میں حافظ ابوشیر الدولابی
اور حافظ ابو جعفر الطحاوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حافظ ابوشیر الدولابی محدث بن احمد حدیث کے مشہور حافظ اور فن جرح و تعدیل کے امام ہیں
طلب حدیث میں حسب تصریح حافظ ذہبی حرین، عراق، مصر اور شام کا سفر کیا اور بہت سے
شیوخ سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ — حدث عن اثني عشر شيخا
كثرت بكثرة شيخه من حدیث بیان کی ہے یہ امام بخاری سے بھی تلمذ حاصل ہے چنانچہ امام
بخاری سے ان کی کتاب الضعفاء الصغیر کے راوی بھی ہیں حافظ ابن یونس لکھتے ہیں:

كان الدولابي من اهل الصنعة حسن التصنيف

حافظ مسلم بن قاسم فرماتے ہیں۔

كان مقدما في العلم والرواية ومعرفة الاخبار

دولابی علم وروایت اور معرفت اخبار میں پیش پیش ہیں۔

اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ:

جالس العلماء وتفقه لابی حفيضة

علماء کی ہم نشینی اختیار کی ہے اور ابو حنیفہ کا فقہ حاصل کیا۔

فن حدیث میں جن اکابر حفاظ نے آپ کے سامنے زائونے شاگردی تہ کیا ہے ان میں ابن عدی،
طبرانی اور ابن المقرئ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سنن ابی داؤد کا صحیح میں مقام

امام ابو داؤد نے خود اپنی کتاب کا ایک خط میں تفصیلی تعارف کرایا ہے یہ خط اہل مکہ کے خطا کا

جواب ہے جس میں انہوں نے کتاب السنن کی حدیثوں کے متعلق امام موصوف سے دریافت کیا تھا ظاہر ہے کہ اس موضوع پر امام موصوف کے بیان کو جواب دہیت ہے وہ کسی اور کے بیان کی نہیں ہو سکتی۔ ہم یہاں اس رسالہ کا اقتباس نواب صدیق حسن خاں کی کتاب الحطہ سے نقل کرتے ہیں۔

آپ لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ کتاب السنن میں جو حدیثیں آتی ہیں کیا وہ میرے علم کے مطابق صحیح ترین ہیں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب حدیثیں صحیح ہیں۔ لیکن ایسی حدیثیں جو دو صحیح طریقوں سے مروی ہوں اور ان میں ایک کا راوی اسناد میں مقدم ہوا اور دوسری کا حفظ میں بڑھا ہوا ہو تو ایسی صورت میں کبھی پہلی کو لکھ دیتا ہوں اور بعض دفعہ میں نے ایک طویل حدیث کو مختصراً ذکر کیا ہے کیونکہ اگر میں اس کو پوری نقل کرتا تو بعض سامعین کو پتہ بھی نہ چلتا اور اس میں جو فقہ کا مسئلہ تھا وہ سمجھ میں نہ آتا۔ اس بنا پر میں نے اختصار کیا اور جب کسی باب میں میں نے کسی حدیث کو دو یا تین طریقوں سے دہرایا ہے تو اس لیے کہ اس میں کوئی بات زیادہ تھی اور کبھی اس میں دوسری احادیث کی بہ نسبت ایک نکتہ زیادہ ہوتا ہے اور جو حدیثیں میں نے اپنی کتاب السنن میں درج کی ہیں ان میں اکثر مشہور ہیں جو ہر اس شخص کے پاس موجود ہیں جس نے تھوڑا بہت حدیث کو لکھا ہے لیکن ان میں تیز کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ سنن ابی داؤد کی افادیت کے پیش نظر امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔ مشہور محدث ابویسحٰی ذکرہ یا ساجی کے الفاظ ہیں۔

کتاب اللہ عن وجل اصل الاسلام و کتاب السنن لابن داؤد
عہد الاسلام۔

حافظ حمیدی کا بیان ہے کہ ایک روز حافظ ابن حزم کی مجلس میں صحیحین اور ان کی رفعت شان کا تذکرہ ہوا تو حافظ ابن حزم نے بتایا کہ حافظ سعید بن سکین کے پاس محدثین کی ایک

جماعت آئی اور انہوں نے کہا کہ علم حدیث میں کتابیں بہت زیادہ ہیں اگر شیخ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کریں اور بتائیں کہ ہم کون سی کتابوں کو اپنائیں تو بس ہم ان ہی پر اکتفا کر لیں۔ حافظ ابن سکن یہ سن کر خاموش ہو گئے اور گھر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے کتابوں کے چار گٹھے اُپر نیچے رکھ کر لاتے اور فرمایا:

هذه فتاوى الاسلام كتاب مسلم، كتاب البخاري وكتاب ابى داود
وكتاب النسائي۔

حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ جس حدیث پر امام ابو داؤد کلام نہ کریں وہ ان کے نزدیک صحیح ہے و جب اس کی یہ ہے کہ خود امام ابو داؤد کی تصریح یہ ہے کہ میں نے کتاب السنن میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو میرے علم میں ہر موضوع پر سب سے زیادہ صحیح ہیں اس سے حافظ ابن الصلاح اور امام نووی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جن حدیثوں پر ابو داؤد نے کوئی کلام نہیں کیا ہے وہ قابل عمل ہیں اور ان کا مقام صحیح نہیں بلکہ حسن ہے لیکن حافظ ابن رشید نے لکھا ہے کہ ابو داؤد کے کلام نہ کرنے سے حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا۔ بہر حال محدثین کے یہاں یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ وہ حدیثیں جن پر ابو داؤد نے کلام نہیں کیا صحیح ہیں یا حسن؟ علامہ یافعی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

فالصواب انه يحتمل الثلاثة الحسن والصحة والوهن
غير الشدید لا كما قاله ابن الصلاح ولا كما قال ابن رشید
ٹھیک یہ ہے کہ تین باتوں کا احتمال ہے کہ صحیح ہوں، حسن ہوں
یا پھر ضعیف لیکن کم درجے کی۔ نہ ابن الصلاح کے خیال کے مطابق
اور نہ ابن رشید کی رائے کے موافق ہے۔

علامہ خطابی نے سنن ابو داؤد کا تعارف کرتے ہوئے معالم السنن میں لکھا ہے کہ:
امام ابو داؤد کی کتاب السنن بلاشبہ ایسی عمدہ کتاب ہے کہ علم دین میں
ایسی عمدہ کوئی کتاب نہیں ہے اس نے سب کی جانب سے سند قبولیت
حاصل کر لی ہے چنانچہ یہ کتاب علماء کے تمام فرقوں کی جانب سے

اور فقہاء کے سارے طبقوں میں باوجود اختلاف کے حکم مافی جاتی ہے۔
 سب لوگ اسی گھاٹ اُتے ہیں اور یہیں سے سیراب ہوتے ہیں۔ اسی
 پر اہل مصر، اہل عراق، بلادِ مغرب اور روستے زمین کے بہت سے شہروں
 کے رہنے والوں کو اعتماد ہے۔ البتہ خراسان میں بیشتر لوگ محمد بن اسماعیل
 مسلم بن الحجاج اور ان لوگوں کی کتابوں کے دلدادہ ہیں کہ جو صحیح صحیح
 میں ان دونوں حضرات کے قدم بقدم چلے ہیں اور جنہوں نے جانچ
 پڑتال میں ان کی شرطوں کو ملحوظ رکھا ہے لیکن ابو داؤد کی کتاب تریب
 کے اعتبار سے بہت اچھی اور بلحاظِ فقہیت بہت اونچی ہے۔

فقہیت میں بہت اونچی مہونے کی وجہ یہ ہے کہ دیگر مصنفین صحاح کے مقابلے میں امام ابو داؤد
 پر ذوقِ فقہی زیادہ غالب ہے۔ چنانچہ تمام ارباب صحاح میں صرف امام ابو داؤد ہی ایک ایسے بزرگ
 ہیں جن کو علامہ ابوالسحاق الشیرازی نے طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے اور امام موصوف نے اسی
 فقہی ذوق کی بنا پر اپنی کتاب میں صرف احادیثِ احکام پر اکتفا فرمایا ہے اگرچہ اس پابندی کی
 وجہ سے ان کی یہ کتاب احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہو گئی ہے لیکن احادیثِ فقہ
 کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں ہے چنانچہ حافظ
 ابو جعفر غرناطی کے حوالے سے حافظ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں:

لابی داؤد فی حصرا حدیث الاحکام واستیعابہا مایس لفیہ۔
 احادیثِ احکام کے بیان میں جو مقام ابو داؤد کا ہے وہ کسی اور کا
 نہیں ہے۔

امام ابو داؤد کے اساتذہ بخاری اور مسلم کے ہی اساتذہ ہیں؛
 اخذ الحدیث عن مشائخ البخاری ومسلم کا محمد بن حنبل
 ابو داؤد نے بخاری و مسلم کے اساتذہ مثلاً امام احمد سے کسب فیض کیا ہے
 ان اساتذہ میں امام احمد کی شخصیت اس صدی کے محدثین میں پدرِ بزرگوار کی حیثیت رکھتی
 ہے۔ شاید ہی تیسری صدی کے محدثین میں کوئی ہو جس کا علمی نسب نامہ بالواسطہ یا بلاواسطہ امام

موصوف سے نہ ملتا ہو بلکہ امام ذہبی نے امام احمد کے تمام تلامذہ میں ابو داؤد کی یہ خصوصیت بتائی ہے۔

کان یثبہ باحمد بن حنبل فی ہدیہ و دلہ و سمعہ لہ

یہ خصوصیت امام ابو داؤد کو امام احمد کے دوسرے شاگردوں سے ممتاز کرتی ہے اور حدیث میں امام احمد کو جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب نہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے ان میں ہشیم بن بشیر، امام جبریل بن عبد الحمید، امام ابو بکر بن عیاش، عباد بن العوام، وکیع بن الجراح، ابن نمیر، عبد اللہ بن المبارک، یزید بن یارون، عبد الرزاق بن ہمام اور یحییٰ بن ابی زائدہ وہ گرامی قدر ہستیاں ہیں جن کو حدیث میں امام اعظم کے سامنے زانوئے ادب نہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ امام ابو داؤد امام اعظم کی مساعی جلیلہ کو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بڑے ادب و احترام سے ان کا نام لیتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر بسند متصل الانتقاء فی فضائل الثلاثة الفقہاء میں ان سے ناقل ہیں :-

حدثنا عبد الله بن محمد بن عبد المؤمن بن يحيى قال اخبرنا
ابو بكر محمد بن بكر بن عبد الرزاق القادر المعروف بابن داود
قال سمعت ابا داود يقول رحم الله مالكا كاف اما ما
رحم الله الشافعي كان اما ما رحم الله ابا حنيفة كان اما ما
ابو داود کہتے ہیں اللہ مالک پر رحمت فرمائے امام تھے اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ
اور شافعی رحمہ اللہ بھی امام تھے بلکہ

سنن ترمذی کا صحاح ستہ میں درجہ

امام ترمذی کی کتاب السنن ابو داؤد اور امام بخاری دونوں کے طریقوں کی جامع ہے اس کی اس جامعیت کا کچھ اندازہ حافظ ابو بکر بن العزنی کے اس بیان سے ہوتا ہے جو عارضۃ الاسود میں ہے :

اس کتاب میں حسب ذیل چودہ علوم ہیں۔ احادیث کی اس طرح تدوین جو عمل سے قریب تر کر دیتی ہے۔ بیان اسناد، تصحیح، تضعیف،

تعدد طرق، جرح رواۃ اور تعدیل، راویوں کے نام اور کیفیت کا بیان، وصل و انقطاع کا ذکر، معمول بہ اور متروک العمل روایات کی توضیح، احادیث کے رد و قبول کا معیار، اس موضوع پر علماء کے اختلاف کا ذکر۔ احادیث کی توجیہ و تاویل کے بارے میں اختلاف افکار کا بیان — یہ وہ علوم ہیں کہ ان میں سے ہر علم اپنی جگہ مستقل ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے قوت المغنزی میں حافظ ابو جعفر بن الزہیر غرناطی سے ترمذی کی خاص محدثانہ خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:

و للترمذی فی فنون الصناعة الحديثية ما لم يشاركه غيره^۱۔

فن حدیث میں امام ترمذی کی وہ شان ہے جس میں امام ترمذی کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

در اصل یہ امام ترمذی ہی کی خصوصیت ہے کہ ایک طرف انہوں نے اپنی کتاب میں احادیث احکام میں سے صرف ان احادیث کو لیا ہے کہ جن پر فقہاء کا عمل رہا ہے۔ دوسری طرف اس کو صرف احکام ہی کے لیے خاص نہیں کیا بلکہ امام بخاری کی طرح سب احادیث کو لے کر اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ علوم حدیث کی ایک سے زیادہ انواع کو کتاب میں اس طرح درج کیا ہے کہ وہ علم حدیث کا ایک چمنستان بن گیا چنانچہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

جامع ترمذی حدیث کی تمام کتابوں میں بعض وجوہ سے سب سے اچھی ہے
اول بلحاظ ترتیب، دوم فقہاء کے مذاہب کا تذکرہ، سوم حدیث کی بلحاظ
اسناد قسمیں صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ، چہارم راویوں کے نام، لقب اور
کیفیت وغیرہ اور ان وجوہ کے علاوہ اور بھی علم رجال سے متعلق فوائد ہیں۔

صحیح کے ساتھ حسن اور غریب کی اصطلاح

اب تک محدثین حدیث کی تقسیم صحیح اور ضعیف میں محصور کرتے تھے امام ترمذی بقول حافظ ابن تیمیہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحیح اور ضعیف کے درمیان حسن کی اصطلاح قائم کی ہے اور حسن

کی تعریف بھی خود امام ترمذی نے کتاب العلل میں یہ بتائی ہے ؛
ہر ایسی حدیث جس کی سند میں کوئی متہم بالکذب نہ ہو اور حدیث شاذ بھی
نہ ہو اور ساتھ ہی کسی طریقوں سے اسے روایت کیا گیا ہو ۔

لیکن اس تعریف کی بنیاد پر یہاں اس سوال کو محدثین کے یہاں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے
کہ اگر امام ترمذی کے نزدیک حدیث حسن کی یہی تعریف ہے اور حسن خود صحیح کی قسم نہیں بلکہ تقسیم ہے
یعنی یہ نہیں کہ صحیح کی دو قسمیں ہیں صحیح حسن اور غریب ۔ تو اس صورت میں ایک ہی حدیث کے بارے
میں یہ فیصلہ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ ہذا حدیث حسن صحیح یا ہذا حدیث حسن صحیح غریب ۔
ظاہر ہے کہ حدیث کی تقسیم اگر فرق مراتب بتانے کے لیے ہوتی ہے تو ایک حدیث میں ایک ہی وقت
میں اعلیٰ اور ادنیٰ مراتب کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے ؟
علمائے اس کے ایک سے زیادہ جوابات دیے ہیں ۔

کچھ کہتے ہیں کہ اگر ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہو تو امام ترمذی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث
ایک سند سے صحیح اور دوسری سے حسن ہے ۔

لیکن جب امام ترمذی ایک حدیث کے بارے میں یہ کہہ کر لا نعرفہ الا من هذا الوجه پھر یہ
فیصلہ فرمادیں کہ ہذا حدیث حسن صحیح تو یہ معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور یہ جواب سوال کو حل
نہیں کرتا ہے ۔

کچھ کی رائے یہ ہے کہ حسن صحیح ایک جگہ کہہ کر امام ترمذی متن اور سند دونوں کے بارے میں اپنی
راتے ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مخاطبوں کے تجلہ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حدیث
بمحاظ متن حسن اور بمحاظ سند صحیح ہے ۔

حافظ ابن کثیر نے اسے بھی محل نظر قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اپنی جو راتے حافظ صاحب نے لکھی
ہے وہ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں کہ ؛

حسن اور صحیح دونوں سلسلے جملے ہیں اور حسن صحیح کا مقام امام ترمذی کی نظر
میں حسن سے بالا اور صحیح سے کمتر ہوتا ہے اس لیے حکم کے لحاظ سے صرف
صحیح اس حدیث سے زیادہ قوت والی ہے جسے حسن صحیح کہہ دیں لے

لیکن حافظ عراقی نے حافظ ابن کثیر کی رائے کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ :
 والذی ظہر لہ تحکمہ لا دلیل علیہ، وهو بعید من فہم
 معنی کلام الترمذی علیہ
 ابن کثیر کی رائے ایک اچھے ہے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ترمذی
 کا کلام اس کا ساتھ دیتا ہے۔

ہمیں اس سلسلے میں شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ کی وہ رائے بہت پسند آتی ہے جو جناب علامہ احمد
 محمد شاہ نے الباعث الحثیث میں ان سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں :
 دراصل امام ترمذی کی نظر میں حسن ذرا صحیح سے عام ہے ایک حدیث
 کبھی حسن ہوتے ہوئے صحیح ہوتی ہے اور کبھی صحیح نہیں ہوتی ہے
 بلکہ صرف حسن ہی ہوتی ہے کیونکہ حسن کے معنی ان کے نزدیک مقبول
 اور معمول پر کے ہوتے ہیں اسی کے لیے امام مالک کے یہاں علیہ
 العمل بہدنا کی تعبیر ہے۔ ایسی حدیث جو سند کے لحاظ سے قوی ہو
 اور اس کی پشت پر صحابہ و تابعین کی عملی تائید نہ ہو وہ امام ترمذی کی
 زبان میں صرف صحیح کہلاتی ہے اور ایسی حدیث جو سند کے لحاظ
 سے قوی نہ ہو مگر اسے عملی تائید حاصل ہو اس کو صرف حسن کہتے ہیں بالفاظ
 دیگر امام ترمذی نے حسن صحیح نیز حسن اور صحیح کی تعبیرات یہ بتانے
 کے لیے اختیار کی ہیں کہ کتاب میں لوگوں کے سامنے احادیث اور
 احادیث پر خیر القرون صحابہ و تابعین کا عمل بیجا ہو کر سامنے آجائے
 اس لیے امام ترمذی ان تمام حدیثوں کو جن کی پشت پر صحابہ و تابعین
 کی عملی تائید ہو حسن کہتے ہیں خواہ وہ صحیح ہوں یا درجہ صحت سے گری
 ہوئی ہوں۔ اور اگر احادیث کو عملی تائید حاصل نہ ہو تو اسے امام ترمذی
 حسن نہیں کہتے چاہے وہ صحیح ہوں۔

۱۔ شرح و مقدمہ ص ۴۷۔

۲۔ الباعث الحثیث ص ۴۴۔

ترمذی کے بارے میں ایک اہم سوال

یہاں اس سوال کو بھی بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ

امام ترمذی ایک حدیث کی تضعیف بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے حالانکہ یہ بات محدثین کے مقررہ اصول و قواعد کے سرتاسر خلاف ہے کیونکہ احکام میں محدثین حدیث صحیح اور حسن کے علاوہ کسی بھی حدیث کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ ترمذی میں ایسے ایک سے زیادہ مقامات ہیں جہاں حدیث کے بارے میں ایک طرف امام ترمذی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دوسری طرف فرماتے ہیں کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں ترمذی میں باب الجمع بین الصلاتین میں یہ حدیث لائے ہیں۔

حدثنا أبو سلمة يحيى بن خلف البصري نا المعتمر بن سليمان

عن أبيه عن حنش عن عكرمة عن ابن عباس عن النبي صلى

الله عليه وسلم قال من جمع بين الصلاتين من غير عذر

فقد اتى باباً من ابواب الكبائر۔

جس نے بغیر عذر کے دو نمازوں کو یکجا کیا ہے اس نے بڑے گناہوں میں

سے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔

اور اس کے بعد اسی حدیث پر یہ نوٹ لکھا ہے :

قال أبو عيسى حنش هذا هو أبو علي الرحبي وهو حسين بن

قيس وهو ضعيف عند أهل الحديث ضعفه أحمد وغيره

حنش کی کنیت ابو علی اور نام حسین بن قیس ہے اور یہ محدثین کے نزدیک

ضعیف ہے امام احمد نے اس کی تضعیف کی ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ :

والعمل على هذا عند أهل العلم ان لا يجمع بين الصلاتين إلا في

السفر أو بعرفة

اس قسم کے اور بھی کئی مواقع ہیں۔ اس کے جواب میں اگرچہ بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ امام ترمذی نے اس طرز عمل سے ایک بے حد اہم اور کارآمد محدثانہ نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں کہ حدیث اگرچہ ہم کو روایتی اور اسنادی طرز پر کمزور طریقہ سے پہنچی ہے لیکن اسے اہل علم کی تائید حاصل ہے۔ اور اہل علم کا کسی حدیث کو اپنالینا بھی حدیث کی صحت کی ضمانت ہے چاہے روایت کی دنیا میں اسے قابل اعتماد اسناد کی قوت حاصل نہ ہو۔ یہی بات حافظ جلال الدین السیوطی نے امام ترمذی کے اس طرز اور انداز سخن سے سمجھی ہے۔ چنانچہ حافظ صاحب حدیث بالا اور اس کے متعلقہ نوٹ پر رقمطراز ہیں:

اشار بذالك الى ان الحديث اعتضد بقول اهل العلم وقد
صرح غير واحد من اهل العلم بان من دليل صحة الحديث
قول اهل العلم به، وان لم يكن له اسناد يعتمد على مثله
امام ترمذی نے یہ بات بتائی ہے کہ حدیث میں اہل علم کے قول سے
قوت آگئی اور اس کی بے شمار علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث کے
صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کتابوں کی صحت میں برنری کا دار و مدار ابن الصلاح اور دوسرے
متاخرین محدثین کے نزدیک ان کے التزام صحت اور شرائط پر نہیں بلکہ اس شہرت اور قبول پر ہے
جو امت کی جانب سے ان دونوں کتابوں کو حاصل ہے تو پھر یہ ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ شہرت
اور قبول میں بذات خود صحت کی ضمانت ہے چنانچہ ایک سے زیادہ محدثین نے اس کی تصریح کی ہے،
حافظ سیوطی تدریب الراوی میں رقمطراز ہیں کہ:

يجزم للحديث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم يكن له
اسناد صحيح -

حدیث کو صحیح قرار دیا جاتا ہے جب اسے لوگ شرف قبول عطا کر دیں چاہے
اس کی کوئی صحیح سند نہ ہو۔

حافظ ابن عبد البر نے التمهید میں حضرت جابر کی اس مرفوع حدیث پر کہ

الدنیار اربعة وعشرون قیراطاً

لکھا ہے کہ علماء کی جماعت کا اسے اپنا لینا اور رائے عامہ کا اس پر مجتمع ہونا اس حدیث کو سند سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے الافصح علی نکت ابن الصلاح میں لکھا ہے کہ :
حدیث کے مقبول ہونے کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ علماء اس حدیث کے مدلول پر متفق ہو جائیں کیونکہ وہ قابل ہوتی ہے تا آنکہ اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے ائمہ اصول میں سے ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے۔

حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں :

جب کسی ضعیف حدیث کو اُمت شرف قبول عطا فرمادے اس پر عمل کیا جائے
گناہاں تک اسے حدیث متواتر کا ایسا مقام حاصل ہو جائے گا جس سے
قطعی الثبوت کو منسوخ کیا جاسکتا ہے بلکہ

ببینہ یہی سوال علامہ عصر محدث شیخ حسین بن محسن یمانی سے بھی کیا گیا ہے انہوں نے اس سوال کا جواب مفصل دیا ہے اور یہ معجم طبرانی صغیر کے آخر میں التحفۃ المرصیۃ فی حل بعض المشكلات الحدیثیہ کے نام سے ملحق ہے اور تقریباً سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے جواب کا لب لباب یہی ہے کہ ضعیف حدیث وہ ہے۔

حيث لم یکن فی سندہ کذاب -

بہر حال امام ترمذی نے یہ بات سمجھائی ہے کہ حدیث مقبول وہ ہے جسے اہل علم کی تائید حاصل ہو اور وہ قابل عمل ہے چاہے وہ ہم تک پہنچنے میں کمزور وسائل کا شکار ہو گئی ہو۔ اس لحاظ سے امام ترمذی کی کتاب کو دوسری کتابوں کے مقابلے میں بہت اوجھا مقام حاصل ہے۔

امام ترمذی نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے ان میں امام بخاری، قتیبہ بن سعید، محمود بن غیلان، احمد بن منیع، محمد بن المثنی، منہاد اور ابو زرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ سب کے سب بالواسطہ یا بلا واسطہ امام اعظم کے تلامذہ سے تلمذ کا شرف رکھتے ہیں

امام بخاری کے متعلق تو آپ سن اُسے ہیں کہ قتیبہ بن سعید کے اساتذہ میں امام مالک کے ساتھ لیث بن سعد اور شریک کا ذکر کیا ہے اور لیث بن سعد اور شریک سے امام اعظم کا جو رشتہ ہے وہ یمن میں کوئی چھپی بات نہیں ہے۔ احمد بن منیع، ہشیم، عباد بن العوام اور عبد اللہ کے واسطہ سے امام اعظم سے ملتے ہیں اور خود امام ترمذی کے تلامذہ میں سرفہرست جن لوگوں کا نام آتا ہے ان میں حماد بن شاگرد اور عبد بن محمد بھی ہیں۔ دونوں نسفی ہیں۔ اول الذکر ان چار میں سے ایک ہیں جن سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا ہے۔ یہ دونوں حنفی بزرگ ہیں۔ محمود بن غیلان کو یک واسطہ امام اعظم سے تلمذ حاصل ہے۔ چنانچہ امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب العلل میں امام اعظم سے جو روایت کی ہے کہ:

حدثنا محمود بن غيلان حدثنا ابو يحيى الحماني قال سمعت ابا حنيفة
يقول ما رأيت احدا كذب من جابر الجعفي ۷ افضل من
عطاء بن ابي رباح ۸

تو اس سے بھی ان کا امام اعظم سے بواسطہ ابویحییٰ تلمذ ثابت ہے۔ ابویحییٰ کے بارے میں حافظ ذہبی نے بھی تصریح کی ہے کہ وہ امام اعظم کے شاگرد ہیں۔

صحاح ستہ میں ابن ماجہ کا مقام

حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں یہ کتاب حسن ترتیب میں ممتاز ہے چنانچہ شاہ عبدالغفر فرماتے ہیں:

فی الواقع از حسن ترتیب و سرد احادیث بے تکرار و اختصار آنچه کتاب
دارد هیچ یک از کتب ندارد ۹

فی الواقع اپنی ترتیب اور احادیث کے بغیر تکرار بیان کرنے اور اختصار
میں اس کتاب کی کوئی کتاب بھی ہمسر نہیں ہے۔

اور اس کتاب کی یہی وہ خوبی ہے کہ جس کو دیکھ کر حافظ ابو زرہ رازی کی زبان سے جگمگاتہ
یہ الفاظ نکل گئے۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھ آگئی تو یہ جوامع یا ان میں سے
اکثر بیکار ہو جائیں گی۔^۱

ابن الاثیر نے کتاب کی اس افادہ جہت کو ان لفظوں میں سراہا ہے۔

کتابہ کتاب مفید قوی النفع فی الفقہ

صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کا پایہ کتب خمسہ جیسا نہیں ہے۔ کتب خمسہ کے بارے میں اگرچہ
آپ حافظ ابوطاہر مقدسی کا یہ بیان سن چکے ہیں۔

قد اتفق علی صحتها علماء الشرق والغرب

لیکن حافظ عراقی کو ابوطاہر سے اس میں اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں:
جو شخص کتب سنن کو صحیح کہتا ہے جیسے ابوطاہر نے کتب خمسہ کی صحت
پر اتفاق کا اعلان کیا ہے اور جیسے حاکم کہ ترمذی کی کتاب کو الجامع الصحیح
کہتا ہے اور ایسے ہی خطیب۔ یہ تساہل ہے یا
اور حافظ ذہبی نے بتایا ہے کہ:

ابن ماجہ حافظ، صدوق اور واسع العلم ہے لیکن ان کی سنن کا درجہ کمتر
ہونے کی وجہ اس کتاب میں مناکیر اور قدسے موضوعات ہیں۔^۲
حافظ سیوطی نے ابن رشید سے نقل کیا ہے۔

ابن ماجہ میں تفردات ہیں اور یہ ایسے لوگوں کی روایات پر مشتمل ہیں جن پر
کذب کی اور احادیث کی چوری کی تہمت ہے۔
حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ:

امام ذہبی نے ابن ماجہ میں کچھ احادیث کے موضوعہ ہونے کا جو پتہ دیا ہے
اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ احادیث باطلہ کم ہیں ورنہ جہاں تک احادیث
ضعیفہ کا مسئلہ ہے وہ تو ابن ماجہ میں کم از کم ایک ہزار حدیثیں ہیں۔^۳
اسی بنا پر حافظ ابوالحجاج المزی کا فیصلہ یہ ہے کہ:

^۱ المحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۰۰۔ ^۲ اختصار علوم الحدیث۔ ^۳ شرح الالفیہ ص ۱۰۴۔

^۴ الاجوبۃ الفاضلہ ص ۷۱۔ ^۵ زہر الربی ص ۴۔

ان الغالب فيما تفرد به الضعف ۱۵

ابن ماجہ کے تفردات میں زیادہ تر ضعیف ہے۔

لیکن اس کے باوجود علماء متاخرین نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کیا ہے کیونکہ ضعیف روایتوں کا ہونا ابن ماجہ کی ہی خصوصیت نہیں ہے بلکہ صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں کم ہیں اور ابن ماجہ میں زیادہ ہیں۔ اور ان سب کتابوں کو باوجود ضعیف روایات ہونے کے صحاح ستہ تغلیباً کہا جاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی ہر روایت صحیح ہے۔ جناب علامہ فاضل نواب صدیق حسن خاں مسک الختام میں فرماتے ہیں:-

ان چھ کتابوں کو اصول ستہ، صحاح ستہ، کتب ستہ اور امہات ستہ کہتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعۃ اللمعات میں فرمایا ہے کہ چھ کتابیں جو اسلام میں مشہور ہیں یہ ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ۔ اور کچھ کی رائے میں بجائے ابن ماجہ مؤطا ہے اور صاحب جامع الاصول نے مؤطا ہی کو اختیار کیا ہے اور ان کتابوں میں حدیث کی قسمیں صحیح، حسن اور ضعیف سب موجود ہیں اور ان کو صحاح کہنا محض تغلیباً ہے بلکہ

مؤلفین صحاح کے نقطہ نظر کا اختلاف

اگرچہ ایک ہی موضوع پر ان بزرگوں کا یہ تصنیفی کارنامہ ہے ان کے شیوخ بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک ہی طبقہ کے لوگ ہیں۔ ان کے سامنے تالیفی سرمایہ بھی ایک ہی تھا۔ اس کے باوجود ان بزرگوں نے جدوجہد میدان تصنیف میں جو داد تحقیق دی ہے اس میں ان کا ایک خاص نصب العین، خاص مطلع نظر اور خاص پیش نہاد ہے۔ ایک ہی موضوع پر ایک ہی قسم کی حدیثوں کو الگ الگ پیش کرنے میں ایک گہری معنویت ہے۔

امام بخاری کا نقطہ نظر

امام بخاری کا مطلع نظر اپنی صحیح میں احادیث صحیحہ کا استیعاب نہیں ہے کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں۔

لما خرج في هذا الكتاب الاصحاح وما تركت من الصحيح اكثر
میں نے اس کتاب میں صحیح احادیث روایت کی ہیں اور زیادہ صحیح
احادیث میں نے چھوڑی ہیں۔

امام حازمی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ امام بخاری کا مقصود احادیث صحیحہ کا ایک اختصار تیار کرنا
ہے احادیث صحیحہ کا استیعاب ان کے پیش نظر نہیں ہے۔

علامہ زابد کوثری نے امام بخاری کا مطلع نظر وضاحت کے ساتھ سمجھایا ہے کہ
صحیح میں امام بخاری کی غرض صرف یہ ہے کہ احادیث صحیحہ متفصلہ کی تخریج
کی جائے اور اس کے ساتھ ان احادیث سے فقہ، میرت اور تفسیر کے
مسائل کا استنباط کیا جائے۔ اور استشہاد میں صحابہ، تابعین اور فقہاء
کی آراء سے مدد لی جائے اسی بنا پر وہ متون احادیث میں تقطیع بھی
کرتے ہیں۔

علامہ نواب صدیق خاں نے بھی امام بخاری کا یہی مطلع نظر بتایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں؛
امام بخاری نے صحت احادیث کے ساتھ فقہی فوائد اور حکیمانہ نکاتوں
کے استنباط کا بھی التزام کیا ہے۔
حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں؛

امام بخاری نے محسوس کیا کہ ان کی صحیح فقہی فوائد اور حکیمانہ نکاتوں سے
مالا مال ہو۔ آپ نے اپنی سمجھ کے مطابق متون احادیث سے بہت سے
نت نئے معانی نکالے ہیں اور ان ہی معانی کی مناسبت سے احادیث
کو ایک سے زیادہ بابوں میں الگ الگ کر کے پیش کیا ہے۔
اور امام نووی فرماتے ہیں کہ؛

امام بخاری کا مقصد صرف احادیث کا تعارف نہیں ہے بلکہ کتاب
میں ان کا اصلی پیش نہاد یہ ہے کہ احادیث سے احکام استنباط کیے
جائیں اور زندگی کے مختلف مسائل کے لیے ان سے استدلال کیا جائے

اسی وجہ سے بہت سے ابواب اسناد سے خالی ہیں۔
بہر حال امام بخاری کا مطلع نظر صحیح میں صرف احادیث صحیحہ کا انتخاب ہی نہیں ہے بلکہ اس کے
ساتھ ان کے پیش نظر دوسرے مقاصد بھی ہیں۔

امام مسلم کا مطلع نظر

امام مسلم کا بھی اپنی صحیح میں یہ مقصد نہیں کہ ساری صحیح حدیثوں کا کتاب میں استیعاب کیا
جائے بلکہ ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ ان حدیثوں کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح طرق کی فراہمی کی
جائے اور صرف صحیح حدیثوں کو یک جا کر دیا جائے۔ چنانچہ خود امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ
میں اس بات کی توضیح کر دی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں :

جمع فیہ طرقہ التي ارتضاہا فاختر ذکرہا وادرد فیہا اسانیدہ
المتعدۃ والفاظہ المختلفۃ۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں ایک حدیث کے اپنی پسند کے سارے طریقوں
کو یکجا کر کے ذکر کر دیا ہے اور اس کو متعدد سندوں اور مختلف الفاظ
کے ساتھ پیش کیا ہے۔

علامہ زائد کوثری نے اسے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا ہے :
امام مسلم کا مقصد صرف صحیح حدیثوں کو پیش کرنا ہے ان کے پیش نظر
احادیث سے مسائل کا استنباط نہیں ہے وہ ایک حدیث کے سارے
طرق کو ایک ہی جگہ صرف اس لیے سمیٹ دیتے ہیں تاکہ دیکھنے والے
کے سامنے متون کا اختلاف اور اسانید کی نیرنگی بہترین شکل میں نمایاں
ہو کر آجائے۔

بہر حال امام مسلم کا پیش منہاد صرف حدیث کی اسنادی اور روایتی حیثیت کو نکھار کر پیش کرنا ہے۔
امام ابو داؤد کا تالیف میں مقصد

امام ابو داؤد کا مطلع نظر اپنی سنن میں صرف ان احادیث کو یکجا کرنا ہے جن سے فقہاء نے استدلال

کیا ہے اور جن پر فقہائے مذاہب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ اسی بنا پر اصول کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ اجتہاد کے میدان میں صرف ابو داؤد کافی ہے۔

حافظ ابو بکر الخطیب فرماتے ہیں کہ :

ابو داؤد کی سنن علم دین میں بے مثال کتاب ہے اسے فقہاء اور محدثین کے یہاں یکساں قبولیت کا شرف حاصل ہے۔ عراقیوں، مصریوں اور اہل مغرب کا اسے اعتماد ہے۔ ابو داؤد سے پہلے بے شک علماء نے جوامع اور مسانید تالیف کیے ہیں اور ان میں سنن، اخبار، قصص، مواعظ اور ادب کا علمی خزانہ تھا لیکن سنن کو خالص کسی نے بھی ایسا پیش نہیں کیا جیسا کہ ابو داؤد نے۔

امام خطابی ابو داؤد کی شرح میں رقمطراز ہیں :

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امام ابو داؤد نے اپنی کتاب میں اصول علم، اہمات السنن اور احکام فقہ پر مشتمل حدیث کا ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں اس کی مثال نہیں ہے۔

حافظ ابن القیم الجوزی فرماتے ہیں کہ :

کتاب ابو داؤد کا اسلام میں ایک خاص مقام ہے اس کی حیثیت مسلمانوں میں ایک حج کی اور نزاع و جدال میں ایک قاضی کی ہے کیونکہ اس میں فقہ کی احادیث کا بھرپور سرمایہ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ حسن ترتیب اور حسن نظم میں اپنی مثال آپ ہے۔ مجروحین اور ضعفا کی حدیثوں کو خوب نکھار دیا ہے۔

امام ابو عیسیٰ ترمذی کا پیش منہاد

امام ترمذی کا پیش منہاد جامع ترمذی میں یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم کے طریقوں کو یکجا کیا جائے یعنی ابواب کے ذریعے استنباط مسائل کا نمونہ بخاری کے طرز پر ہو اور احادیث صحیحہ کے انتخاب

میں امام مسلم کی ترجمانی کی جاتے اور اس کے ساتھ ابو داؤد کے قدم بقدم چل کر صحابہ تابعین اور فقہاء کے مذاہب کو پوری وضاحت سے بیان کیا جاتے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ طرق حدیث میں ایک کا تفصیلی اور باقی کا اجمالی خاکہ پیش کر کے حدیث کا محدثین کے یہاں جو مقام ہے اسے معین کر دیا جاتے۔ گویا امام ترمذی کی کتاب ایک معجون مرکب ہے جس میں تینوں کتابوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

علامہ زائد کوثر ہی فرماتے ہیں :

امام ترمذی کا مسلح نظر بخاری اور مسلم کے دو طریقوں کو ایک جگہ پیش کرنا ہے گویا امام ترمذی کو شیخین کا یہ طریق بیان و ابہام میں بھایا ہے اور اس کے ساتھ وہ ابو داؤد کے طریقے کو بھی اپناتے ہیں اور اس پر ان کی جانب سے یہ اضافہ بھی ہے کہ صحابہ تابعین اور فقہاء اصحاب کے مذاہب کو بیان کرتے ہیں۔ طرق حدیث میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے ایک کو بیان کر کے باقی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور ہر حدیث کے باسے میں بتاتے ہیں کہ صحیح ہے یا حسن اور یا متکرم۔ ضعف کی وجہ بتاتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ حدیث مستفیض ہے یا غریب۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس پر کچھ فقہاء نے عمل نہ کیا ہو۔ سوائے ان دو حدیثوں کے۔ فان شرب فی المرابعة فاقتلوا اور جمع بین الظہر والعصر بالمدينة من غیر خوف ولا سفر۔

امام نسائی کا کتاب کی تالیف میں مسلک

اس کتاب میں امام نسائی کا مسلک یہ ہے کہ خالص محدثانہ نقطہ نظر سے امام بخاری اور امام مسلم کے طریقوں کو انوکھے انداز میں پیش کر کے بیان علل میں خاص طریق پیش کیا جاتے۔ شاید اسی بنا پر مغرب کے بعض محدثین صحیح بخاری پر اس کی ترجیح کے قائل ہیں۔ چنانچہ حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں کہ :

بعض مفاد پر نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی کی کتاب کو بخاری پر فضیلت ہے۔
 اور اسی لیے ناقدین فن کے نزدیک جلالت علمی کے اعتبار سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم
 سے بھی بڑھا ہوا ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :
 فن رجال میں ماہرین فن کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم پر بھی فوقیت
 دی ہے۔

حافظ ابو عبد اللہ رشید نے امام نسائی کا اس کتاب میں مسلک یہ بتایا ہے کہ ،
 یہ کتاب علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان سب میں فضیلت
 کے لحاظ سے انوکھی اور بلحاظ ترتیب بہترین ہے اور یہ بخاری اور مسلم دونوں
 کے طریق کی جامع ہے نیز علل حدیث کا بھی ایک حصہ اس میں بیان کیا
 گیا ہے۔

امام ابن ماجہ کا مطمح نظر

امام ابن ماجہ کا مطمح نظر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسائل فقہیہ پر مشتمل چند در چند متنوع عنوانوں کے
 ساتھ بغیر تکرار کے ایک مختصر مجموعہ لوگوں کے سامنے آجائے۔
 شاہ عبدالعزیز بستان المحدثین میں فرماتے ہیں۔
 فی الواقع ترتیب کی خوبی اور بغیر کسی تکرار کے احادیث کی پیش کش اور
 اختصار کا نمونہ جو یہ کتاب رکھتی ہے کوئی کتاب نہیں رکھتی۔

صحاح ستہ کی علمی خدمت

چونکہ علمائے ان چھ کتابوں کی مختلف طریقوں سے علمی خدمت کی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں
 کہ آپ کی ضیافت طبع کے لیے اسی سلسلے کی دو اہم کڑیاں پیش کریں۔ ان کا نام مستخرجات اور
 اطراف ہے۔

مستخرج جامعین اور استخراج کے فوائد

محدثین کی اصطلاحی زبان میں استخراج جیسا کہ حافظ عراقی اور حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے لکھا ہے کہ

ان یاتی المصنف الی الکتاب فیخرج احادیثہ باسانید لنفسہ

من غیر طریق صاحب الکتاب

مصنف کوئی حدیث کی کتاب لے اور اس میں مندرج حدیثوں کو اپنی

سندوں سے روایت کرے اور یہ صاحب کتاب سے الگ ہو۔

اس میں شرط یہ ہے کہ مستخرج خود صاحب کتاب سے کوئی حدیث روایت نہ کرے بلکہ صحیح سند کے ساتھ اوروں سے روایت کرے۔ چنانچہ صاحب تنقیح الانظار فرماتے ہیں:

شرط المستخرج الا یروی حدیث البخاری ومسلم عنہما بل یروی

حدیثہما عن غیرہما۔

محدثین نے استخراج کے فوائد پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ چند فوائد یہ ہیں۔

۱۔ اس کے ذریعے حدیث میں زیادہ الفاظ کا کوئی تشریح یا کسی محذوف کی تعیین ہو جاتی ہے

۲۔ کبھی مستخرج کی حدیث کی سند اصل سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

۳۔ کثرت طرق کی وجہ سے حدیث میں قوت آجاتی ہے اور احادیث میں باہم تعارض کے

وقت یہ قوت ترجیح میں بہت مفید کام کرتی ہے۔ یعنی تعارض کے وقت اس حدیث کو راجح قرار دیا جاتا ہے جس کے طرق زیادہ ہوں اور کثرت طرق معلوم کرنے کا ذریعہ محدثین کے یہاں استخراج ہے لہ

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ استخراج کے ان کے علاوہ اور بھی بہت فوائد ہیں۔

اول: مخبرین کی عدالت بھی اس سے صاف اور منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے

دوم: کسی بھی روایت میں سماع کی تصریح مل جائے تو عنعنہ کے ذریعے پیدا شدہ یہام تدبیریں

کاشبہ دور ہو جاتا ہے۔

سوم: احادیث میں ایک بڑا اور اہم مسئلہ ان لوگوں کا ہے جو آخر عمر میں اختلاط کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ اختلاط حافظہ کی خرابی، بیماری یا کسی اور افتاد کی وجہ سے ہو جاتا ہے اصل کتاب میں آمدہ روایت کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ قبل از اختلاط ہے یا بعد از اختلاط۔ استخراج یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ روایت کس دور سے متعلق ہے۔

چہارم: اصل کتاب کے متن یا سند کے بارے میں ابہام ہوتا ہے۔ استخراج میں تصریح آجاتی ہے اور اس طرح چہرہ ابہام بے نقاب ہو جاتا ہے۔

پنجم: کبھی اصل کتاب کی حدیث میں راوی کے الفاظ خاص ہوتے ہیں باقی روایتوں کو صائب کتاب مثلاً، یا نحو کہ کہہ کر آگے چل دیتا ہے۔ استخراج کے ذریعے اس میں امتیاز جاتا ہے۔

ششم: احادیث کی سند یا متن میں گاہ گاہ راوی کی جانب سے ادراج ہوتا ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا۔ استخراج کے ذریعے ادراج منقطع ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

ہفتم: حدیث بظاہر مرفوع ہوتی ہے لیکن واقعہ میں وہ موقوف ہوتی ہے۔ استخراج اس معاملے میں قاضی کا کام کرتا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں یعنی صحیحین کے جو مستخرجات لکھے گئے ہیں ان میں کچھ یہ ہیں:

- ۱۔ مستخرج حافظ ابو بکر احمد بن ابراہیم الاسماعیلی الجرجانی ^{۳۷۵ھ}
- ۲۔ مستخرج حافظ ابو احمد محمد بن ابی حامد القطریقی ^{۳۷۵ھ}
- ۳۔ مستخرج حافظ ابو عبد اللہ محمد بن العباس بن ابی ذہبلی ^{۳۷۵ھ}
- ۴۔ مستخرج حافظ ابو بکر احمد بن موسیٰ مردویہ الاصبہانی ^{۳۷۶ھ}
- ۵۔ مستخرج حافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائینی ^{۳۷۶ھ}
- ۶۔ مستخرج حافظ محمد بن محمد الیشاپوری ^{۳۷۶ھ}
- ۷۔ مستخرج حافظ ابو الفضل احمد بن سلمہ ابن زرارہ ^{۳۷۶ھ}
- ۸۔ مستخرج حافظ ابو نعیم الاصبہانی ^{۳۷۶ھ}

احادیث صحیحین کے طرق و اسانید کی تعداد

سارے مستخرجات کا یہاں استقصاء مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا ہے کہ اس سلسلے میں

محدثین نے کس قدر عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ حافظ ابن الدین عراقی، حافظ ابن الصلاح اور حافظ ابن کثیر کی تصریح کے مطابق صحیح بخاری میں آئندہ حدیثوں کی تعداد تکرار کو چھوڑ کر صرف چار ہزار ہے اور امام نووی اور حافظ ابن کثیر کی رائے کے مطابق صحیح مسلم میں حدیثوں کی تعداد بھی صرف چار ہزار ہے۔ لیکن استخراج کی وجہ سے ان چار ہزار حدیثوں کو جن جن طریقوں سے روایت کیا گیا ہے اور حدیثوں کی یہ تعداد جن اسانید کے ذریعے آج امت کے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی تعداد صرف چار ہزار نہیں بلکہ پچیس ہزار چار سو اسی ہے چنانچہ محمد بن اسماعیل الیماہی رقمطراز ہیں:

صحیحین کے سائے طرق اور اسانید کی تعداد کے بارے میں حافظ ابن حجر نے حافظ جوزقی کی المستفق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے صحیحین کی ایک ایک حدیث کا استخراج کیا ہے۔ تمام طرق و اسانید کی مجموعی تعداد پچیس ہزار چار سو اسی ہے۔

اللہ اکبر! صرف چار ہزار ارشادات نبوت امت کو پچیس ہزار چار سو اسی طریقوں اور اسانید سے ملے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اتنے بڑے انبیا نے ان ارشادات کے یاد کرنے میں کوئی کوتاہی کی ہوگی۔ نظر کو بلند تر کیجئے اور ان لوگوں کی محنتوں اور عرق ریزیوں کی داد دیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین میں ایک بڑی بھاری جماعت یہ کہتی ہے کہ صحیحین کی تمام احادیث قطعیت کو مفید ہیں۔ حافظ ابن حزم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک حدیث کے لیے کتنے راویوں کی ضرورت ہے جس کے بعد حدیث بدایتہ علم کا فائدہ ملے سکے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی خاص عدد مقرر نہیں ہے۔ اگر دو شخص بھی کوئی خبر دیں اور ان کے بارے میں ہمیں یقین ہو کہ اس سے پہلے نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں اور نہ اس خبر میں ان کے لالچ یا خوف کو کوئی دخل ہے۔ پھر ایک دوسرے کی لاعلمی میں اس خبر کو ہمارے سامنے بیان کریں وہ بھی از خود نہیں بلکہ ایک ایک جماعت کے واسطے سے۔ تو ہمیں ان کی سچائی کا بدیہی طور پر یقین آجائے گا۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے حالات سے روزمرہ کی زندگی میں دوچار ہوتا ہے ہمارے اس بیان کی شہادت دے سکتا ہے کسی کی موت، ولادت، نکاح، ولایت اور اس قسم کے تمام واقعات کا بدیہی علم ان طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔

بہر حال صحیحین کے طرق و اسانید کی یہ تعداد بتا رہی ہے کہ احادیث صحیحین صحیح ہیں اور یہ صرف صحیحین کی خصوصیت نہیں بلکہ دوسری کتابوں کے بھی مستخرج لکھے گئے ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں:

مستخرج صحیحین ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ محمد بن عبد الملک نے سنن ابی داؤد کا، ابو علی الطوسی نے ترمذی شریف کا اور ابو نعیم نے ابن خزمیہ کی کتاب کا مستخرج لکھا ہے۔

صحیحین اور دوسری کتب کے اطراف

محدثین کی زبان میں مسانید اور اطراف دونوں میں مرکزی توجہ روایت کنندہ صحابی پر ہوتی ہے یعنی ہر صحابی کی مرویات کو بلا لحاظ مضمون یکجا کیا جاتا ہے مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ مسانید میں پوری حدیث بیان کرتے ہیں مگر اطراف میں صرف حدیث کا کوئی مشہور حصہ بیان کر کے شیخین اور سنن کے تمام مشترک اور مخصوص طرق کا ذکر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حدیث کے شروع سرے کو اتنا بیان کر کے کہ جس سے باقی حدیث کی یاد دہانی ہو جائے اس کی تمام اسانید کو بلا استیعاب بیان کیا جاتا ہے یا ان کتابوں کا پتہ دے دیا جاتا ہے کہ جن میں یہ حدیث مروی ہے۔ اس موضوع پر بہت سے حفاظ حدیث نے داد تحقیق دی ہے۔ ان میں سب سے پہلے جن بزرگ نے صحیحین پر اطراف لکھے ہیں وہ حافظ ابو مسعود دمشقی ^{رحمہ اللہ} ہیں۔ ان کے بعد حافظ ابو محمد خلف بن محمد ^{رحمہ اللہ}، حافظ ابو نعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجر نے بھی یہ علمی خدمت انجام دی ہے۔

صحیحین کے علاوہ کتب خمسہ کے اطراف حافظ احمد بن ثابت ازدی نے بھی لکھے اور کتب ستہ کے اطراف لکھنے والے یہ بزرگ ہیں۔

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی ^{رحمہ اللہ}، حافظ ابو الحجاج جمال الدین المزنی ^{رحمہ اللہ}، حافظ شمس الدین ابو المحاسن محمد بن علی الحمینی دمشقی، حافظ ابو القاسم بن عساکر، حافظ سراج الدین ابو حفص عمر بن نور الدین علی بن احمد الانصاری المعروف بابن الملقن۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی کتابوں کے اطراف لکھے گئے ہیں۔ حافظ ابن طاہر نے امام اعظم کی احادیث پر اطراف لکھے

ہیں جس کا نام اطرافِ احادیث ابی خلیفہ ہے۔

دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین حدیث

ہم نے بالا روئے تیسری صدی کے محدثین میں ارباب صحاح کے تالیفی کارناموں پر ذرا کچھ تفصیلی تبصرہ کیا ہے کیونکہ اس صدی میں فن حدیث کے ارتقاء کا یہ وہ نقطہ کمال ہے جہاں پہنچ کر علم حدیث ایک فن کی حیثیت سے ہر قسم کی قوت سے آراستہ ہو کر منصفہ شہود پر آیا اور اس فن کا ایک ایک شعبہ محدثین کی محنتوں سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس صدی کے محدثین اور ارباب روایت نے حدیث کی خاطر خشکی اور تری کو چھان مارا اور دنیا کے اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں جا کر تمام منتشر اور پراگندہ روایتوں کو جمع کیا اور اس طرح مسابد وجود میں آگئے۔ صحت سند کی چھان بین کی گئی۔ اسماء الرجال کی تدوین ہوئی، ہجرج و تبدیل نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی تا آنکہ صحاح جیسی بیش بہا کتابیں تصنیف و تالیف کے بازار میں آگئیں۔ چونکہ تیسری صدی میں اسنادی وسائل کا دامن زیادہ سے زیادہ وسیع ہو گیا حتیٰ کہ جو حدیث دوسری صدی میں صرف دو واسطوں سے معلوم ہوتی تھی وہ تیسری صدی میں چھ اور سات واسطوں کی منہاج ہو گئی۔ اس دور کے محدثین کو تاریخ رجال کی طرف توجہ کرنی پڑی اور اسماء الرجال کا عظیم الشان فن مدون ہوا۔

ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ کہنا ایک واقعہ اور حقیقت کا اقرار ہے کہ

نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت ہم آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ (ترجمان السنہ ص ۱۷۰)

محدثین نے اس کام کے لیے بڑے جتن کیے اور پاڑے بیلے ہیں۔ ہر ہر راوی کے پورے پورے حالات معلوم کیے۔ اس کے نتیجے میں ہر روایت کے بارے میں اسناد کے لیے بلحاظ قوت وضعف، صحت و بطلان اور اتصال و انقطاع نئی نئی بحثیں پیدا ہو گئیں اور حدیث کے فن میں نئی نئی اصطلاحات منصفہ شہود پر آگئیں۔

بنا علیہ تیسری صدی کے محدثین کی راہ علم حدیث کے سلسلے میں دوسری صدی کے محدثین سے کچھ ممتاز ہو گئی کیونکہ دوسری صدی کے محدثین براہِ راست مشاہیر تابعین یا کبار تابعین

کے تلامذہ تھے اور اس لیے ان کو اسناد کے بارے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت تھی لیکن تیسری صدی میں روایت میں اسنادی وسائل پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گئے تھے اس لیے تیسری صدی کے محدثین کو نئے حالات اور جدید تقاضوں کے تحت اپنی شاہراہ بنانی پڑی۔ علم حدیث کے مختلف گوشوں میں اس کا نمایاں طور پر ظہور ہوا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں اس پر قدے تفصیل سے بحث کریں تاکہ ناظرین کے سامنے خالص روایتی نقطہ نظر سے دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کے مابین فرق نمایاں ہو کر آجائے اور ان اختلافی حدود کی نشاندہی ہو جائے جس کی بنا پر علم حدیث کو یہ حالات درپیش آئے ہیں۔ سب سے پہلے اس موقع پر نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کا وہ بیان پیش کر دیں جس سے ان دونوں صدیوں کے محدثین کے طرز عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے شاہ صاحب تیسری صدی کے مؤلفین کا چہرہ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :

غرض احادیث کی تدوین اور ان کو رسالوں اور کتابوں میں لکھنے کا رواج تمام اسلامی شہروں میں اس قدر عام ہو گیا کہ محدثین میں شاید ہی ایسے حضرات تھے جن کے پاس حدیث کا کوئی مجموعہ، رسالہ یا کتاب نہ ہو۔ ہر شخص ان میں سے حدیث در بخل کا مصداق تھا۔ بڑے بڑے علمائے حدیث کی خاطر حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کی خاک چھان ماری۔ کتابیں جمع کیں، نسخے تلاش کیے۔ احادیث غریبہ اور نوادرو آثار کو بہت محنت سے فراہم کیا اور ان کی توجہ سے وہ احادیث منصفہ شہود پر آگئیں جو پہلے نہ تھیں اور ان کو وہ بات اس علم میں نصیب ہوئی جو پہلے کسی کو نصیب نہ تھی اور احادیث کی سندیں اس کثرت سے وجود میں آگئیں کہ بہت سی حدیثوں کی سینکڑوں سندیں معلوم ہو گئیں۔ اسانید کی کثرت نے بہت سی مستور اسانید سے پردہ ہٹا دیا۔ ہر حدیث کی غرابت اور شہرت کا پتہ لگ گیا۔ متابعات اور شواہد وجود پذیر ہو گئے۔ وہ احادیث سامنے آئیں جن سے پہلے ارباب فتویٰ باخبر نہ تھے اور باخبر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ بہت سی حدیثوں کو خاص خاص شہر والے ہی روایت کرتے ہیں مثلاً شام والے، عراق والے یا پھر خاص گھرانے کے آدمی روایت کرتے ہیں جیسے بریدہ کی کتاب اور عمرو بن شعیب کا رسالہ یا پھر مثلاً کوئی

روایت بیان کرنے والا صحابی غیر مشہور ہے اور اس سے چند حضرات کے سوا کسی نے روایت نہیں سنی ہے۔ تیسری صدی کے محدثین سے پہلے لوگ اسماء الرجال اور مراتب عدالت کے بارے میں صرف اپنے مشاہدے اور قرائن پر اعتماد کرتے تھے لیکن محدثین نے اسی کو موضوع بنا کر خوب چھان بین کی اور بحث و تدوین کے ذریعے اسے مستقل فن بنا دیا اس کے نتیجے میں حدیث کا اتصال و انقطاع واضح ہو گیا ہے۔

ایسے شاہ صاحب ہی کی زبانی دوسری صدی کے محدثین کا بھی حال سن لیجئے۔ وہ انصاف اور حجت اللہ میں رقمطراز ہیں کہ:

اس طبقہ کے علماء کا طرز عمل ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا جائے بچا ہے وہ مرسل ہو یا مسند۔ نیز صحابہ و تابعین کے اقوال سے استدلال کیا جائے کیونکہ ان کے علم میں یہ اقوال یا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں جن کو انہوں نے مختصر کر کے موقوف بنا لیا تھا پھر حکم مخصوص سے ان کا استنباط تھا یا اپنی آراء سے ان کا اجتہاد تھا اور ہر صورت میں صحابہ و تابعین اپنے طرز عمل کے اعتبار سے بعد میں آنے والوں سے کہیں بہتر تھے اور کہیں زیادہ صائب الرائے تھے۔ نیز زمانے کے لحاظ سے سب مقدم اور علم کے اعتبار سے سب بڑھ چڑھ کر تھے لہذا سوائے اس صورت کے کہ ان میں باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ان کے قول کے صریح خلاف ہو۔ ہر حال میں ان کے اقوال پر عمل کرنا لازم ہے اور جس صورت میں کسی بھی مسئلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مختلف ہوں تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر صحابہ کسی حدیث کے نسخ کے قائل ہوتے یا اس کو ظاہری معنی سے پھیر دیتے یا اس کے بارے میں

کوئی تصریح نہ کرتے لیکن ترک حدیث یا اس پر عمل نہ کرنے میں متفق ہوتے تو ان کے نزدیک یہ بات حدیث کے معطل ہونے یا منسوخ ہونے اور یا پھر مؤول ہونے کی علامت ہوتی۔ بہر حال ان سب صورتوں میں اس طبقہ کے علماء نے صحابہ ہی کا اتباع کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے کتے کے برتن میں منہ ڈالنے والی حدیث کے بارے میں فرمایا کہ حیا الحدیث ولا ادری ما حقیقتہ؟ حدیث تو ہے مگر مجھے اس کی حقیقت کا پتہ نہیں ہے۔ امام مالک کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس پر فقہاء کو عمل کرتے نہیں دیکھا ہے۔ اور جب صحابہ و تابعین کے مذاہب میں بھی اختلاف ہوتا تو ہر عالم کے نزدیک اپنے ہی اہل شہر اور اپنے اساتذہ کا مذہب مختار سمجھا جاتا۔ کیونکہ وہ ان کے صحیح اور غیر صحیح اقوال سے باخبر ہوتا اور جو اصول ان اقوال کے مناسب ہوتے ان کو محفوظ رکھتا ہے۔

اسی روشنی میں دوسری صدی کے مؤلفین نے اپنے مسائل کی تدوین کی ہے۔ شاہ صاحب نے یہی بات قرۃ العینین میں پورے زور سے کھول کر سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں:

اور جو شخص ان مذاہب کے اصول سے واقفیت رکھتا ہے اس بارے میں شک نہیں کر سکتا کہ ان مذاہب کی اصل و اساس فاروق اعظم کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان تمام مذاہب کے درمیان ایک مشترک چیز ہے۔ اس کے بعد مدینہ والوں میں فقہاء صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمر اور عائشہ ہیں اور کبار تابعین مدینہ میں سے فقہاء سہلہ اور صفار تابعین میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالک کے مذہب کی بنیاد ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتاویٰ پر اعتماد اکثر حالات میں اور حضرت علی مرتضیٰ کے فیصلوں پر کچھ حالات میں بشرطیکہ حضرت علی کے ان فیصلوں کو نقل کرنے والے عبداللہ بن مسعود کے اصحاب ہوں اور اس کے بعد امام ابراہیم نخعی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریج تک

اعتماد امام ابو حنیفہ کے مذاہب کی بنیاد ہے یہ
 آپ نے حکیم الامت کی زبان سے دوسری اور تیسری صدی کے علمائے محدثین میں فرق و امتیاز
 اور خطوط اختلاف پر پردہ لیے ہیں۔ یقیناً آپ اس موازنہ سے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دوسری اور
 تیسری صدی کے محدثین کے مابین ایک سے زیادہ مسائل علم حدیث کی حدود کے اندر روئے ہو گئے
 تھے۔ حدیث کی صحت، تعلیل حدیث، بجرح و تعدیل رواۃ، حدیث کے رد و قبول، تحمل و سماع
 حدیث، شہرت و غرابت حدیث، وجوہ ترجیح اور مختلف احادیث میں منافیہات، مخرج حدیث
 اور خود حدیث کے آئینی اور قانونی مقام جیسے اہم مسائل میں تیسری صدی کے مؤلفین نے اپنی
 راہ بالکل نئی بنالی۔

دوسری اور تیسری صدی میں صحت حدیث کا معیار

اصول میں حدیث صحیح کی یہ تعریف کی گئی ہے
 الصحيح ما اتصل بسندہ بنقل عدل ضابط عن مثله من غير
 شذوذ ولا علة قاذية له

حدیث صحیح کی یہ تعریف حافظ ابن الصلاح اور حافظ زین الدین عراقی نے کی ہے۔ اگرچہ
 اس تعریف سے امام خطابی صاحب معالم السنن کو اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ محدثین کے
 نزدیک صحیح یہ ہے کہ :

ما اتصل بسندہ و عدلت نقلتہ
 اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامہ محدثین کے نزدیک حدیث کے صحیح ہونے کے لیے
 ضروری ہے۔

سند میں اتصال ہو، راویوں میں عدالت اور ضبط ہو اور حدیث نشاذ
 اور معطل نہ ہو۔

اور امام خطابی راویوں کی عدالت اور سند کے اتصال کے علاوہ کوئی شرط منہیں بتاتے۔ یہ تیسری
 صدی کے محدثین کا فیصلہ ہے اور اسے ہی حافظ ابن الصلاح نے محدثین کا اتفاق موقوف قرار

دیا ہے۔ اس میں تین چیزیں مثبت ہیں اور دو منفی۔ مثبت یعنی اتصال سند، عدالت اور ضبط اور منفی یعنی تشاؤ نہ ہونا اور قفل نہ ہونا۔ امیر میانی فرماتے ہیں کہ محدثین کے یہاں صحیح کی تعریف میں یہ پانچوں چیزیں بنیادی ہیں۔

ان پانچوں میں سے اتصال کی قید تیسری صدی کے محدثین نے اس لیے اضافہ کی ہے کہ ان کے زمانے میں اسنادی وسائط زیادہ ہو گئے تھے ان واسطوں میں اہم کڑیاں معلوم کرنا اور پھر ان میں باہم اتصال کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ امام بخاری نے اتصال کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ دور اولوں کا صرف معاصر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے چاہے ایک بار ہی ہو۔ اگر معاشرت کے ساتھ ملاقات ہو تو پھر وہ عنعنہ سے روایت کو قبول کر لیتے ہیں ورنہ وہ اتصال کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امام بخاری نے اس نظریہ کی توضیح تاریخ میں کی ہے اور صحیح میں ان کا اسی پر عمل ہے۔

قد اظهر البخاری هذا المذهب في التاريخ وجرى عليه في الصحيح

لیکن امام مسلم نے اتصال کے معاملے کو اس قدر سنگین نہیں بنایا بلکہ وہ اس سنگینی پر امام بخاری پر برہم بھی نظر آتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر دونوں میں معاشرت ہو تو پھر ملاقات کی شرط بے سود ہے۔ معاصر دوسرے معاصر سے اگر روایت عنعنہ سے پیش کرے تو اسے اتصال پر محمول کیا جائے گا اور اس پر صحیح مسلم کے مقدمہ میں ایک بصیرت افروز نوٹ لکھا ہے۔

ان بزرگوں نے اتصال کو اتنی اہمیت اس لیے دی ہے کہ اسانید کے سلسلہ میں وسائط کی بہتات کی وجہ سے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ ایک ایک راوی کے بارے میں ان کو یہ تحقیق کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی کہ جس سے وہ روایت لیتا ہے وہ اس کا معاصر ہے یا نہیں ہے۔ معاصر ہے تو اس سے اس کی ملاقات ہوئی ہے یا نہیں اور اگر ملا ہے تو اس نے یہ خاص حدیث اس سے سنی ہے یا کسی اور سے سن لی اور اس کا حوالہ دے دیا ہے ایسے بہت سے امور کی پابجائی میں محدثین کو جان کی بازی لگانا پڑی ہے لیکن دوسری صدی کے مؤلفین کو چونکہ براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تابع تابعین سے شرف تلمذ تھا اس لیے ان کو نہ اسناد کے بارے میں تحقیقات کی زیادہ ضرورت پیش آتی اور نہ ان کے یہاں اتصال کو اس قدر اہمیت تھی۔ ان کے یہاں مسند و سہل

کی کوئی تفریق نہ تھی مرسل بھی مسند کی طرح حجت تھی۔

حدیث مرسل محدثین کی اصطلاح میں وہ حدیث کہلاتی ہے جس میں تابعی اپنے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جو واسطہ ہے اس کو بیان کیے بغیر قال رسول اللہ کہے جیسا کہ عام طور پر کجول و مشقی، ابراہیم، سعید بن المسیب اور حسن بصری اور دیگر تابعین کا معمول تھا۔ پھر اگر راوی نے دو راویوں کے درمیان جو شخص واسطہ ہے اسے چھوڑ دیا جیسے ایک شخص حضرت ابو ہریرہؓ کا ہم عصر نہ ہونے کے باوجود کہے قال ابو ہریرہؓ تو ایسی روایت محدثین کی زبان میں منقطع کہلاتی ہے اور اگر ایک سے زیادہ واسطے حذف کر دیے تو اسے معضل کہتے ہیں اور فقہاء و اصولیین کے یہاں ان سب کو مرسل کہتے ہیں۔

حدیث مرسل اور دوسری صدی ائمہ حدیث کے

حدیث مرسل کے بارے میں تیسری صدی میں ارباب روایت نے اپنا موقف دوسری صدی کے مؤلفین سے اتصال کی خاطر الگ بنا لیا ورنہ تیسری صدی سے پہلے اسنادی وسائط کم ہونے کی وجہ سے سب ہی حدیث مرسل کو دین میں مسند کی طرح حجت مانتے تھے اور مسائل و فتاویٰ کی بنیاد اسی پر قائم تھی۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

تابعین سائے کے سائے مرسل کے قبول پر متفق تھے ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی بھی امام سے دوسری صدی کے اختتام تک اس کا انکار ثابت نہیں ہے۔

علامہ بیہقی نے حافظ ابن جریر کا یہ فیصلہ حافظ ابن عبد البر اور حافظ بلقینی سے نقل کیا ہے امام ابو داؤد نے اپنے اس خط میں جو اہل مکہ کے نام لکھا ہے مرسل حدیث کے بارے میں اقرار کیا ہے کہ:

باقی رہیں احادیث مرسلہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کو کثر شہہ علماء مثلاً سفیان ثوری، امام مالک، امام اوزاعی سب ہی قابل استدلال سمجھتے تھے تا آنکہ امام شافعی آئے اور انہوں نے اس پر لب کشائی فرمائی اور

امام احمد نے بھی اس موضوع پر ان کا اتباع کیا ہے
بلکہ حافظ ابن جریر تو یہاں تک کہہ گئے کہ یہ کہنا کہ مرسل حجت نہیں ہے
بدعتہ حدیث بعد المائتین تیسری صدی کی بدعت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دوسری صدی کے بزرگوں کو غلبہ عدالت کی وجہ سے اپنے زمانے کے بزرگوں
پر ایسا ہی اعتماد تھا جیسا اس زمانے میں ابن حجر اور دارقطنی کو بخاری و مسلم پر ہے کیونکہ اس دور
میں عدالت غالب تھی چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر فرماتے ہیں:
ولا شك ان الغالب على حملة العلم النبوي في ذلك الزمان
العدالة۔

بے شک اس زمانے میں اہل علم میں عدالت غالب تھی۔
یہ حقیقت ہے کہ ایک متدین، متقی اور پرہیزگار شخص سے امید بھی یہی کی جاسکتی ہے
کہ اس بڑی ذمہ داری کو انہوں نے اطمینان کے بعد ہی اٹھایا ہے کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کی طرف کسی بات کو
منسوب کرنا اور اصل اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کرنا ہے جس کے دین و ایمان، سیرت و کردار پر
بھروسہ کیا جاتا ہو کیا اس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ قصد اللہ کے دین میں کسی ایسی چیز کا
اضافہ کر دیں گے جسے وہ جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت درست
نہیں ہے یقیناً ایک جمیشت سے یہ افتراء علی اللہ اور قول علی اللہ بغیر علم ہے اور قرآن میں
ایک سے زیادہ مقامات پر اسے سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے۔ جن بزرگوں کی عدالت مسلم ہو یقیناً
ان سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی یہ کھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے۔ اسی بنا پر ان بزرگوں کے
نزدیک حدیث مرسل حجت ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر لکھتے ہیں۔
مراسيل الصحابة والتابعين والائمة الحديث مقبولة۔

سو چاہئے کہ ائمہ حدیث کے مراسیل آج بھی ہمارے یہاں کیا اسی بنا پر مقبول نہیں ہیں؟
ائمہ حدیث کی جو کتابیں آج رائج ہیں کیا کوئی بنا سکتا ہے کہ اصول حدیث کے مقررہ اصول کے
مطابق ان کا اتصال ثابت ہے؟ اب ان کتابوں کی مرویات کو ان کتابوں کے مؤلفین تک جن

اسانید تک پہنچاتے ہیں اور جن رجال کے ذریعے ہم تک پہنچ رہے ہیں کیا ان کی عدالت، ثقاہت، امانت، حفظ و ضبط کی ہم نے اسی طرح چھان بین کی ہے جس طرح امام بخاری اور امام مسلم نے اپنے اساتذہ سے لے کر صحابہ تک کی ہے۔ ان کتابوں کی مرویات کو ان کی طرف منسوب کرنے کی ہمارے پاس اس کے سوا دلیل ہی کیا ہے کہ

والدلیل علی ذالک ان العلماء ما زالوا ینسبون فی مصنفاتہم
الاحادیث الی من اخرجہا۔

اس بات کی اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہمیشہ سے علماء اپنی تصانیف میں حدیثوں کو ان محدثین کی طرف نسبت کرتے رہے ہیں۔ اس لیے جیسا کہ ہمیں ان ائمہ حدیث کی بیان کردہ حدیثوں پر باوجود اتصال نہ ہونے کے اعتماد ہے ایسا ہی امام مالک کو سعید بن المسیب کے اور امام ابو حنیفہ کو امام شعبی اور ابراہیم نخعی کے روایت کردہ ارشادات پر اعتماد تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

ابراہیم نخعی نے ایک موقع پر جب کہ انہوں نے یہ حدیث روایت کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محافلہ اور منراہنہ سے منع فرمایا ہے اور ان سے کہا گیا تھا کہ کیا تمہیں اس کے سوا اور کوئی حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد ہی نہیں۔ کہا کہ کیوں نہیں؟ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ قال عبد اللہ، قال علقمہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اسی طرح شعبی جس وقت ان سے ایک حدیث کی بابت سوال کیا گیا اور کہا گیا کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر دیا جائے تو یہ جواب دیا تھا کہ نہیں مرفوع نہ کرو ہم کو یہ زیادہ محبوب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص تک اس کو نقل کیا جائے کیونکہ اگر روایت میں کمی و بیشی ہوگی تو وہ بعد کے شخص پر ہی سے لگی ہے

بہر حال دوسری صدی کے مؤلفین کے یہاں حدیث کے صحیح ہونے کے لیے مسند ہونا ضروری نہ تھا بلکہ وہ مرسل اور منقطع سب کو یکساں دین میں حجت قرار دیتے تھے۔

اگرچہ مرسل کا انکار تیسری صدی کے محدثین نے اسناد میں زیادتی کی وجہ سے اپنے خیال میں احتیاط کی بنا پر کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو متعدد مسائل میں جہاں مرسل کے علاوہ اور کوئی روایت مسند ان کے علم میں نہ تھی۔ اگلے امّہ سے اختلاف کرنا پڑا۔ متاخرین میں دارقطنی اور بیہقی بڑے نامور محدث گزرے لیکن ان دونوں کا حال یہ ہے کہ سند پر سند اور روایت پر روایت ذکر کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ضعیف ہونے کی ان کے پاس کوئی وجہ نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اسے مرسل ثابت کریں یا موقوف کہہ دیں۔

یہ نہ بھول جاتیے مصنفین صحاح میں سے اگرچہ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ مرسل روایات حجت نہیں ہیں لیکن یہ تمام ارباب صحاح کا متفقہ فیصلہ نہیں ہے۔
امام ابو داؤد فرماتے ہیں:

فاذا لم یکن مسنداً للمرسل ولم یوجد مسنداً لمرسل یحییٰ بہ
ولیس ہو مثل المعضل فی القوۃ۔

جب مسند مرسل کے خلاف نہ ہو اور مسند موجود نہ ہو تو مرسل سے احتجاج کیا جائے گا اور وہ قوت میں معضل کی طرح نہ ہوگی۔

مراسیل صحابہ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی کتاب القراءۃ میں لکھتے ہیں کہ مراسیل صحابہ حجت ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ مراسیل صحابہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک حجت ہیں۔ اور ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علماء کرام کے نزدیک مرسل صحابی حجت ہے۔

اور علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ

صحابہ کرام کے مراسیل حدیث مسند کے حکم میں ہیں۔

کبار تابعین کے بارے میں بھی امام بیہقی نے تصریح کی ہے کہ:

مراسیل کبار تابعین بھی مراسیل صحابہ کی طرح حجت ہیں جبکہ ان کے راویوں میں

عدالت اور شہرت ہو اور کمزور و مجہول رواۃ کی روایت سے اجتناب ہو۔

۱۔ رسالہ ابی داؤد۔ ۲۔ شرح مہذب ج ۴ ص ۸۲۔ ۳۔ نیل الاطّار ج ۱ ص ۲۴۱۔ ۴۔ کتاب القراءۃ ص ۱۴
واضح ہے کہ ان تصریحات کے پیش کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کسی نہ کسی انداز میں
سب مانتے ہیں کہ مراسیل دین میں حجت ہیں اختلاف تفصیلات میں ہے نفس مسئلہ میں نہیں ہے۔

اس موقعہ پر حافظ ابوسعید صلاح الدین العلانی نے جامع التحصیل لاحکام المراسیل میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔

جن لوگوں نے احادیث میں عنعنہ سے کام لیا ہے اور ان پر تدلیس کا شبہ ہے وہ سب ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ کچھ تو اپنی جلالت قدر کی وجہ سے اس زمرہ میں شمار ہی نہیں ہو سکتے مثلاً یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور موسیٰ بن عقبہ۔ کچھ ایسے ہیں جن کی تدلیس کو ائمہ نے برداشت کیا ہے اور ان کی روایت لی ہے چاہے انہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی ہے اور ایسا صرف ان کی جلالت شان اور امامت کی وجہ سے ہے مثلاً امام زہری، امام عجمی، ابراہیم نخعی، الحکم بن عتیبہ، جزیج، الثوری، ابن عیینہ، شریک اور یثیم بن بشیر، ان کی روایات صحیحین میں موجود ہیں۔

موسیٰ بن عقبہ کی صحیح بخاری میں روایت موجود ہے لیکن اسماعیل نے تصریح کی ہے کہ ان کا امام زہری سے سماع ثابت نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں ابان بن عثمان کی بحوالہ عثمان بن عفان روایت موجود ہے حالانکہ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابان نے عثمان سے نہیں سنا ہے اس انقطاع کے باوجود ان روایات کا کتابوں میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے یہاں بھی مراسلات کو شرف حاصل ہے۔ اس موقعہ پر ہمیں حافظ ابن رجب حنبلی کی وہ بات پسند آتی ہے جو مشہور علامہ زاہد کوثری نے ان سے نقل کی ہے اور جس کے ذریعے انہوں نے مراسلات کے موضوع پر دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی ہے فرماتے ہیں:

دونوں کے نقطہ نظر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ محدثین کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے محدثانہ اور روایتی نقطہ نظر سے انقطاع اور عام اتصال کی بنا پر اگر کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور وہ مرسل ہے تو وہ درجہ صحت میں آجاتے اور فقہاء یعنی دوسری صدی کے محدثین کی نظر اس کی اسناد پر نہیں بلکہ ان مننے پر ہوتی ہے جو حدیث مرسل میں بیان ہو رہے ہیں اور اس کی پشت پر ایسے قرائن موجود ہیں جو

ان معنی کی صحت کی دلیل ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ محدثین کی نظر اسناد پر ہوتی ہے اور دوسری صدی کے محدثین کے پیش نظر صرف معنی ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایسے دور میں ہیں جس میں اسناد کی تحقیق کی چنداں ضرورت ہی نہیں ہے۔

افراد و غرائب اور تیسری صدی کے محدثین

چونکہ تیسری صدی کے محدثین نے اتصال کو صحت حدیث کا معیار بنالیا تھا اس لیے انہوں نے ہر نادر نوشتہ اور غیر متداول صحیفے کا کھوج لگایا۔ مختلف اسلامی شہروں کے افراد و غرائب فراہم کیے اور تمام پریشان اور غیر متداول روایات جمع کر لیں اور طرق و اسانید کے ذریعے تمام علوم اسلامی جواب تک خاص خاص سینوں اور سفینوں میں منتشر تھے یکجا ہو گئے۔ دوسری صدی کے مؤلفین عام طور پر اپنی کتابوں میں ان ہی روایات کو جگہ دیتے تھے جو اہل علم میں متداول تھیں۔ قاضی ابویوسف نے ایسے موقعہ کے لیے یہ جچا تلا معیار پیش فرمایا تھا کہ :

الر دایۃ تزاد کثرة و یخرج منها مالا یعرف ولا یعرفہ
اہل الفقه ولا یوافق الکتاب ولا السنۃ فایاک و شاذ
الحديث و علیک بما علیہ الجماعۃ من الحديث و ما
یعرفہ الفقہاء و ما یوافق الکتاب و السنۃ۔

روایات میں بلحاظ کثرت اضافہ ہو گا اور غیر معروف حدیثیں منقہ شہود پر آئیں گی جن کو نہ اہل فقہ جانتے ہیں اور نہ کتاب و سنت کے موافق ہیں۔ تم حدیث شاذ سے بچ کر رہنا اور صرف اس حدیث کو اپنانا جو جماعت پیش کرے جسے فقہاء جانتے ہوں جو قرآن و سنت کے موافق ہو۔

لیکن تیسری صدی کے محدثین میں یہ انداز بدل گیا اور اس کے نتیجے میں افراد و غرائب کے جمع ہو جانے پر ایسی روایات سامنے آئیں کہ جن پر صحابہ، تابعین اور فقہاء مجتہدین کا عمل نہ تھا اور جو فقہاء

میں متداول اور معروف تھیں۔ تیسری صدی میں جن محدثین پر روایتی نقطہ نظر کا غلبہ تھا ان کو ان افراد غائب کی صحت پر اصرار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صحیح سند سے ایک چیز کے ثابت ہو جانے کے بعد اس پر عمل میں چون و چرا کرنا دیدہ و دانستہ حدیث کی مخالفت ہے لیکن دوسری صدی کے محدثین ایسی روایات کو شواہد کہتے ہیں۔ تیسری صدی کے محدثین صحت سند پر زور دیتے تھے۔ اس وجہ سے تیسری صدی کے ارباب روایت نے ایسی تمام روایات کو معمول بہ قرار دیا اور ان مسائل میں دوسری صدی کے مجتہدین سے بالکل جدا گانہ رائے قائم کر لی اور صحابہ و تابعین کے جو فتاویٰ ان روایات کے خلاف تھے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ سخن رجال ہمدردی جال یعنی جس طرح ان کو اجتہاد کا حق تھا ہمیں بھی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں ہم یہاں آپ کی ضیافت طبع کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ابوداؤد و ترمذی کی حدیث قلتین

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ :

سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الماء ما یتوبہ من
الدواب والسماء فقال صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان الماء
قلتین لم یحمل الخبث لہ

صرف ابوداؤد میں ہی نہیں بلکہ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے یہ حدیث خواہ کتنی ہی متعدد طرق سے آئی ہو اور خواہ سند کے لحاظ سے کیسی ہو مگر یہ امر واقعہ ہے کہ یہ حدیث دوسری صدی میں غیر معروف تھی۔ اسے اہل علم و فتویٰ میں سے کوئی بھی قابل عمل سمجھتا تھا اور اس بنا پر قاضی ابویوسف کی زبان میں شاذ تھی۔

حافظ ابن القیم نے تہذیب سنن ابی داؤد میں اس حدیث کے ہر پہلو پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے لیکن اس ساری بحث میں سب سے زیادہ لطیف پہلو وہ ہے جس میں انہوں نے اس حدیث کے شذوذ کو بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

یہ حدیث حلال و حرام، پاک و ناپاک کے بارے میں فیصلہ کن ہے

اور پانیوں کے مسئلہ میں اس کی حیثیت وہی ہے جو زکوٰۃ کے مسئلہ میں مختلف نصاب ہائے زکوٰۃ کی ہے۔ اگر اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک یہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ حدیث صحابہ میں مشہور نہیں ہوئی اور گوشہ گنہامی میں پڑی رہی۔ حالانکہ اُمت کو اس کی نصاب زکوٰۃ سے بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ زکوٰۃ تو ہر کس و ناکس پر فرض نہیں ہوتی مگر پانی تو ہر وضو اور غسل میں اسلامی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے اس لیے ضروری تھا کہ یہ حدیث ایسے ہی ذرائع سے ہمارے پاس پہنچتی جن ذرائع سے پیشاب کی سجاست، اس کے غسل کا وجوب اور نماز کی عدد رکعات نقل ہو کر آتی ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اس حدیث کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنے والے صرف ایک حضرت عبداللہ بن عمر ہیں اور حضرت عبداللہ سے روایت کرنے والے صرف عبید اللہ اور عبداللہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے دوسرے تلامذہ نافع، سالم، ایوب اور سعید بن جبیر کہاں گئے اور اہل مدینہ اور ان کے علماء اس حدیث سے کیوں بے خبر ہے حالانکہ وہ اس حدیث کے سب سے زیادہ ضرورت مند تھے کیونکہ پانی کی ان کے یہاں قلت تھی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت ابن عمر کو یہ حدیث معلوم ہو اور ان کے اصحاب اور ان کے شہر میں جو اہل علم تھے ان کو خبر نہ ہو اور وہ اس کو روایت نہ کریں۔ لہذا اگر یہ حدیث حضرت ابن عمر کے پاس ہوتی تو ابن عمر کے اصحاب اسے روایت کرتے اور اہل مدینہ کا یہ مسلک ہوتا۔ اس سے بڑھ کر اس حدیث کا تشذوذ اور کیا ہوگا؟ اور چونکہ اس کا قائل کوئی نہیں ہے اس لیے اس موضوع پر حضرت ابن عمر کے پاس حدیث کا ہونا ثابت نہیں ہے۔ یہ اس روایت کے شاذ ہونے کا بیان ہے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث نے بھی اس حدیث کے متروک العمل اور شاذ ہونے پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

اس کی مثال حدیثِ قلتین ہے کیونکہ یہ حدیث صحیح ہے اور ایک سے زیادہ طریقوں سے مروی ہے۔ سب کا دار و مدار ولید بن کثیر عن محمد بن جعفر بن الزبیر عن عبد اللہ بن محمد بن عباد بن جعفر عن عبید اللہ بن عبد اللہ ہے۔ دونوں عبد اللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں اس سند کے بعد اس کے بہت سے طریقے ہیں۔ عبد اللہ اور عبید اللہ کی ثقاہت میں کوئی کلام نہیں ہے لیکن ان علماء میں سے منہیں جن پر فتویٰ کا دار و مدار اور لوگوں کا اعتماد تھا۔ اس بنا پر یہ حدیث نہ سعید بن المسیب کے عہد میں ظاہر ہوئی اور نہ زہری کے زمانے میں اور نہ اس پر مالکیہ چلے اور نہ احناف میں سے کسی نے اس پر عمل کیا۔

دیکھ لیجئے کہ شاہ صاحب نے اس روایت کے دونوں مرکز عبید اللہ اور عبد اللہ کے بارے میں یہ کہہ کر

وان کا فاما من الثقات لکنہما یس من وسد الیہما الفتویٰ

وعول علیہم الناس۔

لفظ بلفظ اور حرف بحرف وہی بات کہہ دی جو ہم نے بتائی ہے کہ یہ روایت اہل علم اور اربابِ فتویٰ میں متداول نہ تھی اور یہی بات قاضی ابویوسف نے مایعرفہ الفقہاء کے ذریعے سمجھاتی تھی۔

صرف حدیثِ قلتین ہی پر موقوف نہیں ہے اور بھی اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

ابوداؤد کی حدیثِ تائین

ابوداؤد اور ترمذی میں ہے :

عن دائل بن حجر قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ
ولا الضالین قال آمین ورفع بها صوتہ -
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب ولا الضالین کہتے تو اونچی آواز سے
آمین کہتے -

حافظ ابن القیم نے اس حدیث پر جو نوٹ لکھا ہے وہ سن لیجئے - فرماتے ہیں :
حدیث دائل کو شعبہ اور سفیان دونوں نے روایت کیا ہے - سفیان کی
روایت میں رفع بها صوتہ ہے اور شعبہ کی روایت میں اس کی جگہ
خفض بها صوتہ ہے - اس حدیث میں چار چیزیں قابل غور ہیں -
اول یہ کہ شعبہ اور سفیان کا رفع اور خفض میں اختلاف ہے - دوم یہ کہ
دونوں حجر کی شخصیت میں مختلف ہیں - شعبہ کہتے ہیں کہ ابو العباس حجر
کی کنیت ہے اور سفیان کہتے ہیں کہ نام ہی حجر بن عباس ہے - سوم
یہ کہ حجر کا حال معلوم نہیں ہے - چہارم یہ کہ ثوری اور شعبہ مختلف ہیں
سفیان اسے حجر بن دائل کی روایت بتاتے ہیں اور شعبہ اسے حجر بن علقمہ
عن دائل کی روایت بتاتے ہیں - اگرچہ امام دارقطنی نے ثوری کی روایت
کی تصحیح کی ہے لیکن یہ محل نظر ہے اور اسی بنا پر امام ترمذی نے
روایت کی تصحیح نہیں کی ہے

اس روایت کے تفرد اور غرابت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے تمام رواۃ چلے
سفیان بن یزید یا شعبہ، سلمہ بن کہیل بن یزید یا علقمہ بن دائل یا پھر عبد الجبار بن دائل، سب کوفہ
کے رہنے والے ہیں حتیٰ کہ امام دارقطنی اس کو اپنی سنن میں نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں :
هذه سنة تصد بها أهل الكوفة

اور اس پر طرہ یہ کہ تمام اہل کوفہ میں کوئی بھی آمین بالجہر کا قائل نہیں ہے چنانچہ قاضی شوکانی
رقمطراز ہیں :

كذا ردی عن ابی حنیفۃ والکوفیین -

صحیحین کی حدیث اختیار مجلس

یہ حدیث مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صاحب منتهی الاخبار نے شیخین کے حوالہ سے اس طرح نقل کی ہے :

عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المتبايعان
بالخيار مالم يتفرقا۔^۱

خود شیخین نے اسے متعدد پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اس حدیث کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کاروبار ہی زندگی میں اگر دو آدمیوں میں کوئی سودا ہو جائے اور بات چیت ختم ہو جائے تو جب تک دونوں سودا کرنے والے ایک جگہ بیٹھے ہیں سودا توڑا جاسکتا ہے اور دونوں میں ہر ایک کو ایسا کرنے کا اختیار ہے لیکن شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

فانہ حدیث صحیح روئی بطریق کثیرۃ وعمل بہ ابن عمر و
ابو ہریرۃ من الصحابة ولم یظہر علی الفقہاء السبعة
ومعاصر یہم فلم یقولوا یقولون بہ فرائی مالک
والبو حنیفۃ ہذا علت قاضیۃ فی الحدیث

یہ حدیث صحیح ہے متعدد طریقوں سے مروی ہے اس پر صحابہ میں ابن عمر اور ابو ہریرہ نے عمل کیا ہے لیکن یہ حدیث فقہاء سبعہ اور ان کے معاصرین کے دور میں ظاہر نہیں اس لیے فقہاء سبعہ نے اس پر عمل نہیں کیا اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے فقہاء سبعہ کے عمل نہ کرنے کو اس حدیث کی صحت میں علت قاضیۃ سمجھا ہے بلکہ حافظ ابوبکر الخطیب نے یہ حدیث نقل کر کے امام مالک کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے اس پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ مدینہ والوں کا عمل اس کے خلاف تھا چنانچہ فرماتے ہیں :

سواء مالک ولم یعمل بہ ومنہم انما سرائی

اهل المدينة على العمل بخلافه

اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے لیکن اس پر اس لیے عمل نہیں کیا ہے کہ ان کے خیال میں یہ حدیث عمل اہل مدینہ کے خلاف ہے۔ یاد رہے کہ اس کی جو سند خطیب نے بتائی ہے وہ سند زریں ہے جسے علمائے اہل الاسناد قرار دیتے ہیں یعنی مالک عن نافع عن عبد اللہ بن عمر۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود نافع کا بھی امام مالک کے زمانے میں اس پر عمل نہ تھا۔ اسی لیے خطیب نے لکھا ہے کہ:

فلم یکن ترک العمل به قد حالنا فیه
نافع کا اس پر عمل نہ کرنا حدیث میں قاذح نہیں ہے
چنانچہ امام محمد نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:
وبہذا ناخذ۔^۱

اور امام محمد ہی نے اس کی تفسیر بتائی ہے کہ:

تفسیرہ عندنا علی ما بلغنا عن ابراہیم النخعی انہ قال المتبايعان
بالخيار مالم يتفرقا قال مالم يتفرقا عن منطق البيع اذا
قال البائع قد بعثت فلما ان يرجع مالم يقل الاخر قد
اشتریت فاذا قال المشتري قد اشتریت بكذا وكذا فلا
ان يرجع مالم يقل البائع قد بعثت۔

اس ارشاد کا مطلب ہمارے نزدیک جیسا کہ ہمیں ابراہیم نخعی سے معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ اس میں تفرق سے تفرق اقوال مراد ہے جب بائع کہہ دے کہ میں نے بیچ دیا تو بائع کو رجوع کا حق اس وقت تک ہے جب تک خریدار یہ نہ کہے کہ میں نے خرید لیا اور اگر مشتری کہہ دے کہ میں نے خرید لیا تو اسے رجوع کا اس وقت تک حق ہے کہ جب تک بیچنے والا یہ نہ کہے کہ میں نے بیچ دیا۔^۲

یہی معنی سمجھانے کے لیے امام اعظم نے وہ تبصیر اختیار کی ہے جو حافظ ابن عبد البر نے

۱۔ الکفایہ فی علوم الروایتہ ص ۱۱۴۔ ۲۔ مؤطا امام محمد ص ۳۴۱۔ ۳۔ مؤطا امام محمد ص ۳۴۲۔

سفیان بن عیینہ کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ سفیان کہتے ہیں کہ:
 میں نے امام ابو حنیفہ کے سامنے یہ حدیث پیش کی کہ البیعان بالخیار
 مالم یتفرقا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر سودا کرنے والے دونوں شخص
 کشتی میں سفر کر رہے ہوں تو ان میں افتراق کب ہوگا۔
 ایک ہی بات میں حدیث کی روح سمجھا دی اور بتا دیا کہ تفرق سے تفرق اقوال مراد ہے
 اگرچہ سفیان بن عیینہ نے امام اعظم کی اس بات کو گوارا نہ کیا اور کہہ دیا۔
 کان ابو حنیفۃ یضرب لحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 الامثال فیردہ۔

ابو حنیفہ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے لیے مثالیں بیان
 کرتے تھے۔

یہ سفیان بن عیینہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے اس سے پہلے حفاظ حدیث نے فقہاء پر اسی
 قسم کی پھبتی کسی ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ میں ایک واقعہ آتا ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ اور
 حضرت ابن عباس کا مکالمہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے کہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے
 ارشاد فرمایا ہے کہ:

توضو و ما غیرت النار

حضرت ابو ہریرہ کی زبان سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سن کر حضرت
 ابن عباس نے فرمایا کہ:
 التوضاء من الحمیم

حضرت ابو ہریرہ نے حضرت ابن عباس سے یہ بات سنی تو فرمایا:
 یا ابن اخی اذا سمعت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 حدیثاً فلا تضرب لہ الامثال
 اے میرے برادر زادے! جب تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث
 سنے تو اس کے لیے مثالیں نہ بنا۔ اے

بتایا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث بخیر مجلس بھی اپنے اس مطلب کے لحاظ سے افراد و غرائب میں سے ہے اسی طرح وہ تمام روایات جن پر عہد صحابہ و تابعین میں اربابِ فتویٰ کا عمل نہ تھا۔ ان سب روایات کے بارے میں دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کا نقطہ نظر بالکل جدا تھا۔ تیسری صدی کے محدثین ان کو صرف اسنادی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور اتصال و عدالت کے ذریعے ان روایات کو صحیح گردانتے تھے لیکن دوسری صدی کے محدثین فقہاء ان کو مابعد الجماعۃ اور تعامل و توارث اور السنۃ کی روشنی میں جانچتے تھے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ آگے آ رہا ہے۔

امام اعظم اور حدیث کی صحت

محدثین کی زبان سے تو آپ صحیح حدیث کی تعریف پڑھ چکے ہیں۔ ان کے یہاں حدیث صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ راویوں میں عدالت و ضبط ہو، سند میں اتصال ہو اور حدیث شاذ اور معطل نہ ہو۔ حدیث کی صحت میں ان پانچ کی حیثیت اساس اور بنیاد کی ہے۔ چنانچہ امیر میانی ان پانچوں کا ذکر کر کے فرماتے ہیں :

فہذہ الخمسة هي المعتبرة في حقيقة الصحيح عند المحدثين
یہی پانچ چیزیں محدثین کے نزدیک صحیح کی حقیقت میں معتبر ہیں۔
لیکن امام اعظم ابو حنیفہ محدثین کی بیان کردہ شرطوں کو ضروری قرار دینے کے ساتھ ضبط کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ضبط صدر کو راوی کے لیے اتنا ضروری قرار دیتے ہیں کہ راوی کے لیے حدیث کے بیان کرنے میں یہ بنیادی شرط بتاتے ہیں کہ حدیث کی روایت صرف وہ شخص کرے جو حدیث کے سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک حدیث کا حافظ ہو چنانچہ ابو جعفر طحاوی نے امام اعظم کے بارے میں بتدقیق لکھا ہے کہ

قال ابو حنیفہ لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما
حفظ من لیوم سمع الی لیوم یحدث بہ
ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے لیے مناسب نہیں ہے کہ حدیث بیان
کرے مگر صرف وہ شخص بیان کرے جو سننے کے دن سے بیان کرنے

کے دن تک حدیث کا حافظ ہو جائے
 سید الحافظ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ امام اعظم کا اپنا بھی یہی معمول تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی
 نے یحییٰ بن معین کا یہ بیان لکھا ہے :
 امام ابو حنیفہ صرف وہ حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کے وہ حافظ ہیں اور
 جن کے وہ حافظ نہیں وہ بیان ہی نہیں کرتے۔
 امام نووی نے تقریب میں اس کو مشددین کا مسلک قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ امام مالک
 اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے چنانچہ فرماتے ہیں :
 فمن المشددین من قال لا حجة الا فيما رواه من حفظه و
 تذکرہ مروی عن مالک و ابی حنیفة۔
 کوئی حدیث اس وقت تک حجت اور دلیل نہیں ہو سکتی جب تک راوی
 اپنی یاد اور حافظہ سے روایت نہ کرے۔
 اور حافظ سیوطی نے امام اعظم کا روایت حدیث میں یہ ضابطہ بیان کرنے کے بعد دوسرے
 محدثین سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے اس میں شدت محسوس کی ہے اور لکھا ہے کہ :
 هذا مذهب شديد وقد استقر العمل على خلافه، فلعل الرواة
 في الصحيحين من لم يوصف بالحفظ لا يبلغون النصف
 یہ مذہب بڑا ہی سخت ہے محدثین کا اس کے خلاف عمل ہے کیونکہ
 اگر اس معیار کے پیش نظر صحیحین کا جائزہ لیا جائے تو نصف راوی ایسے
 بلیں گے جو حافظہ کی اس شرط پر پورے نہ آئیں گے۔
 امیر میانی نے توضیح الافکار میں، حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں اور حافظ ابن
 الصلاح نے مقدمہ میں یہی بات بتائی ہے۔ ابن الصلاح کے الفاظ یہ ہیں :
 من مذاهب التشديد مذهب من قال لا حجة الا فيما
 رواه الراوى من حفظه و تذکرہ و ذالک مروی عن

حالتِ دابی حنیفہ -

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے بشرط
لگاتے ہیں کہ راوی کا ضبط اس درجہ قوی ہو کہ سننے کے بعد سے بیان کرنے کے وقت تک اسے
برابر یاد رہے۔ اگر یاد نہ رہے تو اس کو روایت کرنا درست نہ سمجھتے تھے۔ بعد کے محدثین نے
حفظ کی جگہ کتابت کو کافی سمجھ لیا اس لیے ان کے خیال میں اگر راوی کو حدیثوں کے الفاظ و معانی
کچھ بھی یاد نہ ہوں تاہم وہ قلم بند صورت میں اس کے پاس موجود ہو تو اس کو روایت کر سکتا ہے چنانچہ محدث
خطیب بغدادی لکھتے ہیں :

ابوزکریا یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے قلم سے لکھی ہوئی
حدیث پاتے مگر وہ اس کو زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے ؟ کہنے لگے کہ ابو حنیفہ
تو یہ کہتے ہیں کہ جس حدیث کا انسان حافظ نہ ہو اسے بیان نہ کرے لیکن ہم یوں
کہتے ہیں کہ اپنی کتاب میں جو کچھ اپنے قلم سے لکھا ہوا پاس سے بیان کر دے
چاہے وہ اس روایت کا حافظ ہو یا نہ ہو۔

بہر حال امام اعظم نے ضبطِ صدر کو دوسرے محدثین سے الگ ہو کر بے حد اہمیت دی ہے اور
اس کو حدیث کی صحت، عدالت، اتصال کے ساتھ بنیادی شرط قرار دیا مگر بعد کو محدثین نے یہ سختی
برداشت نہ کی۔ جس قدر زمانہ گزرتا گیا حفظ کی جگہ کتابت رائج ہوتی گئی۔ تاہم اس سے انکار نہیں
کیا جاسکتا کہ حافظِ حدیث کی روایت کو غیر حافظ کی روایت پر ترجیح ہے۔ کیونکہ حافظ نہ ہونے
کی حالت میں احتمال ہے کہ کوئی خط میں خط ملا کر نوشتہ میں گڑبڑ کر دے۔ بہر حال امام اعظم نے
حدیث کے صحیح ہونے کے لیے جو شرط لگائی وہ اگرچہ تیسری صدی کے محدثین کے یہاں ایک
تشدید کی حیثیت رکھتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ فخر الاسلام بزدوی ضبط کی دقیق تشریح
کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ بات کو ایسے طریق پر سنا جائے جیسے سننے کا حق ہے
پھر اس کے معنی مراد کو سمجھا جائے۔ امکانی کوشش سے اسے یاد کیا جائے
پھر اس کی حدود کی حفاظت کر کے اس کی پابندی کی جائے اور اسے دوسرے

تک پہنچاتے وقت تک اس کے مذاکرات کا اہتمام کرنا چاہیے مبادا وہ
زمین سے اتر نہ جائے بلکہ

یہ تصریحات فن حدیث میں امام اعظم کی عظمت شان اور جلالِ قدر کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں
غالباً جو لوگ امام اعظم کو حدیث میں متشددین میں شمار کرتے رہے ہیں ان کے پیشِ نظر امام اعظم کی
یہی شرائط ہیں جیسے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ :

شدد فی شروط الروایۃ والتحمل وضعف روایۃ الحدیث
البیاتی اذا عارضها الفعل النفسی -

امام صاحب نے روایت کی شرطوں اور اس کے تحمل میں سختی کی اور اگر
حدیث فعلِ نفسی کے معارض ہو تو اس کی تضعیف کی ہے بلکہ

لیکن جسے سختی کہا جا رہا ہے اسی کا نام احتیاط ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ
دین کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتنی جاتے۔ امام اعظم کی اس احتیاط کا بڑے بڑے محدثین
نے اقرار کیا ہے چنانچہ حافظ ابو محمد عبد اللہ حارثی بسند متصل امام وکیع سے جو حدیث کے بہت بڑے
امام ہیں نقل کرتے ہیں :

اخبرنا القاسم بن عباد سمعت یوسف الصغاری قول سمعت

وکیعاً یقول لقد وجد الوریع عن ابی حنیفۃ فی الحدیث ما لم

یوجد عن غیرہ -

جیسی احتیاط حدیث میں امام ابو حنیفہ نے کی ہے کسی دوسرے نے نہیں کی تھی

اسی طرح علی بن الجعد سے جو حدیث کے بہت بڑے امام اور حافظ ہیں اور امام بخاری اور
ابوداؤد کے استاد ہیں یہ بیان منقول ہے کہ :

امام ابو حنیفہ جب حدیث بیان کرتے ہیں تو موتی کی طرح آبدار ہوتی ہے

اور یہ امام اعظم کی احتیاط ہی کا نتیجہ ہے کہ امام وکیع بن الجراح جیسا شخص جو حدیث میں امام احمد
امام ابن المدینی، امام یحییٰ بن معین اور امام عبد اللہ بن المبارک کا استاد ہے۔ امام اعظم کی ساری حدیثیں

۱۔ اصول فخر الاسلام ج ۲ ص ۱۶۲ برکشف الاسرار - ۲۔ المحطہ ص ۳۴ -

۳۔ المناقب للموفق ج ۱ ص ۱۹۷ - ۴۔ جامع المسانید ج ۲ ص ۳۰۸ -

نوک زبان کرتا ہے اور جسے سید الحافظ سیحی بن معین حفظہ حدیث میں سب سے اونچا بتلاتے ہیں چنانچہ حافظ ابن عبد البر سیحی بن معین سے ناقل ہیں :

میرے علم میں وہ کتب سے اونچا کوئی نہیں ہے۔ وہ کتب امام ابو حنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے اور ان کو امام ابو حنیفہ کی ساری حدیثیں یاد تھیں اور انہوں نے امام ابو حنیفہ سے حدیثیں سنی تھیں۔

امام اعظم اور رد و قبول روایت

محدثین نے روایت کے رد و قبول کے لیے جو شرطیں لکھی ہیں اور جن روایات کو قابل استدلال قرار دیا ہے ان کے نقل کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ بالغ، عاقل ہونے کے ساتھ عدالت اور ضبط کی صفات سے موصوف ہوں۔ حافظ ابن الصلاح نے جمہیر المذہب حدیث کا فیصلہ یہی بتایا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اس میں تیقظ کا اضافہ کر کے لکھا ہے کہ :

اگر ان شرطوں میں سے ایک شرط بھی مخدوش ہو جاتے تو روایت مردود ہو جاتے گی۔

امام نووی نے تقریب میں اور حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اسی کی توثیق کی ہے لیکن امام اعظم نے کسی بھی روایت کی قبولیت کے لیے ان شرطوں کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ اگر روایت کا تعلق اسلام کی عام عملی زندگی سے ہو تو ضروری ہے کہ اس کا نقل کرنے والا ایک نہ ہو بلکہ صحابی سے اس کو نقل کرنے والی ایک جماعت ہو اور جماعت بھی نیک اور پارسا لوگوں کی ہو۔ چنانچہ امام ربانی عید الوہاب الشحرانی رقمطراز ہیں :

قد كان الامام ابو حنيفة يشترط في الحديث المنقول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل العمل به ان يرويه عن ذلك الصحابي جمع القياد عن مثلهم وهكذا۔

جو حدیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کی بابت امام ابو حنیفہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت

اس صحابی سے برابر نقل کرتی آئے۔
 امام شترانی نے حدیث کی قبولیت کے لیے امام اعظم ابو حنیفہ کی جس شرط کا ذکر کیا ہے وہ بصراحت
 خود امام اعظم سے منقول ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے امام سیحی بن معین کی سند سے امام اعظم کا یہ ارشاد
 نقل کیا ہے۔

میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم اور ان حدیثوں سے کہ جو ثقافت کے ہاتھوں میں ثقافت کے
 ذریعے شائع ہوتی ہیں۔ پھر اگر یہاں بھی نہ ملے تو آپ کے اصحاب سے
 جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں لیکن جب بات ابراہیم،
 شعبی، حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح پر آ پڑتی ہے تو جس طرح
 ان حضرات نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظم اس حدیث کو قبول فرماتے تھے جس کے پہلے طبقہ میں اگرچہ
 راوی ایک ہو مگر اس کے بعد وہ مختلف طبقوں میں پھیلی ہو اور اسے ایسے لوگوں نے نقل کیا ہو
 جو انبیاء اور پارساہوں طبقہ اولیٰ سے صحابہ اور طبقہ ثانیہ سے تابعین مراد ہیں۔
 بعد کو محدثین غرائب و افراد، نوادرو آثار جمع ہو جانے پر اس کی پابندی نہ کر سکے بلکہ یہ
 امر واقعہ ہے کہ امام حاکم نے جب صحیح حدیث کی دس قسمیں قرار دیتے ہوئے پہلی قسم کے بارے
 میں یہ اعلان کیا کہ:

ان اخصیاء البخاری و مسلم الخراج المحدث عن عدلین
 عن عدلین اثنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

بخاری و مسلم کا مسک یہ ہے کہ وہ حدیث کو دو عادل راویوں سے
 روایت کرتے ہیں اور پھر وہ دو اپنے سے اوپر دو سے تا آنکہ یہ
 سلسلہ اسی طرح دو دو ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔
 تو محدثین نے امام حاکم کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ حافظ ابن حبان نے امام حاکم کے
 اس اعلان کو حدیث کے خلاف سازش قرار دیا اور بتایا کہ:

احادیث سب کی سب اخبار آحاد ہیں جو شخص روایت حدیث میں اس قسم کی شرطیں عائد کرتا ہے دراصل وہ ترک حدیث کی اسکیم بناتا ہے کیونکہ حدیثیں اخبار آحاد کے ذریعے ہی آتی ہیں۔
امام ابو بکر محمد بن موسیٰ حارمی نے امام حاکم کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا اور لکھا کہ:
لیس کذا لک لانہما الخ جافی کتابہما احادیث جماعۃ من الصحابة لیس لہما الاراد واحد و احادیث لا تعرف الا من جهة واحدة۔

یہ واقعات کے خلاف ہے کیونکہ امام بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں ایسی جماعت سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں جن کی روایات میں صحابہ سے صرف ایک ہی راوی ہے اور ایسی حدیثیں بھی جو ایک ہی طریق سے مروی ہیں۔

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی نے بھی امام حاکم کے اس دعویٰ کی وانتکاف لفظوں میں تردید کی ہے اور فرمایا:

شیخین نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی اور نہ ان سے یہ شرط منقول ہے۔ بخدا یہ بہترین شرط ہوتی اگر اس کا صحیحین میں کوئی نام و نشان ہوتا۔ ہمارا مطالعہ یہ ہے کہ یہ قانون ان کتابوں میں قدم قدم پر پارہ پارہ ہے۔

اور پھر خود امام حاکم کی تردید کے بعد یہ تجویز پیش فرمائی کہ امام بخاری و مسلم کا موقف ان کتابوں میں صرف یہ ہے کہ:

وہ ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جس کے راویوں کی ثقاہت الثاقی ہو۔

لیکن حافظ زین الدین عراقی نے حافظ ابن طاہر کی اس تجویز کو یہ کہہ کر بے جان کر دیا کہ:
قبول روایت میں امام بخاری و مسلم کا یہ موقف نہیں ہے۔ کیونکہ

امام نسائی نے ایسے راویوں پر جرح کی ہے جن سے شیخین نے روایت کی ہے۔
بتانا یہ چاہتا ہوں کہ محدثین اپنے دور میں امام اعظم کی عائد کردہ شرائط کی حدیث کے رد و قبول
میں پابندی نہ کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ امام اعظم کے اس بیان کی روشنی میں اگر سنت اصل ثانی ہے تو قرآن اصل
اول۔ لیکن سنت کے موضوع پر حدیث اس وقت قبول کی جاسکتی ہے جب وہ بالکل موثق
اور مصادر مختلفہ سے ثابت ہو کر آئی ہو اور اس کا صدق و ضبط اور نقل ہر لحاظ سے پایہ تصدیق
کو پہنچ چکا ہو۔ آپ صرف ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو اس معیار پر صحیح ہیں۔ اور جن
کی ثقافت کے ذریعے اشاعت ہوتی ہے۔ امام سفیان ثوری نے بھی حدیث کے متعلق امام اعظم
کا یہی موقف بتایا ہے کہ:

ياخذ بما صح عنده من الاحاديث التي كان يحملها الثقات و

بالاخر من فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور ثقافت جن کو روایت
کرتے ہوں۔ نیز جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے
یہ اس کو لیتے ہیں۔

اس لحاظ سے امام اعظم کی حدیثوں کا بیشتر حصہ مشہور ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ دور ہے جس میں
شہرت کو اعتباری حیثیت حاصل ہے ورنہ اس کے بعد اگر کوئی حدیث شہرت پذیر ہوتی ہے
تو آئینی اور قانونی لحاظ سے وہ شہرت نہیں جس سے حدیث کو قوت حاصل ہو سکے۔ علامہ
عبد العزیز بخاری رقمطراز ہیں:

احادیث کی شہرت کا اعتبار قرن دوم و سوم میں ہو گا۔ قرون ثلاثہ کے

بعد شہرت معتبر نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں اکثر اخبار احاد مشہور

ہو گئی ہیں۔ حالانکہ ان کو مشہور نہیں کہتے ہیں۔

ن شاید آپ کو اس پر حیرت ہو مگر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ شہرت کا رد و قبول

۱۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۱۰۱۔ ۲۔ مناقب ابی حنیفہ ذہبی ص ۲۰۔

۳۔ کشف الاسرار ج ۲ ص ۷۔

اسنادی وسائط پر ہے اگر اسنادی وسائط کم سے کم تر ہوں اور مؤلف کی ذات کا خود ان زمانوں سے تعلق ہو جن میں شہرت کو معتبر قرار دیا گیا ہے تو پھر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ آپ اس نظر سے کتاب الآثار کا مطالعہ کریں آپ کو زیادہ حدیثیں اس میں تین واسطوں سے ملیں گی اور یہ واسطے بھی معمولی نہیں بلکہ احمد المہر اور فقہاء مجتہدین پر مشتمل ہیں۔ یہی حدیثیں تیسری صدی میں اسنادی وسائط کے زیادہ ہونے کی وجہ سے احادیث بن گئی ہیں۔ امام اعظم ایسے دور میں پیدا ہوئے ہیں جو زمانہ ثبوت سے قریب تر ہے اس لیے آپ نے حدیث کے راویوں کی عدالت کا فیصلہ صحابہ ان کے پرکٹا ہوں کے ذریعے نہیں بلکہ مشاہدے کے ذریعے کیا ہے اس لیے احادیث کے بارے میں آپ کی رائے حتمی ہے۔ اسی بنا پر امام شعبہ نے امام اعظم سے تحدیث کی درخواست کی تھی۔ امام شعبہ کو سفیان ثوری امیر المؤمنین فی الحدیث اور امام احمد حدیث میں ائمہ وعدہ کہتے ہیں امام اعظم کے نام امام شعبہ کا یہ خط آج تک تاریخ کے لیے سرمایہ زرینت بنا ہوا ہے خط کا انکشاف کرنے والا بھی کوئی شخص نہیں بلکہ سید الحفاظ یحییٰ بن معین ہیں یہ خط کا مضمون یحییٰ بن معین نے یہ بتایا ہے کہ امام شعبہ نے امام اعظم کو صرف لکھا نہیں بلکہ ان سے حدیث بیان کرنے کی اپیل کی۔ ذرا غور فرمائیے کہ امام اعظم کے علم پر ان کی ثقاہت، عدالت، امانت اور ان کی حدیث میں فن کاری پر امام شعبہ کو کتنا بڑا اعتماد ہے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ کیا فرمایا ہے ہیں ہذا ہے ہیں ان یحدث کہ حدیث بیان کریں۔ تحدیث کی بات صرف اس شخص سے کہی جاسکتی ہے جس کی فن آشنائی پر کل اعتماد ہو۔ کیونکہ علم حدیث کا ایک شہسوار کبھی کسی ایسے شخص کو یہ بات نہیں کہہ سکتا جو اس کا اہل نہ ہو۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ علم حدیث میں امام صاحب کے ناورۃ الوجود ہونے کی کیا یہ دلیل ہے کہ امام فن حدیث آپ سے حدیث بیان کرنے کی اپیل کر رہے ہیں۔ اسی بنا پر امام یحییٰ بن معین سے جب حدیث میں امام اعظم کے بارے میں دریافت کیا گیا تو یہ فرمایا کہ

لقد ما سمعت احدا ضعه

میں نے تو کسی سے بھی ان کی تضعیف نہیں سنی۔

امام شعبہ کا مذکورہ بالا خط بطور شہادت پیش کر دیا اور فرمایا کہ شعبۃ شعبۃ

شعبہ ہی ہیں۔ یعنی جن کی علم حدیث میں جلالت شان اور عظمت قدیم پر امام شعبہ کو اعتماد ہو یا
تو کسی کے لیے یا اتنے سخن نہیں ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الزبیری فرماتے ہیں۔

قد كان الحافظ المشهور بعنايته في هذا الشأن

امام ابو حنیفہ علم حدیث میں مشہور حافظ حدیث تھے۔

بہر حال امام اعظم نے صحت حدیث کے لیے ایک بہت اونچا معیار قائم کیا تھا ان کے شروط
روایت کے لیے معیار تحقیق کی حد تک بقابلہ محدثین زیادہ سخت تسلیم کیے گئے ہیں جیسا کہ
آپ مقدمہ ابن خلدون اور المیزان الکبریٰ کے حوالہ سے پڑھ چکے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اپنی شروط
میں تیسری صدی کے محدثین کی نسبت متشدد تھے۔

امام اعظم اور اہل ہوی سے روایت

روایت کے رد و قبول سے متعلق اس پر تو دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کا اتفاق
ہے کہ قبول روایت کے لیے اسلام اور عدالت شرط ہے اور شرط ہونے کا مطلب یہ ہے
کہ کافر کی حالت کفر میں اور فاسق کی حالت فسق میں روایت مردود ہے۔ اس موضوع
پر کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوتے ہوئے
اپنے مخصوص نظریات کے حامل ہیں جن کے نتیجے میں جمہور امت کی شاہراہ سے ہٹ کر انہوں
نے اپنی راہ الگ بنالی مثلاً خوارج، روافض، نواصب، معتزلہ اور مرجئہ وغیرہ۔ کیا ان کی
روایات کو ان کے مخصوص نظریات کے باوجود شرف قبول عطا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ چونکہ
یہ موضوع علم حدیث کے مہمات مباحث میں سے ہے اس لیے علماء نے اپنے مختلف
عہدوں میں جی بھر کر اس پر دائر تحقیق دی ہے۔ چنانچہ حافظ ابوبکر الخطیب بغدادی
رمطراز ہیں:

علماء میں اہل ہوی سے روایت لینے کے موضوع پر ایک سے زیادہ
مدارس فکر ہیں۔ سلفہ میں سے ایک جماعت اسے درست خیال
نہیں کرتی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کافر اور فاسق بالتمام کی

پوزیشن بھی کافر معاند اور فاسق عابد کی ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان کی روایت ناقابل قبول ہو اور کچھ کی رائے میں اہل اہوار کی روایت کو قبول کر لینا درست ہے بشرطیکہ وہ جھوٹ کو جائز نہ سمجھتے ہوں۔ فقہاء میں سے یہ امام شافعی کی رائے ہے۔ اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ اہل اہوار میں سے ان کی رائے قبول کر لی جائے جو ہوسنی و بدعت کے داعی نہ ہوں۔ دعاۃ کی روایت قابل احتجاج نہیں ہے۔ یہ امام احمد کی رائے ہے۔ مؤرخین اور متکلمین کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ سب اہل اہوار کی روایات قابل قبول ہیں چاہے وہ اپنے نظریات کی وجہ سے کفر ہی کے میدان میں ہوں۔

روایت و تحدیث میں تمام اہل اہوار میں روافض کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس اہمیت کی بنیادی وجہ ان کے وہ نظریات ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اُمت کے جمہور سے الگ ہوئے ہیں صحابہ کے بارے میں ان کا موقف علم کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے اور تقیہ کا عقیدہ بھی ان کی صداقت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر امام اعظم کا فیصلہ عبداللہ بن المبارک نے یہ بتایا ہے۔

امام اعظم سے ابو عصمہ نے دریافت کیا کہ اہل اہوار سے روایت کے بارے میں آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ سب اہل اہوار سے روایت لے سکتے ہو بشرطیکہ وہ عادل ہوں لیکن شیعہ سے روایت نہ لینا۔ کیونکہ ان کے عقیدے کی عمارت حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تضلیل پر ہے۔

ہم اسے نزدیک مسئلہ بھی دوسری اور تیسری صدی کے اختلافی مسائل میں سے ہے۔ اسی لیے حضرت امام مالک بھی اس مسئلہ میں امام اعظم کے ہم زبان ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ روافض سے روایت نہ کرو۔ مشہور محدث یزید بن ہارون کہتے ہیں ہر صاحب بدعت کی اگر داعی نہ ہو تو روایت لے لی جائے لیکن روافض سے روایت نہ لی جائے۔ شریک بن عبداللہ کی

ماتے ہے کہ جس سے تم ملو علم لے لو لیکن روافض سے علم نہ لو۔ عبداللہ بن المبارک نے عمر بن ثابت کا نام لے کر بتایا ہے کہ اس سے حدیث نہ لو کیونکہ یہ سلف کریم اکبر تھا لیکن یہ دوسری صدی کے محدثین کے افکار ہیں۔ تیسری صدی میں ان افکار کی بندشوں کو ڈھیلہ کرنے کی کوشش شروع ہوئی ہے اور رافضیوں کے بائے میں محدثین نے اپنا موقف بدل دیا۔ امام شافعی نے عام روافض کو اس پابندی سے نکال کر خاص خطابت تک اسے محدود کر دیا۔ اور فرمایا کہ ان سے روایت نہ لینی چاہیے۔ اس کے بعد محدثین کی عام سائے تمام اہل اہواء کے بائے میں بلا استثنا شیعہ قائم ہو گئی کہ

تقبل غیر الدعاء من اهل الاهواء فاما الدعاء فلا تقبل
اخبارہم۔^{۱۵}

ان میں جو داعی نہ ہوں ان سے روایت لی جائے داعی کی روایت نہ لی جائے۔

اسی کو محدثین کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے بلکہ حافظ ابن حبان بستی نے اس پر سب کا اتفاق نقل کیا ہے۔ حافظ ابن الصلاح نے اسی کو اعدل الاقوال قرار دیا ہے اور اس کے خلاف سوچنے کو بھی بارگاہِ محدثین میں گستاخانہ جرات بتایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

والقول بالمنع مطلقا مباعد للشائع عن المنة الحديث۔^{۱۶}

مطلقاً اسے روکنا اس راہ سے دور مہٹنا ہے جو ائمہ حدیث سے مشہور ہے

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ طے کیا گیا ہے اور جسے اعدل الاقوال کہا گیا ہے کیا واقعات اور حالات نے بھی اس کا ساتھ دیا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ خود بخارمی و مسلم نے دعا سے روایات لی ہیں چنانچہ حافظ عراقی نے لکھا ہے کہ بخارمی و مسلم نے دعا اہل اہواء کی روایات لی ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی میں بخارمی و مسلم کے ان راویوں کی فہرست دی ہے جن سے شیخین نے روایات لی ہیں اور نوبت بایں جارسید کہ کہنے والوں نے کہہ دیا۔

کتاب مسلم ملان من رواة الشيعة۔^{۱۷}

^{۱۵} تدریب الراوی ص ۲۱۸ - ^{۱۶} توضیح الافکار ج ۲ ص ۱۰۴ - ^{۱۷} اختصار علوم الحدیث ص ۹۹

^{۱۸} تدریب الراوی ص ۱۲۸

اور حافظ ابن الصلاح کو اس نظریہ کو کہ روافضیوں سے روایت نہ لینی چاہیے یہ کہہ کر مروج قرار دینا پڑا کہ فان كتبهم طافحة بالرواية عنهم محدثین کی کتابیں ان کی روایات سے اٹی پڑی ہیں۔ امام ذہبی نے بدعت کی تقسیم کے ذریعے محدثین کی صفائی پیش فرمائی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

بدعت کی دو قسمیں ہیں صغریٰ جیسے تشیع زیادہ یا کم مثلاً وہ حضرات جنہوں نے حضرت علی سے نبرد آزما ہونے والوں کے بارے میں لب کشائی کی ہے۔ یہ طبقہ تابعین میں بہت ہے اور ایسے ہی اتباع تابعین میں اگر ان کی روایات کو تشیع کی بنا پر رد کر دیا جائے تو حدیث کا بیشتر حصہ ختم ہو جائے گا اور بدعت کبریٰ جیسے رافضیوں کا مل اور اس میں غلو مثلاً ابو بکر و عمر کے دامن احترام کو ہاتھ لگانا اور لوگوں میں اس کا پروپیگنڈا کرنا۔ یہ قسم بلاشبہ ناقابل احتجاج ہے۔ مجھے اس قسم کے لوگوں میں کوئی بھی صادق مامون نظر نہیں آتا بلکہ جھوٹ ان کا فیشن اور تفریقہ اور نفاق ان کا شیوہ ہے۔

اگرچہ خود امام ذہبی نے بقول حافظ سیوطی ایک دوسرے موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ :
اس موضوع پر لوگ مختلف الخیال ہیں۔ کچھ کی رائے میں شیعہ سے روایت قطعاً منع ہے اور کچھ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے اور تیسری رائے یہ ہے کہ جو شخص ان کی حدیث کو جانتا ہو اس کے لیے جائز ہے اور دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے۔

بعد ازیں حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سیوطی نے شیعہ اور رافضی کی تشریح فرما کر محدثین کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ساری مساعی صرف اس لیے بروئے کار آئی ہیں کہ محدثین سے جو طے شدہ پالیسی کے خلاف عمل ہوا ہے اس کا مداوا ہو جائے لیکن ان مساعی اور کوششوں کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ کتابوں کی مدد سے شیعہ اور رافضی کی تشریح فرمائی ہے اور دوسری صدی کے محدثین مشاہدے

اور واقعات کے زور سے بتا رہے ہیں کہ :

فان اصل عقیدتہم تضلیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور عبداللہ بن المبارک نے آپ بیٹی سنائی ہے کہ فائزہ کان لیسب السلف اور یہی صورت حال امام مالک کی ہے۔

اس آخری دور میں شام کے مشہور فاضل نے محدثین کی اس موضوع پر صفائی کرتے ہوئے کھلے بندوں اعلان کر دیا ہے کہ محدثین نے جن اہل اہوار سے روایات لی ہیں وہ مبتدعین نہیں ہیں بلکہ مبتدعین ہیں۔ یعنی ہیں تو وہ اہل السنۃ مگر یار لوگوں نے ان کو بدعتی مشہور کر دیا ہے۔ میری مراد علامہ جمال الدین قاسمی ہیں۔ انہوں نے خاص اس موضوع پر الجرح والتعديل کے نام سے کتابچہ لکھا ہے جو مصر میں ۱۳۳۷ھ میں مطبع المنار نے شائع کیا ہے اور اس آخری دور میں مشہور محدث فاضل علامہ احمد محمد شاہ کی حدیث میں علمی خدمت اہل علم کے لیے سامان رشک ہے۔ الباعث الخبیث میں یہ کہہ کر معاملہ ہی صاف کر دیا ہے کہ کسی بھی مکتب فکر سے کوئی راوی تعلق رکھتا ہو روایت میں تو صرف راوی کی صداقت و امانت کا اعتبار ہو گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

العبوة فی الروایۃ بصدق الراوی وامانتہ والثقة

بدینہ، و خلقہ۔

روایت میں تو صرف راوی کی صداقت، امانت، دین میں

ثقاہت اور اخلاق کا اعتبار ہو گا۔

غور فرمائیے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ امام اعظم نے یہ کہہ کر

الا الشیعة فان اصل عقیدتہم تضلیل اصحاب محمد

صلی اللہ علیہ وسلم۔

دینی ثقاہت اور اخلاقی امانت کو چیلنج کیا تھا۔ ان مساعی کے باوجود اس کا حل اب تک کوئی نہ بتا سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ خواہ کچھ کہا جائے مگر واقعات کی دنیا میں تحقیق کی بے لاگ عدالت کا فیصلہ البوحیفہ کے ساتھ ہے۔

لیکن امام اعظم کا یہ فیصلہ صرف ان کے بارے میں ہے جن کے تشیع کی عمارت اصحاب نبوت کی تفصیل کی اساس پر قائم ہے۔ اس تصریح کی ضرورت بھی حضرت امام کو اس لیے پیش آئی کہ ان کے گرد و پیش میں ایسا طبقہ موجود تھا جیسا کہ عبداللہ بن المبارک کی تصریح سے معلوم ہو چکا ہے اور اس طبقہ کے علاوہ اس دور میں ایسا بھی طبقہ تھا جو صرف حضرت علی کے لیے صحابہ میں برتری کا نظریہ رکھتا تھا جیسا کہ حافظ سیوطی نے تدریب میں بتایا ہے اور ایسا طبقہ تھا جو حضرت علی اور حضرت معاویہ کے سیاسی جھگڑوں میں حضرت علی کا طرفدار تھا جیسا کہ ذہبی نے تصریح کی ہے ان طبقوں کی روایت سے امام ابوحنیفہ نے نہیں دکا ہے امام اعظم نے جس دکھتی رگ پر انگشت رکھ کر بتایا ہے وہ یہ اور صرف یہ ہے کہ :

اصل عقیدتہم تفصیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اور بس۔ اس عقیدے کا حامل طبقہ یقیناً امام اعظم کے زمانے میں موجود ہے اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے دوسری صدی کے محدثین کو حضرت علی کی بہت سی حدیثوں سے دست بردار ہونا پڑا حالانکہ حضرت علی کے علم، ان سے محبت اور ان سے عقیدت کا برابر تقاضا یہی رہا کہ ان کے بارے میں جو کچھ بھی سنا جائے اس کی تصدیق کی جائے لیکن یہاں حضرت علی کی عقیدت و محبت کا رسول کی عقیدت و محبت اور اس کی حدیث کی عظمت سے مقابلہ تھا۔ اس کی محبت کا تقاضا یہ اور صرف یہ تھا کہ اس کی جانب کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ ایمان کو سچانے کے لیے احتیاط کی راہ یہی تھی کہ چھان بین کی جائے۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں :

قاتل اللہ الشیعة فانہم افسدوا کثیراً من علمہ بالکذب

علیہ و لہذا تجد اصحاب الحدیث من الصیحح لا یتمدون من

حدیثہ الا ما کان من طریق اہل بیئہ واصحاب عبد اللہ

بن مسعود۔

اللہ شیعہوں کا برا کر کے کہ انہوں نے حضرت علی کے علم کا برا حصہ ان

پر جھوٹ بول کر محدثین کی نظر میں مشتبہ کر دیا ہے اس لیے صحیح

حدیث کے متلاشی محدثین بجز حضرت علی کے گھر والوں اور عبداللہ بن

مسعود کے اصحاب کی وساطت سے آئی ہوئی حضرت علی کی حدیثوں پر
اعتماد نہیں کرتے ہیں بلکہ
اسی دور میں مشہور محدث حماد بن سلمہ نے یہ انکشاف کیا کہ:
اخبرني شيخ من الرافضة انهم كانوا يجتمعون على
وضع الاحاديث -

مجھے رافضیوں کے ایک سربراہ نے بتایا ہے کہ وہ حدیثیں بنانے کے
لیے باقاعدہ اجتماعات کرتے تھے لے

اور آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن حافظ زبلی نے نماز میں جہر بسم کے موضوع پر خالص محدثانہ
نقطہ نظر سے تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنے کے
موضوع پر جس قدر روایات آئی ہیں ان کا سرچشمہ ہی شیعہ ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:
وغالب احاديث الجهر تجد في روايتها من هو منسوب الى
الشيعة. ۳

بسم اللہ بآواز بلند پڑھنے کی زیادہ روایات شیعہ اولیوں کی وساطت سے
آتی ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ نماز میں بسم اللہ کے جہر پر اخبار آحاد کا زیادہ ذخیرہ وضعی اور بناوٹی ہے
اور بناوٹی ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

لان الشيعة ترى الجهر وهم اكذب الطوائف فوضعوا في
ذلك احاديث -

کیونکہ نماز میں بسم اللہ بآواز بلند پڑھنے کے قائل ہیں اور شیعہ گروہوں
میں سب سے زیادہ دروغ گو ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر
حدیثیں بنالی ہیں۔

ان تصریحات سے آپ امام اعظم کے اس دور رس فکر کی صداقت کا اندازہ لگا سکتے

۱۔ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۶۔ ۲۔ الباعث الحثيث ص ۸۴

۳۔ نصب الراية ج ۱ ص ۱۸۲۔

میں اور آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس میں تھوڑا سا تسامع بہت بڑی بلا کا سامان ہے۔

بحرہ و تعدیل رواد حدیث اور امام اعظم

علامہ جزائری نے توجیہ النظر میں حدیث کے سلسلے میں ۵۲ قسم کے علوم کی نشاندہی کی ہے ان ہی علوم کے برتنے پر کہا جاتا ہے کہ جو شخص بھی حدیث کے مختلف طرق و اسانید، ان کے راویوں کی راست گفتاری اور ان پر بحرہ و تعدیل کی داستان پڑھے گا۔ اس کو حدیث کی عظمت کا اقرار کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہ امر آخر ہے کہ کوئی شخص مطالعہ کی محنت سے پہلو ہتی کر کے خواہ مخواہ انکار کر ڈالے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ محدث کی مثال ایک صراف کی سی ہے۔ بسا اوقات روپیہ کی شکل و صورت اور آواز تک میں فرق نہیں ہوتا لیکن صراف کی چٹکی اس کا کھوٹ بتا دیتی ہے۔ یہ کھوٹ بنانے کا علم فن حدیث میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی کی مدد سے علماء نے صحیح احادیث کو غلط سے اور قوی کو ضعیف سے چھانٹ کر علیحدہ کیا اور اس سلسلے میں علماء نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اسی کا نام علم بحرہ و تعدیل ہے۔ اسے ہی علم میزان رجال یا علم رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر راویوں کی امانت، ثقاہت، عدالت اور قوت ضبط کو بتایا جائے تو یہ علم تعدیل ہے اور اگر اس کے برعکس ان کے کذب، غفلت یا نسیان وغیرہ سے بحث کی جائے تو یہ علم البحر ہے۔ امام حاکم معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

وہما فی الاصل نوعان کل نوع منهما علم براسہ

اصل میں یہ دو قسمیں ہیں ان میں سے ہر قسم مستقل علم ہے۔

علم حدیث کے طفیل میں یہ عظیم الشان علم وجود میں آیا ہے اور اقوام عالم کی تاریخ میں اس طرح کے تنقیدی علم کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اس فن کی ابتداء کیوں ہوئی؟ حافظ سیوطی انکاوی فی تاریخ السنن میں رقمطراز ہیں کہ:

چونکہ حدیث نبوی صدر اقول میں سفینوں سے نہیں بلکہ لوگوں کے سینوں سے لی جاتی تھی اس لیے احادیث کی حفاظت اور ان کو

غلط سے پہچانے اور مقبول میں تمیز کی خاطر ہرج کو جائز کیا گیا۔
حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

لوگوں نے یہ علم صحابہ سے لیا اس کے یاد کرنے اور
اس کے پہنچانے میں اوقات لگاتے اور جانیں کھپاتیں لیکن صحابہ کے
بعد ہر دور میں ایسے لوگ اس میں داخل ہو گئے جن میں اس کی صداقت
اور قابلیت نہ تھی۔ انہوں نے نقل روایات میں غلطیاں کیں اور کچھ نے
عمداً خلاف واقعہ نقل میں دست اندازی کی۔ اس راہ سے حدیث ایک
بڑی آفت سے دوچار ہو گئی۔ اللہ سبحانہ نے اس وقت ایسے ارباب
فکر میدان میں روئے کئے جنہوں نے حدیث نبوت کی چھان بین اور
اس کی مدافعت کا کام کیا۔ خیر خواہی کے جذبہ سے راویوں پر کلام
کیا۔

حافظ سخاوی نے اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :
پہلی صدی ہجری جو صحابہ و کبار تابعین کے دور میں گزری۔ اس دور
میں حارث اور مختار کذاب جیسے اکاذب کا شخص کو چھوڑ کر کسی
ضعیف الروایت شخص کا تقریباً وجود نہ تھا۔ پہلی صدی گزر کر جب
دوسری صدی آئی تو اس کے اوائل میں اوساط تابعین میں ضعفا کی
ایک جماعت پیدا ہوئی جو زیادہ تر حدیث کو زبانی یاد رکھنے اور اپنے
کوڑے ذہن میں اس کو محفوظ کرنے کے لحاظ سے ضعیف سمجھی گئی چنانچہ
اُپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ موقوف کو مرفوعاً نقل کر جاتے ہیں کثرت
سے ارسال کرتے ہیں اور ان سے روایت میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں
جیسے ابو ہارون عبدی وغیرہ۔ پھر جب تابعین کا آخری دور آیا یعنی ۱۵۰ھ
کے قریب قریب۔ تو ائمہ کی ایک جماعت نے توثیق و تضعیف کے
لیے زبان کھولی۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ ما را ئت الکذب من

جابر الجعفی میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا منہاں دیکھا۔ اور امام عثمٰش نے ایک جماعت کی تضعیف اور دوسری کی توثیق کی۔ اور شعبہ کے رجال کے بارے میں غور و فکر سے کام لیا۔ یہ بڑے محتاط تھے اور بجز ثقہ کے تقریباً کسی سے روایت نہ کرتے تھے۔ امام مالک کا بھی یہی حال تھا اور اس دور کے ان لوگوں میں سے کہ جب وہ کسی کے بارے میں کچھ کہہ دیں تو ان کی بات مان لی جاتی ہے معمر، ہشام، دستوائی، اوزاعی، سفیان ثوری، ابن الماجہ، حماد بن سلمہ اور لیث وغیرہ ہیں۔ پھر ان کے بعد دوسرا طبقہ ابن المبارک، ہشیم، ابواسحاق فزاری، معانی بن عمران، بشر بن المفضل اور ابن عیینہ وغیرہ کا ہے۔ پھر ان ہی کے ہم زبان ایک اور طبقہ ابن علیہ، ابن وہب اور وکیع جیسے حضرات کا ہے۔ بعد کو ان ہی کے دور میں دو ایسے شخص جو حدیث کے حافظ اور اس فن میں حجت گزے ہیں۔ تنقید رجال کے لیے اٹھے یہ سحیح بن سعید القفطان اور عبد الرحمن بن مہدی ہیں۔

علامہ جزائری نے بھی اس پر تفصیلی تبصرہ فرمایا ہے لے اور حافظ شمس الدین السخاوی نے الاعلان بالتوہیح لمن ذم التاریخ میں علم الجرح والتعدیل کی ایک مورخانہ دستاویز ترتیب دی ہے۔ اس تاریخی ترتیب میں جن ائمہ جرح و تعدیل کا تذکرہ کیا ہے ان کے تعارف کے لیے حافظ موصوف نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

اما المتکلمون فی الرجال فخلق من نجوم الہدی ومصابیح الدجی المستضاء بہم۔

ان اکابر میں جن کو نجوم الہدی اور مصابیح الظلم کہا ہے۔ سب پہلے مقدمہ ابن عدی کے حوالہ سے اس فن کی امامت کے سلسلے میں صحابہ میں سے فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، ابن عباس، عبد اللہ بن سلام، عبادۃ بن الصامت اور عائشہ صدیقہ کا نام لیا ہے۔ پھر اکابر تابعین میں امام شعبی، امام ابن سیرین، سعید بن جبیر اور سعید بن المسیب کا تذکرہ کیا ہے اور اس

کے بعد لکھا۔

فلما كان عند آخر عصر التابعين وهو حدود الخمسين و
مائة تكلم في التوثيق والتجريح طائفة من الامة
فقال ابو حنيفة ما رأيت اكذب من جابر وضعف
الاعمش جماعة ووثق آخرين ونظر في الرجال شعبة له

اور اس کے بعد ان سب کا تذکرہ کیا ہے جو آپ فتح المغیث کے حوالہ سے پہلے پڑھ چکے ہیں
اور یہ بھی اضافہ فرمایا کہ :

پھر یحییٰ بن سعید القطان اور عبد الرحمن بن مہدی کے بعد امام شافعی،
یزید بن یارون، ابو داؤد الطیالسی، عمید الرزاق، القریابی، ابو عاصم النبیل
وغیرہ ہوئے ہیں اور ان کے بعد حمیدی، القعنبی، ابو عبیدہ یحییٰ اور
ابو الولید الطیالسی نے اس میں کام کیا ہے۔

اس تاریخی دستاویز میں حافظ سخاوی نے صرف یہ نہیں بتایا ہے کہ آخر عصر تابعین میں
جرح و تعدیل کے فن میں امامت کا مقام امام اعظم کو حاصل ہے بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ امام
ابو حنیفہ کی ذات گرامی تابعی ہونے کی حیثیت میں توثیق و تجریح کے میدان میں صرف تعارفی
منہیں بلکہ ایک عظیم الشان استدلالی شخصیت ہے اور ائمہ جرح و تعدیل میں ان کو مرکزی حیثیت
حاصل ہے چنانچہ حافظ سخاوی کی یہ تصریح ہے۔

تکلم فی التوثیق والتجریح طائفة من الامة فقال ابو حنيفة -

راویوں کی توثیق و جرح پر ائمہ کی ایک جماعت نے لب کشائی کی،

چنانچہ ابو حنیفہ نے فرمایا -

اسی بنا پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں جرح و تعدیل پر امام اعظم کے ان دو فقرہ کو
بالاسناد کتاب العلل میں روایت کیا ہے۔

حدثنا محمود بن غیلان قال حدثنا ابو یحییٰ الحمافی قال سمعت

ابا حنيفة یقول ما رأیت احداً اکذب من جابر الجعفی

ولا فضل من عطاء

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا اور عطار سے زیادہ فاضل کوئی نہیں دیکھا ہے لے

اس روایت کا تعلق راویوں کی جرح و تعدیل سے ہے اور امام ترمذی نے اسے سند کے طور پر پیش کیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک امام اعظم کا شمار ان ائمہ میں ہے جن کی بات جرح و تعدیل کے موضوع پر سند ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظم کے مئمہ سے نکلے ہوئے تعدیل میں عطار کے متعلق اور جرح میں جابر جعفی کے متعلق دو فقرے علم حدیث میں دو اہم فنون کی بنیادی اینٹ ہیں۔ پہلا فقرہ یعنی مارایت افضل من عطاء بن ابی سراج علم التعدیل کی اور دوسرا فقرہ یعنی مارایت اکذب من جابر الجعفی علم الجرح کی۔ اور تعدیل بھی معمولی روادہ کی نہیں بلکہ امام فن کی فرمائی ہے اور صرف امام ترمذی نے نہیں بلکہ امام بیہقی نے بھی امام ابو حنیفہ کی اس موضوع پر استدلالی حیثیت کو تسلیم کیا ہے چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب المدخل میں بسند متصل عبد الحمید الحمافی کے حوالہ سے لکھا ہے:

سمعت اباسعد الصنعانی وقام الی ابی حنیفۃ فقال یا ابا حنیفۃ
ما تقول فی الاخذ عن الثوری فقال اکتب عنه فانہ
ثقتہ ما خلا احادیث ابی اسحاق عن الحارث و حدیث
جابر الجعفی۔

میں نے ابوسععد کو امام ابو حنیفہ سے یہ کہتے سنا ہے کہ آپ کی سفیان
ثوری سے روایت کے بارے میں کیا رائے ہے؟ فرمایا ان سے
حدیثیں لکھو کیونکہ وہ ثقہ ہیں لیکن ان کی وہ حدیثیں نہ لکھو جو
بحوالہ ابواسحاق از حارث ہیں۔ اور حدیث جابر جعفی بھی نہ لکھو لے

حافظ ذہبی نے ”مذکرۃ الحفاظ میں ابوالزناد عبد اللہ بن ذکوان کی تعدیل کرتے ہوئے
جہاں دوسرے اکابر نقاد کے تعدیلی کلمات درج کیے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابوالزناد
ربیعہ سے زیادہ عالم ہیں۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں ان سب سے

پہلے امام اعظم کے یہ تعدیلی کلمات نقل کیے ہیں :

ما رأیت ربیعۃ و ابا الزناد و ابوالنناد افقہ
میں نے ربیعہ اور ابوالنناد و دونوں کو دیکھا ہے لیکن ابوالنناد زیادہ
فقیہ ہیں۔

مشہور امام جعفر صادق سے کون واقف نہیں ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کی تعدیل کرتے ہوئے
جہاں یحییٰ بن معین اور ابوحاتم سے ان کی توثیق نقل کی ہے وہاں امام اعظم کے یہ تعدیلی
کلمات بھی نقل فرماتے ہیں :

عن ابی حنیفۃ ما رأیت افقہ من جعفر بن محمد
اسی بنا پر ہمیشہ اس فن کے اماموں کو جرح و تعدیل کے موضوع پر امام اعظم کے سامنے
سر تسلیم خم کرنا پڑا ہے چنانچہ حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں :

اعلم ان الامام ابا حنیفۃ قد قبل فتولہ فی الجرح و

التعدیل و تلقوا عنہ علماء هذا الفن و عملوا بہ

جرح و تعدیل کے موضوع پر امام اعظم کی بات قبول کی گئی ہے اور
اس فن کے علماء نے اسے اپنا باب ہے اور اس پر عمل پیرا ہوئے ہیں۔

یہی جابر جعفی جن کے بارے میں امام ترمذی نے کتاب العلل میں امام اعظم سے یہ فیصلہ نقل
کیا ہے کہ ما رأیت اکذب من جابر۔ دوسرے ائمہ کی اس کی نسبت آراء کو پیش نظر
رکھ کر امام ابو حنیفہ کی قوت فیصلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ امام ثوری کہتے ہیں کہ ما رأیت
اودع فی الحدیث من جابر۔ میں نے جابر سے زیادہ حدیث میں محتاط نہیں دیکھا۔ امام
شعبہ کہتے ہیں کہ جابر اگر حدیث میں سماع، تحدیث اور انباء کی تصریح کرے تو قابل
اعتبار ہے۔ ایک بار امام ثوری نے شعبہ سے کہا کہ تم جابر کے بارے میں کچھ کہو گے تو پھر
میں تمہارے متعلق کچھ کہوں گا۔

ذرا غور فرمائیے کہ جابر کی توثیق کون لوگ کر رہے ہیں اور یہ کس نشان کے اجلہ فن ہیں۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابوالنناد۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ۳۔ الجواہر المصنیہ ج ۱ ص ۳۰

۴۔ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۶۶۔

لیکن تحقیق کی بے لاگ عدالت نے جو فیصلہ دیا ہے وہ یہی ہے کہ جابر جعفی کی روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ لیث بن ابی سلیم فرماتے ہیں کہ کذاب ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں کہ متروک ہے امام ابو داؤد نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے نزدیک قوی نہیں ہے۔ جبریر بن عبد الحمید اور یحییٰ المحابر کی رائے سے کہ غالی قسم کا شیعہ تھا اور حضرت علی کی رحبت کا معتقد تھا۔ سید الحفاظ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ جابر کچھ نہیں قطعاً کذاب تھا بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ ابو تھا اور رافضی شتم اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم رافضی ہے حضور انور کے صحابہ کا گستاخ ہے صرف جابر جعفی نہیں بلکہ دوسرے راویوں کے متعلق بھی امام اعظم سے تنقیدات منقول ہیں جن کو محدثین کے یہاں شرف قبول حاصل ہے مثلاً زید بن عیاش کے بارے میں امام اعظم اور امام مالک کے درمیان اختلاف ہے۔ امام اعظم اسے مجہول قرار دیتے ہیں لیکن امام مالک نے اس کے حوالہ سے مؤطا میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی وہ روایت نقل کی ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کججور اور جھوٹے کو ملا کر بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ بعد کو اگرچہ بعض محدثین نے امام مالک کی تقلید میں اس روایت کو صحیح قرار دیا لیکن خود امام بخاری اور امام مسلم نے اس بارے میں امام ابو حنیفہ کے فیصلے سے موافقت کی ہے چنانچہ محدث حاکم نے یہ حدیث درج کر کے امام بخاری اور امام مسلم کی جانب سے اس حدیث کی تخریج نہ کرنے پر معذرت اس طرح پیش کی ہے :

والشَّيْخَانِ لَمْ يَجْزِ جَاهُ لِمَا خَشِيَ مِنْ جَهَالَةِ زَيْدِ بْنِ عِيَاشٍ
يُشْخِصُ نَفْسَ زَيْدِ بْنِ عِيَاشٍ كَمَا يُهْوَلُ بَوْنَهُ كَمَا أَنْدِيشُ عَنْهُ
رَوَايَتُ مِنْهُ لَا يَكُنْ

حافظ ابن الہمام نے اسی موضوع پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ
امام اعظم بغداد شریف لاسے وہاں کے ارباب روایت نے
اس مسئلہ میں کہ رطب کی بیج تھر سے جانتے ہیں۔ یہ کہہ کر امام اعظم کے
خلاف آواز اٹھائی کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے۔ ارباب
روایت نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ بتائیے آپ کججور

کی بیع تمر سے کیے جائز بتاتے ہیں؟ امام صاحب نے جواباً فرمایا کہ دو حال سے خالی نہیں کہ رطب تمر ہے یا نہیں اگر ہے تو بیع جائز ہے اگر تمر بالتمر حدیث میں اس کی اجازت ہے اور اگر تمر نہیں ہے تو پھر بھی اس کی بیع جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے - اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم - ارباب روایت نے لا جواب ہو کر حدیث سعد پیش کی جس میں حضور نے بیع الرطب بالتمر سے منع فرمایا ہے - امام اعظم نے جواباً فرمایا کہ اس حدیث کا مدار زید بن عیاض ہے - اس کی حدیث قابل پذیرائی نہیں ہے -

معار الرجال اور امام اعظم

محدثین لکھتے ہیں کہ اسماء الرجال کا علم حدیث کے علم کا نصف ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے روح اللقیہ میں امام علی بن المدینی سے نقل کیا ہے اور وجہ اس کی یہ بتائی ہے کہ حدیث ن اور سند کے مجموعے کا نام ہے اور سند کا تعلق راویوں سے ہے اور راویوں ہی کے مات کی واقفیت علم اسماء الرجال ہے - اور راویوں پر جرح و تعدیل ایک نہیں بلکہ دو بیم المرتبت اور جلیل القدر فنوں کے مجموعے کا نام ہے - نقد و نظر اس کی جان ہے - اگر شخص کی ذات کو اس فن میں استدلالی حیثیت سے مان لیا جاتا ہے تو اس کا واضح یفظوں مطلب یہ ہے کہ اس کی رجال میں معرفت کی پختگی اور راویوں کے احوال سے واقفیت کو تسلیم لیا گیا ہے کیونکہ علم الجرح میں جرح اور علم التعدیل میں معدل ہونے کی بنیاد ہی شرط ایہی ہے - علماء نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے - تاج الدین السبکی، علامہ بدر بن جماعة، حافظ ابن حجر نے اس کی تصریح کی ہے کہ جو شخص جرح و تعدیل کے اسباب و وسائل سے غف نہ ہو اس کی کوئی رائے اس فن میں کسی درجہ میں قبول نہ کی جائے گی اور حافظ ذہبی نے مابہ :

وہ عالم و عارف جو حدیثوں کے راویوں کا تذکرہ یا ان پر جرح کرتا ہے

نقادِ نجیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تلاش و جستجو
میں جان نہ کھپائے اور بہت زیادہ مذاکرہ، شب بیداری، تفتہ
اور فہم و فراست کے ساتھ درنداری، پارسائی اور انصاف سے
ہم آغوش نہ ہو سکے۔

دوسرے علمائے نے بھی اسی قسم کی تصریحات پیش فرمائی ہیں۔

اہل فن کی یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ ناقد کے لیے راویوں کے حالات سے واقفیت ضرور
ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ جس پر تنقید کر رہا ہے یہ جانے کہ کون ہے کیا کرتا ہے، اس کا چال چلن
کیسا ہے، اس کی سمجھ بوجھ کس درجہ کی ہے، ثقہ ہے یا غیر ثقہ، عالم ہے یا جاہل، ذہین ہے
یا غبی، یادداشت کا کیا حال ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے۔ کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے وغیرہ
وغیرہ۔ جب تک ان بنیادی امور سے پوری واقفیت نہ ہو کوئی شخص ناقدین میں شمار نہیں
ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ اگر امام اعظم کا شمار معدلین رجال میں ہے اور نہ ہونے کی وجہ سے کیا
ہے جبکہ محدثین نے ان کے اس مقام کو تسلیم کیا ہے تو اس کے باور کرنے میں کس کو تاثر
ہو سکتا ہے کہ امام اعظم کو اسماء الرجال میں اونچا مقام حاصل تھا۔ امام اعظم اس موضوع پر بھی بعدین
آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ حافظ عبد القادر قرشی نے ابوسلیمان الجوزجانی کے حوالہ
سے مشہور امام حدیث حماد بن زید جو عبد الرحمن بن مہدی اور علی بن المدینی کے استاد ہیں
ان کا جو بیان لکھا ہے اس سے امام اعظم کی رجال شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سمعت حماد بن زید یقول ما عرفنا کنیۃ عمرو بن دینار
الا بابی حنیفۃ کنا فی المسجد الحرام والبوحنیفۃ مع عمرو
بن دینار فقلنا لا یا ابا حنیفۃ کلمہ یکدثنا فقال یا ابا
محمد حدیثہم۔

میں نے حماد بن زید سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہمیں عمرو بن دینار کی
کنیت کا علم نہ تھا۔ ابوحنیفہ کے ذریعہ ہمیں ان کی کنیت کا علم ہوا
ایک بار ہم مسجد حرام میں تھے ابوحنیفہ عمرو بن دینار کے پاس ہی

کھڑے تھے ہم نے امام صاحب سے کہا کہ آپ ان سے کہتے کہ حدیث بیان کریں آپ نے ان سے فرمایا کہ اے ابو محمد ان کو حدیث سناؤ۔
امام حماد بن زید کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو عبدالرحمن بن مہدی کا یہ بیان پڑھیے فرماتے ہیں کہ:

ہیں نے ان سے زیادہ سنت کا جانکار کوئی نہیں دیکھا ہے۔
حافظ ابن عبدالبر نے سلیمان بن حرب کے حوالہ سے جہاں ان کے متعلق یہ انکشاف کیا ہے کہ حماد کہتے ہیں بخدا مجھے ابو حنیفہ سے محبت ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ:
روی حماد بن زید عن ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً۔^۱

ان احادیث کثیرہ کی صحیح تعداد بھی سن لیجئے۔ امام عجمی فرماتے ہیں کہ حماد بن زید کو چار ہزار حدیثیں یاد تھیں اور یہ آپ پہلے امام حسن بن زید کی زبانی سن چکے ہیں کہ امام اعظم کی مجموعی مرویات کی تعداد چار ہزار ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ امام ابو حنیفہ کی ساری مرویات حماد بن زید روایت کرتے تھے۔ واضح ہے یہ عمرو بن دینار ہی ہیں جن کے متعلق امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن دینار کی حدیثیں بیان کرنے کے لیے مجھے تحدیث کے لیے مقرر فرمانے والے بھی امام اعظم ہیں۔^۲ حماد بن زید کہتے ہیں کہ ہم عمرو بن دینار کے پاس ہوتے جب امام اعظم تشریف لاتے تو عمرو بن دینار ہمیں چھوڑ کر ان کی طرف سرپاٹوجھ ہو جاتے ہم امام اعظم سے پوچھتے وہ ہم سے حدیثیں بیان کرتے۔^۳

تاریخ رجال میں امام اعظم کی مہارت اور برتری کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے جو داؤد بن الجحر نے بتایا ہے کہ امام اعظم سے پوچھا گیا کہ احرام والے کو اگر تہ بند نہ ملے تو کیا شلوار پہن سکتا ہے فرمایا ہرگز نہیں بلکہ اسے تہ بند باندھنا چاہیے۔ پوچھا اگر اس کے پاس تہ بند نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا شلوار فروخت کرے اور تہ بند خرید لے۔

پوچھنے والے نے کہا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

المحرم یلبس السراویل اذا لم یجد الاذار

احرام والا شلوار پہنے جب اسے تہ بند دستیاب نہ ہو۔

۱۔ الجوامع المفضیہ، ۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۲۵-۳۲۶ الانقار ص ۱۳۰-۱۳۱، ۲۔ شہ اوہنج ۱ ص ۶۱۔

امام اعظم نے جواب میں فرمایا کہ :

لَمْ يَصِحْ فِي هَذَا عِنْدِي عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ -

میرے نزدیک اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے۔

اور فرمایا کہ ہمارے نزدیک تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت یہی ثابت ہے کہ حضور انور نے احرام والے کو شلوار پہننے سے منع فرمایا۔

کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو کی راویوں پر نظر ہو اور اسانید و طرق کا پتہ ہو اس لیے امام اعظم کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ امام اعظم تاریخ رجال سے پورے طور پر واقف تھے۔ امام مالک سے جب اس حدیث کے بارے میں یہی سوال کیا گیا تو امام مالک کا جواب یہ تھا :

لَمْ أَسْمَعْ بِهَذَا وَلَا أَرَىٰ أَنَّ يَلِيسَ الْمَحْمُودِ سَرَّادِيلَ
میں نے یہ حدیث نہیں سنی ہے اور احرام والے کے لیے میری رائے میں شلوار پہننے کی گنجائش نہیں ہے۔

الغرض امام مالک اور امام ابو حنیفہ دونوں ہی احرام والے کے لیے شلوار پہننے کے جواز کے قائل نہیں ہیں لیکن حدیث کی حد تک ایک بار ایک سا فرق ہے اور وہ یہ کہ امام مالک حدیث کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی نہیں۔ اور نہ سننا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں اسی لیے حافظ ابن حجر عسقلانی کو امام مالک کی جانب سے یہ معذرت پیش کرنے کا خیال آگیا۔

کان حدیث ابن عباس لَمْ يَبْلُغْ
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کو یہ حدیث نہیں پہنچی تھی۔
برخلاف امام اعظم کے کہ انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے یہ حدیث سنی نہیں ہے۔

۱۔ الانتقاء۔ ۲۔ ادبہ المسالک مع موطا ج ۳ ص ۳۱۲۔

۳۔ فتح الباری ج ۴ ص ۴۶۔

بلکہ فرمایا ہے:

لَمْ يَصِحْ فِي هَذَا عِنْدِي عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اور دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک میں بے خبری اور دوسری میں باخبری کا پتہ ان کے لَمْ یصح کہنے سے چلتا ہے۔ اس سے عارف عیاں ہے کہ حدیث تو موجود ہے لیکن اس کی صحت کا جو معیار سی ہیما نہ مقرر ہے اس پر پوری نہیں اترتی ہے۔ کیونکہ محدثین کے یہاں عدم صحت اس کو مستلزم نہیں ہے کہ گھڑی ہوئی اور موضوع ہے۔ علامہ زرکشی نے نکت علی ابن الصلاح میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدد اور نتائج الافکار میں اور ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں تصریح کی ہے اور باخبر ہو کر روایت کی عدم صحت کا اعلان فنکار ہونے کی نشانی ہے۔ اسی بنا پر اس حدیث پر علی الاطلاق امام احمد کے سوا کسی نے عمل نہیں کیا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

قال القسطنطینی اخذ بظاهر هذا الحديث احمد فاجاز بسنن الخف

والسراويل ثمم الذي لا يوجب النعيم والادار على ما

لهما واشترط الجمهور قطع الخف وفتح السراويل -

قرطبی فرماتے ہیں اس حدیث کے ظاہر پر امام احمد نے عمل کیا ہے انہوں نے خف اور شلوار کے پہننے کو بھی ہوں جائز سمجھا ہے لیکن جمہور نے خف کے لیے قطع اور شلوار کے لیے فتق کی شرط لگائی ہے۔

بہر حال امام اعظم ابو حنیفہ علم الجرح والتعديل کی طرح اسما والرجال کے فن میں کہتے روزگار تھے۔

تحمل روایت حدیث اور امام اعظم

امام اعظم نے علم حدیث کے ہر شعبے میں خاص رہنمائی فرمائی ہے اور مستقبل میں جب کہ علوم و فنون میں بہار آنے والی تھی آپ نے راستے کے نشانات کا کچھ اس انداز سے پتہ دیا ہے کہ

بعد میں آنے والوں نے ان ہی بتائے ہوئے نشانات پر پوری عمارت قائم کی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے جیسا کہ حافظ ابن حزم نے بتایا ہے کہ اقوام دنیا میں کسی کو اسلام سے پہلے یہ توفیق میسر نہیں ہوئی ہے کہ اپنے پیغمبر کی باتیں صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکے یہ شرف صرف امت اسلامیہ کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کو صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کیا ہے آج روئے زمین پر کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریق پر پیش کر سکے اس کے برعکس اسلام نے اپنے رسول کی سیرت کا ایک ایک شوشہ پوری صحت و اتصال کے ساتھ محفوظ کیا۔ اور صرف اس سرمایہ علمی کی حفاظت ہی نہیں بلکہ اس علمی سرمایہ کو لگے پہنچانے، ایک دوسرے سے اسے حاصل کرنے کے طرق بھی مقرر فرمائے ہیں۔ چنانچہ اسی کو محدثین کی اصطلاحی زبان میں تحمل روایت کہتے ہیں۔

تحمل روایت کے طرق

تحمل روایت کے لیے ارباب روایت نے آٹھ صورتیں مقرر فرمائی ہیں۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں :

الاحذ للحدیث وتحملہ عن الشیوخ ثمانية اقسام ۱۰

پھر ان طرق سے حاصل کردہ احادیث کو بیان کرنے کے لیے تعبیر کا بھی ایک خاص پیمانہ مقرر کیا ہے۔

محدثین نے تحمل روایت کی جو آٹھ صورتیں بتائی ہیں یہ ہیں۔ سماع، عرض، اجازہ، منادلہ، مکاتبتہ، اعلام، وصیۃ، وجاہہ۔

سماع و عرض

سماع یہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے مشافہتہ احادیث سنے چاہے استاد اپنے حافظہ کے بھر دسم پر زبانی سنائے یا پھر کتاب سے دیکھ کر سنائے۔ لکھائے یا نہ لکھائے۔ چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں :

سماع الشیخ وهو املاء وغیره من حفظ و من کتاب لہ
حافظ زین الدین عراقی فرماتے ہیں :

سواء احدث من کتابہ او من حفظہ باملاء وبغیر
املاء۔ ۲

عرض یہ ہے کہ شاگرد پڑھے اور اُستاد سنے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :
القرائة على الشيخ حفظا او من كتاب وهو العرض
عند الجمهور۔ ۳

سماع ہو یا عرض ان دونوں میں اس موضوع پر تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان دونوں طریقوں
سے روایت کرنا صحیح ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں برابر ہیں یا ان دونوں میں
اعلیٰ و ادنیٰ کی نسبت ہے۔

جمہور محدثین نے سماع کو ارفع اقسام قرار دیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ
میں، حافظ زین الدین عراقی نے الفیہ میں، امام نووی نے تقریب میں، حافظ ابن کثیر نے
اختصار علوم الحدیث میں اور حافظ سیوطی نے تدْرِیب میں اس کی تصریح کی ہے لیکن اس
موضوع پر دوسری صدی کے محدثین کی آراء ان بزرگوں سے مختلف ہیں۔ دوسری صدی
میں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام تیب بن سعد، امام ابن ابی ذئب، امام شعبہ، امام یحییٰ
بن سعید الانصاری، امام عبد العزیز بن جبریل، امام سفیان ثوری اور امام سعید بن ابی عروبہ
جیسے اساطین اُمت کی لئے ہیں کمال روایت کی دوسری صورت یعنی شاگرد پڑھے اور اُستاد
سنے جسے قراءۃ علی الشیخ اور عرض کہتے ہیں ارفع اقسام ہے۔ اس سلسلے میں محدثین کی
تصریحات یہ ہیں۔

حافظ سیوطی نے امام بیہقی کی مدخل کے حوالہ سے مکی بن ابراہیم کا بیان درج کیا ہے :

ابن بربیع، عثمان بن الاسود، خطلہ بن ابی سفیان، طلحہ بن ابی سفیان،
طلحہ بن عمرو، امام مالک، محمد بن اسحاق، سفیان ثوری، ابو حنیفہ، ہشام
بن عروہ، ابن ابی ذئب، سعید بن ابی عروبہ، المنشی بن الصباح،

ان سب کا کہنا ہے کہ تمہارا استاد تمہارے سامنے پڑھے اور تم سنو لے
حافظ ابو بکر الخطیب نے مکی بن ابراہیم کے حوالہ سے خاص امام ابو حنیفہ کی زبانی بیان کیا ہے
مکی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ میں اگر استاد کے
دوبرو پڑھوں تو مجھے یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ استاد پڑھے
اور میں سنوں لے

اسی سلسلے میں امام حسن بن زیاد کے حوالے سے امام اعظم کا جو بیان آیا ہے وہ بھی سن لیجئے
اس سے امام صاحب کا موقف واضح اور صاف ہو کر سامنے آجاتا ہے:-

حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ فرماتے تھے: تمہارا محدث کے
روبرو پڑھنا اس سے سننے کے مقابلے میں زیادہ ثابت اور موثر
ہے کیونکہ جب استاد تمہارے سامنے پڑھے تو وہ صرف کتاب ہی
سے پڑھے گا اور جب تم پڑھو گے تو وہ کہے گا کہ میری جانب سے وہ
بیان کرو جو تم نے پڑھا ہے اس لیے یہ مزید تاکید ہو گی۔ لے

حافظ ابن کثیر نے امام اعظم کے اس موقف کو ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:
وعن مالک وابی حنیفة وابن ابی ذئب انھا اقوی
امام مالک، ابو حنیفہ اور ابن ابی ذئب کہتے ہیں کہ یہی قوی ہے
امام نووی نے امام صاحب کے اس موقف کو ذرا اور طرح پیش کیا ہے:
والثابت عن ابی حنیفة وابن ابی ذئب وهو روايت
عن مالک

امام ابو حنیفہ اور ابن ابی ذئب اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ
قرآن علی الشیخ کو شیخ سے سننے پر ترجیح دی جائے لے
حافظ ابن الصلاح نے بھی اس کا تذکرہ فرمایا ہے:
فمنصل عن ابی حنیفة وابن ابی ذئب وغیرھما ترجیح القرآۃ

علی الشیخ علی السماع من لفظہ لہ

امام ابو حنیفہ امام ابن ابی ذئب نے قراۃ علی الشیخ کو سماع پر ترجیح دی ہے۔

حافظ ابن الدین عراقی نے امام اعظم اور ابن ابی ذئب کا نام لکھ کر بتایا ہے
قد رجحنا العرض و عکسہ اصح
و جل اهل المشرق نحوہ جنہ لہ

اس داستان کو طول دیتے اور ارباب حدیث کی تصریحات کے تکرار سے میرا مقصود علم کے ان یتیم خانوں میں محدثین کی یہ صدائے غریب پہنچانا ہے جو بجلی کی روشنی اور پنکھوں کی ہوا میں بیٹھ کر یہ کہتے رہتے ہیں کہ ابو حنیفہ حدیث سے بے بہرہ تھے اور ابلہ فریبی کے لیے دھندلے اور ابلے ہیں کہ وہ فقیہ تھے اور صرف فقیہ۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔

بہر حال تحمل روایت کا کوئی طریق ہو سماع ہو یا قراۃ علی الشیخ اس پر سب کا ہی اتفاق اور ایک ہے کہ دونوں طرح سے روایت صحیح ہے لیکن بیان روایت کے لیے دوسرے طریق یعنی قراۃ علی الشیخ میں جو تعبیر ہی پیمانہ اختیار کیا جاتا ہے اس میں اگرچہ اس حد تک تو سب یک زبان ہیں کہ تعبیر یوں ہونی چاہیے قرأت علیہ (میں نے اس کے سامنے پڑھا) یا قرئی علیہ (انا سمعہ) اس کے سامنے پڑھا گیا اور میں سن رہا تھا) وغیرہ۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس طریق میں حد ثنا یا اخبار نا کا تعبیر ہی پیمانہ بھی استعمال کرنا درست ہے یا نہیں۔ عام ارباب روایت اور محدثین اس سے روکتے ہیں۔ امام احمد، نسائی اور دوسرے محدثین کا یہی مذہب ہے خطیب بغدادی نے لکھا ہے :

هو مذهب خلق كثير من اصحاب الحديث

محدثین کی اکثریت کا مذہب یہی ہے

حافظ ابن کثیر نے اسے مسلم، نسائی اور جمہور مشرق کا مذہب قرار دیا ہے لیکن اس موضوع پر امام اعظم ابو حنیفہ کا مذہب ان بزرگوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ امام اعظم اس صورت میں حد ثنا کی تعبیر کو جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابو بکر الخطیب فرماتے ہیں کہ :

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ ایک شخص جس نے حدیث محدث کو سنا کر حاصل کی ہے کیا اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ حد ثنا کہے؟ فرمایا کہ ہاں اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے کہ حد ثنی فلان اور سمعت فلانا اور اس کا یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کے سامنے اقرار ہی دستاویز کو پڑھا جائے اور کہہ دے کہ اس نے میرے سامنے اس دستاویز کے سارے مندرجات کا اقرار کیا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر خطیب بغدادی ہی رقمطراز ہیں :
امام ابو عاصم البغلی کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک، ابن جریر، سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ سے دریافت کیا کہ ایک شخص اگر شیخ کے سامنے حدیث پڑھ رہا ہے تو کیا اسے نقل روایت کے موقع پر حد ثنا کہنا درست ہے؟ سب کا متفقہ جواب یہ تھا کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

امام ابو عاصم ہی کا ایک اور بیان اس سے زیادہ واضح ہے فرماتے ہیں :
میں نے امام مالک، ابن جریر، سفیان ثوری اور ابو حنیفہ سے پوچھا کہ محدث کے سامنے ایک شخص خود حدیث پڑھتا ہے پھر وہ کہتا ہے کہ حد ثنا فلان اس بائے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ سب کا جواب یہ تھا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ ابو عاصم کہتے ہیں کہ ان میں دو حجازی اور دو عراقی ہیں۔

مشہور محدث یحییٰ بن ایوب کہتے ہیں :
میں نے ابو قطن سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میرے سے امام ابو حنیفہ نے کہا میرے سامنے پڑھو اور حد ثنا کہو۔ اگر میرے خیال میں اس میں کوئی بھی مضائقہ ہوتا تو میں ایسا کرنے کا تمہیں ہرگز حکم

زدنیارہ

امام نووی نے تقریب میں اسے دوسری صدی کے محدثین کا مذہب قرار دیتے ہوئے اس موضوع پر امام بخاری کی سمجھوتہ کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

انہ مذہب الذہری و مالک و ابن عیینہ و یحییٰ القطان
و البخاری و جماعة من المحدثین و معظم الحجازیین و الکوفیین۔^۱

قاضی عیاض، حافظ سیوطی، حافظ ابن کثیر بھی اس معاملے میں امام نووی کے ہم زبان ہیں۔

تحمّل روایت اور اجازت

تحمّل روایت کے طریقوں میں سے اجازت بھی محدثین کے یہاں ایک طریق ہے۔ محدثین کی زبان میں اجازت یہ ہے کہ شیخ کسی بھی شخص کو اپنی مرویات کی روایت کا زبانی یا تحریری پروانہ دے دے۔

اجازت کی ایک نہیں بلکہ محدثین کے نزدیک متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی خاص شخص کو کسی خاص حدیث کی اجازت دی جائے مثلاً یوں کہے کہ میں نے تم کو حدیث کی اجازت دی ہے۔ جمہور محدثین اس کے جواز کے قائل ہیں اور اس طریق سے علمی سرمایہ کی روایت کو درست کہتے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

والصیحح الذی قالہ المجہور من الطوائف واستقر علیہ
العمل جواز الروایۃ والعمل بہا۔

سب کے نزدیک صحیح اور سب کا عمل جس پر ہے وہ یہی ہے کہ اس کی روایت اور اس پر عمل درست ہے۔^۲

لیکن محدثین میں مشہور امام نقد و نظر شعبہ اس کے جواز کے قائل نہیں ہیں اور حافظ سیوطی نے تدریب میں امام آمدی کے حوالہ سے امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کا اور قاضی عبد الوہاب کے حوالہ سے امام مالک کا بھی یہی موقف قرار دیا ہے چنانچہ آمدی نے تصریح کی ہے:

قال ابو حنیفۃ و ابو یوسف لا تجوز الروایۃ بالاجازۃ مطلقاً۔^۳

تتمل روایت اور مناوہ

تتمل روایت کے طریقوں میں سے ایک طریق مناوہ بھی ہے
مناوہ یہ ہے کہ محدث طالب کو اپنی مسموعات پر متمل کتاب دے اور کہہ دے کہ اسے تم میری جانب
سے روایت کرو یا طالب کو کتاب کا مالک بنا دے یا لکھنے کے لیے کتاب عاریتہ دے دے یا طالب
شیخ کے پاس اپنی مسموعات کی کتاب لے کر آئے شیخ اُسے دیکھ کر طالب کو کہہ دے کہ تمہیں
اس کتاب کے مشتملات کی میری جانب سے روایت کی اجازت ہے اس کو عرض المناوہ کہتے
ہیں۔ اس موقع پر محدثین کے یہاں یہ سوال ابھر آیا ہے کہ بلحاظ قوت اس کا کیا حکم ہے؟ اس
ابھرے ہوئے سوال کے جواب میں علماء مختلف الخیال ہیں۔ امام نووی نے بتایا ہے کہ امام زہری،
ربیعہ، یحییٰ بن سعید، مجاہد، امام شعبی، علقمہ، ابراہیم، ابوالعالیہ، ابوالزبیر مکی، ابوالمتوکل، مالک،
ابن وہب، ابن القاسم، ان سب کی رائے یہ ہے کہ عرض مناوہ قوت میں تتمل روایت کی
پہلی صورت سماع کے برابر اور ہم پلہ ہے لیکن اس کے مقابلے میں امام ابو حنیفہ، سفیان
ثوری، امام اوزاعی اور عبد اللہ بن المبارک وغیرہ کہتے ہیں کہ عرض مناوہ کا درجہ سماع اور قرا
علی الشیخ دونوں سے کمتر ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں :

والصحيح انها مخطئة عن السماع والقراءة وهو قول الثوري

والاوزاعي وابن المبارک وابی حنيفة

صحیح یہی ہے کہ مناوہ عرض کا مقام سماع اور قرائت علی الشیخ سے نیچے

ہے یہی ثوری، اوزاعی، ابن مبارک اور ابو حنیفہ کا کہنا ہے یہ

اور امام حاکم نے اسی بات کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے :

اما فقهاء الاسلام الذين افتوا في الحلال والحرام فانهم

لم يروه سماعاً منهم الشافعي والاوزاعي والابو حنيفة

والثوري وابن حنبل وابن المبارک

فقہاء اسلام جو اسلام میں حلال و حرام کا فتویٰ دیتے ہیں وہ عرض مناوہ
کو سماع قرار نہیں دیتے جیسے شافعی، اوزاعی، ابو حنیفہ اور ثوری وغیرہ

بہر حال امام اعظم کا مذہب اس موضوع پر یہی ہے کہ عرض مناولہ سماع و قرأت کے ہم پلہ نہیں ہے اور متاخرین محدثین نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔

تحتل روایت کی باقی صورتیں یعنی مکاتیب، اعلام، وصیت اور وجاہہ پر بھی محدثین کے یہاں تفصیلی مباحث اصول حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علم حدیث کی ہر شاخ میں امام اعظم کی حلیل القدر خدمات موجود ہیں اور محدثین نے ہمیشہ سے اس فن میں ان کی جلالتِ شان کا لوہا مانا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن عبد البر نے مشہور محدث یزید بن ہارون کا امام اعظم کے بارے میں یہ تاثر نقل کیا ہے۔

ادركت الف رجل وكتبت عن اكثرهم ما دأيت فيهم

افقه ولا اورع ولا اعلم من خمسة اولهم ابو حنيفة

میں نے ہزار محدثین کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے اور ان میں اکثر سے احادیث لکھی ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ پارسا اور سب سے زیادہ عالم صرف پانچ ہیں۔ ان میں اولین مقام ابو حنیفہ کا ہے۔

امام مکی بن ابراہیم فرماتے ہیں:

كان ابو حنيفة نرا هداً عالماً راعياً في الاخرة صدوق اللسان

احفظ اهل زمانه۔

امام ابو حنیفہ زاید، عالم، انصاف کی طرف راغب، راست گو اور اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔

محدث صفیری نے شیخ الاسلام حافظ یزید بن ہارون سے بھی اسی کے قریب قریب روایت

کیا ہے:

كان ابو حنيفة تقياً نرا هداً عالماً صدوق اللسان احفظ اهل

زمانه۔

اور امام یحییٰ بن سعید القطان جو مشہور ناقد حدیث اور جرح و تعدیل کے امام ہیں وہ فرماتے ہیں:

انہ واللہ لا علم هذه الامّة بما جاء عن اللہ ورسولہ
واللہ امام ابو حنیفہ اس اُمت میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے
سب سے بڑے عالم تھے بلکہ

امام ابو عبد اللہ الحاکم نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں نوع التاسع والاربعین ہیں
ان ائمہ کا تذکرہ کیا ہے جن کی حدیثوں کو حفظ و مذاکرہ اور برکت کے لیے ذخیرہ کیا جاتا ہے
چنانچہ فرماتے ہیں :

هذا النوع من هذه العلوم معرفة الائمة الثقات
المشہورین من التابعین و اتباعہم ممن یجمع حدیثہم
للحفظ والمذاکرۃ والتبرک بہم و بذکرہم من
الشرق الی الغرب -

یہ قسم علوم حدیث میں سے ان معتد، مشہور تابعین اور اتباع تابعین کے
بنائے کے لیے ہے جن کی حدیثوں کو حفظ، مذاکرہ کے لیے جمع کیا
جاتا ہے۔ اور جن سے برکت یا بی اور مشرق سے مغرب تک جن کے
ذکر سے برکت لی جاتی ہے بلکہ

یہ عنوان قائم کر کے امام حاکم نے مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، کوفہ، الجزیرہ، بصرہ،
واسط اور خراسان کے محدثین کا تذکرہ کیا ہے ان میں امام ابو حنیفہ کا نمایاں تذکرہ کیا ہے۔
بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم محدث ہونے کی حیثیت سے محدثین کی برادری میں صرف
جانے پہچانے نہیں بلکہ بارگاہ محدثین میں ان کی جلالت و امامت علم حدیث میں مسلم ہے

حدیث شاذ اور امام اعظم

یہ امر واقعہ ہے کہ آج بھی تدوین حدیث کے بعد حدیث کے نام پر جو علمی سرمایہ موجود ہے
وہ تین قسم کا ہے۔ کچھ وہ حدیثیں ہیں جن کے الفاظ محفوظ ہیں اور کچھ وہ ہیں کہ الفاظ تو
محفوظ نہیں لیکن ان کے معانی محفوظ ہیں۔ اور کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن کے الفاظ ہیں

اختلاف ہے اور ساتھ ہی ان کے راویوں کی عدالت بھی اختلافی ہے۔ قسم اول اور قسم ثانی محدثین اور فقہاء کے یہاں مفہوم و مدلول کی تعبیر میں اختلافی ہے اور آخری قسم خود محدثین کے یہاں صحت اور ثبوت کے لحاظ سے اختلافی ہے، چنانچہ حافظ ابو بکر عقال الصقلی فرماتے ہیں :-

احادیث محدثین کے یہاں دائرہ ضبط میں اس طرح آتی ہیں کہ کچھ ایسی ہیں جن کی نقل میں حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعینہ الفاظ محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جو ہر قسم کی علت سے پاک و صاف ہیں۔ کچھ حدیثیں وہ ہیں کہ نقل میں معانی تو محفوظ ہیں مگر اصل الفاظ تنگ محدثین کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔ اور کچھ حدیثیں وہ ہیں کہ جن کے الفاظ مختلف ہیں اور جن کے راویوں کی عدالت بھی اختلافی ہے۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جن میں علتیں ہوتی ہیں۔ فنکار ہی اصول صحیحہ کے مطابق ان میں صحیح اور ضعیف کی تمیز کر سکتے ہیں۔

محدثین نے صحیح حدیث کی تعریف یہ بتائی ہے کہ جس کے راویوں میں ضبط، عدالت کے ساتھ سند کا اتصال ہو اور اس میں شذوذ اور علت قاعدہ نہ ہو۔ گویا حدیث کے صحیح ہونے کی ایک ناگزیر منفی شرط یہ ہے کہ وہ شاذ نہ ہو لیکن شاذ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں محدثین میں باہم اختلاف ہے۔

حافظ ابن کثیر نے حافظ ابو یعلیٰ الخلیلی سے شاذ کی یہ تعریف نقل کی ہے :

والذی علیہ الحفاظ ان الشاذ مالیس لہ الا اسناد واحد یثذبہ ثقۃ او غیر ثقۃ۔

حفاظ کے نزدیک شاذ یہ ہے کہ اس کی صرف ایک ہی سند ہو اور اس

طرح ثقہ یا غیر ثقہ اس میں شذوذ پیدا کر رہا ہو۔

اور امام حاکم نے شاذ کی یہ تعریف بتائی ہے۔

هو الذی یتفرد بہ الثقۃ و لیس لہ متابِع

۱۔ شروط الائمۃ الخمسہ، ذکر الکوثری فی تعلیقہ ناقلہ عن ابی بکر بن عقال الصقلی فی فوائدہ علی ما رواہ ابن بشکوال

۲۔ اختصار علوم الحدیث ص ۵۷۔

ثقة راوی کا ایسا بیگانہ بیان جس کا متابعت کوئی نہ ہو شاذ کہلاتا ہے۔ لیکن حافظ ابن الصلاح نے دونوں پر بڑی کڑی تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر شاذ یہی ہے تو امام بخاری کی پہلی حدیث بھی شاذ ہے اور اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :
 اس تعریف کی بنیاد پر تو حدیث انما الاعمال بالنیات بھی شاذ ہے۔
 کیونکہ یہ بھی ایک فرد ہے جسے حضرت عمر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منفرداً روایت کرتے ہیں پھر حضرت عمر سے علمتہ بھی منفرداً روایت کرتے ہیں اور علمتہ سے اسے روایت کرنے میں محمد بن ابراہیم اور محمد بن ابراہیم سے یحییٰ بن سعید منفرد ہیں۔ محدثین کے نزدیک یہی ثابت ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال عبداللہ بن دینار کی یہ حدیث ہے ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الاولاد وھبۃ۔ اس میں بھی عبداللہ بن دینار منفرد ہے۔ ایسے ہی وہ حدیث جو بحوالہ مالک از زہری از انس آئی ہے جس میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور آپ کے سر پر ڈھال تھی۔ اس میں مالک امام زہری سے منفرد ہیں۔ یہ سب روایات صحیحین میں موجود ہیں اور ان کی سند بھی صرف ایک ہی ہے جس کا تعلق ثقہ کے تفرد سے ہے۔ غرائب صحیح میں اس کا وافر ذخیرہ ہے۔ امام مسلم کا اپنا اقرار ہے کہ امام زہری کی نوے حدیثیں ایسی ہیں کہ ان کی اسناد میں وہ منفرد ہیں اور ان کی کوئی ہمنوائی نہیں کرتا ہے۔

حافظ ابن الصلاح نے اس اڑچن کا مداوا اور اس مشکل کا خود ہی حل بھی پیش فرمایا ہے لیجئے وہ بھی ان کی زبانی سن لیجئے وہ فرماتے ہیں :

اصل واقعہ یہ ہے کہ راوی اگر کوئی روایت منفرداً پیش کرتا ہے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس کی یہ روایت اگر اس سے زیادہ

کسی حافظ و ضابط کی روایت کے خلاف ہو تو یہ شاذ مرد وہ ہے۔ اور اگر اس کی روایت میں مخالفت کا کوئی پہلو نہ ہو تو پھر اس منفرد کی حیثیت کو دیکھا جاتے اگر حافظ عادل اور ثقہ ہو تو اس کے تفرّد کو شرف پذیرائی دیا جاتے اور اس میں یگانگت قاذح نہیں ہوگی جیسا کہ پہلی مثالوں میں ہے اور اگر راوی کے حفظ و اتقان پر بھروسہ نہ ہو تو اس کی روایت دائرہ صحت سے خارج تصور کی جائے گی۔

قاضی بدرالدین بن جماعہ نے حافظ ابن الصلاح کی اس پیش فرمودہ قرار داد کی تائید فرمائی ہے لیکن حافظ محمد بن ابراہیم نے اس پر بھی ایک سوال قائم کر دیا ہے اور بہت کچھ چینی و چٹاں کے بعد نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:

شاذ اور نکارت کی بنا پر حدیث میں محدثین کے لیے قدرے بے حد مشکل ہو گئی۔

یہ خالص محدثانہ رنگ میں ان محدثین کا نقطہ نظر ہے جن پر اسناد و روایت کا غلبہ ہے۔ دوسری صدی میں شاذ کی تعریف اور اس کی حقیقت کو آشکار کرنے کے لیے محدثین نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس سے بالکل جدا گانہ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ ہر ایسی حدیث کو شاذ قرار دیتے ہیں جو اس موضوع پر آئی ہوئی دوسری حدیثوں اور معانی قرآن کے خلاف ہو۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر نے امام اعظم کے نقطہ نظر کو ایک موقع پر محدثین کو جواب دیتے ہوئے اس طرح واضح کیا ہے:

کثیر من اهل الحديث استجازوا الطعن على ابي حنيفة
لعدة كشيروا من اخبار الاحاد العذول لافه كان يذهب
في ذلك الى عرضها على ما اجتمع عليه من الاحاديث و
معاني القرآن فما شذ من ذلك سرده و سماه شاذاً۔

بہت سے محدثین نے امام ابو حنیفہ پر اس لیے اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے بہت سے ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ امام صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری حدیثوں اور معانی قرآن کے مجموعہ سے ملا کر دیکھتے

اگر خبر واحد کا مضمون ان سے مطابقت کھا جاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث فرماتے۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام اعظم اس حدیث کو شاذ بتاتے ہیں جو معانی قرآن اور اس موضوع پر آئی ہوئی دوسری حدیثوں کے خلاف ہو۔ امام اعظم کا شاذ کے موضوع پر یہ موقف قابلِ داد ہے اور امام مالک بھی امام صاحب کے ہم نوا ہیں۔ اسی بنا پر امام مالک حدیث ولوغِ کلب کی تضعیف فرماتے تھے۔ شاطبی فرماتے ہیں کان مالک یضعفہ امام مالک اسے ضعیف کہتے تھے لیکن حالات کے تحت طبیعتوں اور مزاجوں میں اختلاف رونما ہو گیا جن کے مزاجوں میں تفقہ کا رنگ غالب تھا۔ انہوں نے امام اعظم کی ہمنوائی کی۔ چنانچہ امام شافعی سے جو شاذ کی تعریف منقول ہے وہ بھی اس کے قریب قریب ہے وہ فرماتے ہیں کہ :

شاذ یہ نہیں ہے کہ ثقہ راوی کوئی ایسی حدیث روایت کرے جس کو اس کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا بلکہ شاذ یہ ہے کہ ثقہ راوی ایسی حدیث روایت کرے جو عام لوگوں کی روایت کے مخالف ہو۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ مخالف ماردی الناس سے امام اعظم کے موقف کی تائید فرمائی ہے لیکن چونکہ امام موصوف نے تیسری صدی کا کچھ حصہ پایا ہے اور اس دور میں مجملہ بلادِ اسلامیہ کے افراد و غرائب بازار میں عام ہو گئی تھیں اس لیے تعبیر اس ماحول کی علمی فضا سے متاثر ہو گئی ہے اور معاملہ صرف روایت و اسناد پر آکر ٹھہر گیا ہے۔

قاضی ابولیوسف نے ایسی روایت کو شاذ قرار دیا ہے۔

جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہوں اور جو فقہاء مجتہدین میں معروف نہ ہوں۔

چنانچہ وہ ایک موقع پر لکھتے ہیں :

قابات و شاذ الحدیث و علیہ الجماعة من الحدیث
وما یعرفہ الفقہاء ما یوافق الکتاب و السنۃ۔

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں :

وهو عندنا شاذ والشاذ من الحديث لا يؤخذ به
یہ حدیث شاذ ہے اور شاذ حدیث ہمارے نزدیک حجت نہیں ہے بلکہ
بہر حال دوسری اور تیسری صدی کے محدثین شاذ حدیث کے موضوع پر مختلف خیال ہیں ۔

روایت بالمعنی اور امام اعظم

اس نقطہ پر متقدمین اور متاخرین سب کا تقریباً اتفاق ہے کہ اگر روایت کرنے والا حافظ
اور عارف نہ ہو تو اس کے لیے روایت بالمعنی کی کوئی گنجائش نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن الصلاح
فرماتے ہیں :-

اگر کوئی شخص حدیث بالمعنی روایت کرنا چاہے تو اگر الفاظ اور مقاصد
روایت سے آشنا نہ ہو تو سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کے لیے
روایت بالمعنی جائز نہیں ہے ۔ اسے روایت باللفظ ہی کرنی چاہیے بلکہ
امام نووی فرماتے ہیں کہ :

اگر الفاظ اور مقاصد سے نا آشنا ہو اور معانی کے ڈھانچہ سے ناواقف
ہو تو بالاتفاق اس کے لیے روایت بالمعنی ناجائز ہے ۔ روایت باللفظ
ہی کرنی چاہیے بلکہ

حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں بھی تصریح فرمائی ہے ۔ لیکن علماء کا اس موضوع
پر اختلاف ہے کہ اگر راوی عالم و عارف ہو تو کیا اس کے لیے روایت بالمعنی کی کوئی
گنجائش ہے ۔ حافظ ابوبکر الخطیب نے اکثر سلف کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ وہ اسے بھی
ناجائز کہتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

سلف کی اکثریت اور حدیث میں ارباب تحقیق کہتے ہیں کہ روایت
بالمعنی ناجائز ہے بلکہ نہایت ضروری ہے کہ روایت باللفظ ہو اس میں
کسی قسم کی کوئی کمی یا زیادتی اور کسی طرح کی تقدیم اور تاخیر نہ کی جائے ۔

اس موضوع پر کچھ روایات ہم پیش کر چکے ہیں ان اکابر نے عالم اور غیر عالم میں اس موضوع پر کوئی فرق نہیں کیا ہے۔
حافظ جلال الدین سیوطی نے اسی کو سلف میں قاسم بن محمد، امام ابن سیرین اور رجاء بن حیوہ کا مسلک قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

كان القاسم بن محمد وابن سيرين و رجاء بن حيوة يعيدون
المحدث علي حروفه

قاسم، ابن سیرین رجاء روایت باللفظ کرتے تھے۔
امام ذہبی نے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کو اسی نظریہ کا علم بردار بتایا ہے وہ فرماتے ہیں:

كان ممن يتحري في الاداء ويشدد في الرواية وينجز تلامذته
عن التهاون في ضبط الالفاظ -

حضرت عبداللہ بن مسعود ادائیگی میں تحری کرتے تھے اور روایت میں سختی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو ضبط الفاظ میں تہادون سے بڑے زور سے روکتے تھے۔

اگرچہ امام غزالی نے المستصفیٰ میں، امام زاری نے محصول میں، علامہ قرافی نے شرح تنقیح الفصول میں، حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور علامہ الجزائری نے توجیہ النظر میں یہ بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ نقل روایت میں روایت بالمعنی کے جواز کے قائل ہیں لیکن مشہور محدث ملا علی قاری نے شرح مسند امام میں امام اعظم کے بارے میں حافظ ابو جعفر طحاوی کی ایک روایت کی وجہ سے دعویٰ کیا ہے کہ امام اعظم کسی وجہ سے بھی روایت بالمعنی کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ حافظ ابو جعفر کی وہ روایت جس کو دلیل بنا کر انہوں نے امام اعظم کا یہ موقف بتایا ہے یہ ہے:

حدثنا سليمان بن شعيب حدثنا ابي قال املأ عينا

۱۔ الکفایہ فی علوم الراویہ ص ۱۹۸۔ ۲۔ تدریب الراوی ص ۳۱۱۔

۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۔

ابو یوسف قال قال ابو حنیفۃ لا ینبغی للرجل ان
یحديث من الحديث الا ما یحفظه من لیوم سمعہ الی
لیوم یحدث بہ -

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو اس وقت تک حدیث نہیں
بیان کرنی چاہیے جب تک اسے سننے کے دن سے لے کر بیان
کرنے کے دن تک یاد نہ ہو۔

اور اس سے ملا علی قاری نے امام اعظم کا یہ مسلک مقرر فرمایا ہے کہ:
حاصلہ انہ لم یجوز الروایت بالمعنی ولو کان مراداً
للمبني خلافاً للجمهور من المحدثین -

امام اعظم روایت بالمعنی کو ناجائز کہتے ہیں چاہے وہ مراد الفاظ
ہی میں کیوں نہ ہو یہ جمہور محدثین کے خلاف ہے -

یہی قرن قیاس ہے کیونکہ وہ جب یہ پابندی لگاتے ہیں کہ جب تک روایت سننے کے
دن سے بیان کرنے تک زبانی یاد نہ ہو روایت بیان نہ کرے اور وہ حفظ کے ساتھ یہ قید
بھی اضافہ کرتے ہیں کہ راوی روایت کا حافظ ہونے کے ساتھ عارف بھی ہو تو وہ یہ کب گوارا کر
سکتے ہیں کہ روایت کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ بلکہ امام اعظم نے تو اس میں اتنی
شدت اختیار کی ہے کہ اگر حفظ و معرفت کا سرمایہ راوی کے پاس نہ رہا ہو چاہے وہ روایت
باللفظ ہی ہو لیکن راوی کو یاد نہ ہو مگر لکھی ہوئی اس کے پاس موجود ہو تو صرف کتاب کے
سہارے راوی کو روایت کی اجازت نہیں دیتے چنانچہ امام نووی رقمطراز ہیں:

اذا وجد سماعہ فی کتابہ ولا یدکرہ فغن ابی حنیفۃ
وبعض الشافعیۃ لا یجوز روایتہ -

اگر حدیث راوی کے پاس کتاب میں لکھی ہوئی ہو لیکن اسے زبانی
یاد نہ ہو تو امام ابو حنیفہ اس کی روایت کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔

اس سے محدث قاری ہی کی تائید ہوتی ہے خطیب بغدادی نے یحییٰ بن معین کا جو

بیان لکھا ہے اس سے امام اعظم کے اس موقف پر جس کی نشاندہی ملا علی قاری نے کی ہے۔ مزید روشنی پڑتی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :

یہی بن معین سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی شخص کے پاس اپنی لکھی ہوئی حدیث ہو لیکن وہ اسے زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے ؟ فرمایا کہ ابو حنیفہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس حدیث کا آدمی حافظ اور عارف نہ ہو اسے بیان نہ کرے ۔^۱

ظاہر ہے کہ حفظ کا الفاظ سے اور معرفت کا معانی سے ہی تعلق ہے یعنی راوی کو الفاظ بھی محفوظ ہوتے چاہئیں اور الفاظ کے ساتھ معانی بھی اس کے جانے پہچانے ہوں۔ اس قید اور پابندی کے پیش نظر روایت بالمعنی کی امام اعظم کے یہاں کب گنجائش ہو سکتی ہے۔ صاحب کشف الاسرار نے اسی کو عزیمت قرار دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

الغیۃ ان یحفظ المسموع من وقت السماع والضمیر الی وقت الاداء و هذا مذهب ابی حنیفۃ فی الاخبار والشہادۃ عزیمت یہی ہے کہ سنی ہوئی بات کو سننے اور سمجھنے کے وقت سے نقل روایت کے وقت تک یاد رکھے یہی اخبار و شہادت میں ابو حنیفہ کا مذہب ہے ۔^۲

اور عزیمت کے مقابلے میں رخصت بنا کر جس چیز کا ذکر کیا ہے وہ محدثین کی رخصت نہیں بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی حدیث معلوم ہو اور اس سے کوئی شخص علمی استفادہ کرنا چاہتا ہے تو یہ اپنے جواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو اپنے الفاظ میں پیش کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے ارشاد نہ صرف یاد ہو بلکہ اسے پورے طور پر سمجھے ہوتے بھی ہو لیکن اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ :

اول : ارشاد کا تعلق محکمات سے ہو۔

دوم : بیان کرنے والا وجہ لغت سے آشنا ہو، اس کا منشا یہ ہے کہ :

اگر ارشاد عام ہو تو پھر اس میں روایت بالمعنی کی اجازت نہیں ہے۔ ایسے ہی اگر ارشاد

مشکل، مشترک اور مجمل کا حامل ہو تو پھر روایت بالمعنی کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی رقمطراز ہیں :-

والرخصة ان ينقله بمعناه فان كان محكما لا يجتمل غيره
يجوز نقله بالمعنى لمن له بصيرة في وجوه اللفظة وان
كان ظاهرا يجتمل غيره فلا يجوز نقله بالمعنى الا
للفقيه المجتهد وما كان من جوامع الكلم والمشكل او
المشترك ادا لمجمل لا يجوز نقله بالمعنى للكل -

رخصت یہ ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ
محکم ہو اور روایت کرنے والا لفظ و زبان کی گہرائیوں سے واقف ہو
اور اگر حدیث عام ہو تو پھر بالمعنی روایت غیر مجتہد کے لیے ناجائز
ہے۔ ایسے ہی وہ حدیثیں جن میں جوامع الکلم، مشکل، مشترک اور
مجمل آئے ہوں ان سب میں روایت بالمعنی ناجائز ہے۔

فقیہ مجتہد کی قید بھی یہ بتانے کے لیے لگائی ہے کہ وہ فتاویٰ میں روایت کے معانی کو
اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ اس موقع پر حافظ ابن خزم بڑی عمدہ بات لکھ گئے ہیں -

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا حکم تو یہی ہے کہ اس کی روایت
باللفظ ہونی چاہیے۔ کسی حالت میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہ ہو
صرف ایک صورت میں روایت بالمعنی کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ راوی
حدیث کا حافظ ہو اور ساتھ ہی حتمی طور پر اس کے معانی سے بھی
پورا واقف ہو۔ اس حالت میں اگر اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا
جائے تو یہ مفسنی کی حیثیت میں حدیث کے معنی اور مدلول کو جواب
میں اپنے الفاظ میں پیش کر سکتا ہے یا کسی سے مباحثہ کر رہا ہو
موقع استدلال میں اپنے لفظوں میں حدیث کے معنی پیش کر سکتا
ہے۔ یہی قرآنی آیات کا حکم ہے۔ اس حد تک اس میں کوئی اختلاف

نہیں ہے لیکن اگر راوی ہونے کی حیثیت میں حدیث بیان کرے اور
ارشاد کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرے تو اس کے
لیے ناگزیر ہے کہ الفاظ نبوت جیسے ہی پیش کرے جیسے سُننے ہیں اس
میں حرف کی بھی تبدیلی جائز نہیں ہے چاہے الفاظ میں معنوی ترازو
بھی ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ ملا علی قاری نے امام اعظم کے مذہب کی اس موضوع پر جو نقاب کشائی
کی ہے۔ اس کا مفاد بھی قریب قریب یہی ہے اور فقہاء اصولیین نے روایت بالمعنی پر
جو رخصت دی ہے ان کا منشا بھی اسی قسم کی رخصت کی نشاندہی ہے۔ بہر حال امام اعظم
امام مالک اور خطیب بغدادی کے الفاظ میں سلف کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔ لیکن بعد
کو محدثین اس کی پابندی نہ کر سکے اور انہوں نے پہلے کتابت کے سہارے حفظ کی گرفت
کو ڈھیلہ کیا۔ بعد ازیں راوی سے معرفت کی قید کو یہ کہہ کر ہٹایا کہ عارف ہو یا نہ ہو حدیث روایت
کر سکتا ہے اور معلوم ہے کہ الفاظ کی نگرانی اگر حفظ کے ذریعے ہوتی ہے تو معانی کی حفاظت
کا واحد ذریعہ معرفت ہے لیکن محدثین کو اس میں شدت معلوم ہوئی نہ تھی کہ حافظ سیوطی
نے برملا اس کی سنگینی کی یہ کہہ کر شکایت کی۔

هذا مذهب شديد قد استقر العمل على خلافه

یہ مذہب بہت سخت ہے محدثین کا عمل اس کے خلاف ہے۔
اور اس شکایت کے بعد انہوں نے واشکاف لفظوں میں اقرار کیا کہ
لعل الرواة في الصحيحين ممن يوصف بالحفظ لا
يبلغون النصف۔

شاید صحیحین کے نصف راوی بھی حفظ کی قید پر پورے نہ اتریں۔
اس کے بعد محدثین کی بارگاہ میں روایت بالمعنی کی بھی اجازت دے دی گئی ہے
اس سلسلے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں :
حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :

اگر راوی عالم ہو الفاظ اور اس کے مدلولات سے واقف ہو۔ جمہور علماء نے روایت بالمعنی کو جائز قرار دیا ہے اور اسی پر عمل ہے۔
حافظ ابوبکر الخطیب بغدادی لکھتے ہیں۔

جمہور فقہاء کہتے ہیں عالم بمواقع الخطاب کے لیے روایت بالمعنی جائز ہے اور علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ جاہل بمواقع الخطاب کے لیے یہ ناجائز ہے۔

حافظ ابن الصلاح رقمطراز ہیں:

صحیح یہی ہے کہ سب صورتوں میں روایت بالمعنی جائز ہے بشرطیکہ راوی عالم ہو۔

امام نووی فرماتے ہیں:

جمہور سلف اور خلف مختلف گروہوں میں سے کہتے ہیں کہ سب میں روایت بالمعنی جائز ہے جبکہ قطعی طور پر معنی کی ادائیگی کر سکتا ہو۔ علامہ الجزائری نے اس موقع پر جو بیان قلم بند کیا ہے اس سے پوری صورت حال واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے وہ فرماتے ہیں:

علماء کا ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ روایت بالمعنی مطلقاً ناجائز ہے یہی اکثر محدثین، فقہاء اور اصولیین اور ظاہریہ کا مذہب ہے عبد اللہ بن عمر اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی یہی منقول ہے اسحاق اسفرائینی اور ابوبکر رازی کا بھی یہی کہنا ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ امام مالک کا بھی صحیح مذہب یہی ہے اور امام مالک کا یہ ارشاد کہ لا اکتب الا عن رجل يعرف ما يخرج من راسہ میں صرف اس شخص کی روایت قلم بند کرتا ہوں جو اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات کو جانتا ہے، اسی کا موید ہے کیونکہ یہ بات آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمائی تھی کہ آپ

نے زمانہ پانے کے باوجود بہت سے لوگوں سے روایت کیوں نہیں لی؟ نیز امام مالک نے ایسے بہت سے لوگوں سے بھی روایت نہیں لی ہے جو فضل و تقویٰ میں مشہور تھے۔ ونبہ صرف یہ ہے کہ یہ کاتبہ اپنی حدیثوں کے عارف نہ تھے۔ امام بیہقی اور خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ امام مالک حدیث میں روایت بالمعنی کے جواز کے قائل نہ تھے اور باقی میں اسے درست سمجھتے تھے۔ بعض بزرگوں نے روایت بالمعنی میں اتنا تشدد اختیار کیا ہے کہ وہ حرف کی تبدیلی کو بھی گوارا نہیں کرتے چاہے وہ مرادف ہی کیوں نہ ہو اور کلمات کی تقدیم و تاخیر کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ بعض تو مشدد کو مخفف اور مخفف کو مشدد کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ اور ان کا موقف یہ ہے کہ اگر روایت میں کسی وجہ سے تبدیلی ہوگی تو اس سے راوی اس وعید کا مصداق ہو جائے گا۔ جو اس سلسلے میں آئی ہے اور اس لیے بھی روایت بالمعنی درست نہیں ہے کہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جو امع الکلم کی صفت سے موصوف ہے اور آپ کے سوا دوسرا کوئی خواہ فصاحت و بلاغت کے کتنے ہی ایسے مقام پر ہو حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردیا بھی نہیں پاسکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بسا اوقات روایت بالمعنی کرنے والا اپنی جگہ مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے معنی کا حق ادا کر دیا لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوتا اس کا احادیث میں مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر امام شعبہ کا حدیث میں جو مقام ہے وہ سب ہی جانتے ہیں لیکن شعبہ ہی نے جب اسماعیل بن علیہ سے یہ حدیث سنی کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یتزعفر الرجل اور اسے اپنے نقطوں میں اس طرح پیش کیا کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المتزعفر تو معاملہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ شعبہ کی روایت بالمعنی نے ایک

عمومی ضابطہ کی صورت اختیار کر لی جب کہ اسماعیل کی روایت اسے
مردوں سے مخصوص بنا رہی تھی۔ معاملہ میں کتنی بڑی نزاکت ہے
اور نزاکت بھی ایسی کہ شعبہ جیسا امام فن محسوس نہ کر سکا۔ لیکن
اسماعیل نے ناڑ لی اور شعبہ کو تیار کیا۔

اور پوری وضاحت اور قوت سے یہ بات لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:
کان ینبغی ان یکون هذا المذهب هو الواقع و لکن لہ
ینفق ذالک

اچھا تو یہی تھا کہ یہی مسلک اختیار کیا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا ہے۔
ایسا نہیں ہوا تو پھر کیا ہوا؟ یہ بھی ان کی زبانی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:
ذهب جمہور العلماء الی اجواز الہدایۃ بالمعنی لمن
یحسن ذالک بشرط ان یکون جازماً بانہ ادی معنی
اللفظ۔

جمہور علماء نے روایت بالمعنی کے جواز کو اپنا لیا ہے بشرطیکہ راوی کو
مطلب کی ادائیگی پر یقین ہو اور اسے اس کا ڈھنگ آتا ہو۔
بے محل نہ ہو گا اگر اس موقع پر ۵۹۲ھ کے ایک محقق کی رائے پر بھی نظر ڈال لی جائے
حدیث میں روایت بالمعنی کے جواز نے جو عام شکل اختیار کر لی تھی اس پر بحث کرتے
ہوئے یہ قابل مصنف رقمطراز ہے:

روایت بالمعنی میں یہ اختلاف صرف زمانہ صحابہ تک ہے۔ صحابہ
کے علاوہ کسی کے لیے بھی روایت بالمعنی کی گنجائش نہیں ہے
چاہے راوی معنی کو اپنے الفاظ میں کیسے ہی بھرپور انداز میں پیش
کرے۔ اگر ہم صحابہ کے بعد اوروں کے لیے بھی اس کی گنجائش
پیدا کر لیں تو ہم حدیث کی روایت پر اعتماد نہیں کر سکیں گے
کیونکہ ہر ایک ہمارے زمانے تک منقول میں تبدیلی کرتا ہے

اور اپنی رائے سے حرف کی جگہ حرف لے آتا ہے اس طرح خبر خبر نہیں رہتی صحابہ کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے ان میں دو اہم خصوصیتیں ہیں۔ ایک فصاحت و بلاغت، کیونکہ ان کی جبلت عربی ہے اور ان کی زبان میں صحیح سلیقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مشاہدہ معنی کے سمجھنے میں معین و مددگار ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مگر اور معاین میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ صحابہ احادیث میں جو یہ تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ اے رسول اللہ اور نہی رسول اللہ ہکذا۔ تو حضور کے الفاظ ذکر نہیں کرتے بات حضور کی ہوتی ہے اور الفاظ کا جامہ صحابہ کا ہوتا ہے۔ یہ خبر بالکل صحیح ہوتی ہے۔ اس میں کسی انصاف پسند کے لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس حد تک دوسری صدی کے محققین میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ بات صحابہ کی حد تک ایک عقلی ضابطہ کی بات ہے واقعی یہ بہترین مسئلہ کا حل ہے اور اس میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہوا کیا؟ کیا فی الواقع روایت بالمعنی حدیث میں صحابہ تک محدود رہی ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب محدثین کے یہاں نفی میں ہے۔ عربی تو عربی عجمی اور مولدین راولپور نے احادیث کو بالمعنی روایت کیا ہے حتیٰ کہ عربی ادب اور علماء بلاغت کے یہاں حدیث کی زبان بھی اس وجہ سے حجت و استدلال کی زبان نہ رہی۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام تو زبان کی حد تک اس کے صرف اس حصے سے استدلال کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ روایت باللفظ ہوئی ہے اور یہ حدیث میں بے حد کم اور نادر ہے ”وذلك نادر جداً“ صرف چند گنتی کی چھوٹی

چھوٹی حدیثوں کو چھوڑ کر اکثر حدیثوں کی روایت بالمعنی ہے اور یہ روایت بالمعنی بھی عجمیوں اور مولدین کے ہاتھوں تدریس حدیث سے پہلے ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اسے اپنے انداز میں اپنی عبارت میں روایت کیا ہے انہوں نے کمی بیشی بھی کی ہے اور تقدیم و تاخیر بھی اور الفاظ کی تبدیلی بھی ہے۔

اور اس آخری دور میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے بھی تشریح کی ہے کہ جمہور السواتہ کانوا یجتنون بدوس المعانی لا یجوا شیبھا عام راوی صرف روایت بالمعنی کرتے ہیں اور بس ہے بلکہ علامہ جزائری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ :

روایت بالمعنی پر مشتمل حدیث سے صرف اصل مسئلہ پر استدلال کیا جاسکتا ہے کسی کلمہ کی حدیث میں تقدیم و تاخیر یا حروف عطف وغیرہ سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا ایسے ہی الفاظ اور ان کی ترکیب سے بھی کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ روایت بالمعنی کرتے والے راویوں کی اکثریت نقل روایت میں اس کا نہ کوئی اہتمام کرتی ہے اور نہ لحاظ۔ بلکہ احادیث کے کچھ راوی تو ایسے ہیں جن کو عربی زبان سے بھی پوری واقفیت نہیں ہے چہ جائیکہ زبان اوداد کے اسرار و لطائف سے ہے۔

ہمیں چاہیے کہ معاملے کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ یقیناً اگر روایت بالمعنی کا دائرہ کار صرف صحابہ تک ہی رہتا تو معاملہ میں اتنی سنگینی نہ آتی جس قدر السیوطی، الجزائری اور حکیم الامت نے محسوس کی ہے کہ روایت بالمعنی کی وجہ سے حدیث کی زبان حجت نہ رہی اور حدیث میں انداز کلام اور پیرایہ بیان سے استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ صحابہ بہر حال عرب تھے ان کو لسانی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ متکلم کے مذاق سخن سے بھرپور واقفیت تھی۔ ان کے دلوں پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی

شخصیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کے لیے آپ کی بات اور آپ کے واقعات و حالات کی حیثیت عام انسانی وقائع جیسی نہ تھی۔ وہ آپ کی ایک ایک تقریر ایک ایک گفتگو اور آپ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے وہ علم حاصل کر رہے تھے جو ان کو اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا وہ خود جانتے تھے کہ ہم اس سے پہلے جاہل تھے اور یہ پاکیزہ ترین شخصیت ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کر رہی ہے اس لیے وہ آپ کی ہر بات کو پوری توجہ سے سنتے اور آپ کے ہر کام کو دیکھتے تھے کیونکہ ان کو اپنی زندگی میں اسی کی کاپی کرنی تھی ظاہر ہے کہ اس احساس کے ساتھ آدمی جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہے اسے سمجھنے اور یاد رکھنے میں وہ سہل انگاری سے کام نہیں لے سکتا۔ وہ قرآن کی رو سے یہ بھی جانتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار متنبہ کرنے سے بھی ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ نبوت کے ذمہ جھوٹ تراشنا ایک سنگین گناہ ہے۔ وہ اپنے اندر اس بات کی بہت بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ بعد کے آنے والوں تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ کی ہدایت و تعلیمات کو پہنچانا قرآن کا عائد کردہ فریضہ ہے

لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

اسی وجہ سے صحابہ کے حالات میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے ہوئے وہ کانپ جاتے تھے ان کے چہرے کا رنگ فوق ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے ابو عمر و الشیبانی کی زبانی حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ:

میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھتا سال سال بھر کبھی بان پر قال رسول اللہ نہ آتا۔ اگر کبھی آتا تو کپکپی طاری ہو جاتی اور فرماتے کہ حضور نے یوں فرمایا یا اس جیسا یا اس کے قریب فرمایا۔ لے

پھر اکابر صحابہ خاص طور پر عام صحابہ کی احادیث روایت کرنے میں نگرانی کرتے ان کو روایت میں احتیاط کی تلقین کرتے تھے۔ امام ذہبی نے حضرت ابو بکر کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ احادیث میں احتیاط اور تحری کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت فاروق اعظم کے متعلق بھی یہ انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے محدثین کے لیے نقل روایت میں احتیاط کی شاہراہ قائم کی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کے بارے میں خاص طور پر لکھا ہے کہ:

فقد نجر الامام علی عن رواية المنكر وحث علی الحديث
بالمشهور۔

حضرت علی نے منکر روایت سے منع کیا ہے اور مشہور روایات کو
بیان کرنے کی ترغیب دی ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ زمانہ صحابہ میں حضور انور کی احادیث کا بہت بڑا حصہ وہ
تھا جس کی حیثیت محض زبانی روایات کی نہیں تھی بلکہ صحابہ کے معاشرے میں ان کی شخصی
زندگیوں میں، ان کے گھروں میں، ان کی معیشت اور حکومت و عدالت میں اس کی پوری گہرائی
تھی اور عملاً نافذ تھی۔ اس کے آثار و نقوش ہر طرف لوگوں کو چلتے پھرتے نظر آتے تھے پورا
معاشرہ اس کو استعمال کرتا تھا۔ فقہاء کی زبان میں اسی کا نام السنۃ ہے اور حدیث اسی کی تاریخ
ہے اور یہ السنۃ ہی زمانہ تابعین میں حدیث کی صحت کا ایک معیاری پیمانہ تھی۔
حافظ ذہبی نے دور تابعین کے بارے میں طبقہ خامسہ کے آخر میں جو نوٹ لکھا ہے اس کو
پڑھ کر آپ دور صحابہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مسلمان عزت و برتری میں اور علم کی گہرائی میں بہت اونچے مقام پر تھے
جہاد کے پھر سیرے لہرائے تھے، سنتیں شاہراہ عام پر تھیں اور
بدعتیں سرنگوں۔ اعلان حق کرنے والوں کی کثرت تھی عبادت گزاروں
کا ہجوم تھا۔ پوری انسانیت زندگی میں سکھ اور چین کا سالن لے
رہی تھی۔ اسلامی فوجیں اقصائے مغرب میں جبرائیل، جہشہ اور
ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ دور تابعین کی نقاشی ہے صحابہ تو پھر صحابہ ہیں۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

بہر حال صحابہ کی ذات گرامی کا موضوع بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر روایت
بالمعنی کا دائرہ کار صحابہ کرام تک ہی محدود رہتا تو شاید معاملہ میں اتنی سنگینی ہرگز نہ آتی
اسی بنا پر امام اعظم کے نزدیک روایت باللفظ کا اعتباری مقام صحابہ کے بعد ہے۔ چنانچہ ان

کے یہ الفاظ صراحتاً اس کی دلیل ہیں کہ :

لا ينبغي للرجل ان يحدث من الحديث الا بما حفظه من
ليوم سمعه الى يوم يحدث به له

سوال تو صحابہ سے لینے کے بعد روایت کرنے والوں کا ہے کیا ان کے لیے بھی روایت
بالمعنی کی گنجائش ہے جبکہ ان میں عجمی اور مولدین بھی ہیں۔ اس بارے میں امام اعظم کا موقف
وہی ہے جو ملا علی قاری نے پیش کیا ہے۔ اگرچہ محدثین کے دربار سے اس پر تشدید کا
آوازہ کسا گیا ہے لیکن فی الحقیقت تاریخ سنی کی یہ بڑی ہی درد انگیز بے انصافی ہے جو
حدیث کے اس عظیم الشان امام کے ساتھ جائز رکھی گئی ہے۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں
نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسی طرح معتقدوں نے بھی اس کے فہم و بصیرت سے حدیث
میں بے رخی اختیار کر لی۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ فخر الاسلام ہندووی نے
ضبط کی تشریح کرتے ہوئے جو یہ لکھ دیا ہے کہ :

ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ کلام کو ایسے طریق سے سُنا جائے جیسے سننے
کا حق ہے پھر اس کی مراد کو سمجھا جائے پوری کوشش سے اسے
یاد کیا جائے پھر اس کی حفاظت کر کے اس کی پابندی کی جائے اور
اسے ادا کرتے وقت اس کے مذاکرہ کا اہتمام کرتے رہنا چاہیے
مبادا وہ ذہن سے اتر نہ جائے یہ

تو اس سے ان کا مقصود بھی یہی سمجھنا ہے کہ ضبط میں الفاظ کا یاد رکھنا، ان کی حفاظت
کرنا بنیادی شرط ہے۔ اس لیے یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک
روایت بالمعنی کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اور فخر الاسلام ہی سے روایت بالمعنی پر تشدید
پابندی جو حافظ ابن الہمام نے نقل کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ
فرماتے ہیں :

والحزمية في الاداء باللفظ والرخصة معناه بلا نقص
وزيادة للعالم باللغة ومواقع الالفاظ وقال فخر الاسلام

الا في نحو المشترك والمجمل والمتشابه، بخلاف العام
والحقيقة المحتلتين للخصوص والمجازا ما المحكم منهما
فتكفي اللفظة -

عزیمت تو روایت میں باللفظ ہی ادائیگی ہے اور نخصت روایت
بالمعنی ہے بشرطیکہ راوی زبان دان اور مواقع الفاظ سے واقف
ہو اور کمی زیادتی نہ کرے اور فخر الاسلام نے یہ شرط بھی لگائی
ہے کہ روایت کا تعلق مجمل، مشترک اور متشابہ سے نہ ہو ہاں اگر
عموم و خصوص ہو تو اس سے مستثنیٰ ہے اور محکم اگر ہو تو صرف
زبان دان ہونا کافی ہے۔

دوسرے اصولیین بھی فخر الاسلام کے ہمنا ہیں۔ سعد الدین تفتازانی اور اصول ہندی
کے شامح علامہ عبدالعزیز بخاری نے بھی اسی قسم کی تصریح کی ہے۔

مراتب حدیث اور امام اعظم

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ قوت کے لحاظ سے ہر حدیث کا درجہ ایک نہیں ہے بلکہ ان میں
فرق مراتب ہے۔ فقہاء اور محدثین دونوں کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں۔ متواتر، مشہور
اور اخبار اتحاد۔ علامہ فخر الاسلام ہندی نے متواتر کی یہ تعریف کی ہے۔

متواتر ان حدیثوں کو کہتے ہیں جن کے روایت کرنے والے لا تعدو
ہوں اور ان کی عدوی اکثریت، ان کی عدالت اور بعد مقامات کی
وجہ سے اس احتمال کی گنجائش نہ ہو کہ یہ سب جھوٹ پر متفق ہو
گئے اور اجماع ہر زمانہ میں موجود ہے اور اس کا آخر اور اوسط
شہرت کے لحاظ سے یکساں ہو جیسے قرآن، پانچ نمازیں، تعداد
رکعت، مقادیر، زکوٰۃ وغیرہ۔

اتنے زیادہ لوگوں کی کسی محسوس کے بارے میں خبر جن کا جھوٹ پر متفق

ہونا عادیہ محال ہو لے

حافظ ابن حجر عسقلانی نے خبر کے متواتر ہونے کی چار شرطیں بتائی ہیں۔ اول بیان کرنے والوں کی تعداد کثیر ہو۔ دوم ان کا جھوٹ پر متفق ہونا عادیہ محال ہو۔ سوم جس کثرت سے بیان کرنے والے ہوں اسی جیسی کثرت از ابتدائاً اتہا رہے۔ چہارم روایت کا انجام کسی محسوس و مشاہدہ معاملہ پر ہو اور ان شرطوں کے ساتھ سننے والوں کو اس خبر سے علم یقینی حاصل ہو رہا ہو تو ایسی خبر متواتر ہے۔

حافظ بلال الدین السیوطی نے متواتر کی دو قسمیں بتائی ہیں لفظی اور معنوی۔ تواتر لفظی کی حد تک حافظ ابن حبان بستی اور امام حارمی کا دعویٰ یہ ہے کہ موجودہ ذخیرہ حدیث میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ حافظ ابن الصلاح اور امام نووی بھی ان کے ہمینوا ہیں بلکہ حافظ ابن حبان بستی نے تو حدیث عزیزہ کا بھی انکار کر دیا ہے۔ حدیث عزیزہ یہ ہے کہ اس کے بیان کرنے والے سلسلہ سند میں کہیں بھی دو سے کم نہ ہوں اسے نادرا الوجود ہونے کی وجہ سے عزیز کہتے ہیں لیکن حافظ ابن حجر نے نزہۃ النظر میں اس کی تغلیط کی ہے اور ایسے ہی قاضی ابوبکر بن العربی کا یہ دعویٰ بھی بے دلیل ہے کہ حدیث کا عزیز ہونا بخاری کی شرائط میں داخل ہے۔ ابن رشید نے صحیح کہا ہے کہ :

لقد کان یکنی القاضی فی بطلان ما ادعی اللہ شرط البخاری

اقل حدیث منکوریہ -

قاضی کے دعوے کی تغلیط کے لیے بخاری کی پہلی ہی روایت کافی ہے۔

بعض علمائے تواتر معنوی کی بھی تین قسمیں بتاتی ہیں۔ تواتر اسناد، تواتر عمل اور تواتر قدر مشترک۔

تواتر اسناد

یہ کہ حدیث کو مشروع سند سے لے کر آخر تک اتنی جماعت روایت کرنے والی ہو جس کا

جھوٹ پر ایسا محال ہو۔ اس لحاظ سے محدثین نے حدیث من کذب علی متعمداً کو متواتر قرار دیا ہے۔ حافظ ابن الصلاح نے اس کے راویوں کی تعداد ۶۲ اور حافظ عراقی نے ۷۷ سے زائد لکھی ہے۔ حافظ سیوطی نے اسنادی تواتر پر مشتمل حدیثوں کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ کتاب کا نام "الفوائد المتکاثرہ فی الاخبار المتواترہ" ہے۔ اس کتاب کی تلخیص بھی ان کے ہی قلم سے "الازہار المتکاثرہ" کے نام سے نکلی ہے۔ محمد بن جعفر الکنانی نے اس کا ذیل "نظم المتکاثر من الحدیث المتواتر" کے نام سے لکھا ہے۔ امیر میانی فرماتے ہیں کہ تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین کی حدیثیں اسی تواتر کی مثال ہیں۔ کیونکہ ان کو روایت کرنے والے پچاس صحابہ ہیں ان میں عشرہ مبشرہ بھی داخل ہیں۔ حافظ زہد الدین عراقی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے راویوں کو اکٹھا کیا تو ان کی گنتی پچاس ہوئی۔ حافظ ابن مندہ اور امام حاکم نے دعویٰ کیا ہے کہ عشرہ مبشرہ اس کی روایت پر جمع ہیں۔ امام بیہقی امام حاکم کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

لَا نَعْلَمُ سُنَّةَ أَتَّفَقَ عَلَيَّ رَوَايَتُهَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْخَلَفَاءُ الْأَرْبَعَةُ شَرَّ الْعَشْرَةِ

الَّذِينَ شَهِدُوا لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بِالْجَنَّةِ فَمِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ أَكْبَرِ الصَّحَابَةِ عَلَى تَفَرُّقِهِمْ

فِي الْبِلَادِ الشَّاسِعَةِ غَيْرُ هَذِهِ السَّنَةِ -

ہمارے علم میں ایسی کوئی سنت نہیں ہے جس کی روایت پر حضور

انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خلفاء راشدین، عشرہ مبشرہ اور پھر

اکابر صحابہ متفق ہوئے ہوں سوائے اس سنت کے بلکہ

یاد ہے کہ یہ تواتر تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین کو حاصل ہے امیر میانی کی آپ تصریح پڑھ چکے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے بھی یہ بات صراحت لکھی ہے کہ

فَمِنْ امْتِلَاءِ ذَلِكَ حَدِيثُ رَفْعِ الْيَدَيْنِ عِنْدَ تَكْبِيرَةِ الْأَحْزَامِ

بِالصَّلَاةِ - ۲

یہی وجہ ہے کہ تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین پر اُمت میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوتی

ہیں۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں حافظ ابن حزم، حافظ ابن المنذر اور علامہ السبکی کے حوالے سے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ ابن عبد البر کے حوالے سے تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین کو یہ کہہ کر پوری امت کا فیصلہ قرار دیا ہے کہ :

اجمع العلماء على جواز رفع اليدين عند افتتاح الصلاة

تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین پر پوری امت کا اجماع ہے۔

یہ اسنادی تواتر ہے اور یہی محدثین کے یہاں زیر بحث آتا ہے۔ حافظ ابن کثیر اور علامہ شوکانی نے ختم نبوت سے متعلق حدیثوں کے بارے میں اسی تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔ علامہ الجزائری نے یہاں ایک فیصلہ کن نوٹ لکھا ہے اس جگہ اس کا ذکر یقیناً فائدے سے خالی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

جب علماء کے یہاں متواتر کا بلا قید ذکر آتا ہے تو ہر شخص کا ذہن متواتر کی قسم اول کی طرف ہی جاتا ہے یعنی متواتر لفظی، علماء کا کچھ حدیثوں کے بارے میں اختلاف ہے، کچھ متواتر بتاتے ہیں اور کچھ انکار کرتے ہیں اس میں محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ نزاع محض لفظی ہے دونوں صحیح کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ متواتر ہے ان کی مراد تواتر معنوی ہے اور جو انکار کرتے ہیں ان کا منشا تواتر لفظی ہے علماء اصول کہتے ہیں کہ قرآن تو تواتر ہی سے ثابت ہے لیکن سنت تواتر اور آحاد دونوں سے ثابت ہے لیکن سنت میں متواتر کم ہے بلکہ راجح فیصلہ یہی ہے کہ سنت میں اگر ہے تو صرف تواتر معنوی ہے اور جو بھی سنت میں تواتر کا مدعی ہے اس کی مراد تواتر معنوی ہے۔

تواتر عمل

اسی کو تواتر کہتے ہیں۔ زمانہ نبوت سے لے کر آج تک کسی کام کو کرنے والے اس قدر ہوں کہ عادیۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ اسلامی عبادات امت کو اسی تواتر سے ملی ہیں

اور قرآن میں بلکہ واجبات و سنن بھی اسی راہ سے آئے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو اولاً صحابہ کے معاشرے نے اپنایا۔ ان کی شخصی زندگیوں میں، ان کے گھروں میں، ان کی معیشت میں، ان کی تعلیم گاہوں میں، ان کی عدالت اور ان کی حکومت میں، غرض صحابہ کرام کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر گوشہ میں جس اُسوۂ حسنہ کا ٹھپہ لگتا تھا اور جس کو ان سے والذین اتبعوہم باحسان کی تعمیل میں تابعین نے لیا اور جس کی اتباع تابعین نے کاپی کی ہے اسی کو محدثین تابعین کی زبان میں السنۃ اور اسی کا نام فقہاء۔ اتباع تابعین کے یہاں ماعلیہ الجماعۃ ہے۔ نمازیں، نیکانہ، نمازوں کی رکعتیں، رمضان کے روزے، تراویح کی رکعتیں، مفادیر زکوٰۃ، اعمال حج، وضو اور حتیٰ کہ وضو میں مسواک کا استعمال اسی تواتر عمل سے ثابت ہے اور یہ بات سب ہی مانتے ہیں کہ عمل میں قول سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اس پر اجمالی تبصرہ تلمیذی الامۃ بالقبول کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اگر سند کے لحاظ سے حدیث ضعیف بھی ہو لیکن اس کی پشت پر عمل کی قوت ہو تو وہ حدیث بھی صحیح قرار پاتی ہے بلکہ حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ :

ینزل منزلة المتواتر في انه ينسخ المقتوع

اس کے ساتھ متواتر جیسا معاملہ ہوتا ہے یعنی اس سے قطعی منسوخ

بھی ہو سکتا ہے۔

محدثین نے تواتر عمل کی وجہ سے ایک سے زیادہ ضعیف حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے مثلاً حدیث ”لا وصیۃ لوارث“ الفاظ مختلفہ میں مروی ہے اور امام ترمذی نے اس کے کچھ طریقوں کی تصحیح اور کچھ کی تحسین بھی فرمائی ہے لیکن حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں :

لا یخلو اسناد کل منها عن مقال

اس کے باوجود انہوں نے لکھا ہے کہ :

جنح الشافعی فی الام الی هذا الفق متواتر

اس کے متواتر ہونے کی وجہ خود امام شافعی نے جو بتاتی ہے وہ ان کی زبان فی سینے :

وجدنا اهل الفتيا ومن حفظنا عنهم من اهل العلم

بالمغازی من قریش لا یختلفون فی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال عام الفتح «لا وصیۃ لوارث» ویأثرونہ ممن لقوه من اهل العلم فکان نقل کافۃ عن کافۃ فهو اقویٰ من نقل واحد۔

ہم نے اہل فتویٰ کو اور ان اہل علم کو جن سے ہم نے اسلام کا علمی سرمایہ حاصل کیا ہے پایا ہے کہ وہ اس میں متفق ہیں کہ حضور اللہ نے فتح مکہ والے سال لا وصیۃ لوارث فرمایا ہے اور یہ لوگ اس ارشاد کو اپنے سے قبل اہل علم ہی سے نقل کرتے ہیں اس لیے یہ نقل کافہ عن کافہ ہے یہ خبر واحد سے بھی قویٰ ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تواتر عمل کی کس قدر طاقت ہے۔ اس پر تو تابعین صحیح حدیثوں کو جانتے تھے اور حدیث کی صحت کا یہ ایک معیار تھا۔

تواتر قدر مشترک

حافظ سیوطی اس کو تواتر معنوی کہتے ہیں۔ ایسی روایات جو متعدد طرق سے آئی ہوں، الفاظ مختلف ہوں، واقعات الگ الگ ہوں لیکن اس میں کوئی قدر مشترک ہو مثلاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شب بیداری کے سلسلے میں کوئی کہتا ہے کہ آپ نے پانچ رکعت نماز پڑھی، کوئی سات، کوئی نو، کوئی گیارہ، کوئی تیرہ، کوئی پندرہ اور کوئی سترہ بتاتا ہے تعداد کو چھوڑ کر رات کو نماز تہجد اس میں قدر مشترک ہے۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ دعائیں میں ہاتھ اٹھانے کی حدیثوں میں بھی اسی قسم کا تواتر ہے۔ اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سو سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔

جیسے قرآن تواتر لفظی کے ذریعے اُمت کو ملا ہے۔ ایسے ہی سنت کا علمی سرمایہ بھی اُمت کو تواتر عمل، تواتر اسناد اور تواتر قدر مشترک کے ذریعے ملا ہے۔ اور میں کتاب کے آغاز میں بتایا ہوں کہ جیسے قرآن کے لیے قراء سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی سنت کے لیے

محدثین کی روایات ہیں نہ تو قرآن پر روایات قرار اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اور نہ سنت پر روایات
محدثین اور نہ قرآن کا قرآن ہونا قرار سب سے کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا
روایات محدثین پر موقوف ہے۔ حدیث تو دراصل تاریخ سنت اور اس کی روایت کا
نام ہے۔ حدیث کے اس روایتی سلسلے سے پہلے بھی سنت موجود تھی اور اس کے بعد
بھی ہے۔ علامۃ الشیخ السید نور شاہ کشمیری نے کیسی عجیب بات فرمائی ہے کہ:

كان الاسناد لئلا يدخل في الدين ما ليس منه كالخروج من

الدين ما ثبت منه من عمل اهل الاسناد۔

روایت و اسناد کا سلسلہ اس لیے بروئے کار آیا تھا کہ دین میں وہ چیز

نہ آئے پائے جو دین میں نہیں ہے اس لیے نہیں کہ دین سے ثابت

شدہ چیز کو خارج کیا جائے۔

قرآن ہو یا سنت دونوں روایتی سلسلے سے الگ ہو کر متواتر ہیں۔ قرآن چونکہ ایک علمی چیز ہے
اس لیے اس کا تواتر بھی علمی ہے اور سنت ایک عملی چیز ہے اس لیے وہ عملاً ہی متواتر ہے
اسی بنا پر احناف نے حدیث مشہور کی عام شاہراہ سے ہٹ کر یہ تعریف کی ہے کہ:

ما كان احاد الاصل متواتراً في القرآن الثاني والثالث

اور حافظ ابو بکر نے اسی بنا پر مشہور کو متواتر کا تقسیم نہیں بلکہ اس کی قسم قرار دیا ہے جہاں
"ہم میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ امام اعظم سے جو صحیح کی تعریف
نقل کی گئی ہے اس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ امام عبد الوہاب الشمرانی
رقمطراز ہیں:-

قد كان الامام ابو حنيفة يشترط في الحديث المنقول عن

رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل العمل به ان

يروي عن ذلك الصحابي جمع القيار عن مثله هكذا۔

جو حدیث حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کی بابت

امام اعظم عمل سے پہلے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متفق لوگوں

کی ایک جماعت اس صحابی سے برابر نقل کرتی چلی آئے۔ یہ قید کہ ”اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت صحابی سے برابر نقل کرتی آئے“ اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ حدیث اگرچہ صحابی کی ذات تک خبر واحد ہو مگر اس کے بعد اسے نقل کرنے والے بہت سے متقی اور پارسارادی ہوں یعنی صحابی سے گزرنے کے بعد قرن ثانی اور قرن ثالث میں وہ متواتر ہو اور جس قید کا امام شعرانی نے پتہ دیا ہے وہ خود امام اعظم سے بصراحت منقول ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے امام سیحی بن معین کی سند سے امام اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ

اخذ بكتاب الله مما اجد فبسنت رسول الله والآثار
الصالح التي فشت عنه في ايدى الثقات عن الثقات۔

اس میں یہ فقرہ کہ ”آپ کی وہ صحیح حدیثیں جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات ہی کے ذریعے شائع ہوئی ہوں“ خاص طور پر قابل غور ہے۔ اس میں آپ نے صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ آپ ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو ثقات میں مشہور ہوں۔ بلاشبہ امام اعظم کا زمانہ دور تابعین ہے۔ اس میں سنت تو تواتر عمل سے آنکھوں کے سامنے موجود تھی اور احادیث تو اثر اسناد کے ذریعے نیکو کار لوگوں کی وساطت سے آتی تھی۔ کشف الاستار میں ہے :

احادیث کی شہرت کا اعتبار قرن دوم و سوم میں ہو گا۔ قرون ثلاثہ کے بعد شہرت کا اعتبار نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں اخبار اُحاد مشہور ہو گئی تھیں حالانکہ ان کو مشہور نہیں کہتے۔

اخبار اُحاد اور امام اعظم

خبر واحد اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ایک دو یا اس سے زیادہ ہوں لیکن اس میں شہرت کے اسباب نہ ہوں۔ امام اعظم اولین شخصیت ہیں جنہوں نے اخبار اُحاد کو قابل استدلال قرار دیا ہے۔ چنانچہ خاص اس موضوع پر حافظ ابن حزم نے امام اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

هذا ابو حنيفة يقول ما جاء عن الله تعالى فعلى الراس

والعین وما جاء من رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمعاً وطاعةً وما جاء
عن الصحابة متخيراً من اقوالهم ولم يخرج عنهم وما جاء
عن التابعين فهم رجال ونحن رجال -

یہ ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ اللہ سبحانہ کی جانب سے آئے یعنی قرآن
وہ سرائیکھوں پر اور جو کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے
آئے اس کے لیے ہم سرائیا شنید و طاعت ہیں اور صحابہ سے جو
کچھ آئے تو ان کے اقوال میں سے ہم انتخاب کریں گے اور کسی
درجہ میں ان کے ارشادات سے علیحدہ نہ ہوں گے اور اگر تابعین
سے آئے تو ہم بھی آدمی ہیں وہ بھی آدمی ہیں۔
ابو حمزہ السکرمی نے امام اعظم کا جو ارشاد نقل کیا ہے وہ اس سے بھی واضح ہے -
امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث
صحیح سند سے آئے ہم اسی کو لیتے ہیں اور اس سے آگے نہیں
جاتے۔

ابو حمزہ کو امام حافظ الدین ابن البراز کردہی نے مناقب میں امام اعظم کے تلامذہ میں شمار
کیا ہے اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حفاظ حدیث کے طبقہ خامسہ میں ذکر کیا ہے ان
کا نام محمد بن میمون مروزی ہے اس لیے امام اعظم کے بارے میں ان کی رائے بڑی قیمتی ہے
الغرض خبر واحد کے حجت ہونے اور قابل عمل ہونے میں امام اعظم اور تیسری صدی کے
محدثین کا موقف ایک ہے۔ حافظ ابوبکر الخطیب خبر واحد کے موضوع پر محدثین کے
موقف کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

خبر واحد پر عمل کرنے کے موضوع پر تمام تابعین کا اتفاق ہے
اور تابعین کے بعد آج تک کے فقہاء امصار کا اس پر ایک ہے
ہمائے علم میں اس کا کوئی بھی منکر نہیں ہے اور نہ اس پر آج
تک کسی نے کوئی اعتراض کیا ہے۔ ان کا یہ اتفاق بتا رہا ہے

کہ ان سب کے نزدیک اس پر عمل واجب ہے اگر کہیں بھی انکا
کا کوئی کانٹا ہوتا تو تاریخ میں اس کا ذکر ضرور ہوتا لیے

اس اتفاق کے باوجود اخبارِ آحاد کے موضوع پر چند اہم مباحث فکر و نظر کی جولانگاہ
ضرور ہے پس مثلاً یہ کہ اخبارِ آحاد کے لیے معیارِ صحت کیا ہے؟ اور اخبارِ آحاد موجب العمل ہونے
کے ساتھ مفید یقین بھی ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں مخصوص نہیں ہیں
اس لیے ان میں فکر و نظر کا اختلاف ناگزیر ہے :-

اخبارِ آحاد کا معیارِ احتجاج

جمہور محدثین کا موقف تو یہ ہے کہ اخبارِ آحاد اس وقت تک قابلِ احتجاج نہیں ہو سکتیں
جب تک ان میں خاص خاص شرائط نہ ہوں۔ امام شافعی نے ایک سائل کے جواب میں ان
شرائط کا تفصیلی جائزہ پیش فرمایا ہے :

خبر واحد میں حجت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں یہ شرائط
ہوں۔ راوی میں ثقاہت اور صداقت کے ساتھ آنا علم ہو کہ
وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے جانتا ہو اور الفاظ سے ہٹ کر معنی
کو دوسرے لفظوں کا لبادہ پہنانے کی صلاحیت رکھتا ہو یا پھر
روایت باللفظ کرتا ہو۔ اگر حافظہ کی مدد سے بیان کرتا ہے تو
حدیث کا حافظ ہو اور اگر کتاب سے روایت کرتا ہے تو کتاب
کا حافظ، ثقات راویوں کا ہمنوا ہو، بدلتس نہ ہو، اس طرح
راویوں کی ساری لڑمی اوپر سے نیچے تک ہوتا انکے حدیث حضور
النور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے لیے

دوسرے محدثین نے بھی اسی معیار کو اپنایا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں :

اما الحديث الصحيح فهو الحديث المسند الذي يتصل
اسناده بنقل العدل الضابط عن العدل الضابط الى

مذتھاء ولا يكون شاذاً ولا معطلاً -

صحیح وہ بائند حدیث ہے جس کی سند میں اتصال ہو، جو عادل ضابط
عادل ضابط کی وساطت سے تا آخر روایت کرے اور شاذ و معطل
نہ ہو۔

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ :

فهذا الحديث الذي محكمه بالصحة

یہی وہ حدیث ہے جس کے صحیح ہونے کا ہم فیصلہ کرتے ہیں بلکہ
حافظ ابن الدین عراقی فرماتے ہیں کہ جب محدثین کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ صادر
کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سند کے لحاظ سے یہ صحیح
ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اس حدیث کی قطعیت بتا رہے ہیں چنانچہ علامہ عراقی فرماتے ہیں :
حيث يقول المحدثون هذا حديث صحيح فمرادهم فيما
ظهر لنا عملاً بظاهر الاسناد لا انه مقطوع بصحته
في نفس الامر بل

اور حافظ ابن الصلاح نے بھی یہی بات لکھی ہے :

ليسي من شرطه ان يكون مقطوعاً به

حافظ ابن ابراہیم الزیر نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ :

لجواز الخطأ والذيان على الثقة بـ

مطلب یہ ہے کہ صحت سے ان بزرگوں کی مراد صرف اصطلاحی صحت ہے۔ قرآن جیسی
واقعی صحت نہیں ایک روایت پر اس اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہر لگ جائیں لیکن
بہر حال غیر معصوم انسانوں کی شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ
ہر بات کے لیے حجت کا فائدہ دے سکتا ہے مگر یقینیات اور قطعیات کے خلاف نہیں
ہو سکتا۔ اگر کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعہ سے ٹکرا جائے گی تو یقینیات اپنی جگہ
سے نہ ہلیں گی۔ راوی کی شہادت کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں کا مزاج الگ الگ ہے ایک حدیث کی صحت اور دوسرے حدیث کی مقبولیت۔ حدیث کی صحت سے بحث کرنا اگر ارباب روایت کا کام ہے تو حدیث کی قبولیت کو بتانا مجتہدین کا فن ہے ہر گوشہ کی طرح یہاں بھی افراط و تفریط کی دورانی پیدا ہو گئی ہیں۔

کچھ وہ ہیں جن کے نزدیک کسی بھی حدیث کا فقہ کی کتابوں میں آجانا ہی حدیث کی صحت کی ضمانت ہے اور ان کتابوں کے مؤلفین کی جلالت علمی سے دب کر حدیث کو صحیح مان لیتے ہیں حالانکہ فقہ کی کتابیں بہر حال مسائل کی کتابیں ہیں ان میں حدیث کی صحت سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے۔ نہ ان کا یہ فن ہے حدیث کے لیے محدثین ہی کی خوشہ چینی چاہیے۔ فقہ احناف میں معرکہ کی کتاب اگر ہدایہ ہے تو فقہ شافعی میں رافعی کی شرح البوحیزر ہے۔ ان دونوں کتابوں کی حدیثوں کو دیکھنا ہو تو حافظ زلیحی کی نصب الراية اور حافظ ابن حجر کی التلخیص کو دیکھنا ہو گا یہ دونوں محدث ہیں اور یہ ان کا فن ہے۔

ملا علی قاری محدث نے اس حدیث کو جو جمعۃ الوداع میں قصائے عمر کے بارے میں آئی ہے موضوعات میں قطعاً باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

لا عبوة بنقل صاحب النهاية وغيره من لقيبة
شرح الهداية ليسوا من المحدثين ولا اسند الحديث
الى احد من المحققين -

اس حدیث کو صاحب نہایہ اور ہدایہ کے دوسرے شارحوں کے نقل کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ نہ خود محدث ہیں اور نہ محدثین کے حوالہ سے پیش کرتے ہیں۔

اور مولانا عبدالحی لکھنوی نے ملا علی قاری کے اس فیصلہ سے عمدۃ العرایہ کے مقدمہ میں جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی گوش گزار فرما لیتے :-

ملا علی قاری کے اس فیصلہ سے یہ عجیب بات معلوم ہو گئی کہ فقہ کی کتابیں اپنی جگہ مسائل کے لیے خواہ کتنی معتبر سہی اور ان کے

مؤلفین بھی چاہے کتنے ہی صاحب کمال اور معتمد ہیں لیکن فقہ کی کتابوں میں آمدہ حدیثوں پر محدثانہ نقطہ نظر سے بھرپور اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ کتنی ہی حدیثیں ہیں جو فقہ کی معتبر کتابوں میں آئی ہیں لیکن فی الواقع وہ موضوع ہیں — ہاں اگر مصنف کتاب زمرہ محدثین سے ہو تو بے شک اس کی بیان کردہ حدیث پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا اگر مصنف حدیث کو کسی محدث کے حوالہ سے پیش کرے تو اس پر بھروسہ ہو سکتا ہے۔ راز اس میں یہ ہے کہ اللہ نے ہر فن کے لیے فن کی شخصیتیں بنائی ہیں۔ اپنی مخلوقات میں سے ہر طبقہ کو کچھ نوعی خصوصیات سے مالا مال کیا ہے۔ کچھ محدثین ایسے ہیں جن کو روایت و اسناد ہی سے کام ہوتا ہے فقہ ان کا میدان نہیں ہے اور کچھ فقہاء ایسے ہیں جن کا مقام بس فقہ میں ہے حدیث میں ان کو کوئی مہارت نہیں ہوتی۔

مولانا نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خود انسان کا وجدان بھی یہی باور کرتا ہے کہ فن والوں سے ہی فن کی بات معلوم ہو سکتی ہے اگر آپ شاعروں سے مسائل یا فقہاء سے اشعار کی تحقیق کریں تو یہ بے محل بات ہے۔ اس موقع پر حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں کہ :

اختلاف طبقات کے باوجود مسلمانوں کے سارے فرقے اس پر متفق ہیں کہ ہر فن میں اس کے فنکاروں کی بات سے استدلال کیا جاسکتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو سارے علوم حرف غلط ہو کر رہ جائیں کیونکہ جو فنکار نہیں وہ یا تو اس میں لب کشائی ہی نہ کرے گا اور کرے گا تو غیر تسلی بخش ہوگی۔ غور کرو اگر قرآن و سنت کے غریب الفاظ کی تحقیق تم قاریوں سے کرو یا قرأت کے مسائل اہل لغت سے پوچھو، معافی، بیان اور نسخ کی باتیں تم محدثین سے

دریافت کرو اور علم الاسناد، علل حدیث کی تحقیق کے لیے تم بارگاہِ مشکوٰۃ
کا رخ کرو تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ علوم و فنون ملیا میٹ ہو کر
رہ جائیں گے۔

دوسری طرف اگر بابِ روایت میں جنہوں نے محدثین کی تصحیح کو ہی صرف حدیث کی مقبولیت
کا معیار بنا لیا ہے۔ انہوں نے ائمہ نقادین سے دائرِ فطرتی وغیرہ پر محدثانہ نقطہ نظر غالب دیکھ کر
اپنی توجہات کامرکز صرف اسناد ہی کو بنا لیا اور متن سے نظریں ہٹا لی ہیں۔ حالانکہ حدیث
اسناد و متن دونوں کا نام ہے۔ حدیث کی صحت کی حد تک اسناد کی تحقیق کرنا اگر محدثین کا کام ہے
تو حدیث کے متن کی حد تک قبولیت کو بتانا مجتہدین و فقہاء کا کام ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر
نے حافظ ابن حبان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

ان النظر ان كان للسند فالشیوخ اولى وان كان للمتن فالفقهاء
اگر سند سے متعلق تحقیق کرنی ہو تو محدثین سے کرنی چاہیے اور اگر
متن کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو فقہاء سے پوچھنا چاہیے۔
اس کی وجہ امام حازمی نے یہ بتائی ہے۔

لان قصدہم اثبات الاحکام ومجال نظرہم فی ذلک متسع
فقہاء کا پیش نہاد احکام ثابت کرنا ہے اور اس میں ان کا میدان
وسیع ہے۔

علامہ خطابی کو بھی اس افراط و تفریط کی شکایت ہے۔ یہاں ان کے بیان کو ناظرین کی
ضیافتِ طبع کی خاطر پیش کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ:-
میں نے اپنے زمانے میں علماء کو دو گروہ میں منقسم دیکھا ہے۔
محدثین اور اگر بابِ فقہ ان دونوں علموں میں مقام اور محل کے لحاظ
سے انتہائی قرب کے باوجود یہ دونوں طبقے باہم بچھڑے ہوئے
بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ محدثین کی اکثریت کی تنگ و دو طرفہ
روایات سمیٹنے اور طرق کی یکجا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ غرائب او

شواہد کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں متون کا ان کو کوئی پتہ نہیں ہے
 معافی سے نابلد اور استنباط سے بالکل نا آشنا ہیں۔ فقہاء پر زبان
 طعن و تشنیع استعمال کرتے ہیں۔ فقہاء کے خلاف ان کا آوازہ
 ہے کہ یہ سنن کی مخالفت کرتے ہیں لیکن فقہاء کے مقام علمی کی
 ان بیچاروں کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ زبان کی اس غلط کروٹ
 سے خود ہی گناہ کما سے ہیں۔ فقہاء کا حال یہ ہے کہ حدیث کی
 حد تک ان کو قدس علم تو ہے مگر ان میں صحیح، سفیم، کھری کھوٹی
 میں تمیز کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔

علامہ الجزائری نے توجیہ النظر میں بھی اس قسم کی شکایت کی ہے۔ بہر حال یہ موضوع تفصیل
 طلب ہے لیکن چونکہ ایک اہم اصولی سوال ہے اس لیے اس باب میں تحقیق کی راہ یہ
 ہے کہ حدیث کی صحت کے بارے میں محدثین سے اور حدیث کی قبولیت کے متعلق مجتہدین و
 فقہاء سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اخبار اُحاد سے احتجاج کا مسئلہ صرف حدیث کی صحت سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا صحت
 کے ساتھ قبولیت سے بھی تعلق ہے۔ امام اعظم محدث ہونے کے ساتھ چونکہ فقیہ اور مجتہد بھی ہیں
 اس لیے حدیث کی صحت کے ساتھ حدیث کی قبولیت کی بھی شرطیں بتائی ہیں۔ حدیث کی
 صحت کے موضوع پر وہ بھی وہی کچھ فرماتے ہیں جو عام ارباب روایت کا مسلک ہے لیکن
 حدیث کے مقبول اور قابل عمل ہونے کے لیے انہوں نے کچھ شرائط پیش کی ہیں۔ ان میں اہم
 یہ ہیں کہ :

- ۱۔ روایت دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو۔
- ۲۔ معافی قرآن سے متصادم نہ ہو۔
- ۳۔ سنت مشورہ کے خلاف نہ ہو۔
- ۴۔ صحابہ و تابعین کے عمل متواتر کے خلاف نہ ہو۔
- ۵۔ خبر واحد کا تعلق عموم بلوی سے نہ ہو۔

مسئلہ اصول خلا روایت

امراول یعنی یہ کہ روایت دین کے مسئلہ اصول کے خلاف نہ ہو۔ اس کی اہمیت تمام ارباب اجتہاد نے ہمیشہ تسلیم کی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز امام اعظم کے اس معیار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
 شریعت کا علمی سرمایہ دو قسم کا ہے قوانین کلیہ اور حوادث جزئیہ۔
 قوانین سے مقصود ضوابط عامہ ہیں مثلاً یہ کہ شہادت پیش کرنا مدعی کا کام ہے شریعت و اصل ان ہی قوانین کا نام ہے۔ مجتہد کا کام ہے کہ ان ضوابط کو حوادث جزئیہ سے متاثر نہ ہونے دے۔

(فتاویٰ عزیزی)

علامہ شاطبی اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :
 قوانین عامہ پر جزئی اور خصوصی واقعات اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ قواعد کلیہ قطعی ہوتے ہیں اور حوادث جزئیہ ظنی ہوتے ہیں۔ گمان و ہم سے یقین و اذعان کی عمارت منہدم نہیں ہو سکتی اور نہ ظن میں یقین کا مد مقابل بننے کی تاب ہے۔ نیز قواعد کلیہ دلائل قطعیہ سے غذا حاصل کرتے ہیں اس لیے ان میں کسی دوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف حوادث کے کہ ان میں ہر وقت اور ہمہ آن دوسرے احتمالات کا امکان رہتا ہے۔ احادیث و اخبار کی حیثیت جزئیات کی ہے اور قواعد کا مقام کلیات کا ہے۔

شریعت میں اس کی ایک سے زیادہ مثالیں ہیں۔ صرف ایک مثال مدیہ ناظرین کرتا ہوں۔
 قرآن و سنت میں وضو میں سر کے مسح کا ایک عمومی ضابطہ قرآن میں ہے۔

وا مسحوا برؤسکم

اور سنت سے بھی اس ضابطہ کی کلیت معلوم ہوتی ہے لیکن کچھ حدیثوں میں سر کی جگہ عامہ پر مسح کا ذکر آیا ہے۔ مسند احمد، بخاری، ابن ماجہ میں بحوالہ عمرو بن أمیہ۔ ترمذی، ابن ماجہ،

مسند احمد، مسلم، نسائی میں بحوالہ بلال، ترمذی میں بحوالہ میسرہ۔ طبرانی میں بحوالہ ابی امامہ اور مسند احمد میں بحوالہ ثوبان اور سلمان عمامہ پر مسح کے بارے میں احادیث آئی ہیں۔

ان حدیثوں کی وجہ سے مسح راس کے اس ضابطہ حتمی کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا جو قرآن اور سنت متواتر سے ثابت ہے۔ اگر روایات مسح عمامہ صحیح بھی ہوں تو ان کو مطالبہ کا ایسا جامہ پہنایا جائے گا جس سے مسح راس کی قطعیت پر کوئی حرف نہ آتے۔ علامہ عبد اللہ دراز دمیکی رقمطراز ہیں :

جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح عمامہ کی روایات آئی ہیں۔ یہ روایات وضو میں مسح راس کے قاعدہ عام پر ہرگز اثر انداز نہ ہوں گی۔ اگر روایات صحیح بھی ہوں تو ان کو کسی وقت عذر پر محمول کیا جائے گا مثلاً سر میں زخم یا کسی اور بیماری کو اس قاعدہ عامہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔

علامہ شاطبی اس پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

جب بذریعہ استقرار ایک قاعدہ کلیہ ثابت ہو چکا ہے پھر اگر کوئی جزئیہ سامنے آجائے جو اس قاعدہ کے خلاف ہو تو جزئیہ کے لیے ایسا محمل تجویز کرنا ہو گا جس سے وہ قاعدہ عام سے ہم آہنگ ہو جائے کیونکہ قاعدہ کی کلیت کا علم تو پوری شریعت کے سسٹم کو دیکھ کر ہوا ہے یہ ناممکن ہے کہ اس خاص جزئیہ کی وجہ سے قواعد کی عمارت کو مسمار کیا جائے۔

اس میں امام مالک بھی امام اعظم کے ہم نوا ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دوسری صدی صدی فقہاء و محدثین کا مسلک ہے کہ اخبار احاد کے قابل عمل اور قابل احتجاج ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے قوانین کلیہ کے خلاف نہ ہوں اور ان بزرگوں کو یہ مسلک ابو بکر، عمر، عائشہ اور ابن عباس سے ورثہ میں ملا ہے۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس پر مستقل عنوان کے تحت بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ، ابن عباس اور عمر بن الخطاب نے

اخبارِ احاد کو اصولِ اسلامیہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے رد کر دیا تھا اور اس موضوع پر شاطبی نے امام مالک کا مذہب بھی کھول کر بتایا ہے وہ فرماتے ہیں:

اس مسئلے کی سلف میں اصل موجود ہے حضرت عائشہ نے حدیث
ان المیت لیعذب ببکامل اھلہ کو اسی وجہ سے رد کر دیا کہ قرآن
کے اس ضابطہ عام کے خلاف ہے لا تزدوا ذرۃ و ذرا حی - نیز
ابن عباس کی اس روایت کو جس میں روایت باری کا ذکر ہے حضرت
عائشہ نے لا تدركہ الابصار کے ضابطہ کی وجہ سے نامنظور کیا -
ایسے ہی حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ
کی اس روایت پر تنقید کی جس میں برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے
پہلے ہاتھ دھونے کی ہدایت ہے - نیز حضرت ابن عمر کی نحوست والی
روایت کو ضابطہ رانی ان الامر کلہ للہ کے خلاف قرار دیا اور بتایا
کہ یہ بات منہد نحوست کا اسلام نے اعلان کیا ہے بلکہ اصل یہ ہے
کہ حضور فرما - کہ ایم جاہلیت میں لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ

الغرض دوسری صدی کے محدثین کا نقطہ نظر اخبارِ احاد کے بارے میں واضح اور صاف یہ
تھا کہ خبر واحد اگر شریعت کے کسی مسلمہ قاعدے کے خلاف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں ہے
علامہ شاطبی نے امام مالک کا بھی یہی مذہب بتایا ہے اور علامہ ابن عربی نے بھی امام مالک
کا راجح مسلک یہی قرار دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

اذا جاز الخبر معارضا لقاعدة من قواعد الشرع هل يجوز
العمل به ام لا؟ فقال ابو حنيفة لا يجوز العمل به و
قال الشافعي يجوز و تردد مالك في المسئلة قال ومثله
قوله والذي عليه الماحول ان الحديث ان عندنا
قاعدة اخرى قال به و ان كان وحده تركه
اگر خبر واحد کسی قاعدہ شریعت کے معارض ہو تو کیا اس پر عمل جائز ہے؟

امام ابو حنیفہ تو فرماتے ہیں کہ ناجائز ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ جائز ہے
اور امام مالک کا قول مشہور اور قابل اعتماد یہی ہے کہ حدیث کی تائید
میں اگر کوئی قاعدہ ہو تو عمل جائز ہے اور اگر نہ ہو تو اس کو چھوڑ دینا
چاہیے۔

اس کے برعکس تیسری صدی کے محدثین نے اس اساس سے ہمنوائی نہیں کی بلکہ انہوں نے
اخبار آحاد کے ذریعے آئی ہوئی ہر خبر واحد کے بارے میں فیصلہ کر دیا کہ ہر صحیح حدیث بجائے خود
ایک اصول ہے جس طرح قرآن حکیم ایک اصول ہے اور صحیح حدیث وہ ہے جو محدثین کی طے
کردہ اصطلاحی صحت پر پوری اترے۔ چنانچہ علامہ خطابی رقمطراز ہیں :

والاصل ان الحدیث لما ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم وجب القول به وصار اصلاً في نفسه۔

حدیث جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو اسے
اپنا نا واجب ہے اور وہ خود ایک اصل ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ :

الحدیث الصحیح اصل بنفسہ،

حدیث صحیح خود ایک اصل ہے۔

ابن السمعانی کے حوالہ سے بھی یہی بتایا گیا ہے کہ :

متی ثبت الخبر صار اصلاً من الاصول ولا يحتاج الى

عرضہ علی اصل اخر۔

جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہ خود ایک اصل ہو جاتی ہے۔

فکر و نظر کے اس اختلاف کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کے مسلمات میں ترمیم کرنی پڑ گئی
اور ہر حدیث کے صحیح ہونے کے بعد تیسری صدی میں اسلام میں اصول ہی اصول ہو گئے۔
مثلاً عرض کرتا ہوں کہ صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں حدیث آتی ہے۔

عن ابی ہریرۃ انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم لکذب ابراہیم الا ثلاث کذبات
ثنتين منها في ذات الله تعالى قوله اني سقيم وقوله
بل فعله كبيرهم هذا واحدة في سارة -

اگر اس معیار کو مان لیا جائے کہ ہر حدیث ثابت ہونے کے بعد ایک اصل ہے تو نبی
کا کذب بھی اسلام کے اصولوں میں سے ایک اصل بن جائے گا معاذ اللہ ثم معاذ اللہ
حالانکہ نبی کی سچائی اور اس کی صداقت مانے ہوئے اصولوں میں سے ایک مسلمہ اصول ہے۔
وحی و نبوت کے سارے کارخانے کی رونق نبوت کے اسی وصف سے وابستہ ہے۔ اسی
بنا پر علماء اور مشراح حدیث کو اس حدیث کے لیے مطالب کے جانے تلاش کرنے پڑے
اور ایک نہیں۔ بلکہ متعدد وجوہات کرنی ناگزیر ہو گئیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ حضرت
ابو ہریرہ کی یہ حدیث دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ نبوت ایک سیرت ہے جو
صرف سچائی ہی سے بنتی ہے اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک
نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا لیکن اس بات سے کہ سچ نہ بولے وہ قطعاً عاجز ہوتا ہے
حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے کبھی وہ نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے
انبیاء کی سچائی اور عصمت دین کے یقینیات قطعیہ میں سے ہے اور روایت چاہے کتنی ہی
بہتر قسم کی کیوں نہ ہو لیکن ہر حال میں راوی کی شہادت ہے اور راوی بھی غیر معصوم۔ اس
کی شہادت ایک لمحہ کے لیے یقینیات قطعیہ اور دین کے مسلمہ اصولوں کے مقابلے میں تسلیم
نہیں کی جاسکتی۔ اور الجزا ئری نے جو بعض کی طرف منسوب کر کے اور امام رازی نے جسے امام
اعظم کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ :

هذا الحديث لا ينبغي ان يقبل لان فيه نسبة الكذب

الى ابراهيم -

اس حدیث کو شرف قبول حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت

ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت ہے۔

اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ :

جب ایک غیر معصوم راوی کی غلطی ماننے اور معصوم نبی کی طرف
جھوٹ کی نسبت میں تعارض ہو جائے تو ہم راوی کی غلطی مان لیں گے

لیکن نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت گوارا نہ کریں گے۔

حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے :

ان لا تدعی العصمة فی السواک

ہم راویوں میں عصمت کے دعویدار نہیں ہیں۔

راویوں میں محدثین زیادہ سے زیادہ عدالت کے مدعی ہیں اور عدالت اور عصمت میں جب بھی تعارض ہو گا تو عصمت کو راجح قرار دیا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے ورنہ اس قسم کی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

معانی قرآن سے متضادم روایت

حدیث کی اصطلاحی صحت کے بعد دین کی زندگی میں اسے اپنانے اور اس کی مقبولیت کے لیے امام اعظم ایک شرط یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ حدیث کسی وجہ سے معانی قرآن سے متضادم نہ ہو اور اس شرط کے غائد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مدلول اور مفہوم میں قطعی نہیں ہے لیکن اپنے منطوق میں وہ حتمی اور قطعی ہے اور احادیث اخبار احاد ہونے اور روایت بالمعنی کی وجہ سے اپنے منطوق، اپنے مفہوم میں ہرگز ہرگز قطعی نہیں ہیں۔ ایک روایت پر اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں ثبت ہو جائیں مگر آپ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ راوی جو کچھ تیار ہا ہے یقیناً یہ الفاظ نبوت ہی ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

قد یختلف صیغ حدیث لاختلاف الطرق و ذالک

من جهة نقل الحدیث بالمعنی۔

حدیث میں الفاظ متعدد طرق سے آنے کی وجہ سے مختلف ہوتے

ہیں اور یہ اختلاف الفاظ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کی

روایت بالمعنی ہوتی ہے بلکہ

امام اعظم کا یہ ضابطہ حافظ ابن عبد البر نے اس طرح پیش کیا ہے کہ :

امام اعظم اخبار احاد کو اپنے یہاں جمع کردہ حدیثوں اور معانی قرآن پر پیش فرماتے تھے۔ ان حدیثوں میں جو اپنے معنی میں منفرد ہوتی تھیں ان کو ترک کر دیتے اور ان کا نام شاذ رکھتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار احاد اگر معانی قرآن کے خلاف ہوتی تھیں تو آپ کے یہاں درج قبولیت نہ ملتا تھا۔ خواہ وہ معانی قرآن کا منطوق ہوں یا مدلول۔ اگر خبر واحد ان کے خلاف ہوتی تو خبر کی صحت میں آپ اسے علت قاضی قرار دیتے۔ دراصل اخبار احاد میں تعلیل کا مسئلہ نہایت ہی نازک ترین مسئلہ ہے۔ محدثین کی نظر تو اس موضوع پر صرف اسناد اور الفاظ متن ہی پر ہوتی ہے لیکن مجتہدین کی نظر اس معاملہ میں الفاظ متن اور اسناد ہی پر نہیں ہوتی بلکہ ان کو تقابلی مطالعہ میں اسے شریعت کے پورے نظام کو سامنے رکھ کر جانچنا ہوتا ہے اسی لیے کسی حدیث کے ضعیف ہونے کی وجوہ نہ صرف متعدد ہوتی ہیں بلکہ متباہیت ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ امام حارمی رقمطراز ہیں :

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اخبار احاد کے ضعیف ہونے کی وجوہ ایک سے زیادہ ہونے کے ساتھ مختلف بھی ہوتی ہیں اور اہل علم اس موضوع پر مختلف نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں اور ان میں بزرگترین یہ ہے کہ حدیث کی مقبولیت کا دار و مدار ظاہر شرع کی ہمنوائی پر ہے اور محدثین کے نزدیک دوسرے اسباب ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے یہاں تعلیل اخبار کے جوہر پر مقرر ہیں ان کا تعلق نہ صرف محدثانہ نقطہ نظر سے ہے اور فقہاء کے یہاں صرف یہی پیمانہ نہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ دوسرے سانچوں میں بھی اخبار کو رکھ کر جانچتے ہیں۔ ایک مثال سے اس کی توضیح کرتا ہوں۔

یہ بخیر اور دوسرے ارباب صحاح نے حدیث روایت کی ہے کہ :

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المعبایحان بالخیار مالم یتفرقا۔

یہ حدیث صحیح ہے اور حدیث کی کتابوں میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ محدثین نے اس

حدیث پر غور کیا اور غور و فکر کے بعد ان کو اس کی سند میں ایک جگہ نازک ترین علت معلوم ہوئی۔
بتانے والوں نے اس کا سلسلہ سند یوں ظاہر کیا۔

یعلیٰ بن عبید عن سفیان الثوری عن عمرو بن دینار عن ابن عمر عن النبی۔
حدیث متصل ہے لیکن الجزائری کہتے ہیں کہ اس میں علت موجود ہے اور اس علت کی
وجہ سے بلحاظ سند حدیث صحیح نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

و هو محل غیر صحیح

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ علت کیا ہے؟ الجزائری نے بتایا ہے کہ

والعلة في قوله عن عمرو بن دينار إنما هو عن عبد الله
بن دينار عن ابن عمر هكذا رواية الأئمة من أصحاب
سفیان فهم یعلیٰ بن عبید و عدل عن عبد الله بن
دينار الى عمرو بن دينار وكلاهما ثقة۔

اس میں علت یہ ہے کہ سند میں عمرو بن دينار آیا ہے حالانکہ عمرو بن
دينار نہیں بلکہ عبد اللہ بن دينار ہے۔ ائمہ نے ایسا ہی روایت کیا
ہے یعلیٰ بن عبید کو وہم ہو گیا اور عبد اللہ کی جگہ عمرو مذکور ہو گیا۔
یہ محدثانہ تعلیل ہے لیکن حدیث میں جو فقہاء یعنی امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے علت قاوہ
معلوم کی ہے وہ اس کے سوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث زمانہ فقہاء سبعہ میں منظر عام پر
نہیں آئی اور ان کے معاصرین اس سے آشنا نہیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

فراعى مالك والبوحنيفة هذا علة قاذحة في الحديث۔

بہر حال امام اعظم اخبار احمد کو معافی قرآن کے سانچے میں تول کر حدیث کی مقبولیت کا فیصلہ
کرتے ہیں۔ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں:-

خلاصہ یہ کہ حدیث جب شریعت کے موافق ہو قرآن اس کا مصدق
ہو اور آثار اس کے مؤید ہوں تو ایسی حدیث کی تصدیق واجب
ہے لیکن اگر حدیث شریعت کے خلاف ہو قرآن اس کی تکذیب

کرتا ہو تو ایسی حدیث کا رد کرنا ضروری ہے اور یہ اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ یہ فرمودہ نبوت نہیں ہے بلکہ مشہور محدث ابو بکر خطیب بغدادی فرماتے ہیں :
 اخبار احاد کو مندرجہ ذیل صورتوں میں قبول نہ کیا جائے گا جب عقل صریح کے خلاف ہو، جب حکم قرآنی کے خلاف ہو، جب سنت مشہورہ کے خلاف ہو اور جب کسی ایسے عمل کے خلاف ہو جو سنت کے قائم مقام ہو کر چل رہا ہے اور جب کسی بھی دلیل قطعی کے خلاف ہو۔

خطیب بغدادی ہی نے الفقیہ والمتفقہ میں یہ بات اس سے زیادہ وضاحت سے پیش کی ہے۔ علامہ زاہد کوثری نے الفقیہ والمتفقہ کے حوالہ سے ان کا یہ بیان قلم بند کیا ہے اور اسے مولانا ابوالوفاء افغانی نے الرد علی سیرالاذاعی کی تعلیق میں نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں :
 جب ثقہ مامون راوی کوئی حدیث متصل الاسناد روایت کرے تو اسے صرف ان وجوہ کی بنا پر رد کیا جاسکتا ہے۔

اول عقل کے صریح خلاف ہو۔ دوم حکم قرآنی یا سنت متواترہ کے خلاف ہو۔ اگر ایسا ہو گا تو یقیناً حدیث بے اصل ہے اور یا پھر منسوخ سوم اجماع کے خلاف ہو کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ حدیث صحیح ہو اور امت کسی ایسی چیز پر مجتمع ہو جائے جو اس کے خلاف ہو۔ چہارم راوی کسی ایسی بات کے بیان میں منفرد ہو جسے سب کو جانتا چاہیے پنجم راوی کوئی ایسا انکشاف کرے جسے عادتاً متواتر ہونا چاہیے۔
 ان پانچوں صورتوں میں خبر واحد قابل پذیرائی نہ ہوگی بلکہ حافظ ابو بکر الجصاص نے قرآنی آیت ۱ تبصروا ما انزل الیک من دیکر پر یہ نوٹ لکھا ہے اس آیت قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن کا اتباع بہر حال واجب

۱۔ المختصر ص ۶۲ - ۲۔ الکفایہ ص ۴۳۲ -

۳۔ الفقیہ والمتفقہ بحوالہ التعلیق الرد علی سیرالاذاعی ص ۶۸ -

ہے اور قرآن پر اخبارِ احاد کو بالادستی حاصل نہیں ہے کیونکہ قرآن کی اتباع و لائق قطعیت سے ثابت ہے اور احاد کا ثبوت قطعی ہے اس لیے کسی حال میں کسی حدیث کی بنا پر قرآن کو نہ چھوڑا جائے گا اور نہ احاد کی وجہ سے قرآن پر کوئی اعتراض ہوگا۔

اس موقع پر علامہ عبدالعزیز بخاری کے اس بیان سے چشم پوشی کرنا اس مقام سے بے انصافی ہوگی جو انہوں نے کشف الاسرار میں لکھا ہے :

فتیہ راوی کی حدیث کو قرآن کی مخالفت کی بنا پر رد کرنا سب کے درمیان اتفاقی ہے۔ علاوہ ان ظاہریہ کے جو اخبارِ احاد کو بھی متواتر کی طرح قطعی کہتے ہیں۔ ان کے مکتب میں خبر واحد اور کتاب اللہ کو ایک ترازو میں تولد جاتا ہے ان سے اس موضوع پر بات ہی بیکار ہے۔

بہر حال امام اعظم اور امام مالک حدیث کی صحت کے بعد اس کی مقبولیت میں معافی قرآن کے خلاف ہونے کو علت قادمہ قرار دیتے ہیں اور اس بنا پر انہوں نے ایک سے زیادہ حدیثوں کو معطل قرار دے کر ناقابل پذیرائی بنایا ہے۔ ترمذی، ابن ماجہ اور بیہقی میں حدیث آتی ہے

عن عبد الله ان غيلان بن سلمة الثقفي اسلمه

عشرة نسوة في الجاهلية فاسلمن معه فامر النبي

صلى الله عليه وسلم ان يخيبر منهن اربعاً۔

امام ترمذی نے اسے بحوالہ زہری عن سالم عن عبد اللہ روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے تو محدثانہ انداز میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ

هذا حديث غير محفوظ

اور صحیح روایت کی نشاندہی کی ہے۔ شیخ علاء الدین مغلطائی فرماتے ہیں کہ

احادیث هذا الباب كلها معلولة وليست اسانيد هاقوية

لیکن قاضی ابو یوسف نے اس کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس سے ان کی حدیث و

فتیہ میں جلالتِ نشان کا اندازہ ہوتا ہے فرماتے ہیں :

هو عندنا شاذ والشاذ من الحديث لا يؤخذ به
یہ تو محدثانہ فیصلہ ہے لیکن اس کی جو توجیہ ارشاد فرمائی ہے اس سے ان کی مجتہدانہ جلالیت
قدر معلوم ہوتی ہے فرماتے ہیں :

لان الله تعالى لم يحل الا نكاح الاربع فما كان من فوق
ذالك كله فحرام من الله في كتابه -

کیونکہ اللہ سبحانہ نے ایک وقت میں چار سے نکاح حلال کیا ہے
پانچ کا ایک کے نکاح میں اجتماع حرام ہے بلکہ
دیکھ لیجئے معافی قرآن سے تصادم ہونے کو شاذ ہونے کی علت قرار دیا ہے۔ (اسی قبیل
سے حدیث مصراۃ ہے یعنی حضرت ابو ہریرہ کی مندرجہ ذیل حدیث -

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
کہ اونٹ، بکری کو مصراۃ نہ بناؤ جو کوئی ایسا جانور خریدے تو وہ دودھ
دوہنے کے بعد اختیار رکھتا ہے چاہے اسے لکھے اور چاہے تو اسے
واپس کر دے اور اس کے ساتھ بائع کو ایک صاع کھجور دے دے۔

امام اعظم نے اس حدیث کو معافی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے غیر مقبول قرار دیا ہے۔
اس حدیث کی رو سے سوئے کی واپسی کی صورت میں خریدار کو دودھ کا تاوان کھجور کی صورت میں ادا
کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلاشبہ عیب کی موجودگی میں مشتری کو معاملہ فسخ کرنے کا حق حاصل
ہے لیکن خریدار پر دودھ برتنے کی پاداش میں کھجور کا تاوان قرآن کے بتلائے ہوئے ضابطہ ضمان کے
خلاف ہے۔ قرآن نے متلفات اور عدوانات میں تاوان ذوات الامثال میں مثلی بتایا ہے۔ قرآن
کی یہ آیات اس کی صریح شہادت ہیں -

فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم
پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو چاہیے کہ جس طرح کا معاملہ اس نے
تمہارے ساتھ کیا ہے بالکل ویسا ہی معاملہ تم بھی اس کے ساتھ کرو۔

ایک اور ارشاد ہے :

وان عاقبتہم فحاقبوا بمثل ما عواقبتہم بہ
 اور اگر تم سزا دو تو چاہیے کہ اتنی ہی سزا تم دو جیسی تمہیں دی گئی ہے۔
 یہ آیات قرآنی صراحتہً کہہ رہی ہیں کہ عدوانات کی حدود میں تاوان منکبات میں مشمل ہوتا ہے
 ان ارشادات ربانی کی روشنی میں دودھ کا تاوان دودھ ہونا چاہیے کیونکہ دودھ ذوات الامثال سے
 ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد تاوان کے موضوع پر ایک ضابطہ کی صورت
 میں اُمت کو شہرت کی راہ سے ملا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے یہ آپ کا عدالتی فیصلہ ہے۔
 عن عائشہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی ان الخراج بالضمان
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ خراج ضمان کے ساتھ ہے
 یہ قرآن و سنت کے واضح اصول ہیں اور یہ روایت ان کے معارض ہے اس لیے امام اعظم
 اس روایت کو مقبول نہیں قرار دیتے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے اس روایت کا دوسرے پہلو
 سے جائزہ لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

دودھ جسے خریدار نے گھر لاکر نکالا ہے اس میں خریدنے سے پہلے
 کچھ مالک کی ملک تھا اور کچھ خریدار کے یہاں آکر پیدا ہوا ہے۔ وہ
 خریدار کی ملک ہے۔ کھجوروں کا جو صاع مالک کو دیا جا رہا ہے وہ
 اگر سائے دودھ کا بدل ہے تو یہ حدیث الخراج بالضمان کے خلاف
 ہے کیونکہ جو دودھ خود ملک مشتری میں پیدا ہوا ہے وہ تو اس کا
 ہے خریدار پر کھجور کا تاوان بلا وجہ ہے چنانچہ امام شافعی کا بھی
 یہی مذہب ہے کہ اگر خریدار نے صیورۃ کے علاوہ کسی اور وجہ
 سے جانور واپس کر دیا تو خریدار پر ضمان نہیں ہے۔ اور اگر یہ صاع
 اس دودھ کا بدل ہے جو سوئے کے وقت جانور کے پستانوں
 میں موجود تھا تو پھر بیع الکالی بالکالی ہے جس سے جناب رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دودھ خریدار کی ملک
 نہیں ہے نہ سوئے کی وجہ سے اور نہ حدیث الخراج بالضمان کی
 رو سے۔ خریدار نے اگر پی لیا ہے تو اس کے ذمہ دین ہے اس
 لیے دونوں میں سے کوئی صورت ہو ایک حدیث کا چھوڑنا

ناگزیر ہے۔

علامہ خطاب نے جہاں اس حدیث پر گفتگو فرماتے ہوئے امام اعظم کے موقف کا تذکرہ کیا ہے وہاں واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ امام اعظم اس پر اس لیے عمل نہیں کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں اسے خبر مخالف للاصول لان فیہ تقویم المتلف بخیر الفسود و فیہ ابطال رد المثل فیما لم یتمثل۔

یہ حدیث اصول کے خلاف ہے اس میں تلف شدہ چیز کا ضمان بغیر نقدی کے دیا جا رہا ہے اور اس طرح یہ حدیث مثلیات میں مثلی کے فینے کے اصول کو رد کرتی ہے۔

اور معلوم ہے کہ یہ اصول قرآن کا بتایا ہوا ہے اس لیے یہ حدیث معانی قرآن کے معارض ہے۔ علامہ ابن دینار العید نے یہ فرما کر کہ

لم یقل ابو حنیفۃ بهذا الحدیث

لکھا ہے کہ ابو حنیفہ اس پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ حدیث ان کی رائے میں اصول معلومہ کے خلاف ہے اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اخبار اہل اصول معلومہ کے مخالف ہوں تو ان پر عمل واجب نہیں ہے۔ حدیث کے اصول معلومہ کے مخالف ہونے پر امام اعظم کے موقف کو جن آٹھ وجہوں سے منقح کیا ہے ان میں اولین وجہ یہ بتائی ہے کہ

یہ کہ مثلیات میں تاوان مثلی اور قیمتی اشیاء میں قیمت سے ہوتا ہے اس حدیث میں دو وہ اگر مثلیات سے ہے تو اس کا تاوان دو وہ سے ہونا چاہیے اور اگر قیمتی ہے تو اس کی قیمت دی جانی چاہیے لیکن حدیث میں تاوان جو بخیر کیا گیا ہے نہ وہ مثلی ہے اور نہ قیمتی بلکہ تاوان میں کھجوریں دی گئی ہیں اس لیے یہ حدیث اس اصول کے مخالف ہے۔

امام اعظم کے موقف کی وضاحت کے بعد ان لوگوں کی جانب سے جوابات بھی نقل کیے گئے ہیں جو ظاہر حدیث پر عمل پیرا ہیں۔ مخالفین اس حد تک تو امام اعظم کے ہمناویاں ہیں کہ اخبار اہل اصول کے مخالف ہے۔

اگر اصول معلومہ کے معارض ہوں تو قابل قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ ابن دقیق العید رقمطراز ہیں :
 خص المردن خبر الواحد بالمخالفة للاصول لا بمخالفة
 قیاس الاصول۔

لیکن اس میں ان کو تامل ہے کہ حدیث مصراۃ بھی اصول معلومہ کے مخالف ہے یا نہیں
 ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اصول معلومہ کے مخالف نہیں ہے بلکہ قیاس اصول کے خلاف
 ہے۔ علامہ شوکانی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔

ان المتوقف فی خبر الواحد انما هو اذا كان مخالفاً للاصول
 لا بقیاس الاصول لہ

یہی جواب امام شوکانی کی رائے میں سب سے زیادہ شاندار ہے یعنی حدیث مصراۃ اصول معلومہ
 کے نہیں بلکہ قیاس اصول کے مخالف ہے لیکن علامہ ابن دقیق العید نے اس جواب کی یہ کہہ
 کر رد فی ہذا نظر (محل نظر ہے) کمزوری کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجر اور علامہ
 خطابی کو جب اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ملی کہ حدیث مصراۃ اصول معلومہ کے خلاف
 ہے تو انہوں نے اصول اور قیاس اصول سے نظر ہٹا کر اپنے مخصوص ذہن کے تحت یہ حدیث
 پیدا کر دی کہ محدثین کی اصطلاحی صحت کے بعد ہر حدیث خود ہی ایک اصل کی حیثیت اختیار
 کر لیتی ہے چنانچہ علامہ خطابی فرماتے ہیں :

ان الحدیث اذا ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 وجب القول بہ، وصار اصلاً فی نفسه۔

حدیث جب حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو اسے اپنا
 واجب ہے اور وہ حدیث خود اصل ہے لہ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی یہی بات دہرائی ہے
 الحدیث الصیح اصل بنفسہ۔ لہ

لیکن یہ صرف ان ذہنوں کا تخلیقی کارنامہ ہے جو قرآن کے ساتھ بلحاظ ثبوت احادیث
 کی قطعیت کو مانتے ہیں۔ یہ عامہ اہل علم کا موقف نہیں ہے اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ اپنے مقام

پر اے گا۔

حدیث مصراۃ کے بارے میں امام اعظم کا صحیح موقف تو یہی ہے کہ یہ حدیث معانی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ خود احناف نے بھی امام اعظم کے موقف کو صحیح انداز میں پیش نہیں کیا اس لیے یہاں چند در چند سوالات ابھر آئے۔

عیسیٰ ابن ابان نے امام اعظم کے موقف کی ترجمانی اس طرح کی کہ ایسی اخبار اُحاد جن کے لیے کسی صورت میں بھی قیاس میں گنجائش نہ نکل سکے اور راوی فقیر نہ ہو اسے رو کر دیا جائے اور یہ حدیث مصراۃ اسی قبیل سے ہے چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی لکھتے ہیں :

مذهب عیسیٰ بن ابان من اصحابنا اشتراط فقہ الراوی
للتخیم الخبر علی القیاس و خراج علیہ حدیث المصراۃ
و تابعہ اکثر المتأخرین ۱۷

حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ ابن القیم، حافظ ابن تیمیہ، علامہ ابن دقین العید اور علامہ شوکانی نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ حافظ ابن حجر تو یہاں تک فرما گئے۔
هو كلام اذی قائم به نفسہ و فی حکایتہ غنی عن تکلف
الرد علیہ ۱۸

فخر الاسلام ہر دوی نے امام اعظم کی جو ترجمانی کی ہے وہ بھی بے شمار شبہات کی تخلیق کا ذریعہ بنی ہے انہوں نے صرف قیاس کا سہارا لیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ حدیث مصراۃ قیاس کے معارض ہے اس لیے اسے امام اعظم نے نہیں اپنایا ہے چنانچہ وہ اس حدیث کے مقبول نہ ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
وودھ کے عوض میں ایک صاع کھجور کا دینا ضروری سمجھا گیا ہے ظاہر ہے کہ وودھ خریداری اور بکری پر قبضہ کے بعد ہی دوا گیا ہوگا لہذا وہ خریداری کی ذمہ داری میں داخل ہے کیونکہ وہ اس کا مالک ہے اس لیے تاوان کا سوال ہی نہیں۔ وودھ مال کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ

ایسے ہے جیسے بکری کا بچہ۔ اس لیے مشتری پر نادان کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نیز اگر دودھ کو مال فرض بھی کر لیا جاتے تو یہ اُون کی طرح بکری کے تابع ہے پھر بھی خریدار اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر خریدار پر نادان اس لیے ہے کہ اس نے عقد بیع کیا ہے تو دودھ کے مقابلے میں بکری کی قیمت اتنی کم ہو جانی چاہیے۔ اور اگر اس کی وجہ مشتری کی تعدی ہے تو وہ اتنا دودھ واپس کرے یا اس کی قیمت دے۔ کسی بھی صورت میں ایک صاع خریدنے کا کوئی تجاوز نہیں ہے۔

اس بیان کی روح یہ اور صرف یہ ہے کہ حدیث مصراۃ قطعاً خلاف قیاس ہے اور خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ان بزرگوں کی اپنی اپنی ہے۔ ان کی یہ تخریجات امام اعظم کے مسلک کی ترجمانی نہیں کرتی ہیں اور ان کے بیانیوں سے امام اعظم کے اصل مسلک کی تصویر سامنے نہیں آتی چنانچہ امام ابو الحسن کرخ نے تصریح کی ہے کہ

ہمارے اصحاب ان حدیثوں پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ کتاب اللہ اور سنت کے خلاف ہیں نہ کہ اس لیے کہ راوی فقیہ نہیں ہے حدیث مصراۃ کتاب و سنت دونوں کے خلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اس لیے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے اور یہی امام اعظم کا موقف ہے کہ حدیث مصراۃ معافی قرآن اور سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے اس لیے نہیں کہ یہ حدیث خلاف قیاس ہے جیسا کہ نزدیکی کا خیال ہے اور اس لیے نہیں کہ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہ ہیں اور وہ غیر فقیہ ہیں جیسا کہ عیسیٰ بن ابان کی رائے ہے۔ یہاں حافظ ابن تیمیہ کی یہ بات بے حد وزنی ہے کہ واپسی کی علت حدیث میں عیب کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی علت وہ جعل سازی اور تدلیس ہے جس کا مالک نے دودھ روک کر منظر ہرہ کیا ہے

قاضی ابو یوسف بھی خریدار کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ ایسا مویشی واپس کر دے۔ اگر فی الواقع حدیث میں جانور کی واپسی کا حکم دھوکے اور تدلیس کی بنا پر ہے تو پھر اس ارشاد نبوت کے ذریعے امام اعظم کا موقف بے حد مستحکم اور پائیدار ہو جاتا ہے کیونکہ دھوکہ دو ہی طرح سے ہوتا ہے گفتار سے یا کردار سے۔ اگر لیں دین میں گفتار کے ذریعے دھوکہ دیا گیا تو عدالت کے ذریعے اس کا اقالہ ضروری ہے۔ اور اگر کردار کے ذریعے تدلیس کی گئی ہے تو قانونی طور پر تو اقالہ ضروری نہیں ہے لیکن از روئے دیانت ضروری ہے۔ قانون ہمیشہ کھلے اور صاف ستھارے پر لاگو ہوتا ہے۔ پوشیدہ اور مستور کارروائیاں قانون کے احتساب سے باہر ہیں۔ مان لیا جائے کہ نصیب دھوکہ اور تدلیس ہے اور اس میں بائع پر واجب ہے کہ معاملہ کو منسوخ کر دے لیکن یہ وجوب از روئے دیانت ہے نہ کہ از روئے قانون۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جعل ساری اور تدلیس کرنے والوں کو از روئے دیانت حسن معاشرت کی خاطر فرما رہے ہیں کہ اگر کوئی ایسی جعل ساری وجود میں آجائے تو اخلاق اور باہمی رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ جانور واپس لے لیا جائے اور مشتری کی مروت یہ ہے کہ وہ اسے ایک صاع کھجور دے دے یا اس کی قیمت ادا کر دے جیسا کہ خطاب فی نے قاضی ابو یوسف کی رائے بتائی ہے ورنہ جہاں تک معاملاتی نقطہ نظر سے اس کی قانونی حیثیت کا تعلق ہے وہ تو وہی ہے جو قرآن اور سنت سے ثابت ہے۔ کیونکہ اگر جانور کی واپسی عیب کی بنا پر ہو جیسا کہ محدثین کہتے ہیں یا جعل ساری کی بنا پر ہو جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں تو نقصان عیب میں قرآن و سنت کا ضابطہ یہی ہے کہ متلفات اور عدونات میں نادان ذوات الامثال میں مثلی ہوتا ہے۔

بہر حال اخبار آحاد کا معانی قرآن کے معارض ہو جانا امام اعظم کے نزدیک علت قاذمہ ہے

سنت مشہورہ سے معارض حدیث

اخبار آحاد اگر سنت سے معارض ہوں خواہ ان پر اصطلاحی صحت کی محدثین نے کتنی ہی مہریں لگا دی ہوں۔ امام اعظم اس کو بھی اخبار آحاد کے لیے علت قاذمہ قرار دیتے ہیں اور اس میں امام اعظم ہی کا منہ نہیں بلکہ دوسری صدی کے سب محدثین کا موقف یہی ہے۔ ابو بکر الخطیب کی زبانی آپ اس کی پوری داستان پہلے سن چکے ہیں۔ ان ظاہریہ کو چھوڑ کر جن کے یہاں ہر حدیث محدثین کی اصطلاحی صحت کا لبادہ پہن لینے کے بعد خود ہی اصل بن جاتی ہے اور جن کے

یہاں احاد کو جانچنے کا کوئی معیار ہی پیمانہ نہیں ہے سب کہتے ہیں کہ اخبار احاد اگر سنت مشہورہ کے معارض ہوں تو یہ علت قاطعہ ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کا جو محسوس پیمانہ صحابہ میں چھوڑا ہے اور جسے جماعت صحابہ نے اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اپنایا اور جسے خلافت راشدہ نے اپنے دور اقتدار میں تمام ممالک اسلامیہ میں قانونی طور پر نافذ کیا ہے اور جسے اسلام کہہ کر دنیا نے پکارا ہے۔ یہی حضور انور کی سنت مشہورہ ہے۔ چونکہ یہ عملاً متواتر ہے اس لیے اس کے خلاف سند کی بڑی سے بڑی قوت بھی بطور چیلنج قبول نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک مثال بدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمر بھر کے عمل اور صحابہ کے تعامل سے اُمت کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امامت کے لیے وہ شخص آگے ہونا چاہیے جو عاقل، بالغ ہو اور اس ضابطہ کلیہ میں کہیں کوئی استثناء نہیں ہے۔ صرف عمرو بن سلمہ کی ایک منفرد روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ میں صرف چھ سال کی عمر میں امامت کی ہے۔ حدیث صحیح بخاری میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس طرح آئی ہے کہ:

عمرو بن سلمہ کہتے ہیں کہ زمانہ فتوح مکہ میں سب نے اسلام کی طرف پیش قدمی کی۔ میرے والد نے ہماری قوم میں سے اسلام لانے میں پہل کی۔ مسلمان ہونے کے بعد جب میرے والد واپس تشریف لائے تو بتایا کہ میں تمہارے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حق لے کر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوقات میں نماز پڑھا کرو۔ جب نماز کا وقت آجاتے تو تم میں سے ایک اذان کہے اور جسے قرآن زیادہ یاد ہو وہ امامت کرے۔ لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ قرآن کسی کو یاد نہیں ہے کیونکہ میں آنے والے مسافروں سے ملتا جلتا رہتا تھا۔ لوگوں نے مجھے ہی آگے کر دیا اس وقت میری عمر صرف چھ یا سات سال تھی۔ میں ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھا رہا تھا جب سجدے میں جاتا تو برہنہ ہو جاتا۔ قبیلہ کی ایک عورت نے کہا کیا تم اپنے امام کی جائے شرم نہیں ڈھانپتے۔ لوگوں نے میرے لیے کپڑا خرید کر قبضہ تیار کیا،

جس قدر مجھے اس روز خوشی ہوئی کبھی ایسی خوشی نہ ہوتی تھی بلکہ
تیسری صدی کے محدثین نے اس حدیث سے چھ سالہ بچے کے لیے امامت کے جواز کا پرہیز
حاصل کر لیا۔ چنانچہ مشہور محدث محمد بن نصر مروزی نے امام اسحاق بن راہویہ کے حوالہ سے لکھا
ہے کہ :

امامامۃ الغلام بعد ان یعقل الامامۃ ویفقه
فی الصلاة فجازۃ وان لم یحتمد فیما قال النبی صلی
لیوم القوم اقراہم وان کان اصغرہم دلالة
على ذالک۔

لڑکے کی امامت عقل و فہم کے بعد درست ہے اگرچہ نابالغ ہو
اور حضور کا یہ ارشاد کہ لوگوں میں جو زیادہ پڑھا ہوا ہو وہ امامت
کرے اس کی دلیل ہے۔
علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ

فیہ جواز امامۃ الصبی و وجہ الدلالة ما فی قوله
لیوم مکم اکثرکم قرأنا من العموم۔

یہ حدیث بچے کی امامت کے جواز کی دلیل ہے کیونکہ اقراکم... الخ کا
جملہ عام ہے۔

لیکن دوسری صدی کے محدثین اور فقہانے اس حدیث کو اس موضوع پر سنت مشہورہ کے
خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں سمجھا۔ لیث بن سعد، عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعی،
شعبی، مالک اور ابو حنیفہ نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا اور اس جزئی واقعہ کی یہ تاویل کر
دی کہ یہ ان نو مسلموں کا اپنا اجتہاد تھا کہ معصوم بچے کو امام بنا لیا۔ اس لیے اس موضوع پر یہ حجت
منہیں ہے۔ دین میں نبوت کا چھوڑا ہوا ضابطہ اور محسوس و مرقی عمل کا پیمانہ امامت کے متعلق
وہی ہے جس پر ہمیشہ صحابہ نے عمل کیا ہے۔

تاریخ سنت میں بھی اس محسوس پیمانہ عمل کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ

ارشاد اُمت کو ملا ہے۔ مثلاً مالک بن الحویرث کہتے ہیں کہ :

ہم ایک وفد کی صورت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے بیس روز آپ کی خدمت میں رہے آپ بڑے ہی مہربان اور شفیق تھے جب آپ نے ہم میں واپسی کا اشتیاق محسوس کیا تو ارشاد فرمایا کہ واپس جاؤ جہاں رہو تعلیم جاری رکھو اور نماز پڑھو جب نماز کا وقت آئے چاہیے کہ تم میں سے ایک اذان کہے اور لیو مکہ اکبر کہ جو تم میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔

اس واقعہ کو امام بخاری نے ایک جگہ نہیں بلکہ چھ جگہ اپنے مختلف اساتذہ کے حوالے سے نقل کیا ہے ان میں زیادہ مبسوط وہ واقعہ ہے جو ابوالنعمان کے حوالہ سے لکھا ہے۔

منتقى الاخبار میں اس موضوع پر صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس کے فتاویٰ بھی نقل کیے ہیں کہ بچے کے لیے امامت کی گنجائش نہیں ہے اور قیام لیل میں لیث بن سعد، یحییٰ بن سعید الانصاری، ابن جریر، مجاہد، سفیان ثوری، ابراہیم نخعی کے آثار بھی اسی موقف کی تائید میں آئے ہیں بلکہ عمر بن عبدالعزیز کا وہ مکتوب بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے گورنر کو اس حرکت پر ڈانٹ پلائی ہے کہ اس نے نماز کے لیے اپنے بچے کو امام بنا دیا تھا لکھا ہے کہ :

قدمت غلاماً لم تختك السن ولم تدخله تلك

النیت اماماً للمسلمین فی صلاتہم

تم نے چھوٹے بچے کو امام بنا لیا۔

امام اعظم نے ان صاف اور واضح ہدایات کی روشنی میں اپنی خدا داد فقاہت سے امامت کے اس ضابطہ عام کو جو سنت کی راہ سے آیا ہے اپنی جگہ سے نہ ہلنے دیا۔

یہ تو اس پر خالص مجتہدانہ نظر تھی جس سے سنت کے معارض ہونے کی وجہ سے حدیث پایہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف یہی علت قاعدہ ہے اور اس حدیث کی صحت بالکل ٹھکالی ہے۔

محدثین نے اس کی صحت میں بھی کلام کیا ہے۔ الخطابی فرماتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کا واقعہ ضعیف ہے اور حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے فیہ رجل مجهول فہو غیر صحیح اس میں ایک مجهول راوی ہے لہذا روایت صحیح نہیں ہے۔ اور تو اور حافظ ابن حزم بھی ظاہریت کے باوجود یہاں بول پڑے کہ:

اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے معلوم ہو جانے کے بعد اس پر نیکی نہیں فرمائی تو ہم نیچے کی امامت ضرور جائز کہتے لیکن ہمارے علم میں یہ نہیں آیا۔ اگر مان لیا جائے کہ عمرو بن سلمہ بھی اپنے والد کے ساتھ حضور کے پاس گئے تھے اور حضور اس وفد کو جب حکم دے رہے تھے تو یہ بھی موجود تھے۔ پھر بھی اس عمر کا آدمی نہ مامور ہے اور نہ مکلف ہے اس لیے عمر امامت کے لیے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ اس حکم کے مخاطب صرف مامورین ہیں۔

اخبار احاد کا توارث سے معارضہ

امام اعظم اخبار احاد کو توارث کے پیمانے میں بھی تولتے ہیں اور ہر ایسی حدیث کو معمول قرار دیتے ہیں جو توارث کے خلاف ہو۔ اسی توارث کو السنۃ اور ما علیہ الجماعۃ کہتے ہیں اور اس موضوع پر امام اعظم کو دوسری صدی کے محدثین کی ہمنوائی بھی حاصل ہے چنانچہ مصر کے مشہور محدث و فقیہ لیث بن سعد نے امام مالک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں امام موصوف نے اس معیار کو واضح طور پر پیش فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجائے جس پر مصر، شام، عراق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے زمانہ ابوبکر و عمرو عثمان میں عمل کیا ہو اور اسی پر تناؤ آخر حیات ہے ہوں تو ہماری ایسے مسئلے کے بارے میں راتے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کی ہرگز ہرگز

اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ اب کوئی ایسا کام کریں جو صحابہ و تابعین
میں ان کے اسلاف کے مترادف خلاف ہو۔
امام مالک عمل اہل مدینہ کی حجیت کے جو قائل ہیں اس کا منیٰ بھی توارث ہے۔ حافظ ابن
القیم اسی کو عمل مستمر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ قابل اتباع حجت ہے۔ چنانچہ ایک
موقعہ پر وہ اعظام میں فرماتے ہیں :

فهذا النقل وهذا العمل حجة يجب اتباعها وسنة
متلقاة بالقبول على السراس والعينين واذا ظفر لعالم
بذلك قرت به عينه واطمأنت اليه نفسه
يقتل اور یہ عمل واجب الاتباع دلیل ہے اور ایک ایسی سنت
ہے جسے تلقی بالقبول حاصل ہے اگر ایسی کوئی دلیل مل جائے تو دل
کی ٹھنڈک اور اطمینان کا موجب ہے یہ

واضح رہے کہ اگرچہ حافظ ابن القيم نے عمل اہل مدینہ کی حجیت سے اختلاف کیا ہے جیسا کہ آپ
پڑھ چکے ہیں لیکن وہ زمانہ خلافت راشدہ میں اہل مدینہ کے عمل کی حجیت کے قائل ہیں۔ ہاں
جب دور خلافت کے بعد صحابہ کی اکثریت مدینہ سے باہر چلی گئی ہے تو پھر وہ اہل حرمین کے
عمل کی حجیت کو منہیں مانتے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی بھی شہر میں صحابہ نے ڈیرا لگایا ہو
اور وہاں صحابہ کا قائم کردہ عبادہ عمل استمرار کے ساتھ امت کو ورثہ میں ملا ہو تو اس میں اور
اہل مدینہ کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

اگر کسی ایسے شہر والوں کا کہ جہاں صحابہ منتقل ہو گئے تھے وہاں صحابہ
کی تعلیم کے مطابق کوئی عمل مندرجہ بالا ہے تو اس عمل میں اور اہل
مدینہ کے عمل میں کیا فرق ہے ؟

ان کو استمرار عمل اور توارث کی حد تک اختلاف نہیں ہے اختلاف کا مرکز ہی نقطہ مکان
اور درو دیوار ہیں۔ توارث کو تو وہ اس حد تک طاقتور دلیل قرار دیتے ہیں کہ کتاب المروج میں
ایک مقام پر تلمیذین میت فی القبر کے تذکرے میں ایک حدیث ضعیف لے کر آتے ہیں اور

خود فرماتے ہیں کہ یہ اس موضوع پر ضعیف حدیث ہے مگر اس کے ساتھ جوازِ عمل کا پروانہ انہوں نے جس بنیاد پر دیا ہے وہ بھی تعامل اور توارث ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

فهذا الحديث وان لم يثبت فإتصال العمل به في سائر الامصار والاعصاد من غير انكار كاف في العمل به لے حدیث اگرچہ ثابت نہیں لیکن اس کی پشت پر اتصالِ عمل کی طاقت ہے اس لیے عمل کے لیے کافی ہے ۔

حافظ ابن عبد البر نے الاستذکار میں امام مالک کے حوالے سے یہ تصریح کی ہے کہ : جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف حدیثیں آئیں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ حضرت ابو بکر نے اس پر عمل کیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ جس روایت پر انہوں نے عمل کیا ہے وہ ہی صحیح اور مقبول ہے ۔ ۲۷

حافظ ابو بکر الخطیب بغدادی نے امام مالک کا ایک دوسرا بیان نقل کیا ہے : اگر یہ حدیث معمول ہو جاتی کہ امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھو تو اس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر و عمر و عثمان ضرور عمل کرتے ۔ ۲۸

اسی سلسلے میں امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں جو ضابطہ لکھا ہے وہ بھی سن لیجئے : جب دو حدیثیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف آئیں تو یہ دیکھا جائے گا کہ آپ کے صحابہ نے کس پر عمل کیا ہے ۔ ۲۹ امام عثمان دارمی محدث کے حوالے سے مشہور محدث امام بیہقی بیان کرتے ہیں کہ : جب کسی موضوع پر احادیث مختلف ہوں اور راجح و مرجوح کا پتہ نہ ہو تو ہم یہ دیکھیں گے کہ خلفائے راشدین نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس پر عمل کیا ہم اسی کو راجح قرار دیں گے جس

پر خلفاء راشدین کا عمل ہے۔
 مشہور مجتہد اور اصولی امام حافظ ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں کہ :
 جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوا رشاد مروی ہوں اور ان
 میں سے ایک پر سلف کا عمل ہو تو اسی کو ثابت کہا جائے گا۔ جس
 پر سلف کا عمل ہے۔

دوسری صدی میں تعامل و ثوارث کی طاقت اس درجہ معلوم تھی کہ اس دور کے مصنفین
 اپنی کتابوں میں صرف ان حدیثوں کو اپناتے تھے جن کی پشت پر تعامل کی قوت ہوتی تھی
 چنانچہ قاضی ابویوسف فرماتے ہیں :

عِلَّتْ مِنَ الْحَدِيثِ مَا تَعْرِفُهُ الْعَامَّةُ - ۳

الغرض امام اعظم ابو حنیفہ اخبار احاد کے مقبول ہونے کے لیے تعامل کے ہمنوا ہونے کی
 شرط لگاتے تھے اور اسی معیار پر اخبار احاد کو جانچتے تھے چنانچہ ایک سے زیادہ مسائل میں اسی
 معیار سے اخبار احاد کو ناپا گیا ہے نماز میں بسم اللہ اہستہ پڑھنی چاہیے یا بلند آواز سے - (۳۱)
 موضوع پر ایک سے زیادہ حدیثیں آتی ہیں۔ انس بن مالک کی صحیح مسلم کی حدیث بھی ابو حنیفہ
 کی موید ہے۔ محدثین نے اس حدیث کو معطل قرار دیا ہے اور متن میں علت ہونے کی مثال
 میں سب نے اس حدیث کو پیش کیا ہے چنانچہ الجزائری لکھتے ہیں :

فَعَلَّ قَوْمٌ رَوَايَةَ اللَّفْظِ الْمَذْكُورِ لِمَا رَوَاهُ أَكْثَرُ بَنِي إِسْمَاعِيلَ

فِيهِ فَكَانُوا يَسْتَفْتَحُونَ --- الخ

کچھ لوگوں نے اس حدیث انس کو معطل قرار دیا ہے ۔

اور صاحب دراسات اللیب نے دعویٰ کیا ہے کہ

هَذَا حَدِيثٌ بِسْمَلَةٍ قَدْ عَلِلَ رَوَايَتُهُ مُسْلِمٌ لِبَيْعِ عِلَلٍ

بِسْمَلَةٍ كِي حَدِيثٌ رَوَايَتُهُ مُسْلِمٌ فِي سَائِلِ عِلَلٍ مُوجُودَةٍ فِيهِ

اگرچہ اس کا واضح اور ثانی جواب حافظ ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں دے دیا ہے اور بتایا

ہے کہ اس موضوع پر حضرت انس کی حدیث میں کوئی اضطراب نہیں ہے سب کی سب

ہم آہنگ ہیں چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ۔

فاحادیث انس الصحیحة کلمات متلفۃ متفقۃ تبیین انہ نفی
الجمہ بالقراءۃ وانہ لم یتکلم فی قراءتہا سوا
بنفی ولا اثبات وحنید فلا اضطراب فی احادیثہ
الصحیحة۔

حضرت انس کی ساری حدیثیں علیٰ حلیٰ اور ہم آہنگ ہیں سب پر بتا
رہی ہیں کہ قراعت میں بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھی گئی۔ ہمیشہ
پڑھی گئی یا نہیں اس سے حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے
حدیث انس مضطرب نہیں ہے۔

لیکن حافظ زلیحی نے اس موضوع پر نوآرٹ اور تعامل کا سہارا لے کر جو فیصلہ کن بات فرمائی
ہے وہ بھی گوش گزار فرمائیے۔

بسم اللہ کا نماز میں ہمیشہ پڑھنا صحابہ میں حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ
میراث تھی جس پر لوگ چل رہے تھے اور صرف اتنی ہی بات اس مسئلہ
میں اطمینان کے لیے کافی ہے کیونکہ چہرے نمازیں صبح و شام ہمیشہ پڑھی
گئی ہیں۔ اگر حضور النور کا اس موضوع پر کوئی بھی عمل ہوتا تو اہمیت اس
محسوس عمل میں کبھی مختلف نہ ہوتی۔ یہ بات ہر کس و نا کس کو معلوم
ہوتی اور حضرت انس یوں نہ فرماتے کہ نہ حضور نے بسم اللہ نماز میں
بلند آواز سے پڑھی اور نہ خلفائے۔ اور حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم
کی مسجد میں ہمیشہ پڑھنا نہ ہوتا۔ اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو
ہماری معیشت میں مد اور صاع کی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری
کیونکہ نماز تو تمام مسلمانوں کا اشتراک ہے۔ نیز نمازیں رات دن
میں پانچ بار پڑھی جاتی ہیں۔ ایسے اشخاص تو معاشرے میں مل سکتے
ہیں جن کو صاع اور مد کی ضرورت نہیں لیکن ایسا کون مسلمان ہے

جسے نماز کی ضرورت نہ ہو اور پھر اکابر صحابہ کے بارے میں کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ خلاف پیغمبر پر موانعت کریں۔
 اس موقع پر حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں۔ اس کو نظر انداز کرنا بے انصافی ہے۔
 امورِ دجود یہی وہ امور ہیں جن کے نقل کرنے اور یاد رکھنے کا عادت اور ہمتیں اہتمام کرتی ہیں اور ان کا نقل کرنا شرعاً ضروری ہے۔ باقی رہا امورِ عدویٰ اور منفی چیزیں۔ تو ان کے نقل کی نہ چنداں ضرورت ہوتی ہے اور نہ عادت اس کا کوئی اہتمام ہوتا ہے۔ اگر پانچ نمازوں کے علاوہ چھٹی نماز کی کوئی حدیث پیش کرے یا رمضان کے روزوں کے علاوہ کسی روزے کی فرضیت کا دعویٰ کرے یا رکعات نماز یا فریضہ زکوٰۃ میں کوئی انکشاف کرے تو ہم اس کو بلا ریب غلط اور جھوٹ کہیں گے اور دلیل ہمارے پاس اس کے سوا کچھ نہ ہوگی کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا ہونا منقول ہوتا۔ منقول نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔ بس یہی بسم اللہ کو بلند آواز سے نہ پڑھنے کی دلیل سے ہے۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر اسی معیار سے رفع یدین کے موضوع پر اخبارِ احاد کو ناپ لیجئے تبخیر تحریر کی حد تک تو رفع یدین کا مسئلہ امت میں اتفاقی ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ

لَمْ يَخْتَلَفُوا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ

يَدَيْهِ حِينَ يَفْتَحُ الصَّلَاةَ -

تبخیر تحریر کے وقت رفع یدین میں کوئی بھی اختلاف نہیں ہے۔

اگرچہ حافظ ابن حزم نے مطلق رفع یدین میں تواتر کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے جیسا کہ ان سے

علامہ محمد معین سندھی نے دراسات البیہب میں نقل کیا ہے کہ :
 ان احادیث الرفع فی کل خفض و رفع متواترة لتوجب لعین العلم

لیکن جیسا کہ آپ پہلے سن آئے ہیں کہ دوسرے علماء کو ان کے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ صرف تبکیر افتاح کے وقت رفع یدین متواتر ہے۔ چنانچہ علامہ حافظ محمد بن ابوالہیثم الوزیری نے تنقیح الانظار میں، علامہ محمد بن اسماعیل نے توضیح الافکار میں اور حافظ زین الدین عراقی کی تصریحات اس موضوع پر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ چونکہ تبکیر تحریمہ کے وقت رفع یدین متواتر ہے اس لیے اس میں علماء کی کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔ رفع یدین کے موضوع پر اگر اختلاف ہے تو تبکیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر ہے۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ مشہور روایت حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے۔ یہ روایت خود مواقع رفع یدین میں مختلف ہے چنانچہ حضرت ابن عمر کی روایت بطریق سالم میں تین مواقع پر تذکرہ ہے، تبکیر تحریمہ، عند الکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت۔ اور بطریق نافع میں تعدۃ اولی سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین مذکور ہے اور دونوں بخاری کی روایات ہیں۔ نیز طبرانی کی روایت میں ایک پانچواں رفع یدین سجدہ میں جلتے وقت بھی مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

و عند التکبیر حین یھوی ساجداً

اور صاحب دراسات البیہب نے ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے بین السجدتین رفع یدین کو حضرت انس، الحسن اور ابن سیرین کے حوالہ سے پیش کیا ہے اور علامہ ابن دقین العبد نے شرح المعتمد میں بین السجدتین رفع یدین کو قانونی قرار دیا ہے اور علامہ عراقی نے بھی محدثانہ نقطہ نظر سے اسے سراہا ہے وہ فرماتے ہیں۔

ھی مثبتة و ھی مقدمة علی النفی

امام اعظم نے ان اخبار آحاد کو توارث سے معارض ہونے کی وجہ سے معلول قرار دیا اور ان تمام مواقع میں سے صرف اس رفع یدین کو اختیار فرمایا جو اسناداً متواتر ہے اور جسے توارث کی تائید حاصل ہے یعنی تبکیر تحریمہ کے وقت۔ انہوں نے ان روایات کا جس روشنی میں مطالعہ فرمایا وہ اُمت کا عمل متواتر ہے۔ کیونکہ کوفہ میں اصحاب امیر المومنین علی مرتضیٰ اور اصحاب عبداللہ بن مسعود رفع یدین نہ کرتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر نے کوفہ کی پوری آبادی کے بارے میں مشہور محدث محمد بن نصر مروزی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ :

لا فاعلم مصلاً من الامصار تركوا رفع اليدين باجماعهم
عند الحفص والرافع الا اهل الكوفة - ۱۷

کوفہ کے سوائے تمام شہروں میں ایسا کوئی شہر ہمیں معلوم نہیں جس کی
آبادی نے بالاتفاق رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین
چھوڑا ہو۔

اور یہی حال زمانہ امام مالک میں مدینہ طیبہ کا ہے۔ چنانچہ ابن رشد نے بدایہ میں اسی کو امام
مالک کے روایت ترک کو اختیار کرنے کی بنیاد بتایا ہے وہ فرماتے ہیں :
ان السبب لرواية الترك عن مالك هو عمل المدينة
اذ ذاك فلما احدثوا العظم لعلمه مبني على الترك
امام مالک سے ترک رفع یدین کی روایت آنے کا سبب اہل مدینہ کا
عمل ہے۔

مکہ میں رفع یدین عبد اللہ بن الزبیر کے زمانے میں شروع ہوا اس سے قبل اہل مکہ کا عمل ترک
رفع یدین ہے جیسا کہ میمون مکی کے سوال ابن عباس اور اس انداز بیان سے کہ لعل احداً
بصیدھا ظاہر ہے۔

جب کوفہ، مدینہ اور مکہ کے فقہاء اس پر عمل کر رہے ہیں تو یہ تعامل اور توارث نہیں تو
اور کیا ہے؟ بس اسی پیمانے پر احادیث رفع یدین کو امام اعظم نے ناپ کر صرف تکبیر تحریمہ
والے رفع یدین کو اختیار فرمایا اور باقی کو خلاف اولیٰ قرار دیا۔ واضح رہے کہ رفع یدین میں
اختلاف جواز اور عدم جواز میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں،
حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ اور فتاویٰ میں اور حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے
صرف اولویت اور عدم اولویت میں ہے۔

بہر حال امام اعظم انبار احاد کو توارث اور تعامل کی ترازو میں تولتے ہیں۔ حافظ ابن رجب
حبشی نے اسے ائمہ فقہاء اور محدثین کا فیصلہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فصل علم سلف علی الخلف
میں رقمطراز ہیں۔

فاما الامة وفقهاوا اهل الحديث فانهم يتبعون
الحديث الصحيح حيث كان اذا كان معمولاً به عند الصحابة
ومن بعدهم وعند طائفة منهم فاما ما اتفق على
تركه فلا يجوز العمل به لانهم ما تركوه الا على علم
ان لا يعمل به۔

ائمہ مجتہدین اور فقہاء محدثین حدیث صحیح کی پیروی کرتے ہیں بشرطیکہ
وہ صحابہ اور تابعین میں معمول بہ ہو یا ان میں سے کسی گروہ کے
نزدیک اگر حدیث ایسی ہو جس کے چھوڑنے پر وہ متفق ہو چکے
تو اس پر عمل جائز نہیں ہے کیونکہ انہوں نے بہر حال یہ جان کر
ہی چھوڑا ہے کہ یہ ناقابلِ عمل ہے۔

امام ترمذی نے سنن میں اسی کو اپنا پائے ترمذی کا مطالعہ کیجئے وہ قدم قدم پر ہر موضوع
پر حدیث لکھتے ہیں اور پھر اس کی تائید میں اُمت کا عمل یہ کہہ کر پیش فرماتے ہیں والاعمل
على هذا عند اهل العلم۔ اس سے ان کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ اس حدیث کو
صحابہ و تابعین کی عملی تائید حاصل ہے اس لیے یہ صحیح ہے اور یہ ترمذی کی خصوصیت نہیں
بلکہ تمام اہل علم کا مسلک یہی ہے سکہ بند ظاہر یہ کو چھوڑ کر سب یہی کہتے ہیں علامہ محمد متین
سندھی نے نہ معلوم کس دلیل کی قوت سے یہ دعویٰ کیا ہے۔

یس احد من المحدثین یلفت فی صحۃ الحدیث وحسنہ

الی اشتراط اخذ اهل العلم۔

محدثین میں سے کوئی بھی حدیث کی صحت یا حسن میں یہ شرط نہیں
لگاتا کہ اسے اہل علم کی عملی تائید حاصل ہو۔

اس کے بعد خود ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ امام ترمذی کا سنن میں طرزِ عمل یہی ہے۔
اولاً امام ترمذی کے عمل کے لیے تاویل کا جامہ تلاش کرنا شروع کیا۔ جب تاویل چست نہ بیٹھی
اور بات بنانے کے باوجود نہ بنی تو یہ کہہ کر طرح دے گئے کہ

وان كان الترمذی يرى ذلك فهو مما اختص به على
خلاف جاحيد العلماء -

پتہ نہیں وہ جمہیر علماء کون سے ہیں جو اس موضوع پر امام ترمذی کے مخالف ہیں۔ امام مالک کی تصریح خطیب بغدادی اور ابن عبد البر کی زبانی ابو داؤد صاحب سنن کی سنن میں، محدث عثمان الدارمی کا بیان امام بیہقی کی معرفت، حافظ ابن حجر عسقلانی کا فتح الباری میں بیان، حافظ ابن رجب کا وضاحتی نوٹ اور حافظ ابوبکر الجصاص رازی کا اعلان آپ پہلے اس موضوع پر پڑھ چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث ازالۃ الخفا میں فرماتے ہیں :

الافاق سلف و توارث ایشان اصل عظیم است در فقه
در اصل یہ بات جس ذہنی تحفظ کے ساتھ کہی گئی ہے وہ کچھ اور ہے اگر وہ واضح ہو کر سامنے آجائے تو راہ کی ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں ۔

اعمال و اقوال صحابہ کا اسلام میں مقام

اصل بات یہ ہے کہ محدثین اور فقہاء کے یہاں اعمال و اقوال اور فتاویٰ صحابہ سب حجت ہیں ان کو وہ قبول کرتے ہیں۔ ان میں اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ انداز قبول میں ہے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں :

اگر مجھے کتاب و سنت میں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو میں اقوال صحابہ پر عمل کرتا ہوں اور جس کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان کے اقوال سے تجاوز کر کے کسی اور کا قول لوں ۔

امام مالک نو صحابہ کے اعمال و اقوال کو سنت کا درجہ دیتے ہیں وہ فتویٰ صحابی اور حدیث نے مابین موازنہ کرتے تھے چونکہ ان اکابر کے یہاں صحابہ کے اعمال و اقوال کا یہ وزن ہے اس لیے ان کے یہاں احادیث کی صحت اور مختلف حدیثوں میں ترجیح کا معیار بھی یہی ہے صرف نتیجہ کو اس سے اختلاف ہے وہ صحابہ کے اعمال و اقوال کو قابل احتجاج قرار نہیں دیتے

ہیں۔ حافظ ابن القیم نے جمہور کے مذہب کو ۶۹ دلائل سے ثابت کیا ہے اور بلاشبہ وہ دلائل قوی اور مؤثر ہیں۔ لیکن یہاں ان کی تفصیل موجب طوالت ہوگی لہٰذا آخری دور میں علامہ شاکانی نے اپنی کتاب ارشاد الفحول میں محدثین و فقہاء کے اس مسلک پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اقوال صحابہ حجت نہیں ہیں وہ فرماتے ہیں:

حق یہ ہے کہ قول صحابی حجت نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو امت کے لیے مبعوث نہیں فرمایا ہے اور ہمارا رسول ایک ہے، کتاب ایک ہے اور جمیع امت اتباع کتاب و سنت پر مامور ہے پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ کے دین میں بغیر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے یہ قول حجت ہے تو وہ دین میں ایسی بات کہتا ہے جو ثابت نہیں اور شریعت اسلامیہ میں ایسی شرع ایجاد کرتا ہے جس کی پیروی کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے اور ایسا کہنا بہت بڑی بات ہے لہٰذا اللہ کے سوا کسی ایک یا چند بندوں کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ اس کا یا ان کا قول مسلمانوں پر حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے غلط ہے یہ

ظاہر ہے کہ اس ذہنی سخیلیت کے بعد اخبار آحاد کو اعمال صحابہ میں تو لے کر اور جانچنے کی گنجائش کب گوارا ہو سکتی ہے۔ سندھ کے مشہور عالم محمد معین نے اسی بنا پر لکھ دیا ہے کہ
و یترک عمل الصحابة الثابت عنہم بالمحدث الضعیف
صحابہ سے ثابت شدہ اعمال کو حدیث ضعیف کی وجہ سے بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

اور تقلید کی تردید کے جوش میں یہاں تک فرما گئے کہ

۱۔ اس سلسلے میں حافظ ابن القیم کی اعلام المتوقعین کی جلد چہارم از ص ۱۲۰ تا ۵۲ کا مطالعہ مفید ہے اس میں بے حد مفید علمی جواہر پائے ہیں۔ ۲۔ ارشاد الفحول الی تحقیق الحق فی علم الاصول ص ۲۱۴۔ ۳۔ دراسات اللیبیب ص ۸۶۔

التمسک بأثر الصحابة عند وجدان المرفوع الصحيح
 على خلافه تمسك ضعيف
 جب حدیث مرفوع موجود ہو تو آثار صحابہ کو اختیار کرنا ایک غلط
 استدلال ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اسلام کا سارا علمی سرمایہ
 روایت و اسناد کی پستی تلی ترانہ و کے ذریعے صرف حدیث مرفوع کی صورت میں اُمت کو ملا
 ہے حالانکہ صورت معاملہ یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جسے ہم سنت کہتے ہیں وہ صحابی کی
 محسوس اور مرنی زندگی کے ذریعے آئی ہے انہوں نے ہر سنی ہوئی حدیث کو نہ روایت
 کیا ہے اور نہ اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس موقع پر حافظ ابن القیم مفید بات فرما گئے ہیں :

یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر
 سنی ہوئی حدیث کو روایت نہیں کیا سو چتے حضرت ابوبکر الصديق
 اور حضرت فاروق اعظم اور دوسرے کبار صحابہ نے جو کچھ حضور انور
 صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲۳ سالہ حیات نبوت میں سنا ہوگا اس کو
 کچھ بھی اس سے نسبت ہے جو حدیثوں کی مقدار ان سے مروی ہے
 حضرت ابوبکر سے صرف سو حدیثیں مروی ہیں۔ درآں حالیکہ حضرت
 ابوبکر وفات تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے حضور انور
 کی کوئی بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ
 وسلم کی بعثت کے وقت سے حضرت ابوبکر کو شرف حضور ہی
 اور آپ کے قول و فعل کا علم رہا۔ آپ کی سیرت و کردار کا ہر پہلو
 ان کی نظر کے سامنے تھا۔ اُمت میں سب سے زیادہ حضور انور
 سے ابوبکر ہی واقف تھے۔ یہی حال دوسرے کبار صحابہ کا ہے
 یعنی جو کچھ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا یا
 جو آپ کے حالات مشاہدہ کیے تھے ان کے مقابلے میں ان کی

مرویات کی تعداد بہت کم ہے اور اگر یہ اپنے مشاہدات اور مسموعات کو روایت کرتے تو ان کی روایات کی تعداد حضرت ابو ہریرہ سے کہیں زیادہ ہوتی۔

ان بزرگوں سے روایات کم آنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ سنت چونکہ صحابہ کی عملی زندگی میں موجود تھی اس لیے اس کا کوئی داعیہ ہی نہ تھا۔ اور یہ عملی زندگی ان سے منتقل ہو کر تابعین میں آئی ہے اور تابعین میں اس کا داعیہ پیدا ہوا۔

ذرا اس پہلو پر غور فرمائیے کہ ایک طرف اُمت کا عمل ہے اور دوسری طرف راوی کی شہادت ہے۔ اُمت کو یقیناً عصمت حاصل ہے لیکن راوی کی روایت کو عصمت نہیں بلکہ صرف اصطلاحی صحت کا مقام دیا گیا ہے۔ یہ مان لینا ہے کہ راوی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا یا حافظہ غلط ہو گیا لیکن یہ کہ خیر القرون میں پوری اُمت پیغمبر کے خلاف جمع ہو گئی ہو ناممکن ہے یہ تو اثر عمل ہے اور اس کے خلاف جب بھی ایک شخص کی روایت چیلنج بن کر آئے گی اس کی صحت متدوچ ہو جائے گی۔

یہ ارشاد نبوت کو رد کرنا نہیں بلکہ ارشاد ہی کے ثبوت کا ایک مستحکم اور محتاط معیار ہے۔

اخبار احاد میں مفاہمت اور امام اعظمؒ

اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے
ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

پھر ہم نے تم کو الامر کی صاف راہ پر لگایا ہے اسی کی پیروی کیجئے
اور بے علم لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔

شریعت من الامر کے معنی ہیں امر کی راہ۔ امر یا امور کا واحد ہے اور یا اوامر کا۔ اگر امور کا واحد ہے تو مقصود یہ ہے کہ آپ کو زندگی کے حقائق کو پورا کرنے کی راہ اللہ نے بتادی ہے اور اگر اوامر کا واحد ہے تو مطلب یہ ہے کہ آئینی اور قانونی اقدار کی راہ پر ہم نے تم کو

نکادیا ہے۔ شریعت کے معنی راہ کے آنے ہیں دونوں صورتوں میں آیت کا مدلول یہ ہے کہ سلام کی شریعت صاف اور واضح ہے اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ علامہ شاطبی فرماتے ہیں المشیئة لا تعارض فیہا البتہ لیکن چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتی زندگی کی پوری تاریخ ہم تک شہور و سنین کی تعبیر اور آیات کی ترتیب سے نہیں پہنچی اور کچھ صحابہ کے ذریعے پہنچی اس میں بھی بعد کو راویوں نے روایت بالمعنی کی ہے اس لیے ہماری نگاہ میں تعارض محسوس ہوتا ہے اور تعارض کا حاصل یہ ہے کہ

ان یاتی حدیثان متضادان فی المعنی ظاہراً
اس تضاد کو دور کرنے کا موضوع اہم ترین موضوع ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ کام صرف محدثین کا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ فقیہ ہو۔ چنانچہ حافظ ابو بکر عازمی فرماتے ہیں :

ذالك من وظيفة الفقهاء لان قصدهم اثبات
الاحکام و مجال نظرهم في ذلك متسع
یہ فقہاء کا کام ہے کیونکہ حدیث میں ان کا مطلع نظر احکام ثابت
کرنا ہوتا ہے اور اس موضوع پر ان کی فکری جولانیاں وسیع ہیں یہ
اور امام نووی فرماتے ہیں :

انما یجمل له الامثلة الجامعون بین الفقه والحديث
والاصوليون الضواصون علی المعانی
یہ کام زیبا ہے ان ائمہ کے لیے جن میں حدیث و فقہ کی نشان
جامعیت پائی جاتی ہے اور وہ اصولیین جو معانی کی گہرائی
میں اترے ہیں یہ

حافظ سخاوی کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم رقمطراز ہیں :
هذا فن تكملي في الامثلة الجامعون بین الفقه
والحديث وقواعد مقررة في اصول الفقه

اس موضوع پر ان اماموں نے لب کشائی فرمائی ہے جو حدیث وفقہ

کے جامع ہیں اور اس کے قواعد اصول وفقہ میں مقرر ہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام اہم ہونے کے ساتھ بے حد نزاکت بھی رکھتا ہے اس کی نرا کہ یہ ہے کہ یہ ایک کام نہیں بلکہ اس میں بہک وقت متعدد کاموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مختلف احادیث میں منافیہت کرائی پڑتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شریعت کے سارے احکام باہم ٹکرا جائیں اور شرعی و قانونی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت نہ رہے۔ حافظ ابن حجر نے اس سلسلے میں جس فراخ دلی کا یہ فرما کر مظاہرہ کیا ہے کہ

اذا تعارض الحدیثان — فرض علی مسلم استعمال کل ذالک

اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو تو ہر مسلم کا فرض یہ ہے کہ سب پر ہی عمل کرے۔

یقیناً ایک منفرد زندگی کے لیے آزادی کی حد تک یہ ایک خوبی کی بات ہے لیکن تشریح جب اجتماعی زندگی میں نظم کی مضبوطی، عمل کی سختگی اور نوازن اور فکر کی استقامت قائم کرنا چاہیے تو ان کی خوبیوں سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے اس فراخ دلانہ آزادی کے ساتھ یہاں حد بندی کا کوئی خط خود زندگی کا ایک اہم تقاضا ہے جو ان تمام کی پوری پوری ضمانت دے سکے۔ آئین و قانون کے تمام احکام ان ہی حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور ابھرتے ہیں یہ خطوط جو نہیں ہٹے سکتے ہیں۔ نظام قانون کی پوری عمارت ہل جاتی ہے۔ بلاشبہ ہر حدیث پر عمل کرنے کی آزادی کا پروانہ ایک بہت بڑی فراخ دلی ہے لیکن حیات اجتماعی میں یہی آزادی ہوائے نفس سے ہمدوش ہو کر بے راہ روی کے نام سے پیکاری جاتی ہے ماننا پڑے گا کہ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا ایک منفرد زندگی کے دائرہ کار کی حد تک حافظ ابن سیرمنے سوچا ہے بلکہ یہاں زندگی کے حقائق کے تقاضے کچھ اور بھی ہیں۔ کسی ایک گوشہ ہی کو سامنے رکھ کر نہ سوچنا چاہیے دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی ضروری ہے۔ یقیناً اگر ہمیں اخبار احاد میں آئین و قانون کی اقدار کو پہچاننے کے لیے کبھی منافیہت کرائی پڑتی ہے تو کبھی دو حدیثوں میں راجح و مرجوح قرار دینا پڑتا ہے۔ اور

ن کے ساتھ ہی اگر ہماری نظر تاریخ احکام پر ہے اور ہمیں کسی طریق سے دونوں میں سے
 کا پہلے ہونا اور دوسرے کا بعد میں ہونا معلوم ہو گیا ہے تو ایک کو کالعدم قرار دینا
 رہتا ہے اور اس کے لیے ہمیں نبوت کی جانب سے نسخ کی صراحت کا انتظار ضروری نہیں ہے
 افسوس ہے کہ علامہ معین سندھی نے دراست میں اتنی موٹی ٹسی بات کو یہ کہہ کر پیچیدہ
 دیا کہ

لیس نسخ الحديث بالحديث فان ذلك لا يتحقق الا بصريح
 النسخ المرفوع الى رسول الله صلى الله عليه وسلم
 یہ حدیث کا حدیث سے نسخ نہیں ہے کیونکہ نسخ کے ثابت ہونے
 کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحت نسخ ثابت ہونا چاہیے ہے
 گویا موصوف نے یہ فرض کر لیا ہے کہ حدیث کے نام پر جو تاریخ سنت محدثین کی روایات
 مدون ہوئی وہ پورمی کی پوری تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب و مدون ہوئی ہے حالانکہ
 یہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ حضور انور کی پورمی ۲۳ سالہ زندگی میں سنت کی یہ
 نسخ کیف ما اتفق امت کو ملی ہے اور وہ بھی صحابہ سے راویوں نے سن کر اپنے الفاظ
 محدثین تک پہنچائی ہے اور ہر محدث حافظ تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے
 کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کے مفتر سخن کو سمجھ کر ہی کہہ رہا ہے۔ مشہور محدث محمد بن المثنیٰ
 حدیث یاد تھی۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی الی عنزہ
 حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عنزہ (نیزہ) کو سترہ بنا کر نماز پڑھی۔
 لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ محمد بن المثنیٰ جو ائمہ ستہ حدیث کے شیوخ میں
 ہیں یعنی امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ کے
 ہیں اور جن کا تعلق قبیلہ عنزہ سے ہے وہ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھتے ہیں
 کہ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عنزہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے اور
 مط مطلب کے سہارے وہ اپنے عنزہ ہونے پر ناز کرتے تھے اور کہتے تھے۔

نحن قوم لنا شرف نحن من عنزة صلى الله عليه وسلم
 صلى الله عليه وسلم

ہماری قوم کو شرف حاصل ہے کہ ہم قبیلہ عنزہ سے ہیں ہماری
 طرف رسول اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہے

امام حاکم نے اسی حدیث میں ایک اور راوی کی کہانی بتائی ہے کہ وہ اس میں عنزہ کو شا
 (بکرمی) کے معنی میں سمجھتا تھا اور روایت بالمعنی اس طرح کرتا تھا کہ
 صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم الى شاة يله

ان حالات میں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ جب تک نسخ کی صراحت نہ ہو نسخ کا فیصلہ نہ
 ہو سکتا۔ زندگی کے تقاضوں اور قانونی ضروریات کو نظر انداز کر کے محض جذباتی لغو
 اور کہنا کہ تعارض کے وقت میں دو حدیثوں میں سے ایک کو منسوخ کہنا شریعت کے مفاد
 میں بے باکانہ جرات ہے نعرے کی حد تک تو درست ہے لیکن حقائق اور واقعات کی دنیا
 اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ خود محدثین نے اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے البتہ اس
 علماء کے افکار مختلف ہیں کہ ان تینوں مفاہمت، ترجیح اور نسخ میں سے آحاد میں تعارض
 کے وقت کس کا پلڑا بھاری ہے لیکن اس قدر مشترک پر سب ہی متفق ہیں کہ روایتی
 اسنادی حیثیت سے اگر دونوں حدیثیں ایک جیسی ہوں اور تاریخ احکام کے فیصلہ
 ان کی تقدیم و تاخیر کا پتہ ہو یا خیر القرون میں امت نے کسی ایک کو عملاً اپنا لیا تو پھر ایک
 کا عدم اور دوسری کو معمول بہ قرار دیا جائے گا۔ ایسا ممکن نہ ہو تو مفاہمت اور ترجیح
 کام لیا جائے گا۔ مفاہمت یہ ہے کہ دو حدیثوں میں ہم آمینگی اس طرح پیدا کی جائے کہ دو
 زندگی کے حقائق کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ مفاہمت قانون کی ایک بنیادی ضرورت ہے
 اخبار آحاد میں تشریحی زندگی متراسر مفاہمت ہی کا نام ہے۔ حافظ ابن حجر نے ایک سے
 مقامات پر تصریح کی ہے کہ اہمال حدیث سے جمع بین الحدیثین زیادہ بہتر ہے۔ امام حاکم
 نے مفاہمت ہی کو عموم فائدہ کا حامل قرار دیا ہے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے مخرج معانی
 میں ایک مقام پر اسی سلسلے میں یہ ضابطہ لکھا ہے :

اولی الاشیاء اذا روى حدیثان عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فاحتملا الاتصاف واحتملا المتضاد ان تحملهما على الاتصاف۔

اچھا یہی ہے کہ دو حدیثوں میں باہم مفاہمت کرائی جائے۔
حضرت مولانا عبدالحی نے علامہ ابن امیر الحاج کے سوال سے نقل کیا ہے
الجمع متعین عند الامکان اذا دار الامر بین اھدر
العمل باحدھما بالکلیۃ۔

جب صورت حال یہ ہو جائے کہ مفاہمت ہو ورنہ دونوں میں سے
ایک ہاتھ سے جائے گی تو مفاہمت ضرور ہی ہے۔
مفاہمت کے موضوع پر امام اعظم کی ذہانت اور فطانت کو سب نے سراہا ہے احکام و احکام
غیر احکام سے متعلق احادیث میں مفاہمت کے لیے بھی امام اعظم کی ذات گرامی محدثین کے
یہاں استدلالی ہے۔

دنیا میں اسلام کے رونما ہونے کے بعد اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کا سب سے پہلے
شرف کسے حاصل ہوا ہے؟ یہ سیرت و تاریخ کا اہم بحث ہے اور اختلاف روایات کی وجہ سے
فقہاء مدینہ میں بھی اس میں اختلاف رہا ہے اور ویرکبار تابعین میں فقہاء کو فہم بھی اس میں
مختلف ہیں۔ کئی حدیثوں میں اولین مسلم حضرت علی کو بتایا گیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کی
حدیثوں میں یہ شرف حضرت ابو بکر کو دیا گیا ہے کچھ روایات میں حضرت خدیجہ الکبریٰ کا نام
آیا ہے اور بعض حدیثوں میں حضرت زید بن حارثہ کو سب سے پہلا مسلمان ظاہر کیا گیا ہے
محدثین نے ان روایات میں روایتی نقطہ نظر سے تحلیل کا کام کیا اور خالص محدثانہ نظر سے
ان پر بحث فرمائی۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس سادہ و انسان کو لکھنے کے بعد جو فیصلہ کن
بات فرمائی ہے وہ یہ نہیں کہ ان روایات میں راجح کون ہے؟ بلکہ اس موقع پر انہوں نے
حضرت امام اعظم کا وہ فیصلہ لکھ دیا ہے جس میں امام صاحب نے ان حدیثوں میں مفاہمت
کا فارمولا پیش کیا ہے :

قد اجاب ابو حنیفۃ بالجمع بین هذه الاقوال ان اول
من اسلم من الرجال الاحرار ابو بکر و من النساء خدیجۃ
و من الموالی زید بن حارثہ و من الخلمان علی بن ابی طالب -
ابو حنیفہ نے ان سب میں اس طرح ہم آمہنگی پیدا کر دی ہے کہ
آزاد مردوں میں سے اسلام لانے کی اولیت کا شرف ابو بکر کو
عورتوں میں سے خدیجۃ الکبریٰ کو غلاموں میں سے زید کو اور اہل گھر کو
میں سے علی مرتضیٰ کو حاصل ہوا ہے یہ

احکام اور فقہ پر مشتمل حدیثوں میں مفاہمت کی مثالوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہاں
ہم تطویل سے بچتے ہوئے اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ
مفاہمت کے موضوع پر امام اعظم کی خداوندانہ کما صحیح انداز ہو سکے۔

رفع یدین کی صورت

نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت جو رفع یدین کیا جاتا ہے اس کی کیفیت میں روایات مختلف
آئی ہیں حافظ ابن حجر نے تلخیص میں ساری روایات سمیٹ دی ہیں اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار
میں بھی سب روایات کو یکجا کیا ہے ان میں ابن عمر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرفع یدیه ہذو
منکبیه اذا فلتخ الصلۃ -

حضور النور نماز کے آغاز میں مؤذنین تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔

ابو داؤد، نسائی میں وائل کی روایت میں یہ الفاظ ہیں

یرفع ابهامیه الی شحمة اذنیہ

آپ اپنے دونوں انگوٹھوں کو کانوں کی پاڑیوں تک اٹھاتے تھے

احمد اور مسلم میں ابو قتادہ کی روایت میں ہے

کان اذا کبر رفع یدیه حتی یحاذی بہما اذنیہ

ہاتھ اٹھانے وقت دونوں ہاتھ کانوں کے سامنے ہوتے تھے۔

حدو منکبین یعنی مونڈھوں تک ہاتھ اٹھانے کو علامہ ابن دقیق العید نے امام شافعی کا مذہب روایا سے چنانچہ لکھتے ہیں ہوا اختیار الشافعی فی منتہی السرف اور مذکورہ بالا حدیثوں میں محدثانہ نقطہ نظر سے بلحاظ قوت سند حدیث ابن عمر کو راجح قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

وساج مذهب الشافعی بقوة السند لحديث ابن عمر

امام شافعی کے مذہب کو قوت سند کی وجہ سے راجح قرار دیا ہے

علامہ شوکانی نے بھی قوت سند ہی کو پیش نظر رکھ کر ان حدیثوں کے ساتھ ترجیح کا معاملہ فرمایا، لیکن امام اعظم نے تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین کی جو صورت بتائی ہے کہ

یرفع یدیه حتی یحاذی بابہا مینہ شحمتی اذنیہ

رفع یدین اس طرح کرے کہ ہاتھ کے دونوں انگوٹھے کانوں کی پاٹریوں

کے آمنے سامنے ہو جائیں

تو اس سے انہوں نے ان حدیثوں کے بارے میں اپنا موقف واضح فرما دیا کہ وہ اس موضوع اتنی ہوئی حدیثوں میں ترجیح کو نہیں بلکہ مفاہمت کو اپناتے ہیں اور مفاہمت اس طرح کہ جب انگوٹھے کان کی پاٹری سے متصل ہوں گے تو ہاتھ کا بالائی حصہ اگر کانوں کے منے ہو گا تو ہاتھ کا زہرین حصہ مونڈھوں کے محاذ میں ہو گا اور اس طرح ابن عمر، وائل مالک بن الحویرث کی تمام مختلف روایات میں مفاہمت ہو گئی۔ اور یہ میری ذاتی رائے ہیں ہدایہ کے مشہور شارح حافظ ابن الہمام نے بھی رفع یدین کی اس صورت سے یہی نتیجہ لایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

ولا معارضة فان محاذات الشحمتين بالابها مین تسوغ

حکایت محاذات الیندین بالمنکبین والاذنین

ان حدیثوں میں کوئی معارضہ نہیں ہے کیونکہ جب انگوٹھے پاٹریوں کے سامنے ہوں گے تو ہاتھ کانوں اور مونڈھوں کے سامنے آجائیں گے

روایات میں ہر راوی کا بیان اپنی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ تبکیر تحریر کے وقت ہاتھ

اٹھانے کی مدت قلیل ہوتی ہے۔ ہر شخص کی اضطراری نگاہ ہاتھ کے جس حصہ پر پڑی اسی کارروائی میں اظہار کر دیا۔

ہبہ کی واپسی پر احادیث میں مفاہمت

حدیث میں آتا ہے

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم العائد

في هبته كالكلب يعود الى قيئه

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہبہ وے کر واپس لینے والا

ایسا ہے جیسے کتا کہ قے کر کے چاٹے لے

یہ حدیث امام بخاری اپنی صحیح میں دو طریق سے لائے ہیں ایک بحوالہ سعید بن المسیب اور دوسری بحوالہ عکرمہ۔ دونوں حدیثوں کی وجہ سے امام بخاری نے پوری قطعیت کے ساتھ فیصلہ فرمایا ہے کہ

لا يحل لاحد ان يرجع في هبته وصداقته

ہبہ اور صدقہ کو وے کر واپس لینا کسی کے لیے روا نہیں ہے

لیکن اس کے ساتھ ایک دوسری حدیث بھی آتی ہے

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا يرجع في هبته

الا المولد من ولدك -

ہبہ کر کے واپسی کا حق کسی کو نہیں ہے سوائے والد کے کہ وہ اپنے

لڑکے سے وے کر واپس لے سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حدیث ابن عباس کی صرف ظاہری سطح کو دیکھا کہ ہبہ وے کر واپس کر کے قے چاٹنے سے تشبیہ دی ہے انہوں نے ہبہ کی واپسی کے لیے حرمت کا فیصلہ کر دیا اس لیے کہ قے ناپاک ہوتی ہے اور ناپاک چیز حرام ہے لیکن امام اعظم نے یہاں صراحت یہ نہیں دیکھا کہ قے سے تشبیہ دی ہے بلکہ تشبیہ پر بڑے گہرے غور کے بعد بتایا کہ

واقعی ناپاک ہوتی ہے اور ناپاک چیز حرام بھی ہوتی ہے لیکن حضور انور نے جو تشبیہ دی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہمہ دے کر واپس لینے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے چاٹے۔ بلکہ تشبیہ یہ ہے کہ ہمہ دے کر واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے چاٹے۔ ظاہر ہے کہ قے حرام ہے لیکن کتے کے لیے حرام نہیں ہے کیونکہ حلت و حرمت کا تعلق تکلیف سے ہے اور کتا مکلف نہیں ہے اس لیے حدیث کی روح یہ ہے کہ ہمہ کی واپسی مکروہ اور خلاف اولی ہوگی۔ اگر تشبیہ آدمی سے دی جاتی تو پھر ہمہ کی واپسی حرام ہوتی کیونکہ آدمی کے لیے حرام ہے اور یہ کراہت بھی اس وقت سے جب کہ موسیٰ ب لہ ہمہ کنندہ کا قریبی رشتہ دار نہ ہو اور موسیٰ ب لہ کی جانب سے ہمہ کنندہ کو اس کا کوئی بدل نہ ملا ہو اور یہ دونوں شرطیں امام اعظم نے دو حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر مقرر فرمائی ہیں۔ رشتہ داری کی شرط نسائی میں آئے ہوئے استثناء الا الوالد من ولدہ سے اخذ کی ہے اور بدل کی شرط دارقطنی اور ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے لی ہے۔

الرجل احق بہبتہ ما لم یثب منہا
ہمہ کا حقدار ہے جب تک اس کا بدل نہ پائے
دیکھ لیجئے کس نشاندہ طریق سے تمام ارشادات کے درمیان مفاہمت ہو گئی۔

ارشاد نبوت اور صحابی کے فتویٰ میں مفاہمت

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے۔
ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا شرب
الکلب فی اناء احکم فلیغسلہ سبداً۔
تمہارے برتن میں جب کتا منہ ڈالے تو چاہیے کہ اسے سات بار
دھو ڈالے۔

سنن دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہ کی دوسری حدیث ہے
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیغسل الاناء
من ولوغ الکلب ثلاثاً وضحاً وسبداً۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتے کے برتن میں منہ

ڈالنے سے برتن کو تین یا پانچ یا سات بار دھویا جائے۔
حافظ زبیری نے ابن عدی کے حوالہ سے ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہ کی یہ بھی لکھی ہے
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دلیغ الکلب فی اناء
احدکم فلیہرقہ، ویغسلہ ثلاث مرات۔
برتن میں کتا منہ ڈال جائے تو اسے گرا کر تین بار دھوؤ۔
نیز دارقطنی نے اپنی سنن میں حضرت ابو ہریرہ کا یہ فتویٰ بھی روایت کیا ہے
اذا دلیغ الکلب فی الاناء فاہرقہ ثم اغسلہ ثلاث
مرات۔

جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے اٹھاؤ اور اسے تین بار دھوؤ
اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ کا یہ عمل بھی نقل کیا ہے کہ
انہ کان اذا دلیغ الکلب فی الاناء اہرقہ وغسلہ ثلاث مرات
برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اسے گرا کر تین بار دھوتے تھے۔
حضرت ابو ہریرہ سے ان کا فتویٰ اور ان کا عمل نقل کرنے والے مشہور محدث و مجتہد حضرت
عطاء بن ابی رباح ہیں۔

محدثین نے اپنے روایتی مذاق کے مطابق ان حدیثوں کی اسنادی بحث کو سامنے رکھ کر سبع
کی روایت کو راجح قرار دیا اور تین کی مرفوع روایت میں عبد الوہاب پر تفرد کا الزام لگا دیا اور
ابن عدی کی روایت میں احمد حسین کراچی پر یہ تنقید کی کہ ان کا تعلق لفظیہ سے ہے یعنی
ان لوگوں میں سے ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن کے جو الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں وہ مخلوق
ہیں۔ یہ کلامی مسائل میں امام بخاری کے اساتذہ میں سے ہیں اور جو ہرج ان پر کی گئی ہے
بالکل اسی قسم کی ہرج امام بخاری پر بھی کی گئی ہے چنانچہ حافظ ابوالولید حسان بن محمد نیشا
پوری ^{رحمۃ اللہ علیہ} نے جب صحیح بخاری پر مستخرج لکھنے کا ارادہ کیا تو ان کے والد بزرگوار نے ان
کو ہدایت کی۔

علیک بکتاب مسلم فانہ اکثر برکۃ فان البخاری کان ینسب الی اللفظ

تمہیں مسلم کی کتاب پر مستخرج لکھنا چاہیے کہ اس میں برکت زیادہ ہے کیونکہ
امام بخاری مسئلہ لفظ کی طرف منسوب ہیں۔

چنانچہ سعادت مند بیٹے نے باپ کی تعمیل ارشاد میں بجائے صحیح بخاری کے صحیح مسلم پر مستخرج
تصنیف کیا۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابوالولید مذکور کے ترجمہ میں اس واقعہ کو نقل کر کے
بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ

و مسلم ایضاً منسوب الی اللفظ والمسئلت مشکلتاً

اور خود امام مسلم پر بھی لفظیہ ہونے کا الزام معاملہ پیچیدہ ہے
اسی فکری اختلاف کی وجہ سے امام مسلم نے امام ذہبی سے جو تمام ارباب صحاح کے فن حدیث
میں استاد ہیں اور جن کو تلفظ بالقرآن کے مسئلہ پر امام بخاری سے سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ اپنی
صحیح میں روایت نہیں لی اور صرف امام ذہبی سے ہی نہیں بلکہ اس اختلاف کے نتیجے میں
امام مسلم نے امام بخاری سے بھی اپنی صحیح میں روایت نہیں لی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی
لکھتے ہیں :

قد انصف مسلم فلم یحدث فی کتابہ عن ہذا ولا عن ہذا

امام مسلم نے اچھا کیا ہے کہ اپنی کتاب میں کسی سے بھی روایت نہیں لی۔

بہر حال یہ علمی چشمک کوئی جرح کی بات نہیں ہے اور اس بنیاد پر نہ امام بخاری مجروح ہو
سکتے ہیں اور نہ کراہیسی۔ اس لیے حضرت ابو ہریرہ کی روایت کو شک کی نگاہوں سے نہیں دیکھا
جاسکتا۔ امام بیہقی نے اس روایت کو یہ کہہ کر در خود اعتناء نہیں سمجھا کہ

اس حدیث کا راوی عبد الملک تمام عطاء بن ابی رباح کے تلامذہ میں

اور پھر عطاء تمام ابو ہریرہ کے اصحاب میں سے اس روایت میں

منفرد ہیں حالانکہ عطاء اور ابو ہریرہ کے تلامذہ سب کے سب

سات بار کی روایت کر رہے ہیں۔ اس لیے عبد الملک کی روایت

مخالفت ثقات ہونے کی وجہ سے قابل پذیرائی نہیں ہے۔

لیکن امام بیہقی کی یہ معذرت اصول محدثین کے مطابق کچھ جچتی نہیں ہے جب کہ جمہور

محدثین اور فقہاء لکھتے ہیں کہ ثقہ کا تفسر قابل قبول ہے۔ عبد الملک بن ابی سلیمان مسلم کے راویوں میں سے ہے۔ اور تمام ارباب سنن نے ان سے روایت لی ہے۔ ابن سعد، ابن عمار موصلی، الثوری، ترمذی، احمد، یحییٰ اور نسائی ان کی ثقاہت اور امانت کے گن گاہے ہیں۔ امام شعبہ نے اگر ان سے حدیث شفعہ نہیں لی ہے تو خطیب کہتے ہیں کہ یہ ان کی بے انصافی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

شعبہ سے اس معاملہ میں بڑی بے انصافی ہوئی ہے کہ انہوں نے محمد بن عبد اللہ کی حدیث کو اپنا لیا اور عبد الملک بن ابی سلیمان کی حدیث کو چھوڑ دیا کیونکہ محمد بن عبد اللہ کی روایت کے غیر معتبر ہونے میں تمام محدثین متفق ہیں۔ برخلاف عبد الملک کے کہ ان کے بارے میں سب محدثین رطب اللسان ہیں اور ان کا تذکار حسن درجہ شہر کو پہنچا ہوا ہے۔

آئیے امام شعبہ کا وہ بیان بھی سن لیجئے جس کے سہارے امام بیہقی نے عبد الملک بن ابی سلیمان کو متروک اور ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

حدثنا نعیم بن حماد قال سمعت دکیعا یقول سمعت شعبۃ یقول لوروی عبد الملک بن ابی سلیمان حدیثاً اخری مثل حدیث الشفۃ طرحت حدیثاً

شعبہ کہتے ہیں کہ اگر عبد الملک حدیث شفعہ کے علاوہ کوئی اور حدیث روایت کرے گا تو میں اس کی حدیث کو پھینک دوں گا۔

کیوں؟ اس کی وجہ کوئی نہیں بتائی گئی۔ شعبہ کا یہ بیان ہمیں نعیم کی وساطت سے ملا ہے۔ نعیم کی خود شخصیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابو داؤد کہتے ہیں کہ نعیم کی بیس حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ امام نسائی ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ازہری لکھتے ہیں کہ:

کان نعیم یضع الحدیث فی تقویۃ السنۃ وحکایات نردۃ فی ثلب نعان کلھا کذب۔

نعیم سنت کی تقویت کے لیے حدیثیں گھڑتے تھے اور امام ابو حنیفہ کے مقابل میں جھوٹی حکایتیں بناتے تھے بلکہ

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ نعیم نے یہاں بھی اپنے گمان کے مطابق سات کے عدد کی سنت کو قومی سے قومی تر بنانے کے لیے مدافعانہ کارروائی کی ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ نہیں کی روایات کو مجروح کر دیا جائے اور اس کے لیے بیچاڑے عبد الملک کو نشانہ بنالیا ورنہ عبد الملک کو جملہ محدثین کی حمایت حاصل ہے اور سب کے نزدیک ثقہ ہیں ان کا قصور صرف یہ ہے کہ :

کان من ا حفظ اهل الکوفۃ - ۱۷

یہ کوفہ کے حفاظ حدیث میں سے ہیں۔

امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ حفاظ حدیث لوگوں میں یحییٰ بن سعید، عبد الملک بن ابی سلیمان، اور اسماعیل بن خالد ہیں۔ عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ امام شعبہ عبد الملک کے حافظ پر بے حد حیران ہوتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین سے عبد الملک کی حدیث شفعہ کے بارے میں جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ لوگوں نے اس حدیث پر گرفت کی ہے لیکن عبد الملک ثقہ ہیں، صدوق ہیں۔ ان جیسوں پر گرفت نہیں ہو سکتی۔

بہر حال محدثین نے اپنے نقطہ نظر سے ان حدیثوں میں رد و قبول کا رویہ اختیار کیا اور حافظ ابن القیم اور علامہ شوکانی کو تو یہاں تک جوش آگیا کہ

حدیث جب کسی موضوع پر صحیح ہو جائے اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسری حدیث صحیح نہ ہو ہمارا فرض یہی ہے کہ حدیث کو اپنائیں اور اس کے مخالف ہر چیز کو چھوڑ دیں اور ہم حدیث کو کسی کی بھی مخالفت کی وجہ سے نہ چھوڑیں گے خواہ وہ کوئی ہورادی یا غیرادی تھے

اور علامہ شوکانی رقمطراز ہیں

کسی حال میں بھی کسی کا قول حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں حجت نہیں ہے بلکہ

اتباع سنت کی حد تک تو یہ بات بالکل درست ہے اور واقعی ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہی ہے لیکن یہاں یہ بحث بے محل ہے کیونکہ یہاں حضور کے ارشاد کا مقابلہ حضور کے ارشاد سے ہے ایک وہ ارشاد ہے جو بخاری میں بحوالہ ابو ہریرہ ہے اور دوسرا ابو ہریرہ ہی کے حوالہ سے سنن دارقطنی میں ہے اور اس کی تائید میں حضرت ابو ہریرہ کا عمل اور ان کا فتویٰ یہی ہے ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اگر حضرت ابو ہریرہ کا یہ بیان درست ہے کہ حضور نے فرمایا کہ برتن میں کتا منہ ڈال دے تو تین مرتبہ دھویا جائے اور درست نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ روایت صحیح ہے اور اس پر ابو ہریرہ کا عمل بھی ہے اور عمل کے ساتھ اسی پر ابو ہریرہ فتویٰ بھی دے رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ کا یہ بیان بھی درست ہے کہ حضور نے فرمایا کہ برتن کو سات بار دھویا جائے تو یہ سوال یہاں بے حد اہم ہے کہ اس سات بار والے بیان کے ہوتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ نے تین پر کیونکر عمل کیا اور اس پر فتویٰ کیوں دیا۔ حضرت ابو ہریرہ کے لیے تو ارشاد نبوت کا درجہ قطعیت میں آیت قرآنی کا ہے کیونکہ وہ خود حضور سے سنتے ہیں۔ یہاں حافظ ابو جعفر طحاوی کی یہ بات جی کو لگتی ہے کہ اگر حضرت ابو ہریرہ نے اس ارشاد کو عمداً ترک کیا ہے تو اس سے ان کی عدالت پر حرف آتا ہے اور ان کی روایات کا سرمایہ ہی ناقابل قبول ہو جاتا ہے اس لیے ہم ایسا سوچنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ نے ان سب حدیثوں کو اور حضرت ابو ہریرہ کے فتویٰ اور عمل کو پیش نظر رکھ کر ان میں ایسی مفاہمت کر دی ہے کہ جس سے ان حدیثوں میں سے کوئی حدیث بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی ہے فرماتے ہیں کہ تین بار دھونا واجب ہے اور سات کا عدو استحباب کے لیے ہے۔ چنانچہ امام طحاوی فرماتے ہیں:

.. بحمل ما زاد علی الثلاث فی المرفوع والموقوف علی ابی ہریرۃ کلہما

علی الاستحباب لورود التثلیث فی المرفوع والموقوف عندہ

تین سے زیادہ عدو کو مستحب قرار دیا جائے گا۔

اور حافظ ابن الہمام فرماتے ہیں

طہارۃ الاناء الذی دلیغ فیہ، الکلب لا توقف علی السبع

بل تثبت قبل السبع بالثلاث على ما ذكره المحاكم في اشاراته
وهو ايضا مقتضى نقلهم عن ابى حنيفة وجوبها و
استحباب الامر بجهة بعدها -

جس برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا اس کا پاک ہونا سات پر موقوف
نہیں بلکہ وہ سات سے پہلے ہی تین سے پاک ہو چکا ہے جیسا کہ
حاکم نے بتایا ہے اور یہی تقاضا ہے امام ابو حنیفہ کی اس روایت کا
جس میں کہا ہے کہ تین بار دھونا واجب ہے اور سات بار مستحب ہے
اس طرح دونوں ارشاد نبوت میں اور راوی حدیث کے فتویٰ میں مفاہمت ہو گئی اور تمام حدیثوں
پر اپنی اپنی جگہ عمل ہو گیا -

جماعت کھڑی ہو جانے پر سنتیں پڑھنا

اسی قسم کی ایک اور مثال سنئے - صحیح مسلم میں حدیث آتی ہے :
عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقيمت
الصلاۃ فلا صلوة الا المکتوبۃ -

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز قائم کر دی جائے تو فرض
نماز کے سوا کوئی نماز نہیں ہے -

اگرچہ حفاظ حدیث کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے - یا
حضرت ابو ہریرہ کا فتویٰ ہے - حضرت امام شافعی نے کتاب الام میں اسے حضرت ابو ہریرہ کا
فتویٰ ہی قرار دیا ہے - ابن ابی شیبہ کا مصنف میں اور طحاوی کا شرح معانی الآثار میں یہی
میلان ہے - حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ شاید اسی اختلاف کی بنا پر امام بخاری نے اس
کو اپنی صحیح میں روایت نہیں کی ہے -

ظاہر بینوں نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے کہ اگر جماعت کھڑی ہو جائے اور کوئی شخص
سنتیں وغیرہ پڑھ رہا ہو تو اس کی سنتیں کا عدم اور باطل ہوں گی - چنانچہ علامہ شوکانی نے ظاہر یہ

کے حوالہ سے نقل کیا ہے ۔

واهل الظاهر انما لا تنعقد صلاة تطوع في وقت اقامة
الفريضة ۔^۱

ظاہریہ کی رائے میں فرض قائم ہونے پر کوئی نفل نماز نہیں ہوتی ہے
اور علامہ شوکانی کا اپنا میلان بھی یہی ہے و هذا القول هو الظاهر یہی قول ظاہر ہے
لیکن اس حدیث میں نماز کے باطل ہونے کے لیے دُور کا بھی اشارہ نہیں ہے ۔ نہ یہ اس کا
منطوق ہے نہ مدلول اور نہ مفہوم ۔ اسی بنا پر ائمہ اربعہ میں سے یہ کسی کا مذہب نہیں ہے ۔
جمہور کا مذہب یہی ہے کہ توڑے نہیں بلکہ پوری کرے ۔ امام اعظم کا مذہب صحیح یہ ہے کہ
اگر ایک رکعت طے کی توقع ہو تو سنتیں مسجد سے باہر ادا کرے ۔ رکعت کی قید اس حدیث
سے لی گئی ہے ۔

من ادرك الركعة من الصلاة فقد ادرك الصلاة

(رواه ابو داود)

جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی
امام اعظم کا یہ مذہب امام محمد نے جامع صغیر میں ان الفاظ میں لکھا ہے ۔
رجل انتهي الى الامام في الفجر ولم يصل ركعتي الفجر فخشى
ان يفوته ركعة ويدرك الاخرى فانه يصلي ركعتي
الفجر عند باب المسجد فان خشى فوتهما دخل مع الامام
ولم يصل ركعتي الفجر ۔

اگر کوئی نماز میں آیا اور اس نے صبح کی سنتیں نہ پڑھی ہوں اسے
ایک رکعت جانے کا اندیشہ ہو اور دوسری رکعت طے کی اُمید
ہو تو اسے اجازت ہے کہ مسجد کے دروازے کے پاس صبح کی
سنتیں پڑھے اگر دونوں رکعتوں کے نہ طے کا اندیشہ ہو تو
جماعت میں شامل ہو جائے اور سنتیں نہ پڑھے ۔

صاحب ہدایہ نے باب اور اک الفرضیہ میں اسی کو مختار قرار دیا ہے اور علامہ کا ثنائی نے امام صاحب کا یہی مذہب بتایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت میں نماز کھڑی ہونے پر نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے اور اس کا منشا دوسری حدیثوں کو ملا کر صبح کی سنتوں اور فرض کو بلا فصل ادا کیگی پر نیکر کرنا ہے۔ کیونکہ دوسری حدیثوں میں جماعت کھڑی ہونے سے پہلے جماعت کھڑی ہونے پر اور جماعت سے فرات کے بعد سب پر نیکر آتی ہے اور ہر جگہ منشا یہی ہے کہ صبح کی سنتوں اور فرضوں میں اتصال نہ کیا جاتے بلکہ انفصال ہونا چاہیے اور حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے سب کی روح یہ ہے کہ نماز فجر کی سنتوں اور فرضوں میں فصل کیا جائے بلکہ ایک موقع پر آپ نے یہ بات صراحتاً فرمائی ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعید اللہ بن مالک
وهو منتصب یصلی ثم قبل صلوٰۃ الصبح فقال لا
تجعلوا هذه الصلوٰۃ كصلوٰۃ قبل الطهر وبعدها
واجعلوها بينهما فصلا۔

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن مالک کے پاس سے گزرے وہ نماز صبح سے پہلے سنتیں پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اس نماز کو ظہر کی نماز سے پہلے اور بعد کی سنتوں جیسا نہ بناؤ ان میں کچھ فاصلہ کرو۔

اس میں وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ مقصود یہ ہے کہ صبح کے فرضوں اور سنتوں میں فاصلہ ہو۔ چاہے یہ فاصلہ زمانی ہو یا مکانی۔ حضور ہی کے دوسرے اعمال سے مکانی فصل معلوم ہوتا ہے اس لیے امام اعظم نے اس ارشاد کی روح سمجھ کر بتایا کہ سنتوں کی ادائیگی اگر مسجد میں نہیں بلکہ مسجد سے باہر ہو جائے تو منشا نبوت پورا ہو جائے گا۔ تصریح کے بعد قیاس آرائی کا کوئی محل نہیں ہے۔ جب فرمایا ہے کہ ان میں فاصلہ کرو تو منطوق کلام اسی کو قرار دیا جائے ورنہ نماز سے قبل سنتوں پر ٹوکنے کے معنی کوئی نہیں ہیں۔ اور نماز کے بعد بھی سنتوں کی ادائیگی پر نیکر آتی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے :

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لاتے نماز کھڑی ہو گئی میں نے جماعت سے صبح کی نماز ادا کی حضور النور اٹھے تو مجھے نماز پڑھتے

دیکھا۔ فرمایا قیس چھوڑا کیا دو نمازیں یک دم میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے صبح کی دو سنتیں نہیں پڑھی ہیں۔ فرمایا پھر بھی نہیں۔

نماز ہوتے ہوتے بھی سنتیں پڑھنے پر نیکرائی ہے چنانچہ صبح بخاری میں ہے : حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جماعت کھڑی ہو جانے پر نماز کی سنتیں پڑھتے دیکھا۔ جب حضور نماز سے فارغ ہو گئے تو حضور انور نے اس سے فرمایا کیا صبح کی نماز چار رکعتیں ہیں؟ کیا نماز صبح چار رکعت ہے؟

ایک اور حدیث صحیح مسلم میں ہے :

ایک شخص مسجد میں آیا حضور انور صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اس نے دو رکعت مسجد میں پڑھی پھر جماعت میں مل گیا۔ حضور نے سلام پھیر کر فرمایا دونوں نمازوں میں کون سی نماز کو تو نے قرار دیا ہے؟ انفرادی کو یا جماعت والی کو؟

ان تمام ارشادات کو غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے آپ کے سامنے یہ بات منقح ہو کر آجائے گی کہ منشاء نبوت سنتوں اور فرضوں کو ایک ہی جگہ ملا کر پڑھنے سے روکنا ہے اور مقصد یہ ہے کہ دونوں میں فصل کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں :

اس حدیث نے بتایا ہے کہ حضور انور نے ابن الجینہ کے لیے جس بات پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے وہ سنتوں کو ایک ہی جگہ پر فرضوں سے بغیر کسی فصل کے ملانا ہے۔

اس لیے اگر صبح کی سنتوں کی ادائیگی مسجد سے باہر کر کے مکان کا فصل کر دیا جائے تو منشاء نبوت پورا ہو جاتا ہے صرف امام اعظم ہی نے نہیں بلکہ خود صحابہ کرام نے بھی حضور انور کا یہی منشاء سمجھا ہے کیونکہ اذا اقيمت الصلوة میں اذا اگر ظرفیہ ہے تو دو ہی صورتیں ہیں طرف زمان یا ظرف مکان۔ ظاہر ہے کہ ظرف مکان ہے۔ مکان ہونے کی صورت میں اس کی

حد بندی ناگزیر ہے موٹی سے موٹی عقل والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ لاہور کی شاہی مسجد میں صبح کی جماعت کھڑی ہونے پر تمام روئے زمین پر ہر قسم کی نماز حرام ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو پھر اذا قیمتہ الصلوٰۃ میں مکان سے مکان نماز یعنی مسجد ہی مراد ہے اس لیے نماز کھڑی ہو جانے پر مسجد میں سنتیں نہ پڑھنی چاہئیں۔ یہی امام ابو حنیفہ کا اصل مذہب ہے۔ صحابہ کرام کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ محمد بن کعب نے حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس سے میں تیار ہوں

خرج عبد اللہ بن عمر من بیتہ فا قیمت صلوٰۃ الصبح فر کح
ر کعتین قبل ان یدخل المسجد و هو فی الطریق ثم
دخل المسجد فصلی الصبح مع الناس رکعتین -

عبداللہ بن عمر گھر سے نکلے نماز صبح کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ نے
سنتیں مسجد میں داخل ہونے سے پہلے راستہ ہی میں ادا کیں
بعد ازیں مسجد میں آئے اور جماعت سے نماز پڑھی۔

یہ اور اس قسم کے ایک سے زیادہ آثار صحابہ آئے ہیں۔ امام ابو بکر بن شیبہ نے انیس صحابہ
کے آثار پیش کئے ہیں جن سے بیرون مسجد صبح کی نماز کھڑی ہو جانے کے باوجود ادا و امر سنت
کا پتہ چلتا ہے :-

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ امام اعظم کو صبح کی سنتوں کی
ادائیگی پر اس قدر اصرار کیوں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اصرار بھی امام
اعظم کا اپنا نہیں بلکہ یہ اور راست کمرج رسالت منیر کا اصرار ہے۔
مسند احمد، ابوداؤد میں ارشاد ہے :

لا تدعوا رکعتی الفجر ولو طردتکم الخیل -
صبح کی سنتیں نہ چھوڑو چاہے تمہیں گھوڑے روند ڈالیں۔

حضرت عائشہ نے حضور انور کے عمل کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بھی سن لیجئے :

لما یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی شیئ من المنافع اشد
تعاہداً منہ علی رکعتی الفجر -

نبوت کے اسی اصرار کی بنا پر امام عظیم فجر کی سنتوں کی ادائیگی کو جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود دو شرطوں کے ساتھ جائز بتاتے ہیں۔ اول یہ کہ بیرون مسجد ہو۔ دوم یہ کہ دونوں کعتوں کے جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر ایسا اندیشہ محسوس کرے تو جماعت میں شامل ہو جائے اور سنتوں کو طلوع آفتاب کے بعد پڑھے۔ صبح کی نماز کے بعد نہ پڑھے کیونکہ صبح کی نماز کے بعد حضور انور کا بتایا ہوا عام ضابطہ یہ ہے :

عن عمر بن الخطاب ان النبي صلى الله عليه وسلم نهى
عن الصلوة بعد الفجر حتى تطلع الشمس وبعد العصر
حتى تغرب الشمس (متفق عليه)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اور
نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک نماز سے منع فرمایا ہے۔

صرف حضرت عمر ہی سے نہیں بلکہ التلخیص الجیر میں حافظ عسقلانی نے بتایا ہے کہ صحابہ
کی ایک بڑی جماعت نے یہ ضابطہ نقل کیا ہے۔ ارباب ظاہر نے ترمذی کی ایک روایت میں
اپنا خود ساختہ مطلب ڈال کر اسے اس مشہور ضابطہ سے متصادم کر دیا۔

ترمذی میں قیس بن قیس کا یہ واقعہ منقول ہے :

خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فاقيمت الصلوة
فصليت معه الصبح ثم انصرف النبي صلى الله عليه
وسلم فسجد في اصلي فقال مهلاً يا قيس اُصلتان
معاً قلت يا رسول الله اني لما كنت صلّيت ركعتي الفجر
قال فلا اذن -

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے جماعت کھڑی ہو گئی
میں نے آپ کے ہمراہ نماز صبح ادا کی بعد ازیں حضور نے نماز سے
فراغت کے بعد مجھے نماز پڑھتے پایا تو فرمایا اے قیس چھوڑ !
کیا دو نمازیں اکٹھی ؟ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے
صبح کی دو سنتیں نہیں ادا کی تھیں فرمایا پھر بھی نہیں۔

اس حدیث میں فلا اذن کے معنی فلا باس اذن یعنی تب کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ اس

روایت کو پہلی روایت عمر کے معارض بنا دیا اور بطور خود صبح کی نماز کے بعد سنتیں پڑھنے کا پرواز دے دیا۔ اور اس واقعہ ہی میں مہلاً یا قیس دھپوڑا لے قیس کی گرفت سے ایسے بے خبر ہو گئے گویا یہ بات زبان نبوت نے فرمائی ہی نہیں۔ لیکن امام اعظم نے مہلاً یا قیس کے زور کی وجہ سے فلا اذن کے معنی فلا اذن اذن تب بھی اجازت نہیں ہے تاکہ مراد نبوت کو مقرر فرمایا اور اس طرح اس واقعہ کو دوسرے ارشادات کے ساتھ متصادم ہونے سے بچا لیا۔ اور فلا اذن کے معنی بھی امام اعظم نے صرف سیاق کلام کی مدد سے نہیں بلکہ حدیث ہی میں آمدہ دوسرے شواہد سے لیے ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں واقعہ آیا ہے کہ نفعان بن بشیر نے اپنے ایک لڑکے کو کچھ مال دے دیا۔ ان کی خواہش ہوئی کہ اس معاملہ میں حضور انور بھی گواہ ہو جائیں۔ نفعان حضور انور کی خدمت میں آئے۔ آپ نے دریافت کیا اھل مہلت سائر ابنائک مثلاً کیا تم نے اپنے سائے بیٹوں کو اسی طرح دیا ہے؟ بولے کہ نہیں۔ حضور نے فرمایا کہ فلا اذن۔ یہاں معنی صاف ہیں کہ پھر اجازت نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں امام اعظم نے صبح کی نماز کے بعد سنتوں کی ادائیگی سے منع فرمایا اور طلوع آفتاب کے بعد ان کی ادائیگی کو جائز قرار دیا۔ طلوع آفتاب کے بعد کے متعلق خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد بھی آیا ہے جو حاکم نے مستدرک میں، دارقطنی، بیہقی اور ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں بحوالہ حضرت ابو ہریرہ نقل کیا ہے۔

من لم یصل رکعتی الفجر فلیصلہما بعد ما تطلع الشمس
جس شخص نے صبح کی سنتیں نہیں پڑھیں اسے چاہیے کہ آفتاب نکلنے پر پڑھ لے۔

اس طرح امام اعظم نے اس موضوع پر آئی ہوئی مختلف حدیثوں میں شاندار طریق پر مفاہمت کر دی کہ ایک ارشاد نبوت بھی امت کے عمل سے بیگانہ نہ رہا اور سب حدیثوں پر عمل ہو گیا۔ یہ چند مثالیں بطور نکلے از گنزار عرض کر دی گئی ہیں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ مختلف حدیثوں میں مفاہمت کے موضوع پر سینۃ ابو خلیفہ سے اہلی ہوتی نقاہت کیا ہے؟

وجہ ترجیح اور امام اعظم

اگر دو صحیح حدیثوں میں تعارض ہو اور ان میں باہم مفاہمت کی کوئی صورت نہ ہو تو ان میں ایک کو

راج اور دوسری کو مرجوح قرار دیا جاتا ہے۔ ترجیح کی حقیقت یہ ہے کہ دو حدیثیں اگر صحت و قوت کے لحاظ سے یکساں اور ہم پلہ ہوں لیکن اپنے مضمون کے لحاظ سے باہم متعارض ہوں تو ان دونوں میں سے ایک کو دوسری کے مقابلہ میں کسی ایسے سہارے کے ذریعے جس میں خود مستقل طور پر حجت بننے کی صلاحیت نہ ہو رائج قرار دیا جاتے۔ جن سہاروں کے ذریعے ترجیح کا عمل کیا جاتا ہے، محدثین کی اصطلاحی زبان میں ان کو وجوہ ترجیح کہتے ہیں۔ علمائے نے ایک سے زیادہ وجوہ ترجیح کی نشاندہی کی ہے۔ علامہ حازمی نے دوسرے علماء کے بائے میں بتایا ہے کہ

قد اورد بعض الممتنا فی باب الترجیحات نیفا و اربعین
وجہا فی ترجیح احد الحدیثین علی الآخر۔

ہماری بعض ائمہ نے وجوہ ترجیح چالیس سے زیادہ بتائے ہیں۔
خود علامہ حازمی نے کتاب الاعتبار میں جن وجوہ ترجیح کا پتہ دیا ہے ان کی تعداد پچاس ہے اور آخر میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ

فهذا القدر کاف فی ذکر الترجیحات و ثم وجوہ کثیرة
اضرب بنا عن ذکرها کیلا یطول هذا المختصر۔

وجوہ ترجیح کی یہ مقدار کافی ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ
ہیں لیکن ہم نے طوالت کے اندیشہ سے ان کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ
حافظ سیوطی نے وجوہ کثیرہ کے چہرہ ابہام سے یہ کہہ کر نقاب ہٹا دی ہے کہ
وصلها غیرہ الی اکثر من مائتہ کما استوفی ذالک العراقی
فی نکتہ۔

حازمی کے علاوہ اوروں نے اس تعداد کو ایک سو تک پہنچا دیا ہے
جیسا کہ حافظ عراقی نے نکت علی ابن الصلاح میں اس کی تفصیل کی ہے کہ
علامہ جمال الدین قاسمی نے تمام وجوہ ترجیح کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے۔
جو شخص صحابہ تابعین اور اتباع تابعین کے حالات کا مطالعہ کرے گا
وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ بزرگ اس پر متفق تھے اور ان کی

اس موضوع پر کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں کہ راجح پر عمل کیا جائے
اور مرجوح کو چھوڑ دیا جائے۔ ترجیح کے طریقے بہت ہیں۔ لیکن
ترجیح کی بنیاد یہ ہے کہ وجہ ایسی ہو جو مسالک شرعیہ کے مطابق
اور مزاج نبوت کے موافق ہو۔ جس میں یہ چیز موجود ہو وہ وجہ معتبر
ہے۔ ترجیح کبھی بلحاظ اسناد، کبھی باعتبار متن، کبھی بحیثیت مدلول
اور کبھی کسی بیرونی چیز کی وجہ سے ہوتی ہے۔

ان وجوہ ترجیح کا یہاں موقع نہیں ہے جو محدثین کرام نے قلم بند فرمائی ہیں اور جن کو فقہاء
کرام نے اسلام کی قانون سازی کے مختلف مرحلوں پر استعمال کیا ہے۔

ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اگر دو حدیثیں صحیح ہونے کے باوجود باہم متعارض ہو جائیں
تو کیا ان میں سے کسی ایک کو اس بنا پر راجح قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس کے بیان کرنے والے
علم و فکر اور فقہ و نظر کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اس حد تک سب متفق ہیں کہ راویوں میں فقہانیت
یقیناً وجہ ترجیح ہے چنانچہ امام حارمی رقمطراز ہیں۔

وجوہ ترجیح میں سے تیسویں وجہ یہ ہے کہ دو حدیثوں میں سے کسی
ایک کے بیان کرنے والے اگر حفظ و ضبط میں ہم پلہ ہوں لیکن ان میں
سے ایک کے راوی فقہاء ہوں تو فقہاء کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ علی
بن خشرم محدث کہتے ہیں کہ ہم سے امام وکیع نے کہا کہ ان دو سندوں
میں سے تمہیں کون سی سند پسند ہے؟ اعمش عن ابی داؤد عن عبد اللہ
یا سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبد اللہ۔ ہم نے جواباً عرض
کیا کہ ہمیں تو اعمش عن ابی داؤد عن عبد اللہ کا سلسلہ سند زیادہ پسند
ہے۔ امام وکیع نے بتایا کہ اس سند میں اعمش اور ابو داؤد شیعہ
حدیث ہیں۔ اور دوسری سند میں سفیان، منصور، ابراہیم اور علقمہ
فقہاء ہیں اور وہ حدیث جو فقہاء کی راہ سے آئے بلاشبہ اس حدیث
سے بہتر ہے جو محدثین کی وساطت سے آئے۔

علامہ ابوالسعدات محمد الدین ابن الاثیر نے جامع الاصول میں اس موقع پر بڑے پتے کی بات لکھی ہے :

یہ سلسلہ روایت فقہاء کی راہ سے عبد اللہ بن مسعود تک رباہی ہے اور محدثین کی راہ سے ثنائی ہے یعنی فقہاء کے طریق میں عبد اللہ تک چار راوی ہیں اور محدثین کے سلسلے میں صرف دو راوی ہیں۔ اس کے باوجود صرف راویوں کی فقہائیت کی وجہ سے فقہاء کی روایت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو جائے اور بلحاظ سند دونوں قوی ہوں۔ لیکن ایک کے سلسلہ سند میں شیوخ حدیث ہوں اور دوسری فقہاء کی وساطت سے آرہی ہو تو خود ارباب حدیث کے نزدیک بھی فقہاء کی روایت کا پلڑا بھاری ہوگا۔ چاہے فقہاء کی روایت کے مقابلے میں محدثین کی روایت کو ”علو“ کا مقام بھی حاصل ہو۔ یعنی فقہاء کے سلسلے میں راویوں کی تعداد زیادہ اور محدثین کے طریق میں راویوں کی تعداد کم ہو۔ علامہ محمد معین سندھی نے اس مقام پر یہ کہہ کر کہ

فقه السواة لا اثر له في صحة المروى وانما مدارها على العدالة والاضبط -

راویوں کی فقہائیت کا روایت کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے روایت کا دار و مدار راویوں کی عدالت و ضبط پر ہے۔

اختلاف سے کام لیا ہے۔ گفتگو روایت کی صحت میں نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ روایت کی صحت کے لیے فقہ راوی شرط نہیں ہے۔ اس میں دو رائے نہیں ہیں۔ گفتگو تو اس میں ہے کہ اگر دو صحیح روایتوں میں تعارض ہو جائے، دونوں روایتوں کے راویوں میں عدالت و ضبط یکساں ہو اور ان میں باہم کسی طرح منافقت نہ ہو سکے تو کسے راجح قرار دیا جائے ظاہر ہے کہ محدثین فقہ راوی کو ترجیح میں سبب مؤثر قرار دیتے ہیں۔ آپ امام حازمی کی تصریح پڑھ چکے ہیں۔ حافظ سیوطی اور حافظ عراقی جیسے اساطین حدیث بھی امام حازمی کے ہم زبان ہیں چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی رقمطراز ہیں :

لے جامع الاصول ج ۱ ص ۶۲ - لے دراسات اللیب -

ثالثها۔ اسی من وجوہ الترجیح۔ فقہ الراوی سواد کان الحدیث
مراد بالمعنی او باللفظ۔ لان الفقیہ اذا سمع ما یمنع حملاً علی
ظاهرہ بحث عنه حتی یطلع علی ما یزول به الاشکال۔
وجوہ ترجیح میں سے تیسری وجہ فقہ راوی بھی ہے چاہے حدیث کی روایت
باللفظ ہو یا بالمعنی ہو کیونکہ فقیہ جب کوئی ایسی بات سنتا ہے جسے ظاہر
پر محمول کرنا دشوار ہو تو اس کے بارے میں بحث و تمحیص سے کام لیتا ہے
تا آنکہ وہ ایسی چیز پر مطلع ہو جاتا ہے جس سے راہ کی مشکلات حل
ہو جاتی ہیں۔ لے

خطیب بغدادی لکھتے ہیں :

ویرجح بان یکون رواۃ فقہاء لان عنایۃ الفقیہ بما یعلق
من الاحکام و مثله من عنایۃ غیرہ بذالک۔
کسی حدیث کو اس کے راویوں کے فقیہ ہونے کی بنا پر ترجیح دی جائے
گی کیونکہ فقہاء کی مرکزی توجہ احکام پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ
ہوتی ہے۔ لے

بہر حال علامہ معین الدین سندھی نے یہ کہہ کر اپنے مخاطبوں کو ایک سنگین غلط فہمی میں ڈالنے کی
کوشش ہے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ روایت کی صحت کے لیے فقہ راوی کسی کے نزدیک بھی شرط
نہیں ہے۔ فقہ راوی صحت کے لیے نہیں بلکہ صرف دو صحیح روایتوں میں ترجیح کا سبب ہے۔
ترجیح روایت اور صحت روایت دو الگ الگ موضوع ہیں ان کو باہم خلط ملط کرنا سنگین مغالطہ
بہر حال فقہ راوی کے ترجیح روایت کے لیے وجہ ہونے میں محدثین اور فقہاء کا نقطہ نظر ایک
ہے اور یہ ایک بے غبار حقیقت ہے۔ شیخ عبداللطیف سندھی کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ

لا یرتاب احد فی ان فقیہ الراوی مما یتثبت به الترجیح
راوی کی فقہیت روایت کی ترجیح کے لیے مثبت ہے اور اس میں
کوئی بھی شبہ نہیں ہے۔ لے

ہاں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر دونوں روایتیں صحیح ہوں اور دونوں میں تعارض ہو اور دونوں میں ایک کے راوی فقہاء ہوں اور دوسری متعدد طرق سے مروی ہو۔ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ محدثین اور ارباب روایت کا موقف یہ ہے کہ کثیر الطرق روایت کو راجح قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ امام حازمی ارقام فرماتے ہیں :

کسی حدیث کو راجح قرار دینے کے وجوہ میں سے ایک وجہ کثرت عدو ہے
اس کا روایت پر خاص اثر ہوتا ہے اس طریق سے روایت کے بارے
میں علم میں پختگی آتی ہے۔^۱

خطیب بغدادی فرماتے ہیں :

ویرجح بکثرة الرواة لاحد الخبرین۔^۲

لیکن اس موضوع پر امام اعظم کو محدثین سے اختلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ ایسی دو روایتوں میں ترجیح اس روایت کو دی جائے گی جس کے بیان کرنے والے فقہاء ہوں۔ چنانچہ رفع یدین کے موضوع پر انہوں نے امام اوزاعی سے مناظرے کے وقت اسی اصول کو اپنایا ہے۔ امام اوزاعی سے امام اعظم کا یہ مناظرہ امام موفق نے امام الحارثی کے حوالہ سے بسند متصل نقل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں امام حارثی کا ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے :

عالم ماوراء النہر ومحدث الامام العلامة ابو محمد عبد اللہ بن یعقوب بن الحارث

الحارثی البخاری الملقب بالاساذ جامع مسند ابی حنیفہ۔^۳

امام حارثی نے اس واقعہ کی سند یہ لکھی ہے :

حدثنا محمد بن ابراہیم بن زیاد السرازی حدثنا سليمان بن الشاذ

کوفی قال سمعت سفیان بن عیینة يقول اجتمع ابو حنیفہ

والاوزاعی بکعة -

حافظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں، علامہ اکمل الدین نے عنایہ میں، ملا علی قاری نے شرح منہج میں، الشیخ ابوالطیب سندھی نے ترمذی کے حاشیہ میں اور السید مرتضیٰ زبیدی نے معجم الجوابر المبیضہ میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسی معروف و مشہور داستان کے بارے میں

اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسی معروف و مشہور داستان کے بارے میں راویوں کی معاصرانہ چشمک سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بے اصل ہونے کا دعویٰ کرنا فن کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ حیرت ہے کہ علامہ محمد معین سندھی نے اس قصہ کے معلق ہونے کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے :

ان هذه الحكاية عن سفیان بن عیینہ، معلقة ولم

ار من اسندھا۔^۱

اور ساتھ ہی یہ چیلنج بھی دیا ہے :

ومن عنده السند فليأت به۔

حالانکہ یہ واقعہ نہ تو غیر مسند ہے جیسا کہ آپ امام حارثی کی زبانی سن آتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مسند میں اسے باسند لکھا ہے چنانچہ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں :

فقد اسندھا ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب

بن الحارث الحارثی البخاری المعروف بالاساذ تلميذ

ابی حفص الصغیر بن ابی حفص الکبیر تلميذ الامام

محمد بن الحسن فی مسنده بقوله حدثنا محمد بن ابراهيم

بن زياد۔ الخ۔^۲

اور نہ معلق ہے جیسا کہ امام موفق نے لکھا ہے۔ آئیے اب اصل واقعہ گوش گزار فرمائیے :

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ اور امام اوزاعی مکہ کے دارالحنطین

میں جمع ہوتے گفتگو کے دوران امام اوزاعی نے امام عظیم سے

دریافت کیا آپ رکوع میں جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت

رفع یدین کیوں نہیں کرتے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ اس لیے کہ

رفع یدین رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا یہ کیونکر ہو سکتا ہے

مجھے زہری نے بتایا، انہوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے باپ سے

سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت رکوع کو

جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ نے جواب دیا مجھے حماد نے بتایا۔ انہوں نے ابراہیم سے سنا ابراہیم نے علقمہ اور اسود سے سنا اور انہوں نے عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے اور پھر اسے منہیں دہراتے تھے۔ امام اوزاعی نے پھر جواب میں کہا۔ میں آپ کو زہری، سالم اور ان کے والد ابن عمر کی روایت سنا تا ہوں اور آپ مجھے حماد اور ابراہیم کی روایت سناتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ جواباً بولے حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے۔ ابراہیم سالم سے بڑھ کر عالم تھے اور اگر صحابی ہوتے کا پاس نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ عبد اللہ بن عمر سے زیادہ عالم فقہ تھے اور عبد اللہ تو آخر عبد اللہ ہیں۔

عبد اللہ سے مراد عبد اللہ بن مسعود ہیں یعنی ان راویوں میں کوئی شخص بھی عبد اللہ بن مسعود کا ہم پلہ نہیں ہے۔

حافظ ابن الہمام نے یہ واقعہ درج کر کے لکھا ہے کہ

رفع یدین کے موضوع پر آثار صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بہت ہیں اور ان میں گفتگو بڑی طویل الذیل ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ دونوں رفع اور عدم رفع ثابت ہیں اور دونوں کے ثابت ہونے کی صورت میں باہم ترجیح کی ضرورت ہے کیونکہ تعارض موجود ہے۔ عدم رفع ہمارے نزدیک اس لیے راجح ہے کہ نماز اس موجودہ صورت میں مختلف احوال سے گزر کر آتی ہے اقوال اور رفع یدین کی جنس کے افعال ایک وقت میں نماز میں مباح تھے اور وہ منسوخ ہو چکے ہیں۔ اگر یہ حرکتیں بھی اسی درجے میں آجائیں تو کوئی بعید نہیں ہے۔ رفع یدین چونکہ وجودی حرکت کا

نام ہے اس لیے اس میں اس کا احتمال ہے برخلاف عدم رفع کے کہ وہ ایک منفی چیز ہے اس میں اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے عدم رفع حرکت نہیں بلکہ سکون کا نام ہے وہ بالاجماع نماز میں خشوع کے عموم کی وجہ سے مطلوب ہے اور ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ عدم رفع کی روایت کے راوی فقہت کی وجہ سے رفع یدین کے راویوں پر برتری رکھتے ہیں جیسا کہ امام ابو حنیفہ نے امام اوزاعی کو جواب دیا ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ

رفع یدین اور عدم رفع دونوں قسم کی روایتوں میں موازنہ کرتے ہوئے امام ابو حنیفہ نے عدم رفع کی روایات کو راویوں کی فقہت کی بنا پر اور امام اوزاعی نے سند کے عالی ہونے کی بنا پر ترجیح دی ہے۔ امام اعظم نے روایت کے اسناد ہی علو سے بٹ کر فقہت کو ترجیح کے لیے کیوں وجہ قرار دیا ہے؟ اس لیے کہ

فقہت کے ذریعے فقہ میں صحیح اور غیر صحیح کا شعور اور سلیقہ ہوتا ہے جب اسے کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے جس کا ظاہر مزاج شریعت سے مطابقت نہیں رکھتا تو وہ اس کو اول نظر میں ہی روایت نہیں کرتا بلکہ اس کی حقیقت کا کھوج لگاتا ہے اور اس کے معنی میں سرگرداں رہتا ہے جب وہ مطمئن ہو جاتا ہے تو روایت کرتا ہے برخلاف غیر فقہ کے کہ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہوتی ہے وہ سنی ہوتی بات کو آگے چلا دیتا ہے۔ اس تعلیل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ افقہ کی روایت کو فقہ کی روایت پر ترجیح دی جائے۔

ترجیح روایت کے باوجود میں دراصل امام ابو حنیفہ کا یہی مذہب ہے اور فقہت ان کے نزدیک دو صحیح حدیثوں میں ترجیح کا سبب مؤثر ہے۔ فخر الاسلام بن دومی نے تصریح کی ہے کہ ہذا

مذہبنا فی الترجیح — اور حافظ ابن الہمام نے اسی کو فتح القدیر میں مذہب منصور قرار دیا ہے
اور ملا علی قاری نے واشکاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ

والمذہب المنصور عند علماءنا الحنفیۃ الا فقہیۃ دون
الا کثریۃ -

کامیاب مذہب احناف کے نزدیک افضلیت ہے اکثریت نہیں ہے -

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ عدوی طاقت اور ووٹوں کی زیادتی سے کسی
روایت کو رائج نہ قرار دیا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ معنویت کہاں ہے ؟

ظاہر بین بزرگوں نے امام اعظم کے اس زیریں ضابطہ کو تخریجی قسم کا ضابطہ قرار دے کر بے بن
بنانے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن شاید ان کو علم نہیں ہے کہ محدثین کے علم حدیث کے
متعلق سارے ہی اصول وضوابط تخریجی ہیں - اصول حدیث کا کوئی ضابطہ اور قاعدہ بھی مخصوص
نہیں ہے یہ بات کہ تعدد طرق کی بنا پر روایت کو ترجیح دی جاتے خود تخریجی ہے اور اس کا
پس منظر افراد و غرائب کے لیے گنجائش نکالنا ہے یعنی اس کو افراد و غرائب کے لیے بنایا گیا
ہے فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ورنہ اللہ کے دین میں احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ دین میں
فکر و نظر اور فقہ و بصیرت رکھنے والوں کی بات کا پلڑا بھاری ہو - آخر کوئی وجہ تو ہے کہ نماز کی
صفِ اول کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم تھا جو بحوالہ ابو مسعود انصاری و
بحوالہ عبد اللہ بن مسعود و مسند احمد، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں ان الفاظ میں موجود ہے -

لیلیٰ نئی اولوا الہلام والنہی منکم

مجھ سے قریب نماز میں تم میں سے اہل عقل و فہم ہوا کریں -

اہل علم و فضل کو صفِ اول میں رکھنے کی اس کے سوا وجہ کیا ہو سکتی ہے جو علامہ شوکانی نے
بتا دی ہے :

لیاخذوا عن الامام ویاخذ عنہم غیرہم لانہما امتی

بضبط صفتہ الصلاۃ وحفظہا ونقلہا وتبلیغہا

تاکہ وہ امام کے اعمال و افعال کی کاپی کریں اور رائے عامہ ان کے اعمال و

افعال کی کاپی کرے - کیونکہ اہل علم ہی نماز کے طریقہ کو زیادہ ضبط اور

حفظ کر سکتے ہیں اور ان میں اسے نقل کرنے اور پہنچانے کی

صلاحت ہے

امام اعظم نے اوزاعی کے سامنے رفع یدین کے موضوع پر یہی کسوٹی پیش فرمائی ہے۔ رفع یدین کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے اور عدم رفع کے موضوع پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے۔ ان دونوں حدیثوں کی روایتی اور اسنادی حیثیت دونوں کو مسلم ہے اور ان دونوں روایتوں کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ امام اعظم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت کو رائج قرار دیا ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کبار صحابہ سے ہیں۔ نماز میں یہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صفِ اول میں ہوتے تھے حضور النور نے معلمین قرآن میں سب سے پہلا نمبر ان کا بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود پسند کرے میں تمہارے لیے اسی پر راضی ہوں۔ اور فرمایا کہ ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کو مضبوطی سے قائم رکھو اور اس پر جیسے رہو۔ حضرت عمر نے ان کو علم کا انبار کہا ہے اور کوفہ والوں کی طرف معلم قرآن و سنت بنا کر روانہ کیا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود خلفاء راشدین سے بھی زیادہ عالم تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت حضور النور کے پاس رہتے تھے اور حضور النور ان سے کسی وقت حجاب نہ کرتے تھے۔ ان کی وفات ساٹھ سال کی عمر میں ۲۲ھ میں ہوئی ہے۔ مسلمان ہونے والوں میں یہ چھٹے مسلمان ہیں اس لیے ان کا شمار ابو بکر و عمر، عثمان و علی کے ساتھ السابقون الاولون میں ہے۔ ان کا بیان امام اعظم کو پہنچا ہے کہ حضور النور صرف تکبیر تحریر کے وقت رفع یدین کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر بے شک بزرگ ترین صحابی ہیں لیکن حضور النور کی ہجرت کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی اور وفات کے وقت یہ عمر کی چوبیسویں بہار دیکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا شمار السابقون الاولون میں ہے۔ اور نہ یہ ابو بکر و عمر کے علم و فضل میں ہم پلہ ہیں۔ نماز میں حضور کے پیچھے جو مقام عبداللہ بن مسعود کا ہے وہ یقیناً عبداللہ بن عمر کا نہیں ہے اس لیے امام اعظم نے عبداللہ بن مسعود کے بیان کو رائج قرار دیا ہے۔

حدیث ضعیف اور امام اعظم
محدثین نے حدیث ضعیف کی یہ تعریف کی ہے کہ

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں حسن اور صحیح کی صفات نہ ہوں۔
اور کچھ نے یہ بتایا ہے کہ

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جو حسن کے پائے کی نہ ہو۔

لیکن حدیث ضعیف کی یہ تعریف ان بعد میں آنے والے محدثین کرام کی اختراعی ہے جن کے نزدیک حدیث تین قسموں پر مشتمل ہے۔ صحیح، حسن اور ضعیف۔ ورنہ متقدمین حدیث کی اس ثلاثی تقسیم سے آشنا نہ تھے۔ ان کے یہاں حدیث کی تقسیم ثلاثی تھی یعنی حدیث کی دو ہی قسمیں بتاتے تھے صحیح اور ضعیف۔ چنانچہ امام احمد کے زمانے تک حدیث دو ہی قسموں میں منحصر تھی ان دو کے درمیان حسن کا کوئی درجہ نہ تھا لیکن بعد کے محدثین نے ان دونوں کے درمیان حسن کی صورت نکال لی۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

حدیث کی یہ تقسیم صحیح، حسن اور ضعیف امام ابوعلیٰ ترمذی کی بنائی ہوئی ہے ترمذی سے پہلے یہ تقسیم کسی سے مروی نہیں ہے اور ترمذی نے اس سلسلے میں اپنی مراد بھی واضح کر دی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ حسن وہ ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور نہ ہی شاذ ہو۔ یہ مرتبہ میں اس صحیح سے کم ہے جس کے راویوں کی عدالت اور ضبط معلوم ہوتا ہے۔ ضعیف وہ ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو یا روی الحفظ ہو۔
علامہ خطابی نے حسن کی یہ تعریف کی ہے :

جس کا مخرج معلوم ہو اور جس کے راوی مشہور ہوں۔

لیکن حافظ ابن تیمیہ کو علامہ خطابی سے اختلاف ہے وہ امام ترمذی کے ہموا ہیں حدیث حسن وہ ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور اس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور نہ وہ شاذ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ متاخرین جسے حسن کہتے ہیں وہ متقدمین کے یہاں ضعیف ہے چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

لیس المراد بالحدیث الضعیف فی اصطلاح السلف هو الضعیف
فی اصطلاح المتأخرین بل ما یسمیہ المتأخرون حسناً قد
یسمیہ المتقدمون ضعیفاً۔

ضعیف کے بارے میں متقدمین اور متأخرین کی اصطلاحیں الگ الگ
ہیں۔ متأخرین جسے حسن کہتے ہیں متقدمین کی زبان میں اس کا نام
ضعیف ہے۔

اسی ضعیف کے بارے میں محدثین نے امام اعظم کا یہ موقف بتایا ہے کہ وہ اسے رائے اور قیاس
کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حزم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:
اس پر اجماع ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ حدیث ضعیف رائے
اور قیاس پر مقدم ہے بشرطیکہ اس موضوع پر صحیح حدیث نہ ہو۔
حافظ ابن القیم رقمطراز ہیں:

اصحاب ابی حنیفۃ فمحزون علی ان مذهب ابی حنیفۃ ان
ضعیف الحدیث اولی عندہ من القیاس والرائی۔

ابو حنیفہ کے اصحاب کا اس پر اجماع ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب
یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک قیاس اور رائے سے بہتر ہے۔
بلکہ حافظ ابن القیم ہی نے اس موضوع پر امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل کی ہم آہنگی کا
دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

فتقدیم الحدیث الضعیف واثار الصحابة علی القیاس والرائی
قولہ وقول الامام احمد بن حنبل۔

حدیث ضعیف اور آثار صحابہ کو قیاس اور رائے پر مقدم کرنا امام
ابو حنیفہ اور امام احمد کا قول ہے۔

لیکن ضعیف سے متأخرین کی مراد اصطلاحی ضعیف نہیں بلکہ حسن مراد ہے۔ چنانچہ حافظ

ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

ہمارا یہ کہنا کہ حدیث ضعیف رائے اور قیاس سے بہتر ہے۔ اس سے ضعیف متروک مراد نہیں ہے بلکہ حسن ہے اور اصطلاح میں ترمذی سے قبل حدیث کی دو ہی صورتیں تھیں صحیح یا ضعیف اور ضعیف کی دو قسمیں تھیں ضعیف متروک اور غیر متروک۔ چنانچہ ائمہ حدیث کی زبان پر یہی اصطلاحیں جاری تھیں۔ اس کے بعد وہ لوگ آئے جن کو صرف اصطلاح ترمذی ہی کا پتہ تھا جب ان کے کان میں بعض ائمہ حدیث کا یہ قول پڑا کہ حدیث ضعیف قیاس سے بہتر ہے تو انہوں نے خیال کیا کہ ایسی حدیث سے حجت لائی جا رہی ہے جو بہ اصطلاح ترمذی ضعیف ہے تو یہ ان لوگوں کے طریقہ کو ترجیح دینے کے جو حدیث صحیح کے اتباع کا اظہار کرتے ہیں۔ لہ

حافظ ابن القیم نے یہی بات پوری صراحت سے لکھی ہے فرماتے ہیں : ضعیف سے باطل و منکر مراد نہیں ہے اور نہ وہ روایت ہے جس کے راویوں میں کوئی مستہم ہو بلکہ حدیث ضعیف ان کے یہاں صحیح کی قسم ہے۔ قسم نہیں ہے ان کے یہاں حدیث کی تلافی نہیں بلکہ ثنائی تقسیم ہوتی تھی اور ضعیف ان کے یہاں مراتب والی تھی۔ لہ علامہ ابن علان صدیقی نے امام احمد کے اس ارشاد پر کہ حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے بشرطیکہ اس موضوع پر کوئی صحیح حدیث نہ ہو۔ یہ نوٹ لکھا ہے کہ :

حدیث ضعیف کے بارے میں امام احمد سے جو منقول ہے تو اس میں ضعیف سے مراد وہ ضعیف ہے جو صحیح کے مقابلے میں ہو یہ خود امام احمد اور متقدمین کا عرف ہے کیونکہ ان کے یہاں حدیث کی دو ہی قسمیں صحیح اور ضعیف ہیں اور یہ ضعیف حسن کو بھی شامل ہے اور باقی متاخرین کی اصطلاحی ضعیف تو وہ امام احمد کی برگز مراد

نہیں ہے۔ لے

اور یہ صرف امام احمد ہی کی نہیں بلکہ امام اعظم ابو حنیفہ کے ارشاد میں بھی ضعیف ہے متقدمین کی اصطلاحی ضعیف مراد ہے چنانچہ علامہ ابن علان ہی نے علامہ زرکشی کے حوالہ سے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:

وقریب من هذا قول ابن حزم الحنفية متفقون على ان

مذهب ابی حنیفۃ ان ضعیف الحدیث عندہ اولی من

المای والظاهر ان مرادہ بالضعیف ما سبق لے

الغرض صرف امام اعظم ہی کا نہیں بلکہ تمام ائمہ کا مذہب یہی ہے کہ قیاس و رائے کے مقابلے میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے چنانچہ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

لیس احد من الامۃ الا وهو موافقہ علی هذا الاصل

من حیث الجملة -

اماموں میں سے ہر ایک بالاجمال اس موضوع پر امام احمد کا ہمنوا ہے۔ لے

لیکن یہاں اتنی بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ یہ ائمہ جس حدیث ضعیف سے استدلال کرتے ہیں وہ ضعیف الاسناد تو محدثین تک پہنچنے میں ضرور ہوتی ہے مگر ضعیف المتن نہیں ہوتی ہے اتصال عمل کی کسی شاہد صحیح کی ظاہر قرآن کی اور بالآخر کثرت طرق کی اسے یقیناً تائید حاصل ہوتی ہے

اسنادی کمزوری کی حد تک حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں:

ایک شخص محدثین کے یہاں حدیث میں غلطیوں کی وجہ سے ضعیف

قرار پا جاتا ہے لیکن اس کی حدیثوں میں زیادہ تر صحیح ہوتی ہیں۔ وہ

اس سے محض اعتبار و اعتقاد کی خاطر حدیثیں روایت کرتے ہیں کیونکہ

لے، لے شرح الاذکار ج ۱ ص ۸۶، ۸۷ - لے اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۱ -

لے اعتبار اصول حدیث کی ایک اصطلاح ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ روایت کی مختلف سندیں جمع کر کے دیکھی جائیں تاکہ پتہ چل جائے کہ قدر مشترک کے طور پر سند و متن کا کتنا حصہ درست اور صحیح ہے۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ اعتبار متابعیت اور شاہد محدثین کی خاص اصطلاحی زبان ہے اس کے ذریعے وہ احادیث کے مختلف احوال معلوم کرتے ہیں سب سے یہ جانتے ہیں کہ راوی اپنے بیان میں منفرد ہے یا نہیں پھر یہ کہ

(باقی ص ۶۵۶ پر)

تعدد طرق اور کثرت اسانید سے روایت میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ اس کے ذریعے علم حاصل ہو جاتا ہے۔ چاہے روایت کرنے والے فاسق و فاجر ہی ہوں اور اگر روایت میں غلطیوں کے باوجود بیان کرنے والے علما اور عادل ہوں تو پھر کیا ہی کہنے میں جیسے عبداللہ بن لہیعہ۔ یہ اکابر علماء میں سے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی روایات میں غلطیاں ہوتی ہیں حالانکہ ان کی روایات بیشتر صحیح ہوتی ہیں۔
 ایسے سرے سے چند مثالیں بھی سن لیجئے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ائمہ دین نے دین کی زندگی میں ضعیف حدیثوں سے کس طرح اور کس انداز میں فائدہ اٹھایا ہے۔

حدیث قہقہہ سے وضو کے ٹوٹنے پر استدلال

مسئلہ یہ ہے کہ نماز کی حالت میں اگر قہقہہ مار کر سنسا جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اس موضوع پر احادیث مسندہ اور مسئلہ دونوں آتی ہیں۔ احادیث مسندہ میں ابی موسیٰ اشعری، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جابر بن عبداللہ، عمران بن حصین اور ابی الملیح کی احادیث آتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی روایت بھی محدثانہ نقطہ نظر سے اصطلاحی صحت کے معیار پر پوری نہیں ہے۔ ابی موسیٰ کی روایت طبرانی میں ہے اگرچہ حافظ بیہقی نے اس کے رجال کی توثیق کی ہے لیکن ان میں محمد بن عبد الملک مختلف فیہ ہے۔ حدیث ابی ہریرہ سنن دارمی میں ہے مگر منقطع ہونے کے ساتھ عبدالعزیز اور عبدالمکریم کی وجہ سے ضعیف ہے۔
 حافظ ابن عدی فرماتے ہیں :

۶۵۵ کا بقیہ ماشیہ :- معروف ہے یا مجہول دستور۔ اعتبار یہ ہے کہ کسی روایت کی مختلف سندیں یکجا کی جائیں اور دیکھا جائے کہ سند میں کسی اور کی ہمنوائی بھی اسے حاصل ہے یا نہیں اس ہمنوائی کے مبہم پہنچانے کا نام اعتبار ہے۔ پھر اس تلاش میں اگر راوی کی یا راوی کے استاد کی یا استاد کے آخر سند تک ہمنوائی مل جائے تو اس کا نام متابعت ہے اور پھر اگر اس روایت کے ہم معنی کوئی اور روایت بھی متباب ہو جائے تو اس کا نام تباہ ہے حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ اعتبار کا فائدہ یہ ہے کہ حدیث کے لیے توابع اور شواہد معلوم ہو سکیں۔ لے قواعد التحدیث ص ۱۱۵۔

والبلاء فی هذا الاسناد من عبدالعزیز و عبدالکریم و هما
ضعیفان ۱۷

عبداللہ بن عمر کی حدیث کے بارے میں ابن الجوزی کا الطلل المتناہیہ میں فیصلہ یہ ہے کہ
هذا حدیث لا یصح -

حدیث انس سنن دارقطنی میں ہے اس میں بھی داؤد و متروک الحدیث اور ایوب ضعیف
ہے۔ دارقطنی فرماتے ہیں -

راؤہ داؤد بن المجہود و متروک یضع الحدیث عن ایوب
و هو ضعیف ۱۸

حدیث جابر بھی سنن دارقطنی میں ہے لیکن اس میں یزید بن سنان ضعیف ہے۔ عمران بن
الحصین کی روایت عمرو بن قیس اور عمرو بن عبیدہ کی وجہ سے پایہ اعتبار سے گری ہوئی ہے -
ابو ایلیح کا اس موضوع پر بیان اپنے اضطراب کی وجہ سے محدثین کے دربار میں مخدوش ہے
یہی حال ان روایات کا ہے جو مسندہ نہیں بلکہ مرسلہ ہیں۔ ان پر تفصیلی کلام حافظ زلیحی نے نصب الرایہ
میں فرمایا ہے۔ بہر حال نماز میں قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کے موضوع پر جس قدر روایات آتی ہیں
وہ مسند ہوں یا مرسل۔ محدثین کے یہاں متکلم فیہ ہیں اور حافظ ابن القیم کا یہ کہنا درست ہے کہ
اجمع اهل الحدیث علی ضعفہ ۱۹

اس کے باوجود کہ عقلیت کا تقاضا بھی ہے اور قیاس بھی چاہتا ہے کہ قہقہہ سے وضو نہ ٹوٹے
امام ابو حنیفہ نے قہقہہ کو وضو کے لیے ناقص قرار دیا ہے۔ اس باب میں بہت سے امور تفصیل
طلب ہیں لیکن یہاں مزید اطناب کا موقعہ نہیں ہے۔

نبیذ تمر سے وضو کی حدیث

اگر اور کوئی پانی نہ ہو اور صرف کھجوروں کی نبیذ ہی ہو تو نبیذ ہی سے وضو جائز ہے اس کے
لیے تیمم روا نہیں ہے۔ اس موضوع پر دو حدیثیں آتی ہیں۔ ایک حدیث ابن مسعود اور دوسری
حدیث ابن عباس۔ حدیث ابن مسعود پر محدثین نے خاص محذرانہ اور مورخانہ کلام کیا ہے۔ ابن

ابی حاتم نے کتاب العلل میں حافظ ابو زرعمہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ
حدیث ابی حاتم اسرۃ فی الوصوۃ لیس بصحیح والہو زید مجہول۔
حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں :

ان حدیث ابن مسعود روی من طرق لا تقوم بمثلها حجة۔
اگرچہ حدیث ابن مسعود کو ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے لیکن محدثین
کے یہاں اس کی صحت مخدوش ہے۔ خود صاحب بدایہ کو اس کے اضطراب کی شکایت ہے۔
حافظ مندرجی نے مشہور محدث ابو احمد الکراہیسی سے نقل کیا ہے۔

لا یثبت فی هذا الباب من هذه الروایة حدیث بل
اخبار الصحیحة عن عبد اللہ ناطقة بخلافہ
اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے بلکہ عبد اللہ سے صحیح حدیثیں
اس کے خلاف ہیں۔

عبداللہ بن عباس کی حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے لیکن حافظ بزار کا فیصلہ ہے :
هذا حدیث لا یثبت
یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔

حدیث مقدار ایام حیض

حیض کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مدت کے موضوع پر جو حدیث آتی ہے وہ اگرچہ
ابو امامہ، واثلہ بن الاسقع، معاذ بن جبل، ابو سعید، انس بن مالک اور عائشہ کے حوالہ سے
آتی ہے اور حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے لیکن ان کے راویوں میں مجاہیل ضعیفہ کا
اتنا ہجوم ہے کہ محدثین کے معیار کے مطابق اس کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں ملتی ہے
لیکن اس کے باوجود قابل قبول سمجھ لی گئی۔

بہر حال امام اعظم قیاس اور رائے کے مقابلے میں حدیث ضعیف پر بھی عمل کرتے ہیں۔ اس
کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ امام اعظم کے زمانے میں معاشرے کی عملی تائید کی وجہ سے ان حدیثوں

کا درجہ حسن ہو جاتا ہے۔ علامہ بابر قی نے شاید اسی بنا پر لکھا ہے کہ :
والحدیث مشہور ثبت بطرق مختلفہ و عملت بہ الصحابۃ[ؓ]
حافظ ابن الہمام فرماتے ہیں :

فہذا عدۃ احادیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم متعددۃ
الطرق و ذالک یرفع الضعیف الی الحسن۔^۱

یہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں ہیں اور متعدد طرق سے
آنے کی وجہ سے درجہ حسن کو پہنچ گئی ہیں۔

حافظ سخاوی فرماتے ہیں :

حسن لغیرہ بھی قابل احتجاج ہو جاتی ہے جب وہ متعدد طرق سے آئے۔
امام نووی بھی علامہ سخاوی کے ہم زبان ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ :
حدیثوں کی سندیں اگر ایک الگ ہوں چاہے وہ ضعیف ہوں، ان کا
مجموعہ باہم تقویت کی وجہ سے حدیث کو حسن اور قابل احتجاج بنا
دیتا ہے۔

امام بیہقی کی بھی یہی رائے ہے کہ حدیث ضعیف کثرت طرق سے آئے تو قوی ہو جاتی ہے
بلکہ عون الباری میں امام نووی کے حوالہ سے یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ :
حدیث ضعیف اگر متعدد طرق سے مروی ہو تو وہ ضعیف سے حسن اور
مقبول و معمول بہ ہو جاتی ہے۔^۲

ارباب روایت کے یہاں عمل کے بارے میں تین مسلک ہیں۔
اول یہ کہ ضعیف پر قطعاً عمل نہ کیا جائے۔ ابن سید الناس نے اسی کو یحییٰ بن معین کا مسلک
قرار دیا ہے۔ علامہ سخاوی نے فتح المغنیث میں ابوبکر بن العربی کا یہی میلان بتایا ہے بلکہ صاحب
قواعد التحدیث کی تصریح کے مطابق محدثین میں بخاری اور مسلم کا بھی یہی مسلک ہے۔
دوم یہ کہ حدیث پر ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔
حافظ سیوطی فرماتے ہیں :-

عنری ذالک الی ابی داؤد واحمد لانهما یریان اقوی من رای الرجال۔
 سوم یہ کہ صرف فضائل میں ضعیف پر عمل کیا جائے احکام میں ضعیف پر عمل نہ کیا جائے چنانچہ
 امام حاکم رقمطراز ہیں :

میں نے ابو زکریا عنبری سے سنا وہ فرماتے تھے کوئی حدیث اگر حلال کو
 حرام اور حرام کو حلال نہ کرتی ہو اور کسی حکم کو واجب نہ کرتی ہو اور
 صرف ترغیب و ترہیب سے تعلق رکھتی ہو تو اس سے چشم پوشی
 کی جائے گی اور اس کے راویوں پر جرح میں تساہل سے کام لیا جائے
 گا اور جیسا کہ امام عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم
 صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور احکام کی روایت کرتے ہیں تو
 اسانید کے بارے میں سختی برتتے ہیں اور رجال پر نقد کرتے ہیں
 اور جب فضائل و عقاب کی روایت کرتے ہیں تو اسانید میں نرمی
 اختیار کرتے ہیں اور احادیث میں تسامح سے کام لیتے ہیں۔ میمون
 نے امام احمد کا بھی ایسا ہی بیان بتایا ہے کہ رفاق کی حدیثوں میں
 تساہل مناسب ہے لیکن احکام میں نہیں۔
 علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ :

اگر حدیث ضعیف ہو لیکن موضوع نہ ہو تو محدثین اس کی اسناد میں
 تساہل کو جائز سمجھتے ہیں اور یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ ضعف کی تصریح
 کے بغیر بیان بھی کر سکتا ہے جب کہ حدیث کا تعلق احکام و عقائد
 سے نہ ہو بلکہ مواعظ، قصص اور فضائل میں ترغیب و ترہیب سے
 ہو۔ اگر حدیث احکام و عقائد سے متعلق ہو تو اس میں تساہل قطعاً
 ناجائز ہے۔ المہ حدیث میں عبدالرحمن بن مہدی، عبداللہ بن المبارک
 اور احمد بن حنبل کی یہی رائے ہے۔
 حافظ ابن الہمام نے تصریح کی ہے کہ :

حدیث اگر ضعیف ہو اور موضوع نہ ہو تو اس سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے۔
 لیکن حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور حافظ سخاوی نے القول البدیع میں حافظ ابن
 حجر عسقلانی کے سوال سے بتایا ہے کہ حدیث ضعیف کی قبولیت کے لیے تین شرطیں ہیں۔
 اول یہ کہ حدیث میں ضعف زیادہ نہ ہو یعنی حدیث کے راوی ایسے نہ ہوں جو جھوٹ میں شہرت
 رکھتے ہوں یا ان پر دروغ گوئی کی تہمت ہو یا کھلم کھلا غلطیوں کا شکار ہوں۔
 دوم یہ کہ حدیث جس مضمون پر مشتمل ہے اس کی کوئی اصل شریعت میں موجود ہو بات محض
 بے اصل اور من گھڑت نہ ہو۔
 سوم یہ کہ عمل کے وقت میں اس کے ثابت ہونے کا عقیدہ نہ رکھا جائے بلکہ از روئے احتیاط
 اس پر عمل ہو۔ آخری دو شرطیں حافظ عزالدین بن عبدالسلام اور علامہ ابن دقیق العید کی بتائی
 ہوئی ہیں۔ اور پہلی شرط کو علامہ علائی نے اتفاقی قرار دیا ہے۔
 مولانا عبدالحی نے نظرالامانی فی شرح مختصر الجرجانی میں ان سہ گانہ شرطوں کا تذکرہ کر کے
 مثالیں بھی دی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :

فقہاء احناف کا فیصلہ ہے کہ اذان کے کلمات آہستہ آہستہ دہری
 آواز سے اور تبکیر جلدی اکبری آواز سے کہی جائے اور ایسا کرنا مستحب
 ہے اور اس پر انہوں نے ترمذی کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے
 جو بحوالہ حضرت جابر ان الفاظ میں آئی ہے کہ — حضور انور صلی اللہ
 علیہ وسلم نے بلال سے فرمایا ہے کہ اے بلال جب اذان دو تو آہستہ
 آہستہ دو اور جب تبکیر کہو تو جلدی کرو۔ ۱۰۰۰ — امام ترمذی نے
 اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ ہواستاد فحول۔ امام
 دارقطنی نے اس کے راوی عبدالمنعم کی تضعیف کی ہے اس کے
 باوجود چونکہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف کافی ہو جاتی ہے
 اس لیے فقہائے نے اس پر عمل کو مستحب قرار دیا ہے۔ نیز فقہاء حنفیہ
 وضو میں گردن کے مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں اور اس پر وہ

ایک ایسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو خالص محدثانہ نقطہ نظر سے ضعیف ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ طلحہ بن مصرف اپنے والد اور دادا کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سر کا مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے تا آنکہ آپ نے قذال تک مسح کیا۔ قذال گردن کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں۔ یہ روایت معانی الآثار میں بھی ہے لیکن یہ سب روایات طلحہ کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہیں۔ ابن القفطان نے طلحہ ان کے والد اور ان کے دادا کو بھول قرار دیا ہے۔

علامہ دوانی کا شبہ اور اس کا جواب

علامہ دوانی نے النموذج العلوم میں یہاں ایک شبہ اٹھا کر ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے ایک پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ علامہ موصوف کے اس شبہ کو مولانا عبدالحی نے الاسبوتہ الفاضلہ میں، مولانا صدیق حسن خاں نے المحطہ میں اور علامہ جمال الدین القاسمی نے قواعد التحدیث میں بڑی آب و تاب سے بیان کیا ہے۔ ان کے شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء ایک طرف فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب اور جواز معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ان کا ہی ارشاد ہے کہ استحباب ہو یا جواز۔ یہ بھی احکام شرعیہ ہیں سے ایک حکم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف احکام کے اثبات کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب و جواز ثابت ہو گا تو اس کے نتیجے میں اس سے حکم شرعی کا اثبات ہو گا۔ اس لیے ایک طرف یہ کہنا کہ حدیث ضعیف سے استحباب و جواز ثابت ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بتانا کہ حدیث ضعیف سے احکام ثابت نہیں ہوتے دونوں میں اس لحاظ سے یقیناً تضاد ہے کہ استحباب اور جواز بھی خود حکم شرعی ہے۔ اگر حدیث ضعیف سے حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا تو لازماً استحباب بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔

علماء نے اس شبہ کے متعدد جوابات دیے ہیں اور خود علامہ دوانی نے بھی اس کے ازالہ کی بہترین کوشش فرمائی ہے۔

علامہ احمد الخفاجی نے نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض میں جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :

حدیث ضعیف سے فضیلت کا ثابت ہونا کسی حکم کے ثابت ہونے کو مستلزم نہیں ہے ایسا عمل جس کا استحباب صحیح حدیث سے ثابت ہو اس کا ثواب یا اسے کرنے کی ترغیب یا صحابہ کی فضیلت یا اذکار مالورہ کی فضیلت اگر کسی ضعیف حدیث سے معلوم ہو جائے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل حکم ہی حدیث ضعیف سے ثابت ہو رہا ہے۔ اعمال اور فضائل اعمال میں بہت بڑا فرق ہے۔

علامہ خفاجی کی بات بڑی گہری ہے اور اپنے اس بیان کے ذریعے وہ پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے کسی عمل کا وجود ثابت نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ثابت شدہ موجود عمل جس کا وجود دلائل شرعیہ سے پہلے ثابت ہو چکا ہے صرف اس کی فضیلت کو حدیث ضعیف کے ذریعے ظاہر کیا جاسکتا ہے مثلاً نماز تہجد کی سنیت ماکل شرعیہ سے ثابت ہے اب اس ثابت شدہ سنت کی ترغیب کے لیے یا اس کی رگی کے اظہار کے لیے حدیث ضعیف کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ علامہ موصوف نے اس طرح امرو دوانی کے اٹھاتے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے۔ مولانا صدیق حسن خاں نے صرف امرو موصوف کے جواب پر ہی اکتفا فرمایا ہے اور اس سلسلے میں اپنی کوئی قیمتی رائے ظاہر نہیں فرمائی ہے۔ جمال الدین القاسمی نے علامہ موصوف پر بہت بڑی برہمی کا اظہار فرمایا ہے۔ مولانا عبدالحی نے یہ فرما کر علامہ خفاجی کی بنائی ہوئی عمارت کو بے جاں کر دیا ہے کہ خفاجی یہ موقف فقہاء اور محدثین دونوں کے خلاف ہے۔ فقہاء کے اس لیے کہ وہ ضعیف حدیث سے بلا شبہ ایسے عمل کے استحباب کو ثابت کرتے ہیں جس کا استحباب احادیث صحیحہ ہرگز ثابت نہیں ہے۔ محدثین کے اس لیے کہ وہ حدیث ضعیف کا فضائل، مناقب

اور ترغیب و ترہیب کے موضوع پر ذکر کرتے ہیں۔ اگر فضائل اعمال سے وہی کچھ مراد ہے جو خفاجی بتا رہے ہیں تو اس کا مقابلہ ترغیب و ترہیب میں قبولیت سے نہیں ہو سکتا۔ علامہ کا یہ ارشاد امام نووی کی اس تصریح کے بھی خلاف ہے جو انہوں نے الاذکار میں کی ہے :

اذا ورد حدیث ضعیف بکراہیۃ بعض البیوع او
الانکحۃ فالمتحب ان یتنزه عنہ لہ

جب کوئی ضعیف حدیث نکاح یا سوئے کی کراہت کو بتائے تو
اس سے بچنا ہی اچھا ہے۔

اور حافظ ابن الہمام کے اس نظریہ کے بھی خلاف ہے۔

یثبت الاستحباب بالحدیث الضعیف لہ

استحباب حدیث ضعیف سے ثابت ہو جاتا ہے۔

نیز اگر بالفرض وہ ہی کچھ امر واقعہ ہے جو خفاجی بتا رہے ہیں تو پھر ان شرائط میں کوئی افادیت نہیں رہتی جو قبول ضعیف کے لیے محدثین میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے قائم فرمائی ہیں کیونکہ اگر ضعیف سے صرف ان اعمال کی فضیلت ہی بیان ہو سکتی ہے جو احادیث صحیحہ کے ذریعے ثابت ہو چکے ہوں تو پھر یہ قید بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کہ حدیث ضعیف جس مضمون پر مشتمل ہو اس کی کوئی اصل موجود ہو اور یہ بشرط بھی بالکل بے جان ہو جاتی ہے کہ عمل کے وقت اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

مولانا عبدالحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

اس مقام پر واقعی اور سچی بات یہ ہے کہ جب کسی بھی کام کا جواز یا استحباب کسی خاص حدیث صحیح سے ثابت نہ ہو اور اس موضوع پر کوئی ضعیف حدیث آجائے لیکن اس کا ضعف شدید نہ ہو تو اس سے جواز و استحباب ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کام کی کوئی اصل مشروعیت میں موجود ہو اور یہ کام اصول شرعیہ اور دلائل صحیحہ کے منافی نہ ہو۔

نہ خود علامہ دوانی نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ اگرچہ ذرا طویل ہے لیکن اسے یہاں نظر انداز کرنے سے بات ادھوری رہ جائے گی اس لیے یہاں اس کا خلاصہ بدینہ ناظرین کرتا ہوں۔

اس موضوع پر قابل اعتماد بات یہ ہے کہ جب کسی بھی کام کی خوبی کسی حدیث سے معلوم ہو جائے اور وہ کام ناجائز اور مکروہ ہونے کے اندیشے سے بالا ہو تو ایسے موقع پر ضعیف پر عمل جائز اور مستحب ہے کیونکہ یہ ناجائز ہونے کے اندیشے سے پاک ہے اور اس پر ثواب کی توقع ہے اور اس توقع کی وجہ کام میں اباحت اور استحباب کی کثرت ہونا ہے بنا بریں ثواب کی امید پر عمل ہی میں احتیاط ہے۔ اور اگر خود کام ہی ناجائز اور استحباب کے درمیانی مقام پر ہو تو پھر ناجائز ہونا راجح ہے۔ اور اگر کام کراہت اور استحباب سے دوچار ہو تو اس میں فکر و غور کے لیے کافی گنجائش نکل سکتی ہے عمل کی صورت میں مکروہ کا شکار ہو سکتا ہے اور ترک کی حالت میں مستحب و دستبرداری کی راہ ہے۔ اگر کراہت کا اندیشہ قوی ہو اور استحباب کا احتمال کمزور ہو تو ایسی حالت میں ترک کو ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر کراہت کا اندیشہ کمزور ہو تو عمل میں احتیاط کا پہلو ہے۔ اور اگر طرفین برابر ہوں تو پھر بھی عمل میں استحباب کو اپنایا جائے گا۔ ان تمام صورتوں میں حدیث ضعیف پر عمل اس شرط کے ساتھ مشروع ہے کہ عدم جواز کا احتمال نہ ہو، حاصل کلام یہ ہے کہ کسی کام کا جواز ان صورتوں میں حدیث ضعیف سے نہیں بلکہ باہر سے معلوم ہوتا ہے اور استحباب کا پتہ بھی حدیث ضعیف سے نہیں بلکہ ان قواعد شرعیہ سے ہوتا ہے جو دین کی زندگی میں احتیاط کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ اس لیے احکام میں سے کوئی چیز بھی حدیث ضعیف سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ ان میں حدیث ضعیف کے ذریعے استحباب کا احتمال رونما ہوتا ہے اس لیے احتیاط اس پر عمل کیا ہے اور احتیاط عمل کا استحباب خود قواعد شرعیہ سے معلوم ہے۔

مولانا عبدالحی نے اس موضوع کے تفصیلی مباحث اور ان کی گہرائیاں ظفرالامانی میں سمیٹ دی ہیں
بہر حال متقدمین ہوں یا متاخرین ضعیف میں اختلاف کے باوجود عمل بالضعیف پر متفق ہیں۔
اگرچہ اس کی وجوہات میں اختلاف ہے۔

متقدمین حدیث ضعیف پر عمل تابعین اور اتباع تابعین کی عملی تائید کی وجہ سے کرتے ہیں
اور متاخرین تعدد طرق سے آنے کی بنا پر۔

متاخرین کے مابین جس حدیث ضعیف پر عمل کے بارے میں اختلاف ہے وہ ان کی اپنی
اصطلاحی ضعیف ہے۔ اس کا متقدمین کی ضعیف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حدیث و قیاس میں تعارض اور امام اعظم

قانون کی اصولی کتابوں میں قیاس کی جو تعریف کی گئی ہے ہم آپ کو یہاں اس میں الجھانا نہیں
چاہتے۔ اس کے تفصیلی مباحث آپ کو انشاء اللہ امام اعظم اور علم الشرائع میں ملیں گے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احکام قننا ہی ہیں اور حوادث و واقعات جو روزانہ منت
پیش آتے ہیں وہ ان گنت ہیں۔ الشہرستانی رقمطراز ہیں:-

ہمیں اس کا قطعاً علم ہے کہ حوادث و واقعات خواہ ان کا تعلق عبادات
سے ہو یا معاملات سے، بے حساب اور بے شمار ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں
پتہ ہے کہ ہر ہر واقعہ اور حادثہ کے بارے میں صاف اور صریح حکم نہیں
ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ جب صورت حال یہ ہے کہ حوادث و
واقعات ان گنت اور احکام مقررہ ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہے کہ
لا متناہی متناہی کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ اس لیے یہ بات حتمی اور
قطعی ہے کہ اسلام میں اجتہاد و قیاس کا خاص مقام ہے تاکہ ہر پیش
پا افتادہ حال کے لیے اجتہاد کے ذریعے راستہ معلوم ہو سکے۔

قرآن نے ان حوادث کے لیے اعتبار اور نبوت نے اجتہاد کا اُمت کو پروانہ دے کر ایک طرف
اسلامی قانون کو باز یہیچہ اطفال بننے سے محفوظ کر لیا اور دوسری طرف اسلامی معاشرے کو

بے راہ روی، آوارگی اور بے قیاس زندگی کی برائیوں سے بچا لیا۔ اس بنا پر چند گئے چنے لوگوں کو چھوڑ کر پوری امت نے قیاس کی شریعت کو مانا ہے۔ امام شافعی کے مشہور شاگرد امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ اس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک دینی معاملات میں فقہاء قیاس سے برابر کام لیتے رہے ہیں۔ ان کا اس پر اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہے اور باطل کی نظیر باطل ہے لہذا قیاس کا انکار درست نہیں ہے کیونکہ وہ مماثل اشیا پر مماثل احکام کا نام ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پیش آنے والے حوادث میں اجتہاد سے کام لیتے تھے اور بعض احکام کو بعض پر قیاس کرتے تھے وہ ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کرتے تھے۔

امام ابوبکر سرخسی نے اس موضوع پر مفید اور بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔ قیاس سے شریعت میں کام لینا صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور ائمہ دین کا مذہب ہے۔ سب سے پہلا شخص جس نے قیاس کے جواز کا انکار

۱۔ جامع بیان العلم وفضلہ - ۲۔ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷۶۔

۳۔ ان کا نام محمد بن احمد کنیت ابوبکر اور لقب شمس الاممہ ہے۔ ۴۔ ان کی تاریخ وفات ہے۔ اصول فقہ میں ان کی یہ کتاب اب مصر میں طبع ہو چکی ہے۔ حاجی غلیف نے ان کی اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب سرخسی نے خوارزم کے جیل خانہ میں لکھی ہے۔ جب باب شرط پر پہنچے تو رہائی ہو گئی آپ فرغانہ پہنچے اور اس کتاب کی تکمیل کرائی (کشف الظنون ص ۹۰) فرغانہ کو آج کل تاشقند کہتے ہیں۔ ڈاکٹر حسی نے اپنی تاریخ ادب العرب میں اس کی تصریح کی ہے۔ مولانا عبدالحی نے مدینۃ العلوم کے نوالہ سے بتایا ہے کہ اصول فقہ کی اس کتاب اور شرح السیر البکیر ان دونوں کو شمس الاممہ نے قید میں تصنیف کیا۔ حکام وقت کو نصیحت کی پاداش میں قید کیے گئے تھے (الفوائد البہرہ ص ۵۷) یہ اس مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے جس کا خود شمس الاممہ نے اپنی کتاب مبسوط کے مختلف مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ ان کو یہ تکلیف مسئلۃ النواتب کے سلسلہ میں اٹھانی پڑی۔ یعنی حکومت کی جانب سے بلا وجہ بھاری بجاری

(باقی صفحہ ۶۶۸ پر)

کیا ہے وہ ابراہیم نظام ہے بغداد کے کچھ متکلمین نے اسی کی پیروی کی ہے۔ بعد ازیں ایک سادہ لوح شخص داؤد نامی آئے اور انہوں نے متقدمین کے اس سے متعلق افکار معلوم کیے بغیر قیاس پر عمل کے ابطال کا اعلان کر دیا۔ اور لوگوں کو بتایا کہ ترتیب میں قیاس حجت نہیں ہے۔ ان کی پیروی میں وہ تمام ظاہریہ جو غور و فکر کی نعمت سے ان کی طرح بے نیاز ہیں کچھ کہنے لگے۔ اور ان میں سے کچھ نے یہی بات قنادہ، مسروق اور ابن سیرین کی طرف منسوب کی ہے۔ یہ ان بزرگوں پر مہتان ہے۔ ان کا مقام اس سے کہیں بالا و بالا ہے کہ وہ اس قسم کی بات کہیں نہ علامہ شوکانی بھی انکار قیاس کی خشیت اول کی نشاندہی میں اسرختی کے ہمزبان ہیں۔

۱۱۸، ۱۱۹۔ اصول سرخسی

صحت کا بقیہ حاشیہ :- ٹیکس لگاتے گئے۔ اس کے خلاف انہوں نے احتجاج کیا ان ٹیکسوں کا فتح القدر میں اس طرح ذکر آیا ہے کالجایات فی زمانہ بلاد فارس علی الخیاط و الصباغ و غیرہ صمد السلطان فی کل یوم او الشهر او ثلاثة الشهور یعنی جیسے ہمارے زمانے میں بادشاہ فارس کے لیے درزی، رنگر، وغیرہ روزانہ اور ماہانہ اور سہ ماہی ٹیکس لیا کرتے ہیں (ج ۵ ص ۳۳۲) اس کے بعد حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ شمس الامم نے ان ٹیکسوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بتایا کہ اکثر المنائب توخذ ظلماً و من تمكن من دفع الظلم عن نفسه، فهو خیر لہ من زیادہ ٹیکس ظلماً ہی لیے جاتے ہیں اور جو شخص اپنی ذات سے ظلم دور کر سکتا ہے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ ایسا ہی کرے اور ان کو صرف اسی پر اصرار نہ تھا بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ ٹیکس دینا ہی چاہتا ہے تو وہ ایسے شخص کو دے جو ظلم کی خود مدافعت نہ کر سکتا ہو یا ایسے فقیر کو دے جو کسی ظلم کا مقابلہ اس کے ذریعے کر سکے۔ اس طرح دینے والا ثواب کا مستحق ہو گا و فتح القدر ج ۵ ص ۳۳۲ بظاہر جیل میں قید کی مدت بہت لمبی تھی کیونکہ مبسوط، شرح السیر البکیر نیز اصول فقہ کا اکثر حصہ جیل ہی میں لکھا گیا ہے۔ شمس الامم کی تحریک کامیاب ہوئی۔ ابن خلکان نے ملک شاہ سلجوقی کے بارے میں لکھا ہے وایطلل المکوس الخفادات فی جمیع البلدان تمام ٹیکس وغیرہ ختم کر دیے۔

اولین شخص جس نے قیاس کا کھلم کھلا انکار کیا نظام ہے۔ اور اس کی معتزلہ میں سے کچھ لوگوں نے پیروی کی ہے مثلاً جعفر بن حرب، جعفر بن جعفیہ، محمد بن عبد اللہ۔ ان ہی کے سیکھے تائیکے داؤد ظاہری نے بائیں ہیں۔

حافظ ابن عبد البر مغربی نے حافظ ابو القاسم بغدادی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ما علمت احدا سبق النظام الى القول بنفي القياس نظام سے پہلے قیاس کا منکر میرے علم میں کوئی نہیں ہے۔ اور اپنا یہ تاثر ظاہر کیا ہے :

لا خلاف بين فقهاء الامصار وسائر اهل السنة في نفي القياس في التوحيد واثباته في الاحكام الاداؤد الظاهري فانه نفاك۔

فقہاء اور تمام اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ عقائد میں قیاس روا نہیں ہے اور احکام میں درست ہے داؤد نے احکام میں بھی انکار کیا ہے۔

تمام اہل سنت کی قید پر حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ شیعہ کا موقف اس موضوع پر اہل سنت سے بالکل جدا ہے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ فرماتے ہیں : ایک طبقے نے قیاس کے موضوع پر شدید مخالفت کی ہے ان میں سب سے مخالف شیعہ ہیں وہ اسے قطعاً حجت نہیں مانتے ہیں۔

اے ابراہیم بن سبیر نظام غالی معتزلی ہے اس کے حالات کے لیے الفرق بین الفرق ص ۱۱۳ تا ۱۲۹ دیکھئے۔ لسان المیزان ج ۱ ص ۶۷۔ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۹۷۔ خطیب لکھتے ہیں کان احد فرسان اهل النظر والكلام على مذهب المعتزلة۔ الحافظ بھی ان کے ہی شاگرد ہیں بشر میں صرف ملکہ ہی نہ تھا بلکہ لکھا ہے کہ وقت معانی کے مالک تھے۔ المرزبانی کا بیان ہے کہ ترقیق شعر اور ترقیق معانی میں نظام ایک مثالی شخصیت تھے (تاریخ بغداد) اے ارشاد الفحول ص ۱۸۶۔ اے جامع بیان العلم وفضلہ ج ۲۔

ان کے بعد اہل الظاہر ہیں اور ان کے سرگرم وہ داؤد ظاہری اور مذہب
ظاہریہ کے مشہور نام شرفی حافظ ابن حزم ہیں۔

الغرض یہ مسئلہ اہل حق میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے اور جن کو اختلاف ہے ان کی مخالفت
اجماع میں قاذح نہیں ہے جیسا کہ سیوطی نے تصریح کی ہے۔

البتہ محل بحث یہ ہے کہ اگر قیاس اور خبر واحد میں تعارض ہو جائے تو کیا کیا جائے۔
کیا خبر واحد کو مخالف قیاس ہونے کی وجہ سے رد کر دیا جائے اور یا پھر خبر واحد کو قبول
کر کے قیاس کو رد کر دیا جائے۔

اس موضوع پر امام اعظم کی ترجمانی کرتے ہوئے بیگانوں نے نہیں بلکہ یگانوں نے کچھ
پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

فخر الاسلام بنردوی علی بن محمد کا کہنا یہ ہے کہ اگر خبر واحد کے راوی اصحاب کبار ہوں مثلاً خلفاء
راشدین، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، ابو موسیٰ اشعری، عائشہ اور دیگر صحابہ
جو علم و فضل میں شہرت رکھتے ہوں تو ان کی روایت کردہ حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دی جائے
گی۔ خود فخر الاسلام نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث نبوی کا حفظ و ضبط بڑا کٹھن کام ہے
آپ کو اللہ کی جانب سے شان جامعیت ملی تھی۔ صحابہ میں روایت
بالمعنی کا عام رواج تھا۔ اگر راوی حدیث کے معلوم کرنے اور اس
کا احاطہ کرنے سے قاصر ہو تو اس بات کا خطرہ درپیش ہوتا ہے کہ
حدیث کا کوئی جز اس سے نہ رہ جائے اور اس طرح حدیث میں قیاس
سے ایک شبہ زائد داخل ہو جائے گا لہذا اس میں احتیاط بھی زیادہ
چاہیے۔ اور اس تصور فہم سے ہمارا مطلب صرف مقابلے کے وقت
میں فقہ حدیث میں احتیاط ہے صحابہ کی تحفہ ہرگز مقصود نہیں ہے
امام محمد متعدد مواقع پر امام ابو حنیفہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں
نے انس بن مالک کی روایت کو اپنا یا ابو ہریرہ تو ان سے بڑھ کر ہیں

اس باب میں ہمارے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ ایسے راویان حدیث کی روایت اس وقت ترک کی جائے گی جب اس کے قبول کرنے میں کسی طرح کی گنجائش نہ ہوگی۔ جب قیاس کے سبب دروازے بند ہو جائیں گے اس وقت وہ حدیث کتاب اور سنت مشہورہ کی مخالفت تصور کی جائے گی اور اجماع کی بھی بلے

فخر الاسلام بزودی نے امام اعظم کا جو موقف قرار دیا ہے یہ دراصل امام اعظم کا نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان کا موقف ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالعزیز بخاری رقمطراز ہیں :

هذا مذهب عیسیٰ بن ابان و تابعه اکثر المتأخرین -

یہ عیسیٰ ابن ابان کا مذہب ہے اور اسی کی اکثر متاخرین نے پیروی کی ہے ورنہ جہاں تک امام اعظم کے اس موضوع پر موقف کا تعلق ہے وہ نہیں جو فخر الاسلام بتا رہے ہیں بلکہ وہ ہے جو ان کے بھائی صدر الاسلام سے صاحب تحقیق نے نقل کیا ہے کہ حدیث

لے کشف الاسرار ج ۲ ص ۱۶ -

لے یہ دو بھائی ہیں۔ ایک کا نام علی بن محمد لقب فخر الاسلام، کنیت ابوالحسن ہے۔ اور ان کے چھوٹے بھائی کا نام محمد بن محمد لقب صدر الاسلام اور کنیت ابوالیسر ہے۔ دونوں بھائی اپنے وقت کے امام ہوتے۔ ان کے جَدِ امجد علامہ عبدالکریم صرف یہی نہیں کہ امام الہدی ابوالمنصور الماتریدی کے تلامذہ میں سے تھے بلکہ اپنے وقت میں درس و تدریس کا حلقہ بھی انہوں نے قائم کیا تھا۔ فخر الاسلام سمرقند کے قاضی تھے اور صدر الاسلام کا مستقر بخارا تھا۔ آخر زمانے میں بڑے بھائی کے انتقال کے بعد صدر الاسلام کو بھی سمرقند کا قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ کان قاضی القضاۃ بسمرقند (الجواہر ج ۲ ص ۲۷۱) دونوں صاحب تصنیف ہیں۔ صدر الاسلام کے علمی کارناموں میں ان کی کتاب "اصول دین ہے"، علامہ قاسم بن قطلوبغا نے ان کی تصانیف کے بارے میں ان کے شاگرد رشید نجم الدین محمد نسفی صاحب عقائد نسفیہ کا یہ تاثر لکھا ہے کہ قد ملأ الشرق والغرب بمؤلفاتہ فی الاصول والفروع۔ فخر الاسلام کی تصانیف میں ایک سے زیادہ کتابیں ہیں۔ مؤرخین نے ان کو امام فی الدنیا فی الفروع والاصول لکھا ہے۔ فخر الاسلام کی وفات بخارا میں رجب ۷۳۶ھ میں ہوئی۔ اور صدر الاسلام کی وفات رجب ۷۹۳ھ میں ہوئی ہے۔

اور قیاس میں اگر تعارض ہو جائے تو حدیث کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا بشرطیکہ حدیث صحیح ہو اور کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ صدر الاسلام نے امام اعظم کے اس مسلک کی توجیہ فرمائی ہے کہ راوی کی عدالت اور ضبط ثابت ہو جانے کے بعد روایت میں تغیر و تبدل کا خیال ایک امر موهوم ہے۔ ظاہر ہے کہ راوی جو کچھ پیش کرتا ہے یہ اس کی سنی ہوئی بات ہے بالفرض اگر الفاظ میں اس کی جانب سے کوئی تغیر بھی ہوتا ہے تو یہ ایسا تغیر منہیں ہوتا جس سے مطلب بدل جائے کیونکہ ارباب عدالت راویوں کے بارے میں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ اہل زبان ہیں اور زبان دانی کے ساتھ معنی کی تبدیلی کا گمان محض ایک خیال ہے اور ان کی عدالت و تقویٰ مان کر ان پر زیادتی اور کمی کا شبہ کرنا بھی بے محل ہے۔ نیز جس قیاس کی بنا پر روایت کو رد کیا جا رہا ہے خود اس قیاس کی صحت ہی کی کیا ضمانت ہے؟ قیاس صحیح سے واقفیت بھی دشوار تر ہے لہذا حدیث کو اپنا ضروری ہے۔

شیخ ابوالحسن کمرخی نے بھی امام اعظم کے مسلک کی یہی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالعزیز بخاری فرماتے ہیں:

شیخ ابوالحسن کمرخی اور ان کے ہمواؤں کے نزدیک حدیث کے قیاس پر مقدم کرنے کے لیے راوی کی فقہیت شرط منہیں ہے بلکہ روایت کی قبولیت کے لیے صرف راوی میں عدالت اور ضبط ہونا کافی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ حدیث قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔ بلاشبہ ایسی حدیث کو قیاس پر بھی مقدم کیا جائے۔

حافظ ابن الہمام نے بھی امام اعظم کا یہی مسلک بتایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

اذا تعارض خبر الواحد والقياس بحيث لا جمع قدم الخبر مطلقاً عند الاكثر منه والبرهان والشافعي والحمد لله

حدیث اور قیاس میں اگر تعارض ہو جائے اور کسی طرح بھی دونوں کا باہم جمع کرنا ممکن نہ ہو تو پھر حدیث کو بلا شرط مقدم کیا جائے گا۔ اکثر کی رائے یہی ہے ان ہی میں ابو حنیفہ، شافعی اور احمد ہیں۔
 دوسرے اکابر نے امام اعظم کے اس موقف کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں لیکن علامہ عبدالعزیز بخاری نے اسی سلسلے میں جو بات پوری ثبوت سے بتائی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں :

جو بات فخر الاسلام نے پیش فرمائی ہے یہ ہمارے اصحاب سے قطعاً منقول نہیں ہے ان سے اس کے برعکس جو کچھ روایت ہمیں معلوم ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہے اور اس بارے میں تفصیلاً ان سے کچھ بھی مروی نہیں ہے۔ واقعات بھی اسی نظریہ کے مؤید ہیں۔ چنانچہ حدیث ابی ہریرہ کی وجہ سے بھول کر کھانے پینے سے روزہ ٹوٹنے کا فیصلہ ابو حنیفہ نے اسی بنا پر کیا ہے حدیث اگرچہ خلاف قیاس ہے لیکن اس کے باوجود اسی پر عمل ہے حتیٰ کہ امام اعظم سے منقول ہے کہ لولا الروایۃ لقلت بالقیاس۔ اس موضوع پر اگر یہ روایت نہ ہوتی تو میں قیاس سے کام لیتا۔ اور یہ بھی امام اعظم سے منقول ہے کہ ما جاءنا عن الله والرسول فهو على الناس والعين الله اور اس کے رسول کی جانب سے جو کچھ ہمارے پاس آئے وہ ہمارے سرانکھوں پر ہے۔ اس بنا پر ہمارے اسلاف میں سے کسی سے بھی روایت کی صحت کے لیے راوی کے فقیہ ہونے کی شرط منقول نہیں ہے بلاشبہ یہ بات بعد کو گھڑی گئی ہے۔

فقہ احناف میں جن روایات پر عمل نہیں کیا گیا ہے مثلاً حدیث عرابیہ، حدیث مصراۃ، اور حدیث قرعہ، اور جن کے متعلق لوگوں نے عمل نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ خلاف قیاس ہیں۔

ان کا جواب دیتے ہوئے امام علامہ ابوالحسن کرخی رقمطراز ہیں :

یہ غلط ہے کہ ہمارے اصحاب نے ان حدیثوں پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ یہ خلاف قیاس ہیں بلکہ ان حدیثوں پر عمل نہ کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ حدیثیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف ہیں۔ اور یہ وجہ بھی نہیں کہ ان کے راوی فقہیت کی نعمت سے محروم ہیں۔ حدیث عراقیہ سنت مشہورہ کے خلاف ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ التمر بالحدیث مثل مثل کیل بکیل کجور کے بدلے کجور برابر برابر ہم یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہیں کہ ابوہریرہ فقیر تھے۔ آپ زمانہ صلحاہ میں فتویٰ دیتے تھے حالانکہ اس زمانے میں غیر فقیہ کے فتویٰ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ آپ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی ہے اور آپ سے روایت کردہ حدیثوں کو کافی شہرت ہوئی ہے۔

بہر حال یہ حقیقت بے غبار ہے کہ امام اعظم اور آپ کے اصحاب سنت بلکہ اخبار احاد تک کو قیاس کے مقابلے میں راجح قرار دیتے تھے اور یہی امام اعظم کے موقف کی صحیح ترجمانی ہے۔

حدیث میں امام اعظم کے اصول

حدیث کی صحت اور اس کی قبولیت کے بارے میں امام اعظم نے جو اصول مقرر فرمائے ہیں۔ اور اس فن میں جو ایک فن کار کی حیثیت سے علمی خدمت سرانجام دی ہے اس کی ایک ادنیٰ سی جھلک آپ بالا صفحات میں دیکھ چکے ہیں اور آپ یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ تیسری صدی میں امام شعبہ اور یحییٰ بن معین کے زمانے تک امام اعظم کی ذات گرامی اس فن میں ارباب حدیث کے یہاں صرف علمی منہیں بلکہ استدلالی شخصیت تھی۔

امام اعظم کے وضع فرمودہ اصولوں کے بارے میں کچھ بزرگ ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس کے نتیجے میں یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ امام اعظم کے

نام سے اس موضوع پر جو بھی سرمایہ ہے وہ سب یار لوگوں کا گھڑا ہوا ہے اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خاص خطیبانہ انداز میں برملا کہہ دیا کہ

امام ابو حنیفہ اور ان کے صاحبزادے کو ان اختراعی اصول و قواعد کا وہم و خیال بھی نہ گزرا ہو گا۔

میرے خیال میں یہ ان بزرگوں کی جانب سے بہت بڑی زیادتی ہے۔

در اصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں اپنے مزاج کے لحاظ سے الگ الگ ہیں صحت حدیث اور قبولیت حدیث۔

صحت حدیث کے لیے اصول و قواعد اور قوانین و ضوابط بنانا اگر محدثین کا کام ہے تو قبولیت کے لیے شرائط اور قواعد مرتب کرنا ارباب اجتہاد اور فقہاء کا کام ہے۔ حدیث کی صحت کے لیے بخاری اور مسلم کے نام سے جو شرائط، جو اصول و قواعد اور جو ضوابط متاخرین نے بنائے ہیں اور بتائے ہیں ان میں ایک بھی معاصرت اور تقابلاً کو مستثنیٰ کر کے امام بخاری اور امام مسلم سے صراحتاً منقول نہیں ہے۔ بلکہ بتانے والوں نے کھلے بندوں یہ انکشاف کیا ہے۔

اعلم ان البخاری و مسلماً و من ذکرنا بعدہم لم یثقل

عن واحد منهم انه قال شرطت ان اخرج فی کتابی

ما یکون علی الشرط الفلانی و انما یعرف ذالک من

سیر کتبہم فیعلم بذالک شرط کل رجل منهم۔

امام بخاری اور مسلم وغیرہ سے ایسی کوئی ثابت تصریح نہیں آتی جس میں ان بزرگوں نے یہ بتایا کہ کتاب میں تخریج روایت کی فلاں شرط کی میں نے پابندی کی ہے ان کی شرائط کا پتہ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے اور بس۔

الجزائری بھی علامہ مقدسی کے ہم زبان ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اعلم ان البخاری لم یوجد عنده تصریح بشرط معین

وانما اخذ ذالک من تسمیة الکتاب والاسنتقاد من تفرقه

خود بخاری کی کسی شرط کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے ان کی کتاب کے نام اور کتاب میں ان کے تفرقات سے لوگوں نے خود یہ اخذ کر لیا ہے۔

اگر حدیث کی صحت کے لیے شرائط و ضوابط کا پیمانہ ان بزرگوں کے طرز عمل سے معلوم کر کے بتایا جاسکتا ہے اور اسے ان بزرگوں کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے تو پھر ائمہ مجتہدین ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد کی کتابوں میں طرز عمل سے اگر متاخرین نے کچھ قواعد معلوم کر کے ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیے تو اس میں کون سی قباحت ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ صحت حدیث کے موضوع پر قوانین کی تخریج کو صرف برواشت نہ نہیں کیا جاتا بلکہ اس پر تحسین و افرین کے نعرے لگاتے جاتے ہیں۔ لیکن قبولیت حدیث کے میدان میں ائمہ اجتہاد کی طرف منسوب اصول و قوانین طبع نازک پر گراں ہوتے ہیں اور ان پر تخریج ہونے کی پھبتی اور اختراعیت کا آوازہ کسا جاتا ہے فیاللاسف ویا للعاد والی اللہ المشتکی دوسرے علوم و فنون کی طرح حدیث بھی ایک فن ہے اس کے بھی دوسرے علوم کی طرح تقاضے ہیں۔ بتایا جائے آخر وہ کون سا علم ہے جس میں قواعد و ضوابط تخریجی نہیں ہوتے۔ اشتقاق، تصریف، معانی، بدیع، بیان، نحو وغیرہ زبان اور لغت سے متعلق اصول و قوانین کا نام ہے۔ کیا ان میں کوئی بھی مخصوص ہے؟ سب کے سب بعد میں آنے والوں کے اختراعی اور تخریجی قوانین و ضوابط ہیں۔ اس طرح کی تخریج اگر علمی طور پر غلط ہے تو علوم و فنون کی پوری دنیا مشکوک ہو کر رہ جائے گی اور کسی فن کے قواعد و ضوابط کو بھی اعتقاد و توقیر کا پروانہ نہیں مل سکتا۔

اس سلسلے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کا اسم گرامی بھی پیش کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ اور انصاف میں ان اصول و ضوابط کے تخریجی ہونے کی تصریح کی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا اختلاف بزدوی وغیرہ کی کتابوں میں بیان شدہ اصولوں پر مبنی ہے لیکن

امرواقعہ یہ ہے کہ یہ اصول زیادہ تر ان کے اقوال پر تخریج کیے گئے ہیں لیہ
 شاہ صاحب کی اس عبارت سے یہ سمجھنا کہ جملہ قواعد کا علمی سرمایہ تخریبی ہے اور چونکہ تخریبی ہے۔
 اس لیے یہ سرمایہ ناقابل اعتبار ہے بہت بڑی زیادتی اور بے انصافی ہے۔ شاہ صاحب تو اس
 عبارت کے ذریعے اپنے مخاطبوں کے دماغوں میں مقدسی اور حاذمی کی طرح ان قواعد کی تاریخی
 حیثیت پیش فرما رہے ہیں اور یہ بنانا چاہتے ہیں کہ یہ قوانین تخریبی ہیں اور صاحب مذہب سے
 خود مروی نہیں ہیں اور اس موضوع پر شاہ صاحب کے اس انکشاف کی حیثیت حرف بحرف
 وہی ہے جو مقدسی اور حاذمی کے اس انکشاف کی ہے کہ صحت حدیث کے موضوع پر شرائط وغیرہ
 کا سرمایہ بخاری و مسلم کا خود ساختہ اور پرداختہ نہیں ہے بلکہ ان کے بعد میں آنے والے
 محدثین کا اختراعی اور تخریبی ہے جیسا کہ آپ پہلے سن آئے ہیں۔
 انصاف ہی میں شاہ صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ

ان قواعد کی پابندی اور ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات میں
 تکلف سے کام لینا جیسا کہ بزدلی کا کام ہے۔ متقدمین کا ہرگز
 شبہ نہیں ہے۔

شاہ صاحب کے اس ارشاد کی حیثیت بھی بالکل اس محاکمہ کی ہے جو حافظ ابن الہمام
 نے ان متاخرین محدثین کے جواب میں پیش کیا ہے جنہوں نے حدیث کی اصحیت کو بخاری و
 مسلم کے دائرے میں محدود کر دیا تھا۔ حافظ ابن الہمام نے بتایا کہ
 یہ خواہ مخواہ کی آپہنچ ہے اس میں کسی کی تقلید روا نہیں ہے
 کیونکہ اصحیت کا مدار تو صرف ان شروط پر ہے جو ان بزرگوں نے
 اپنی کتابوں میں ملحوظ رکھی ہیں۔ اگر یہی شرطیں ان دو کتابوں
 کے علاوہ کہیں اور بھی پائی جاتیں تو پھر اصحیت کو ان میں محدود
 کرنا بالکل بے معنی ہے۔

یہ بات حافظ ابن الہمام نے ان سے کہی ہے کہ جو صحیحین کی حدیثوں کی اصحیت کا صرف
 صحیحین میں ہونے کی وجہ سے دعویٰ کرتے ہیں۔ اور تو اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو

شیخ ابن الہمام کے خلاف استغاثہ کرنا پڑا۔ وہ فرماتے ہیں :

ابن الہمام نے اس طرح کے اصول بنانا شروع کر دیے کہ صحیحین کی ترجیح صحیحین کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ان شروط کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اگر دوسری کتاب کی روایت بھی ان شرطوں پر آئی تو قوت میں صحیحین کی روایت کے ہم پلہ ہو جائے گی حالانکہ صحیحین کی ترجیح محض ان شروط کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے۔ اور اس پر تمام اُمت کا اتفاق ہو چکا ہے۔

اتفاق اُمت، شہرت اور قبول کی پوری داستان محدثین کی زبانی آپ پہلے سن چکے ہیں اس لیے یہاں اس کا تکرار بے معنی ہے۔

بہر حال اگر شاہ صاحب اور حافظ ابن الہمام دونوں کا آپ موازنہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ دونوں میں ایک روح کام کر رہی ہے فرق ہے تو صرف یہ کہ شاہ صاحب متاخرین فقہاء کے بارے میں وہی بات کہہ رہے ہیں جو ابن الہمام نے متاخرین محدثین کے بارے میں کہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اصول و قواعد صحت حدیث سے متعلق ہوں یا قبولیت سے۔ دونوں تخریجی اور اختراعی اور بعد میں آنے والوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ نہ تو محدثین کے یہاں صحت حدیث کے اصول بذریعہ وحی آئے ہیں اور نہ فقہاء کے پاس قبولیت حدیث سے متعلق قوانین منصوص ہیں۔ اگر قواعد و ضوابط کو یہ کہہ کر پس انداز کر دیا جائے کہ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں تو تمام نظام شریعت درہم برہم ہو جائے گا۔

اس میں علمی طور پر کوئی شک نہیں کہ اصول و قواعد تخریجی ہیں اس لیے ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہاں اس کی جگہ یہ بات عقل کو اپیل کرتی ہے کہ فن کے قواعد اہل فن کے بنائے ہوئے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ کسی فن میں غیر فنکاروں سے استفادہ فن سے اعتماد و ہٹا دینا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الزہیری اس موقع پر بڑے پتے کی بات فرما گئے۔

تمام اسلامی فرقے اس پر متفق ہیں کہ ہر فن میں اس کے فنکاروں کی

بات حجت ہو گی۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو علوم و فنون کی دنیا ختم ہو جائے
کیونکہ انارٹھی اول تو فن میں بات نہ کر سکے گا اور اگر بات کرے گا
تو غلط کرے گا۔

یہ بات تو یقینی برانصاف ہے لیکن اس میں کوئی عقلیت نہیں ہے کہ اصول و قواعد کو
تخریبی بننا کر غیر معتبر قرار دے دیا جائے۔ اسے اگر بطور اصل تسلیم کر لیا جائے تو فنِ قرأت میں
تجوید کے اصول، ادب و لغت میں لغت و زبان کے قواعد، فقہ میں اصول فقہ، حدیث میں
اصول حدیث، تفسیر میں اصول تفسیر سب ہی انسانوں کے وضع کردہ اور تخریبی ہیں۔ ان کو
اگر یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ وضعی اور تخریبی ہیں تو اسلام کے پورے علمی سرمایہ سے دستبردار
ہونا پڑے گا۔ اصول و قواعد حدیث کے ہوں یا فقہ کے۔ سب انسانی محنتوں کے رہیں منت
ہیں اس لیے یہ کہنا کچھ وزن نہیں رکھتا کہ احناف نے کچھ شرطیں لگالی ہیں جیسا کہ حافظ ابن
تیمیہ نے مجموعۃ الرسائل میں لکھا ہے۔

بہت سے اہل الرائے نے اکثر احادیث کا ایسی شرطوں کی وجہ سے
انکار کر دیا جو انہوں نے خود لگائیں۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ حدیث کی صحت کے لیے اگر محدثین متاخرین شرطیں مقرر
کریں تو یہ درست اور علم کی خدمت سمجھی جائے اور حدیث ہی کی قبولیت کے میدان میں
اللہ کے دین میں احتیاط کی خاطر اگر احناف شرطیں بتائیں تو ان کو خود لگائی ہوئی شرطیں
قرار دیا جائے۔ دونوں امتی ہیں دونوں فن کی خدمت اللہ کے دین کی خاطر کر رہے ہیں دونوں
کا پیش نہاد دین کی حفاظت ہے دونوں میں یہ امتیاز کچھ قرین انصاف نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ اصول و ضوابط بخاری و مسلم کی طرح امام اعظم سے صراحتہ منقول نہیں
ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تدوین قانون کے موقع پر حدیث کے بارے میں کچھ
ضوابط ان ائمہ مجتہدین کے ضرور پیش نظر ہوں گے جن کی روشنی میں انہوں نے حدیث و
سنت کو قانون سازی میں استعمال کیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے حدیث کی تصنیف کے
موقع پر کچھ قوانین و ضوابط ضرور ائمہ ستہ حدیث کے پیش نظر تھے جن کی روشنی میں انہوں نے

حدیث کے یہ مجامیع تیار کر کے اسلام کی پیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ ان سے اگر صراحتہً اصول و ضوابط کا کوئی سرمایہ منقول نہیں ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ صحت حدیث کے لیے ان بزرگوں کے پیش نظر کوئی ضابطہ ہی نہ تھا ایسے ہی حدیث کی قبولیت کے بارے میں اگر ائمہ مجتہدین ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد سے اصولی سرمایہ صراحتہً منقول نہیں تو اس کا بھی ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تدوین شریعت کے میدان میں یہ بزرگ حدیث کی حد تک کسی قاعدے اور آئین کے پابند نہ تھے۔ یقیناً آپ کچھ قواعد کے ضرور پابند ہوں گے۔ باقی ان کا مدون نہ کرنا۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں اصول و قوانین کا وجود ہی نہ تھا اور تدوین شریعت کا سارا کام محض جفاف سے ہو رہا تھا۔

جن علماء نے اصول و قوانین پر تدوین کی خدمت انجام دی ہے انہوں نے اس کو ائمہ مذہب سے منقول فروعی علمی سرمایہ سے اخذ کر کے ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج، اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ، الرد علی سیرالذرائعی اور امام محمد کی الحجۃ علی اہل المدینہ، مؤطا، کتاب الآثار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر امام اعظم کے استدلال کے قواعد عامہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحب کا منشا

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اپنے مطالعہ میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاہ صاحب انصاف اور حجتہ اللہ میں ان اصول و قوانین کے خلاف نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان جیسے حضرات کی ان آراء کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے ہیں جو شعوری یا غیر شعوری طور پر حنفی فقہ میں داخل ہو گئی ہیں اور جن کو بعض جاہل قسم کے فقہاء نے جہل و مناظرے کے لیے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اس احتجاج میں شاہ صاحب منفرد نہیں بلکہ امام ابو الحسن کمرخی اور حافظ ابن الہمام کی زبانی آپ پہلے اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ چنانچہ جن قواعد کا نام لے کر شاہ صاحب نے تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ صاحب مذہب سے منقول نہیں ہے اور ان کے لیے جن محققین کا حوالہ دیا ہے وہ وہی آراء ہیں جن کو متاخرین نے اصول کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ان قواعد کے ائمہ مذہب سے منقول نہ ہونے پر محققین کا یہ قول

کافی ہے کہ یہ قاعدہ کہ ایک راوی جو ضبط و عدالت میں معروف ہو مگر فقہ میں شہرت نہ رکھتا ہو تو اس کی وہ روایت واجب العمل نہ ہو گی جس سے رائے اور قیاس کا دروازہ بند ہو جاتا ہو جیسے حدیث مصراۃ۔ یہ عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور بہت سے متاخرین اس کے قائل ہیں۔ لیکن امام کمرخی اور بہت سے علماء کے نزدیک راوی کا فقیہ ہونا ضروری نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ قول ہمارے اصحاب سے منقول نہیں ہے بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ حدیث قیاس پر مقدم ہے۔

یہ تصریح اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ شاہ صاحب اصول و قواعد کی مطلق نفی نہیں فرماتے ہیں جو ائمہ نے ارباب مذاہب کی فروعات سے اخذ کیے ہیں بلکہ ان آراء کی تردید کرتے ہیں جن کا نام اصول رکھ لیا گیا ہے اور جن کا ارباب مذاہب سے تعلق نہیں ہے ورنہ جہاں تک ان اصول و قواعد کا تعلق ہے جو ہم نے کتاب میں حدیث کے موضوع پر امام اعظم کا نام لے کر پیش کیے ہیں وہ امام اعظم نے دلیل و برہان کے تحت اختیار کیے ہیں اور ان پر آج تک کسی بھی محدث نے یہ تنقید نہیں کی ہے کہ یہ اختراعی ہیں اور امام اعظم سے ثابت نہیں ہیں۔ اس موضوع پر امام اعظم کو دوسری صدی کے محدثین کی پوری حمایت حاصل ہے۔ بلاشبہ جیسے معانی قرآن سے تصادم کے موقع پر کسی حدیث کو رد نہیں کیا بلکہ حدیث کی موجودگی میں قیاس سے متعلق بحث و اجتہاد کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ حکیم الامت نے امام اعظم کے اس موقف کی یہ کہہ کر وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں؛ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ روزے دار اگر بھول کر کھاپی لے تو امام اعظم حضرت ابو ہریرہ کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے روزہ نہ ٹوٹنے کا فتویٰ دیتے ہیں حالانکہ روایت ابی ہریرہ قطعاً خلاف قیاس ہے اس موقع پر امام اعظم فرماتے ہیں کہ اگر روایت نہ ہوتی تو میں قیاس کے مطابق فتویٰ دیتا۔

اسی سے ان تمام اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین کا اندازہ لگالیجئے جو حدیث سے متعلق آپ پیچھے اوراق میں پڑھ چکے ہیں ۔

اصول و ضوابط صحت و قبولیت حدیث

ارباب روایت اور ائمہ اجتہاد کے نقطہ نگاہ میں چونکہ بنیاد ہی پر ایک عظیم فرق ہے ۔ اس لیے ان کے پیش فرمودہ اصول و ضوابط میں بھی اختلاف ناگزیر ہے جو حیثیت محدثین کی حدیث کی صحت اور رجال اسناد میں ہے وہی حیثیت مجتہدین کی حلال و حرام کے احکام کی معرفت میں ہے اور دونوں میں ایسے بھی ہیں جن کو دونوں فنوں میں امامت حاصل ہے ۔

حافظ ابن تیمیہ کتاب الاستغاثہ میں جو بکری کی تردید میں لکھی ہے رقمطراز ہیں ۔

امام یحییٰ بن معین ، بسمازی ، مسلم ، ابو حاتم ، ابو زرعہ ، نسائی ، ابن عدی ، دارقطنی اور ان جیسے حضرات کے کلام کی حیثیت رجال اور صحیح و ضعیف احادیث کے بارے میں وہی ہے جو امام مالک ، سفیان ثوری ، اوزاعی ، شافعی اور ان جیسے حضرات کے کلام کی احکام اور حلال و حرام کی معرفت کے باب میں ہے ۔ اور ائمہ میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جو محدثین میں بھی امام ہیں اور فقہاء میں بھی اور دونوں جماعتوں میں شامل ہیں ۔ گو ان میں سے ایک جماعت کی طرف ان کا انتساب زیادہ موزوں ہے ۔ اور حدیث و فقہ کے اکثر امام جیسے مالک ، شافعی ، احمد اور اسحاق ابن راہویہ اور اسی طرح اوزاعی ، ثوری اور لیث ایسے ہی تھے اور اسی طرح ابو یوسف صاحب ابی حنیفہ اور خود امام ابو حنیفہ کا بھی وہ ہی مرتبہ ہے جو ان کے شاہان شان ہے ۔

محدثین کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا ہے اور بس ۔ اس لیے ان پر اخبار ہی نقطہ نظر غالب ہے اور وہ روایت کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں صرف اس کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ اسناد و رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہے ؟

اس کے برعکس مجتہدین کے پیش نظر صرف اسناد و رجال ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کے پیش نظر بحیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کا پورا سسٹم ہوتا ہے اس بنا پر حدیث کی قبولیت کے ضوابط ان کے یہاں اس کے زیر اثر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام حازمی فرماتے ہیں:

اما الفقہاء فمذاہب الضعف عندہم مخصوصۃ وعلیہا منوط لمراعاة ظاہر الشرع۔

فقہاء کے یہاں اسبابِ ضعف حدیث محدود ہیں اور ان میں عظیم ترین ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث ظاہر شریعت سے کس قدر موافق ہے۔ اے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے شریعت کے پورے سسٹم پر نظر ہونے کا یہ مطلب بتایا ہے کہ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پانچ علموں کا جامع ہو۔ قرآن کی قرأت اور تفسیر، احادیث کا علم مع اسانید اور صحیح و ضعیف کی معرفت، مسائل میں سلف کے ارشادات سے واقفیت، عربی زبان کا علم، استنباط مسائل اور نصوص میں تطبیق کا علم۔

مولانا محمد اسماعیل الشہید نے مجتہدین کو شریعت کے پورے سسٹم پر بحیثیت مجموعی نظر ہونے میں انبیاء کے مشابہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

پس مشابہ بانبیاء درین فن مجتہدین مقبولین اند۔ پس ایشان را از ائمہ فن باید شمر و مثل ائمہ اربعہ۔ ہر چند مجتہدین بسیار از بسیار گذشتہ خاما مقبول در میان جمہور امت ہمیں چند اشخاص اند۔ پس گویا کہ مشابہت تامہ درین فن نصیب ایشان گردیدہ۔ بناء علیہ در میان جمہیر اسلام از خواص و عوام بلقب امام معروف گردیدند۔

اس فن میں انبیاء سے مشابہت رکھنے والے مجتہدین ہیں۔ ان کو اس فن کا امام سمجھنا چاہیے جیسے ائمہ اربعہ۔ اگرچہ مجتہدین بہت ہوتے ہیں لیکن جمہور امت میں مشہور یہی چند ہستیاں ہیں۔ اس لیے گویا پوری پوری مشابہت اس فن میں ان کے ہی حصہ میں آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہورِ امت کے خواص و عوام میں یہی بزرگ امام کے لقب سے مشہور ہوتے ہیں۔^۱
اور امامت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ
امامت درہر کمال عبارت است از حصول مشابہت تامہ بانبیاء اللہ
در اہل کمال۔

اور علامہ شاطبی نے اسی کمال کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ

انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين احدهما

فهم مقاصد الشريعة على كمالها والثاني من الاستنباط۔

درجہ اجتہاد صرف اس شخص کو ملتا ہے جو دو وصفوں سے موصوف

ہوتا ہے ایک یہ کہ پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو۔ دوسرے

یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔^۲

اسی کی جھلک آپ ان اصولوں میں دیکھیں گے جو ان بزرگوں نے رد و قبولیت روایات کے لیے وضع فرماتے ہیں اور جن کے پیش نظر ان بزرگوں کی یہ حیثیت نہیں وہ ذرا سے فکر ہی لگنا کو دیکھ کر بدک جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جس طرح روایت و اسناد کو شب و روز کنگھالنے کنگھالتے محدث کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح اور غیر صحیح سند کو اپنے ذوق سے پہچان لیتا ہے چنانچہ تہانے والوں نے عبد الرحمن بن مہدی کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے۔
میں نے عبد الرحمن بن مہدی سے دریافت کیا کہ آپ سلسلہ روایت میں جھوٹے کا پتہ کیسے لگالیتے ہیں؟ فرمایا جیسے حکیم مجنون کا پتہ لگالیتا ہے۔

اور اسی کمال کو وہ اپنے الفاظ میں یوں تعبیر کرتے تھے کہ :

معرفة الحديث الهام

حدیث کی معرفت الہام ہے۔^۳

ٹھیک ٹھیک اسی طرح مجتہد کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ متن حدیث پر نظر ڈالتے ہی یہ تباد

ہے کہ حدیث شریعت اسلامیہ کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے یا نہیں۔ احادیث پر نظر ڈالتے وقت مجتہد کا یہی ملکہ رد و قبول کا معیار بن جاتا ہے۔ شریعت کا مزاج عین مزاج نبوت ہے جو شخص شریعت کے مزاج کو سمجھتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ متون احادیث کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ ان میں سے کون سا ارشاد اور کون سا عمل صاحب نبوت کا ہو سکتا ہے۔ بہر حال صحیح اور غیر صحیح سند کو پہچاننے کا ملکہ ہو جو محدثین کو ہوتا ہے یا متن حدیث کے رد و قبول کا ملکہ ہو جو مجتہدین کو ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں حالتیں سرتاسر ذوقی ہیں اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی ہیں اس لیے ان میں باہم اختلاف کی گنجائش ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے متن حدیث کی حد تک جیسے ائمہ مجتہدین میں بکثرت مسائل میں اختلاف ہوا ہے ایسے ہی صحت اسناد کی حد تک ائمہ روایت کے درمیان بھی روایات میں بکثرت اختلافات ہوتے ہیں :

ایک حدیث کو امام مسلم اس سند ہی کے ساتھ اپنی صحیح میں لاتے ہیں کہ
لیس کل شیئ عندی صحیح وضعتہ ہہنا انما وضعت ہہنا
ما اجمعوا علیہ -

ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں
درج نہیں کیا۔ میں نے صحیح مسلم میں صرف ان حدیثوں کو درج
کیا ہے کہ جن کی صحت پر شیوخ کا اجماع ہے لے

لیکن اس کے باوجود بہت سی حدیثیں ہیں جن کو کسی علت قاذمہ کی بنا پر امام بخاری نے
روایت نہیں کیا۔ یہاں حافظ عبد القادر قرطبی کا بہت قیمتی بیان پڑھنے کے لائق ہے جو انہوں
نے ایک ناقد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

حافظ رشید عطار نے ان حدیثوں پر ایک کتاب لکھی ہے جو
صحیح مسلم میں مقطوع آتی ہیں۔ اس کتاب کا نام "الفوائد المجموعہ
فی شان ما وقع فی مسلم من الاحادیث المقطوعہ" ہے۔ اور یہ جو
لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حدیث کو اگر شیخین روایت کر لیں تو معاملہ پار

ہے۔ فنی لحاظ سے یہ محض ادعا ہے اور حدیث کی قوت کی یہ کوئی قانونی ضمانت نہیں ہے۔ آخر یہ مسلم ہی تو ہے جس میں لیث بن سلیم جیسے ضعیف راویوں سے بھی روایات آتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مسلم میں اس قسم کے راویوں کی روایات کا درجہ محض شواہد، توابع اور اعتبار کا ہے درست نہیں ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ شواہد اور قوابع کی مدد سے کسی حدیث کا حال معلوم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ امام مسلم نے کتاب میں اگر صحت کا التزام کیا ہے تو آپ ہی بتائیے کہ وہ حدیث جو خود ان راہوں سے آتی ہو وہ صحیح کیسے ہو گی؟ سب مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ محدثین کے یہاں حدیث میں اَنَّ اور عَنْ کی تعبیر انقطاع کی نشاندہی کرتی ہے لیکن بخاری اور مسلم دونوں اپنی کتابوں میں عنعنہ پر مشتمل روایات لاتے ہیں اس کے جواب میں یہ کہنا کوئی معنویت نہیں رکھتا کہ عنعنہ صحیحین کے علاوہ دوسری کتابوں میں منقطع ہونے کی نشانی ہے۔ امام مسلم نے بحوالہ ابی الزبیر عن جابر بہت سی معنن حدیثیں روایت کی ہیں حالانکہ حفاظ کا فیصلہ ہے کہ ابوالزبیر مدلس ہے۔ حافظ ابن حزم اور حافظ عبدالحق نے لیث بن سعد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ انہوں نے ابوالزبیر سے دریافت کیا کہ مجھے وہ حدیثیں سناتو جو تم نے خود جابر سے سنی ہیں۔ انہوں نے صرف سترہ حدیثیں سنائیں۔ اس بنا پر حفاظ کہتے ہیں کہ لیث کی حدیثیں بحوالہ ابی الزبیر عن جابر صحیح ہیں لیکن مسلم میں جابر کی بحوالہ ابی الزبیر ایسی بھی حدیثیں ہیں جو لیث کی وساطت سے نہیں آتی ہیں اور جن میں عنعنہ ہے۔ نیز امام مسلم نے جابر اور ابن عمر کے حوالہ سے حجۃ الوداع کے موضوع پر یہ روایت پیش کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دسویں ذی الحجہ کو مکہ تشریف لے گئے آپ نے وہاں طواف افاضہ کیا پھر مکہ ہی میں نماز پڑھ کر منیٰ واپس تشریف لائے۔ دوسری روایت

میں ہے کہ آپ طواف افاضہ کر کے منیٰ تشریف لاتے اور نماز ظہر منیٰ میں ادا کی۔ دونوں روایتوں کو جمع کرنے کے لیے یہ توجیہ کرتے ہیں کہ نماز تو مکہ ہی میں ادا کی مگر منیٰ میں بیان جواز کے لیے دوبارہ پڑھی۔ مگر حافظ ابن حزم کہتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں سے ایک بلاشبہ جھوٹ ہے۔ ایسے ہی مسلم میں حدیث اسرار میں یہ اضافہ آیا ہے کہ واقعہ اسرار آپ کو وحی آنے سے پہلے پیش آیا ہے۔ حافظ حدیث نے اس پر بڑی لے لے کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ایسے ہی مسلم کی حدیث خلق اللہ الترتیبہ یوم السبت باتفاق حفاظ ضعیف ہے۔

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جیسے ائمہ مجتہدین قبولیت حدیث کی حد تک مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں ایسے ہی محدثین بھی روایت حدیث کی حد تک صحت حدیث میں اختلاف رکھتے ہیں اور قبولیت و صحت میں ان کے فکری اختلاف کا مظاہرہ ان اصول و ضوابط میں بھی ہوا ہے جو اس موضوع پر ان نبرہ رکوں سے منقول ہیں۔

تلامذہ حدیث اور امام اعظم

اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو پھر جیسا کہ امام ابن حجر مکی نے لکھا ہے کہ امام اعظم کی عظمت نشان کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ بڑے بڑے ائمہ کو ان کے سامنے زانوئے شاگردی طے کرنے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

مشائخ ائمہ مجتہدین اور علماء را سخیین میں سے بڑے بڑے لوگوں نے امام اعظم کی شاگردی اختیار کی ہے مثلاً امام جلیل عبدالعزیز بن المبارک جن کی جلالتِ قدر پر اتفاق عام ہے اور جیسے امام لیث بن سعد اور مالک بن انس۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ناہیک بھولا لامنا ابو حنیفہ کو سمجھنے کے لیے بس یہ ائمہ کافی ہیں۔

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں حدیث میں امام اعظم سے یہ تلامذہ بتاتے ہیں۔

روى عنه — عباد بن العوام — ابن المبارک، ہشتم و وکیع —
 و مسلم بن خالد — و ابو معاویہ — و المرقی —

شیخ الاسلام ابو محمد عبد الرحمن بن ابی حاتم رازی نے ان پر عبد الرزاق بن ہمام اور ابو نعیم کا
 اضافہ اور کیا ہے۔ کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔

حماد — ابراہیم بن طہمان، حمزہ بن حبیب الزیات، زفر بن الہذیل۔
 ابو یوسف القاضی۔ ابو یحییٰ الحمائی، عیسیٰ بن یونس، یزید بن ذریع،
 اسد بن عمرو البجلي، حکام بن یعلیٰ الرازی، خارجہ بن مصعب، عبد المجید
 بن ابی رداد، علی بن مسهر، محمد بن بشیر العبدي، مصعب بن المقدم،

یحییٰ بن یمان، نوح بن ابی مریم، ابو عاصم۔ کہ

حافظ عسقلانی نے آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ و آخر و ن یعنی ابو حنیفہ کے حدیث میں صرف
 یہی نہیں بلکہ اور بھی تلامذہ ہیں۔

خطیب بغدادی نے ان ناموں کی اور نشاندہی کی ہے۔

یزید بن ہارون، علی بن عاصم، یحییٰ بن نصر، عمرو بن محمد، ہودہ بن خلیفہ۔

حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام صاحب کے سامنے زائونے ادب نہ کرنے والے دو قسم
 کے تلامذہ ہیں۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے فقہ میں امام صاحب سے استفادہ کیا ہے اور دوسرے
 وہ ہیں جنہوں نے حدیث میں امام صاحب کے سامنے زائونے تلمذ نہ کیا ہے اور دونوں
 کے لیے حافظ ذہبی نے جو تعبیری زبان اختیار کی ہے وہ الگ الگ ہے قسم اول کے لیے وہ
 لکھتے ہیں کہ :

ثقة به جماعة من الكبار منهم زفر بن الهذيل و ابو

يوسف القاضى الى اخره

اور قسم ثانی کے لیے وہ فرماتے ہیں :

روى عنه من المحدثين والفقهاء عدة لا يحصون۔

۱۔ تاریخ کبیر ج ۴ ص ۸۱۔ ۲۔ کتاب الجرح والتعديل ج ۲ ص ۴۴۹۔

۳۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۴۹۔ ۴۔ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۴۔

اس کے بعد ان گنت محدثین میں سے چند محدثین کا بطور مشتمل از خرواز تذکرہ کیا ہے۔ خود ان کی زبانی یہ نام گوش گزار فرمائیے۔

فمن اقراء ميثرة بن مقسم وزكريا بن ابی زائدة ومسعر بن كرام
وسفيان الثوري و مالك بن مقول ويونس بن ابی اسحاق ومن
بعدهم زائدة وشريك والحسن بن صالح والوبكر بن عياش وحفص
بن غياث، جريير بن عبد الحميد المحاربي، ابو اسحاق الفزاري، اسحاق
بن يوسف الارزقي، المعاني بن عمران، زبير بن الحباب، سعد
بن الصلت، حفص بن عبد الرحمن، عبيد الله بن موسى، محمد بن عبد الله
الانصاري، ابو اسامة، ابن لمير، جعفر بن عون، اسحاق بن سليمان
الرازمي

ہم نے بالا روادہ تکرار سے بچنے کے لیے ان ناموں کو چھوڑ دیا ہے جو پہلے آچکے ہیں حافظ
ابو الحجاج المزی نے تہذیب الجمال میں اگرچہ سارے تلامذہ کا اشتقاق نہیں کیا ہے۔ اس کے
باوجود انہوں نے جن تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہے۔ حافظ
ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں تلامذہ کی بہتات کا تذکرہ کرنے اور نمونہ کے چند نام ذکر کرنے کے
بعد ”وبش کثیر“ اور مناقب میں ”و خلافت“ فرما کر تلامذہ کی کثرت کو بتایا ہے۔
اس بہتات کے اجمالی تذکرے کو حافظ عبد القادر قرشی نے یہ کہہ کر بے نقاب کیا ہے کہ
روای عن ابی حنیفة ... نحو من اربعة الاف نفر
تلامذہ کی اسی کثرت اور بہتات کے تذکرے میں حاشیہ نسائی میں حافظ ابن حجر کے حوالہ سے
بعض ائمہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے کہ

اسلام کے مشہور اماموں میں سے کسی کے اتنے اصحاب اور شاگرد
نہیں ہوئے جس قدر امام ابو حنیفہ کے ہوئے اور جس قدر علماء
نے آپ سے استفادہ کیا ہے اور سے نہیں کیا۔

امام اعظم کے تلامذہ کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ خلیفہ وقت کی حدود مملکت بھی اس سے

زیادہ وسیع نہ تھیں۔ امام حافظ الدین بن البرکات کوردی نے امام اعظم کے مخصوص تلامذہ کا تفصیلی تذکرہ لکھنے کے بعد سات سو تیس مشاہیر علمائے کرام کے نام بقید نسب لکھے ہیں اور صوبہ وار ان کو شمار کیا ہے۔ چنانچہ جن صوبہ جات و ممالک کا اس سلسلے میں انہوں نے نام لیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، واسطہ، موصل، جزیرہ، رقعہ،
 نصیبین، دمشق، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز،
 کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، مہاوند، لیس، وامنان،
 قوس، طبرستان، ہرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، مرو، بخارا، ترقند،
 کش، صغائیاں، ترمذ، بلخ، ہرات، قہستان، بختان، رم، خوارزم،
 حافظ الدین بن البرکات کوردی نے ان امکان کے جن خاص خاص تلامذہ کا تذکرہ زیر عنوان
 من ردی عنہ الحدیث والفقہ ما شرقا وغربا بلداً بلداً لہ
 لکھا ہے ان کی تعداد سات سو تیس مشاہیر علمائے ہیں۔

علامہ ابن النذیم نے الفہرست میں اسی بہتات کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔
 اعلم بمرآۃ البیاض فی الفہرست ما بعد اوقر با تدوینہ رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ۔ لہ

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دوسری صدی کے نصف ثانی میں امام اعظم کے تلامذہ
 اسلامی دنیا کے چیمہ چیمہ پر پھیل چکے تھے اور ہر جگہ علم کی اشاعت میں مصروف تھے۔ زندگی
 کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہ تھا جہاں ان کا پرچم نہ لہراتا ہو۔ اقتدار حکومت سے مدرسوں اور
 خانقاہوں تک ان ہی کا پھر لپٹا رہا تھا۔ بلکہ بہتوں کے لیے ان کی یہ مقبولیت اور برگزشتہ
 حیات پر قبضہ سامان رشک بنا ہوا تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان شہروں میں
 آپ نے مرو کا نام پڑھا ہے۔ یہاں عرصہ سے فقہ حنفی کی حکمرانی تھی اور امام اعظم کے
 تلامذہ کی ایک بڑی جماعت یہاں قضا، افتاء اور تدریس میں مشغول تھی۔ علامہ نصر بن شہیل
 جب بصرہ سے مامون کی علمی قدردانیوں کی شہرت سن کر یہاں آئے تو امام اعظم کے علوم

کی یہ قبولیت عام اور اشاعت عام دیکھ نہ سکے اور کچھ نو عمر محدثین کو اپنے ساتھ ملا کر امام اعظم کے علوم کے خلاف ایک منظم اسکیم بنالی۔ چنانچہ صدر الامتہ نے بہ سند لکھا ہے کہ فتح بن عمر کہتے ہیں :

نضر بن شمیل جس زمانے میں مرو میں مقیم تھے میں وہیں تھا۔ انہوں نے امام اعظم کی کتابوں کو آب رواں میں بھیج کر دھونا شروع کیا۔ خالد بن صبیح نے جو ان دنوں مرو کے قاضی تھے یہ کہانی سنی۔ تو وہ خود اور خالوادہ صبیح کے دیگر افراد فضل بن سہل کے پاس پہنچے۔ یہ مامون کا وزیر اعظم تھا۔ وراق کہتے ہیں کہ اس زمانے میں خالوادہ صبیح میں پچاس یا اس سے بھی زیادہ ایسے علما موجود تھے جو عدلیہ میں کام کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ خالد کے ساتھ ابراہیم بن رستم اور سہل بن مزاحم بھی تھے ان سب حضرات نے اگر فضل بن سہل کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ فضل نے واقعہ سن کر جواب دیا کہ میں اس وقت تک اس مخاطبے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک کہ صورت واقعہ کو خلیفہ کے رو بہ و پیش نہ کر دوں۔ یہ کہہ کر فضل مامون الرشید کے پاس گیا اور اسے سارے واقعہ سے آگاہ کیا۔ مامون نے فریقین کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فضل نے بتایا کہ یہ نوخیز تو اسحاق بن راہویہ اور احمد بن زہیر ہیں مگر نضر بن شمیل ان کے ساتھ ہیں اور دوسرے خالد بن صبیح، سہل بن مزاحم اور ابراہیم بن رستم ہیں۔ مامون نے دوسرے روز دونوں کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ اسحاق اور ان کے ساتھیوں کو مامون کی گفتگو معلوم ہوئی تو اسحاق بن راہویہ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ مامون سے گفتگو کون کرے گا۔ آخر مشورے سے یہ طے پایا کہ احمد بن زہیر مامون سے گفتگو کریں۔ چنانچہ دوسرے روز دربار میں حاضری ہوئی۔ مامون نے آتے ہی سلام کیا اور نضر بن شمیل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ امام ابو حنیفہ کی کتابوں کے متعلق آپ

لوگوں نے یہ کیا رویہ اختیار کیا ہے؟ نصرت تو خاموش رہے مگر احمد بن زہیر
 بولے کہ امیر المومنین اگر اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔ مامون نے
 کہا ہاں فرمائیے وہ بولے امیر المومنین اب ہم نے ان کی کتابوں کو کتاب اللہ و
 سنت کے خلاف پایا ہے۔ مامون نے کہا کتاب و سنت کے خلاف
 کیسے؟ آنا کہہ کر خالد بن صلیح سے ایک مسئلہ دریافت کیا کہ اس کے بارے
 میں ابو حنیفہ نے کیا کہا ہے؟ خالد نے امام موصوف کے قول کے مطابق
 فتویٰ بتایا۔ احمد بن زہیر اس کے خلاف روایت بیان کر سنے لگے
 مگر مامون نے امام ابو حنیفہ کی تائید میں وہ احادیث پیش کیں جو
 ان لوگوں کے علم میں نہ تھیں۔ آخر میں مامون نے کہا کہ لمو و جدناھا
 مخالفاً لکتاب اللہ و سنتہ رسولہ ما استعملناہ اگر ہم ان کو
 کتاب و سنت کے خلاف پاتے تو ان پر عمل کرانے کے خواہش مند
 ہی کیوں ہوتے۔ خبردار اب آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ اگر نصرت مکمل
 تم میں نہ ہوتے تو میں تم کو ایسی منراویتا کہ یاد رکھتے رہے

الغرض امام اعظم کے تلامذہ کی ہمہ رسی دیکھی نہ جاسکی۔ ان تلامذہ میں ایسی گرامی قدر شخصیتیں
 ہیں جو اپنے وقت میں نہ صرف حافظ حدیث بلکہ علم حدیث کے آفتاب ہوتے۔ ان کا دائرہ
 اگرچہ بہت وسیع ہے مگر ہم یہاں صرف تقریب کی خاطر چند کاتعارف بطور گلزار
 لکھتے ہیں۔

الحافظ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابی حنیفہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ابوسعید
 کنیت اور کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ الخطیب نے امام علی بن المدینی کے حوالہ سے ان کے بارے
 میں یہ انکشاف کیا ہے کہ

حدیث میں روایت و اسناد کے سارے سلاسل کا محور صرف چھ بزرگ

ہیں۔ ان کے نام بتائے ان کے بعد ان چھ بزرگوں کا علم ارباب تصنیف کے حصے میں آیا ہے۔ بعد ازیں ان ارباب تصنیف کا سارا علم دو یحییٰ نامی شخصیتوں میں سمٹ کر آیا ہے۔ اول یحییٰ بن زکریا۔ دوم یحییٰ بن سعید۔ ۱۷

اور یہ بھی امام علی بن المدینی کا تاثر ہے کہ:

زمانہ ابن عباس میں علم ابن عباس پر زمانہ شعبی میں شعبی پر اور زمانہ ثوری میں ثوری پر اور زمانہ یحییٰ میں یحییٰ پر ختم ہے ۱۸
صاحب تصانیف بزرگ ہیں۔ حافظ ذہبی نے تو صرف اس قدر بتایا ہے کہ ان امام صاحب التصانیف لیکن ابن ابی حاتم کا کہنا ہے کہ کوفہ میں کتابوں کے سب سے پہلے مصنف یہی ہیں خطیب بغدادی نے بھی یہی لکھا ہے کہ

انہ اول من صنف الکتاب فی الکوفۃ وکان یعد فی فقہا
محدثی الکوفۃ۔

لیکن بات ابھی ناقص اور اوصوری ہے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے اس کی پوری وضاحت فرمائی ہے وہ بسند متصل اسد بن الفرات سے ناقل ہیں کہ

امام عظیم ابو حنیفہ کے وہ تلامذہ جنہوں نے تدوین کتب کا کام کیا ہے ان کی تعداد چالیس ہے۔ ان دس حضرات میں جو ان تمام میں اولین صف کے سمجھے جاتے تھے امام ابو یوسف، امام زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد اور یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہیں۔ اور یحییٰ کے سپرد لکھنے کا کام تھا اور یحییٰ تیس سال تک اس مجلس میں لکھنے کا کام کرتے رہے ۱۹

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ یحییٰ بن زکریا نے تدوین کا یہ کام پورے تیس سال امام اعظم کی نگرانی میں کیا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ یحییٰ کا تصنیفی کارنامہ ہے کیونکہ

۱۷ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۱۱۵۔ ۱۸ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۴۔

۱۹ الجواہر المصنیۃ ج ۲ ص ۲۶۲۔

وہ کتابت کا کام کرتے تھے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ یحییٰ کا کارنامہ نہیں بلکہ امام اعظم کا تصنیفی کارنامہ ہے۔ یحییٰ تو صرف کتابت کا کام کرتے تھے کتابت تھی ہٹا پر بعد کو محدثین نے یحییٰ کی طرف نسبت کر دیا۔ امام اعظم کے یہاں تصنیف کا طرز یہی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو املا کر یا کرتے تھے اور تعلیم و تصنیف کا سارا کام زبانی تھا۔ چنانچہ حافظ قاسم بن فطوہ بغدادی نے منیۃ الالمعی میں تصریح کی ہے :

ان المتقدمین من علمائنا كانوا يلغون المسائل الفقهية و
ادلّتها من الاحادیث النبویة باسانیدهم۔

ہمارے علمائے متقدمین مسائل اور ان کے دلائل کا احادیث نبویہ سے
اپنی اسانید کے ساتھ املا کرتے تھے۔

حال کے غیر مسلم محققین میں سے ڈاکٹر فلیپ سٹی نے بھی یہی انکشاف کیا ہے :

قد رها أبو حنيفة في الكوفة وبغداد وتوفي سنة ۶۴۰ و كان
قد احترف التجارة ثم مال عنها الى الفقه فاصبح اعظم
علمائهم في الاسلام وقد افضى بتعاليمه تلمذها للتلاميذ
أبو حنيفة كوفه ودر بغداد میں پروان چڑھے۔ شہید ہیں وفات پائی
پہلے کاروبار کرتے تھے پھر شرائع کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلام
کے علمائے عظیم ترین شخصیت بن کر سامنے آئے۔ آپ نے اپنی
تعلیمات کو اپنے تلامیذ تک زبانی پہنچایا ہے۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اسی زمانے میں امام اعظم نے اختلاف
الصحابہ، کتاب السیر، کتاب الآثار جیسی کتابیں اپنے شاگردوں کو املا کرائی ہیں۔ ان کے
اولین کاتب یحییٰ ہیں۔ بعد میں یہی کتابیں ان کے شاگردوں سے موسوم ہو گئی ہیں مثلاً
کتاب السیر امام حسن بن زیاد، کتاب السیر امام محمد وغیرہ وغیرہ۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن وکیع
بن الجراح کا نام لے کر تو خطیب بغدادی نے علانیہ اور برملا لکھ دیا ہے کہ :
وکیع انما صنف کتبہ علی کتب یحییٰ بن ابی زائدہ۔

یہی بن زکریا کے سامنے جن ائمہ حدیث نے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان میں امام احمد، ابراہیم بن موسیٰ، ابوالکریب اور زیاد بن ایوب کا نام لیا ہے لیکن حافظ ابوبکر الخطیب نے یہی بن آدم، قتیبہ بن سعید، ہناد بن السری، محمد بن عیسیٰ، یہی بن معین، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ اور مسریح بن یونس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ

كان على قضاء المدائن وبعد من حفاظ الكوفيين للحدیث
مفتيا مبتدا۔

مدائن کے قاضی تھے اور ان کا شمار کوفہ کے حفاظ حدیث میں ہے۔
ان کی جلالت علمی کا اندازہ کرنا ہو تو یہی بن سعید القطان کا وہ بیان پڑھیے جو حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ :

سائے کوفہ میں مجھے یہی بن زکریا سے زیادہ اپنی مخالفت کا کسی سے
اندیشہ نہ تھا۔

ارباب صحاح نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ اور بمقام مدائن بعمر ۶۳ سال وفات پائی ہے

امام ابو عبد الرحمن المقرئ

عبد الرحمن بن یزید نام ابو عبد الرحمن کنیت اور المقرئ لقب ہے۔ ۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ علم قرأت میں امام نافع کے شاگرد ہیں۔ حدیث میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی رقمطراز ہیں :

سمع من عون و ابی حنیفة۔

بصرے میں ۳۶ سال اور مکہ معظمہ میں ۳۵ سال قرآن پڑھایا ہے اسی لیے مقرئ کر کے مشہور ہیں۔ حدیث کی ساری کتابوں میں ان کی روایات ہیں۔

حافظ ابوبکر الخطیب نے بسند متصل ان کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ :

بشیر بن موسیٰ کا بیان ہے کہ امام ابو عبد الرحمن المقرئ ہم سے
حدیثیں روایت کرتے تھے لیکن جب امام موصوف امام اعظم ابو حنیفہ

کے حوالہ سے روایات پیش فرماتے تو ان کا دستور یہ تھا کہ تعبیر کا
پیرایہ یہ اختیار فرماتے تھے کہ حدیثنا شاہنشاہ یعنی محدثین
کے ملک معظم نے ہم سے بیان کیا ہے

حافظ وہبی نے تذکرہ میں ان کے حوالہ سے بسند متصل ایک حدیث روایت کی ہے جس میں نہ
صرف ان کو امام اعظم کا شاگرد ظاہر کیا ہے بلکہ بتایا ہے کہ قطیعیات میں یہ سند عالی ہے چنانچہ
فرماتے ہیں :

انبا ابی قدامۃ اخبرنا ابن طبرزدانا ابو غالب
بن البنادرانا ابو محمد الجوهری انا ابو بکر القطیعی نابشر
بن موسیٰ انا ابو عبد الرحمن المقرئ عن ابی حنیفہ
عن عطاء عن جابر انہ سارہ یصلی فی قمیص خفیف لیس
علیہ ازار ولا رداء - قال ولا اظنہ صلی فیہ
الا لیرینا انہ لا یاس بالصلوۃ فی الثوب الواحد

ابن ابی حاتم کا منالطہ

کتاب الجرح والتعديل میں امام مقرئ کے ترجمہ میں امام مقرئ کا ایک ایسا بیان درج کیا
ہے جو نہ صرف امام مقرئ کی نشان جلالت کے خلاف ہے بلکہ تاریخی طور پر ثابت بھی نہیں ہے
لکھتے ہیں کہ ابو عبد الرحمن مقرئ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو حنیفہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور جب
احادیث کے بیان سے فارغ ہو جاتے تو معاذ اللہ تم معاذ اللہ یوں فرماتے ہذا المذی
سمعتہ کلہ، رایج و باطل۔ یعنی تم نے مجھ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوارشادات
سنے ہیں وہ ہوائی اور باطل ہیں۔ بیان کی رکاکت ہی تبارہی ہے کہ ذہنوں نے امام اعظم
کی نشان محدثانہ سے مرعوب ہو کر یہ افسانہ تراشا ہے۔ امام اعظم تو امام ہیں ایک فاسق سے
فاسق تر مسلمان کی زبان پر بھی ارشادات نہرت بنا کر یہ کلمات نہیں آتے۔ ایسے ذرا تاریخی
طور پر بھی اس کا تجزیہ کر لیجئے اور دیکھئے کہ اس کی روایتی پوزیشن کیا ہے۔

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ مجھے ابراہیم الجوزجانی نے ایک خط میں امام ابو عبد الرحمن کا یہ بیان لکھا ہے۔

کیا ابراہیم الجوزجانی نے خود یہ بیان امام مرقی سے سنا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے یعنی ان کو کسی نے بتایا ہے۔ یہ بتانے والا کون ہے؟ جوزجانی نے اس کا نام نہیں بتایا۔ سند کا یہ انقطاع ہی زبان حال سے بول رہا ہے کہ کسی نے نہیں بتایا ہے بلکہ یاروں کا بنایا ہوا افسانہ ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے؟ آپ مانیں یا نہ مانیں یہ خود ابراہیم جوزجانی کے ہاتھوں کی صفائی ہے کہ نکمہ اسماعیل بن ابان کہتے ہیں کہ جوزجانی حق سے منحرف اور رد گردان تھے اور نا صبی مذہب رکھتے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام حبان فرماتے ہیں کہ جوزجانی ضروری تھے یعنی حضرت علی کے مخالف تھے۔ حافظ صاحب نے ہی تہذیب میں واقعہ لکھا ہے کہ ان سے دروازے پر ایک بار محدثین کا مجمع تھا۔ جوزجانی کی کینز چوڑہ باہر لے کر آئی کہ اسے کوئی ذبح کر دے مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان کے تمام شاگردوں میں کسی کو اسلامی زندگی برتنے کا اتنا بھی سلیقہ نہ تھا کہ کوئی چوڑہ ہی ذبح کر دے۔ کینز نے جوزجانی کو صورت حال سے آگاہ کیا تو بولے واہ آج چوڑہ کو ذبح کرنے والا کوئی نہیں ہے ابک وقت وہ تھا کہ علی مرتضیٰ صرف چاشت کے وقت میں بیس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو ذبح کر دیتے تھے۔ لاجول دلا فتوة الا باللہ

اسی بنا پر حافظ صاحب نے جوزجانی کا نام لے کر صاف لکھ دیا ہے کہ

اما الجوزجانی فلا عبرة بحطه على الكوفيين

اور صرف تہذیب میں نہیں بلکہ لسان المیزان میں اس موضوع پر ایک فصل قائم کی ہے اور یہ بات کھول کر بتاتی ہے کہ کوفہ والوں کے بارے میں جوزجانی کے جارحانہ اقدامات ناقابل برداشت ہیں :

المحاذق اذا تامل ثلب ابی اسحاق الجوزجانی وای العجب وذالک
لشدۃ الخرافۃ فی النصب۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ کون ہے جن کے دامن تقدس پر جوڑ جانی کے لگائے ہوئے دھبے نہیں
 ہیں۔ امام ائمہ، امام ابو نعیم اور عبید اللہ بن موسیٰ یار تہ کو مختصر کر کے فرماتے ہیں کہ اس کی
 چیرہ دستیوں سے اساطین حدیث اور ارکان روایہ نالال ہیں۔ اس بنا پر اگر جوڑ جانی
 نے امام اعظم کے خلاف یہ بے پر کی اڑائی ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں بلکہ میں حافظ عسقلانی
 سے ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ — آپ اس شخص کی زبان قلم سے، دامن امامت کی
 حفاظت چاہتے ہیں جس کی زبان دہن سے دامن خلافت محفوظ نہیں ہے۔ فانا للہ والی
 اللہ المشتکی۔ حیرت جوڑ جانی پر نہیں بلکہ ان کی سادہ لوحی پر ہے جو جانتے بوجھتے اس قسم
 کی من گھڑت کہانیوں کو بلا تنقید نقل کر جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں سے ابو حنیفہ
 کے فضل اور علم کو دیکھا نہیں گیا ہے۔ سینوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی جب کتابیں
 خورد برد کرنے کی سازش میں ناکامی ہوئی تو اس راہ سے دل کی بھڑاس نکالنے میں لگ
 گئے۔ عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ لوگ امام اعظم کے متعلق صرف ازراہ حسد چہ میگوئیاں
 کرتے ہیں، حافظ ابن ابی داؤد محدث کہتے ہیں کہ امام اعظم کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے والے دو ہی قسم کے
 ہیں حاسد اور ناواقف، میرے نزدیک ناواقف دونوں میں غنیمت ہے، ناواقفیت کا ایک اقدار بھی سن لیجئے،
 عبد اللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ میں شام میں امام اوزاعی کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔
 انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی ہے جس کی کفایت ابو حنیفہ
 ہے۔ یہ سن کر میں گھرواپس آیا اور امام اعظم کی کتاب سے کچھ مسائل کا انتخاب کیا۔ تیسرے روز
 کتاب ہاتھ میں لے کر اوزاعی کی خدمت میں حاضر ہوا امام اوزاعی مسجد میں تھے۔ دریافت کیا
 کہ یہ کیا کتاب ہے؟ میں نے ان کو کتاب دے دی اس میں وہ مسئلے بھی ان کی نظر سے
 گزرے جن کی پیشانی پر میں نے لکھ دیا تھا کہ نعمان اس کے متعلق یوں فرماتے ہیں۔ لکھا
 ہے کہ اوزاعی نے اذان دے کر کھڑے کھڑے نماز سے پہلے جب کتاب کا ابتدائی حصہ دیکھ لیا
 تو کتاب رکھ دی اور نماز سے فراغت کے بعد کتاب کا پھر مطالعہ کیا تا آنکہ کتاب ختم کر دی۔
 پھر مجھ سے دریافت کیا اے خراسانی یہ نعمان کون ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ایک بزرگ
 ہیں میری ان سے عراقی میں ملاقات ہوئی ہے۔ فرمایا یہ تو بڑے پائے کے بزرگ ہیں

جاؤ ان سے ملو اور علم حاصل کرو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو وہی ابو حنیفہ ہیں جن کے پاس جانے سے مجھے آپ روکتے تھے۔ لے

بہر حال امام ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن یزید المقرئ امام اعظم کے حدیث میں تلامذہ میں سے ہیں اور بعد کے محدثین کے بالواسطہ یا بلا واسطہ اسناد میں حتیٰ کہ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ حدیث کی کوئی کتاب بھی ان کی روایات سے خالی نہیں ہے۔ امام عبد اللہ بن المبارک ان کی امانت، ثقاہت، عدالت اور دیانت کو کھرے سونے سے تعبیر کرتے تھے۔ لے

امام عبد اللہ بن المبارک

حافظ جمال الدین المزنی نے تہذیب الکمال میں، حافظ ذہبی نے مناقب میں، حافظ جلال الدین السیوطی نے تبصیر الصغیرہ میں اور امام بخاری نے تاریخ میں عبد اللہ بن المبارک کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔

عبد اللہ بن المبارک کی جلالتِ قدر کا اندازہ کرنا ہو تو امام الحسن بن علیسی کا یہ بیان پڑھیے وہ فرماتے ہیں کہ

عبد اللہ بن المبارک کے تلامذہ نے ایک میٹنگ اس ارادے سے منعقد کی کہ امام موصوف کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ جن خوبیوں پر سب کا اتفاق ہوا یہ تھیں۔ فقہ، ادب، سخن، لغت، زہد، شجاعت، شعر، فصاحت، قیامِ لیل، حج، جہاد فی سبیل اللہ، گھوڑے کی سواری، ترکِ مالا یعنی، انصاف، رفقائے کم اختلاف۔ یہ سب خوبیاں آپ کی ذاتِ گرامی میں جمع ہیں۔ لے

حافظ ذہبی نے بتایا ہے کہ امام بخاری نے پچھنے میں عبد اللہ کی کتابوں کو ازبر کر لیا تھا۔ لیکن حافظ ابن حجر نے مقدمہ میں سولہ سال کی قید لگائی ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن المبارک کے سامنے ایک بار امام اعظم کا تذکرہ ہوا فرمایا اس شخص کے بارے میں کیا کہا جاتے جس کے سامنے دنیا و داس کا پورا سرمایہ آیا مگر اس نے لات مار دی۔ کورے کھائے

تکلیفیں برداشت کیں مگر اس چیز کو ہرگز قبول نہیں کیا جس کے لیے اس وقت لوگ تمنائیں کر رہے تھے اور درخواستیں لیے پھر رہے تھے۔

امام ابن المبارک فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے زیادہ پارسا کوئی نہیں دیکھا ہے اور ایک نظم میں جو انہوں نے امام اعظم کی شان میں لکھی ہے امام اعظم کی محدثانہ شان کو سراہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام ابن المبارک کے قلب میں امام اعظم کا کیا مقام تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

روى اثاره فاجاب فيها كطيران الصقور من المنيفه
انہوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلند پروازی دکھائی جیسے شکاری
پرندے بلند مقام سے اڑ رہے ہوں۔

ولم يكن له بالعراق نظير ولا بالمشرقين ولا بالكو فتيه
عراق میں ان کی کوئی مثال تھی نہ مشرق و مغرب اور نہ کوفہ میں
امام اعظم کے فقہ کے بارے میں عبد اللہ بن المبارک کا جو تاثر حافظ عبد القادر نے سوید بن
نصر کے حوالہ سے لکھا ہے اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو لوگوں کو فقہ ابی حنیفہ کے
بارے میں عبد اللہ کی طرف منسوب کر کے افسانے سناتے رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

لا تقولوا لى ابى حنيفه ولكن قولوا انه تفسيرا لمحدث

اسے ابو حنیفہ کی رائے نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ یہ حدیث کی تفسیر ہے۔

اور یہ بھی عبد اللہ بن المبارک ہی کا کہنا ہے کہ حدیث سے چمٹ جاؤ اور حدیث کی خاطر
امام اعظم سے کیوں؟ اس کی وجہ بھی خود عبد اللہ بن المبارک کی زبانی سنئے۔

بحرف تاويل الحديث ومعناه

اور خود ابن المبارک کا اپنی ذاتی تربیت کے بارے میں امام اعظم کے متعلق تاثر یہ تھا کہ

لو لا ان الله اعاننى باقى حنيفه وسفيان كنت بدعيًا

امام ابو حنیفہ کے علوم سے پورے طور پر میرا بھونے کے بعد سفیان ثوری سے شرفیلا

حاصل کیا ہے۔ امام ذہبی نے بسند متصل نقل کیا ہے کہ
 ما لم ت سفیان حتی جعلت علم ابی حنیفۃ بکذا
 و اشار بقبض یدہ -

میں سفیان کے پاس اس وقت گیا جب میں نے ابو حنیفہ کے علم
 کو پورے طور پر سمیٹ لیا ہے
 ان کے زہد و تقویٰ اور پارسائی کا عالم یہ تھا کہ مشہور محدث سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ
 میں نے صحابہ اور عبد اللہ بن المبارک دونوں کے حالات کا مطالعہ
 کیا مجھے صحابہ میں عبد اللہ سے زائد صرف دو چیزیں معلوم ہوتی ہیں
 ایک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اور دوسرے
 عزوات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت ہے
 امام اعظم نے ان سے ان کی زہدانہ زندگی کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا کہ ایک روز
 میں اپنے بھائیوں کے ہمراہ ایک باغ میں تھا۔ رات تک سارا وقت کھانے پینے میں گزر گیا۔
 میں اس زمانے میں گانے بجانے کا بہت دلدادہ تھا۔ سحری کے وقت میں سو رہا تھا کہ
 میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ درخت پر بیٹھا ہوا ایک پرندہ کہہ رہا ہے -
 السمان الذین امنوا ان تخشع قلوبہم لذلک اللہ و

ما نزل من الحق -

میں نے اس سوال پر ہاں کہہ کر جواب دیا۔ آنکھ کھل گئی باجے وغیرہ توڑ کر نذر آتش کر دیے
 یہ میری زہدانہ زندگی کا روزِ اول ہے
 ان علوم کا منبع تو آپ ان کی زبانی سن چکے ہیں۔ کہ میں نے امام ابو حنیفہ کے علم کو پورے طور
 پر سمیٹ لیا تھا۔ آئیے اب ان کی اس علم پر مشتمل تصانیف کا حال بھی سن لیجئے۔ یہ آپ
 پہلے پڑھ چکے ہیں کہ امام بخاری نے سولہ سال کچھ عمر میں ان کی کتابوں کو زبانی یاد کیا تھا علمی
 طور پر ان کتابوں کا کیا مقام تھا اور ان میں کس قسم کے مسائل تھے۔ مشہور محدث یحییٰ بن آدم
 سے خطیب بغدادی نے بسند متصل نقل کیا ہے کہ :

جب میں دقیق مسائل کی تلاش میں ہوتا اور مجھے عبداللہ بن المبارک کی

کتابوں میں بھی نہ ملتے تو میں مایوس ہو جاتا۔

ان کی کتابوں میں حدیثوں کی تعداد کس قدر تھی؟ حافظ ذہبی نے یحییٰ بن معین کی زبانی بتایا:

ان کی کتابیں تقریباً بیس ہزار حدیثوں پر مشتمل تھیں۔

یتیم فی الحدیث کا مطلب

بزرگوں نے ان کو بھی معاف نہیں کیا اور امام اعظم کے متعلق ان کے مُنہ سے نکلے ہوئے اچھے بول کو غلط معنے پہنا کر ہنر کو عیب بنا دیا۔ بعد کو ہی کہیں بلکہ ان کی زندگی میں بھی ابو حنیفہ کے بارے میں ان کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لوگ غلط معنے پہنانے کی کوشش کرتے تھے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے حماد بن احمد مروزی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

میں نے ایک بار عبداللہ بن المبارک کو یہ کہتے سنا کہ

کان ابو حنیفۃ ایۃ

ایک شخص بول پڑا اے ابو عبد الرحمن! یہ بتائیے کہ آیت کس میں تھی
مشرقی یا غیر میں۔ عبداللہ بن المبارک نے فوراً ڈانٹ کر کہا کہ خاموش
رہو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ آیت کا لفظ خیر ہی کے لیے آتا ہے شر کے
لیے آیت نہیں غایت آتا ہے یوں بولا جاتا ہے ایۃ فی الخیر
اور غایۃ فی الشر اور بعد ازیں قرآن کی یہ آیت تلاوت کی —

و جعلنا ابن مریم و امّہ ایۃ

جیسے اس شخص نے عبداللہ کے مُنہ سے نکلے ہوئے اچھے فقرے کو جس میں وہ امام اعظم کو
اللہ ہی نہ کی نشانی بتا رہے تھے عبداللہ ہی کے سامنے غلط معنے پہنائے ٹھیک اسی طرح عبداللہ
ہی کے مُنہ سے نکلے ہوئے اچھے بول کان ابو حنیفۃ یتیم فی الحدیث کو یار لوگوں نے ایسے
معنے پہنائے جس سے ان کا جی تو خوش ہوا ہو گا لیکن متکلم کی رُوح تڑپ کر رہ گئی ہو گی اور

اسی پر بس نہیں بلکہ روایت بھی بالمعنی شروع کر دی کہیں یتیم کہیں مسکین روایت کیا خطیب بغدادی اور محمد بن نصر مروزی کی روایت میں یتیم آیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے الجرح والتعديل میں یتیم کی جگہ مسکین لکھا ہے اور ابن عبد البر نے جو روایت بحوالہ ابوالموجہ پیش کی ہے اس میں نہ یتیم ہے نہ مسکین بلکہ یتیم آیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب بات نہ بنی تو اسے بنانے کی دوبارہ کوشش میں روایت میں تیرنگی آگئی ہے اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ جن راہوں سے یہ روایت گزر کر آئی ہے اور جن جن سندوں اور طرق سے عبد اللہ بن المبارک کا یہ بیان آیا ہے ان میں کوئی طریق بھی ایسا نہیں جسے صحیح کہہ دیا جاسکے لیکن اگر ہم روایت کا محدثانہ نقطہ نظر سے پوسٹ مارٹم نہ کریں اور مان لیں کہ واقعی حضرت عبد اللہ نے یہ بات فرمائی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اسے غلط معنی پہنا کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ امام اعظم کو حدیث نہ آئی تھی کیونکہ غلط یتیم دو معنی میں استعمال ہوتا ہے ایک لغوی اور دوسرے محدثین کے اصطلاحی۔

لغت میں یتیم کے معنی صاحبِ قلموس نے یگانہ اور نادر کے لکھے ہیں الیتیم الفرد وکل شیء یغیر نظیرہ۔ یگانہ اور ہر ایسی چیز جو نادر المثال ہو۔ زمر شری رقمطراز ہیں کہ درجۃ یتیمہ یتیم اور حرمتہ یتیمہ کے محاورات بے مثال اور نادر الوجود کے لیے بولے جاتے ہیں۔ پچو بے باب کے ہو کر فروہ جاتا ہے اس لیے وہ یتیم کہلاتا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ امام اعظم حدیث میں نادرۃ الدہر اور عظیم النظم شخصیت ہیں اور اسے بھی یہ بات ٹھیک۔ عبد اللہ بن المبارک کے دوسرے بیان بھی اس کے مؤید ہیں۔

اصطلاح محدثین میں یتیم وہ شخص کہلاتا ہے جو ایک حدیث کو کم از کم ایک سو سندوں سے روایت نہ کرے چنانچہ مشہور محدث ابراہیم بن سعید جو ہری کہتے ہیں۔

کل حدیث لم یکن عندی من مائة وجه فانافیه یتیم۔

جو حدیث مجھے سو سندوں سے نہ ملے تو میں اس میں اپنے کو یتیم سمجھتا ہوں۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے بھی یہی بات الروض الباسم میں نقل کی ہے۔ اگر اس معنی کے لحاظ سے امام اعظم حدیث میں یتیم ہیں تو یہ بات نہ امام اعظم کے لیے

قدح ہے اور نہ کسی کے لیے قابلِ مدح ہے۔ امام اعظم کا زمانہ اکثر طرق کا زمانہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے تو سائے تابعین اور سائے صحابہ حدیث میں یتیم ہیں کیونکہ صحابہ اور تابعین میں کسی کو بھی کوئی ارشاد نبوت سو سو طرق سے معلوم نہ تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی حدیث تو دراصل نام ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور آداب و احوال کا۔ نہ کہ اکثر طرق کا۔ اسلام کی زندگی میں مسائل کے لیے ضرورت کی چیز حدیث ہے نہ کہ طرق۔ اور امام اعظم کو یہ چیز بخوبی حاصل تھی جیسا کہ آپ سن آئے ہیں کہ امام اعظم چار ہزار احادیث روایت کرتے تھے اور یہ بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ احادیث احکام کی کل تعداد بھی چار ہزار ہی ہے یہی تعداد بعد کو فن پیدا ہونے پر محدثین کے زمانے میں تیسری صدی میں چار ہزار سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔

اس فن کے مشہور محدث اسرائیل اس موقع پر بڑے پتے کی بات فرما گئے کہ
نعمان کیا ہی مرے دارِ شخص تھے فقہ سے متعلق ہر حدیث ان کو
خوب یاد تھی اس کی ان کو بے حد جستجو تھی اور اس میں جو کچھ فقہ ہوتا
اس کے خوب ہی عالم تھے انہوں نے حماد سے حدیثیں یاد کی تھیں
اور خوب یاد کی تھیں اس لیے ان کی خلفاء، امراء اور وزراء سب
عزت کرتے تھے۔

بہر حال عبداللہ بن المبارک امام اعظم کے تلامذہ ہیں سے تھے بعد کے تمام محدثین ان سے
مشرق تلامذہ رکھتے ہیں۔ امام احمد کے خاص اساتذہ میں سے ہیں اور یہی وہ مثالی شخصیت ہے
جو زہد و تقویٰ میں امام اعظم سے پوری پوری مشابہت رکھتی تھی۔ جو دوزخ، تھوڑی پونجی
پر گزر بسر کرنا، بادشاہوں اور اربابِ اقتدار سے دور رہنا، دین کو اپنے رزق کے لیے راہ نہ
بنانا، دین کے معاملات میں پستی اور دنائت کا اظہار نہ کرنا۔ یہ تمام باتیں عبداللہ بن المبارک کی
ذات گرامی میں پائی جاتی تھیں رحمہ اللہ تعالیٰ۔

الامام ابراہیم بن طہمان

حافظ ذہبی نے ان کا حفاظِ حدیث کے پانچویں طبقے میں ذکر کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے کبار

تلامذہ میں سے تھے۔ اور ان کے فخر کے لیے یہ کافی ہے کہ خود امام اعظم نے استاد ہونے کے باوجود ان سے روایت لی ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے۔

حدث عنه من شیوخہ صفوان بن سلیم و ابو حنیفۃ

الامام یحییٰ

محدثین کے عرف میں اس قسم کی روایات کو روایت الاکابر عن الاصاغر کہتے ہیں۔ اور ایک محدث کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سے بالا اور کمتر اور اپنے جیسوں سے روایت کرے۔ علامہ ترمذی نے محدثین کبار کا فیصلہ لکھا ہے کہ

لا یكون محدثا حتی یاخذ عن فوقہ ومثلہ ودونہ

محدث ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے سے برتر، کمتر اور مثیل

سے روایت لے سکے

اور اسی بنا پر محدثین نے اس کی عظمت نشان اور جلالت قدر کا اقرار کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

ذو عہم تدعو الیہ الہم العالیۃ والافس

الذکیۃ۔

بہر حال امام اعظم نے استاد ہونے کے باوجود ابراہیم بن طہمان سے روایت لی ہے ابراہیم کی جلالت قدر کا اندازہ ان کے تلامذہ سے ہو سکتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں ابو بکر الخطیب نے عبد اللہ بن المبارک، سفیان بن عیینہ، خالد بن نزار، وکیع بن الجراح، عبد الرحمن بن مہدی، ابو عامر العقدری، محمد بن سابق، یحییٰ بن ابی بکر کا نام لیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الامام کے لقب سے نوازا ہے۔ مشہور محدث اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم کی حدیث میں ثقاہت مسلم سے ہمیشہ سے ائمہ ان کی حدیثوں کے خواہاں رہے ہیں اور سب نے ان کی ثقاہت کی منادی کی ہے۔

افسوس ہے کہ ایسا باکمال اور بلند پایہ محدث بھی اربابِ ظواہر کی فرقہ وارانہ چشمک سے بچ نہ سکا۔ چونکہ امام اعظم کے شاگرد تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ ایمان و عمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے اس بنا پر بزرگوں نے ان پر بھی مرتبہ ہونے کی

تہمت لگا دی۔ یہاں بھی نعیم بن حماد اور ابوالسحاق الجوزہانی نے اپنی جہولانی طبع کا ان کو نشانہ بنایا۔
لیکن ان کو پھر بالآخر منہ کی کھانی پڑی۔ اور حافظ ذہبی کو کہنا پڑا۔

فلا عبرة بقول مضعف

اس فرعونہ کے خلاف تمام ارباب صحاح ان کی حدیث سے احتجاج پر متفق ہیں اور مشہور محدث
اقرار کرتے ہیں کہ:

انه حسن الحديث يميل شيئا الى الارجاع في الايمان حبيب الله

حديثه الى الناس له

دراکٹر جاتیے اور میل تیسٹا الی الارجاع فی الایمان کی حقیقت بھی گوش گزار فرما لیجئے۔
خدا بھلا کرے محدث خطیب بغدادی کا کہ وہ اس مقام پر ارجاع کی حقیقت ابوالصلت کے حوالہ
سے یہ کہہ کر بے نقاب کر گئے۔

قال علی:- قال ابوالصلت لم یکن ارجاعا هم هذا المذهب
الجنیث ان الايمان قول بلا عمل وان ترك العمل لا یضر
بالايمان بل كان ارجاعا هم انهم كانوا يرجون لابل
الكبار الفقراء ردًا علی الخوارج و غیرهم الذین یكفرون
الناس بالذنوب فكانوا يرجون ولا یكفرون بالذنوب
و نحن كذا اللث

ان کا ارجاع یہ مذہب جنیث نہ تھا کہ ایمان قول بغیر عمل ہے اور
ترک عمل سے کچھ نہیں بگڑتا ہے بلکہ ان کا ارجاع تو صرف یہ تھا کہ
وہ گنہ گاروں کے لیے اُمیدوار مغفرت تھے وہ خوارج کی تردید
کرتے تھے جو لوگوں کو صرف گناہ کی پاداش میں دائرۃ اسلام سے
نکال دیتے ہیں وہ بخشش کی اُمید کرتے تھے اور کسی کو گناہ کی
وجہ سے کافر نہ کہتے تھے اور ہم بھی ایسے ہی ہیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ خطیب نے بتایا ہے کہ امام وکیع بن الجراح اور سفیان ثوری جیسے

محمد بن کا بھی یہی مذہب ہے۔

وکیع بن الجراح کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے بھی آخر میں یہی سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ہم سارے مسلمان گنہگاروں کے لیے جو ہماری نماز پڑھتے ہیں اُمیدوارِ مغفرت ہیں خواہ وہ کیسا ہی عمل کریں۔
اور واقعہ یہ ہے کہ مانتے تو سب تھے لیکن محمد بن فقہار کی یہ تعبیر سننے کو تیار نہ تھے کہ ایمان و عمل جدا جدا ہیں اور ان میں ہر ایک کا حکم مختلف ہے۔ صرف یہ دیکھ کر کہ ایمان و عمل کو جدا جدا سمجھنا مریضہ کا مذہب ہے اس کی تردید کرتے تھے۔ چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں اس کے خلاف عنوان پر عنوان لاتے ہیں۔ حالانکہ مریضہ کے نزدیک عمل کی حیثیت ہی کوئی نہیں ہے ان کا تو کھلا مذہب یہ ہے کہ اگر ایک شخص مجھے دل سے توحید و نبوت پر ایمان رکھتا ہے تو پھر اسے گناہ کی کوئی پروا نہیں اور وہ سارے گناہوں کے باوجود آخرت کی باز پرس سے آزاد ہے لیکن محققین اہل سنت جو عمل کو جزوِ ایمان نہیں بتاتے ان کے نزدیک ایک گنہگار مسلمان کا معاملہ اللہ سبحانہ کے اختیار میں ہے چاہے تو اپنے فضل سے بخش دے اور چاہے تو اپنے عدل کے مطابق منزاعے اور خود امام بخاری کا بھی یہی مذہب ہے۔ بہر حال ابراہیم بن طہمان کی برگزیدہ شخصیت اس سے برتر تھی۔

امام احمد بن حنبل کے دل میں ان کی اس قدر عظمت تھی کہ ایک بار ان کی مجلس میں ابراہیم کا ذکر ہوا تو امام احمد بخاری کی وجہ سے ڈھاسنا لگاتے بیٹھے تھے اٹھ بیٹھے اور فرمایا:
لَا يَنْبَغِي أَنْ يَذْكُرَ الصَّالِحُونَ فَيْدَكَائِهِ
صالحین کا ذکر ہو تو ڈھاسنا لگانا اچھا نہیں ہے۔

ولادت ہرات میں ہوئی اور وفات ۳۶۷ھ میں حرم محترم میں ہوئی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

الامام الحافظ مکی بن ابراہیم

حافظ وہابی نے ان کا ذکر اس طرح شروع کیا ہے۔ الحافظ الامام، شیخ فخر اسان۔ اور ان کے ساتھ میں نیرید بن ابی عبید اور بہز بن حکیم کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

حدث عن يزيد بن ابی عبيد و جعفر الصادق و بهن بن حكيم و ابی حنيفة و هشام -

امام مکی بن ابراہیم امام اعظم کے خاص تلامذہ ہیں سے ہیں۔ صدر الائمہ رقمطراز ہیں کہ مکی بن ابراہیم کوفہ آئے اور امام اعظم کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہے اور آپ سے فقہ و حدیث حاصل کیا اور بکثرت روایتیں لیں۔

امام مکی علم حدیث میں بہت بڑے امام ہیں۔ بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ ان کے شاگرد تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین اور امام بخاری نے ان کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے۔ خود امام مکی کا بیان ہے کہ میں نے ساٹھ حج کیے، دس سال تک حرم محرم کا مجاور رہا ہوں اور سترہ تابعین سے حدیثیں لکھی ہیں اور یہ بھی فرماتے تھے کہ سترہ میں پیدا ہوا۔ اور سترہ سال کی عمر میں علم حدیث کی تحصیل شروع کی یہ حافظ عسقلانی نے تہذیب میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لوگوں کو میری ضرورت پیش آئے گی تو میں سوائے تابعین کے کسی سے بھی حدیث نہ لیتا۔ ان کے آغاز علم کی داستان بھی بڑی مزے دار ہے۔ کیونکہ ان کو تحصیل علم کے لیے امام ابو حنیفہ نے ہی متوجہ کیا تھا۔ چنانچہ امام حارثی عبد الصمد بن فضل کی زبانی ان سے ناقل ہیں کہ میں کاروبار کرتا تھا ایک بار امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ تم تجارت کرتے ہو مگر تجارت میں علم کے بغیر ستر تا ستر خسارہ ہی خسارہ ہے۔ تم علم کیوں نہیں حاصل کرتے ہو اور احادیث کیوں نہیں لکھتے۔ امام موصوف مجھے برابر اس طرف توجہ دلاتے رہے حتیٰ کہ میں نے اس راوی میں قدم رکھ دیا اور کتابت علم کی طرف متوجہ ہو گیا اور اللہ سبحانہ نے مجھے علم کی دولت مرحمت فرمائی اس لیے میں ہر نماز کے بعد اور جب بھی امام ممدوح کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے حق میں دعا کرتا ہوں۔

لان الله تعالى ببركته فتح لي باب العلم
کیونکہ آپ ہی کی برکت سے اللہ سبحانہ نے میرے لیے علم کا دروازہ کھولا ہے۔

۱۔ مناقب صدر الائمہ ج ۱ ص ۲۰۳ - ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۳ -

۳۔ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۹۵ - ۴۔ مناقب صدر الائمہ ج ۲ ص ۱۶۱

ظاہر ہے کہ آپ امام اعظم سے پندرہ سولہ سال کی عمر میں کاروبار ہی کے سلسلے میں ملے ہوں گے اسی عمر کے لڑکے کو علم کی ترغیب دی جاتی ہے۔ سال ڈیڑھ سال سوچ بچار میں گزر گیا اور بالآخر آپ نے سترہ سال کی عمر میں علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت اختیار کر لی اور اس سلسلے میں الدین استاد آپ کے امام اعظم ہوتے اور آپ ۳۳۱ھ سے ۳۵۰ھ تک امام اعظم کے علوم سے خوشہ چینی کرتے رہے اور آپ کی وفات کے بعد آپ نے حجوں کا سلسلہ شروع کیا اور پہلا حج ۳۵۰ھ ہی میں کیا۔ خطیب نے عبدالصمد بن الفضل کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ آپ نے ساٹھ حج کیے ہیں۔ اگر آپ کی وفات جیسا کہ محمد بن سعد نے بتایا ہے ۳۵۰ھ میں ہوئی ہے تو حجوں کی یہ تعداد اسی طرح پوری ہو جاتی ہے کہ آپ کا پہلا حج ۳۵۰ھ میں ہو۔

امام اعظم کے علم کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ کان اعلیٰ اهل زمانہ اور محدثین کی اصطلاحی زبان میں علم سے مراد حدیث ہی ہوتا ہے۔
امام مکی کے دل میں امام اعظم کی حدیث دانی کی عظمت کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو صدر الامر نے اسماعیل بن بشر کی زبانی نقل کیا ہے کہ

ایک بار ہم امام مکی کی مجلس درس میں حاضر تھے انہوں نے درس شروع کیا کہ حدثنا ابو حنیفۃ... الخ حاضرین میں سے ایک بول پڑا کہ حدثنا عن ابن جریج ہم سے ابن جریج مکی کی روایات بیان کھتے اس پر امام مکی کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فرمانے لگے۔

انا لا نحدث السفہاء من علیہ ان تکتب عتی قم
من مجلسی ہم بیوقوفوں سے حدیثیں بیان نہیں کرتے تمہیں میرے
سے حدیث لکھنا روا نہیں ہے میری مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔
چنانچہ جب تک اس شخص کو اپنی مجلس سے نہ اٹھا دیا حدیث بیان نہیں
کی اور جب اس کو نکال دیا گیا تو پھر وہی حدثنا ابو حنیفۃ کا سلسلہ
شروع کر دیا۔ لے

امام مکی کو امام اعظم کے تلامذہ میں صرف حافظ ذہبی نے ہی نہیں بلکہ حافظ ابوالحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں جہاں امام بخاری کے اساتذہ و مشائخ حدیث کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بھی تصریح کی ہے کہ مکی بن ابراہیم کا تعلق امام بخاری کے اساتذہ میں اس طبقہ اولیٰ سے ہے جنہوں نے تابعین کے سامنے زانوئے نشاکردی نہ کیا ہے۔ گو یا مراتب شیوخ میں امام بخاری کے اساتذہ اتباع تابعین ہیں۔ اور ان اتباع تابعین میں جو امام بخاری کے طبقہ اولیٰ کے شیوخ ہیں سب سے اوسچا اور بالا مقام مکی بن ابراہیم کا ہے۔ چنانچہ امام بخاری کی مرویات میں جو روایات سب سے عالی ہیں اور جن کو ثلثیات کہا جاتا ہے جن کی تعداد بائیس ہے ان میں زیادہ تعداد امام بخاری کو مکی بن ابراہیم ہی کے حوالہ سے ملتی ہے یعنی بائیس میں سے گیارہ اور باقی گیارہ دوسرے مختلف اساتذہ سے آئی ہیں جیسا کہ آپ نیچے پڑھ آئے ہیں اور مکی بن ابراہیم کے حوالہ سے جو ثلثیات امام بخاری کو ملی ہیں وہ صحیح بخاری کے مندرجہ ذیل البواب میں آئی ہیں۔

باب اثم من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب قدر کم ینبغی ان یکون بین المصلی والسترة، باب الصلوة الی الاسطوانة، باب وقت المغرب، باب صوم عاشوراء، باب اذا احال دین المیت۔ باب البیعة فی الحرب، باب من رای العدو، باب غزوة خیبر، باب انیة المجوس، باب اذا قتل نفسه خطا۔

الامام الضحاک بن محمد البوعاصم البزیل

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں، حافظ ابوالحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں اور محدث صیمری نے مناقب میں ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ان کو فرسے کہ ان کے حلقہ تلمذ میں امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ، امام علی بن المدینی اور امام بخاری جیسے اساطین علم حدیث داخل ہیں۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں۔ کہ امام البوعاصم کو ایک ہزار صحیح حدیثیں نوک زبان تھیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے خود ان سے سنا ہے فرماتے تھے کہ مجھے جب سے غیبت کی حرمت معلوم ہوئی ہے۔ میں نے کبھی غیبت نہیں کی۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا سارا علم ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ چنانچہ ابن خیراز کہتے ہیں کہ یہ کتاب ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔

حافظ ذہبی نے بھی ان کی اس خوبی کو یہ کہہ کر سراہا ہے کہ

لم یحدث قط الا من قبل حفظه لہ

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کے زبد، علم و دیانت پر علماء کا اتفاق کہتے ہیں۔

ان کو نبیل کیوں کہتے ہیں۔

اس میں علماء کے مختلف خیالات ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی زیر کی اور فراست کی وجہ سے ان کو نبیل کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ شہر میں ایک روز ہاتھی آگیا۔ عام شہری اسے دیکھنے گئے لیکن ابو عاصم اس نظارہ سے لطف اندوز نہیں ہوئے۔ ابن جریر نے یہ سن کر فرمایا کہ انت النبیل تو ہی عقل مند ہے لیکن امام طحاوی اور حافظ دولابی نے خود ان کا بیان اس سلسلے میں جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ :

امام زفر کے یہاں ان کی اکثر حاضری ہوا کرتی۔ اتفاق سے امام موصوف کے یہاں ان کا ہم نام ایک اور شخص بھی آتا تھا جن کی وضع قطع بالکل گنتی گزری تھی۔ یہ حسین و جمیل اور خوش پوش تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انہوں نے حسب معمول امام زفر کے دروازے پر دستک دی۔

لوٹدی نے آکر دریافت کیا کون ؟ جواب ملا کہ ابو عاصم۔ کنیز نے اندر جا کر اطلاع دی کہ ابو عاصم دروازے پر حاضر ہیں۔ امام زفر نے دریافت کیا کون سے ابو عاصم ہیں ؟ لوٹدی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

النبیل (مغیر ز) ابو عاصم اندر آئے تو امام زفر فرمانے لگے کہ اس لوٹدی نے تمہیں وہ لقب دیا ہے جو میرے خیال میں تم سے کبھی بھی جدا نہ ہو گا۔ اس نے تمہیں نبیل کے لقب سے ملقب کیا ہے ابو عاصم کا بیان ہے کہ اس روز سے میرا یہ لقب پڑ گیا۔

حافظ ابن ابی العوام نے بھی اس واقعہ کو بسند متصل نقل کیا ہے۔ بصرے میں ابو عاصم النبیل

ہی امام اعظم کے مذہب کی نشر و اشاعت کا باعث بنے ہیں۔ ابو عاصم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر نوے سال کی تھی۔ فقہیت میں یگانہ روزگار تھے۔ ابن سعد ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ کان ثقتہ فقیہا۔ ائمہ سترہ میں امام بخاری تو ان کے بلا واسطہ شاگرد ہیں اور امام ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی بواسطہ حافظ بدیع عبد اللہ بن اسحاق ابو محمد الجوهری ان کے تلامذہ ہیں۔ حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں کہ امام طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ میں نے خود امام ابو عاصم کی زبانی سنا ہے فرماتے تھے کہ ہم امام اعظم کی خدمت میں حاضر تھے آپ کے پاس فقہ و حدیث کے تشنگان علوم کا بے حد ہجوم ہوتا تھا۔ ایک روز آپ نے فرمایا کہ کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو صاحب خانہ سے جا کر کہے کہ وہ اس ہجوم کا بندوبست کرے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جانا ہوں لیکن ذرا مجھے کچھ مسائل کے بارے میں پوچھنا ہے فرمایا پاس آؤ اور پوچھ لو۔ میں آگے بڑھ گیا اور مسائل دریافت کیے۔ اسی اثنا میں اوروں نے بھی کچھ سوالات کیے اور آپ نے ان کو جوابات دیے۔ میں ان میں کچھ ایسا محسوس کیا کہ مجھے صاحب خانہ کے پاس جانا پادہ رجا۔ پھر آپ ہجوم سے کچھ پریشان ہوئے اور فرمایا کہ ابھی ابھی یہاں کسی شریف آدمی نے صاحب خانہ کے پاس جانے کا وعدہ کیا تھا وہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں ہوں۔ فرمایا کیا تم جاؤ گے نہیں؟ تم نے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ عرض کیا کہ میں نے بلا قید و وقت جانے کو کہا تھا جب چاہوں جاسکتا ہوں فرمایا کیا کہہ رہے ہو؟ مخاطبات اور محاورات میں کلام کا تحمل ارادہ سے مقرر نہیں ہوتا ہے اس کا تحمل فی الفور ہے۔

حافظ ابن حجر نے ابو عاصم انبیل کو بھی امام بخاری کے اساتذہ میں صف اول اور طبقہ اولیٰ کا درجہ دیا ہے۔ یہ بھی اتباع تابعین سے متعلق لکھتے ہیں اور ان میں سے ایک ہیں جن کی وساطت سے امام بخاری کو تلامذات ملی ہیں۔ ان کی وساطت سے آتی ہوئی تلامذاتی حدیثوں کی تعداد صحیح بخاری میں چھ ہے۔

امام اعظم سے ان کو جو گہری اور بے پایاں عقیدت تھی اس کا اندازہ کرنا ہو تو امام نصر بن علی کا یہ بیان پڑھیے کہ:

میں نے ایک بار ابو عاصم سے دریافت کیا کہ آپ کے خیال میں

سفیان ثوری زیادہ فقیہ ہیں یا ابو حنیفہ۔ فرمایا سفیان سے مقابلہ کرتے
ہو۔ بخدا ابو حنیفہ کا فقہ میں مقام تو میرے نزدیک ابن جریر سے
بھی بالا ہے۔ میری آنکھوں نے آج تک علم پر اتنا قابو یافتہ شخص
کوئی نہیں دیکھا ہے۔

بہر حال ابو عاصم النبیل کی شخصیت امام اعظم کے تلامذہ میں جیسے گرامی قدر ہے ایسے ہی ان کی
ذات گرامی بعد میں آنے والے محدثین کے اساتذہ میں عظیم ترین مہتی ہے۔ سارے محدثین کا
شجرہ علمی بالواسطہ اور بلاواسطہ ان سے جا کر ملتا ہے۔

الامام الحافظ یزید بن ہارون

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مبسوط ترجمہ لکھا ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے الحافظ
القُدوہ، شیخ الاسلام اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کے چہرے کا آغاز اس طرح
کیا ہے احد الحفاظ المشاہیر الاعلام، امام علی بن المدینی کہتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون سے
بڑھ کر کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ ابن ابی شیبہ کہتے ہیں کہ ہم نے یزید بن ہارون سے زیادہ
حفظ میں کسی کو پکا نہیں دیکھا۔ علی بن عاصم کا بیان ہے کہ یزید رات بھر نوافل پڑھتے۔ انہوں نے
کچھ اوپر چالیس سال تک عشتاکے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے۔ حافظ ابو بکر الخطیب نے
بسنہ متصل یحییٰ بن ابی طالب کا بیان لکھا ہے کہ میں نے بغداد میں ان سے حدیث کا سماع
کیا ہے اس وقت ان کے درس میں ستر ہزار حاضرین کی تعداد بتائی جاتی تھی۔ حافظ عبد اللہ
قرشی نے الجواہر المفصیۃ میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں تصریح
کی ہے کہ یزید بن ہارون نے امام اعظم سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ یہ امام صاحب کے فضل و کمال
اور حفظ حدیث کے نہایت معترف تھے۔ ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو میں نے
دیکھا ہے ان میں ابو حنیفہ سے زیادہ فقیہ کوئی نہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے یزید بن ہارون کے
حوالہ سے لکھا ہے :

۱۔ مناقب صدر الامم ج ۲ ص ۶۵ - ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۲ -

۳۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۲۶ -

ادركت الف رجل فكتبت عن اكثرهم ما رايت فيهم افتقروا
اوسرع ولا اعلم من خمسة اولهم ابو حنيفة -

میں ایک ہزار اکابر سے ملا ہوں اور ان میں اکثر سے حدیثیں لکھی ہیں۔
لیکن میں نے ان میں پانچ سے زیادہ پارسا، فقیہ اور عالم کوئی نہیں
دیکھا ہے ان میں اولین ابو حنیفہ ہیں۔

ان کی حدیث دانی کا حال یہ ہے کہ علی بن شعیب کہتے ہیں کہ میں نے خود ان کو یہ کہتے سنا ہے
کہ مجھے بالاسناد چوبیس ہزار حدیثیں زبانی یاد ہیں۔

ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کے یزید بن ہارون منشی ہے ہیں یعنی جس زمانے میں ابوشیبہ اسطر
میں قاضی تھے تو یزید ان کے منشی تھے ان کے بارے میں یزید کا بیان ہے کہ:
اپنے زمانے میں ابوشیبہ سے زیادہ عادلانہ فیصلہ کوئی نہ کرتا تھا۔

یہ امام یزید کے حدیث میں استاد بھی ہیں۔ انسوس ہے کہ ابوشیبہ کو بعد کے محدثین نے
جرحی تیروں کا نشانہ بنالیا ہے اور اس کی بنیاد محض ایک افسانے پر رکھی ہے ورنہ یزید بن ہارون
نیک ان کی ثقاہت اور دیانت میں کسی کو کوئی کلام نہ تھا۔

یزید اپنے علمی جلال میں اس قدر اونچا پایہ رکھتے تھے کہ مامون جیسا عظیم المرتبت خلیفہ بہت بڑے
علمی جلال کے باوجود ان سے خائف تھا۔ حافظ ذہبی نے جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس کی تائید
ہوتی ہے۔

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ ایک بار ہم سے مامون نے کہا کہ اگر مجھے یزید کی
جانب سے اندیشہ نہ ہوتا تو میں اعلان کر دیتا کہ قرآن مخلوق ہے ورنہ
کیا کیا یہ یزید کون ہیں؟ جن سے آپ کو اندیشہ ہے۔ جواب دیا کہ مجھے
اندیشہ ہے کہ میں اعلان کروں اور یزید میری تردید کریں اور لوگوں میں
اختلاف ہو کر رائے عامہ فتنہ کا شکار ہو جائے۔ مامون کی یہ باتیں سن
کر ایک شخص یزید بن ہارون کے پاس واسطہ پہنچا اور کہا کہ امیر المؤمنین
آپ کو سلام کہتے ہیں اور یوں فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ ہے کہ میں

قرآن کے مخلوق ہونے کا اعلان کروں۔ امام یزید نے سنتے ہی فرمایا کہ تم
جھوٹ بول رہے ہو امیر المومنین نے یہ بات نہیں کہی اور نہ امیر المومنین
سے یہ توقع ہے کہ وہ اتنے عامہ کے سامنے ایسی بات رکھیں جس سے
عوام آستنا نہیں ہیں۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ مامون الرشید نے یزید کی زندگی میں اس بات کا اعلان نہیں
کیا۔ حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق یزید کی وفات ۲۱۳ھ میں ہوئی اور مامون نے یزید بن ہارون
کی وفات کے پورے چھ سال بعد ۲۱۹ھ میں اس کا اعلان کر دیا۔

ابھی صرف اعلان تھا اور ۲۱۳ھ میں اس نے طے کر لیا کہ اپنی قوت سے کام لے کر لوگوں
کو خلق قرآن کا مسئلہ ماننے پر مجبور کرے چنانچہ اس فیصلہ کو جبراً نافذ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔
اللہ اکبر! یزید کی شخصیت میں کس قدر برتری ہوگی جو ایک فتنہ کے لیے تاحین وفات روک بنی رہی۔
بہر حال امام یزید بن ہارون کی ذات گرامی محدثین کے یہاں ایک استدلالی شخصیت ہے
بڑے بڑے ائمہ حدیث نے ان کے سامنے زانوائے تشاگردی طے کیا ہے جیسے امام احمد بن حنبل،
امام علی بن المدینی، امام ابو حنیفہ، امام ابو بکر بن ابی شیبہ، خلف بن سالم، امام احمد بن منیع وغیرہ
وغیرہ، اس لحاظ سے بعد کے تمام محدثین کے لیے امام یزید بن ہارون استاد الاساتذہ ہیں۔

الامام الحافظ وکیع بن الجراح

وکیع بن الجراح بن یلیح بن عدی نام، البوسفیان کنیت، نسباً المر و اسی اور بلحاظ بود و باش کو فی
ہیں۔ علم حدیث کے مشہور امام ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو الامام الثبت الحافظ محدث العراق
کے القاب سے یاد کیا ہے۔ مشہور ناقد رجال یحییٰ بن معین علم حدیث میں ان کا پایہ بتاتے ہوئے
فرماتے ہیں وکیع فی زمانہ کلاذیعی فی زمانہ عبد اللہ بن المبارک، امام احمد بن حنبل، امام
علی بن المدینی، امام یحییٰ بن معین، امام اسحاق بن راہویہ، امام زہیر، امام ابو بکر بن ابی شیبہ
اور ابو کریب نے ان کے آگے زانوائے ادب نہ کیا ہے۔
یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔ سجداً میں نے اللہ کی خاطر وکیع کے علاوہ حدیث روایت کرنے والا

کوئی نہیں دیکھا اور مجھے وکیع سے زیادہ حافظ بھی کوئی نظر نہیں آیا اور فرماتے تھے کہ محدثین تو چار ہیں وکیع، یعلیٰ بن عبید، القعنبی اور احمد بن حنبل۔ امام احمد جب وکیع کا ذکر فرماتے تو کہتے کہ میرے مشاہدے میں وکیع سے زیادہ حدیث کا ضابطہ اور حافظ کوئی نہیں ہے۔ ان کا ہی ایک اور بیان ہے کہ میں نے وکیع جیسا علم، حفظ و ضبط میں روایت و اسناد، فقہ و احکام میں اور پارسی و تقویٰ میں کوئی نہیں دیکھا۔ جسم کے ذرا بھاری بھر کم تھے، مکہ تشریف لائے۔ فضیل بن عیاض سے ملاقات ہوئی۔ سعید بن منصور کہتے ہیں کہ فضیل نے ان سے پوچھا کہ راہب عراق ہو کر یہ موٹا یا کیسا؟ جواب بڑا ہی مسکت دیا فرمایا کہ مسلمان ہونے کی خوشی میں بھول گیا ہوں۔ حافظ اس قدر غضب کا تھا کہ ابو داؤد کہتے ہیں کہ وکیع کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔ صرف یہی نہیں کہ امام اعظم کے تلامذہ میں سے تھے جیسا کہ حافظ ذہبی نے ترجمہ ابی حنیفہ میں تصریح کی ہے بلکہ یہ امام اعظم کے ان مخصوص تلامذہ میں سے ہیں جن کے بارے میں خود امام صاحب نے یہ تاثر ظاہر فرمایا ہے۔

تم میرے دل کی مسرت اور میرے رنج و غم کا جلا ہو، فقہ و شریعہ کی زمین میں نے تمہارے لیے کس دی ہے اور کس کام تمہارے ہاتھ میں لے چکا ہوں۔ لائے عامہ تمہارے پیچھے چلے گی اور تمہارے الفاظ کی مثللاشتی ہو گی تم میں سے ہر ایک عدلیہ میں کام کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ میرا تم سے اللہ کے نام پر اور اس علم کی بزرگی کے نام پر مطالبہ ہے کہ علم کو گراہ پر چلانے سے بچنا۔ اگر تم میں سے کوئی عدلیہ کی آزمائش میں پڑ جائے اور اسے اپنے اوپر اعتماد نہ ہو تو اس کے لیے عہدہ قضا ہرگز روا نہیں ہے اور اگر ناگزیر حالات میں طبیعت کے خلاف یہ کام کرنا ہی پڑ جائے تو لوگوں سے علیحدگی ہرگز اختیار نہ کرنا۔ نماز پنجگانہ مساجد میں عوام کے ساتھ ادا کرنا اور نماز کے بعد اعلان کے ذریعے ارباب ضرورت کو تلاش کرنا اور نماز عشا کے بعد خصوصاً اس مقصد کے لیے تین بار

اعلان کرنا۔ اگر بیمار ہو جاؤ تو بیماری کے زلمے کی تنخواہ نہ لینا۔ اور
اگر سربراہ مملکت خزانہ حکومت میں بددیانتی کرے اور ظلم و جور کا
روئے اختیار کرے تو اس کی سربراہی باطل اور اس کی حکومت
ناجائز ہے۔

وکیع کے والد اگرچہ سرکاری ملازم تھے یعنی سرکاری خزانہ کے نگران تھے اور حکومت کا مالیاتی
مسئلہ ان سے متعلق تھا۔ خود امام وکیع کے حوالہ سے خطیب رقمطراز ہیں کہ :

میں امام اعمش کے پاس گیا اور ان سے احادیث روایت کرنے کی
درخواست کی انہوں نے مجھ سے میرا نام دریافت کیا۔ بتایا کہ وکیع
ہے۔ فرمایا کہ نام تو بڑا ہی پر عظمت ہے۔ میرا خیال ہے کہ مستقل میں
تمہارا نام ہوگا۔ بتاؤ کوفہ میں کہاں رہتے ہو؟ میں نے بتایا کہ بنی اواس
میں۔ بولے کہ جراح بن یلیع کے گھر سے کتنی دور؟ میں نے عرض کیا
کہ وہ تو میرے والد ہیں۔ بولے جاؤ پہلے ان سے میرا ماہانہ لے آؤ
وہ کیشر ہیں۔ میں بعد ازیں تمہیں پانچ حدیثیں سناؤں گا۔ میں
گھر آیا اور صورت حال سے والد کو مطلع کیا۔ والد نے کہا کہ آدھا
روزینہ لے جاؤ اور پانچ حدیثیں سن آؤ پھر آدھا لے جانا اور پانچ
حدیثیں سن آنا اس طرح تمہیں دس حدیثیں آجائیں گی۔ چنانچہ میں
آدھا روزینہ لے کر مہینا امام اعمش نے لے لیا اور مجھے نقد دو حدیثیں
سنا دیں میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو مجھ سے پانچ حدیثوں کا وعدہ
کیا تھا فرمایا پورا ماہانہ کہاں ہے میرا خیال ہے کہ تمہارے والد
نے تمہیں یہ ترکیب سمجھائی ہوگی۔ لیکن ان کو پتہ نہیں کہ اعمش جہاں
دیدہ گھاگ ہے جاؤ پورا روزینہ لے کر آؤ اور پوری پانچ حدیثیں
سن لو۔ میں واپس آیا وظیفہ لے گیا اور پانچ حدیثیں سنیں۔

اس کے باوجود کہ ان کے والد کا سرکار میں اس قدر عمل دخل تھا اور اتنی اونچی کلیدی

ملازمت پر تھے اور بارون الرشید سربراہ مملکت عباسی نے امام وکیع کو عدلیہ میں لانے کی کوشش بھی کی لیکن لکھا ہے کہ انہوں نے عہدۂ قضا قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ :

ادالہ شیدان یولی وکیعاً قضا الکوفۃ فامتنع۔^۱

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ امام وکیع نے اپنے استاد ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور اس راہ میں اپنی ذات پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے استاد کی نصیحت پر عمل کیا تھا۔

امام وکیع صاحب تصانیف بزرگ ہیں۔ ہم نے ان کی تصانیف کاگزشتہ اوراق میں ذکر کیا ہے امام ذہبی نے ان کے بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ نماز میں بسم اللہ باواز بلند کو بدعت کہتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر اور حافظ ابوبکر الخطیب دونوں اس پر متفق ہیں کہ امام وکیع نے حدیث میں امام اعظم کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا ہے۔ چنانچہ الخطیب نے اگر یہ بتایا ہے کہ :

کان قد سمع منہ شیئاً کثیراً۔^۲

تو حافظ ابن عبد البر نے بھی یہی لکھا ہے کہ :

وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً۔ وکان یحفظ حدیثہ کلدہ۔^۳

اور صرف حدیث میں ان کو نسبت تلمذ ہی حاصل نہ تھی بلکہ امام اعظم کے علم پر ان کو اس قدر اعتماد تھا کہ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں، الخطیب نے تاریخ بغداد میں اور ابن عبد البر نے الانتقاء فی فضائل الثلاثمۃ الفقہاء اور جامع بیان العلم میں یحییٰ بن معین کے حوالہ سے تصریح کی ہے کہ کان یفتی بقول ابی حنیفۃ۔ ان کی وفات ۱۹۸ھ میں ہوئی ہے۔

الامام الحافظ علی بن مسہر

علی بن مسہر نام، ابوالحسن کنیت، نسبت و لامکی وجہ سے قرشی اور سکونت کے لحاظ سے

^۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲۔ ^۲ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۷۱۔

^۳ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹۔

کوئی ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کا ترجمہ الامام الحافظ کے القاب سے شروع کیا ہے۔ ان کے تلامذہ میں مشہور محدثین میں ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن حجر اور ہناد ہیں۔ یہ فقہ و حدیث دونوں کے جامع تھے۔ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابو زرعہ، نسائی اور ابن حبان ان سب نے متفقہ طور پر ان کو ثقہ کہا ہے۔ امام عجل کے ان کے بارے میں الفاظ یہ ہیں کان ممت جمع الحدیث والفقہ۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ کان ثقہ کثیر الحدیث۔

امام سفیان ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظم کی مجلس درس میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں مگر امام اعظم کی فقہ کو انہوں نے علی بن مسہر سے حاصل کیا ہے۔ اور سفیان ثوری نے اپنی کتاب جامع کی تصنیف میں بھی زیادہ تر ان سے ہی مدد لی ہے۔ چنانچہ عبدالقادر قرطبی نے مشہور محدث صیری سے جو خطیب بغدادی کے علم حدیث ہیں استاد ہیں نقل کیا ہے۔

وهو الذي اخذ عنه سفیان عبد ابی حنیفۃ و نسخ منه کتبہ۔
اسی بنا پر سفیان ثوری کی جامع کے بارے میں حافظ ابن عبد البر نے قاضی ابویوسف کا یہ تاثر بنایا ہے:

سفیان الثوری اکثر متابعه منی لا بی حنیفۃ۔
علی بن مسہر آرمیتیا میں عدلیہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قاضی کہلاتے تھے۔ حافظ ذہبی نے ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ۳۹۰ھ میں کوفہ ہی میں وفات ہوئی۔ محدثین نے ان کی ثقاہت، دیانت اور امانت کے بہت گن گاتے ہیں۔

الامام الحافظ حفص بن غیاث

حفص بن غیاث نام، ابو عمر و کنیت، نسباً نخعی اور وطناً کوئی ہیں خطیب بغدادی نے ان کے تلامذہ میں جن اجلہ محدثین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ابو نعیم، عثمان بن مسلم، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، زہیر بن حرب اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔
اولاً بغداد پھر کوفہ میں منصب قضا پر فائز ہے ہیں۔

حفص بن غیاث بھی امام اعظم کے ان مخصوص تلامذہ میں سے ہیں جن کو امام اعظم نے قلمی سر
قرار دیا ہے۔ ان کے قاضی بننے کی داستان خطیب بغدادی نے جو لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ انہوں نے بکراہت قاضی بننا گوارا کیا تھا۔ چنانچہ حمید بن الربیع کہتے ہیں کہ
جب عبداللہ بن ادریس، حفص بن غیاث اور وکیع بن الجراح کو
ہارون الرشید نے عدلیہ میں کام کرنے کے لیے بلایا تو مجلس میں
پہنچتے ہی عبداللہ بن ادریس نے ہارون الرشید کو سلام کیا اور سلام
کے بعد جان کر زمین پر گر پڑے یوں محسوس ہوتا تھا کہ دورہ پڑ گیا۔
وکیع نے اپنے کو آنکھ پر ہاتھ رکھ کر یک چشم بنالیا۔ ہارون نے
یہ صورت حال دیکھ کر دونوں کو نا اہل قرار دے دیا۔ حفص کہتے ہیں کہ
اگر مجھ پر قرض اور اولاد کا بار نہ ہوتا تو میں کبھی بھی یہ عہدہ قبول نہ کرتا۔

قاضی بن گئے لیکن ان کی عدلیہ کی پوری زندگی زبرد و پارسائی کی مثالی زندگی سے چنانچہ البوشام
الرفاعی کہتے ہیں کہ حفص بن غیاث ایک روز عدالت میں مقدمہ سن رہے تھے کہ رئیس مملکت
نے بلایا بھیجا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ عدالت کا وقت ہے میں اس وقت نہیں آ
سکتا۔ ایک روز آپ بیمار ہو گئے اور پورے پندرہ دن بیمار رہے۔ حفص بن غیاث کے پوتے
عبید کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے ایک سو درہم دیے اور کہا کہ جاؤ یہ رقم خزانہ حکومت میں داخل
کر آؤ اور بتایا کہ یہ ان پندرہ دنوں کی تنخواہ واپس کر رہا ہوں جن میں میں نے کام نہیں کیا۔
یہ میرا حق نہیں ہے بلکہ

ان کی حدیث دانی، حدیث میں ثقاہت اور حفظ و ضبط کا سب محمد بن لوہا مانتے ہیں۔ چنانچہ
امام سیحی بن معین فرماتے ہیں،

وہ تمام احادیث جو امام حفص بن غیاث نے کوثر و بغداد میں بیان
کی ہیں۔ وہ سب زبانی یادداشت کے سہارے روایت کی ہیں ان
میں کوئی بھی لکھی ہوئی نہ تھی اور ان حدیثوں کی تعداد جو لوگوں نے
ان سے لکھیں تین ہزار ہے اور چار ہزار حدیثیں ان کو یاد تھیں۔

زہد و پارسائی اور اس شانِ محدثانہ کے ساتھ آپ جذبۂ سخاوت سے بھی مالا مال تھے۔ چنانچہ ابو جعفر المسندی نے ان کو اسخی العرب کے لقب سے یاد کیا ہے اور ان سے ان کا یہ اعلان بھی نقل کیا ہے :

من لم يأكل من طعامي لا يحدثني

محدثین کے لئے تاریخ رجال سے واقفیت نہایت ضروری ہے کیونکہ بیشتر احادیث اخبارِ احاد ہیں اور احاد کا تمام تر مدار رجال اسناد پر ہے۔ لہذا جب تک راویانِ حدیث کے حالات پر کج فہمی اطلاق نہ ہو۔ اس کی سند کی صحت و ضعف کا پتہ نہیں چل سکتا۔ پہلی صدی میں تو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ اس زمانے میں حدیثوں کے راوی تمام تر صحابہ کرام اور اکابر تابعین ہی تھے۔ قرنِ اول گزر جانے پر بے شک ضعیف راویوں کا کچھ پتہ ملتا ہے۔ لیکن ان کا ضعف بیشتر بددیانتی کی بنا پر نہیں بلکہ حافظہ کی کمزوری، قلتِ ضبط یا روایت میں تساہل کی وجہ سے ہے۔ بہر حال اس دور تک حدیث کے راویوں میں کسی دروغ گو کا وجود نادر اور ضعیف الروایت بہت کم تھے۔ امام اعظم اور امام مالک کی اکثر و بیشتر حدیثیں اسی طبقہ کے راویوں سے منقول ہیں۔ اسی لیے وہ صحت و وثوق کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہیں۔ دوسری صدی میں کچھ لوگوں نے روایتِ حدیث میں کذب بیانی سے کام لیا تو ائمہ جرح و تعدیل نے تاریخ کی روشنی میں روایتوں کو جانچا۔ چنانچہ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں :

جب راویوں نے جھوٹ سے کام لیا تو ہم نے ان کے لیے تاریخ استعمال کی۔ اور امام حفص بن غیاث نے وقت کے اس تقاضے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسی سلسلے میں بڑے پتے کی بات فرمائی ہے :

إذا تهتم الشيخ فحاسبوه بالسنين -

جب کسی شیخ کو متہم کرو تو دونوں کی عمروں کا حساب لگالو۔ لے

یعنی اس راوی کی عمر کا اس شخص کی عمر سے حساب لگالو جس سے یہ روایت کر رہا ہے کہ یہ اس سے ملا بھی ہے یا نہیں ہی اس سے روایت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ بہر حال امام حفص

بن غیاث امام اعظم کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی وفات ۱۹۴ھ میں ہوئی ہے۔

الامام الحافظ، متیم بن بشر

متیم بن بشر بن ابی خازم القاسم بن دینار نام، ابو معاویہ کنیت، نسبت و لا کی وجہ سے سلمی، اصلاً بخاری، وطن واسطی اور بلخاڑ بود و باش بغدادی ہیں۔ ۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے اجلہ تابعین کے سامنے زانوئے شاگردی نہ کیا ہے۔ مثلاً عمرو بن دینار اور زہری۔ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام اعظم کے ترجمہ میں جن ائمہ کے متعلق تصریح کی ہے کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ سے حدیث روایت کی ہے ان میں متیم بن بشر کو بھی شمار کیا ہے۔ امام ذہبی نے مناقب میں بھی اس کی تصریح کی ہے اور یہ بھی تذکرہ میں لکھا ہے کہ لا نزاع فی انہ من الحفاظ الثقات۔

ان کے والد حجاج بن یوسف ثقفی کے باورچی تھے۔ مچھلی پکانے میں خاص مہارت تھی۔ اس خاندان میں متیم پہلے منفرد فرزند ہیں جنہوں نے اپنے لیے خاندان سے الگ ہو کر علم کی راہ تجویز کی۔ اولاً والد نے علم حاصل کرنے سے روکا لیکن متیم علم کے نشہ سے چور تھے وہ بالکل خاموشی سے والد کی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت سہتے رہے اور علم میں لگے رہے۔ حافظ، متیم قاضی ابوشیبہ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور ان سے علم حدیث حاصل کرتے۔ ایک بار متیم بیمار ہو گئے اور قاضی ابوشیبہ کے درس میں نہ جاسکے۔ قاضی صاحب نے اپنے شاگرد کی غیر حاضری کا لوگوں سے سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ ابوبکر الخطیب بغدادی نے بسند متصل یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ :

ایک بار متیم بیمار ہو گئے۔ ابوشیبہ نے لوگوں سے دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ بیمار ہیں۔ فرمایا کہ چلو متیم کی عیادت کریں۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہو گئے اور قاضی صاحب کی ہم کابی میں متیم کی عیادت کے لیے بشر طباخ کے گھر پہنچے۔ ان کو گھر پر کھڑا دیکھ کر ایک شخص بھاگا ہوا بشر کے پاس آیا اور بتایا کہ تیرے گھر شہر کا قاضی

ایا ہوا ہے والد گھراٹے تو قاضی صاحب ہشیم کے پاس بیٹھے ہوئے
تھے۔ جب قاضی صاحب واپس چلے گئے تو بشیر نے اپنے بیٹے سے
کہا۔ یا بنی قدکنت امنعت من الحدیث فاما الیوم فلا۔ بیٹے
میں تم کو حدیث پڑھنے سے روکتا تھا لیکن آج سے نہیں روکوں
گا۔ ابو شیبہ جیسا میرے گھراٹے واہ رے میرے نصیب بھلا میں
اس کی کبھی آرزو بھی کر سکتا تھا۔

بغداد میں علم حدیث کی اشاعت میں امام ہشیم کا بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ حافظ سخاوی نے امام
ذہبی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ :

بغداد جو عراق کا سب سے بڑا شہر ہے اس کی آبادی تابعین کے آخری
دور میں ہوئی۔ سب سے پہلے یہاں جس نے حدیث کی اشاعت کا کام
کیا وہ ہشام بن عروہ اور ان کے بعد شعبہ اور ہشیم ہیں۔
ان کی حدیث دانی کا حال معلوم کرنا ہو تو حماد بن زید کا وہ بیان پڑھیے جو خطیب بغدادی
نے بسند متصل پیش کیا ہے۔

محدثین میں ہشیم سے زیادہ میں نے بلند پایہ کوئی نہیں دیکھا ہے
کچھ محدثین تو ان کو سفیان ثوری سے بھی برتر کہتے تھے۔ امام مالک
ان کی بے حد تعریف کرتے تھے وہ اسے تسلیم ہی نہ کرتے تھے
کہ عراق میں ان کے سوا کوئی محدث ہے وہ فرماتے تھے کہ کیا
ہشیم سے بڑھ کر بھی عراق میں کوئی محدث ہے۔

ہشیم امام عظیم کے خاص تلامذہ ہیں سے ہیں اور ہشیم کے تلامذہ میں دوسرے محدثین
کے ساتھ امام احمد بن حنبل کو خاص مقام حاصل ہے اس لحاظ سے جیسے ہشیم اور ابو یوسف
کا باپیم رشتہ استا و برادر ہونے کا ہے۔ ایسے ہی امام احمد کا رشتہ بھی ہشیم اور قاضی ابو
یوسف سے نسبت تلمذ میں ایک ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے جب تک تحصیل علم کا کام

م شروع کیا تو سب پہلے قاضی ابویوسف کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیثیں لکھیں۔ فن حدیث میں اگر قاضی صاحب کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے دو شاگرد امام احمد اور امام یحییٰ بن معین ان کے بارے میں آرا پر ٹپھتے۔ افسوس کہ یہ تفصیل کا محل نہیں ہے۔ بہر حال منہم بن بشیر علم حدیث کے امام اور امام ابو حنیفہ کے تلمیذ ہیں۔ الخطیب نے ان کی تاریخ وفات ۱۸۰ھ بتائی ہے۔

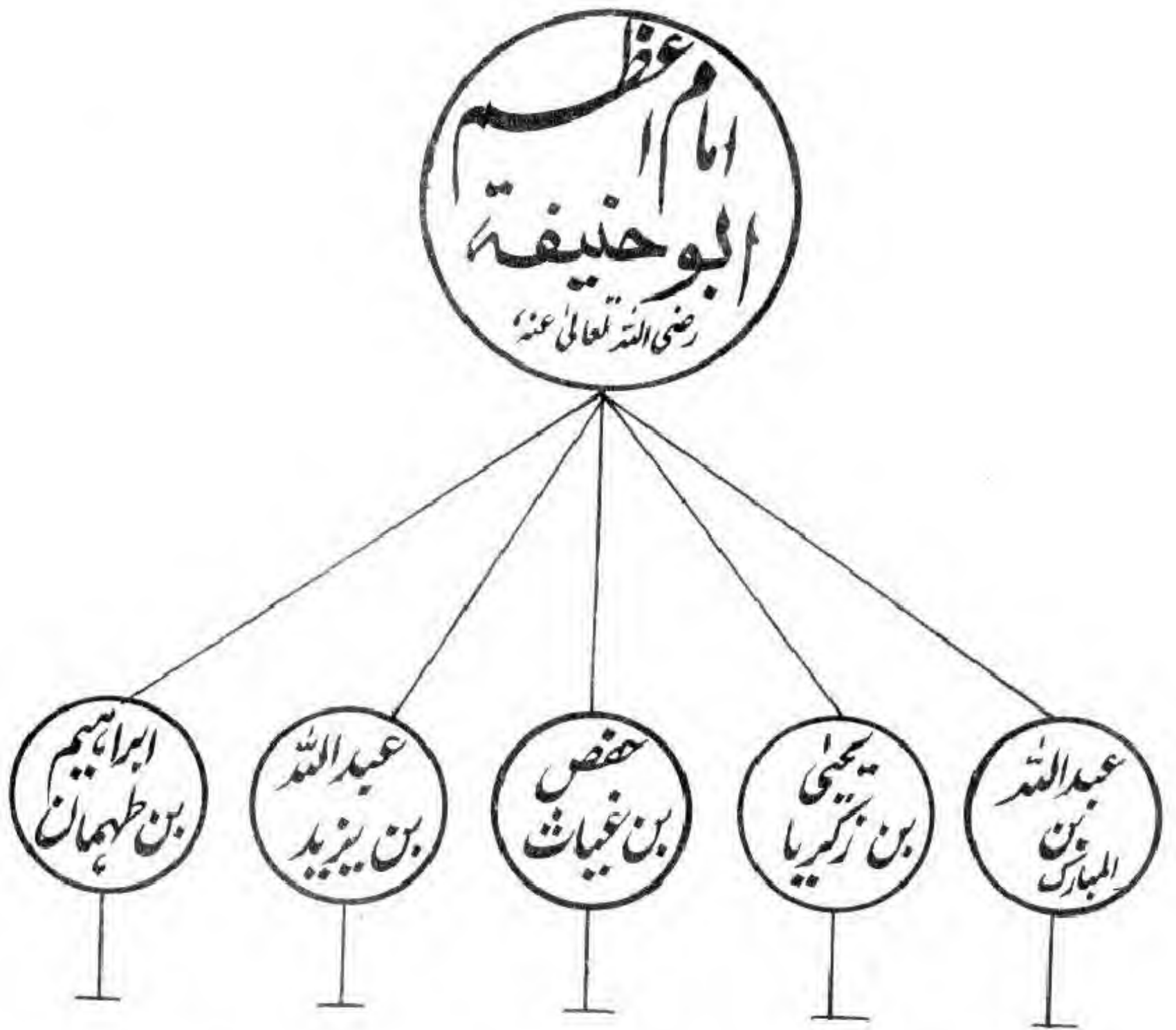
یہاں امام اعظم کے تمام تلامذہ کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی حفاظ ہیں جن کے تراجم حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھے ہیں اور جن کے بارے میں خود امام ذہبی کی تصریح ہے کہ یہ امام اعظم کے تلامذہ ہیں یا پھر جن کا امام علی بن المدینی، امام بخاری، حافظ عسقلانی نے امام اعظم کے تلامذہ حدیث میں ذکر کیا ہے۔

اگر ہم یہاں حافظ الدین البزار اور علامہ خوارزمی کی تصریح کے مطابق امام اعظم کے تمام تلامذہ بیان کریں تو ایک طول طویل داستان ہو جائے گی اس لیے ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف ان ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

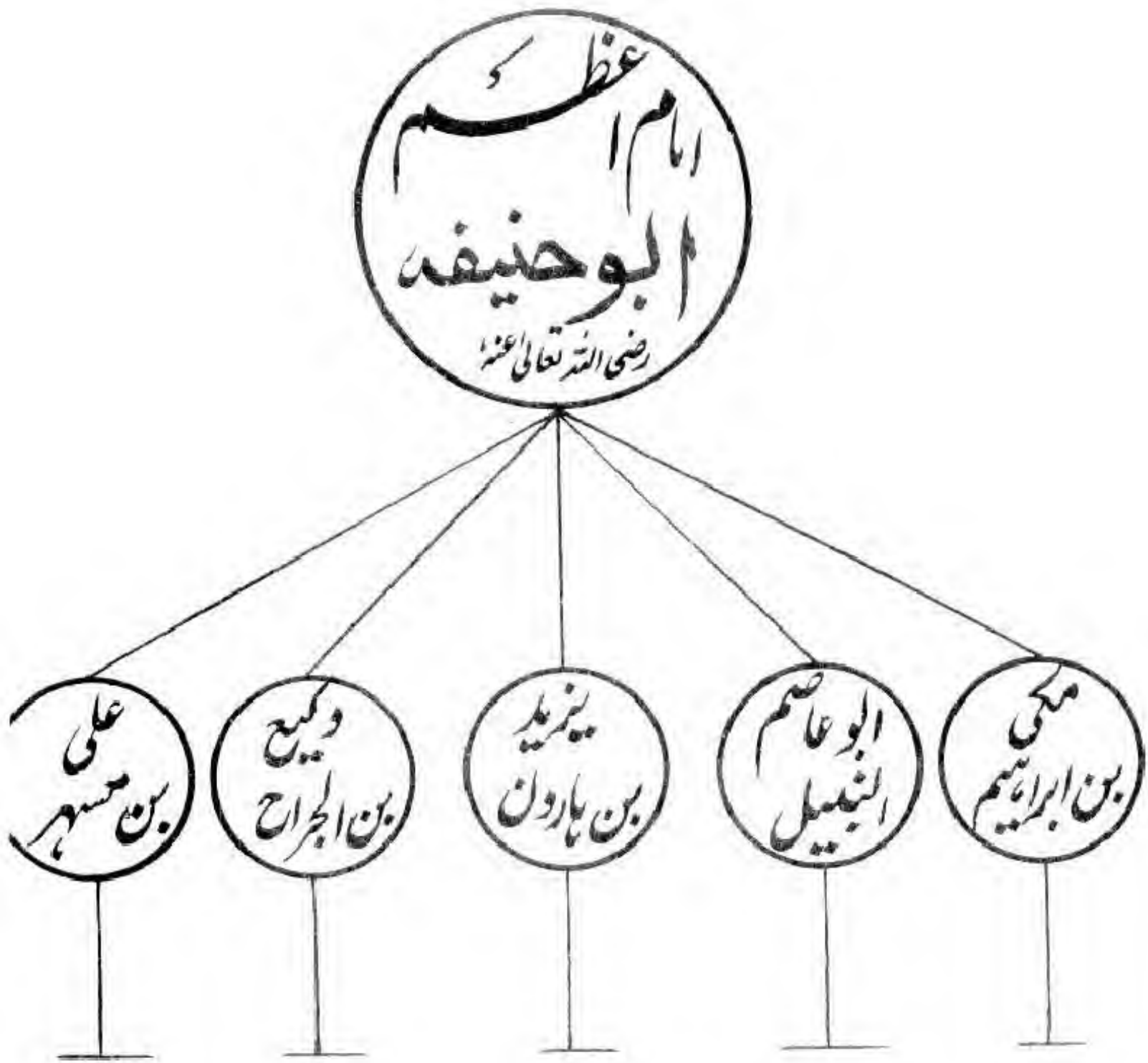
محدثین کرام کا امام اعظم سے علمی رشتہ

یہ امام اعظم کے چند مخصوص تلامذہ ہیں۔ لیجئے ان ہی کی مدد سے بعد میں آنے والے محدثین کا امام اعظم سے علمی رشتہ معلوم کر لیجئے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس آفتاب عالمتاب کی شعاعیں کہاں کہاں پہنچی ہوئی ہیں۔

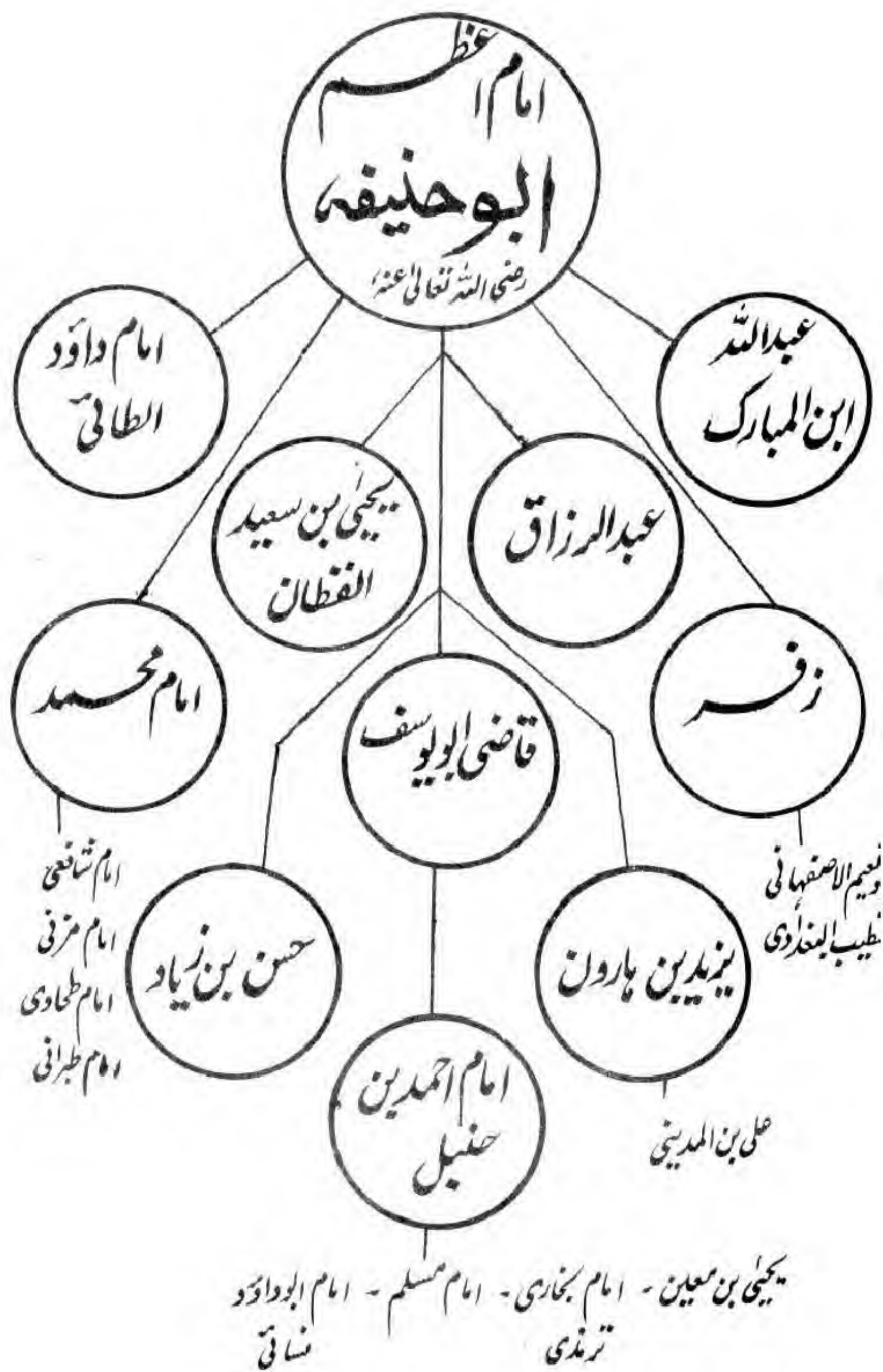
اس شجرہ علمی کی ایک ایک شاخ کی نشاندہی تو اڑبیں مشکل ہے۔ ہم یہاں صرف بطور گٹے از گلزار اجمالی طور پر عرض کرتے ہیں۔ اسی اجمال سے آپ کو پوری تفصیلات کا اندازہ ہو جائے گا۔



۱- ابراہیم بن طہمان	۱- اسحاق بن راہویہ	۱- ابو کریب	۱- عبد الرحمن بن ہمدانی
۲- عبد اللہ بن یزید	۲- عثمان بن ابی شیبہ	۲- یعقوب	۲- یحییٰ بن معین
۳- حنص بن غیاث	۳- علی بن المدینی	۳- ابراہیم بن موسیٰ	۳- ابو بکر بن ابی شیبہ
۴- یحییٰ بن زکریا	۴- یحییٰ بن معین		۴- احمد بن حنبل
۵- عبد اللہ بن المبارک			



۱۔ علی بن حجر	۱۔ ابو کریب	۱۔ عبد بن حمید	۱۔ الدارمی	۱۔ اکلمی
۲۔ ہناد بن اسیری	۲۔ علی بن المدینی	۲۔ ابو خنیس	۲۔ ابو مسلم الجعفی	۲۔ یحییٰ بن معین
۳۔ سوید بن سعید		۳۔ ابو بکر بن ابی شیبہ	۳۔ الحارث بن ابی اسامہ	۳۔ الذہبی
				۴۔ عباس الدوری



عظ
امام
ابو حنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عبدالرحمن بن مہدی، اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی، محمد بن یحییٰ، الذہلی

عبداللہ المبارک

یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، ابو زرعمہ

امام احمد، امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، ابو زرعمہ، ابوالقاسم البغوی

عبداللہ بن زید
المقبری

امام بخاری، محمد بن نصر موزی، حمزہ، مطین، ابن خزمیہ

الدارمی، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، جعفر الفریابی

ابوعامر البیہقی

ابو مسلم الکجی، ابو بکر القطیعی، ابوالقاسم الطبرانی، النجاشی، الفزار

الکدیری، ابن الانباری، ابو بکر القطیعی، ابو بکر الشافعی

الذہلی، ابو زرعمہ، ابن خزمیہ، السراج، بخاری

مکی بن ابراہیم

ابو کریب، بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ

یعقوب بن ابراہیم، یحییٰ بن صاعد، قاسم المطرز، یحییٰ بن محمد

یحییٰ بن کثیر

عظ
امام
ابو حنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حفص بن غیاث
اسحاق بن ابراہیم : بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی
عثمان بن ابی شیبہ : ابویعلی، جعفر القریابی، نسائی، ابن ماجہ

ابراہیم بن طہمان
بخاری : محمد بن نصر مزنی، ابن خزیمہ، صالح بن جزیرہ
نسائی : ابوبشر الدولابی، ابوالقاسم الطبرانی
علی بن المدینی : ذہبی، بخاری، ابویعلی

دکین بن الجراح
ابویحییٰ بن ابی شیبہ : ابوزرعمہ، یحییٰ بن محمد، الفریابی

علی بن مسہر
علی بن حجر : بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی
ہناد بن السمری : ابوزرعمہ، ابوالعباس، عبدان

مسعر بن کدکام
یحییٰ بن آدم : احمد، اسحاق، عبد بن حمید، الحسن بن علی
ابونعیم : محمد بن یحییٰ الذہبی، بخاری، دارمی، القعات

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ



اصحابہ

یحییٰ بن یوسف - ابو یوسف

اصحابہ

امام احمد

محمد بن عبد اللہ

سفیان الثوری

امام شافعی

احمد بن ابی یوسف

دارمی

یحییٰ بن عقیل

۷۴

طبرانی

یحییٰ بن یوسف
مسلم، ابوالزناد

انصاری

اصحابہ

حمیدی

ابن ابی شیبہ

ذہبی

یحییٰ بن یوسف

مسلم، ترمذی، ابن خزیمہ

یحییٰ

اصحابہ

یحییٰ

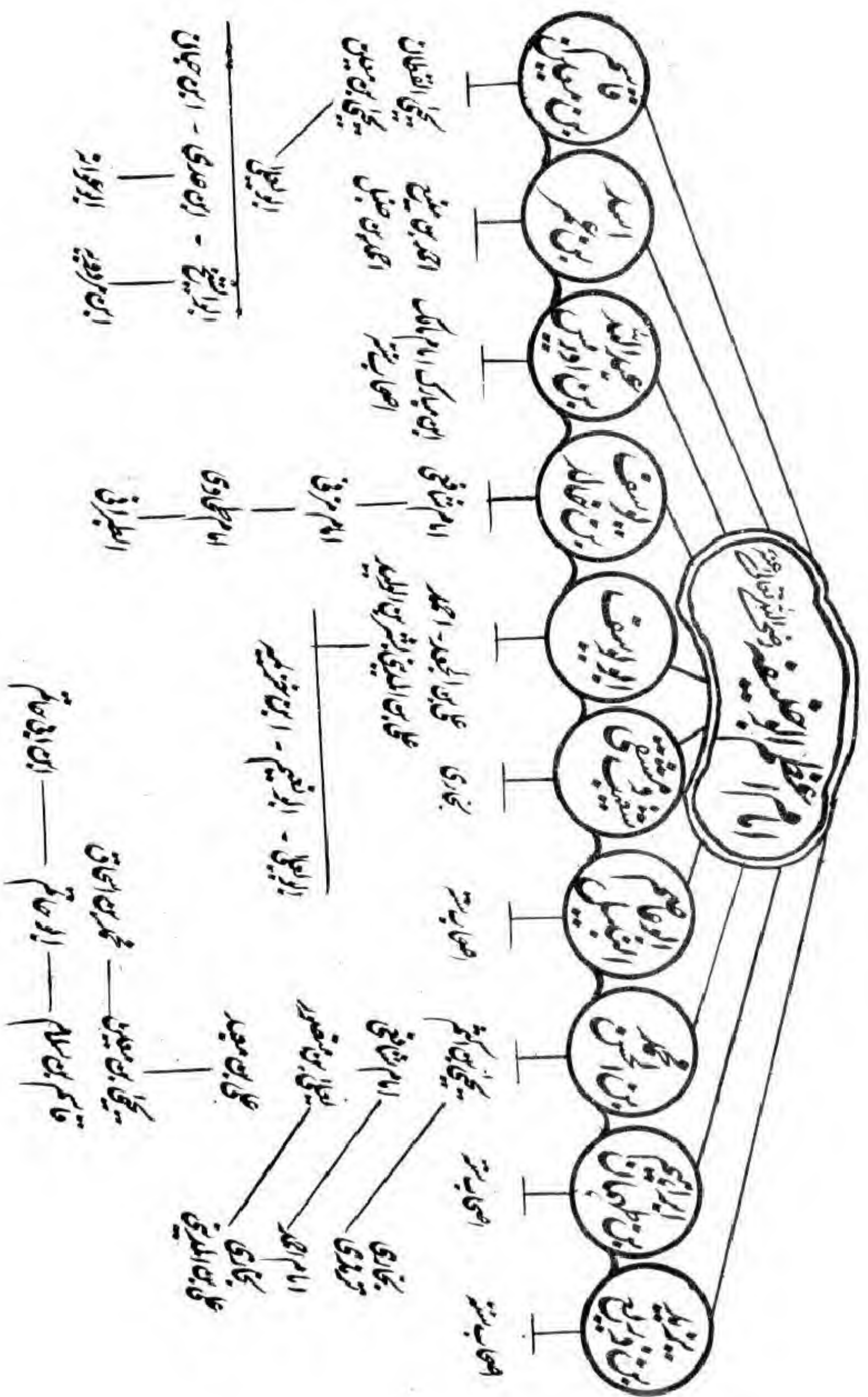
یحییٰ بن یوسف

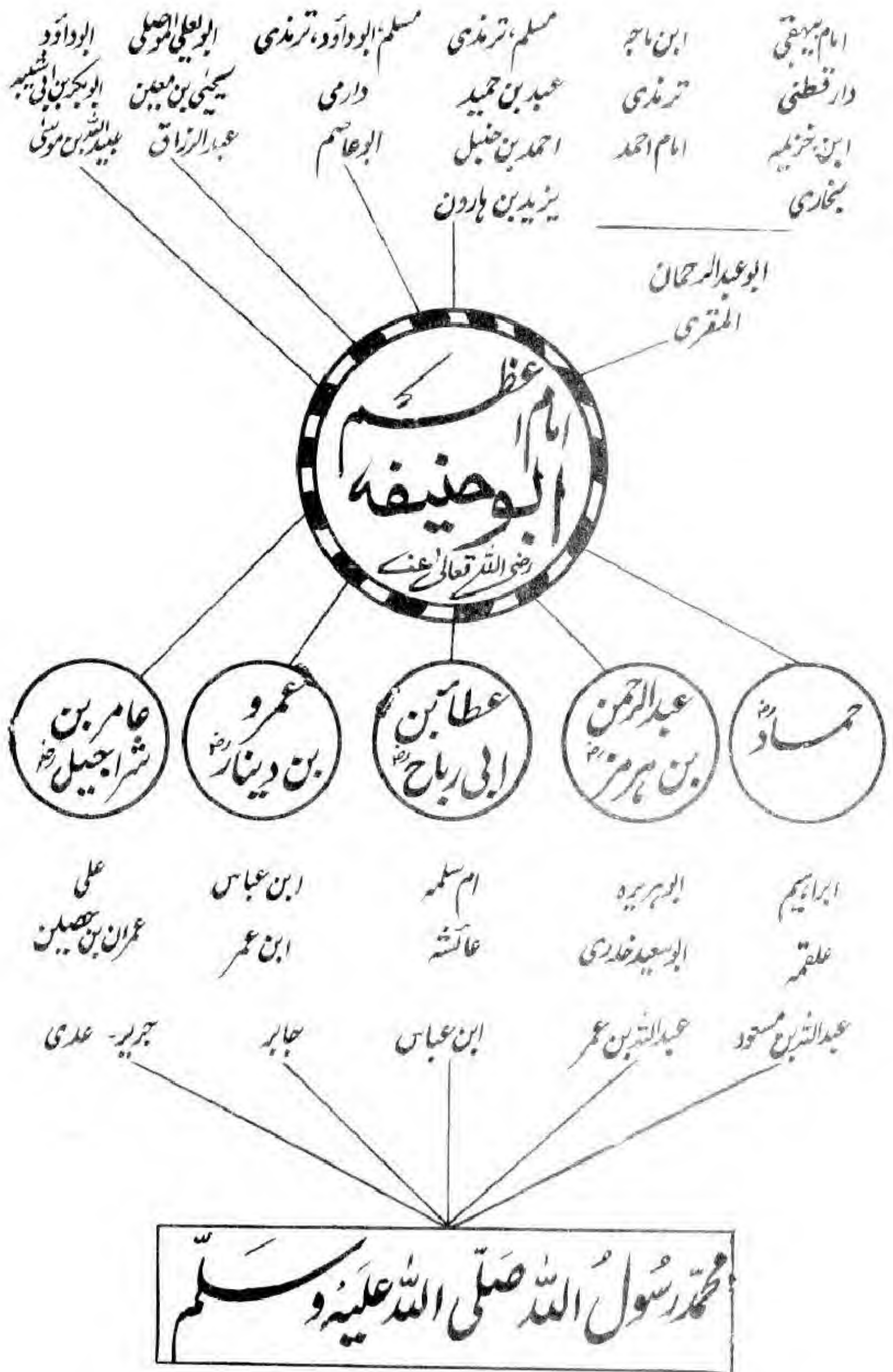
علی بن المدینی

بیہقی، صاحبکم، ابوالعزیز، دارقطنی

شیخ الاسلام المودعی

احمد بن فضال





اشایہ

مرتبہ: عبد الوکیل علوی

_____ اسماء کتب

_____ اسماء رجال

_____ اسماء اماکن

اسماء الكتب

(الف)

آداب القاضي ٢١٩

ابو حنيفة (البزهره) ٣٥٢، ٣٥٥، ٣٥٦

اتحاف النبلاء (نواب صديق حسن خان) - ٤٤

١٢٥ ، ١٢٦ ، ٢٦٩ ، ٢٩٩ ، ٣٥٠ ، ٣٥٢

٣٤٣ ، ٣٣٩ ، ٣٣٠ ، ٣٦٣

الاتفاق في علوم القرآن ١٥٠ ، ٤٨١ ، ٦٨١ ، ٦٤

٣٢٣ ، ٣٢٢

الاجابة فيما استدركة عائشة على الصحابة ١٠٦

اجوبة الفاضل ٢٨٨ ، ٢٨٩ ، ٥٨٨ ، ٦٢٥ ، ٦٢٦

٦٦٨ ، ٦٦٩ ، ٦٦٢ ، ٦٦٣

اجوبة المنيقة عن اعتراضات ابن ابي شيبة ٢٢٦

الاحكام في اصول الاحكام ٣٦٤ ، ٢٧٢ ، ٢٨٨

١٤٠ ، ١٤١ ، ١٤٢ ، ١٤٣ ، ١٤٤ ، ١٤٥

١٥٨ ، ١٥٩ ، ١٦٠ ، ١٦١ ، ١٦٢ ، ١٦٣

ابن حزم، احكام الاحكام (أحمدى) ٥٥١

احكام القرآن (ابن العربي) ٥٦٨

احكام القرآن (مختصا) ١٩٠ ، ٢١٥ ، ٢٢٠

٥٩٤ ، ٦١١ ، ٦١٥

احمد بن حنبل ٢٣٤

انخبار ابى حنيفة ١٢٣ ، ٣٦١

الانخبار الطوال ٢٢٥

اختصار علوم الحديث ٢٣٦ ، ٢٨٢ ، ٢٨٨

٥١٩ ، ٥٢٢ ، ٥٢٩ ، ٥٢٤ ، ٥٢٨ ، ٥٥٥

ابن كثير (٥٥٩ ، ٥٦٥)

اختلاف ابى حنيفة وابن ابي ليلى ٢٥٨ ، ٦٨٠

اختلاف الصحابة ٢١٩ ، ٦٩٢

اختيار اعتماد المسانيد ٣٩١

الادب المفرد ٢٢٠

الاذكار ٦٦٢

ارشاد الفحول (شوكاني) ٦١٨ ، ٦٦٩

ارشاد السارى ١٢٢

ازالة الخفا ٥٦ ، ١٠١ ، ١٠٤ ، ١١١ ، ١١٥ ، ١١٩ ، ١٢٤

١٣٦ ، ٢٥٦ ، ٣٣٤ ، ٣٣٨ ، ٣٣٩ ، ٣٤٠ ، ٣٤١

٦١٤ ، ٦١٥ ، ٦١٦

الازهار المتناثرة ٥٤٥

اساس البلاغة ١٢٠

الاستذكار لمذاهب علماء الامصار ٢٨٨ ، ٣٩٤

ابن عبد البر ٦١٠

الاستيعاب الاسماء الصحابة ۶۵۱، ۸۹، ۸۸

اسد الغابة ۱۳۴، ۱۰۸

اسعاف المبطلات ۲۵۸، ۲۵۳، ۲۴۲

اشارات المرام ۲۴۵، ۱۶۵، ۱۶۳، ۱۶۲

اشقة الممات ۴۸۹

اصابر في تميز الصحابة ۲۳۸، ۱۸۴، ۱۰۸، ۱۰۳، ۸۸

اصول دين يزدي ۶۴۱، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۲

اصول الدين (عبد القاهر) ۲۴۶، ۱۶۶

اطراف ابن القيسراني ۳۹۱، ۳۹۰

اطراف احاديث ابی حنیفہ ۳۹۹، ۳۹۱

اعلام السالكين عن كتب سيد المرسلين ۹۳، ۸۹

اعلام الموقعين ۲۴۸، ۲۴۵، ۱۰۵، ۵۵، ۵۳

۳۵۹، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۱۳، ۴۱۴، ۴۱۶، ۴۱۴

۵۳۳، ۶۰۹، ۶۱۸، ۶۲۰، ۶۳۳، ۶۵۳

۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۶۶

اعلان بالتوزيع ۲۳۳، ۲۲۲، ۱۸۵، ۱۴۸

۲۳۴، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۶۳، ۲۸۰، ۲۹۰، ۲۹۰

۳۵۲، ۳۶۶، ۳۹۹، ۴۰۱، ۴۰۴، ۴۰۶

- ۵۳۷

اصول سرخسي ۶۶۸

اطراف صحيحين ۳۹۰

الفقه الاوسط ۱۶۲

الاغانى ۳۳۸

الافصاح ۴۸۶

الفقه الاكبر ۱۶۳

اقوم المسالك ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷

الاكمال ۴۵۱، ۳۵۶

الفقيه ۴۴۲، ۳۴۲، ۳۴۶، ۴۴۸، ۴۴۹

- ۵۴۸

الامام ۴۶۹

المقاصد الحسنية ۱۸۱

الامالي (قاضي البوليوسف) ۲۵۸

امام ابن ماجه اور علم حديث ۳۵۶، ۴۴۴

الامتناع ۴۰۶، ۳۵۸

امام اعظم اور علم الشرائع ۴۱۲، ۴۶۶

الامصار ذوات الآثار ۲۴۳، ۲۴۴

الانتباه ۳۷۹

الانتصار والمرجح ۳۰۶، ۱۸۸

(سبط بن الجوزي)

الانتصار السالك ۱۸۶، ۱۸۵

الانتصار في فضائل الثلاثة آل أمية - الفقهاء ۷۶

۸۸، ۱۲۹، ۱۵۸، ۱۹۰، ۱۹۶، ۱۹۱، ۲۰۹

۲۳۹، ۲۵۸، ۲۶۶، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳

۴۱۰، ۴۲۴، ۴۴۱، ۴۸۰، ۵۲۶، ۵۴۴، ۵۴۵

۵۵۳، ۵۵۸، ۵۸۱، ۵۹۴، ۶۱۶، ۷۱۸

- ۷۱۹

انسان العين ۳۸۸، ۳۸۹

انسان النيون في سيرة الامين والمؤمن ۱۸۰

الانصاف ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۴، ۵۱۳

۵۱۵، ۵۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷

انفاس العارفين ۳۱۵
 النموذج العلوم (دوانی) ۶۶۲
 اوائلی انبیلیہ ۳۶۰
 ادجز المساکب ۱۲۱، ۵۴۳، ۵۴۴
 (مع موطا)
 الاثیر معرفت رواته الآثار ۳۵۰

(ب)

الباعث الحثیث (احمد محمد شاکر) ۸۴، ۸۵، ۸۶
 ۵۳۱، ۵۳۳، ۵۸۶
 بدایۃ المجتہد ۶۱۵
 بدائع الفوائد ۶۰۸
 البدایہ والنہایہ ۱۳۰، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۸۲
 ۱۸۶، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۵
 ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۳، ۳۹۱، ۴۲۶
 البدر الطالع ۳۹۲
 البستان ۵۳۸
 بستان المحدثین ۳۷۲، ۳۷۹، ۳۹۷، ۴۸۱
 ۴۹۴، ۴۹۵
 بلوغ الامانی ۲۰۶

(ت)

تاریخ الاسلام (سماعی) ۱۸۵
 تاریخ ابی الفداء ۲۴۵
 تاریخ (ابن خلکان) ۱۳۱
 تاریخ الادب العربی ۴۱۳، ۴۱۷
 تاریخ اصفہان ۱۲۵، ۲۰۰

تاریخ الاسلام (ذہبی) ۱۲۸، ۱۴۷، ۱۴۸، ۲۶۸
 تاریخ الاسلام سیاسی ۱۵۱، ۱۵۷، ۲۲۴، ۲۲۵
 تاریخ بغداد ۳۷، ۴۱، ۴۳، ۱۵۱، ۱۵۳
 ۱۷۴، ۱۸۶، ۱۹۷، ۲۰۹، ۲۷۹، ۳۰۹، ۳۱۳
 ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۸، ۳۶۹
 ۳۷۷، ۳۷۹، ۳۸۲، ۳۸۵، ۴۰۲
 ۴۰۴، ۴۰۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۲، ۴۲۳
 ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۶۹، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۴
 ۴۹۶، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۱۳
 ۵۱۴، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۲۰ -
 تاریخ الخلفاء ۹۲، ۳۲۸، ۳۹۹، ۴۰۴، ۴۰۵
 تاریخ دمشق ۳۸۷
 تاریخ طبری ۱۲۶، ۱۲۷
 تاریخ العرب (حتی) ۱۶۷، ۳۱۳، ۴۸۷، ۶۶۷
 تاریخ الفقہ الاسلامی ۴۴۵، ۶۷۰
 تاریخ آداب العرب ۶۹۴
 تاریخ القرآن (الزنجانی) ۳۲۳
 تاریخ کبیر (بخاری) ۱۰۲، ۳۷۷، ۴۳۸، ۴۴۱
 ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۹۹
 تاریخ کبیر (ذہبی) ۴۰۶
 تاریخ اللغة العربیہ ۲۴۴
 تاریخ نیشاپور ۲۲۲، ۳۵۵
 ۳۸۵
 تانیب ۲۷۹، ۳۹۹، ۳۰۶، ۳۲۹، ۳۷۸
 التبصیر ۱۶۷
 تبیض الصحیفہ ۷۷، ۱۲۵، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۷
 (سیوطی)

التعليقات على الدراسات ٦١٦، ٢٢

تغريب علوم الحديث ٨٢

التعليق المجدد ٢٤٠، ٢٣١، ٣٥٩، ٦١٠، ٢

التعليقات على الاجوبة الفاضلة ٥٤٩

التعليقات على توضيح الافكار ٣٩٤، ٣٢٩، ٣٠٠

٢٢٨

التعليقات على الحارمي ٢٩٠

التعليقات على كتاب الآثار ٣٥٢

التعليقات على الموافقات ٥٨٩

التعليق على الانتقاء في فضائل الثلاثة ٢٦٤، ٢٦٦، ٢٥٢

التعليقات على الانتقاء ٢٠٦، ٢٤٢، ٢٤١، ٢٦٨

التعليقات على شروط الامة الخمسة ٥١٠، ٥٠٦، ٢٩٣

التعليقات على المناقب ١٢٣

التعليقات ذب ذبابات ٢٢

التعليقات الاحمد محمد شاكر على اختصار علوم الحديث ٢٣٨

التعليقة المنيعة ٣٩١

تفسير ابن كثير ٢٤

تفسير مظري ١٢٦

تقدم الجرح والتحليل ٢٦٩، ٢٦٨

تقدم على نصيب الراي ٣٨٩، ٣٨٦، ٣٠٠، ١٩١

التقريب (لنودي) ٣٩١، ١٣٩، ١٩١، ٢٤٤، ٣٠٠، ٢

٣٠١، ٣٠٨، ٣١٨، ٥١٩، ٥٢٢، ٥٢٤، ٥٢٨، ٥٢٨

٥٥١، ٥٥٩، ٥٦١، ٥٦٥، ٥٦١، ٥٦٢، ٥٦٣، ٥٦٤

تقريب التهذيب ٣٥١، ١٣٤

التقرير والتجريد ٢٦٥

تفسير العلم ٨٢

التقيد والايضاح ٢٩٠

تكملة شرح المرقضي ١٢٢

التلخيص الجبر ٦٢٦، ٦٢٧، ٦٢٨، ٦٢٩

تلفيح نهوم اهل الاثر ١٠٢، ١٩٦، ١٩٧، ٢١٢، ٢١٣

(ابن الجزري) ٣٩٩

التمهيد ٢٨٨، ٢٨٩، ٣٢٩، ٣٩٤، ٢٨٥

تنقيح الانظار ٩١، ٢٥٣، ٢٨٢، ٢٨٣، ٢٨٤، ٢٨٥

٣٩٣، ٢٣٠، ٢٣١، ٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٥، ٢٣٦

٥٥٤، ٥٥٥، ٥٥٦، ٥٥٧، ٥٥٨، ٥٥٩، ٥٦٠

تنقيح الفصول (قرافي) ٥٩٠

تنوير الحوالك (مقدم) ٣٢٢، ٣٢٩، ٣٣٠، ٣٣١

٣٩٣، ٥٢٠

توالي التأسيس ٢٢١، ٢٢٢

توجيه النظر ٤٨، ٤٩، ٥٠، ٥١، ٥٢، ٥٣، ٥٤

٣٠٤، ٣١٦، ٣٢٦، ٣٢٧، ٣٢٨، ٣٢٩

٢٦٢، ٢٦٣، ٢٦٤، ٢٦٥، ٢٦٦، ٢٦٧، ٢٦٨

٢٥٣٦، ٢٥٣٧، ٢٥٣٨، ٢٥٣٩، ٢٥٤٠، ٢٥٤١

٥٩٥، ٦١٢، ٦١٣، ٦١٤

التوسل والوسيلة ٦٥٢، ٦٥٣

توضيح الافكار ٨٤، ٨٥، ٨٦، ٨٧، ٨٨، ٨٩

٣١٨، ٣١٩، ٣٢٠، ٣٢١، ٣٢٢، ٣٢٣، ٣٢٤

٢٥٢، ٢٥٣، ٢٥٤، ٢٥٥، ٢٥٦، ٢٥٧، ٢٥٨

٢٦٢، ٢٦٣، ٢٦٤، ٢٦٥، ٢٦٦، ٢٦٧، ٢٦٨

٢٨٩، ٢٩٠، ٢٩١، ٢٩٢، ٢٩٣، ٢٩٤

ش

شذرات الذهب ٢٢٢، ٢٢٦

شرح الاذكار ٦٥٥

شرح اصول ٦٩

شرح بخاري (ذكرها انصاري ٢٦٣

شرح الاحياء (عراقي ٢٥١

شرح ترمذي ٢٢٢

شرح الفقيه ١٢٢، ١٨١، ٢٠٣

٢٨٦، ٢٨٨، ٢٨٩، ٢٩٠

شرح بخاري (قسطلاني ٣٤٠

شرح تنقيح الفصول ٥٦٠

شرح السير الكبير ٦٦٤، ٦٦٨

شرح صحيح امام مسلم (نودي ١٢٢، ١٣٥، ٣٣٣

٢٥٥، ٢٤٣

شرح العقيدة الاصفهانية ١٣٥، ١٥٦

شرح الحمد (العبد ٦١٢

شرح مسند امام اعظم (ملا علي قاري ١٤٣، ١٨٤

١٩٨، ٢٠٨، ٥٦١، ٥٤٢

شرح مسند احمد ٢١١، ٢١٢

شرح معاني الآثار ٩٤، ٢٦٣، ٢٦٥، ٦٢٢، ٦٢٥

شرح المواهب اللدنية ١٤٨، ١٤٩

شرح المذهب ١٢٢، ٢٨٣، ٥٠٨

شرح نخبة الفكر ١٣٩، ٢٢٢، ٦٢٦

شرح الوجيز ٥٨٢

شرح بدايه (عيني ٣٥٨

شروط الائمة الخمسة (تجليقات ٢١٤، ٢٥٠

٢٥٣، ٢٥٨، ٢٥٩، ٢٦٠، ٢٦٥

٢٦٦، ٢٦٧، ٢٦٨، ٢٦٩، ٢٧٠، ٢٧١

٢٧٣، ٢٧٤، ٢٧٥، ٢٧٦، ٢٧٧

٢٧٨، ٢٧٩، ٢٨٠

شرح والمقدم ٢٨٣

الشروط الائمة الستة ٢٨٤، ٢٨٥، ٢٨٦

شفا السقام في زيارة خير الانام ٢٥١، ٢٨٤

شمال نبوي ٩٢-

ص

صحيح ابن حبان ٥١، ٩٠، ٩١

صحيح بخاري ٥٠، ٥٢، ٦٢، ٩٥، ٩٤، ١٢١

١٢٢، ١٢٣، ١٢٤، ١٢٥، ١٢٦، ١٢٧، ١٢٨

١٢٩، ١٣٠، ١٣١، ١٣٢، ١٣٣، ١٣٤

١٣٥، ١٣٦، ١٣٧، ١٣٨، ١٣٩، ١٤٠

١٤١، ١٤٢، ١٤٣، ١٤٤، ١٤٥، ١٤٦

١٤٧، ١٤٨، ١٤٩، ١٥٠، ١٥١، ١٥٢

١٥٣، ١٥٤، ١٥٥، ١٥٦، ١٥٧، ١٥٨

١٥٩، ١٦٠، ١٦١، ١٦٢، ١٦٣، ١٦٤

١٦٥، ١٦٦، ١٦٧، ١٦٨، ١٦٩، ١٧٠

١٧١، ١٧٢، ١٧٣، ١٧٤، ١٧٥، ١٧٦

١٧٧، ١٧٨، ١٧٩

صحيح مسلم (ومقدم ٥٢، ٨٠، ١٢١

١٢٢، ١٢٣، ١٢٤، ١٢٥، ١٢٦، ١٢٧

١٢٨، ١٢٩، ١٣٠، ١٣١، ١٣٢، ١٣٣

طبقات الفقهاء (شيرازي) ٨٥، ٢٢٢

طبقات القراء (نوبختي)

طبقات كاشغري ٤٤

طبقات المحدثين ٣٥٦

طلوع اشريا ١٨١

ظ

نظر الاماني (مولانا عبدالحق) ٦٦١، ٦٦٢، ٦٦٦

ع

العالم والمتعلم ١٦٢، ١٦٣

عارضه الاحوذى ٨٠، ٢٨١

عجالة نافذة ٣٤٠

عقائد نسفيه ٦٤١

عقد الجيد ٥٨

عقود الجمان ٢٨٠، ٢٩٩، ٢٢٤

عقود الجواهر المنيضة ٣٦٢، ٦٢٦

عقود الجواهر المضية في اولة تدبير امام ابي حنيفة ٣٩٢

العقيدة والشرعية ٢٢٥

العلل المتناهيمة ٦٥٤

علوم الحديث ٨٢، ٩٩، ٥٨٣

عمدة الرعاية ١٢٢، ٥٨٢، ٥٨٥

عمدة القاري ٢٠٥، ٢٣٥، ٢٣٢

عنانية ١٦٢، ٦٥٩

العواصم ٢٨٢

عون الباري على اولة البخاري ١٢٥، ٦٥٩

عين الاجابة في استدراك عائشة على الصحابة ١٠٦

٣٥١، ٣٦٣، ٣٦٩، ٣٤٠، ٣٩٣، ٣٩٤

٢٢٤، ٢٢٨، ٢٥٢، ٢٥٣، ٢٥٤، ٢٥٥

٢٥٤، ٢٦٢، ٢٦٥، ٢٦٨، ٢٦٩، ٢٦٣، ٢٨٩

٢٩١، ٢٩٢، ٢٩٤، ٢٩٥، ٢٩٦، ٢٩٧، ٢٩٨

٦١١، ٦٢٦، ٦٣٠، ٦٣١، ٦٣٥، ٦٣٦، ٦٣٧

٦٥٠، ٦٨٥

صحيفة جابر ٩٤، ٩٨، ٣٢٠، ٣٢٥

صحيفة سمرة (جباله) ٩٨

صحيفة صادقة ٩٣، ٩٩، ٣٢٥

صحيفة صديقي ٩٦، ٣٢٥

صحيفة صحيم - ٩٩، ٣٢٥

صحيفة حضرت علي ٩٥، ٣٢٥

صحيفة بهام بن بهشير ٨٢، ٩٩، ٢٠١، ٢٠٢، ٢٠٣

صيد الخاطر ٢٣٤

صدر الائمة ١٣١، ٢٢٣، ٢٢٤، ٢٢٥، ٢٢٦، ٢٢٧، ٢٢٨، ٢٢٩

ض

الصفاء الصغير (البخاري) ٤٦

الضوء الامع ٣٥٢

ط

طبقات ابن سعد ١٠٢، ١٠٥، ١٠٨، ١٩٠، ٢٩٨، ٣٢٤

٢١٤

طبقات الحفاظ ٣٤٢

طبقات الخليل ٤٥، ٣٨٥، ٢٣٥

طبقات الشافعية الكبرى ١٩١، ٢٩٢، ٢٢٦

طبقات سيوطي ٨١، ١٢٢

عجون الاثر في فنون المغازي والسير ٣٥٢، ١٨٠

ع

غنيث النخام ٢٠٣

تخايبه الماتول ٣٥٣

ف

فتاوى ابن تيمية ٣١٥، ٦١٥

فتاوى عزيزي ٥٨٨

فتح الباري ١٨٠، ١٢٨، ١٣٥، ١٤٥، ١٤٦، ١٩٢،

٢١٨، ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٦٢، ٢٨٦، ٣٢٦،

٣٣٢، ٣٣٣، ٣٣٥، ٣٦٩، ٣٩٣، ٣٩٣،

٤٠٤، ٤٣٣، ٤٣٣، ٤٣٤، ٤٣٤، ٤٣٤،

٤٣٥، ٤٣٦، ٤٣٨، ٤٣٩، ٤٣٩، ٤٣٩،

٤٣٩، ٤٣٩، ٤٣٩، ٤٣٩، ٤٣٩،

فتح القدير ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

فتح المغيث ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

فتح الملمح (مقدمه) ٢٤٠

فتوح البلدان ١٨٩

(اصول) فخر الاسلام ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

الفرق بين الفرق ٦٦٩

الفصل في الملل والاسماء والنحل ١٥٦، ٢٠٣، ٣٠٠،

٣٣٠

فضل علم السلف على الخلف ٦١٥

الفقه الاوسط ١٦٣، ١٦٣

الفقه الاكبر ١٦٠، ١٦٠

الفقيه والمفتي ٥٩٦

الفوائد البهية ١٢٣، ١٢٣، ١٢٣، ١٢٣، ١٢٣،

الفوائد المتكاثرة في الاخبار المتواترة ٥٤٥

الفوائد المجموعه ٦٨٥

فراش الرجوت ٢٨٢، ٣٣٠، ٣٣٠، ٣٣٠، ٣٣٠،

الفهرست ١٦٤، ١٦٤، ١٦٤، ١٦٤، ١٦٤،

١٦٤، ١٦٤، ١٦٤، ١٦٤، ١٦٤،

الفهرست الاوسط ٣٠٥

فيض الباري ٦١٥

فيض الحرمين ١٢٤

ف

القاموس ١٤٩

قرآن مجيد ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨،

كتاب التفسير (ابن طهمان) ٢٢٢
 كتاب التفسير (ابن المبارك) ١١١
 كتاب التفسير ابن عليه ٢٢٢
 كتاب التفسير (الزائدة) ١٠٤
 كتاب التفسير (مشيم) ١٠١
 كتاب النفقات ٢١٩
 كتاب التميز ٣١٤
 كتاب الثقات ٢٢٢
 كتاب الجامع (قرشي) ٦٠٢
 كتاب الجرح والتعديل (١٣١، ١٩١، ٢٨٩، ٢٩٢، ٢٩٨)
 ٦٨٨
 كتاب الجمع بين رجال الصحيحين ٣٩١
 كتاب الجهاد (ابن المبارك) ٢٢٢
 كتاب الخراج ١٠٨، ٢٥٨، ٢١٩، ٢٨٠٠
 كتاب الخراج (حسن بن زياد) ٢١٩
 كتاب الخصال ١٩١
 كتاب الذكر والدعاء ٢٢٢
 كتاب خطا البخاري ٢٩٠
 كتاب الروايت خطيب بغدادى ٢٦٥
 كتاب الرد على اهل المدينة ١٩١
 كتاب الرواة
 كتاب الرقاق ٢٨٦
 كتاب الروح ٤٤، ٤٥، ٦٠٩، ٦١٠
 كتاب الرهن ٣٥٣
 كتاب الزهد (ابن المبارك) ١١٠، ١١١

كتاب السنن (ابن ابى ذئب) ٢١٩، ٢٢٢
 كتاب الزهد (الزائدة) ١٠٤
 كتاب السنن (ابن جرير) ١٠٥، ١٠٦
 كتاب السنن (ابن ابى عرويه) ١٠٩، ١١٠
 كتاب السنن (ابن طهمان) ٢٢٢
 كتاب الكمال في الجرح والتعديل ٣٨٤
 كتاب السنن (عبد الملك بن عبد العزيز) ٢٢١
 كتاب السنن (اوزاعي)
 كتاب السنن (عقاد بن مسلم) ٢٢١
 كتاب السنن (الزائدة) ١٠٤
 كتاب السنن (محمد بن فضل) ٢٢٢
 كتاب السنن (المكحول) ٣٣٥
 كتاب السنن (دويك) ١٠٨، ٢٢١
 كتاب السنن (دوليد) ١٠٥، ٢٢٢
 كتاب السنن (مشيم) ١٠١
 كتاب السنن (سيحى بن زكريا) ١٠٤
 كتاب السير ١٩١، ٢٩٢
 كتاب السير (حسن) ٢٩٢
 كتاب الصدقة ١٩١، ٣٢٥
 كتاب الصلوة ٣٥٣
 كتاب الصدقات (امام سالم) ٣٣٥
 كتاب الصلوة ٢٩٢
 كتاب العالم والمتعلم ١٦٢، ١٦٣، ١٦٤
 كتاب الحلل (علي بن مدينى) ٢٩٢، ٢٩٣، ٢٨٢، ٢٨٣
 ٦٥٨

ل

باب المناسك ٢٥٢

لحظ الالحاظ وتعليق (كوتشري) ١٢١، ٣٤٢، ٣٣٣

٢٢٦

لسان الميزان (٣، ١٨٦، ٢٠٣، ٣٠٨، ٣٥٤)

٣٥٨، ٣٤٥، ٣٤٦، ٣٤٤، ٣٤٩، ٣٨١

٣٨٢، ٣٨٦، ٣٨٤، ٣٩١، ٣٣٢، ٥٣٥

٦٦٩، ٦٩٤، ٦٩٨

لمحات النظر ٣٥٦

لفظ المرجان من مسند ابن حنيفة النخعي ٣٩٢

م

موطأ (٢٤٠، ٢٠٦، ٢٥٨، ٢٦٩، ٢٨٠، ٢٨١)

٣٦٦، ٣٥١، ٣٦١، ٣٦٢، ٣٦٣، ٣٦٥

٣٦٤، ٣٦٩، ٣٤٠، ٣٤٢، ٣٩٢، ٣٩٣

٣٩٨، ٣٩٥، ٣٩٦، ٣٩٤، ٣٩٨، ٣٩٩

٣٠٠، ٣٠١، ٣٠٢، ٣٠٣، ٣٠٤، ٣٠٥، ٣٠٦

٣٥٢، ٣٦٥، ٣٨٩

موطأ (امام محمد) ٢٠٦، ٣٣٨، ٣٥٨، ٣٦٤

٣٢٤، ٥١٦، ٦٨٠

ماتمس به الحاجه ٣٢٢، ١٤٣، ٥٥٣، ٥٥٤

مارواه الاكابر عن مالك ٢٦٦

مبسوط (لامام محمد) ٢٥٨، ٢١٩

مبسوط (سرخسي) ٦٦٤، ٦٦٨

المجتمعي

مجموعه الرسائل والمسائل ٦٤٩

(ابن تيميه)

كتاب الفرائض (ابن ابي ليلى) ١١٩

كتاب الفرائض (حسن بن زياد) ١٢٣، ٢٠٦، ٢١٩

كتاب القراءه (بيهقي) ٥٠٨

كتب (قاضي ابو بكر بن حزم) ٣٣٥

كتاب الكنى والاسماء ١٢٨

كشف الآثار في مناقب ابي حنيفة ٣٤٩

كشف الاسرار ١٠٥، ٥٢١، ٥٢٥، ٥٦٢، ٥٩٤

٦١٣، ٦٤١، ٦٤٢

كشف الظنون ٣٥٢، ٣٢٢، ٣٢٤، ٦٦٤

الكفايه في علم الروايه ١٤٠، ١٨٤، ٢٥٥، ٢٦٠

٢٨٢، ٥١٦، ٥٢٠، ٥٢٨، ٥٣٨، ٥٥٠، ٥٥١

٥٦٠، ٥٦٢، ٥٦٥، ٥٨٢، ٥٩٦، ٦٢٣

٦٢٥، ٦٢٦

كتاب المنقود في تاريخ اليهود ٢٥٢

كتاب المدبج (دارقطني) ٢٦٢

كنز العمال ٣٣٩

كتاب المسالك

كتاب معاني الايمان ٢١٩

كتاب المناقب (لزامه) ٢٠٤

كتاب النسخ والمنسوخ ٢٢٢

كتاب القراءه (الازرق) ٢٢٢

كتاب القراءات (لزامه) ٢٠٤

كتاب القراءات (مشيم) ٢١٠

كتاب المفتح (عثمان بن سيداني) ٣٢٢

كتاب البوتر (مروزي) ٣٥٥

مسک الختام ۲۶۵، ۲۸۹

مسند ابراهیم بن سعد

مسند ابی یحییٰ صدیق ۳۴۲، ۳۴۳

مسند ابو جعفر عبداللہ ۲۳۱

مسند ابی جعفر محمد کوفی ۳۸۵، ۲۳۱

مسند بقی بن مخلد ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۸

مسند تنوخی ۲۳۱

مسند عبید اللہ بن موسیٰ ۲۲۹

مسند فاروق اعظم ۳۴۲

مسند مسدد بن مسرید ۲۲۹، ۲۳۱

مسند یحییٰ بن عبدالحمید ۲۳۱

مسند بزاز ۵۱، ۲۲۳

مسند شافعی ۳۵۱، ۳۴۲، ۳۸۳

مسند حارثی ۱۸۵، ۲۱۳، ۳۸۱، ۳۸۹، ۶۴۴

مسند موسیٰ بن زکریا، حصکلی ۲۶۳

مسند خوارزمی ۱۹۸، ۲۰۴

مسند دارمی ۸۵، ۸۸، ۹۰، ۱۱۲، ۱۲۴

۳۳۱، ۶۵۶

مسند خزاعی ۲۲۹

مسند امام اعظم ۳۸۸

مسند محمد بن حسن ۳۹۰، ۲۲۱

مسند قاضی ابویوسف ۳۹۰

مسند امام حسن بن زیاد ۳۹۰

مسند امام حماد ۳۹۰

محاسن الاصطلاح

المحاضر ۱۲۳

المحرث الفاضل ۸۲، ۸۴، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱

محمول ۵۶۰

المحلی (ابن حزم) ۶۰۸

المدخل الیه ۵۲۸، ۵۴۴

مدینۃ العلوم ۶۶۴

المدخل فی اصول الحدیث ۱۰۱، ۳۴۳، ۴۱۴، ۴۲۰، ۴۲۱

۴۶۰، ۴۲۹

مرآة الجنان ۱۲۱

مراتب الدیانۃ ۴۴۶

مراسیل ابی داؤد

مرقاۃ المفاتیح ۱۳۳، ۳۳۳

مستخرج ۴۹۵

مستخرج (ابو نعیم اصفہانی) ۳۳۱، ۴۹۶، ۴۹۸

" (ابو الفضل التبرار) ۴۹۶

" (محمد بن محمد نیشاپوری) ۴۹۶

" (ابو عوانہ سفرائی) ۴۹۶

" (احمد بن موسیٰ مردویہ) ۴۹۶

" (محمد بن العباس) ۴۹۶

" (محمد بن ابی حامد قطریفی) ۴۹۶

" (احمد بن ابراہیم البحرانی) ۴۹۶

مستصفیٰ ۵۶۰

المستند فی اختیار مختصر المسند ۳۹۱

مستدرک حاکم ۹۴، ۱۱۲، ۳۳۲، ۶۴۱، ۶۵۱

مسند ابوالقاسم عبداللہ بن ابی العوام ۳۹۰
 مسند ابوالحسن محمد بن مظفر ۳۸۹
 مسند ابی حنیفہ لابی الضیاء ۲۳۱، ۲۶۶، ۳۷۱، ۳۷۲
 مسند لابن المقرئ ۳۸۱
 مسند اصفہانی ۳۶۳، ۳۹۰، ۴۳۱
 مسند ابی حنیفہ (ابن عقیقہ) ۳۷۸
 مختلف مسانید ۴۳۱
 مسند احمد (مقدمہ) ۴۲۴، ۴۲۵
 مسند احمد بن حنبل ۴۴، ۸۳، ۹۵، ۹۹، ۱۰۴، ۱۱۲، ۱۸۲، ۱۹۸، ۲۲۰، ۳۱۷، ۳۵۱، ۴۳۱، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۴۰، ۴۴۲، ۵۸۸، ۵۸۹، ۶۲۶، ۶۳۹
 مسند عبید اللہ بن موسیٰ ۴۳۱، ۴۳۲
 مسند ابوالحسن عمر بن حسن ۳۸۵، ۳۹۰
 مسند ابن خشرود ۳۸۳، ۳۸۶، ۳۹۰
 مسند ابن عدی ۳۸۵، ۳۹۰
 مسند حافظ ابوعبداللہ الحسین ۲۹۶، ۳۸۳
 مسند ابی داؤد طیالسی ۱۰۴، ۴۲۹، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۴۲
 مسند ابی حنیفہ (بلخی) ۲۶۵
 مسند طبرانی ۲۵۱، ۵۸۹، ۶۱۴
 مسند حافظ ابوبکر ۱۸۵، ۳۹۰، ۴۳۱
 مسند طلحہ بن محمد ۲۵۲، ۲۶۳، ۲۷۶، ۳۸۷، ۳۸۹
 مسندی ۲۵۰، ۴۱۵
 مشکل الآثار ۱۲۲، ۱۲۳، ۳۷۱
 المصعد الامجد فی ختم مسند امام احمد ۴۳۴

مصنفی شرح موطا ۲۲۸، ۲۲۸، ۳۶۷، ۳۹۳
 ۳۹۶
 مصنف ابن ابی شیبہ (۴۴، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۶، ۴۴۷)
 ۴۳۵، ۶۲۹، ۴۴۷
 مصنف حماد بن مسلمہ ۳۹۴
 مصنف عبدالرزاق ۴۴، ۴۳۹، ۴۴۲
 معالم السنن ۸۲، ۳۱۷، ۴۱۲، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۹۲
 ۵۰۳، ۵۸۷، ۵۹۱، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۵۲، ۶۵۸
 معانی الآثار (طحاوی) ۳۷۱، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۸
 ۶۳۹
 المختصر ۵۹۶
 المعجم لابن عساکر ۳۸۷
 معجم البلدان ۴۲۰
 المعجم الصغیر ۳۵۶
 المعجم المفہرس ۳۰۵، ۳۸۶
 معرفۃ علوم الحدیث (حاکم) ۱۴۸، ۱۹۰، ۲۰۱، ۲۲۲
 ۲۶۳، ۲۷۲، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۳۴، ۳۵۵
 ۵۳۴، ۵۵۲، ۵۵۴، ۵۵۶، ۵۵۷
 مفاح السعاده ۱۶۳
 مقدمہ ابن خلدون ۵۲۷
 المغازی (موسیٰ بن عقبہ) ۴۲۲
 مکتوبات شاہ ولی اللہ ۲۷۷، ۴۶۷
 مناقب امام (ملا علی) ۲۴، ۱۱۳، ۳۱۳، ۳۶۷، ۳۶۸
 مقدمہ ابن الصلاح ۱۸۷، ۳۰۴، ۳۴۹، ۴۵۴
 مقدمہ اعلام السنن ۳۹، ۲۲۵، ۴۶۱، ۵۱۹، ۵۴۱
 ۵۴۹، ۵۵۹، ۵۶۵

مناقب صدر الامّة ١٥١، ١٥٢، ١٥٣، ١٥٥، ١٦٠،
 ١٨٣، ٢٢٢، ٢٩٢، ٤٠٨، ٤٠٩، ٤١٣،
 المقاصد الحسنة وعبد الوهاب ٣٩٢
 مناقب بن ماري ٢٢٥، ٢٩٤
 مفاتيح الاسانيد ٣٨٨
 مناقب صيمري ٤١٠، ٤٢٣
 الملل والنحل شهرستاني ٦٦٦
 المنار ٥٦٣
 مناقب كردري ١٥١، ١٦٢، ١٤١، ٢٢٠، ٣٦٠، ٦٩٠،
 مناقب احمد بن الجوزي ١٦١، ١٨٥، ٢٠٢، ٢١٢،
 ٣٥٣، ٣٥٤، ٣٥٥، ٣٦٠، ٣٦١، ٣٦٥،
 مناقب للموفق ١٢٣، ١٥١، ١٥٢، ١٤٥، ١٩٠،
 ٢٠١، ٢٢٨، ٣٥٤، ٣٦٠، ٣٦١، ٣٦٥،
 ٣٦٨، ٥٢١، ٥٥٣
 مناقب از امام زهبي ٣٦، ٣٨، ٤٦، ١٢٣،
 ١٢٩، ١٣١، ١٤٢، ١٤٣، ١٤٤، ١٤٥، ٢٢١، ٢٢٢،
 ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٤٨، ٢٤٩، ٢٥٠، ٢٥١، ٢٥٢،
 ٢٥٣، ٢٥٤، ٢٥٥، ٢٥٦، ٢٥٧، ٢٥٨،
 المنتظم ٣٣٣، ٣٤٤، ٣٩١، ٤٤٦،
 المنتقى من منهاج الاعتدال ٣٩٤، ٥٨،
 منتقى الاخبار ٥١٥، ٥٩٨، ٦٠٦، ٦٠٧،
 منصب امامت ٥٤٤، ٥٤٦، ٥٨٢،
 المنقذ من الضلال ١٦٥
 منهاج السنه ٦٢، ١٥٠، ١٤٤، ٢١٠، ٢٣٠، ٢٥٤،
 ٣٣٣، ٣٣٤، ٣٣٥، ٣٣٦، ٣٣٧، ٣٣٨

المنهج ذوى النظر ٢٣٣، ٢٥٥،
 منظومه علم الاثر (سيوطي) ٢٢٦،
 منية الراعي ٣٢٩، ٦٩٢،
 الموافقات ٢٨، ٥٨، ٥٩، ٦٠، ٦١، ٦٢، ٦٣،
 ٥٥٨، ٥٨٨، ٥٨٩، ٥٩٠، ٥٩١، ٥٩٢،
 مواهب ١٢٥
 موضح اوهام الحجج والتفريق ٢٩٠، ٢٩١، ٢٩٣،
 موضوعات كبير ٥٢٥
 ميزان الاعتدال ٢٠١، ٢٠٢، ٢٠٣، ٢٠٦، ٢٦٦،
 ٢٩٠، ٥٣٩، ٥٩٣، ٦٣٣، ٦٩٤،
 الميزان الكبرى ٣٤٥، ٥٢٣، ٥٢٤، ٥٨٠،
 ن
 النبوات ١٣٦
 نتائج الافكار ٥٢٥
 نزهة النظر ٥٤٢
 نسيم الرياض شرح شفا ٦٦٣
 نصب الراية (زبيعي) ٩٠، ٩٢، ٩٣، ٩٤، ٩٥،
 ٩٦، ٩٧، ٩٨، ٩٩، ١٠٠، ١٠١، ١٠٢،
 نصيحة المسلمين ١٦٥
 نظم العقيان في اعيان الاعيان ٨٠
 نظم المتناثر من الحديث المتواتر
 النكت الطريفة عن رد ابن ابى شيبه ٢٢٦
 نكت على ابن الصلاح ٢٦٥، ٢٦٦، ٢٦٧،
 نهاية المقصد في زوائد المسند ٢٣٤
 النور السافر في القرن العاشر ١١٩

النهائيه ۵۸۴

نيل الاماني ۱۴۶، ۱۴۷، ۲۲۱

نيل الاوطار (شوكاني) ۲۵۱، ۵۰۸، ۵۱۴، ۵۱۵

۶۰۱، ۶۰۶، ۶۲۶، ۶۳۳، ۶۳۶، ۶۵۱

و

الذابل الصيب ۵۳، ۱۰۵، ۲۸۹

الوثائق السياسييه ۹۳

الوصيه ۱۶۳

وفاء الوفاء ۲۵۰، ۲۵۱

وقيات الاعيان وانباء الزمان ۱۲۱، ۲۶۳، ۳۶۹

برايه ۶۲۷، ۶۳۷، ۶۵۸

الهدى السارى ۳۹۳، ۴۹۳، ۴۰۴، ۴۲۹

۳۳۳، ۳۵۳، ۴۵۴، ۴۵۴، ۴۵۴، ۴۵۴، ۴۵۴، ۴۵۴

۴۹۴، ۴۵۰، ۴۱۰

اسماء المکنیہ

ا

آذربائیجان ۳۸۷

آرمینیا ۷۹

البوالمشیم (مکہ) ۱۱۹

أحد ۱۳۷، ۸۳

استرآباد ۶۹۰

استنبول ۴۴۱، ۴۰۱

اصفہان ۶۳، ۲۵، ۳۸۰، ۳۸۷، ۶۹۰

اعظم گڑھ ۱۰۶

افریقہ ۴۴۱، ۴۴۵

افغانستان ۱۴۵

اندلس ۸۸

اہواز ۶۹۰

ایران ۱۴۵

ایشیا ۱۴۵

ایشیائے کوچک ۱۴۵

ب

بابل ۱۴۷

بحرین ۶۹۰، ۶۹۶

بخارا ۶۹۰، ۶۷۱، ۳۰۷، ۲۹۱، ۱۹۲

بدر ۳۰۸، ۱۸۹، ۱۴۸، ۱۰۳

برلن ۹۹

بسطام ۳۸۷

بصرہ ۴۹، ۸۵، ۹۸، ۱۰۱، ۱۱۵، ۱۴۰، ۱۷۱

۱۴۷، ۱۵۰، ۱۵۳، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۷، ۱۷۸

۱۸۳، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۲، ۱۹۷، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۲۱

۲۲۳، ۲۴۸، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵

۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲

۳۶۵، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴

۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶

بغداد ۲۴۹، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳

۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱

۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸

۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶

البحقیق ۵۲

بلخ ۶۹۰، ۳۱۱، ۲۲۱

بیروت ۳۸۰، ۳۴۴

پ

پاکستان ۱۴۵، ۱۴۶
پنجاب یونیورسٹی ۴۴۰

ت

تاشقند ۶۶۷

ترکی ۴۰۰

ترکستان ۱۴۵

تبوک

ترمذ ۶۹۰، ۶۹۲

تستر ۳۸۰، ۵۲

ث

ٹونک ۴۴۱

ٹھٹھہ ۵۲

ج

جامعہ ازہر ۳۹۲، ۱۱۹

جامعہ انقرہ ۴۰۰

جامعہ اسلامیہ بہاولپور ۴۴

جبرالٹر ۵۷۱، ۱۴۵

جرم جان ۶۹۰

جزیرہ ۶۹۰، ۱۹۲، ۲۲۱، ۲۹۹، ۳۸۱، ۵۵۴

ح

جلشہ ۱۰۳، ۱۳۴، ۱۴۹، ۵۷۱

حجاز ۲۲۵، ۲۲۸، ۱۴۵، ۱۸۲، ۱۹۲، ۱۹۷، ۲۳۱، ۲۲۵

۲۲۴، ۲۲۶، ۲۶۱، ۲۷۴، ۲۷۸، ۳۶۵، ۳۶۶

۳۷۸، ۳۹۳، ۴۰۴، ۴۱۴، ۴۲۲، ۵۰۰

حدیبیہ ۱۰۳

حمران ۳۸۰

حکوان ۶۹۰، ۶۹۲

حرم نبوی ۵۲

حرمین ۴۷۶

حمص ۴۴۵، ۳۸۰، ۳۳۹

حوض کوثر

حیدرآباد سندھ ۴۴۱، ۳۵۰، ۳۹۱

خ

خراسان ۹۲، ۲۷۸، ۲۹۱، ۲۹۲، ۳۱۱

۴۴۴، ۳۷۸، ۳۸۷، ۳۸۷، ۴۳۲، ۴۷۰

۴۷۹، ۵۰۰، ۵۵۴، ۶۹۸، ۷۰۷

خندق

خوارزم ۶۹۰، ۶۹۷

خیبر ۴۹

د

دارالعلوم الشہابیہ ۴۳، ۴۱

دائمرہ المعارف ۲۹۵

دارالندوہ ۱۰۳

دامغان ۶۹۰، ۳۸۷

دارالحفاظین ۶۲۷

دکن حیدرآباد ۴۴۱، ۲۹۵

دجلہ ۲۷۳، ۱۴۶

دمشق ۴۷، ۴۳، ۸۲، ۹۹، ۱۳۲، ۱۷۷، ۱۷۸

۲۱۸، ۲۲۸، ۲۵۱، ۲۷۸، ۳۳۴، ۳۳۹، ۳۸۰، ۳۸۷

۳۸۹، ۴۱۴، ۴۹۰

ق

٣٥٦٢٣٢	قاهرة
٣٨٠	قدس
١١٩	قطب شریف (مصر)
٦٩٠	قہستان
١٠٣	قبا
٨٨	قرطبہ
٦٩٠	قوس
٣٢٣، ٣٢٣	قیروان

ک

٦٩٠	کرمان
٦٩٠	کش

کعبہ (حرم) مسجد حرام ٢٢٦، ٢٢٦، ٢٢٦، ٢٢٦، ٢٢٦، ٢٢٦
 کوفہ ٦٩٠، ٦٩٠، ٦٩٠، ٦٩٠، ٦٩٠، ٦٩٠، ٦٩٠، ٦٩٠، ٦٩٠، ٦٩٠
 ١٠٠، ١٠٠، ١٠٠، ١٠٠، ١٠٠، ١٠٠، ١٠٠، ١٠٠، ١٠٠، ١٠٠
 ١٦٩، ١٦٩، ١٦٩، ١٦٩، ١٦٩، ١٦٩، ١٦٩، ١٦٩، ١٦٩، ١٦٩
 ٣٨٨، ٣٨٨، ٣٨٨، ٣٨٨، ٣٨٨، ٣٨٨، ٣٨٨، ٣٨٨، ٣٨٨، ٣٨٨
 ١٩٥، ١٩٥، ١٩٥، ١٩٥، ١٩٥، ١٩٥، ١٩٥، ١٩٥، ١٩٥، ١٩٥
 ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢
 ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢
 ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢
 ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢
 ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢
 ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢

٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥
 ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥

م
 مودار النهر ٢٤٨، ٢٤٨

مجدل ٢٤٨

مجمع البحرين (مقام) ٢١٨

مدائن ٦٩٥، ٦٩٥، ٦٩٥

مدرسہ اشرقیہ ١٢٢

مدینہ منورہ ٩٢، ٩٢، ٩٢، ٩٢، ٩٢، ٩٢، ٩٢، ٩٢، ٩٢، ٩٢

٩٦، ٩٦، ٩٦، ٩٦، ٩٦، ٩٦، ٩٦، ٩٦، ٩٦، ٩٦

١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨، ١٣٨

٢١٠، ٢١٠، ٢١٠، ٢١٠، ٢١٠، ٢١٠، ٢١٠، ٢١٠، ٢١٠، ٢١٠

٥٣٥، ٥٣٥، ٥٣٥، ٥٣٥، ٥٣٥، ٥٣٥، ٥٣٥، ٥٣٥، ٥٣٥، ٥٣٥

٢٥٠، ٢٥٠، ٢٥٠، ٢٥٠، ٢٥٠، ٢٥٠، ٢٥٠، ٢٥٠، ٢٥٠، ٢٥٠

٢٦٩، ٢٦٩، ٢٦٩، ٢٦٩، ٢٦٩، ٢٦٩، ٢٦٩، ٢٦٩، ٢٦٩، ٢٦٩

٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤

٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤

٥٦٣، ٥٦٣، ٥٦٣، ٥٦٣، ٥٦٣، ٥٦٣، ٥٦٣، ٥٦٣، ٥٦٣، ٥٦٣

٣٩٨، ٣٩٨، ٣٩٨، ٣٩٨، ٣٩٨، ٣٩٨، ٣٩٨، ٣٩٨، ٣٩٨، ٣٩٨

٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠

٥١٢، ٥١٢، ٥١٢، ٥١٢، ٥١٢، ٥١٢، ٥١٢، ٥١٢، ٥١٢، ٥١٢

مستان ٣٨٥

٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١

٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١

٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١

٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١، ٦٩١

۶۹۰	نصار	مصر ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹
۱۲۸	نصر آباد	۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰
۶۹۰	نصیبین	۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴
۶۹۰	نہاوند	۶۶۴، ۶۶۵
۱۲۲	نوحی	مکتبہ قاسمہ ۳۱، ۳۲
۶۹۰، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۵۶، ۶۶۴	نیشاپور	مکہ معظمہ ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰

و

۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰	واسط	۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰
۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵		

ز

۶۹۰، ۴۰۴	برات	۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱
۶۹۰، ۳۸۴	بمبدان	۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱
۴۰۳، ۱۰۶	ہندوستان	۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱

ح

۶۹۰، ۵۵۴، ۲۹۹	یامہ درجنگ	۴۱۶
۴۰۹، ۱۵۰، ۲۲۱، ۲۹۹، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵	یلین	۴۱۷، ۴۱۸
۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵		۴۱۹، ۴۲۰
۴۵۵، ۶۹۰		۴۲۱، ۴۲۲

ن

۸۸

نجران

۴۱۷، ۴۱۸	مقان
۴۸۴، ۴۸۵	منی
۴۱۷، ۴۱۸	موصل

ض

ضرب (قبیله)

۱۲۸

ظ

ظاہرہ ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۴۰، ۶۴۵

ع

عنزہ (قبیله) ۶۲۳، ۶۲۴

عشرہ مبشرہ ۵۴۵

عبدالقیس (قبیله) ۱۰۰، ۹۹

ق

قدیری قدری ۲۳۷

قریش (قبیله) ۵۴۸، ۵۴۶

قشیر (قبیله) ۱۲۸

م

مرحبہ ۱۵۵، ۱۶۱، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۳۷

۴۵۹، ۵۲۷، ۷۰۵، ۷۰۶

مرزائیہ ۴۱

معتزلہ، معتزلی ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۴، ۲۰۵، ۲۳۷

۲۴۰، ۵۲۷، ۶۶۹

ن

ناصبی، نواصب ۵۲۷

ک

کذیل (قبیله) ۱۳۴

فہرست اسماء رجال

ابراہیم بن محمد البواسحاق نیشاپوری ۲۰۸، ۳۶۱، ۴۴۳

” محمد انصاری ۱۹۲

” محمود ابو محمد شیخ ۳۵۷

” معتقل النقی حافظ ۲۹۵، ۴۳۱، ۴۵۲

۲۶۷، ۲۶۸

” منیرہ ابن بردزبر ۹۶

” موسیٰ بن یزید التیمی ۶۹۵، ۷۲۵

” یزید التیمی ۲۹۲، ۱۹۲

” میسرہ ۱۴۲، ۲۴۳

” یزید ابو عمران النخعی ۹۸، ۲۹۵

۱۹۴، ۱۹۶، ۱۹۸، ۳۰۰، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۲

۲۴۹، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰

یزید - نخعی ابراہیم امام کے ضمن میں ملاحظہ ہو

ابن ابی حاتم الرازی ابو محمد عبد الرحمن امام ۳۲۷، ۱۹۱

۳۶۸، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۲۹۳، ۳۷۴، ۳۵۰

۶۵۸، ۶۸۸، ۶۹۳، ۶۹۶، ۶۹۷، ۷۰۳، ۷۰۴

ابن ابی داؤد محدث ابو بکر ابن ابی داؤد ۶۳۷، ۶۹۸

ابن ابی ذئب محمد بن عبد الرحمن ابو الحارث ۵۱۹

۲۴۹، ۳۹۶، ۴۱۹، ۴۲۲، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹

آزاد، ابوالکلام مولانا ۶۳۷، ۶۴۵، ۶۷۷

الامدی، سیف الدین ابو الحسن علی بن ابی علی بن محمد

۵۵۱، ۴۸

آلوسی علامہ ابو الفضل محمود البغدادی ۶۹، ۷۰۷

ابان بن ابی عیاش ۲۸۷، ۲۸۸

ابان بن عثمان ۴۱۲، ۵۰۹

ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ۶۵، ۱۲۰، ۱۳۲، ۵۹۲

ابراہیم بن ادھم بن منصور بنجی ۲۱۲

ابراہیم بن اسماعیل ۲۸۸، ۴۳۱

ابراہیم بن جعفر ۳۵۴

” رستم المروزی ابو بکر ۶۹۱

” زیاد الرازی ۶۴۶، ۶۴۷

” سعید بن ابراہیم البواسحاق ۲۴۹، ۲۳۱

۳۴۹، ۴۳۱

” طہمان امام ابو سعید الہروی ثم نیشاپوری ۲۴۳

۲۶۸، ۲۲۲، ۶۸۸، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۷

۷۲۵، ۷۲۹، ۷۳۱

ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ الواسطی قاضی ۳۰۷، ۳۰۸

۷۱۴

ابن زید ٣٨٢

ابن زواد ٢٨٩

ابن السبكي علامه تاج الدين ابو نصر عبد الوهاب بن تقي الدين

٢٨٤

المستدر

ابن سعد ابو عبد الله محمد ٢٣٠ هـ ١٠٣، ١٠٢، ١٠٥

١٣٤، ١٣٠، ١٣٣، ١٠٥، ١٩٠، ٢٢٩، ٢٩٨

٣١٣، ٣٢٤، ٣١٤، ٢٢٠، ٢٥٩، ٢٣٢

٤١٢، ٤١٩

ابن السكيت حافظ ٢٥١، ٢٤٨

ابن سيرين، محمد ابو بكر امام شافعي ١٢٢، ١٩٠، ٢٣٠

٢٢٦، ٢٥٥، ٢٦١، ٢٤٣، ٢٤٢، ٢٨٨

٣٠٩، ٣٢٤، ٢٤٦، ٥٣٦، ٥٦٠، ٦١٢

ابن سيد الناس ابو الفتح علامه الحافظ ابو بكر محمد بن احمد

يعمر بن شافعي ٦٥٩ هـ ١٨٠، ٣٥٩، ٦٥٩

ابن الشايع الحافظ ابو حفص عمر بن احمد البغدادي

٢٨٥ هـ ٢٦٥، ٣٤٤، ٣٨١، ٣٨٩

ابن شيراز، عبد الله ابو شيراز النضبي ٢٢٨ هـ

١٢٩، ١٩٤، ٣٢١، ٣٢٦

ابن شداد ٢١٣، ٢١٣

ابن صاعد ٣٤٤

ابن الصلاح حافظ شيخ تقي الدين ابو عمر ٦٢٣ هـ

١٢٢، ١٣٩، ١٨٤، ٢٥٣، ٢٦٥، ٢٨٢

٢٨٣، ٢٩٠، ٣٠٢، ٣٢٨، ٣٢٩، ٣٩٥

٣٢٨، ٣٢٨، ٣٢٨، ٣٢٨، ٣٢٨، ٣٢٨

١٢٨٥، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤

١٢٨٥، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤

١٢٨٥، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤، ١٢٩٤

١٢٩٤

ابن الضياء ٢٦٦

ابن طاهر حافظ محمد بن طاهر مقدسي ابو الفضل ٥٠٤

٣٩١، ٣٥٠، ٣٥٨، ٣٦٠، ٣٦٤، ٣٦٤

٥٢٢، ٥٢٢

ابن طبرزاد ٦٩٦

ابن طولون حافظ شمس الدين محمد بن علي بن احمد ٩٥٣ هـ

٢٠٩، ٢٠٩، ٢٠٩

ابن عابد بن الشامي علامه محمد بن بن عمر ١٢٥

ابن عامر عبد الله بن عامر بن يزيد بن تميم الدمشقي ٦٣

ابن عباس جهر امت عبد الله ٢٤، ٥٢، ٥٢، ١٠١

١٠٤، ١٠٥، ١٠٦، ١١٤، ١٢٢، ١٢٢، ١٢٢، ١٢٢

١٢٢، ١٢٢، ١٢٢، ١٢٢، ١٢٢، ١٢٢

١٢٥٤، ١٢٦١، ١٢٦٥، ١٢٦٥، ١٢٦٥، ١٢٦٥

٢٨٩، ٢٩٠، ٣٠٤، ٣٠٤، ٣٠٨، ٣٢١

٣٣٦، ٣٣٦، ٣٣٦، ٣٣٦، ٣٣٦، ٣٣٦

١٢٥، ١٢٦، ١٢٨، ١٢٨، ١٢٨، ١٢٨

١٢٩٠، ١٢٩٠، ١٢٩٠، ١٢٩٠، ١٢٩٠، ١٢٩٠

١٢٩٠

ابن عبد الوهاب ٢٩٣

ابن عجلان ابو عبد الله محمد ١٢٨ هـ ٢٢٩

ابن عبد البر مغربي حافظ يوسف بن عبد الله ابو عمر

١٢٦٣ هـ ١٢٦٣، ١٢٦٣، ١٢٦٣، ١٢٦٣، ١٢٦٣

ابو جعفر الدين بلي ٨٩
 ابو جعفر العقيلي محمد بن عمرو الحافظ ٣٢٢ هـ ١٨٥
 ابو جعفر منصور دوانبقي ٣٤٠ ١٢٢٤
 ابو الحارث بن محمد ٢٨٢ هـ ٢٣١
 ابو حاتم امام حافظ محمد بن ادريس ٢٤٤ هـ ٥٣
 ١٩٠ ١٨٥ ٢١١ ٢٥٥ ٢٩٠ ٢٩١ ٢٩٢
 ٢٩٣ ٣٩٠ ٣٨٦ ٣٨٥ ٢١٥ ١٩٨ ١٨٥
 ابو حاتم محمد بن حبان البستي ٢٦٠
 ابو حسان الاعرج ١٠٤
 ابو الحسن عجلي ٢٠١ ١٢٨
 ابو الحسن شيخ ٢١٥
 ابو الحسن محمد بن مسلم ٢٢٢ هـ ٢٣١
 ابو الحسن القطان الامام علي بن ابراهيم ٣٢٥ هـ ٣١٨
 ابو الحسن مرغيناني علي بن عبد العزيز ٥١٦ هـ ٤٩٩
 ٢٢٢ ٢٢٣
 ابو الحسين بن المبارك ١٤٥
 ابو الحسين الهكي ١٥٠ هـ ٢٢٣
 ابو حفص صغير امام ابو عبد الله محمد بن احمد ٢٦٦ هـ
 ٩٧ ١٤٢ ٢٤٨ ٣٤٩ ٦٢٤
 ابو حفص كبير حنفي امام احمد بن حفص ٢١٤ هـ
 ٩٧ ١٤٣ ٢٤٨ ٣٥٣ ٦٢٤ ٦٢٥
 ابو حيان اندلسي اشير الدين محمد بن يوسف الخزناطي
 ٢١٦ هـ ٢١٦
 ابو حازم عبد الحميد ١٢٣
 ابو جناب الكلبي ٢٤٤

ابو بكر بن عياش ١٨٢ ١٩٢ ٢٠٩ ٢٢٤ ٢٨٠ ٢٨٩
 ابو بكر بن عمال حافظ الصقلي ١٠٩ ٥٥٥
 ابو بكر بن عبد الرحمن ٢٢٢ ٢٢٥ ٢٢٦ ٢٢٧ ٢٢٨
 ابو بكر بن ابى شيبة حافظ عبد الله بن محمد ٢٣٥ هـ ٢٣٩
 ٤١٥ ٤١٩ ٤٢٥ ٤٢٦ ٤٢٩ ٤٣٢
 ابو بكر محمد بن عبد الباقي حافظ (قاضي المرستان) ١٨٣
 ١٨٥ ١٩٨ ٢١٥ ٣٨٥ ٣٨٦ ٣٩٠
 ابو بكر الخطيب حافظ احمد بن علي بن ثابت ٢٦٢ هـ
 ٢٩٢ ٢٩٣ ٥١٥ ٥١٦ ٥٢٨ ٥٢٩ ٥٥٩ ٥٨١
 ٦٠٢ ٤٠٥ ٤١٣ ٤١٨
 ابو بكر رازي ٥٦٥
 ابو بكر الشافعي ٤٢٨
 حضرت ابو بكر صديق اكبر ٩١ ٩٢ ٩٦ ١٠٢ ١١٣
 ١٣٦ ٢٥٤ ٢٦١ ٣٢٢ ٣٢٣ ٣٢٤
 ٣٢٥ ٣٣٣ ٣٣٤ ٣٣٨ ٣٤٢ ٣٤٣
 ٢٢٦ ٢٢٧ ٢٥٣ ٣٠٠ ٣٤٠ ٣٨٩
 ٦٠٨ ٦١٠ ٦١٩ ٦٢٥ ٦٢٦ ٦٥١
 ابو بكر بن محمد بن عمر فرغاني ٣٤٩
 ابو بكر عتيق بن داود يمانى ١٨٩
 ابو بكر القطيعي ٦٩٦ ٤٢٨
 ابو بكر ١٠٢
 ابو ثور امام ابراهيم بن خالد بن ابى اليمان ٣٢٠ هـ
 ابو جعفر بن زبير خزناطي حافظ ٤٠٨ هـ ٤٨٥ ٤٥١
 ٢٨١ ٢٤٩
 ابو جعفر السندي عبد الله بن محمد الحافظ البجلي ٢٩٩ هـ

ابو خيثمة زهير بن حرب حافظ ٢٣٣ هـ ٤١٥ ٤٢٩
 ابو داود امام سليمان بن الاشعث ٢٤٥ هـ
 ٤٢٩ ٤٥٢ ٤٨٥ ٤٩٠ ٤٩١ ٤٩٢ ٤٩٤ ٤٩٦ ٥٠٠ ٥٠٢ ٥٠٤ ٥٠٦ ٥٠٨ ٥١٠ ٥١٢ ٥١٤ ٥١٦ ٥١٨ ٥٢٠ ٥٢٢ ٥٢٤ ٥٢٦ ٥٢٨ ٥٣٠ ٥٣٢ ٥٣٤ ٥٣٦ ٥٣٨ ٥٤٠ ٥٤٢ ٥٤٤ ٥٤٦ ٥٤٨ ٥٥٠ ٥٥٢ ٥٥٤ ٥٥٦ ٥٥٨ ٥٦٠ ٥٦٢ ٥٦٤ ٥٦٦ ٥٦٨ ٥٧٠ ٥٧٢ ٥٧٤ ٥٧٦ ٥٧٨ ٥٨٠ ٥٨٢ ٥٨٤ ٥٨٦ ٥٨٨ ٥٩٠ ٥٩٢ ٥٩٤ ٥٩٦ ٥٩٨ ٦٠٠ ٦٠٢ ٦٠٤ ٦٠٦ ٦٠٨ ٦١٠ ٦١٢ ٦١٤ ٦١٦ ٦١٨ ٦٢٠ ٦٢٢ ٦٢٤ ٦٢٦ ٦٢٨ ٦٣٠ ٦٣٢ ٦٣٤ ٦٣٦ ٦٣٨ ٦٤٠ ٦٤٢ ٦٤٤ ٦٤٦ ٦٤٨ ٦٥٠ ٦٥٢ ٦٥٤ ٦٥٦ ٦٥٨ ٦٦٠ ٦٦٢ ٦٦٤ ٦٦٦ ٦٦٨ ٦٧٠ ٦٧٢ ٦٧٤ ٦٧٦ ٦٧٨ ٦٨٠ ٦٨٢ ٦٨٤ ٦٨٦ ٦٨٨ ٦٩٠ ٦٩٢ ٦٩٤ ٦٩٦ ٦٩٨ ٧٠٠ ٧٠٢ ٧٠٤ ٧٠٦ ٧٠٨ ٧١٠ ٧١٢ ٧١٤ ٧١٦ ٧١٨ ٧٢٠ ٧٢٢ ٧٢٤ ٧٢٦ ٧٢٨ ٧٣٠ ٧٣٢ ٧٣٤ ٧٣٦ ٧٣٨ ٧٤٠ ٧٤٢ ٧٤٤ ٧٤٦ ٧٤٨ ٧٥٠ ٧٥٢ ٧٥٤ ٧٥٦ ٧٥٨ ٧٦٠ ٧٦٢ ٧٦٤ ٧٦٦ ٧٦٨ ٧٧٠ ٧٧٢ ٧٧٤ ٧٧٦ ٧٧٨ ٧٨٠ ٧٨٢ ٧٨٤ ٧٨٦ ٧٨٨ ٧٩٠ ٧٩٢ ٧٩٤ ٧٩٦ ٧٩٨ ٨٠٠ ٨٠٢ ٨٠٤ ٨٠٦ ٨٠٨ ٨١٠ ٨١٢ ٨١٤ ٨١٦ ٨١٨ ٨٢٠ ٨٢٢ ٨٢٤ ٨٢٦ ٨٢٨ ٨٣٠ ٨٣٢ ٨٣٤ ٨٣٦ ٨٣٨ ٨٤٠ ٨٤٢ ٨٤٤ ٨٤٦ ٨٤٨ ٨٥٠ ٨٥٢ ٨٥٤ ٨٥٦ ٨٥٨ ٨٦٠ ٨٦٢ ٨٦٤ ٨٦٦ ٨٦٨ ٨٧٠ ٨٧٢ ٨٧٤ ٨٧٦ ٨٧٨ ٨٨٠ ٨٨٢ ٨٨٤ ٨٨٦ ٨٨٨ ٨٩٠ ٨٩٢ ٨٩٤ ٨٩٦ ٨٩٨ ٩٠٠ ٩٠٢ ٩٠٤ ٩٠٦ ٩٠٨ ٩١٠ ٩١٢ ٩١٤ ٩١٦ ٩١٨ ٩٢٠ ٩٢٢ ٩٢٤ ٩٢٦ ٩٢٨ ٩٣٠ ٩٣٢ ٩٣٤ ٩٣٦ ٩٣٨ ٩٤٠ ٩٤٢ ٩٤٤ ٩٤٦ ٩٤٨ ٩٥٠ ٩٥٢ ٩٥٤ ٩٥٦ ٩٥٨ ٩٦٠ ٩٦٢ ٩٦٤ ٩٦٦ ٩٦٨ ٩٧٠ ٩٧٢ ٩٧٤ ٩٧٦ ٩٧٨ ٩٨٠ ٩٨٢ ٩٨٤ ٩٨٦ ٩٨٨ ٩٩٠ ٩٩٢ ٩٩٤ ٩٩٦ ٩٩٨ ١٠٠٠ ١٠٠٢ ١٠٠٤ ١٠٠٦ ١٠٠٨ ١٠١٠ ١٠١٢ ١٠١٤ ١٠١٦ ١٠١٨ ١٠٢٠ ١٠٢٢ ١٠٢٤ ١٠٢٦ ١٠٢٨ ١٠٣٠ ١٠٣٢ ١٠٣٤ ١٠٣٦ ١٠٣٨ ١٠٤٠ ١٠٤٢ ١٠٤٤ ١٠٤٦ ١٠٤٨ ١٠٥٠ ١٠٥٢ ١٠٥٤ ١٠٥٦ ١٠٥٨ ١٠٦٠ ١٠٦٢ ١٠٦٤ ١٠٦٦ ١٠٦٨ ١٠٧٠ ١٠٧٢ ١٠٧٤ ١٠٧٦ ١٠٧٨ ١٠٨٠ ١٠٨٢ ١٠٨٤ ١٠٨٦ ١٠٨٨ ١٠٩٠ ١٠٩٢ ١٠٩٤ ١٠٩٦ ١٠٩٨ ١١٠٠ ١١٠٢ ١١٠٤ ١١٠٦ ١١٠٨ ١١١٠ ١١١٢ ١١١٤ ١١١٦ ١١١٨ ١١٢٠ ١١٢٢ ١١٢٤ ١١٢٦ ١١٢٨ ١١٣٠ ١١٣٢ ١١٣٤ ١١٣٦ ١١٣٨ ١١٤٠ ١١٤٢ ١١٤٤ ١١٤٦ ١١٤٨ ١١٥٠ ١١٥٢ ١١٥٤ ١١٥٦ ١١٥٨ ١١٦٠ ١١٦٢ ١١٦٤ ١١٦٦ ١١٦٨ ١١٧٠ ١١٧٢ ١١٧٤ ١١٧٦ ١١٧٨ ١١٨٠ ١١٨٢ ١١٨٤ ١١٨٦ ١١٨٨ ١١٩٠ ١١٩٢ ١١٩٤ ١١٩٦ ١١٩٨ ١٢٠٠ ١٢٠٢ ١٢٠٤ ١٢٠٦ ١٢٠٨ ١٢١٠ ١٢١٢ ١٢١٤ ١٢١٦ ١٢١٨ ١٢٢٠ ١٢٢٢ ١٢٢٤ ١٢٢٦ ١٢٢٨ ١٢٣٠ ١٢٣٢ ١٢٣٤ ١٢٣٦ ١٢٣٨ ١٢٤٠ ١٢٤٢ ١٢٤٤ ١٢٤٦ ١٢٤٨ ١٢٥٠ ١٢٥٢ ١٢٥٤ ١٢٥٦ ١٢٥٨ ١٢٦٠ ١٢٦٢ ١٢٦٤ ١٢٦٦ ١٢٦٨ ١٢٧٠ ١٢٧٢ ١٢٧٤ ١٢٧٦ ١٢٧٨ ١٢٨٠ ١٢٨٢ ١٢٨٤ ١٢٨٦ ١٢٨٨ ١٢٩٠ ١٢٩٢ ١٢٩٤ ١٢٩٦ ١٢٩٨ ١٣٠٠ ١٣٠٢ ١٣٠٤ ١٣٠٦ ١٣٠٨ ١٣١٠ ١٣١٢ ١٣١٤ ١٣١٦ ١٣١٨ ١٣٢٠ ١٣٢٢ ١٣٢٤ ١٣٢٦ ١٣٢٨ ١٣٣٠ ١٣٣٢ ١٣٣٤ ١٣٣٦ ١٣٣٨ ١٣٤٠ ١٣٤٢ ١٣٤٤ ١٣٤٦ ١٣٤٨ ١٣٥٠ ١٣٥٢ ١٣٥٤ ١٣٥٦ ١٣٥٨ ١٣٦٠ ١٣٦٢ ١٣٦٤ ١٣٦٦ ١٣٦٨ ١٣٧٠ ١٣٧٢ ١٣٧٤ ١٣٧٦ ١٣٧٨ ١٣٨٠ ١٣٨٢ ١٣٨٤ ١٣٨٦ ١٣٨٨ ١٣٩٠ ١٣٩٢ ١٣٩٤ ١٣٩٦ ١٣٩٨ ١٤٠٠ ١٤٠٢ ١٤٠٤ ١٤٠٦ ١٤٠٨ ١٤١٠ ١٤١٢ ١٤١٤ ١٤١٦ ١٤١٨ ١٤٢٠ ١٤٢٢ ١٤٢٤ ١٤٢٦ ١٤٢٨ ١٤٣٠ ١٤٣٢ ١٤٣٤ ١٤٣٦ ١٤٣٨ ١٤٤٠ ١٤٤٢ ١٤٤٤ ١٤٤٦ ١٤٤٨ ١٤٥٠ ١٤٥٢ ١٤٥٤ ١٤٥٦ ١٤٥٨ ١٤٦٠ ١٤٦٢ ١٤٦٤ ١٤٦٦ ١٤٦٨ ١٤٧٠ ١٤٧٢ ١٤٧٤ ١٤٧٦ ١٤٧٨ ١٤٨٠ ١٤٨٢ ١٤٨٤ ١٤٨٦ ١٤

احمد بن منیع حافظ ابو جعفر البغدادی ۲۴۲ هـ

۴۰۹، (۴۳)، (۴۸۶)، (۴۱۵)، (۴۳۱)

ازدی ۶۳۲

الازهری ۳۵۳

اسامه بن زید ۵۵ هـ ۱۰۲

اسحاق الازرق ۴۲۲ هـ ۶۸۹

اسحاق بن ابراهیم ابو یعقوب البصری ۲۳۸ هـ

۴۵۹، (۴۳۱)، (۴۵۳)، (۴۶۹)

اسحاق بن راهویه امام ۳۳۷ هـ ۹۵۵، (۴۱۱)، (۴۷۷)

۴۰۴، (۴۰۹)، (۴۲۹)، (۴۵۲)، (۴۷۶)، (۴۸۲)، (۴۸۴)

۶۹۱، (۷۰۵)، (۷۱۰)، (۷۱۵)، (۷۱۹)، (۷۲۵)، (۷۲۸)

۷۳۰، (۷۲۹)

اسحاق بن سلیمان الرازی ۱۹۵ هـ ۶۸۹

اسحاق البوسعدی ۴۲۷

اسحاق بن منصور نیشاپوری ۲۵۱ هـ (۴۳۱)

اسد بن عمرو البجلي ۱۸۸ هـ ۴۲۲، (۴۰۸)، (۴۱۶)

۴۱۹، (۴۲۳)، (۴۲۴)، (۴۹۳)، (۴۳۱)

اسد بن فرات ۱۷۶ هـ (۴۰۸)، (۴۲۳)، (۴۹۳)

اسد بن موسیٰ حافظ ۲۱۲ هـ ۴۲۹

اسمرائیل بن یونس السبیتی ۱۶۲ هـ ۴۱۹، (۴۲۳)

۴۷۹، (۴۳۰)، (۴۰۴)

اسماعیل بن احمد السمرقندی ۳۵۷

اسماعیل صفهانی ابو القاسم شیخ الاسلام ۳۸۵

اسماعیل بن ابان ۶۹۷

اسماعیل بن ابراهیم بن مغیره ۹۶

احمد بن حنبل ۲۴۶، (۴۲۷)، (۴۲۹)، (۴۳۱)، (۴۳۳)

۴۳۵، (۴۳۷)، (۴۳۸)، (۴۳۹)، (۴۳۹)

۴۰۴، (۴۲۲)، (۴۵۴)، (۴۶۲)، (۴۷۶)، (۴۷۹)

۴۸۰، (۴۸۴)، (۴۸۶)، (۵۰۶)، (۵۲۱)، (۵۲۶)، (۵۳۸)، (۵۴۵)

۵۴۹، (۵۵۲)، (۵۸۸)، (۵۸۹)، (۶۰۸)، (۶۲۶)

۶۳۲، (۶۵۲)، (۶۵۳)، (۶۵۴)، (۶۵۵)، (۶۶۰)

۶۷۳، (۶۸۲)، (۶۹۵)، (۷۰۴)، (۷۰۷)، (۷۰۸)، (۷۱۰)

۷۱۵، (۷۱۶)، (۷۱۹)، (۷۲۳)، (۷۲۵)، (۷۲۷)، (۷۲۹)

۷۳۸، (۷۴۹)، (۷۳۰)، (۷۳۱)، (۷۳۲)

احمد بن رسته ۳۵۶

احمد بن زهیر ۶۹۱، (۶۹۲)

احمد بن شان ۲۵۸ هـ (۴۳۱)

احمد بن سلمه ابو الفضل حافظ ۲۸۶ هـ ۴۹۶

احمد بن الصلت ابو العباس الحنفی ۳۰۸ هـ ۱۸۵

احمد بن عبد الله ۳۱۷ هـ ۱۴۸، (۱۹۵)

احمد بن عبد الله ابو الحسن امام ۴۳۱ هـ ۷۳۲

احمد بن علی مروزی ۲۹۲ هـ (۴۳۱)

احمد بن عمرو البصری البرک ۲۹۲ هـ (۴۳۱)

احمد بن عوف ابو مصعب (الزهري) ۳۴۶

احمد بن محمد بن سعید ابو العباس ۳۳۲ هـ ۳۷۶

۳۷۷، (۳۷۸)، (۳۷۹)

احمد بن محمد بن محمد بن الاصفهانی ۲۷۲ هـ (۴۳۱)

احمد بن محمد شاکر ۸۴ هـ ۱۸۶، (۴۰۳)، (۵۳۱)

احمد بن علی ۶۳ هـ ۳۵۲، (۳۵۳)

احمد بن منصور ابو بکر ۲۶۵ هـ (۴۳۱)، (۴۴۰)

أكل الدين علامة ٦٢٦

إمام أعظم البصيرة، نعمان بن ثابت - ٣٤٠

٨٠، ٨١، ٨٢، ٨٣، ٨٤، ٨٥، ٨٦، ٨٧، ٨٨، ٨٩، ٩٠

٩١، ٩٢، ٩٣، ٩٤، ٩٥، ٩٦، ٩٧، ٩٨، ٩٩، ١٠٠

١٠١، ١٠٢، ١٠٣، ١٠٤، ١٠٥، ١٠٦، ١٠٧، ١٠٨، ١٠٩، ١١٠

١١١، ١١٢، ١١٣، ١١٤، ١١٥، ١١٦، ١١٧، ١١٨، ١١٩، ١٢٠

١٢١، ١٢٢، ١٢٣، ١٢٤، ١٢٥، ١٢٦، ١٢٧، ١٢٨، ١٢٩، ١٣٠

١٣١، ١٣٢، ١٣٣، ١٣٤، ١٣٥، ١٣٦، ١٣٧، ١٣٨، ١٣٩، ١٤٠

١٤١، ١٤٢، ١٤٣، ١٤٤، ١٤٥، ١٤٦، ١٤٧، ١٤٨، ١٤٩، ١٥٠

١٥١، ١٥٢، ١٥٣، ١٥٤، ١٥٥، ١٥٦، ١٥٧، ١٥٨، ١٥٩، ١٦٠

١٦١، ١٦٢، ١٦٣، ١٦٤، ١٦٥، ١٦٦، ١٦٧، ١٦٨، ١٦٩، ١٧٠

١٧١، ١٧٢، ١٧٣، ١٧٤، ١٧٥، ١٧٦، ١٧٧، ١٧٨، ١٧٩، ١٨٠

١٨١، ١٨٢، ١٨٣، ١٨٤، ١٨٥، ١٨٦، ١٨٧، ١٨٨، ١٨٩، ١٩٠

١٩١، ١٩٢، ١٩٣، ١٩٤، ١٩٥، ١٩٦، ١٩٧، ١٩٨، ١٩٩، ٢٠٠

٢٠١، ٢٠٢، ٢٠٣، ٢٠٤، ٢٠٥، ٢٠٦، ٢٠٧، ٢٠٨، ٢٠٩، ٢١٠

٢١١، ٢١٢، ٢١٣، ٢١٤، ٢١٥، ٢١٦، ٢١٧، ٢١٨، ٢١٩، ٢٢٠

٢٢١، ٢٢٢، ٢٢٣، ٢٢٤، ٢٢٥، ٢٢٦، ٢٢٧، ٢٢٨، ٢٢٩، ٢٣٠

٢٣١، ٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٥، ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٣٨، ٢٣٩، ٢٤٠

٢٤١، ٢٤٢، ٢٤٣، ٢٤٤، ٢٤٥، ٢٤٦، ٢٤٧، ٢٤٨، ٢٤٩، ٢٥٠

٢٥١، ٢٥٢، ٢٥٣، ٢٥٤، ٢٥٥، ٢٥٦، ٢٥٧، ٢٥٨، ٢٥٩، ٢٦٠

٢٦١، ٢٦٢، ٢٦٣، ٢٦٤، ٢٦٥، ٢٦٦، ٢٦٧، ٢٦٨، ٢٦٩، ٢٧٠

٢٧١، ٢٧٢، ٢٧٣، ٢٧٤، ٢٧٥، ٢٧٦، ٢٧٧، ٢٧٨، ٢٧٩، ٢٨٠

٢٨١، ٢٨٢، ٢٨٣، ٢٨٤، ٢٨٥، ٢٨٦، ٢٨٧، ٢٨٨، ٢٨٩، ٢٩٠

٢٩١، ٢٩٢، ٢٩٣، ٢٩٤، ٢٩٥، ٢٩٦، ٢٩٧، ٢٩٨، ٢٩٩، ٣٠٠

٣٠١، ٣٠٢، ٣٠٣، ٣٠٤، ٣٠٥، ٣٠٦، ٣٠٧، ٣٠٨، ٣٠٩، ٣١٠

إسماعيل بن إبراهيم صفى الدين ٣٤٩

إسماعيل بن أمية ٢٢٣، ٣٩٩

إسماعيل بن بشير البصري ٢٥٥، ٤٠٩

إسماعيل بن بشير ٣١٢

إسماعيل بن جعفر أبو اسحاق المدني ٢٢٩

إسماعيل بن خالد ١٩٠، ٢١٣، ٢٣٣

إسماعيل بن حماد بن إمام أعظم، ١٢١، ٢٢٣، ٢٢٤

١٦٣، ١٦٤

إسماعيل بن عبد الصادق ١٦٣

إسماعيل بن عبدة ٣١٩

إسماعيل بن عيسى شرف الدين ٣٩١

إسماعيل بن علي ٢٢٢، ٢٥٦، ٢٥٧

إسماعيل بن مسلم أبو اسحاق المكي ٢٢٣

إسماعيل الصغار ٣٢٢

أسود بن يزيد النخعي ١٥٠، ١٥١، ١٥٢، ١٥٣، ١٥٤، ١٥٥، ١٥٦، ١٥٧، ١٥٨، ١٥٩، ١٦٠

١٦١، ١٦٢، ١٦٣، ١٦٤، ١٦٥، ١٦٦، ١٦٧، ١٦٨، ١٦٩، ١٧٠

أسيد بن الحمال ٢٨٦، ٣١٨

أشتباني أبو الحسن عمر حافظ ٣٨٥، ٣٩٠

أشعث بن قيس ١٩٢، ٢٤٥

أشعث بن عبد الله ٣٩٩

أشهب ٢٦٤، ٢٦٥

أعمش إمام أبو محمد سليمان بن مهران ١٣٩، ١٤٠

٢٠٩، ٢١٠، ٢١١، ٢١٢، ٢١٣، ٢١٤، ٢١٥، ٢١٦، ٢١٧، ٢١٨، ٢١٩

٢٢٠، ٢٢١، ٢٢٢، ٢٢٣، ٢٢٤، ٢٢٥، ٢٢٦، ٢٢٧، ٢٢٨، ٢٢٩

اوزاعی امام ابو عمرو عبد الرحمن ۵۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۳۵۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۳۹۹ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۵۰۵ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۶۸۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰

رهبان اوس الاسلامی ۱۹۲

ایوب بن زید ۹۵

ایوب بن عائد ۶۵۰ ۶۵۹

ایوب الخلقی محدث ۱۰۰ ۳۵۸

ایوب ابن تیمیہ سختیانی ۳۵۸ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۳۵۸ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۵۱۲ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰

ایوب بن علی بن ابی بکر ۳۸۵

ب

باقر امام ۹۸

بایر قی علامه ۶۵۹

امام بخاری محمد بن اسماعیل ۵۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۸۵ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۱۲۳ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۱۷۵ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۱۹۱ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۲۳۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۲۵۳ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۲۸۹ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰

۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۳۹۹ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۴۹۹ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۵۰۵ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۶۸۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۷۸۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۸۵ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۱۲۳ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۱۷۵ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۱۹۱ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۲۳۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۲۵۳ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰
 ۲۸۹ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰

بحر العلوم مولانا ۳۳۳

بدر بن جماعة علامه محمد بن ابراهیم کتانی الحدری ۵۳۳
 ۵۵۴ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰

بدر بن حافظ ۷۱۲

بدر بن عازب ۱۰۲ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰

بدر بن کلین ۳۱۴ (۳۰۰) ۳۰۰ (۳۰۰) ۳۰۰

بدر بن زید ۹۶

بدر بن الدین الانبازی الشیخ ۸۰

نخشب بن الارت ۱۹۳

نخشمه بن عبد الرحمن ۴۱۵

نخسجه الكبرى ۶۲۶، ۶۲۵

الخزرجي عبد الله بن داود، حافظ ۳۶۸

الخزرجي علامه صفى الدين ۴۵۲، ۴۳۹

نخزيمه (صحابي) ۳۰۸

الحصاف امام البركة احمد بن عمر ۲۶۱ هـ

نخسره حافظ ۱۸۳

نخطابي علامه امام محمد بن محمد البركة سليمان ۳۸۸ هـ

۴۹، ۴۲، ۴۱، ۳۲۳، ۳۱۲، ۳۰۸، ۲۹۲، ۲۹۱

۵۰۳، ۵۸۶، ۵۹۱، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۸، ۶۵۲

خطيب بغدادى حافظ البركة احمد بن علي ۴۳۳ هـ

۱۲۳، ۱۵۲، ۱۷۰، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۵، ۱۸۶

۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۰۶، ۲۶۵، ۲۶۶

۲۶۷، ۲۶۹، ۲۷۹، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۰

۲۹۱، ۲۹۳، ۳۴۸، ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۸

۳۷۰، ۳۷۷، ۳۸۱، ۳۸۳، ۳۸۷، ۳۸۸، ۴۰۳

۴۰۷، ۴۱۱، ۴۱۴، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۷، ۴۲۹

۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷

۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸

۴۷۹، ۴۸۳، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸

۴۸۹، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵

- ۷۲۷

الخفاجي احمد علامه ۶۶۳، ۶۶۴

خلاد بن يحيى ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱

خلاص بن عمرو ۴۱۵

خلف بن ايوب ۲۰۵ هـ، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۳۹

۳۱۱

خلف بن سالم ۲۳۱ هـ ۷۱۵

خلف بن نجيم ۱۹۵

نخلف بن محمد ابو محمد حافظ (۴۰)، ۳۹۱، ۳۹۸

نخيلي حافظ ابو يعلى خليل بن عبد الله ۴۴۶ هـ

۱۲۲۱، ۱۲۵۴، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۱

نخيلفه حاجي ۶۶۷

نخوارزمي علامه محمد بن محمود ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۸

۲۰۰، ۲۰۷، ۲۱۲، ۲۶۷، ۲۷۲، ۳۵۷

۳۵۸، ۳۶۰، ۳۷۱، ۳۷۸، ۳۷۹

۳۸۲، ۳۸۴، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۴۰۰

۷۲۴



الدراني، البركة سليمان ۴۸، ۱۶۳

دارقطني امام حافظ ابو الحسن علي بن عمر ۳۸۵ هـ

۸۹، ۹۵، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴

۱۸۵، ۲۳۲، ۲۵۱، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷

۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۷، ۳۰۵، ۳۷۵، ۳۷۶

۳۷۷، ۳۸۱، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۷، ۳۸۹

۴۰۱، ۴۰۳، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰

۴۸۶، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵

۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹

الدرامي ابو محمد عبد الله بن عبد الرحمن امام ۲۵۵ هـ

رسول الله صلى الله عليه وسلم ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵

۶۳۶، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵

۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴

۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴

رشید عطار حافظ ۶۸۵

روح بن عباده ۳۴۶

ن

نراندہ بن قدامہ امام ابو الصلت ۶۱۱ھ ۱۹م ۱۱۹، ۱۲۱

۶۸۹، ۴۰۴

زاید کوثری علامہ زاید ۳۴۱ھ ۱۶۳، ۳۵۵، ۳۵۷

۳۵۸، ۳۸۲، ۳۸۸، ۳۸۹، ۴۴۳، ۴۴۶

۴۶۵، ۴۶۸، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۳، ۵۰۹، ۵۰۹، ۵۰۹

الزبیدی مرتضی السید ابو الفیض محمد بن محمد ۳۰۵ھ

۶۴۶، ۳۹۲

الزبیری بن عدی ۱۴۲

زبیر بن العوام ابو عبد الله ۴۰۴، ۴۴۵

زبیر بن معاویہ ابو خثیمہ ۱۹۴

زربن حبیش (ابو مریم الاسدی) ۵۲ھ

۱۹۴، ۲۱۰، ۴۱۵

زرنجری شمس الائمہ ۱۴۴، ۳۶۳

زركشي حافظ بدر الدين ابو عبد الله محمد بن عبد الله ۸۵ھ

۱۰۶، ۱۴۸، ۳۱۸، ۴۶۹، ۵۲۵

زرنکمی امام ۱۵۵

زعفرانی حافظ ابو علی حسن بن محمد بغدادی ۱۲۶۰ھ

۳۷۷

زفر بن الهذیل العنبری امام ۱۵۸ھ ۲۳۲، ۳۱۳

۳۴۹، ۳۵۵، ۳۵۶، ۴۰۲، ۴۰۸، ۴۰۹

۴۱۶، ۴۱۹، ۴۲۴، ۴۸۸، ۴۹۳، ۴۹۴

۴۲۷، ۴۳۰

زکریا انصاری شیخ الاسلام البوسجی ۹۲۵ھ

۲۶۳

زکریا بن ابی زائده ۳۱۴، ۴۰۸، ۶۸۹

زکریا بن عدی ۱۹۵

زکریا ساجی البوسجی محدث ۲۸۲ھ ۴۷۷

زکریا نیشاپوری حافظ البوسجی ۲۰۱، ۳۵۷، ۳۶۳

زرخشری علامہ محمود بن عمر ۱۳۰

الزنجانی سعد بن علی علامہ ابو عبد الله ۳۲۳، ۴۷۳

زوطی، نغان ۱۲۱، ۱۲۴

زهری امام ابو بکر محمد بن مسلم بن شهاب ۴۴ھ

۸۹، ۹۰، ۹۲، ۱۴۲، ۱۶۸، ۱۹۷، ۲۰۹

۲۳۹، ۳۳۱، ۳۳۷، ۳۴۳، ۳۴۶، ۳۵۵

۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴

۳۹۵، ۳۰۰، ۳۰۷، ۳۱۰، ۳۱۳، ۳۱۴

۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۷، ۳۴۲، ۳۴۳

۳۹۶، ۳۹۹، ۴۱۲، ۴۱۵، ۴۲۲، ۴۵۰

۵۰۹، ۵۵۲، ۵۵۶، ۵۹۷، ۶۴۷، ۶۴۸

۷۲۲

زهری بن حرب حافظ البوسجی ۲۳۴ھ ۲۶۴

۴۱۹، ۴۱۵، ۴۲۹

زهری بن معاویہ ۱۴۵ھ ۴۲۴

٥٩٥، ٥٥٢، ٥٥٠، ٥٤٤، ٥٣٩، ٥٣٨
٦٩٣، ٦٨٢، ٦٨٣، ٦٣٣، ٦٣٢، ٦٠٤
٤٠٠، ٤٠١، ٤٠٦، ٤٠٤، ٤١٣، ٤١٩، ٤٢١
٤٢٣، ٤٣٠ -

السكري ابو حمزة (محمد بن ميمون مروزي ٥٨)

سلفي، ابو طاهر، حافظ ٢٢٨

سلجوقي ملك شاه ٦٦٨

سلمان فارسي ١٠٦، ١٣٥، ١٢٦، ١٨٣

سلمه بن ابى دينار ١٢٢

سلمه بن صهيب ١١٥

سلمه بن كهيل ١٢١ هـ ٢١٣

سليم رازي امام ٢٨٣

سليمان الاغمش ١٢٢، ١٢٦، ١٥٣، ٥٨٩

سليمان بن ابى سليمان ١٢١ هـ ٢١٣

سليمان بن بلال ٢٢٩

سليمان بن برد ٣٩٨

سليمان بن حبان الاحمر ١٩٢

سليمان بن الشاذ كوفي ٦٢٦

سليمان بن حرب ٥٢٣

سليمان بن داود الخولاني ٩١

سليمان بن ربيعة الباهلي ١١٥

سليمان بن شعيب ٥٦٠

سليمان بن فيروز ١٩٢

سليمان بن سمره بن جندب ٩٨

سليمان بن المعتمر ١١٦

سعيد بن جبيرة ١١٢، ١٥٠، ١٦٩، ١٩٢، ٢٠٠، ٢٠٢

٢١٢، ٢٣٢، ٢٣٦، ٢٣٦، ٢٣٦، ٢٣٦، ٢٣٦، ٢٣٦

سعيد بن سلام البصري ٢٣٦

سعيد بن سكين ٢٤٤

سعيد بن العاص ٣٢٢

سعيد بن مسروق ابو عبد الرحمن ٢١٣

سعيد بن كثير الانصاري ٣٩٨

سعيد بن المسيب ١٩٤، ٢٠٠، ٢٠٢، ٢٠٢، ٢٠٢

٢٨٨، ٢١٢، ٢١٢، ٢١٢، ٢١٢، ٢١٢، ٢١٢

١٥٣٦ - ٦٢٨

سعيد بن منصور خراساني ٢٣٢، ٢٥٣، ٢٥٢

٤١٦

سناج ٢٢٦

سفيان بن عيينه (ابو محمد) ٩٨، ٢٢٩، ٢٢٩، ٢٢٩

١٩٦، ٢١٢، ٢٣٩، ٢٣٩، ٢٣٩، ٢٣٩، ٢٣٩

٣٠٠، ٣٠٠، ٣٠٠، ٣٠٠، ٣٠٠، ٣٠٠، ٣٠٠

٢٠، ٢٠، ٢٠، ٢٠، ٢٠، ٢٠، ٢٠

٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤، ٢٢٤

سفيان ثوري امام (سفيان بن سعيد الثوري) ٢٣٣

٤٥، ٢٩، ٢٠، ٢٠، ٢٠، ٢٠، ٢٠

٢١١، ٢١١، ٢١١، ٢١١، ٢١١، ٢١١، ٢١١

٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤

٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤

٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥

٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥، ٢٠٥

٢٩٤	عبد الله بن ذكوان	عبد القاهر بغدادى ابو منصور ١٢٢٩، ١٢٤٤، ٢٦٩
٣١٥	عبد الله بن سالم	عبد القاهر تميمى ابو منصور ٢٦٩
٥٣٦	عبد الله بن سلام	عبد الكريم علامه ٩٤١
٢١٥	عبد الله بن سحر	عبد الكريم بن ابى المنارق ٦٥٤، ٦٥٦، ٢٨٤
١٢٢	عبد الله بن عبد الرحمن الطائفى	خطيب جمال الدين عبد الكريم ابو الفضائل النصارى ٣٤٩
٣٩٩	عبد الله بن طائوس	عبد الكريم ابى اليسر ١٦٣
٢١٥	عبد الله بن عقيب بن مسعود قاضى	عبد الكريم شافعى ابو معشر ١٣٩، ٣٠٥
٢٢٣	عبد الله بن عبد الرحمن التوملى	عبد اللطيف الشيخ ٣٨٢
٢٢٣	عبد الله بن عثمان، ابو عثمان	عبد الله نسفى ابو البركات ١٣٩
٢٦٢	عبد الله بن على بن الحسين	عبد الله بن ابى اوفى ١٢٠، ١٨٦، ١٨٤، ١٩٣
١٠٢، ٩٩، ٩٣، ٨٥	عبد الله بن عمرو بن العاص	٣٠٥
٢٠٩، ٣٢٥		عبد الله بن ابى زياد ٢٢٣
١٦٩، ١٢٢	عبد الله بن عون	عبد الله بن ابى بنجيج ٢٣٢
٢٤٣	عبد الغنى حافظ	عبد الله بن ابى ليلى ١٢٣
٦٣	عبد الله بن كثير القرشى ابو معبد	عبد الله بن (احمد بن حليل) ١٩٢، ٣٣٣، ٣٣٣، ٣٣٣
٢٦٥	عبد الله بن الفضل	٣٨٤، ٣٨٥
٢٠٥	عبد الله بن لحيه	عبد الله بن احمد نسفى ٥٦٣
٦٣٤	عبد الله بن مالك	عبد الله بن ادريس ١٩٢، ١٩٢، ٢٢٠، ٢٢٠، ٢٣١
١٢٥، ١٦٩، ١٢٥	عبد الله بن المبارك	عبد الله بن انيس ٣٠٥، ٢٢٠
٢٦٣، ٢٦٠، ٢٥٨، ٢٢٦، ٢٢٤، ٢٢٦، ٢٠٨		عبد الله بن بريده ٢٢٠، ٢٢٠
٢٤٤، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠		عبد الله بن الحسن ابو القاسم ٣٥٤
٢٠٥، ٢٠٩، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠		عبد الله بن الحارث ١٨٥، ١٨٤، ١٦٨، ١٢٣
١٥٢٩، ١٥٢٨، ١٥٢٠، ١٥٢٠، ١٥٢٠، ١٥٢٠		١٩٦، ٢٢٣، ٢٢٣، ٢٢٣، ٢٢٣، ٢٢٣
١٥٣١، ١٥٣٢، ١٥٣٦، ١٥٣٦، ١٥٣٦، ١٥٣٦		عبد الله بن داود الخريبي ١٩٥، ١٩٨
٢٠٣، ٢٠٢، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠		عبد الله بن دينار ١٩٨، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢، ٢٢٢
٢٠٢، ٢٠٢، ٢٠٢، ٢٠٢، ٢٠٢، ٢٠٢		٥٩٥

عبد المنعم ٦٦١
 عبد الوارث ٥٥١، ٣١٢
 عبد الوهاب قاضي ٦٣٠، ٣٤٢
 عبد الوهاب استاذ كلية شرعية جامع ٣٩٢
 عبدة بن سليمان ١٩٥
 عبدة بن محمد وراق ٢٥١
 عبدة بن نضلة ٤٢٠، ٢١٦
 عبدة الله (محدث كوفي) ١٩٥
 عبدة الله الاشجعي ١٩٥
 عبدة الله بن عامر ٢٢٥
 عبدة الله بن عبد الله ابو عبد الله ٩٨، ٢٢٢
 ٥١٣، ٥١٢، ٢١٢، ٢٢٢
 عبدة الله بن عمر قوامري ٢٢٩، ٢٢٥
 عبدة الله بن موسى العباسي حافظ ابو محمد ١٤٢، ٣١٣
 ١٩٥، ١٩٩، ٣٩٤، ٢٢٨، ٣١٣، ٢٢٣، ٢٢٣
 ١٢٣٨، ٦٨٩، ٦٩٨، ٤٣٢
 عبدة بن حميد ١٩٥، ١٢٩
 عبدة بن عمرو السلمي المرادي ١٩٢، ١٢٩، ١٩٢
 ١٩٦، ١١٥
 عتبة (صحابي) ١٢٤
 عتبة بن فرق ٢١٦
 عتبة بن عبد الله بن عتبة ٢١٣
 عثمان بن ابي شيبة حافظ ابو الحسن ٢٣٩، ١٩٥
 ٢٠٨، ٢٢٩، ٢١٥، ١٦٦، ١٩٥، ٢٣٥
 عثمان بن الاسود ٥٢٤

عبد الله بن محمد ابو جعفر ٢٢٦، ٢٣١
 عبد الله بن محمد انصاري ٣٨٦
 عبد الله بن محمد، ابو بكر ٢٣٢، ١٩٥
 عبد الله بن محمد بن عبد المؤمن بن يحيى ٢٨٠
 عبد الله بن محمد بن عقيل ٢٢٠
 عبد الله بن مسلم، ابو عبد الرحمن ٣٩٨
 عبد الله بن معقل ١١٥، ١٠١
 عبد الله بن نمير ١٩٥
 عبد الله بن وهيب بن سلمه ابو محمد ٢٠٠، ٢٣٦، ٣٩٤
 (دينوري) ٢٢٢
 عبد الله بن يزيد (المعري) ١٢٢، ١٢٣، ١٩٣
 ١٩٥، ٣٦٠، ٤٢٥، ٤٢٨
 عبد المجيد بن ابي رداد ٦٨٨
 عبد الملك بن جريج ١٢٢
 عبد الملك بن حبيب ٢١٨
 عبد الله العمري ١٢٢
 عبد الله بن يوسف ابو محمد ٣٩٨
 عبد الملك بن سليمان ١٩٢، ٢٣١
 عبد الملك بن عبد العزيز امام ٣٢٣، ٣٢٨، ٢٢١
 عبد الملك بن ابي سليمان ٦٣٢، ٦٣٣
 عبد الملك بن عمير ١٢٦، ١٩٢، ١٩٦، ٢١١، ٢١٣
 ٢٩٥، ٢٦٤
 عبد الملك بن مروان ١٨٢
 عبد الملك بن محمد بن ابي بكر ٢٢٢
 عبد الواحد بن زياد ٢٤٦

فضل بن عباس بن عبدالمطلب ١٨ هـ ١٢٢
 فضل بن موسى ١٩٢ هـ ٢٢٢
 فضل بن عياض ١٨٤ هـ ٢٢٢، ٢٢٦، ٢١٦
 فضيل بن عياض ٢٥٩
 فضيل بن عيينه ٢٣٢
 فيروز آبادي مجد الدين ١٨٩، ١٤٩، ١٥٥
 فلاس ٢٥٩
 فيض الله أفندي ٢٠١
 نوآرد داکتر ٢٠١

ق

قاسم المطرز ٤٢٨
 قاسم زين الدين حافظ ٨٤٩ هـ ٣٩١، ٢٢٦
 قاسم بن اصبيغ ٢٤٨، ٣٤٨، ٦٢٦
 قاسم بن الحكم العرفي ٢٦٥
 قاسم بن عبد الرحمن ٢١٣، ٢١٦
 قاسم بن سلام ٤٣١
 القاسم بن محمد ١٩٨، ٢٢٢، ٢٢٥، ٢٢٦، ٢٢٩
 ٢٥٠، ٣٥٩، ٢٦٠، ٢٦١، ٢٦٢، ٢٦٣، ٢٤٥
 ٢٢٤، ٢٢١، ٥٦٠
 القاسم بن طارون ابو محمد ٢٦٤، ٢٦٤
 القاسم بن مخيمر ابو عروه ١٩٢، ٢١٣
 القاسم بن معن ١٤٥ هـ ١٩٢، ٢٩٥، ٢١٦، ٢٢٢
 ٤٣١
 قاسم جمال الدين ١٥٣، ٢٢٢، ٢٦٢، ٢٦٣
 قبيصة بن عقبة العامري ١٩٥، ٢٢٦، ٢٥٥

عوف اعدالي ٢٢٢

العبدروس، عبد القادر ١٢١
 عياض قاضي ابو الفضل ٥٢٢ هـ ١٨٤، ٢٢٩

٥٥١، ٦٦٣

حضرت عيسى عليه السلام ١٣٢

عيسى بن احمد البوسيني ٢٦٨ هـ ٣١١

عيسى بن ابان ١٦٠، ١٦٣، ١٦٤، ١٦٥، ١٦٨، ١٦٩

عيسى بن يونس السبيعي حافظ ابو عمرو ١٨٤ هـ ١٩٢

عيسى بن موسى ابو احمد ١٨٦ هـ ٣٤٤، ١٤٢

عيسى مغربي جعفري محدث ١٠٨٠، ٣٨٨

عيسى بدر الدين، حافظ ابو محمد محمود بن احمد ٨٥٥ هـ

١٣٩، ٢٠٢، ٣٣٠، ٣٥٨، ٣٤٤

ع

عزالي، امام ابو حامد محمد بن محمد ٥٠٥ هـ ٦٤٩، ١٢٩، ١٣٢

١٦٥، ١٦٦، ١٦٧، ٥٦٠

عسان بن محمد البوسيني ٣٦٢

عيلان بن سلمة الثقفي ٦٩١

ف

فتح بن عمر ٦٩١

الفتح بن ابي علوان ١٩٣

فضاله بن عبيد الانصاري ابو محمد ٥٣٥ هـ ٢٢١

الفريابي ٥٣٤، ٤٢٩

الفضل بن سهل ابو عبد الله ذو الرياستين ٢٠٢ هـ

٢٥١، ٦٩١

الفضل بن دكين ابو نعميم عمر بن حماد ٢١٦ هـ ١٣١، ٤٣٠

الکدیمی ۴۲۸، ۴۲۶
 کثیر بن قیس شامی ۲۱۹
 کرخی، ابوالحسن، امام ۳۴۹، ۶۰۳، ۶۴۲، ۶۴۴
 ۶۸۰
 کرا بیسی ابو علی الحسین بن علی ۶۳۰
 کرا بیسی ابوالاحمد محدث ۶۵۸
 کردری، حافظ (محمد بن محمد) ۱۴۱، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۶۰
 ۲۲۳، ۳۹۳
 کردری ابن البراز حافظ الدین ۵۸۱، ۶۹۰
 کرو علی، ڈاکٹر ۳۸۷
 کرمانی علامہ ۲۳۲، ۳۳۲
 کسائی، ابوالحسن علی بن حمزہ الاسدی ۸۹ھ ۱۶۳، ۱۵۰
 کعب بن مالک ۲۶۵
 الکمال بن یوسف ۱۶۱
 کلاعی، ابوبکر ۳۹۰
 کمال الدین البیاضی، علامہ "دیکھو البیاضی"
 کمال الدین مغربی، علامہ ۱۳۲

گ

گولڈنہیر ۴۱۳

ل

لالکائی، حافظ ابوالقاسم بیٹہ اللہ بن الحسن ۱۸ھ ۴۰۲
 لیث بن ابی سلیم ۳۸۶، ۵۴۰، ۶۸۶
 لیث بن سعد، امام ابوالخارث ۵۴۵ھ ۳۸
 ۱۴۰، ۱۴۶، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۵۳، ۲۵۸
 ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹
 ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹
 ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹
 ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹
 ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹
 ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹
 ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹
 ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹
 ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹
 ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹
 ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹
 ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹
 ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹
 ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹
 ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹
 ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹
 ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹
 ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹
 ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹
 ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹
 ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹
 ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹
 ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹
 ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹
 ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹
 ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹
 ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹
 ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹
 ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹
 ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹
 ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹
 ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹
 ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹
 ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹
 ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹
 ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹
 ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹
 ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹
 ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹
 ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹
 ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹
 ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹
 ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹
 ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹
 ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹
 ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹
 ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹
 ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹
 ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹
 ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹
 ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹
 ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹
 ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹
 ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹
 ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹
 ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹
 ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹
 ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹
 ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹
 ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹
 ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹
 ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹
 ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹
 ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹
 ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹
 ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹
 ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹
 ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹
 ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹
 ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹
 ۱۰۰۰

قنادہ بن دعامہ ۲۳۴، ۲۴۶، ۲۹۵، ۳۲۰
 القات ۴۲۹
 قنادہ ۹۴، ۱۴۲، ۱۴۸، ۱۹۸، ۲۰۹، ۳۴۳، ۳۹۸
 ۴۵۳، ۴۵۹
 قتیبہ بن سعید (۳)، ۱۰۴، ۱۵۳، ۱۸۶، ۲۸۴
 ۶۹۵
 قتیبہ بن مسلم باہنی ۱۲۵
 قرانی علامہ ۵۶۰
 قرظہ ۱۰۷
 قرظی محمد بن کعب ۱۲۲، ۶۳۹
 قرطبی، امام ۵۶۵، ۵۶۷
 قسطلانی علامہ ۱۵۵، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۲، ۳۴۲
 القزازی ۴۲۸
 قطب الدین مکی ۱۲۱
 القعنبنی عبداللہ بن سلمہ ۸۵، ۲۶۹، ۳۴۰، ۴۵۳، ۴۶۵
 قیس بن ابی حازم ۱۹۴، ۱۸۳
 قیس بن ربیع ۱۹۴، ۲۲۲
 قیس بن فہد ۶۴۰، ۶۴۱
 ۶۴۱

ک

کاشانی علامہ ۶۳۷
 کبرقانی حافظ ۳۸۱
 کبشہ والدہ ابوبکر بن حزم ۲۶۲
 الکلتانی، ابوجعفر محمد بن جعفر ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۷۳
 ۳۸۶، ۳۹۰، ۳۹۵، ۴۰۵، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۲۹
 ۵۷۵، ۴۳۹

محمد بن العلماء بن کریم الہمدانی ۲۲۸ھ ۱۹۵، ۲۲۲
 محمد بن علی الصائغ ۳۶۱
 محمد بن علی الواسطی ۲۶۵
 محمد بن علی بن طرخان ۳۱۱
 محمد بن علی، ابوالمحسن شمس الدین حافظ ۲۸۳، ۲۹۸
 محمد بن علی شیخ، ابوعبداللہ ۳۵۷
 محمد بن عمر رازی البوکری ۲۲۶
 محمد بن عمر قاضی ۳۸۱
 محمد بن عیسیٰ ۶۹۵
 محمد بن فضیل ۱۹۵، ۲۲۷
 محمد بن الفضل ۲۲۲
 محمد بن قاسم ۱۲۶
 محمد بن کعب قرظی ۱۲۲، ۲۳۹
 محمد بن المثنیٰ ۸۶، ۶۲۳
 محمد بن مجاہد ۱۲۲
 محمد بن قیس ۳۱۰
 محمد بن محمد نیشاپوری ۲۸۰ھ ۲۹۶
 محمد بن المبارک القرشی ۳۹۸
 محمد بن محمد ابوالنضر ۳۵۵
 محمد بن مخزوم ۲۶۵
 محمد بن مخلد ابوعبداللہ حافظ ۲۶۶، ۳۷۵
 محمد بن مزاحم، ابوصاحب مروزی ۳۵۵، ۳۵۶
 محمد بن المیثم ۲۶۷، ۳۵۶
 محمد بن متاکل ۱۶۳
 محمد بن المنکدر ابوعبداللہ ۱۲۰ھ ۲۶۷، ۳۷۷
 ۲۹۵، ۳۹۹

محمد بن موسیٰ ابوبکر الحارثی ۳۶۶، ۴۱۸
 محمد بن نصر مروزی ۷۰۳
 محمد بن ہارون الحضرمی، ابوعامر ۳۰۵
 محمد بن یزید ۱۶۳
 محمد بن یعقوب ۳۵۳
 محمد بن یوسف الصالحی شافعی ۲۸۰، ۲۹۹، ۴۲۷
 محمد بن یوسف الغریبی ۲۲۲، ۲۶۷
 محمد بن یوسف غریابی ۲۱۳ھ ۴۳۱
 محمد سعید علامہ ۳۶۰
 محمد المہدی، عباسی، محمد بن ابی جعفر المنصور ۱۶۹ھ
 ۳۲۶، ۳۶۸
 محمد یوسف، ڈاکٹر ۱۲۱، ۶۶۹
 محمد موسیٰ مولانا ۴۴۱
 محمود بن الرزح ۱۸۷
 محمد بن یحییٰ زینی ۸۵، ۷۶۸
 محمود بن عیسیٰ ۲۰۸، ۲۸۶، ۴۸۷، ۵۳۷
 محی الدین ابن الجوزی ۳۰۰
 مرداس اسلمی ۲۸۲
 مرداس بن مالک ۱۹۳
 المرزبانی ۶۶۹
 مرغینانی امام ۱۵۲
 مردان بن معاویہ ۱۹۵
 مروزی، محمد بن نصر، امام ۳۵۵، ۶۰۶، ۶۱۱
 ۷۲۹، ۷۳۸
 مردان الغزالی ۳۱۲

موسی بن جبال، العبدی ۲۵۱

موسی، محمد یوسف واکٹر

ہماجر ۲۱۲

المویدین محمد بن علی الطوسی البواحسن ۱۳۱ھ

الموفق امام ۶۲۴، ۲۲۸، ۲۲۴

میر سید شریف

المیدونی ۳۸۶

میمون بن مهران، قاضی ۶۱۵، ۳۳۵

ن

نابلسی، عبدالغنی بن اسماعیل ۱۱۳ھ ۴۵۱

نافع، امام، ابو عبد اللہ العدوی مولیٰ ابن عمر ۱۱۸ھ

۱۹۵، ۱۳۰، ۱۹۸، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۵۲، ۲۵۳

۲۵۴، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۵، ۲۹۵، ۳۰۷

۳۰۹، ۳۳۵، ۳۹۶، ۵۱۲، ۵۱۶، ۶۹۵

نافع بن جبیر بن مطعم ۱۸۹، ۲۳۶، ۲۶۵

نافع بن عبد الرحمن البوردیم ۱۹۱ھ

نہیض ۱۸۳

النجاد ۷۳۸

نخب ۳۸۶

نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم اللیثی مدنی ۱۶۱ھ ۶۳

نسخی، ابراہیم، امام ۹۵ھ ۱۹۲، ۱۹۶، ۱۹۸

۲۰۰، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۲، ۲۱۶، ۲۵۸

۲۵۹، ۲۶۰، ۲۸۸، ۳۱۴، ۳۲۱، ۴۱۶

۴۱۶، ۵۰۹، ۵۰۷، ۵۰۳، ۵۰۲، ۵۲۴، ۵۲۳

۵۵۲، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲

نسانی، امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب ۳۰۳ھ

۱۹۱، ۲۰۸، ۲۱۱، ۲۳۸، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۸۶

۳۱۴، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۸۲، ۳۸۵، ۴۵۹

۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸

۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴

۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹

۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳

نسخی، نجم الدین محمد نسخی ۶۷

نصر بن سعد ۲۷۷

نصر بن سیار بن صاعد البواضح ۵۷۲ھ

نصر بن عبد الحکیم ۱۶۹ھ ۴۲۲

نصر بن علی الازدی حافظ البصری ۲۵۰ھ ۷۱۲

نصیر بن یحییٰ ۱۶۳

نضر بن انس ۱۸۲

نضر بن شلیل البواحسن ۲۰۳ھ ۶۹۱، ۶۹۲

نضر بن محمد مردی، امام ۱۸۳ھ ۲۷۷، ۲۷۸

نضیح بن الحارث ۱۹۳

نظام، ابراہیم بن سیار ۶۶۹، ۶۷۸

نعمان بن بشیر ۵۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴

نعمان بن مرزبان ۱۲۳

نعمان بن معترن ۱۹۳

نعیم بن حماد خزاعی ۲۲۸ھ ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱

نعیم بن الطوسی ۲۹۰ھ ۴۳۱

نعیم بن حماد ۷۰۶

نعیم بن عمرو ۱۵۴

حضرت نوح علیه السلام ۱۳۲

نوح بن دراج ۲۲۲ ، ۲۱۶

نور الدین ۱۷۸

نوح بن مریم ابو عصمه ۶۸۸ ، ۲۲۲ ، ۲۱۶

نوروی، امام ابو ترکیا محی الدین سیحی بن شرف ۶۷۶

۹۵ ، ۱۲۲ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، ۱۳۵ ، ۱۳۹

۱۴۱ ، ۱۸۱ ، ۲۰۳ ، ۲۰۴ ، ۲۰۵ ، ۲۰۶ ، ۲۰۷ ، ۲۰۸ ، ۲۰۹

۲۹۸ ، ۳۰۰ ، ۳۰۱ ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، ۳۰۴ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶

۴۰۸ ، ۴۰۹ ، ۴۱۰ ، ۴۱۱ ، ۴۱۲ ، ۴۱۳ ، ۴۱۴ ، ۴۱۵

۴۱۶ ، ۴۱۷ ، ۴۱۸ ، ۴۱۹ ، ۴۲۰ ، ۴۲۱ ، ۴۲۲ ، ۴۲۳

۴۲۴ ، ۴۲۵ ، ۴۲۶ ، ۴۲۷ ، ۴۲۸ ، ۴۲۹ ، ۴۳۰ ، ۴۳۱

۴۳۲ ، ۴۳۳ ، ۴۳۴ ، ۴۳۵ ، ۴۳۶ ، ۴۳۷ ، ۴۳۸ ، ۴۳۹

مناد بن اسیری ۲۳۳ ، ۲۳۴ ، ۲۳۵ ، ۲۳۶ ، ۲۳۷

المنفی، علی بن احمد ۳۰۵

و

واثله بن اسقع ۶۵۸ ، ۳۰۵

وائل بن حجر ۶۲۴ ، ۶۲۶ ، ۵۱۴

الواسطی، خالد ۳۶۱

واصل بن داود ۲۶۴

واقفی ابو عبد الله محمد بن عمر بن واقد ۳۰۴ ، ۱۹۳

الوحشی، ابو علی ۳۸۴

وراق ۶۹۱ ، ۲۹۱

ورقان عمر ۱۹۴

وزیر بن عبد الله ۲۳۶

دکیح بن الجراح یلیح بن عدی امام البوسفیان ۱۹۶

دکیح بن الجراح ۹۶ ، ۳۰ ، ۱۹۵ ، ۱۹۹ ، ۳۰۸

۲۵۸ ، ۲۵۹ ، ۲۶۰ ، ۳۵۸ ، ۳۶۰ ، ۳۶۱ ، ۳۶۲ ، ۳۶۳

۳۶۴ ، ۳۶۵ ، ۳۶۶ ، ۳۶۷ ، ۳۶۸ ، ۳۶۹ ، ۳۷۰ ، ۳۷۱

۳۷۲ ، ۳۷۳ ، ۳۷۴ ، ۳۷۵ ، ۳۷۶ ، ۳۷۷ ، ۳۷۸ ، ۳۷۹

۳۸۰ ، ۳۸۱ ، ۳۸۲ ، ۳۸۳ ، ۳۸۴ ، ۳۸۵ ، ۳۸۶ ، ۳۸۷

۳۹۰ ، ۳۹۱ ، ۳۹۲ ، ۳۹۳ ، ۳۹۴ ، ۳۹۵ ، ۳۹۶ ، ۳۹۷

۳۹۸ ، ۳۹۹ ، ۴۰۰ ، ۴۰۱ ، ۴۰۲ ، ۴۰۳ ، ۴۰۴ ، ۴۰۵

۴۰۸ ، ۴۰۹ ، ۴۱۰ ، ۴۱۱ ، ۴۱۲ ، ۴۱۳ ، ۴۱۴ ، ۴۱۵

ولید بن کثیر ۵۱۳

ولید بن عبد الملك بن مروان ۱۲۶ ، ۱۲۷ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹

ولید بن مسلم القرشی ابو العباس الدمشقی ۲۲۲ ، ۲۲۳

ولید بن یزید ۲۲۹ ، ۲۳۰ ، ۲۳۱ ، ۲۳۲

وصب بن عبد الله ۱۹۳

وصب بن منبیه ۱۴۲ ، ۱۴۳ ، ۱۴۴ ، ۱۴۵ ، ۱۴۶ ، ۱۴۷ ، ۱۴۸ ، ۱۴۹

۵

بارون الرشید، عباسی ابو جعفر بن محمد المهدی العباسی ۱۹۳

۴۲۰ ، ۴۲۱ ، ۴۲۲ ، ۴۲۳ ، ۴۲۴ ، ۴۲۵ ، ۴۲۶ ، ۴۲۷

الهرودی شیخ الاسلام ۴۳۰

هاشم بن عقیبه بن ابی وقاص ۲۶۴

هاشم بن پیتروطنس، ڈاکٹر ۱۶۲

هشام بن حسان ۲۷۵

هشام بن عبد الملك ۲۵۹ ، ۲۶۰

هشام بن عروہ بن النذیر ابو المنذر ۱۴۲ ، ۱۴۳

۴۲۶ ، ۴۲۷ ، ۴۲۸ ، ۴۲۹ ، ۴۳۰ ، ۴۳۱ ، ۴۳۲ ، ۴۳۳

۴۳۴ ، ۴۳۵ ، ۴۳۶ ، ۴۳۷ ، ۴۳۸ ، ۴۳۹ ، ۴۴۰ ، ۴۴۱

يسحي بن عبد الله بن بكير البزكري المصري ٢٣١ هـ ١٥١
يسحي بن خريس ٢٤٣

يسحي بن ابى بكير ٢٠٣ هـ ١٩٥ ٤٠٥

يسحي بن زكريا بن ابى زائدة البوسعيد ٨٤ هـ ١٩٣

١٠٤، ١٠٨، ١٢٢، ١٣٨، ١٨٠، ٢٩٢، ٢٩٣

٢٩٢، ٢٩٥، ٤٢٥

يسحي بن سعيد النصارى البوسعيد ١٢٠ هـ ٢٣٣

٢٥٩، ٢٦٠، ٢٦١، ٢٦٢، ٢٦٣، ٢٦٤، ٢٦٥، ٢٦٦

٢٦٧، ٢٦٨، ٢٦٩، ٢٧٠، ٢٧١، ٢٧٢، ٢٧٣، ٢٧٤

٢٧٥، ٢٧٦، ٢٧٧

يسحي بن سعيد القرشي ١٩٥

يسحي بن سعيد القطان حافظ ٩٨ هـ ١٢٩، ١٣٠

١٤٢، ١٤٣، ١٤٤، ١٤٥، ١٤٦، ١٤٧، ١٤٨، ١٤٩، ١٥٠

١٥١، ١٥٢، ١٥٣، ١٥٤، ١٥٥، ١٥٦، ١٥٧، ١٥٨

١٥٩، ١٦٠، ١٦١، ١٦٢، ١٦٣، ١٦٤، ١٦٥، ١٦٦

١٦٧، ١٦٨، ١٦٩، ١٧٠، ١٧١، ١٧٢

يسحي بن شيبان ١٥٣، ١٥٤

يسحي بن ابى طالب ١٤٦، ١٤٧

يسحي بن عبد الحميد ٢٢٨ هـ ١٩٥، ١٩٦

يسحي بن كثير ٢٣٤

يسحي بن نصر ٣٦٣، ٣٦٤

يسحي بن يحيى، ليشى، سمودى ابو محمد ٢٣٣ هـ ٢٠٦

يسحي بن يحيى المسعودى ٣٩٤

يسحي بن يمان البزكريا ١١٩ هـ ١٢٠

يسحي بن يحيى بن بكر بن عبد الرحمن ٢٢٦ هـ ٣٩٨

هشام بن الغاز ١٢٢

هشام بن يوسف ١٩٤ هـ ٢٢٢

هشام دستواى بن ابى عبد الله البزكريا ٥٢ هـ ٥٣٦

هشام بن محمد كلبى ٢٠٢ هـ ١٩٣، ٢٩٦، ٢٩٤

هشام بن الحارث ٢١٦

هشام بن منيه بن كامل ابو عقبة ١٣١ هـ ١٩٩، ٢٢٥

٣٩٩، ٤٠٠، ٤٠١، ٤٠٢

هشيم بن بشير، امام الحافظ الثقة ابو احمد ٨٣ هـ

٢٢٣، ٢٢٤، ٢٢٥، ٢٢٦، ٢٢٧، ٢٢٨، ٢٢٩، ٢٣٠

٢٣١، ٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٥، ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٣٨

٢٣٩، ٢٤٠، ٢٤١، ٢٤٢، ٢٤٣، ٢٤٤، ٢٤٥

٢٤٦، ٢٤٧، ٢٤٨، ٢٤٩، ٢٥٠

هشام بن اسرى بن مصعب حافظ ٢٢٣ هـ ٢٠٨، ٢٩٥

٤١٩، ٤٢٠، ٤٢١

هشام بن خليفة ٢٨٨

هشيم بن نور الدين، حافظ ابو الحسن ٨٠٤ هـ ٢٣٤، ٢٥٦

ي

الياقنى ١٢١، ١٢٢، ١٢٣، ١٢٤، ١٢٥، ١٢٦

ياسين الزيات ٢٧٦

ياقوت حموى رومى علامه ابو عبد الله ٢٢٦ هـ ٢٣٠

يا غنذى ٣٨٢

يسحي بن آدم العلما البزكريا القرشى ٢٠٣ هـ ١٩٥

٢٤٤، ٢٤٥، ٢٤٦، ٢٤٧، ٢٤٨، ٢٤٩، ٢٥٠، ٢٥١

يسحي بن دى كثير ١٢٢

يسحي بن اكثم قاضى ٢٢٣ هـ ٢٥٩، ٢٦٠، ٢٦١

يسحي بن ايوب ابو العباس ١٦٨ هـ ٥٥٠

